يؤتي الحكمة من يشاء ومن يؤت الحكمة فقد أوتي خيرا كثيرا

فقہائے ہند

محمد اسحاق بھٹی

www.KitaboSunnat.com

5

دار النوادر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد اپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

فقہائے ہند

بارھویں صدی ہجری

محمد اسحاق بھٹی

محمد اسحاق بھٹی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

باشتراک

دار النوادر

الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور فون: ۰۳۰۰ ۸۸۹۸۶۳۹

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جملہ حقوق محفوظ

۲۰۱۳/۱۴۳۴ھ

نام کتاب: ـــــــــ فقہائے ہند

مصنف: ـــــــــ محمد اسحاق بھٹی

اہتمام: ـــــــــ محمد اسحاق بھٹی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
بہ اشتراک دار النوادر

مطبع: ـــــــــ شفیق پریس

حروف خوانی: ـــــــــ محمد سعید بھٹی

کمپوزنگ: ـــــــــ محمود فرید

صفحات: ـــــــــ ۵۲۸

سرورق: ـــــــــ ضیاء الرحمٰن

جلد ساز: ـــــــــ بنیامین

ڈسٹری بیوٹرز

کتاب سرائے
پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات
فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اردو بازار، لاہور فون: 37320318، 37239884
ای میل: Kitabsaray@hotmail.com

فضلی بک سپر مارکیٹ
اردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 32212991-32629724

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترتیب

◆	مقدمہ	۵۱۵
◆	اورنگ زیب عالم گیر	۵۱۵
◆	ولادت اور تعلیم وتربیت	۵۱۶
◆	شجاعت اور بہادری	۵۱۷
◆	پہلی باقاعدہ معرکہ آرائی	۵۱۸
◆	دکن کی صوبے داری	۵۱۸
◆	شاہ جہان کی خفگی اور صلح	۵۱۹
◆	گجرات کی نظامت	۵۱۹
◆	بلخ وبدخشاں کی مہم	۵۲۰
◆	ملتان کی ولایت اور قندھار کی مہم	۵۲۱
◆	دوسری دفعہ نظامت دکن	۵۲۳
◆	داراشکوہ کا کردار اور بھائیوں کا ردِ عمل	۵۲۴
◆	بعد کے مختصر حالات	۵۲۷
◆	شاہ جہان کا طرزِ عمل اور عالم گیر کی اطاعت شعاری	۵۲۹
◆	اورنگ زیب کی تخت نشینی	۵۳۳
◆	تخت نشینی میں علمائے کرام کا حصہ	۵۳۴
◆	نظم ونسق اور اصلاحات کا نفاذ	۵۳۵
◆	بعض قبائل کی شورشوں کا انسداد	۵۳۷
◆	سکھ اوران کے ہنگامے	۵۳۷
◆	جسونت سنگھ کی بے وفائی اور عالم گیر کا عفو وکرم	۵۳۸
◆	دکن کی فتح اور مرہٹوں کی سرکوبی	۵۳۹
◆	سرمد کا قتل	۵۴۳
◆	اوصاف وکمالات کی ایک جھلک	۵۴۵
◆	سخاوت اور غریب پروری	۵۴۹
◆	بُردباری اور متحمل مزاجی	۵۵۰
◆	اصلاحی اقدامات	۵۵۰
◆	نیکی اور تدین	۵۵۱
◆	قرآن مجید سے شغف ومحبت	۵۵۲
◆	علم فقہ میں درک اور فتاویٰ عالم گیری کی تدوین	۵۵۳
◆	عالم گیر کا کتب خانہ	۵۵۷
◆	عہد عالم گیری کے علمائے کرام	۵۵۸
◆	فنونِ لطیفہ اور تعمیرات	۵۵۹
◆	عالم گیر کے اساتذہ	۵۵۹
◆	بزرگانِ سرہند سے تعلق خاص	۵۶۱
◆	قرآنِ مجید کی کتابت کا سلسلہ	۵۶۴
◆	عدل وانصاف	۵۶۴
◆	خبر رسانی کا اہتمام	۵۶۵
◆	بادشاہ کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کا حق	۵۶۶
◆	چاندی کے بجائے چینی کی دوات	۵۶۶
◆	جیب خاص کے مصارف میں کمی	۵۶۶
◆	ملکی آمدنی میں اضافہ	۵۶۷
◆	مسلسل جدوجہد	۵۶۷
◆	ادبیت اور حسن بیان	۵۶۸

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

◆ عبادت گزاری اور شریعت کی پاس داری	۵۶۹
◆ دورِ آخر کا ایک رقت انگیز واقعہ	۵۶۹
◆ آخری دور اور تجہیز و تکفین کی وصیتیں	۵۷۰
◆ وفات	۵۷۰
◆ خلد آباد میں تدفین	۵۷۱
◆ لیکن ایک بات	۵۷۱
◆ اورنگ زیب کے بعد	۵۷۳
◆ **الف**	
◆ ۱۔سید آل محمد بلگرامی	۵۷۵
◆ ۲۔سید آیت اللہ رائے بریلوی	۵۷۶
◆ ۳۔مفتی ابوالبرکات دہلوی	۵۷۷
◆ ۴۔قاضی ابوبکر مدراسی	۵۷۷
◆ ۵۔شیخ ابوالحسن دیلوری	۵۷۸
◆ ۶۔شیخ ابوالحسن سندھی کبیر	۵۷۸
◆ ۷۔شیخ ابوالحسن سندھی صغیر	۵۷۹
◆ ۸۔مولانا ابوالحسن کشمیری	۵۷۹
◆ ۹۔مولانا ابوالخیر جون پوری	۵۸۰
◆ ۱۰۔سید ابوسعید بریلوی	۵۸۰
◆ ۱۱۔سید ابوسعید کالپوی	۵۸۱
◆ ۱۲۔مفتی ابوسعید گوپاموی	۵۸۲
◆ ۱۳۔شیخ ابوالطیب سندھی	۵۸۲
◆ ۱۴۔مولانا ابوالفتح کانی کشمیری	۵۸۳
◆ ۱۵۔مفتی ابوالفتح کلو کشمیری	۵۸۳
◆ ۱۶۔قاضی ابوالفرح گجراتی	۵۸۳
◆ ۱۷۔مولانا ابوالقاسم سندھی	۵۸۴
◆ ۱۸۔سید ابواللیث رائے بریلوی	۵۸۴
◆ ۱۹۔مفتی ابومحمد سہسوانی	۵۸۴
◆ ۲۰۔مفتی ابوالوفا کشمیری	۵۸۵
◆ ۲۱۔شیخ احمد صدیقی امیٹھوی۔ملاجیون	۵۸۵
◆ ۲۲۔شیخ احمد گوپاموی	۵۸۸
◆ ۲۳۔شیخ احمد رفائی	۵۸۸
◆ ۲۴۔شیخ احمد نائطی مدراسی	۵۸۹
◆ ۲۵۔شیخ احمد عثمانی لکھنوی	۵۸۹
◆ ۲۶۔شیخ احمد ہرکامی	۵۹۰
◆ ۲۷۔قاضی احمد جون پوری	۵۹۰
◆ ۲۸۔حاجی احمد دہلوی	۵۹۰
◆ ۲۹۔قاضی احمد حماد فتح پوری	۵۹۱
◆ ۳۰۔شیخ احمد عبدالحق لکھنوی	۵۹۱
◆ ۳۱۔قاضی احمد علی سندیلوی	۵۹۱
◆ ۳۲۔شیخ احمد اللہ خیرآبادی	۵۹۲
◆ ۳۳۔مولانا احمد اللہ پانی پتی	۵۹۲
◆ ۳۴۔شیخ اسماعیل غوری پشاوری	۵۹۳
◆ ۳۵۔شیخ اشرف قلی جائسی	۵۹۳
◆ ۳۶۔شیخ افضل راجیندروی	۵۹۳
◆ ۳۷۔مولانا اکبریار کشمیری	۵۹۴
◆ ۳۸۔شیخ اکرم الدین گجراتی	۵۹۴
◆ ۳۹۔شیخ اللہ بخش گوپاموی	۵۹۵
◆ ۴۰۔شیخ اللہ داد گوپاموی	۵۹۵
◆ ۴۱۔شیخ امام الدین جون پوری	۵۹۵
◆ ۴۲۔مولانا امان اللہ کشمیری دہلوی	۵۹۵
◆ ۴۳۔حافظ امان اللہ بنارسی	۵۹۶
◆ ۴۴۔ مولانا امین الدین کنتوری	۵۹۶
◆ ۴۵۔مولانا امین الدین مدراسی	۵۹۷
◆ ۴۶۔مولانا امین الدین جون پوری	۵۹۷
◆ ۴۷۔مولانا انگنون جون پوری	۵۹۸
◆ ۴۸۔مولانا اوغلان خراسانی	۵۹۸

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ب	
۴۹۔ شیخ باسط علی قلندر الہ آبادی	۵۹۸
۵۰۔ شیخ بدر الدین جون پوری	۵۹۹
۵۱۔ شیخ بدر رفاعی	۵۹۹
۵۲۔ شیخ بدیع عالم سادا موی	۶۰۰
۵۳۔ شیخ بہلول برکی	۶۰۰
ت	
۵۴۔ مفتی تابع محمد لکھنوی	۶۰۰
۵۵۔ میر تاجو کشمیری	۶۰۱
ج	
مرزا جان جاناں دہلوی	۶۰۱
خود نوشت حالات	۶۰۲
مرزا کے بعض آبا و اجداد	۶۰۵
اساتذہ اور مرشد	۶۰۷
ملوک و امرا سے کنارہ کشی	۶۰۷
اخذ و قبولِ نذر کے پیمانے	۶۰۸
اتباعِ سنت کا شدید جذبہ	۶۰۹
مرزا صاحب شاہ ولی اللہ کی نظر میں	۶۱۰
حدیث ہی کو مدارِ عمل ٹھہراتے	۶۱۱
رفع سبابہ اور فاتحہ خلف الامام	۶۱۲
عمل بالحدیث کی تاکید	۶۱۲
انتقالِ مذہب اور تقلید کے سلسلے میں	۶۱۴
ہندو مذہب کے بارے میں	۶۱۸
بلندیٔ اخلاق اور بلندیٔ کردار کی تلقین	۶۲۱
سیاسی حالات	۶۲۳
شعر و شاعری	۶۲۳
اُردو کلام	۶۲۴
وفات	۶۲۵
نماز کے لیے بے چینی	۶۲۶
تدفین	۶۲۷
مرزا صاحب کا وصیت نامہ	۶۲۷
نجف خاں	۶۲۸
۵۷۔ مولانا جار اللہ سہارنپوری	۶۳۰
۵۸۔ مولانا جان محمد لاہوری	۶۳۰
۵۹۔ شیخ جلال الدین گجراتی	۶۳۱
۶۰۔ مولانا جلال الدین مچھلی شہری	۶۳۱
۶۱۔ شیخ جمال الدین گجراتی	۶۳۲
ح	
۶۲۔ مولانا حامد جون پوری	۶۳۳
۶۳۔ شیخ حبیب اللہ بہاری	۶۳۳
۶۴۔ قاضی حبیب اللہ تاج پوری	۶۳۴
۶۵۔ شیخ حبیب اللہ قنوجی	۶۳۴
۶۶۔ سید حسن دہلوی عُرف رسول نما	۶۳۵
۶۷۔ قاضی حسن سعید جون پوری	۶۳۶
۶۸۔ قاضی حیدر کشمیری	۶۳۶
خ	
۶۹۔ خواجہ میر درد دہلوی	۶۳۷
خواجہ نقشبند	۶۳۷
برصغیر میں آمد	۶۳۸
تعلیم و تربیت	۶۳۹
بادشاہ کو سرزنش	۶۴۰
عُسرت اور تنگ دستی	۶۴۰
تصانیف	۶۴۱
وفات	۶۴۶
اولاد	۶۴۷
شاگرد	۶۴۷

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۷۰۔ قاضی خلیل اللہ حیدر آبادی	۲۴۸
۷۱۔ شیخ خوب محمد گجراتی	۲۴۸
۷۲۔ قاضی خیر اللہ جون پوری	۲۴۸
د	
۷۳۔ سید درگاہی بلگرامی	۲۴۹
۷۴۔ مفتی درویش محمد بدایونی	۲۴۹
ر	
۷۵۔ شیخ رحمت اللہ لکھنوی	۲۵۰
۷۶۔ شیخ رحمت اللہ کشمیری	۲۵۰
۷۷۔ مولانا رستم علی قنوجی	۲۵۰
ز	
۷۸۔ شیخ زین العابدین سرہندی	۲۵۱
س	
۷۹۔ سید سعد الدین بلگرامی	۲۵۲
۸۰۔ مولانا سعد الدین کشمیری	۲۵۲
۸۱۔ سید سعد اللہ سلونی	۲۵۳
۸۲۔ شیخ سلطان محمد کرمانی	۲۵۴
۸۳۔ سید سلطان مقصود کالپوی	۲۵۴
۸۴۔ شیخ سیف اللہ بخاری دہلوی	۲۵۴
ش	
۸۵۔ مفتی شرف الدین لکھنوی	۲۵۵
۸۶۔ شیخ شکر اللہ جون پوری	۲۵۵
۸۷۔ شیخ شمس الدین جون پوری	۲۵۶
۸۸۔ قاضی شہاب الدین گوپاموی	۲۵۶
۸۹۔ قاضی شیخ الاسلام گجراتی	۲۵۷
ص	
۹۰۔ شیخ صبغت اللہ سرہندی	۲۵۹
ض	
۹۱۔ سید ضیاء اللہ بلگرامی	۲۶۰
ط	
۹۲۔ سید طفیل محمد اترولوی بلگرامی	۲۶۱
۹۳۔ سید طیب بلگرامی	۲۶۲
ظ	
۹۴۔ سید ظریف حسینی عظیم آبادی	۲۶۳
ع	
۹۵۔ شیخ عبدالباسط سندھی	۲۶۴
۹۶۔ سید عبدالجلیل حسینی بلگرامی	۲۶۴
۹۷۔ سید عبدالحکیم لاہوری	۲۶۶
۹۸۔ شاہ عبدالرحیم دہلوی	۲۶۷
مفتی شمس الدین	۲۶۷
مفتی کمال الدین	۲۶۷
مفتی قطب الدین	۲۶۸
شیخ عبدالمالک	۲۶۸
قاضی بدھا	۲۶۸
قاضی قاسم	۲۶۸
قاضی قادن	۲۶۹
شیخ محمود	۲۶۹
شیخ احمد	۲۶۹
شیخ منصور اور شیخ حسین	۲۶۹
شیخ معظم	۲۷۰
شیخ وجیہ الدین	۲۷۰
ولادت اور دیگر حالات	۲۷۰
بادشاہوں کی مجالس میں حاضری سے گریز	۲۷۱

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسائل فقہی پر تعامل	۶۷۳
قبولیت دعا	۶۷۳
شوقِ شعری	۶۷۵
اہل اللہ اور مجاذیب سے ملاقات	۶۷۵
مدرسہ رحیمیہ کی بنیاد	۶۷۶
علمی مباحث	۶۷۷
شاہ صاحب سے ملا عبداللہ چلپی کی بیعت	۶۷۹
فتاویٰ عالم گیری میں حصہ	۶۸۰
انتقال	۶۸۲
۹۹۔ شیخ عبدالرحیم حسینی بیجاپوری	۶۸۳
۱۰۰۔ قاضی عبدالرسول سہالوی	۶۸۳
۱۰۱۔ شیخ عبدالصمد چریاکوٹی	۶۸۴
۱۰۲۔ قاضی عبدالصمد عثمانی جون پوری	۶۸۴
۱۰۳۔ مولانا عبدالصمد دیوی	۶۸۵
۱۰۴۔ مولانا عبدالفتاح صمدانی	۶۸۵
۱۰۵۔ مولانا عبدالقادر گجراتی	۶۸۵
۱۰۶۔ شیخ عبدالقادر پٹنی مکی	۶۸۶
۱۰۷۔ شیخ عبدالقادر لاہوری	۶۸۶
۱۰۸۔ سید عبدالکریم حسینی قنوجی	۶۸۶
۱۰۹۔ شیخ عبدالکریم صدیقی بلگرامی	۶۸۷
۱۱۰۔ قاضی عبدالکریم کشمیری	۶۸۷
۱۱۱۔ مخدوم قاضی عبداللطیف ٹھٹھوی	۶۸۷
۱۱۲۔ شیخ عبداللہ حسنی لاہوری	۶۸۸
۱۱۳۔ سید عبداللہ سندیلوی	۶۸۸
۱۱۴۔ قاضی عبداللہ گجراتی	۶۹۰
۱۱۵۔ مولانا عبداللہ امیٹھوی	۶۹۰
۱۱۶۔ مولانا سید عبداللہ بلگرامی	۶۹۱
۱۱۷۔ مولانا عبدالمقتدر بہاری	۶۹۱
۱۱۸۔ مفتی عبدالمومن کشمیری	۶۹۲
۱۱۹۔ قاضی عبدالنبی عثمانی احمد نگری	۶۹۲
۱۲۰۔ مولانا عبدالولی طرخانی کشمیری	۶۹۳
۱۲۱۔ میر سید عبدالوہاب منور آبادی	۶۹۳
۱۲۲۔ شیخ عتیق اللہ جالندھری	۶۹۴
۱۲۳۔ قاضی عثمان احمد عثمانی بلگرامی	۶۹۴
۱۲۴۔ قاضی عصمت اللہ فاروقی لکھنوی	۶۹۴
۱۲۵۔ شیخ عصمت اللہ سہارن پوری	۶۹۵
۱۲۶۔ شیخ عطاء اللہ دہلوی	۶۹۸
۱۲۷۔ شیخ علی اصغر قنوجی	۶۹۸
۱۲۸۔ مفتی علیم اللہ گوپاموی	۶۹۹
۱۲۹۔ سید عنایت اللہ بلگرامی	۶۹۹
۱۳۰۔ شیخ عنایت اللہ سندھی	۶۹۹
۱۳۱۔ سید عنایت اللہ بالاپوری	۷۰۰
۱۳۲۔ شیخ عنایت اللہ شال کشمیری	۷۰۰
۱۳۳۔ شیخ عنایت اللہ قادری لاہوری	۷۰۰
غ	
۱۳۴۔ شیخ غلام اخی عثمانی بلگرامی	۷۰۱
۱۳۵۔ سید غلام حسین اورنگ آبادی	۷۰۱
۱۳۶۔ میر سید غلام علی آزاد بلگرامی	۷۰۲
واسطی سادات کی بلگرام میں آمد	۷۰۲
سید غلام علی کی ولادت اور تعلیم وتربیت	۷۰۴
سیر وسیاحت	۷۰۵
قصد حج	۷۰۵
نواب آصف جاہ کے دربار میں	۷۰۷
میدانِ جنگ میں	۷۰۸
حج کو روانگی	۷۰۹
شیخ محمد فاخر سے ملاقات	۷۰۹

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

◆ مکہ مکرمہ میں حاضری ۷۰۹
◆ مدینہ منورہ میں آمد ۷۱۰
◆ مولانا شیخ محمد حیات سندھی سے اجازۂ حدیث ۷۱۱
◆ مکہ مکرمہ کو روانگی ۷۱۲
◆ مراجعت ہند ۷۱۲
◆ حج ثانی کا خیال اور اس کا ترک ۷۱۵
◆ برہان پور اور حیدر آباد وغیرہ کے سفر ۷۱۶
◆ جوان بیٹے کا انتقال ۷۱۶
◆ تصانیف ۷۱۷
◆ آزاد کی شاعری پر اہل علم کی تنقیدات ۷۲۴
◆ چند واقعات ولطائف ۷۲۶
◆ ضبط وتحمل ۷۲۹
◆ فقیرانہ زندگی ۷۲۹
◆ مال ودولت سے بے نیازی ۷۳۱
◆ فقر کی بہترین راہ ۷۳۳
◆ حسان الہند ۷۳۴
◆ معاصرین سے علمی صحبتیں اور ادبی لطیفے ۷۳۴
◆ دکن میں مستقل سکونت ۷۳۷
◆ سفر آخرت کی تیاری ۷۳۸
◆ وفات ۷۳۸
◆ ۱۳۷۔ قاضی غلام مصطفیٰ انصاری لکھنوی ۷۳۹
◆ ۱۳۸۔ سید غلام نبی بلگرامی ۷۳۹

◆ ف

◆ ۱۳۹۔ قاضی فتح علی قنوجی ۷۴۰
◆ ۱۴۰۔ مولانا فخر الدین مانک پوری بلگرامی ۷۴۰
◆ ۱۴۱۔ مولانا فخر الدین دہلوی ۷۴۱
◆ ۱۴۲۔ شیخ فرخ شاہ سرہندی ۷۴۱
◆ ۱۴۳۔ سید فرید الدین بلگرامی ۷۴۲
◆ ۱۴۴۔ مولانا فصیح الدین پھلواروی ۷۴۳
◆ ۱۴۵۔ سید فضل اللہ کالپوی ۷۴۵
◆ ۱۴۶۔ شیخ فضل اللہ پرینوی ۷۴۶
◆ ۱۴۷۔ مولانا فضل اللہ بہاری ۷۴۶
◆ ۱۴۸۔ سید فیروز جائسی ۷۴۷
◆ ۱۴۹۔ خواجہ فیض الحسن سورتی ۷۴۷

◆ ق

◆ ۱۵۰۔ سید قاسم دہلوی ۷۴۷
◆ ۱۵۱۔ مولانا قطب الدین شہید سہالوی ۷۴۸
◆ شہادت ۷۴۹
◆ مولانا سے عداوت اور قتل کی وجہ ۷۵۳
◆ بادشاہ کا فرمان اور قاتلوں کا انجام ۷۵۴
◆ بادشاہ کی طرف سے مکان کا عطیہ ۷۵۴
◆ تصانیف ۷۵۵
◆ ۱۵۲۔ سید قطب الدین شمس آبادی ۷۵۷
◆ ۱۵۳۔ سید قطب الدین اورنگ آبادی ۷۵۷
◆ ۱۵۴۔ شیخ قطب الدین سرہندی ۷۵۸
◆ ۱۵۵۔ مولانا قطب الدین عباسی الہ آبادی ۷۵۸
◆ ۱۵۶۔ سید قطب احمد حیدر آبادی ۷۵۹
◆ ۱۵۷۔ قاضی قل احمد سترکھی ۷۵۹
◆ ۱۵۸۔ سید قمر الدین اورنگ آبادی ۷۵۹

◆ ک

◆ ۱۵۹۔ شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی ۷۶۰
◆ ۱۶۰۔ سید کلیم اللہ مکی ۷۶۱
◆ ۱۶۱۔ شیخ کمال الدین سندھی ۷۶۲
◆ ۱۶۲۔ شیخ کمال الدین فتح پوری ۷۶۲
◆ مراجع ومصادر ۷۶۳

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

اورنگ زیب عالم گیر:

فقہائے ہند کی چوتھی جلد کے مقدمے میں مغل خاندان کے تیسرے حکمران جلال الدین اکبر کے ضروری حالات بیان کیے گئے ہیں اور اس کی زندگی کے مذہبی اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیا گیا ہے۔

چوتھی جلد کے دوسرے حصے کے مقدمے میں اکبر کے فرزند نورالدین جہاں گیر کی حیاتِ مستعار کے ان واقعات سے قارئین کرام کو روشناس کرانے کی کوشش کی گئی ہے جو کتاب کے مندرجات کی مناسبت سے ہمارے موضوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اسی جلد میں شہاب الدین شاہ جہان کی سرگزشت حیات کے بعض گوشوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔

اب آیئے پانچویں جلد کے مقدمے میں دودمان مغلیہ کے چھٹے حکمران ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب عالم گیر کے حالات وسوانح کی تلاش کے لیے تاریخ کے دروازے پر دستک دیتے اور اس کے چند علمی کارناموں کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ نیز اس نے جواں مردی اور شجاعت کے جو نقوش برصغیر کی سرزمین پر چھوڑے، انھیں نمایاں کرنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

قمری حساب سے یہ بارھویں صدی ہجری کا زمانہ ہے اور اس صدی کے برصغیر میں جن علمائے کرام اور فقہائے عظام نے علمی وتصنیفی خدمات سرانجام دیں کتاب میں ان کا تذکرہ کیا جائے گا۔ جن حضرات کے حالات زیادہ دست یاب ہیں، ان کا کچھ تفصیل سے اور جن کے واقعاتِ زندگی سے ہم زیادہ مطلع نہیں ہو سکے، ان کا ذکر اختصار سے کیا جائے گا۔ آئندہ سطور میں بہ صورت مقدمہ پہلے اورنگ زیب عالم گیر کے کوائف حیات اور اس کے بعد اس کے عہد کے علما وفقہا کی خدمات گوناگوں کا تذکرہ ملاحظہ فرمایئے۔

اورنگ زیب عالم گیر کا عہد حکومت پچاس برس سے زیادہ عرصے کا احاطہ کیے ہوئے ہے، اس لیے مقدمے کے متعلق مرقوم واقعات تقریباً ساٹھ صفحات میں پھیل گئے ہیں۔ لیکن تمام واقعات بے حد دلچسپ ہیں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ولادت اور تعلیم و تربیت:

اورنگ زیب عالم گیر اتوار کی رات ۱۵ ذیقعدہ ۱۰۲۷ھ (۲۴ اکتوبر ۱۶۱۸ء) کو ''دوحد'' کے مقام پر پیدا ہوا جو گجرات اور مالوہ کی سرحد پر اجین سے سو میل اور بڑودہ سے ستر میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ شاہ جہان اس وقت ولی عہد تھا اور جہاں گیر ملک عنبر کو شکست دے کر آگرہ کی طرف جا رہا تھا۔ جہاں گیر نے نومولود کا نام اورنگ زیب رکھا اور کلیم ہمدانی نے ''آفتاب عالم تاب'' سے تاریخ نکالی۔ شاہ جہان کا اورنگ زیب تیسرا بیٹا اور اس کے چودہ بچوں میں سے بہ اعتبار ترتیب چھٹا بچہ تھا۔ ماں کا نام ارجمند بانو تھا جو آصف جاہ ابوالحسن طہرانی کی بیٹی تھی اور ممتاز محل کے عرف سے معروف تھی۔

اورنگ زیب کی عمر چار سال کے لگ بھگ تھی کہ ۱۰۳۱ھ (۱۶۲۱ء) میں شاہ جہان نے جہاں گیر کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ اس بغاوت کا پس منظر درحقیقت نور جہاں کا وہ طرز عمل تھا جو اس نے شاہ جہاں کے بارے میں اختیار کر رکھا تھا اور اس کی وجہ سے لائق بیٹا عظیم باپ سے بددل ہو گیا تھا۔ بغاوت کے دنوں میں شاہ جہان نہایت پریشانی کے عالم میں اہل و عیال سمیت ہندوستان کے مختلف علاقوں بہار، بنگال، اڑیسہ اور دکن وغیرہ میں مارا مارا پھرتا رہا۔ اس اثنا میں باغی شہزادے کا کئی بار شاہی فوج سے مقابلہ بھی ہوا، مگر شہزادے نے ہر بار شکست کھائی۔ بالآخر اسے باپ کے حضور جھکنے اور معافی مانگنے پر مجبور ہونا پڑا۔ جہاں گیر نے بیٹے کی غلطی معاف کی اور اسے بالاگھاٹ کی نظامت پر مامور کیا۔ رہتاس اور اسیر گڑھ کے دو قلعے بھی عطا کیے۔ لیکن یہ شرط عائد کی کہ شاہ جہان اپنے دو بیٹوں دارا شکوہ اور عالم گیر کو بطور یرغمال جہاں گیر کے پاس لاہور بھیجے گا۔ شاہ جہان کو شہنشاہ کی یہ شرط ماننا پڑی۔ شہزادہ شجاع پہلے ہی جہاں گیر کے پاس تھا۔ یہ واقعہ ۱۰۳۵ھ (جون ۱۶۲۶ء) کا ہے۔ اورنگ زیب عالم گیر کی عمر اس وقت کم و بیش آٹھ سال کی تھی۔

اس واقعہ کے ڈیڑھ دو سال بعد ۱۰۳۷ھ (۱۶۲۷ء) میں جہاں گیر لاہور میں وفات پا گیا اور شہاب الدین محمد شاہ جہان ہندوستان کا بادشاہ بنا۔ رسم تاج پوشی اکبر آباد (آگرہ) میں ادا کی گئی۔ اس موقعے پر آصف جاہ نے شاہ جہان کے حکم سے تینوں شہزادوں کو لاہور سے اپنے ساتھ لیا اور اکبر آباد پہنچا۔ ان کی ماں ممتاز محل اکبر آباد سے روانہ ہو کر سکندرہ کے مقام پر بیٹوں سے آ کر ملی اور نہایت مسرت کا اظہار کیا۔ دوسرے دن شہزادوں نے بادشاہ کے حضور نذریں پیش کیں اور بادشاہ نے جوش محبت سے انھیں گلے لگایا۔ شہزادوں کی آمد پر دربار میں دوبارہ تقریب مسرت منعقد کی گئی اور اورنگ زیب کو ایک لاکھ روپے نقد عطا کیے گئے اور پانچ سو روپیہ روزینہ مقرر ہوا۔ اس وقت اس کی عمر دس سال ہو گئی تھی۔

شاہ جہان کے زمانۂ شہزادگی کا بہت بڑا حصہ گوناگوں مصروفیات میں گزرا تھا، اس لیے وہ بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دے سکا تھا۔ اب وہ تخت حکومت پر بیٹھا تو اس اہم مسئلے کو موضوع فکر

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ٹھہرایا اور شہزادوں کی تعلیم کے لیے مختلف مشہور اور بہترین اساتذہ مقرر کیے۔ ہمارا دائرہ گفتگو چوں کہ اورنگ زیب عالم گیر تک محدود ہے، اس لیے ان سطور میں ہم صرف اسی کے اساتذہ کا ذکر کریں گے۔ اس کے اساتذہ کرام میں مولانا عبداللطیف سلطان پوری، مولانا محمد ہاشم گیلانی، شیخ محی الدین بہاری، محمد صالح، سعد اللہ خاں اور سید محمد قنوجی کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ اس کے ایک استاذ ملا شفیعائے یزدی تھے، جو اقلیم ہند کے نامور فاضل تھے اور نواب دانش مند خاں کے لقب سے ملقب تھے۔ ان کا شمار اس عہد کے جلیل القدر علما اور رفیع المرتبت فضلا میں ہوتا تھا۔ ان سے شہزادے نے علوم متداولہ اور فنونِ مروجہ کی باقاعدہ تحصیل کی۔

اس زمانے میں حاجی قاسم اور شیخ علی بن محمد مقیم مشہور خطاط تھے اور خط نستعلیق، خط نسخ اور خط شکستہ میں عدیم المثال تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر نے ان کے سامنے بھی زانوئے شاگردی تہ کیا اور خطوط متعارفہ میں مہارت پیدا کی۔ اورنگ زیب اس قدر اونچے درجے کا خوش نویس تھا کہ سریر آرائے سلطنت ہونے سے پہلے اپنے ہاتھ سے قرآن مجید کی کتابت کی اور اس کی تذہیب وتجلید پر سات ہزار روپے خرچ کر کے اسے مدینہ منورہ بھجوایا۔ اسی طرح علم نحو کی مشہور کتاب الفیہ ابن مالک کی کتابت کی اور اسے حاجی عبدالرحمٰن مفتی کے ہاتھ مکہ مکرمہ ارسال کیا۔

اورنگ زیب تصوف وسلوک میں بھی دلچسپی رکھتا تھا اور حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند گرامی شیخ محمد معصوم سرہندی سے بیعت تھا۔ سلسلۂ طریقت میں وہ شیخ محمد معصوم کے نامور بیٹے شیخ سیف الدین سرہندی کے حلقے میں داخل تھا اور اپنے والد سلطان شاہ جہان کے حکم سے شیخ موصوف کے ساتھ کامل وابستگی اختیار کر لی تھی۔

شجاعت اور بہادری:

تیمور کے خون میں شجاعت اور بہادری کے جوہر تلاش کرنے نکلیں تو اس کے اثرات ہر مقام پر نمایاں نظر آئیں گے اور معلوم ہوگا کہ بابر سے شاہ جہان تک ہر شخص جواں مردی کا مرقع اور بسالت کا پیکر ہے۔ لیکن تاریخ کے اوراق سے واقعات کی تہوں کو کھولا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ علامہ شبلی کے بقول عالم گیر اس خاندانی ''وراثت کا سب سے بڑا حصے دار ہے۔'' اکبر مست ہاتھیوں کو عین حالت لڑائی میں سونڈ سے پکڑ کر ایک دوسرے سے پیچھے ہٹا دیتا تھا۔ شاہ جہان نے زمانہ شہزادگی میں تلوار کی ضرب سے شیر کے ٹکڑے کر دیے تھے، لیکن عالم گیر کی شجاعت کے خدوخال اس سے بھی نمایاں تر ہیں۔ وہ صرف چودہ برس کا بچہ تھا کہ ایک موقعے پر اس کا باپ شاہ جہان ہاتھیوں کی لڑائی کے تماشے سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اچانک ایک ہاتھی عالم غیظ وغضب میں فوج پر ٹوٹ پڑا اور آناً فاناً میدان صاف ہوگیا۔ لیکن چودہ سالہ عالم گیر پہاڑ کی طرح اپنی جگہ کھڑا رہا اور ہاتھی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے گتھم گتھا ہو گیا۔ ہاتھی نے غضب ناک ہو کر اس کے گھوڑے کو سونڈ میں پکڑ کر دور پھینک دیا۔ عالم گیر دھڑام سے زمین پر گرا۔ اس کی رگ شجاعت جوش میں آئی، نہایت غصے سے اٹھا اور پورے زور سے آگے بڑھ کر ہاتھی پر تلوار کی ایسی شدید ضرب لگائی کہ ہاتھی زخمی ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ شاہ جہان خرو سال بیٹے اور مست ہاتھی کا یہ معرکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ ہاتھی پیچھے ہٹا تو شہزادے کو بلا کر سینے سے لپٹا لیا اور اس پر موتی اور جواہر نچھاور کیے ❶۔ مورخین نے اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ دربار شاہ جہانی کا ملک الشعرا ابو طالب کلیم بھی اس موقعے پر موجود تھا۔ اس نے یہ سارا واقعہ نظم کر دیا ہے۔

پہلی باقاعدہ معرکہ آرائی:

اورنگ زیب کی پہلی باقاعدہ معرکہ آرائی بندھیل کھنڈ کے راجا ججھر سنگھ سے ہوئی۔ یہ راجا ایک عرصے سے حکومت کے خلاف سرگرم عمل تھا۔ جب اس کی دست درازیاں حد سے بڑھ گئیں اور سخت باغیانہ رویہ اختیار کر لیا تو شاہ جہان نے اس کی سرکوبی کا منصوبہ بنایا۔ اس وقت اورنگ زیب کی عمر اٹھارہ سال کے قریب تھی۔ بادشاہ نے اس اہم فوجی خدمت کے لیے اس کا انتخاب کیا اور ۱۶۳۵ء میں نوجوان شہزادے کی سرکردگی میں راجا مذکور کی سرزنش کے لیے ایک لشکر روانہ کیا۔ اورنگ زیب کچھ عرصہ اس مہم میں مصروف عمل رہا اور بہت سے جنگی کارنامے انجام دیے۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور شہزادے کے مناصب میں اضافہ کیا۔

دکن کی صوبے داری:

اورنگ زیب بندھیل کھنڈ کی مہم سے فارغ ہوا تو ۳ ذوالحجہ ۱۰۴۵ھ (۲۹ اپریل ۱۶۳۶ء) کو اسے دکن کی صوبے داری پر مامور کیا گیا۔ دکن کے حالات انتہائی خراب تھے اور ان کے درپے اصلاح ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ اورنگ زیب آٹھ سال اس نواح میں مقیم رہا اور وہاں کے سیاسی اور فوجی معاملات کو درست کرنے میں نہایت سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ آٹھ سال کے اس طویل عرصے میں وہ صرف چار مرتبہ دہلی آیا۔ پہلی مرتبہ یکم ذوالحجہ ۱۰۴۶ھ (۱۶/ اپریل ۱۶۳۷ء) کو شادی کے لیے، دوسری مرتبہ ۱۵ رمضان ۱۰۴۹ھ (۳۰ دسمبر ۱۶۳۹ء) کو باپ کی زیارت اور ملاقات کے لیے، تیسری مرتبہ ۱۹ ذوالحجہ ۱۰۵۱ھ (۱۱ مارچ ۱۶۴۲ء) کو۔ اس موقعے پر بھی اس کی آمد کا مقصد شہنشاہ کی زیارت اور سلام تھا۔ چوتھی مرتبہ وہ ۱۵ ربیع الاول ۱۰۵۴ھ (۱۲ مئی ۱۶۴۴ء) کو دہلی آیا۔ اس دفعہ وہ اپنی بہن جہاں آرا بیگم کی عیادت کے لیے آیا تھا جو شاہ جہان کی سترھویں سالگرہ (۲۷ محرم ۱۰۵۴ھ۔ ۲۶ مارچ ۱۶۴۴ء) کے موقعے پر کپڑوں میں آگ لگنے سے جھلس گئی تھی۔ اورنگ زیب کا اس مرتبہ شاندار استقبال کیا گیا اور اسے بے حد اعزاز و احترام کا مستحق گردانا گیا۔

❶ یہ واقعہ تاریخ کی مختلف کتابوں میں مرقوم ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شاہ جہان کی خفگی اور صلح:

لیکن اورنگ زیب کو دہلی آئے ابھی بیس پچیس روز ہوئے تھے کہ شاہ جہان کسی بات پر اس سے ناراض ہوگیا اور یہ ناراضی یہاں تک بڑھی کہ بادشاہ نے دربار شاہی میں اس کی آمد و رفت بند کردی، اس کے احکام پر عمل درآمد روک دیا گیا اور اسے دکن کی نظامت سے علیحدہ کردیا گیا۔ اگرچہ مورخین نے شہنشاہ کے اس بہت بڑے اقدام کی مختلف وجوہ بیان کی ہیں، لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ دکن میں عالم گیر نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے تھے، ان سے اس کے حاسدوں کے دل میں ایک جلن پیدا ہوگئی تھی اور وہ شاہ زادے کی مخالفت پر اتر آئے تھے اور اس کے خلاف شہنشاہ کے کان بھرتے رہتے تھے۔ حکمران چوں کہ اس قسم کی باتیں سننے اور ان پر اعتماد کرنے کے عام طور پر عادی ہوتے ہیں، لہٰذا مخالفین اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور بادشاہ کو لائق بیٹے کی مخالفت پر کمربستہ کردیا۔

اس شکر رنجی میں تقریباً پانچ ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ سات ماہ بعد جہاں آرا بیگم کو افاقہ ہوا تو اس نے غسل صحت کیا اور اس پُرمسرت موقعے پر دربار میں ایک جشن منانے کا اہتمام کیا گیا۔ اب شاہ جہان کے دل میں شفقت پدری نے جوش مارا اور جہاں آرا کو عالم گیر کے پاس بھیجا۔ اس کی تقصیر معاف ہوئی۔ باپ بیٹے میں دوبارہ مصالحت کی فضا پیدا ہوئی۔ شہزادے پر جو پابندیاں عائد کی گئی تھیں وہ اٹھالی گئیں۔ منصب میں اضافہ کیا گیا اور بیٹے کو خلعتِ شاہانہ سے سرفراز فرمایا گیا۔

یہ باپ اور بیٹے کے درمیان پہلی شکر رنجی تھی۔ مستقبل میں جو واقعات رونما ہوئے ان سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں اصل ہاتھ داراشکوہ کا تھا۔

گجرات کی نظامت:

اب عالم گیر کو دوبارہ دکن کی نظامت تو نہ مل سکی، البتہ ۲۹ ذوالحجہ ۱۰۵۴ھ (۱۶ فروری ۱۶۴۵ء) کو گجرات کی زمامِ نظامت عطا کی گئی۔

گجرات بعض اعتبارات سے بڑا اہم علاقہ تھا۔ تجارت وصنعت اور زرخیزی وسرسبزی میں بڑا مشہور تھا۔ اس کے علاوہ اس میں ہندوؤں کی آبادی بہت زیادہ تھی۔ کاٹھیاواڑ، احمد آباد اور سومنات جیسے اہم مقامات اس میں واقع تھے۔ جب اورنگ زیب عالم گیر کو اس کی نظامت تفویض ہوئی، یہ علاقہ لوٹ مار، قتل وغارت اور سلب ونہب کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ اس کی اصلاح کرنا اور انتہائی بگڑے ہوئے حالات کو درست کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ لیکن عالم گیر اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر اس میں بھی کامیاب رہا۔ اس نے ذہانت اور جرات سے کام لے کر پورے علاقے میں پھیلی ہوئی بدنظمی کو ختم کردیا اور اس نواح کے فسادیوں، چوروں اور لٹیروں کو اس

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طرح محاصرے کی زنجیر میں جکڑا اور اس طرح ان کا چاروں طرف سے تعاقب کیا کہ وہ قطعی طور سے بے بس اور مغلوب ہو گئے اور نتیجتاً پورے صوبے میں امن و امان کا شامیانہ تن گیا۔

بلخ و بدخشاں کی مہم:

یہ وہ وقت تھا جب عالم گیر سخت آزمائش کے دور سے گزر رہا تھا۔ بادشاہ اس کے کام میں بار بار روکاوٹیں ڈالتا اور مختلف طریقوں سے اس کی اصلاح احوال کی مساعی میں سدِّ راہ ہوتا تھا۔ چنانچہ نظامت گجرات کے سلسلے میں بھی یہی ہوا، اسے یہاں کی عنانِ اختیار ہاتھ میں لیے دو سال بھی نہیں ہوئے تھے اور اس کی اصلاحی کوششیں ابھی کامیابی سے ہم کنار ہونے ہی لگی تھیں کہ ۳ شعبان ۱۰۵۶ھ (۴ ستمبر ۱۶۴۶ء) کو شاہ جہان کا حکم موصول ہوا کہ گجرات کی نظامت حاکم مالوہ شائستہ خاں کے سپرد کر کے فوراً لاہور پہنچو، تمھیں اب بلخ اور بدخشاں کی مہم پر بھیجنا مقصود ہے۔

یہ وہ علاقہ تھا، جہاں شہزادہ مراد بخش کی سرکردگی میں پچاس ہزار فوج روانہ کی گئی تھی، لیکن اس علاقے اور اس کے ماحول سے وہ جلد ہی اکتا گیا تھا اور بلا اجازت واپس آ کر شہنشاہ کو استعفا پیش کر دیا تھا۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ بلخ، بخارا اور بدخشاں مغلوں کے ممالک محروسہ میں شامل نہ تھے، لیکن کسی زمانے میں یہ علاقے امیر تیمور کی مملکت کا حصہ رہ چکے تھے، اس لیے ہندوستان کے مغل حکمرانوں کی یہ شدید خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح ان علاقوں کو زیرِ نگیں کیا جائے۔ شاہ جہان کے زمانے میں اس خواہش کی تکمیل کے لیے حالات سازگار ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بلخ و بخارا وغیرہ کا اصل حاکم جس کا نام امام قلی خاں تھا، ایک نیک خصال شخص تھا۔ وہ بتیس برس حکومت کرنے کے بعد مدینہ منورہ چلا گیا تھا۔ اس کی جگہ اس کا بھائی نذر محمد خاں حکمرانی کے فرائض انجام دیتا تھا۔ لیکن اپریل ۱۶۴۵ء میں نذر محمد خاں اور اس کے بیٹے عبدالعزیز خاں کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے تھے جس کے نتیجے میں عبدالعزیز نے باپ کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا تھا۔ نذر محمد خاں بیٹے کے مقابلے میں بے بس ہو گیا تو شاہ جہان سے خط کے ذریعے اس علاقے پر حملہ آور ہونے اور مداخلت کرنے کی استدعا کی۔ شاہ جہان نے جو ایک عرصے سے موقعے کی تاک میں بیٹھا تھا، پہلے تو جون ۱۶۴۶ء میں مراد بخش اور علی مردان خاں کو اور پھر ۱۵ محرم ۱۰۵۷ھ (۱۰ فروری ۱۶۴۷ء) میں اورنگ زیب عالم گیر کو اس مہم پر روانہ کیا۔ اورنگ زیب نے پچیس ہزار فوج لے کر لاہور سے کوچ کیا اور ایک مہینے میں (۱۴ صفر ۱۰۵۷ھ/۱۲ مارچ ۱۶۴۷ء) کو پشاور پہنچا۔ پشاور سے چل کر وہ کابل میں اترا۔ یہ فاصلہ بھی تقریباً ایک مہینے میں طے ہوا۔ وہ کابل سے آگے بڑھا اور ازبکوں کو شکست دیتا ہوا بلخ جا پہنچا۔

اس جنگ میں اورنگ زیب نے نہایت بہادری کا مظاہرہ کیا۔ ثابت قدمی اور دلیری اس کا بہت بڑا وصف تھا، جو اس جنگ میں بھی نمایاں نظر آتا تھا۔ تاریخ نے جو واقعات اس ضمن میں بہم پہنچائے ہیں، ان میں

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک واقعہ خاص طور سے قابل ذکر ہے اور یہی واقعہ ہے، جس نے لڑائی کا فیصلہ کر دیا۔ عین اس وقت جب کہ معرکۂ کارزار گرم تھا، نماز کا وقت آ گیا۔ عالم گیر ہر صورت میں نماز ادا کرنا چاہتا تھا، لیکن جو امرائے جنگ اس کے ہم رکاب تھے، انھوں نے روکنے کی کوشش کی اور اپنے عظیم جرنیل کو لڑائی کے مہیب خطرات سے آگاہ کیا، لیکن اس نے کسی کی ایک نہ مانی۔ وہ فریضہ نماز ادا کرنے کے لیے گھوڑے سے اترا اور پورے اطمینان کے ساتھ نماز ادا کی۔ اس کے مدمقابل عبدالعزیز خاں والی بخارا کو اس واقعہ کا علم ہوا تو بے ساختہ پکار اٹھا ؎

با چنیں کسے در افتادن بر افتادن است [1]

(ایسے شخص سے لڑنا اپنے آپ کو تباہی میں ڈالنا ہے۔)

یہ کہہ کر اس نے لڑائی بند کرنے کا اعلان کر دیا اور صلح کی پیش کش کی، چنانچہ شاہ جہان کے مشورے سے جو اس زمانے میں کابل میں بیٹھا محاذ جنگ کی نگرانی کر رہا تھا، رمضان ۱۰۵۷ھ (اکتوبر ۱۶۴۷ء) میں عبدالعزیز خاں سے صلح کر لی گئی ____ اورنگ زیب کے بعض نقاد مورخ جو یہ کہا کرتے ہیں کہ اس نے باپ کی اسارت کے جرم اور بھائیوں کے قتل کے فعلِ قبیح کو چھپانے کے لیے اپنے ''معصیت آلود چہرے'' پر نیکی اور خدمت دین کا خول چڑھا لیا تھا، یہ واقعہ ان کی تردید کے لیے کافی ہے۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اورنگ زیب عالم گیر نے تقویٰ اور تدین کی راہ صرف تخت حکومت پر متمکن ہونے کے بعد ہی اختیار نہیں کی، وہ زمانہ شاہ زادگی میں بھی جب کہ فرماں روائی کی منزل بہت دور تھی، نہایت متدین، نیک کردار اور پابند احکامِ شرع تھا۔ اور یہ واقعہ اس کی بین دلیل ہے

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اورنگ زیب اس صلح سے مطمئن نہیں تھا، وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا لیکن شاہ جہان کی مداخلت اور حکم سے اسے مجبوراً وہیں گھوڑے کی لگا میں کھینچنا اور قدم روکنا پڑے۔

ملتان کی ولایت اور قندھار کی مہم:

بلخ اور بدخشاں کی مہم سے واپسی کے بعد ۲۹ صفر ۱۰۵۸ھ (۱۵؍ مارچ ۱۶۴۸ء) میں عالم گیر کو ملتان کا والی مقرر کیا گیا۔ اس سے کچھ عرصہ بعد ۱۸ محرم ۱۰۵۹ھ (۲۲ جنوری ۱۶۴۹ء) میں قندھار کی پہلی مہم تفویض کی گئی۔ آگے چلنے سے پہلے قندھار کے بارے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ ۱۵۹۵ء میں اسے جلال الدین اکبر نے فتح کر کے اسے مغلیہ سلطنت میں شامل کیا تھا لیکن ۱۶۲۲ء میں صفویوں نے اسے مغلوں کے قبضے سے آزاد کرا لیا تھا۔ ۱۶۳۸ء میں علی مراد خاں کی ہمت و مدد سے پھر مغلوں کے تسلط میں آ گیا۔ اس کے بعد عباس شاہ صفوی دوم نے اس پر دوبارہ قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ شاہ جہان کو اس کی اطلاع پہنچی تو اس نے عالم گیر کے نام حکم جاری کیا کہ اس کو اور سعد اللہ خاں کو قندھار کی مہم تفویض کی گئی ہے۔ چنانچہ یہ دونوں اس فوجی خدمت کی انجام دہی

[1] مآثر عالم گیری: ص ۵۳۱

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے لیے روانہ ہوئے۔ مگر ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی صفوی فوج نے قندھار پر قبضہ کرلیا تھا تاہم عالم گیر اور سعد اللہ خاں نے پیش قدمی جاری رکھی اور قندھار کا محاصرہ کرلیا۔ کئی مہینے کے بعد محاصرہ اٹھانا پڑا اور عالم گیر واپس ملتان آ گیا۔

کچھ عرصے کے بعد عالم گیر کو دوبارہ قندھار کی مہم پر جانے کا حکم ہوا۔ اس نے جاتے ہی شہر کا محاصرہ کرلیا۔ اس اثنا میں خود شاہ جہان بھی کابل پہنچ گیا تھا۔ تین مہینے محاصرہ جاری رہا، لیکن شاہ جہان چوں کہ عالم گیر سے ناخوش تھا اس لیے اس کے کام میں برابر مداخلت کرتا اور غیر جنگی نوعیت کی ہدایات دیتا رہا۔ یہ ہدایات اور مشورے وہ اپنے نامور وزیر سعد اللہ خاں کے ذریعے جاری کرتا تھا۔ جنگی وسائل کی کمی کے باعث یہ محاصرہ بھی بادشاہ کے حکم سے اٹھالیا گیا۔ عالم گیر نے قندھار فتح کرنے کے لیے شہنشاہ سے ایک اور موقع ملنے کی درخواست کی لیکن یہ درخواست ٹھکرادی گئی۔ اس دوران داراشکوہ بھی برابر بادشاہ کو عالم گیر کے خلاف برانگیختہ کرتا رہا۔ اب قندھار کی تیسری مہم کا آغاز داراشکوہ کی کمان میں ہوا۔ کئی مہینے شہر کا محاصرہ جاری رہا۔ لیکن اس میں بھی ناکامی ہوئی۔

یہ واقعات بہت سی تفصیلات و جزئیات اپنے دامن میں لیے ہوئے ہیں، جنھیں ہم اپنے موضوع سے خارج قرار دے کر قلم زد کرتے ہیں۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ عالم گیر چار سال کے لگ بھگ ملتان کا اور ڈھائی سال تک ملتان اور سندھ دونوں کا والی رہا۔ درمیان میں اگرچہ دو مرتبہ وہ قندھار کی مہم پر بھی گیا لیکن اپنے دور ولایت میں ان علاقوں میں اس نے بہت سی اصلاحات نافذ کیں۔ اس عرصے میں مرکزی حکومت کی طرف سے نہ اسے کوئی قابل ذکر مدد ملی اور نہ کسی موقعے پر اس کی قدر افزائی ہوئی بلکہ ہر معاملے میں حوصلہ شکنی کی گئی اور اس کے راستے میں مشکلات کے کانٹے بچھائے گئے۔ مخالفوں نے بہت سی غلط باتوں کو اس کے دامن میں ٹانکنے کی کوشش کی مثلاً یہ کہ اس نے بعض لوگوں کے گھروں کو آگ لگا کر تباہ کر دیا ہے۔ ساحل سمندر پر اپنا ایک تجارتی جہاز تیار کرلیا ہے جس کو اپنی ذاتی آمدنی کا ذریعہ بنا رکھا ہے اور یہ کہ وہ مرکز سے رابطہ توڑنا چاہتا ہے۔ لیکن اس مرد مجاہد نے کسی بات کی پروا نہیں کی اور محدود وسائل کے باوجود برابر اپنے علاقوں کی ترقی کے لیے کوشاں رہا۔ شاہ جہان نے بھی اس کو تلخ اور سخت خط تحریر کیے اور اس کے ترقیاتی منصوبوں میں قدم قدم پر رکاوٹیں ڈالیں، مگر اس لائق اور باہمت بیٹے نے شہنشاہ کو ہر خط کا توازن اور ادب سے جواب دیا اور اس کے قلم اور زبان نے کبھی حد اعتدال سے باہر قدم نہیں رکھا۔

ان تمام معاملات میں اس کا اصل مخالف بڑا بھائی داراشکوہ تھا جو ہر وقت بادشاہ سے اس کے خلاف غلط سلط باتیں کرتا رہتا تھا۔ ادھر بادشاہ کی حالت یہ تھی کہ وہ بے شک بڑا فہیم، جری اور نیک تھا لیکن عالم گیر کے متعلق داراشکوہ کی ہر بات کو صحیح قرار دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں وہ عدل وقسط کے تقاضوں سے گویا محروم ہو چکا تھا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسری دفعہ نظامت دکن:

اسی اثنا میں عالم گیر کو دوسری دفعہ دکن کی نظامت پر مامور کیا گیا۔ بادشاہ کی طرف سے تاکید کی گئی تھی کہ وہ فوراً ملتان سے دکن پہنچے۔ یہ حکم اس کو ماہ شعبان ۱۰۶۲ھ (جولائی ۱۶۵۲ء) میں موصول ہوا جس کی رو سے اس نے ۱۲ رمضان (۷ اگست) کو بادشاہ کی خدمت میں حاضری دی اور ۲۲ رمضان (۱۷ اگست) کو عازم دکن ہوا۔ ۹ ستمبر کو دریائے سندھ عبور کیا۔ ۱۷ نومبر کو دہلی سے گزرا۔ ۲۸ نومبر کو آگرے پہنچا۔ اس طرح ۱۵ ربیع الاول ۱۰۶۲ھ (۱۵ر فروری ۱۶۵۲ء) کو اس نے برہان پور میں پڑاؤ کیا۔ اس کو کثرت باراں کا نتیجہ قرار دیجیے یا عالم گیر کی سست رفتاری سے تعبیر کیجیے۔ بہر حال یہ واقعہ ہے کہ یہ سفر اس نے تقریباً آٹھ مہینے میں طے کیا۔

اس طویل سفر کے دوران کچھ ایسے واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے عالم گیر کا کردار بادشاہ کی نظر میں مشکوک قرار پا گیا۔ ان میں ایک واقعہ یہ ہوا کہ جب عالم گیر آگرے سے گزر رہا تھا تو اس کی ملاقات اپنے بڑے بھائی شجاع سے ہوئی۔ قندھار کی تگ وتاز کے زمانے میں شجاع کو بھی دکن سے بلایا گیا تھا، لیکن دارا شکوہ نے کچھ ایسا طرز عمل اختیار کیا کہ وہ آگرے سے آگے نہیں جا سکا تھا۔ اس بات کا اسے شدید احساس تھا۔ مستقبل میں جو واقعات رونما ہوئے، ان کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ ملاقات بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ اس میں دونوں بھائیوں نے آئندہ کے لیے آپس میں دوستی کا پیمان باندھا ہوگا۔ غالباً اس کو مزید پختہ کرنے کی غرض سے عالم گیر کے بیٹے سلطان محمد کی شجاع کی بیٹی سے نسبت بھی قرار پا گئی۔ دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ جب عالم گیر برہان پور پہنچا تو وہاں اپنے خالو سیف الدین کے ہاں مقیم ہوا۔ اس بہانے وہاں ہیرا بائی نامی ایک خاتون سے شادی کی جو بعد میں زین آبادی محل کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ وہ واقعات تھے جو شاہ جہان کو سخت ناگوار گزرے۔ چنانچہ ان کے بارے میں اس سے جواب طلبی ہوئی۔ بیٹے نے باپ کو سب باتوں کا تفصیل سے جواب دیا اور تلخی احوال کے باوجود دکن کی عنانِ نظامت ہاتھ میں لی۔

دکن کے سیاسی، انتظامی اور اقتصادی حالات نہایت ابتر تھے اور عالم گیر ہر گوشے کی اصلاح کرنا چاہتا تھا، لیکن دارا شکوہ نے اس کے خلاف جو سازشوں کا جال بچھا رکھا تھا، وہ قدم قدم پر اس کے راستے میں زبردست رکاوٹ ثابت ہو رہا تھا۔ اسی وجہ سے شاہ جہان بار بار اس کو آگے بڑھنے سے روکتا تھا۔ تعجب یہ ہے کہ جو احکام خود جاری کرتا تھا، انھی پر عمل نہیں ہونے دیتا تھا۔ دکن کی ریاستیں سرکشی پر اتر آئی تھیں اور عالم گیر کے نزدیک ان کا سر کچلنا ضروری تھا۔ عالم گیر چاہتا تھا کہ دکن کے شرپسند عناصر کو اتنی سخت سزا دی جائے کہ وہ دوبارہ سر نہ اٹھا سکیں۔ لیکن شاہ جہان کی طرف سے ایسے حالات پیدا کر دیے گئے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا اور یہ ریاستیں دہلی کی مرکزی حکومت کے زیر نگیں نہ آ سکیں۔ عالم گیر کو اپنے اس مقصد میں کامیاب نہ ہونے کا شدید احساس اور بے حد افسوس تھا۔ اس سلسلے میں اپنے بعض خطوط میں جو اس نے بادشاہ اور جہاں

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آرا بیگم کے نام لکھے، اس بات کا شکوہ بھی کیا ہے۔

اسی اثنا میں ۷ ذیقعدہ ۱۰۶۷ھ/ ۲۷ راگست ۱۶۵۷ء کو شاہ جہان سخت بیمار ہو گیا اور اس کے چاروں بیٹوں، داراشکوہ، شجاع، اورنگ زیب عالم گیر اور مراد بخش کے درمیان وراثت تخت کے سلسلے میں شدید تصادم کی فضا پیدا ہو گئی۔

داراشکوہ کا کردار اور بھائیوں کا ردعمل:

داراشکوہ مذہب اور عقیدے میں عام مسلمانوں سے بہت حد تک مختلف تصورات کا حامل تھا۔ وہ اگر چہ علومِ اسلامی سے آگاہ اور فنونِ مروجہ سے بہرہ ور تھا، تاہم اس کے افکار و رجحانات شرعی احکام سے ہم آہنگ نہ تھے اور وہ عملی اور ذہنی اعتبار سے سخت انتشار اور تضادات کا شکار تھا۔ اس کے نزدیک قرآنِ مجید اور بھگوت گیتا میں کوئی فرق نہ تھا۔ ایک اپنشد کا بھی اس نے سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ بزرگانِ دین کے حالات میں بھی اس نے سفینۃ الاولیا اور سکینۃ الاولیا کے نام سے کتابیں تصنیف کیں۔ ایک طرف وہ حضرت میاں میر رحمہ اللہ سے تعلق ارادت رکھتا تھا تو دوسری جانب ہندو جوگی لال داس کے حلقۂ عقیدت سے بھی وابستہ تھا۔ یعنی مسلمان صوفیا اور ہندو جوگی دونوں عبادت اور بھگتی میں اس کے نزدیک یکساں درجہ رکھتے تھے۔

داراشکوہ کے ان عقائد و نظریات کی بنا پر علمائے دین اور متبعین شریعت اسے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے اور حکومت کے دروبست پر اس کے تسلط سے انھیں سخت اختلاف تھا۔ لیکن حیرت انگیز تعجب کی بات ہے کہ شاہ جہان فہیم و فریس اور متبع سنت ہونے کے باوجود ملکی معاملات میں اسی کی رائے کو لائق اعتنا اور قابل عمل قرار دیتا تھا۔ شاہ جہان کے ایام مرض میں بھی یہی ہوا۔ شاہ جہان حبس بول کے عارضے میں مبتلا ہو کر کاروبارِ حکومت چلانے کے قابل نہ رہا تو داراشکوہ نے موقع مناسب پا کر عنانِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

شاہ جہان کی بیماری کی خبر نہایت تیزی کے ساتھ پورے ملک میں پھیل گئی تھی، بلکہ بعض مقامات میں اس کی موت کی افواہ بھی گردش کرنے لگی تھی۔ اس قسم کی افواہوں کے پھیلنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ داراشکوہ نے باپ کے واقعۂ مرض کو خفیہ رکھنے کی کوشش کی اور ملک کے انتظام و انصرام پر خود قابض ہو گیا۔ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ دکن، گجرات اور بنگال کے تمام راستے بند کر دیے اور مختلف اہم ٹھکانوں پر سخت پہرے بٹھا دیے تا کہ نہ کوئی راز کی خبر باہر جا سکے اور نہ مراد بخش، شجاع اور اورنگ زیب میں سے کوئی بھائی دہلی کی طرف کوچ کر سکے۔ ان کے جو وکلا و سفرا دربار میں متعین تھے، ان سے بھی ضمانت لی کہ وہ دربار کی کوئی خبر انھیں نہ بھیجیں گے۔ بعض کے گھر بار بھی لوٹ لیے۔ ایک اقدام اس نے یہ کیا کہ مراد بخش اور اورنگ زیب میں اختلاف پیدا کرنے کی غرض سے برار کا وہ علاقہ جو اورنگ زیب کی ولایت دکن میں شامل تھا، مراد کو دے دیا اور قاسم خاں اور جودھ پور کے راجا جسونت سنگھ کو فوج کی بھاری جمعیت کے ساتھ مالوہ کی طرف روانہ کیا۔ ان واقعات سے جو شاہ جہان کی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بیماری کے فوراً بعد رونما ہوئے، داراشکوہ کی طرف سے بھائیوں کے دلوں میں کئی قسم کے شبہات پیدا ہو گئے اور انھوں نے شدید ردعمل کا اظہار کیا۔

شجاع اس زمانے میں بنگال میں مقیم تھا۔ اس نے راج محل کے مقام پر ''ابوالفوز ناصرالدین محمد تیمور ثالث، سکندر ثانی، شاہ شجاع غازی'' کا لقب اختیار کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ داراشکوہ نے باپ کو زہر دے دیا ہے اس لیے وہ بڑے بھائی سے لڑنے کے لیے عازم آگرہ ہوا۔ ۲۴ ربیع الثانی ۱۰۶۸ھ (۱۹ جنوری ۱۶۵۸ء) کو وہ بنارس کے قریب پہنچا۔ یہاں بہادر پور کے نواح میں شاہی فوج سے جس کی کمان سلیمان شکوہ اور جے سنگھ کر رہے تھے، اس کا مقابلہ ہوا، اور شکست کھائی۔ یہ واقعہ ۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۰۶۸ھ (۱۶ فروری ۱۶۵۸ء) کو پیش آیا۔

مراد بخش ان دنوں گجرات میں تھا۔ اس نے احمد آباد کو دارالحکومت قرار دے کر مروّج الدین کے لقب سے گجرات میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور غازی مراد بخش کے نام سے اپنا الگ سکہ بھی جاری کر لیا، نیز داراشکوہ کو ایک تہدید آمیز خط لکھا اور لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس کی فوجی طاقت چوں کہ کم تھی اس لیے دکن میں اورنگ زیب عالم گیر کو مسلسل اور متعدد خطوط لکھے جن میں امداد اور اتحاد کی التجا کی۔

سلطنت مغلیہ کے لیے یہ انتہائی نازک وقت تھا۔ اورنگ زیب عالم گیر ان دنوں دکن میں مقیم تھا اور نہایت تذبذب اور تحیر کی کیفیت اس پر طاری تھی۔ وہ بے حد محتاط اور گہرا آدمی تھا، اس لیے عجلت میں کوئی قدم اٹھانا اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ یہ البتہ اسے یقین تھا کہ بادشاہ فوت نہیں ہوا زندہ ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ بادشاہ کو اس معاملے میں داراشکوہ کی حمایت نہیں کرنی چاہیے اور جو زیادتیاں وہ کر رہا ہے اس کا بہر حال ازالہ ہونا چاہیے لیکن افسوس ہے اس کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی اور چند روز میں شاہی فوجیں مالوہ کے علاقے میں گھس گئیں۔ ان فوجیوں کا ارادہ پہلے مراد بخش کو شکست دینے اور اس کے بعد دکن پہنچ کر اورنگ زیب عالم گیر سے نبرد آزما ہونے کا تھا۔ اورنگ زیب عالم گیر نے جب یہ دیکھا کہ حالات بگڑ رہے ہیں اور مراد بھی اس سے طلب امداد کے لیے انتہائی مضطرب ہے تو اس نے مراد کی درخواست قبول کر لی اور اپنی فوج کو آگرے کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔ اورنگ زیب کا لشکر دریائے نربدا عبور کر کے آگے بڑھا تو اجین کے مقام پر مراد کی فوجیں بھی اس سے آملیں۔ راجا جسونت سنگھ کو جب اس کا پتا چلا تو اس نے بھی اپنی فوجوں کو حرکت دی اور عالم گیر کے پڑاؤ سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر خیمہ گاڑ دیا۔ اورنگ زیب نے شاہی فوج کے سپہ سالار کو یہ پیغام بھیجا کہ ہمارا مقصد لڑائی کا بازار گرم کرنا نہیں ہے، ہم اپنے باپ شہنشاہ ہند سے ملنے اور ان کی عیادت کے لیے آگرے جانا چاہتے ہیں، لہٰذا ہمارا راستہ نہ روکو اور اپنا سفر جاری رکھنے دو۔ لیکن جسونت سنگھ نے عالم گیر کی یہ بات ماننے سے انکار کر دیا اور سپری ندی کے گھاٹوں کی ناکہ بندی کر کے سخت پہرے بٹھا دیے تاکہ عالم گیر اور مراد کی فوجیں ندی عبور نہ کر سکیں۔ عالم گیر نے اس موقعے پر نہایت تحمل کا ثبوت دیا اور پہرے داروں سے متصادم

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہونے سے گریز کرتے ہوئے بندھیلہ سرداروں کی مدد سے چند میل کا چکر کاٹ کرندی کو عبور کیا۔ یہ صورت حال جسونت سنگھ اور شاہی فوجوں کو سخت ناگوار گزری اور دھرمٹ کے مقام پر دونوں جانب کی فوجوں کے درمیان شدید جنگ ہوئی جس میں عالم گیر اور مراد فتح یاب ہوئے اور شاہی فوج کو کامل ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے بہت سے سردار اور سپاہی مارے گئے اور قاسم خاں اور جسونت سنگھ نے میدان جنگ سے فرار ہو کر جان بچائی۔ عالم گیر نے اس فتح کی یادگار کے طور پر اسی میدان میں ایک قصبہ آباد کیا جو فتح آباد کے نام سے مشہور ہوا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ راجا جسونت سنگھ جب عالم گیر کی فوج سے شکست کھانے کے بعد بھاگ کر وطن پہنچا تو اس کی بیوی نے اس کو اپنے قریب آنے سے سختی کے ساتھ روک دیا اور پھر تمام عمر اس سے ہم بستر نہیں ہوئی۔ اس نے اپنے شوہر راجا جسونت سنگھ سے صاف لفظوں سے کہا کہ میدان جنگ میں پیٹھ دکھا کر بھاگنے والا میرے ہم صحبت ہونے کے قابل نہیں رہا[1]۔

جنگ کے اس نتیجے سے آگرے میں سخت اضطراب اور ہیجان پیدا ہو گیا اور شاہی حلقوں میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ شاہ جہان آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے دہلی جا رہا تھا کہ اس غیر متوقع خبر سے رک گیا۔ اب اس نے بھائیوں کے درمیان صلح کرانے اور ان کی دشمنی کو ختم کرانے کی کوشش کی، لیکن دارا کی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ دارا اپنی شکست فاش سے پریشان ضرور تھا لیکن صلح ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ مراد اور عالم گیر کی افواجِ قاہرہ اب تیزی کے ساتھ آگرے کی طرف بڑھ رہی تھیں اور دارا ان کے ساتھ فیصلہ کن لڑائی کی تیاری کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ حریف کی فوجوں پر ضرور فتح پائے گا۔ چنانچہ شاہ جہان کی شدید مخالفت کے باوجود وہ ایک لاکھ سپاہ کی معیت میں آگرے سے نکلا اور مخالفوں کو میدان جنگ میں شکست دینے کا عزم لے کر روانہ ہوا۔

ادھر عالم گیر اور مراد بھی اپنی جاں باز اور آزمودہ کار فوج کے ساتھ دارالسلطنت آگرے کی طرف بڑھ رہے تھے اور دریائے چنبل عبور کر چکے تھے۔ مئی کا مہینا تپ رہا تھا۔ گرمی شباب پر تھی کہ دارا شکوہ کی فوج نے آگرے سے روانہ ہو کر ساموگڑھ کے مقام میں پڑاؤ کیا جو آگرے سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ۲۶ شعبان ۱۰۶۸ھ (۱۹ مئی ۱۶۵۸ء) کو فریقین کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے میں اتریں اور زبردست لڑائی ہوئی۔ یہ لڑائی واقعی فیصلہ کن ثابت ہوئی اور دارا کو اس میں شکست فاش سے دوچار ہونا پڑا۔

یہاں اس لڑائی کی تاریخ کا یہ بیان لائق تذکرہ ہے کہ مراد نے اس معرکے میں نہایت ثابت قدمی سے حصہ لیا اور جرات و دلیری کا پورا ثبوت دیا۔ اس کے ہاتھی کا ہودہ تیروں سے چھلنی ہو گیا اور وہ خود لہولہان ہو گیا۔ لیکن پہاڑ کی طرح ڈٹا رہا اور برابر دشمن پر تیر برساتا رہا۔ یہ ہودہ فرخ سیر کے زمانے تک یادگار کے طور پر قلعے میں محفوظ رہا۔ جب سادات بارہ کی سرکشی حد سے بڑھی تو عالم گیر کی بہن بادشاہ بیگم نے یہ ہودہ دکھلا کر

[1] منتخب اللباب: ج ۲ ص ۴۲

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہا کہ یہ تیموری نسل کی یادگاریں ہیں ❶۔

دارا شکوہ ساموگڑھ کے میدان میں شکست کھانے کے بعد آگرے کی طرف بھاگا اور شرم کے مارے شاہ جہان کے پاس نہیں گیا۔ شاہ جہان نے ضروری مشوروں کے لیے اسے بار بار بلایا لیکن وہ باپ سے ملے اور مشورہ کیے بغیر اسی رات اہل وعیال کے ساتھ آگرے سے نکلا اور لاہور کے ارادے سے دہلی روانہ ہوگیا۔

بعد کے مختصر حالات:

یہ دنیا دارالمکافات ہے۔ یہاں ہر نیکی کی جزا اور ہر برائی کی سزا ملنی ضروری ہے۔ یہ ایک عالم گیر اور دائمی اصول ہے کہ خیر کا صلہ ثواب کی صورت میں اور معصیت کا بدلہ عقاب کی شکل میں ظہور میں آتا ہے۔ اس اصول میں تقدیم یا تاخیر تو ہوسکتی ہے لیکن یہ ختم بالکل نہیں ہوسکتا۔ اورنگ زیب اور دارا شکوہ یا اورنگ زیب اور شاہ جہان کے سلسلے میں یہی اصول رونما ہوا۔ قدرت کی کرشمہ سازیاں دیکھیے کہ وہی اورنگ زیب جس کے لیے کل دارالسلطنت کے دروازے بند تھے، آج وہی اورنگ سلطنت کا مالک بنا۔ اور اس دارا شکوہ کے لیے جو باپ کو بے بس کر کے مملکت کے سیاہ سفید پر قابض تھا، آگرے کے دارالحکومت میں ایک رات گزارنا بھی ناممکن ہوگیا۔ وہ پہلے دہلی گیا۔ وہاں سے پنجاب کا رخ کیا اور لاہور سے ملتان اور ملتان سے سندھ ہوتا ہوا گجرات کی طرف بھاگا۔ اس کے تعاقب میں خود اورنگ زیب بھی پنجاب گیا اور اسے کبھی چین کا موقع نصیب نہ ہوا۔

جس زمانے میں دارا شکوہ گجرات پہنچا، اس زمانے میں وہاں کا والی شاہ نواز خاں تھا، اس کی بیٹی دلرس بانو اورنگ زیب کے عقد میں تھی۔ ساموگڑھ کی لڑائی کے بعد اورنگ زیب عالم گیر نے سسر کو نظر بند کر دیا تھا کیوں کہ اس کی ہمدردیاں فریق مخالف کے ساتھ تھیں، لیکن بعد میں حالات اعتدال پر آئے تو اس کو گجرات کا ناظم مقرر کر دیا گیا۔ اب دارا شکوہ گجرات پہنچا تو شاہ نواز خاں نے دارا کی حمایت اور اورنگ زیب کی مخالفت شروع کر دی۔ اسی اثنا میں راجا جسونت سنگھ نے جو اس سے قبل دھرمٹ کے میدان میں اورنگ زیب اور مراد سے بری طرح ہزیمت اٹھا چکا تھا دارا کو اجمیر آنے کی دعوت دی اور راجستھان کے راجپوتوں کی مدد کا یقین دلایا۔ اس سے دارا کی حوصلہ افزائی ہوئی اور اس نے اجمیر کا عزم کیا۔ ادھر اورنگ زیب کو صورت حال کا علم ہوا تو وہ بھی ۲۷ جمادی الاخری ۱۰۶۹ھ (۱۱ مارچ ۱۶۵۹ء) کو ایک لشکر کے ساتھ اجمیر کے قریب پہنچ گیا۔ دونوں فریقوں کے درمیان اجمیر کے نواح میں دیواری کے مقام پر گھمسان کا رن پڑا۔ تین دن لڑائی جاری رہی۔ نتیجتاً دارا کو پھر شکست فاش سے دوچار ہونا پڑا۔ اس لڑائی میں شاہ نواز خاں بھی شریک تھا جو میدان جنگ میں مارا گیا۔ دارا نے وہاں سے پھر راہِ فرار اختیار کی مگر چند روز بعد اورنگ زیب دہلی واپس آگیا۔

اس لڑائی میں ہزیمت اٹھانے کے بعد دارا شکوہ سندھ کے راستے عازم ایران ہونا چاہتا تھا تاکہ

❶ اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر: ص ۷۹

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہمایوں کی طرح ایران کی مدد سے دوبارہ حصول سلطنت کی کوشش کی جائے۔ اس منصوبے کے تحت وہ بنوں کے قریب پہنچا تھا کہ ایک بلوچ سردار ملک جیون نے پکڑ کر اسے شاہی حکام کے حوالے دیا۔ یہ واقعہ ۱۲ شوال ۱۰۶۹ھ (۳ جون ۱۶۵۹ء) کو پیش آیا۔ بنوں سے ۲۰ ذوالحجہ ۱۰۶۹ھ (۲۹ اگست ۱۶۵۹ء) کو اسے دہلی لایا گیا۔ اس کے عقائد کی بنا پر علما نے اس پر کفر و الحاد کا فتویٰ جاری کیا، جس کی پاداش میں اگلے روز ۲۱ ذوالحجہ ۱۰۶۹ھ (۳۰/ اگست ۱۶۵۹ء) کو اسے قتل کر دیا گیا۔

یہ تو تھا دارا شکوہ کا انجام۔ اب مراد بخش کے بارے میں سنیے اس پر کیا بیتی۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا دارا شکوہ نے دارالسلطنت میں بیٹھ کر جو طرز عمل اختیار کیا تھا اس پر سب بھائی نالاں تھے۔ مراد بخش نے گجرات میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا اور اپنے نام کا سکہ اور خطبہ بھی جاری کر دیا تھا۔ اس نے اورنگ زیب عالم گیر سے جوان دنوں دکن کا والی تھا آگرے کی طرف کوچ کرنے کی غرض سے خط و کتابت بھی کی تھی اور اسی کی تحریک اور پیہم درخواستوں کی بنا پر اورنگ زیب نے آگرے کا قصد کیا تھا۔ اورنگ زیب نے مراد کے قصد آگرہ کی درخواست قبول کرتے ہوئے اسے یہ عہد نامہ لکھ کر دیا تھا کہ اگر وہ (اورنگ زیب عالم گیر) حصول سلطنت میں کامیاب ہو گیا اور مراد بخش آخر وقت تک وفادار رہا تو اسے کابل، کشمیر، شمالی پنجاب اور سندھ کے علاقے دے دیے جائیں گے۔ بلاشبہ مراد بڑا بہادر اور جری تھا اور دھرمت اور ساموگڑھ میں نہایت شجاعت اور جواں مردی سے لڑا تھا، لیکن طبیعت کا تیز اور عجلت پسند تھا۔ مے نوش اور عیاش تھا۔ معرکہ ساموگڑھ کے بعد جب زمام سلطنت عالم گیر کے ہاتھ میں آئی تو مراد نے بہت ہی عجلت پسندی کا ثبوت دیا اور در پردہ عالم گیر کی مخالفت کرنے لگا۔ خفیہ طور پر شاہ جہان سے خط و کتابت شروع کر دی۔ ساتھ ہی اورنگ زیب عالم گیر کے امرائے سلطنت کو لالچ دے کر اپنی حمایت پر کمر بستہ کرنے کی مہم کا آغاز کر دیا، نیز اورنگ زیب کو وہ وعدے یاد دلائے جو اس کے ساتھ کیے گئے تھے۔ اورنگ زیب نے اسے ہر چند سمجھایا کہ ابھی حالات اعتدال پر نہیں آئے لڑائی اختتام کو نہیں پہنچی اور کش مکش کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن اس نے ایک نہ مانی اور عالم گیر کو برابر پریشان کرتا رہا۔ آخر تنگ آ کر اسے گرفتار کر لیا گیا۔ پہلے سلیم گڑھ میں اور بعد کو گوالیار کے قلعے میں محبوس کر دیا گیا اور وہیں ۲۱/ ربیع الاول ۱۰۷۲ھ (۴/ دسمبر ۱۶۶۱ء) کو شاہی دیوان علی قلی خاں کے قصاص میں اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا۔

باقی رہا تیسرا بھائی شجاع، تو اس نے حالات کی ابتری سے فائدہ اٹھانے کے لیے بنگال سے تازہ دم فوج کے ساتھ آگرے کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ عالم گیر ان دنوں دارا شکوہ کے تعاقب میں پنجاب میں سرگرم عمل تھا۔ اسے شجاع کے ارادوں کی اطلاع پہنچی تو فوراً پیچھے مڑا اور الہ آباد کے قریب جا کر پڑاؤ کیا۔ ادھر شجاع بھی اپنی فوجوں کے ہم رکاب وہاں پہنچ چکا تھا۔ دونوں کے درمیان الہ آباد کے جوار میں کھجوہ کے مقام پر لڑائی کا آغاز ہوا اور ۱۰ ربیع الثانی ۱۰۶۹ھ (۲۶/ دسمبر ۱۶۵۸ء) کو شجاع نے عالم گیر کے ہاتھوں بری طرح

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شکست کھائی اور راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوا۔ وہ بے شمار ساز وسامان اور اسلحہ جنگ کے ساتھ حملہ آور ہوا تھا، سب وہیں چھوڑ گیا۔ میر جملہ اور عالم گیر کا بیٹا شہزادہ سلطان محمد اس کے تعاقب میں گئے لیکن سلطان محمد سے شجاع کی بیٹی منسوب تھی لہٰذا وہ چچا کے ساتھ جا ملا۔ اس کے نتیجے میں وہ سزاوار عتاب قرار پایا اور گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ میر جملہ نے انتہائی شجاعت کا ثبوت دیا اور شجاع کو بنگال سے نکال کر دم لیا۔ شجاع نے بنگال سے نکل کر پہلے تو آسام کے راجا کے ہاں پناہ لی، پھر اس سے مخالفت ہوگئی تو ارکان بھاگ گیا۔ بعد ازاں غالباً جنوری ۱۶۶۱ء میں وہاں کے پہاڑی قبائلیوں کے ہاتھوں مارا گیا❶۔

شاہ جہان کا طرزِ عمل اور عالم گیر کی اطاعت شعاری:

شاہ جہان کے چار بیٹے تھے داراشکوہ، شجاع، اورنگ زیب عالم گیر اور مراد بخش۔ اورنگ زیب بہ ترتیب عمر چاروں بھائیوں میں تیسرے درجے پر تھا، لیکن قابلیت واستعداد، بہادری، جواں مردی، دور اندیشی، جفاکشی، علم وعرفان، مردم شناسی، کردار کی پختگی، بلند حوصلگی اور انتظامی نقطۂ نظر سے سب سے فائق تر تھا۔ اس نے ملک کے دور دراز علاقوں میں نظم ونسق کی عظیم ذمہ داریوں پر فائز رہ کر وسیع تجربات حاصل کر لیے تھے اور ایام شہزادگی ہی میں منجھے ہوئے سیاست دانوں اور باتدبیر حکمرانوں کے تمام اسالیب فکر کو اپنا لیا تھا۔ وہ انتہائی ٹھنڈے دل ودماغ کا مالک، متحمل مزاج اور محتاط حکمران تھا۔ جذبات کو قابو رکھنا اور دل کی بات کسی کو نہ بتانا اس کی سب سے بڑی خوبی تھی۔ اس کی ذہنی اور فکری استعداد اس درجہ تیز تھی کہ ایسے تمام معاملات کو نہایت عجلت سے حیطۂ فہم میں لے آتا جو حصولِ مقاصد میں اس کے لیے مفید ہو سکتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ جب شاہ جہان اپنے چاروں بیٹوں کے بارے میں سوچتا تو ہر پہلو سے عالم گیر ہی کو ان پر ترجیح دیتا اور اس کے عزم وحزم اور گوناگوں صلاحیتوں کا صاف الفاظ میں اعتراف کرتا وہ خوب جانتا تھا کہ اس کا کون بیٹا کس درجے کا ہے۔

شاہ جہان آئندہ کاروبارِ حکومت کے سلسلے میں بہت فکر مند رہتا تھا اور بعض مقربین خاص سے اس کا ذکر بھی کرتا چنانچہ ایک مرتبہ اس نے علی مردان خاں اور اپنے وزیر اعظم سعد اللہ خاں کو خلوت میں بلایا اور خاص طور سے اس موضوع پر گفتگو کی۔ ان سے کہا کہ میں اس معاملے میں بڑا فکر مند ہوں۔ آپ اللہ کے لیے فقرا و صلحا کے ساتھ مل کر دعا کریں کہ ہماری مملکت کا مستقبل بہتر ہو اور میرے بیٹوں کو بارگاہ خداوندی سے عمل خیر کی توفیق نصیب ہو۔ اس کا ذکر خود عالم گیر نے اپنے ایک خط میں کیا ہے جو اس نے اپنے ایک بیٹے کے نام لکھا۔ آگے چل کر وہ اس نتیجے کا ذکر کرتا ہے، جس پر شاہ جہان اپنے بیٹوں کے بارے میں پہنچا تھا اور جس کا تذکرہ اس نے خود علی مردان خاں اور سعد اللہ خاں سے ان الفاظ میں کیا۔

❶ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ۔ مقالہ ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالم گیر۔ از شیر محمد گریوال: ج ۱۸، ص ۷۵۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بعضے اوقات اندیشہ خاطر راہ می یابد کہ مہین پور خلافت اگر چہ اسباب شان وشوکت وسامان تجمل و صولت ہمہ دارد لیکن عدو نیکوان و دوستِ بداں واقع شدہ۔شجاع غیراز سیر چشمی وصفے نہ دارد و مراد بخش مجہول الکیفیت بہ اکل وشرب ساختہ دائم الخمراست،مگر فلانی این عاجز فانی ذی عزم ومآل اندیش بہ نظرمی آید اغلب کہ متحمل امر خطیر ریاست تواند شد ❶۔

(یعنی بعض دفعہ میرے دل میں یہ خطرات پیدا ہوتے ہیں کہ داراشکوہ اگر چہ حکومت کے آداب شان وشوکت اور اصول تجمل وتہور سے آگاہ ہے،لیکن اس میں یہ برائی راسخ ہو چکی ہے کہ نیک لوگوں کا دشمن اور بدکردار لوگوں کا دوست ہے۔شجاع سیر چشمی کے علاوہ کسی وصف سے بہرہ ور نہیں۔مراد بخش ہر معاملے کی کیفیت سے محروم اور ہر آن کھانے پینے میں مگن اور ہر وقت شراب نوشی میں مشغول رہتا ہے۔بعد ازاں اس عاجز فانی (اورنگ زیب عالم گیر) کا نام لے کر کہا کہ وہ صاحب عزم اور دور اندیش ہے۔مجھے یقین ہے وہ حکومت کے اس بار گراں کا متحمل ہوگا۔)

بہر حال شاہ جہان ایک مردم شناس بادشاہ تھا اور اورنگ زیب کو ''ذی عزم ومآل اندیش'' سمجھتا تھا۔ لیکن افسوس ہے،بقول شیخ محمد اکرام ''اپنی حکومت کے آخری پندرہ بیس سالوں میں اس نے اورنگ زیب سے کوئی قدر دانی کا برتاؤ نہیں کیا ❷۔'' اس زمانے کے احکام وخطوط پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ اورنگ زیب کے بارے میں باپ کا طرز عمل نہ صرف پدرانہ شفقت ومحبت سے خالی تھا بلکہ سراسر معاندانہ تھا۔چھوٹی چھوٹی باتوں پر اس سے باز پرس کی جاتی۔اسے امرا کے سامنے ڈانٹ دیا جاتا اور اس کے لائق فخر کارناموں کو بھی ناقابل تعریف قرار دیا جاتا۔یہاں تک کہ مغلیہ سلطنت کی توسیع اور ملک میں امن وامان قائم رکھنے کے لیے گولکنڈہ اور بیجاپور وغیرہ میں اس نے خود بادشاہ کے حکم سے جو نمایاں کارنامے انجام دینا شروع کیے،ان میں رکاوٹ ڈالی گئی اور دوسروں کی نظر میں اسے لائق ملامت بلکہ ذلیل ٹھہرایا گیا۔

یہ سلسلہ یہاں تک دراز ہوا کہ ساموگڑھ کی لڑائی کے بعد جو واقعات پیش آئے،ان میں بھی اورنگ زیب عالم گیر کے بارے میں شاہ جہان کا طرز عمل بڑا حیران کن بلکہ افسوس ناک رہا۔شاہ جہان قلعہ آگرہ میں بیمار پڑا تھا اور نہایت تکلیف کی زندگی بسر کر رہا تھا۔داراشکوہ نے اس کو عضو معطل قرار دے کر معاملاتِ سلطنت سے الگ کر دیا تھا۔شاہ جہان کے بار بار روکنے اور یقین دلانے کے باوصف کہ تم عالم گیر کے مقابلے میں نہ نکلو میں خود جا کر حالات پر قابو پالوں گا،دارا نے اس کی ایک نہ مانی۔اب ساموگڑھ میں عالم گیر کو فتح حاصل ہوئی اور اس نے ہندوستان کی وسیع مملکت کے دروبست پر قبضہ کیا تو شاہ جہان نے مبارک باد کا پیغام بھیجا اور ایک مرصع تلوار بھیجی جس پر عالم گیر کا خطاب کندہ تھا۔اس نے بیٹے سے ملاقات کے اشتیاق کا اظہار بھی کیا اور قلعے

❶ رقعات عالم گیری: ص ۱۹، ۲۰۔

❷ رود کوثر: ص ۴۵۴ـ۴۵۵۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں آنے کی دعوت دی۔ عالم گیر کی بہن جہاں آرا بیگم بھی آئی جو عالم گیر کی شدید مخالف اور دارا کی حامی تھی۔ عالم گیر نے اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ اس نے بھی بھائی کو باپ سے ملاقات کے لیے مجبور کیا۔ عالم گیر کا دل صاف اور ضمیر مطمئن تھا۔ لہٰذا باپ کی خدمت میں حاضر ہونے اور ملاقات وسلام کے لیے تیار ہوگیا۔ اس کے امراو مقربین نے اس کو روکا اور ممکنہ خطرات سے آگاہ کیا تو وہ سوچنے لگا۔ اس سے آگے واقعات عالم گیری کا مصنف عاقل خاں جو امرائے عالم گیری میں سے تھا، جن الفاظ میں شاہ جہان کے اصل ارادوں کی وضاحت کرتا ہے، وہ بڑے افسوس ناک ہیں۔ ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ شاہ جہان ملاقات کے بہانے عالم گیر کو گرفتار کر کے داراشکوہ کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ عاقل خاں کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے۔

''عین اس وقت کہ عالم گیر خیر خواہانِ دولت کی باتیں سن کر سوچ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ اچانک ناہر دل خاں چیلہ پہنچا۔ شاہ جہان نے خود اپنے ہاتھ سے داراشکوہ کے نام خط لکھ کر بڑی احتیاط سے اس کے حوالے کیا تھا کہ کسی کو اس کی خبر نہ ہونے پائے اور وہ یلغار کرتا ہوا دہلی پہنچ کر داراشکوہ سے اس کا جواب لائے۔ خط کا مضمون یہ تھا کہ تم (داراشکوہ) مطمئن ہو کر دہلی میں ٹھہرو، آگے نہ جاؤ، ہم یہیں تمام قصے کا فیصلہ کیے دیتے ہیں۔

اس کے اصل الفاظ یہ ہیں:

داراشکوہ خاطر خود را جمع کردہ در شاہ جہان آباد ثبات قدم ورزد واز آں جا پیشتر نہ گزرد کہ ما دریں جا مہم را فیصل می فرمائیم۔

عاقل خاں اس سے آگے لکھتا ہے:

ایں فرمان مصدق ومصداق قول خیر خواہاں آمدہ۔

(یعنی داراشکوہ کے نام شاہ جہان کے اس خط نے اورنگ زیب عالم گیر کے بہی خواہوں کی بات کی حرف بحرف تصدیق کر دی۔)

ماٗثر الامرا کے مصنف نے یہ واقعہ بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ناہر دل خاں چیلہ نے جو خط عالم گیر کی خدمت میں پیش کیا، اس میں شاہ جہان نے داراشکوہ کو جو الفاظ لکھے تھے ان کا مطلب یہ تھا کہ

مضمون آں کہ او لشکر با فراہم آوردہ در دہلی ثبات قدم ورزد، ما دریں جا مہم را فیصل می فرمائیم [1]۔

(یعنی مضمون خط یہ تھا کہ وہ (داراشکوہ) اپنی فوج کے ساتھ دہلی میں قیام کرے، ہم اس مہم کا یہیں (آگرہ میں) فیصلہ کر دیں گے۔)

اتفاق سے جنگ کے ان ایام میں ایک یورپی مورخ ڈاکٹر برنیر ہندوستان میں موجود تھا اور تمام

[1] ماٗثر الامرا: ج ۲ ص ۲۹۷

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

واقعات اس کی آنکھوں کے سامنے رونما ہوئے تھے۔ اپنے سفرنامے میں اس نے تفصیل سے ان واقعات کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر برنیر کا پیرایۂ بیان اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ وہ عالم گیر کا مخالف تھا، لیکن اس کے قلم نے بعض مقامات پر اصل حقائق کی بھی نشان دہی کر دی ہے۔ علامہ شبلی کے الفاظ میں ''اس کے بیان سے اجمال کی گرہ کھل جاتی ہے'' وہ لکھتا ہے:

شاہ جہان نے ایک معتبر خواجہ سرا کو اورنگ زیب کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ بے شک دارا شکوہ نے جو کچھ کیا نامناسب تھا (اس سے آگے) اس کی بے سمجھی اور نالائقی کی باتیں یاد دلا کر کہا کہ ''تم پر تو ہم ابتدا ہی سے دلی شفقت رکھتے تھے۔ پس تم کو ہمارے پاس جلد آنا چاہیے تاکہ ہمارے مشورے سے ان امور کا انتظام کیا جائے جو افراتفری کے باعث خراب اور ابتر پڑے ہیں۔'' لیکن اس محتاط شہزادے (عالم گیر) نے بدگمانی سے بادشاہ پر اعتماد کر کے قلعے میں جانے کی دلیری نہ کی، کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ بیگم صاحبہ (یعنی عالم گیر کی بہن جہاں آرا بیگم) کسی وقت بادشاہ سے جدا نہیں ہوتی۔ وہ اس کے مزاج پر اس قدر حاوی ہے کہ جو کچھ چاہتی ہے وہی ہوتا ہے، اور یہ پیغام اس کا ایک چکمہ ہے۔ اس نے تاتاری عورتوں میں سے جو محل سرا کے چوکی پہرے پر متعین رہتی ہیں، کچھ قوی ہیکل اور مضبوط مسلح عورتیں اسی مقصد کے لیے مقرر کر رکھی ہیں کہ جب عالم گیر قلعے میں داخل ہو تو فوراً اس پر ٹوٹ پڑیں ❶۔

لین پول لکھتا ہے:

اس جال میں جو شاہ جہان نے اپنے بیٹے کے پھانسنے کے لیے بچھایا، خود شاہ جہان ہی اس میں پھنس گیا ❷۔

بہرحال شاہ جہان نے مملکت ہند کی کئی اہم شخصیتوں کے نام عالم گیر کو دام تزویر میں پھانسنے کے لیے لکھا، ایک خط مہابت خاں کے نام بھی تحریر کیا جو اس زمانے کا نامور سپہ سالار تھا اور کابل میں مقیم تھا۔ لیکن عالم گیر کا رویہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر تفصیل سے بات کرنا چاہتا تھا اور اگر اس کی غلطی ثابت ہو جائے تو عفو و درگزر کا متمنی تھا۔ مگر شاہ جہان کی تمام تر ہمدردیاں اب بھی دارا سے وابستہ تھیں۔ اس کی اصل وجہ جہاں آرا بیگم تھی، جو شاہ جہاں کو سب سے زیادہ عزیز تھی اور وہ دارا کی زبردست حامی تھی۔ شاہ جہان نے عالم گیر کے خلاف شجاع کو بھی ہندی زبان میں ایک خفیہ خط لکھا اور برابر کوشاں رہا کہ کسی طرح عالم گیر کی فتح شکست میں بدل جائے اور دارا تخت حکومت پر متمکن ہو جائے۔ جب عالم گیر باپ سے بالکل مایوس ہو گیا تو قلعہ آگرہ پر پہرہ بٹھا دیا گیا۔ بہ الفاظ دیگر یہ شاہ جہان کی تخت ہند سے معزولی کا اعلان تھا۔

عالم گیر کا حوصلہ اور دل گردہ دیکھیے کہ شاہ جہان کی مخالفانہ سرگرمیوں کے باوجود اپنے بیٹے شہزادہ محمد

---

❶ سفرنامہ ڈاکٹر برنیر اردو ترجمہ: ج ۱، ص ۱۱۴۔

❷ ترجمہ لین پول، ص ۴۵

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اعظم کو شاہ جہان کی خدمت میں عفو تقصیر کے لیے بھیجا اور پانچ سو اشرفیاں اور چار ہزار روپے نذر کیے۔ بعد ازاں باپ کے لیے قلعے میں ہر قسم کے آرام و راحت کے سامان مہیا کر دیے۔ ڈاکٹر برنیر بھی عالم گیر کا سخت مخالف ہونے کے باوصف صاف لفظوں میں اس کی شہادت دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

غرضیکہ اورنگ زیب کا برتاؤ شاہ جہان کے ساتھ مہربانی اور ادب سے خالی نہ تھا۔ وہ حتیٰ الامکان اپنے بوڑھے باپ کی ہر طرح سے خاطر داری کرتا اور نہایت کثرت سے اس کی خدمت میں تحفے تحائف بھیجتا رہتا۔ سلطنت کے اہم معاملات میں اس کی رائے اور مشورے مثل پیر و مرشد کی ہدایت کے طلب کرتا۔ اس کے عریضوں سے جو اکثر باپ کو لکھا کرتا تھا، ادب اور فرماں برداری ظاہر ہوتی ہے۔ عالم گیر کے اس طرز عمل سے شاہ جہان کی گردن کشی اور اس کا غصہ یہاں تک ٹھنڈا پڑ گیا کہ وہ معاملات سلطنت میں بیٹے کو ضروری باتیں تحریر کرنے لگا، بلکہ اپنے باغی فرزند کی سب گستاخانہ حرکتیں معاف کر کے اس کے حق میں دعائے خیر بھی کی ❶۔

بہر کیف شاہ جہان کی معزولی اور قلعہ آگرہ پر پہرہ بٹھانے کے بعد بھی اورنگ زیب عالم گیر ہمیشہ باپ کا اطاعت شعار رہا اور اس کے ساتھ نہایت مؤدبانہ سلوک روا رکھا۔

شاہ جہان نیک اور باعمل بادشاہ تھا اور بدو شعور ہی سے علما کی صحبت و رفاقت میں رہنے کا عادی تھا، قلعہ آگرہ میں بھی اس نے اس روایت کو قائم رکھا۔ یہاں اس نے دیار ہند کے بہت بڑے عالم و فاضل اور فقیہ نام دار سید محمد قنوجی (متوفی ۱۱۰۱ھ/۱۶۹۰ء) کو اپنے پاس بلایا، تاکہ علوم و معارف میں اس سے بحث و مذاکرے کا سلسلہ جاری رہے اور بوقت ضرورت مسائل دینی میں ان سے رجوع کیا جائے۔ وہ شاہ جہان کی وفات تک اس کے ساتھ رہے۔ تجہیز و تکفین اور نماز جنازہ کے انتظامات میں بھی وہ باقاعدہ شامل تھے۔ مسائل فقہیہ میں وہ اس درجے کے صاحب فضل و کمال تھے کہ عالم گیر نے فتاویٰ عالم گیری کے مدونین کی عالی قدر جماعت میں ان کو شریک کیا۔

www.KitaboSunnat.com

اورنگ زیب کی تخت نشینی:

گزشتہ سطور میں ساموگڑھ کی لڑائی کے بعد اورنگ زیب عالم گیر کی تخت نشینی کے واقعہ کو وہیں چھوڑ کر پہلے اختصار کے ساتھ اس کے بھائیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مجملاً شاہ جہان کے کردار کی وضاحت کی گئی ہے۔ اب اس کی تخت نشینی اور بعد کے ضروری وقائع و حالات بیان کیے جاتے ہیں

اورنگ زیب یکم ذی قعدہ ۱۰۶۸ھ (۲۳ جولائی ۱۶۵۸ء) کو باغ اغر آباد (دہلی) میں جو بعد کو شالا مار باغ کہلایا، جمعہ کے دن تخت ہند پر متمکن ہوا۔ اس وقت اس کی عمر چالیس برس کی تھی۔ فرہنگ رشیدی کے مصنف سید عبدالرشید نے قرآن مجید کی اس آیت مبارکہ سے تاریخ نکالی

---

❶ ترجمہ سفرنامہ ڈاکٹر برنیر، ج۱، ص ۲۸۹۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔

ملا شاہ نے ''ظل الحق'' سے تاریخ نکال کر یہ رباعی کہی۔

صحنِ دلِ من چوں گلِ خورشید شگفت
حق ظاہر شد غبار باطل رارفت
تاریخ جلوس شاہ حق آگہ را
''ظل الحق'' گفت الحق ایں را حق گفت

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ تخت نشینی کے موقعے پر ایک صاحب نے نو شعر کہے، ان کے ہر مصرعے سے ۱۰۶۸ھ کے عدد نکلتے تھے ❶۔

تخت نشینی میں علمائے کرام کا حصہ:

اورنگ زیب عالم گیر دین دار بادشاہ تھا۔ علما و مشائخ کا قدر دان تھا۔ ان کی صحبت میں بیٹھتا اور ان سے شرعی مسائل دریافت کرتا تھا۔ اس کے برعکس بڑے بھائی دارا شکوہ کی دینی اور مذہبی حالت نہایت قابل اعتراض اور احکام اسلام کے منافی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اورنگ زیب کی تخت نشینی میں علما و مشائخ نے اہم کردار ادا کیا اور پوری کوشش کی کہ یہی شخص آئندہ ہندوستان کی مسند حکومت پر متمکن ہو۔ چنانچہ نواب سعد اللہ خاں نے بھی جو شاہ جہان کے بہ درجہ غایت معتمد علیہ وزیر اعظم، انتہائی فہیم اور بہت بڑے عالم دین تھے، کئی دفعہ دربار میں شاہ جہان اور سب امرائے سلطنت کے سامنے اورنگ زیب کی حمایت کی، اس سلسلے میں دارا شکوہ ان پر ناراض بھی ہوا، لیکن انھوں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی۔ جب نواب سعد اللہ خاں نے ۲۶ جمادی الاخری ۱۰۶۶ھ/ ۱۱ر اپریل ۱۶۵۶ء کو وفات پائی تو بعض لوگوں نے دارا شکوہ پر یہ الزام عائد کیا تھا کہ اس نے ان کو زہر دے دیا ہے۔

تخت نشینی کے بعد اورنگ زیب نے حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے دونوں صاحب زادوں خواجہ محمد معصوم اور شیخ محمد سعید کو دربار شاہی میں تشریف لانے کی دعوت دی تھی، جو انھوں نے قبول فرمائی تھی۔ اس کے بعد بھی وہ کئی بار اس کے دربار میں گئے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے چھوٹے صاحب زادے شیخ محمد یحییٰ سے بھی عالم گیر نے ملاقات کی۔ شیخ محمد معصوم کے صاحب زادے شیخ سیف الدین سرہندی سے بھی اورنگ زیب عالم گیر عقیدت رکھتا تھا۔ ایک روایت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ اورنگ زیب کے زمانہ شاہ زادگی میں خواجہ محمد معصوم کے صاحب زادے خواجہ محمد اشرف اور بھتیجے شیخ سعد الدین اس کے پاس دکن میں مقیم تھے اور جب وہ دارا شکوہ کے مقابلے کو نکلا تو خواجہ محمد اشرف اس کی فوج میں شریک تھے۔ خواجہ محمد معصوم حج کو گئے تو

❶ ماہ نامہ ''المعارف'' لاہور، مارچ ۱۹۶۸ء: ص ۷

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مدینہ منورہ میں اورنگ زیب کی کامیابی کی دعا کی۔ پھر انھوں نے ایک مکتوب میں اس کو جہاد کا مشورہ بھی دیا تھا اور لکھا تھا کہ اللہ کی راہ میں ایک گھڑی کا جہاد حرم مکہ میں حجر اسود کے پاس لیلۃ القدر کے قیام سے افضل ہے۔

بہر حال اس بات کے متعدد ثبوت ملتے ہیں کہ خواجہ محمد معصوم نے اورنگ زیب کو جہاد کی تلقین کی اور اس کی مجاہدانہ سرگرمیوں پر خوشی کا اظہار فرمایا۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ اورنگ زیب ان کا بے حد معتقد تھا اور اس خاندان کے تمام حضرات سے دلی عقیدت رکھتا تھا۔

دیار ہند کے مشہور محدث شیخ طاہر پٹنی کے پوتے شیخ عبدالوہاب نے فتویٰ جاری کیا تھا کہ شاہ جہان مرض اور ضعف کی وجہ سے امور سلطنت انجام دینے سے معذور ہو گیا ہے، لہٰذا دار الحکومت پر اورنگ زیب کی فوج کشی شرعاً جائز ہے۔

قصور کے افغانوں نے شیخ آدم کے خلیفہ عبدالخالق کی خدمت میں اورنگ زیب عالم گیر کی کامیابی کے لیے دعا کی درخواست کی۔ پھر یہ بھی منقول ہے کہ اس سے پہلے شیخ آدم بنوری نے اپنی وفات سے قبل اپنے مریدوں کو اورنگ زیب کی حمایت کرنے کی نصیحت فرمائی تھی۔ یہ بھی تذکروں میں مرقوم ہے کہ شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کے اخلاف میں سے شیخ الاسلام خواجہ عابد نے جن کا شمار ماوراء النہر کے جید علما میں ہوتا تھا، اورنگ زیب کی حمایت کی تھی اور وہ دارا کے خلاف لڑائی میں شریک تھے

گزارش کا مقصد یہ ہے کہ اس زمانے کے علما و مشائخ داراشکوہ کے سخت مخالف تھے اور اس کے مذہبی رجحانات کی شدت سے نکیر کرتے تھے۔ اس کے مقابلے میں وہ اورنگ زیب عالم گیر کے پورے زور اور دلائل سے حامی تھے۔ لہٰذا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اورنگ زیب عالم گیر کو تاج شہنشاہی پہنانے میں ہندوستانی علما و مشائخ نے بھرپور حصہ لیا[1]۔

نظم و نسق اور اصلاحات کا نفاذ:

اورنگ زیب عالم گیر کا دور حکمرانی بڑا طویل ہے۔ اس نے قمری حساب سے ہندوستان پر پچاس سال دو ماہ اور ستائیس دن حکومت کی۔ مورخین ہند نے اس کے پچاس سالہ دور حکومت کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے پچیس سال ہندوستان کے مختلف علاقوں کی بغاوتیں فرو کرنے اور اصلاحات کے نفاذ میں گزرے۔ آخری پچیس سال دکن کے حالات کی اصلاح اور وہاں کے بگڑے ہوئے نظم و نسق کو بہتر بنانے میں صرف ہوئے[2]۔

عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اس نے ہندوستان کے تمام صوبوں اور علاقوں کے ذمہ دارانہ

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے ماہ نامہ ''المعارف'' بابت ماہ اگست ۱۹۶۸ء: ص ۲۲ تا ۲۹۔ مضمون ''اورنگ زیب کی تخت نشینی میں علما و مشائخ کا کردار'' از پروفیسر محمد اسلم۔

[2] مقالہ محی الدین محمد اورنگ زیب عالم گیر: ص ۵۷۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، از شیر محمد گریوال۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مناصب پر بہترین صلاحیتوں کے حامل افراد مقرر کیے اور انھیں ہر لحاظ سے مستعد اور چوکس رہنے کی ہدایات جاری کیں۔ دکن کا عہدۂ نظامت شائستہ خاں کے سپرد کیا گیا اور بنگال کی صوبے داری میر جملہ کے حوالے کی گئی۔ ان دونوں کا شمار نہایت قابل اور منتظم امرائے مملکت میں ہوتا تھا اور جن علاقوں کے نظم و نسق پر انھیں مامور کیا گیا، وہ بھی بے حد اہمیت کے علاقے تھے۔

بنگال میں شجاع کا اثر و رسوخ کار فرما تھا، وہاں کا وہ والی رہ چکا تھا اور باپ کے ایام مرض میں اس نے وہاں اپنی بادشاہت کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ اسی لیے عالم گیر نے میر جملہ کو بنگال کا ناظم مقرر کر کے شجاع کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ وہ اتنا بہادر جرنیل ثابت ہوا کہ شجاع کو دھکیلتا کوچ بہار کی ریاست میں داخل ہو گیا۔ وہاں کے راجا نے مغل شہزادوں کی باہمی جنگ کے زمانے میں بغاوت کر کے ملک کے مشرقی علاقوں میں قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا تھا۔ میر جملہ نے اس فتنے کو پوری قوت سے دبایا اور کوچ بہار کا مضبوط قلعہ اس سے چھین لیا۔ اس موقعے پر میر جملہ کے نامور ساتھی قاضی سید صادق نے راجا کے محل کی چھت پر چڑھ کر بلند آواز سے اذان دی۔ راجا نے نہایت سراسیمگی کی حالت میں وہاں سے راہِ فرار اختیار کی اور بھوٹان میں جا کر پناہ لی۔ میر جملہ نے پیش قدمی جاری رکھی اور دریائے برہم پتر عبور کر کے آسام کا علاقہ فتح کیا اور اسے پہلی مرتبہ مغل حکومت کا باج گزار بنایا۔ وہ بے حد دلیر اور جفاکش جرنیل تھا اور ہندوستان کی منتہائے حد سے آگے نکل کر چین تک تگ و تاز کرنے کا خواہاں تھا، لیکن موسمی اور جغرافیائی حالات نے اس کا راستہ روک لیا۔ وہ کوچ بہار کے راجا سے وفاداری کا عہد و پیمان لے کر اور بہت سے علاقے فتح کر کے جہاں گیر نگر (ڈھاکہ) کی طرف واپس آ رہا تھا کہ ۳۱ مارچ ۱۶۶۳ء کو خضر پور کے مقام پر وفات پا گیا۔

اس کے بعد بنگال کا ناظم شائستہ خاں کو مقرر کیا گیا۔ یہ بھی بڑا لائق، منتظم اور مشہور جنگ جو تھا۔ اس نے بہت سے باغیوں اور سرکشوں کا مقابلہ کیا اور ان کی اکڑی ہوئی گردنوں کو جھکنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے زمانے میں مخالفین حکومت سے کئی دریائی معرکے بھی ہوئے اور یہ سب میں کامیاب رہا۔ چٹا گانگ کے مضبوط و مستحکم قلعوں پر بھی اس کے دور نظامت میں مغل شہنشاہیت کے جھنڈے لہرائے گئے۔ اس نے بنگال کی شورشوں کو ختم کرنے اور انتظامی امور کو درست کرنے کے علاوہ بہت بڑا کام یہ کیا کہ اس علاقے میں متعدد مسجدیں تعمیر کرائیں، دینی مدارس قائم کیے، پل بنوائے، آمد و رفت کے لیے شاہ راہوں کا انتظام کیا اور مختلف مقامات پر سرائیں تعمیر کرائیں۔ پھر اس زمانے میں عام استعمال کی چیزوں کے نرخ بڑھ رہے تھے، ان کی قیمتوں پر کنٹرول کیا۔ غرض شائستہ خاں کا دور نظامت اہل بنگال کے لیے خوش حالی، سکون اور ارزانی کا دور تھا۔

اسی زمانے میں ملک کے دوسرے سرے پر علاقہ کشمیر کے ناظم حکومت نے مشرق کی طرف فوج کشی کی اور لداخ، تبت اور بلتستان کے سرحدی علاقے زیر نگیں کیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وادیٔ کشمیر بیرونی حدیں پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہو گئیں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بعض قبائل کی شورشوں کا انسداد:

عالم گیر امن پسند بادشاہ تھا اور پورے ملک کو دارالامن بنا دینے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔ دور دراز کے علاقوں پر بھی وہ پوری نظر رکھتا تھا۔ ملک کے کسی حصے میں کوئی شورش یا گڑ بڑ پیدا ہوتی تو فوراً اس کو دبا دیتا۔ پنجاب اور کابل کے درمیانی علاقوں میں کچھ ایسے قبائل آباد تھے، جو بعض اوقات بدنظمی پھیلانے کی سعی کرتے، لیکن عالم گیر اس کے انسداد کے لیے مؤثر قدم اٹھاتا۔ چنانچہ ۱۶۶۷ء میں یوسف زئی اور ۱۶۷۲ء میں آفریدی قبائل کے لوگوں نے انتظامی امور میں خلل انداز ہونے کی کوشش کی تو عالم گیر نے بلا تامل اس اہم مسئلے کو شائستہ التفات ٹھہرایا اور مقامی انتظامیہ کو حکم دیا کہ ہر ممکن طریقے سے اس شورش کو ختم کر دیا جائے۔ لیکن جب فتنہ زیادہ پھیل گیا اور مقامی حکومت بے بس ہوگئی تو ایک نامور فوجی جرنیل امین خاں کی سرکردگی میں فوج کو حرکت میں لانے کے احکام نافذ کیے۔ معاملہ چوں کہ زیادہ سنگین نوعیت اختیار کر گیا تھا۔ اس لیے خود عالم گیر نے بھی پنجاب کا عزم کیا اور حسن ابدال میں آ کر خیمہ زن ہوا۔ وہ ڈیڑھ سال وہاں مقیم رہا۔ اس اثنا میں مختلف مقامات پر فوجی چوکیاں قائم کیں اور فتنہ وفساد کے دروازے بند کر دیے۔

سکھ اور ان کے ہنگامے:

ابتدا میں سکھ ملکی سیاسیات سے بے تعلق رہے تھے اور اپنے خاص طریقے کے مطابق صرف مذہبی امور کی بجا آوری میں مشغول رہتے تھے، لیکن ان کے پانچویں گرو ارجن دیو نے جن کی مذہبی رہنمائی کا دور ۱۵۸۱ء سے ۱۶۰۶ء تک کے عرصے کو محیط ہے، سیاست میں دخل اندازی کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۶۰۶ء میں جہاں گیر کے مقابلے میں اس کے بیٹے شہزادہ خسرو نے علم بغاوت بلند کیا تو گرو ارجن دیو نے خسرو کی حمایت کی تھی جس کی وجہ سے ۱۶۰۶ء ہی میں جہاں گیر نے ان کو قتل کرا دیا تھا۔ اس کے بعد جب داراشکوہ اور اورنگ زیب کے درمیان تخت نشینی کے مسئلے پر لڑائی ہوئی تو وہ سکھوں کے ساتویں گرو ہر رائے کا زمانہ تھا۔ گرو ہر رائے اس لڑائی میں داراشکوہ کے حامی تھے۔ لیکن اورنگ زیب چوں کہ وسیع القلب بادشاہ تھا، لہٰذا اس نے اس کو کوئی اہمیت نہ دی اور درگزر سے کام لیا۔ پھر آٹھویں گرو ہرکشن کے انتخاب کے مسئلے پر جھگڑا ہوا تو اس میں بھی اورنگ زیب نے کسی قسم کا حصہ نہیں لیا۔

لیکن ۱۶۷۴ء میں جب سکھوں کا نواں گرو تیغ بہادر سکھوں کی مذہبی رہنمائی کی گدی پر بیٹھا تو اس نے سخت باغیانہ طرز عمل اختیار کیا اور پنجاب اور کشمیر کے علاقوں میں وسیع پیمانے پر لوٹ مار اور غارت گری شروع کر دی۔ چنانچہ ۱۶۷۵ء میں اسے بغاوت کے جرم میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد دسویں گرو جنھیں آخری گرو بھی کہا جاتا ہے، گرو گوبند سنگھ کی رہنمائی کا زمانہ آیا۔ انھوں نے اپنے پیروانِ مذہب کو مغل حکومت کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خلاف خوب مشتعل کیا اور سکھ قوم کو خالصہ کے نام سے موسوم کر کے ایک باقاعدہ فوجی تنظیم کی شکل دے دی۔ مختلف مقامات پر کئی مضبوط قلعے تعمیر کرائے اور اسی (۸۰) ہزار افراد پر مشتمل ایک بہت بڑی فوجی جمعیت تیار کر لی۔ پھر ان کی اشتعال انگیز سرگرمیوں کا سلسلہ اس قدر وسعت اور خطرناک صورت اختیار کر گیا کہ حکومت کو امن قائم رکھنے کے لیے مجبوراً کوئی اہم قدم اٹھانے کے مسئلے پر غور کرنا پڑا۔ نتیجتاً فوج حرکت میں آئی اور میدان مقابلہ میں سکھوں کو شکست فاش ہوئی۔ گرو گوبند سنگھ کے دو بیٹے گرفتار ہو کر قتل ہوئے۔ خود گرو نے حکومت کی وفاداری کا عہد کیا اور بادشاہ نے احترام کے ساتھ انھیں دکن آنے کی دعوت دی۔ ابھی وہ راستے میں ہی تھے کہ عالم گیر کا انتقال ہو گیا۔ عالم گیر کے جانشین بہادر شاہ نے بھی گرو صاحب کا احترام قائم رکھا اور فوج میں عہدے دار مقرر کیا۔ لیکن ۱۷۰۸ء میں کسی پٹھان نے ذاتی عداوت کی بنا پر انھیں قتل کر دیا۔

جسونت سنگھ کی بے وفائی اور عالم گیر کا عفو و کرم:

جودھ پور کے راجا جسونت سنگھ کا اس سے پہلے ذکر آچکا ہے۔ یہ اورنگ زیب عالم گیر کا شدید مخالف اور دارا شکوہ کا سخت حامی تھا۔ یہ وہی جسونت سنگھ ہے جو دھرمٹ کی سخت لڑائی میں اورنگ زیب سے شکست کھا کر بھاگ گیا تھا اور گھر گیا تو بیوی نے اپنے قریب آنے سے سختی سے روک دیا تھا۔ یہ واقعہ خافی خاں نے تفصیل سے بیان کیا ہے اور راجپوت عورتوں کے مزاج کی نفسیات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ نہایت غیور اور باحمیت ہوتی ہیں۔ میدان جنگ میں پیٹھ دکھا کر بھاگ جانے والے مرد کو وہ انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اور اس کے ساتھ قربت اور صحبت سے انکار کر دیتی ہیں۔ چنانچہ جسونت سنگھ جب میدان جنگ سے فرار ہو کر گھر گیا تو اس کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ خافی خاں لکھتا ہے:

زنِ کلاں او کہ دختر راجا چتر سال بود شوہر را مطعون ساختہ، ترک ہم خوابی با او نمود و اکثر در وقت کلمہ و کلام زبان بر طعن و کنایہائے ملامت انجام آشنامی ساخت ❶۔

(یعنی اس کی بڑی بیوی نے جو راجا چتر سال کی بیٹی تھی، شوہر کو مطعون ٹھہرایا اور اس سے ہم بستری کا سلسلہ ختم کر دیا۔ وہ جب اس سے بات کرتی تو اشاروں کنایوں سے اسے ہدف ملامت ٹھہراتی۔)

ہندوستان کا بادشاہ بننے کے بعد اورنگ زیب نے جسونت سنگھ کو نہ صرف کوئی سرزنش نہیں کی بلکہ ہمیشہ بہترین سلوک کا مستحق سمجھا اور ملک کے اہم مناصب پر مامور کیا۔ اس نے کئی دفعہ بے وفائی کی اور بادشاہ کو دھوکا دیا، لیکن بلند اخلاق بادشاہ نے ہر بار اس کی تقصیر معاف کی۔ آخر میں اس کو کابل کا والی مقرر کیا جو خالص مسلمان آبادی کا علاقہ تھا۔ وہ کئی سال کابل کے اس اہم عہدے پر فائز رہا اور ۲۲ شوال ۱۰۸۹ھ/ ۲۷ نومبر ۱۶۷۸ء) کو جمرود کے قریب فوت ہوا۔

---

❶ منتخب اللباب: حصہ دوم، ص ۴۳۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جسونت سنگھ سے اورنگ زیب نے جو حسن سلوک روا رکھا، وہ ایک ایسا آئینہ ہے جس سے بادشاہ کے کردار کی بلندی اور اس کے حلم کی پوری تصویر واضح طور پر سامنے آجاتی ہے۔ اس سے یہ حقیقت بھی نمایاں ہو جاتی ہے کہ اس کا دل تعصب سے پاک اور بغض وعناد سے خالی تھا۔ رحم دلی، عفو و کرم اور مخالف سے درگزر کرنا اس کی فطرت میں داخل تھا۔

دکن کی فتح اور مرہٹوں کی سرکوبی:

اورنگ زیب عالم گیر کو دکن کے معاملات سے بے حد دلچسپی تھی۔ زمانہ شاہ زادگی میں بھی وہ کئی سال تک اس علاقے کا والی رہ چکا تھا اور معرکہ تخت نشینی کے موقعے پر بھی دکن ہی سے روانہ ہوا تھا۔ زمام حکومت ہاتھ میں لی تو زندگی کے آخری پچیس سال بھی دکن کی فتح اور اس میں اصلاحات کے نفاذ میں گزارے۔

دکن کے حالات، وہاں مرہٹوں کی آمد، ان کی دست درازیاں، مغل حکومت سے تصادم، عہد شکنی، دربار مغلیہ میں معذرت خواہانہ انداز، پھر ان سے مغل حکمرانوں کا نرم رویہ وغیرہ۔ یہ واقعات تاریخ کے ایک طالب علم کے لیے نہایت دلچسپ ہیں اور منتخب اللباب، مآثر عالم گیری، مآثر الامرا، خزانۂ عامرہ اور سیر المتاخرین وغیرہ کتب تاریخ میں تفصیل سے مرقوم ہیں۔ لیکن اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ اس موقعے پر ہم ان تمام امور سے صرف نظر کر کے صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مرہٹوں نے دکن کی مسلمان ریاستوں میں توسل پیدا کر کے اور ملازمتیں اختیار کر کے ایک مؤثر اور مضبوط طاقت فراہم کر لی تھی، اور باقاعدہ ایک فوجی تنظیم قائم کر لی تھی۔ مختلف مقامات پر فوجی اور عسکری نوعیت کے متعدد قلعے بھی تعمیر کر لیے تھے جن میں وسیع پیمانے پر جنگی اسلحہ جمع تھا۔ وہ مغل حکومت کے لیے مستقل خطرہ بن گئے تھے۔ ان کی دست درازیاں یہاں تک پہنچ گئی تھیں کہ مغلوں کے علاقوں کو بھی تاراج کرنے لگے تھے۔ لوٹ مار، قتل وغارت اور رہزنی ان کا پیشہ بن گیا تھا اور دکن کی کمزور ریاستیں ان کے سامنے بے بس و مجبور ہو گئی تھیں، بلکہ مغل حکومت کے خلاف ان کی امداد کرتی تھیں۔ یہ صورت حال امن عامہ کے لیے انتہائی تباہ کن ثابت ہو رہی تھی۔ بلا امتیاز مذہب و ملت ملک کے ہندو اور مسلمان سب ان سے پریشان تھے اور وہ سب کو اپنا نشانہ ستم بناتے تھے۔

ظاہر ہے اورنگ زیب عالم گیر جیسا عادل و منصف اور رحم دل و منتظم بادشاہ اس تکلیف دہ صورت حال کو ہرگز برداشت نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ اسے مجبوراً فوجی کارروائی کرنا پڑی اور مرہٹوں کے استیصال کے ساتھ ساتھ دکن کی ریاستوں کا بھی خاتمہ کرنا پڑا، کیوں کہ ایک کا سلسلہ دوسرے سے وابستہ تھا اور دونوں کی طاقت کو ختم کرنا عین مصلحتِ ملکی تھا۔

مرہٹوں کی تاریخ کے سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کا ابتدائی تعلق راجپوتانے سے تھا۔ بعد میں ان کے آبا و اجداد میں سے بعض لوگ دکن کی ریاست میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ اس خاندان کا ایک شخص

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مالوجی تھا۔ یہ شخص مسلمان اصحاب رشد وہدایت سے بہت عقیدت رکھتا تھا اور شاہ شریف کا مرید تھا جو احمد نگر میں مدفون ہیں۔ مالوجی کے دو بیٹے تھے۔ اس نے شاہ شریف سے تعلق ارادت کی بنا پر ان کے نام شاہ جی اور شریف جی رکھے جو در حقیقت مسلمانوں کے نام ہیں۔ یہی شاہ جی آگے چل کر ساہو جی کے لقب سے مشہور ہوا اور یہی وہ ساہو جی ہے جو سیوا جی مرہٹہ کا باپ تھا۔ مغل حکمرانوں کی تاریخ حرب وضرب کے ضمن میں ساہو جی مرہٹہ اور سیوا جی مرہٹہ کے نام بار بار آتے ہیں۔

سیوا جی مرہٹہ کے بارے میں یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیے کہ اس کی حیثیت ایک ڈاکو اور لٹیرے کی تھی۔ کمزور علاقوں میں چھاپے مارنا اور وہاں کے باشندوں کو ہراساں کر کے زیر کرنا اس کا پیشہ تھا۔ ریاست بیجاپور کے حکمران عادل شاہ کے زمانے میں اس کی تخریبی سرگرمیاں بہت بڑھ گئیں تھیں۔ کیوں کہ عادل شاہ کی بیماری کی وجہ سے پوری ریاست میں ابتری اور بدنظمی پھیلی ہوئی تھی اور رشوت خور اہل کاروں نے سیوا جی کو بہت سی جاگیروں کی جعلی سندیں لکھ کر دے دی تھیں۔ اس نے دکن کے اس علاقے پر تصرف حاصل کر لیا تھا جو بیجاپور کی حکومت میں داخل تھا۔

عالم گیر اپنے دور شاہ زادگی میں بھی جب وہ دکن کا والی تھا، اس افراتفری کو ختم اور اس علاقے کو فتح کرنا چاہتا تھا تاکہ ابتری اور لوٹ مار کا قطعی طور سے سد باب ہو جائے لیکن دارالحکومت آگرہ میں حالات نے کچھ ایسی انگڑائی لی کہ اسے مجبوراً اپنے دکن کے مرکزی مقام اورنگ آباد میں واپس آنا پڑا۔

اس کے بعد ملک کے سیاسی معاملات میں حیرت ناک تغیر کی لہر اٹھی۔ شاہ جہان کو شدتِ مرض نے گھیر لیا اور وہ مسلوب الاختیار ہو گیا۔ دارا شکوہ نے بھائیوں کے استیصال اور سلطنت پر متصرف ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ مراد نے صوبہ گجرات میں اپنے نام کا خطبہ وسکہ جاری کر لیا۔ شجاع نے جو بنگال کے منصب ولایت پر متعین تھا، وہیں اپنی بادشاہت کا اعلان جاری کر دیا اور پھر حکومت پر قبضہ کرنے کی غرض سے دارالسلطنت آگرہ کی طرف بڑھنے لگا۔ سیوا جی کے لیے اب میدان صاف تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اس کو کھل کھیلنے کے لیے اس سے زیادہ کوئی موقع نصیب نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ ہر طرف ہاتھ بڑھانے اور نظر دوڑانے لگا۔ بہت سے قلعے تعمیر کرائے اور جزیروں میں رسائی حاصل کر کے بحری قوت کے سامان فراہم کیے۔ اس نے مغل شاہ زادوں کی باہمی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر مرہٹوں کی ایک زبردست فوج تیار کر لی اور رفتہ رفتہ ریاست بیجاپور کے متعدد اضلاع پر قابض ہو گیا۔ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، مغلیہ حدودِ حکومت میں بھی دست تصرف دراز کرنا شروع کر دیا۔ اس کی ستم رانیاں یہاں تک بڑھیں کہ سورت اور اس کے نواح کی بندرگاہوں پر قبضہ کر کے حجاج کے قافلوں کو لوٹنا شروع کر دیا[1]۔ یہ جرات نسل تیموری کے شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کے لیے قطعاً ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ عالم گیر نے مملکت ہند پر قبضہ کرنے کے بعد سیوا جی کے ساتھ وہی سلوک کیا جس کا وہ مستحق تھا۔

---

[1] منتخب اللباب: ج ۲، ص ۱۱۵۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سیوا جی کے بارے میں تمام مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ جس طرح وہ غارت گری اور قتل وخوں ریزی میں بہت بے باک تھا، اسی طرح پرلے درجے کا مکار، فریبی، عہد شکن اور دغا باز بھی تھا۔ پھر انتہائی چاپلوس اور بزدل بھی تھا۔ اس کی بزدلی اور مکاری کی مثالیں دیتے ہوئے منتخب اللباب اور مآثر عالم گیری کے مصنفوں نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ جب اس نے بیجاپور کے اکثر اضلاع پر قبضہ کرلیا تو اس کے حکمران علی عادل شاہ نے افضل خاں سپہ سالار کو اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ افضل خاں نے سیوا جی کا محاصرہ کرلیا۔ سیوا نے عاجز آ کر مکرو فریب سے کام لیا۔ اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور عفو تقصیر کی درخواست کی۔ ساتھ ہی اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں افضل خاں سے ملاقات کے بعد اس کے ہم رکاب ہوکر علی عادل شاہ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں تاکہ براہ راست اپنی معروضات پیش کرسکوں اور معافی مانگ سکوں۔ شرط یہ قرار پائی کہ ملاقات کے وقت کسی کے پاس کوئی ہتھیار نہ ہوگا اور دونوں خالی ہاتھ ہوں گے۔ چنانچہ افضل خاں عہد کے مطابق خالی دست گیا، لیکن سیوا آستین میں چھرا چھپائے ہوئے تھا۔ بغل گیر ہوتے ہی اس نے افضل خاں کا کام تمام کردیا[1]۔

فریب دہی اور عہد شکنی سیوا جی کے کردار کا لازمی جز بن گئے تھے اور یہی وجہ تھی کہ مغلیہ سلطنت کا کوئی جرنیل اور ذمہ دار رکن اس کو لائق اعتماد نہیں گردانتا تھا۔ جب تیموری حدود مملکت میں سیوا جی کی دست درازیاں حد سے متجاوز ہوگئیں تو عالم گیر نے اس کی روک تھام کے لیے مہاراجا جے سنگھ کو جو ریاست جے پور کا راجا اور مغل حکومت میں سپہ سالاری کے منصب پر فائز تھا، فوج دے کر بھیجا۔ فوج کا ہراول دلیر خاں کو مقرر کیا۔ جے سنگھ بڑا زیرک جرنیل تھا۔ وہ سیوا کی سرکوبی کے لیے پونہ میں داخل ہوا اور ہر جانب فوجیں پھیلا دیں۔ دلیر خاں نے صرف سات ہزار فوج کے ساتھ پانچ مہینے کی مدت میں سیوا کے تمام مقبوضہ علاقے پامال کرڈالے۔ سیوا کا دارالسلطنت راج گڑھ تھا۔ اس کے ننھیال بھی اسی نواح میں رہتے تھے۔ دلیر خاں کی فوج نے جب ادھر کا رخ کیا اور آگے بڑھنے لگی تو سیوا اس تصور سے گھبرا اٹھا کہ یہ مقامات بھی فتح ہوگئے تو تمام اہل وعیال یا تو قتل ہو جائیں گے یا قیدی بنالیے جائیں گے، چنانچہ اس نے صلح واطاعت کے لیے سلسلۂ جنبانی شروع کیا۔

اسی اثنا میں جب سیوا جی کے ایک قلعے کا محاصرہ کرکے اس کا ایک برج توپوں سے اڑا دیا گیا تو دلیر خاں نے فوج کو قلعے کے دوسرے برج پر چڑھا دیا اور حکم دیا کہ اسے مسمار کردیا جائے۔ اس قلعے میں دوسرے لوگوں کے علاوہ سیوا کے متعدد اہل خانہ اور رشتے دار بھی محصور تھے۔ اس نے جب دیکھا کہ تھوڑی دیر میں قلعہ فتح ہونے اور حریف کے قبضے میں آنے کو ہے تو مجبور ہوکر صلح کی التجا کی۔ لیکن راجا جے سنگھ کو سیوا کی مکاریوں کا علم تھا اور اس کی باتوں پر اعتماد نہ تھا، اس نے حکم دیا کہ حملہ تیز کردیا جائے اور یورش کے سامان مزید بڑھا دیے جائیں۔ اتنے میں خبر پہنچی کہ سیوا خالی ہاتھ قلعے سے نکل کر آرہا ہے۔ اس کے قابل اعتماد چند برہمن بھی ساتھ ہیں۔ راجا جے سنگھ کو جب یقین ہوگیا کہ سیوا عجز وزاری کی حالت میں آرہا ہے تو اجازت دے دی، اور جن

[1] منتخب اللباب: ج ۲، ص ۱۸۲۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لوگوں کو اس کے استقبال کے لیے بھیجا، ان کے ساتھ چند مسلح راجپوت بھیجے اور سیوا سے ہوشیار رہنے کی تاکید کی۔ یہ بھی کہلا بھیجا کہ اگر خلوص دل کے ساتھ آتا ہے تو بے ہتھیار آئے ورنہ واپس چلا جائے۔ سیوا خالی ہاتھ اور بے ہتھیار آیا۔ راجا جے سنگھ کے پاس گیا اور نہایت سماجت کی اور عجز و انکسار کے ساتھ وفاداری اور عہد پر قائم رہنے کی قسمیں کھائیں۔ یہاں تک کہ سیوا نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

بہ طریق بندہائے ذلیل مجرم رو بدیں درگاہ آوردہ ام، خواہی بہ بخش وخواہی بہ کش ❶۔

(یعنی نہایت ذلت کے ساتھ ادنیٰ گناہ گار غلاموں کی طرح حاضر ہوں۔ اب آپ کو اختیار ہے ماریے، یا چھوڑ دیجیے۔)

جے سنگھ نے اٹھ کر گلے لگایا اور وفاداری کا اطمینان ہو جانے کے بعد دلیر خاں کو قلعے کا محاصرہ اٹھانے کا حکم دیا۔ قلعے کا پھاٹک کھلا تو سات ہزار مرد اور عورتیں باہر آئے جنھیں امان دی گئی۔ دلیر خاں کی طرف سے تلوار، کچھ اسلحہ اور دو عربی گھوڑے مع ساز طلائی کے سیوا کو عنایت کیے گئے۔ پھر جب دلیر خاں نے سیوا کا ہاتھ جے سنگھ کے ہاتھ میں دیا تو جے سنگھ نے خلعت، گھوڑا اور ہاتھی عطا کیا۔ دلیر خاں نے اپنے ہاتھ سے سیوا کی کمر میں تلوار باندھی، لیکن اس نے تھوڑی دیر کے بعد تلوار کھول کر رکھ دی اور کہا کہ میں بغیر ہتھیار کے خدمت کروں گا۔ بڑے بڑے قلعے بھی مغل حکومت کو پیش کیے۔

شاہی دربار کو جے سنگھ نے سیوا کی اطاعت گزاری کی اطلاع دی تو وہاں سے فرمان اور خلعت بھیجا گیا۔ سیوا کو خلعت اور فرمان قبول کرنے کے آداب سکھائے گئے۔ چنانچہ وہ فرمان کے استقبال کے لیے تین میل تک پا پیادہ گیا اور خلعت کے سامنے آداب بجا لایا۔ سیوا جی کے لڑکے اور دیگر رشتے داروں کو بھی عالم گیر نے مختلف مواقع پر بہت سے اونچے خطابات و اعزازات سے نوازا اور حکومت کے بلند منصب عطا کیے مگر یہ سب لوگ مسلسل بے وفائی کرتے رہے۔

یہاں یہ بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب عالم گیر نے جب جے سنگھ کو سیوا جی کے استیصال کے لیے بھیجا تو بیجاپور کے حکمران کو بھی سیوا کے مقابلے کے لیے فوجیں بھیجنے کی درخواست کی تھی لیکن حاکم بیجاپور اپنی سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر اور مغلوں کو نقصان پہنچانے کی غرض سے خفیہ طور پر سیوا جی کی حمایت کرتا رہا۔ اسی طرح حیدر آباد کے حکمران نے بھی یہی وتیرہ اختیار کیا۔ گولکنڈہ کے حکمرانوں نے بھی شاہی علاقوں پر غارت گری کرنے کے لیے مرہٹوں کی پوری اعانت کی۔

بہر حال نہ تو مرہٹے بار بار وفاداری کی یقین دہانی کے باوجود دغابازی اور باغیانہ سرگرمیوں سے باز آئے اور نہ دکن کی ریاستوں کے حکمرانوں نے مخالفانہ رویہ ترک کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ عالم گیر کو مجبوراً دونوں پر یلغار کرنا پڑی۔

---

❶ منتخب اللباب: ج ۲، ص ۱۸۲۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مرہٹوں کے بارے میں یہ بات ذہن میں رہے کہ شاہ جہان کے زمانے میں انھوں نے پوری قوت حاصل کر لی تھی، دکن سے مدراس تک وسیع علاقے ان کے تسلط میں چلے گئے تھے۔ سیکڑوں مضبوط اور سر بفلک قلعوں پر ان کا قبضہ تھا۔ یہ ایک جدید قوم کی شکل میں ابھر رہے تھے اور ان کا یہ عین عروج و شباب کا زمانہ تھا۔ اسی حالت میں عالم گیر نے ان سے مقابلہ کیا۔ نتیجہ کیا ہوا؟ یہ کہ عالم گیر کی زندگی ہی میں سیوا مر گیا۔ پھر اس کا ایک بیٹا سنبھا مارا گیا۔ دوسرا بیٹا رام راج آوارگی اور صحرا نوردی کی نذر ہوا۔ مرہٹوں کے مشہور سپہ سالار سنتا کا سر کٹ کر دربار میں پہنچا۔ غرض سب علم برداران بغاوت ایک ایک کر کے مٹا دیے گئے۔ تمام قلعوں پر عالم گیر نے قبضہ کر لیا اور علامہ شبلی نعمانی کے الفاظ میں دکن سے لے کر مدراس تک سناٹا چھا گیا۔ جس زمانے میں مرہٹوں کا استیصال ہو رہا تھا اور دکن کی ریاستوں کو مغل حکومت کے زیر تسلط لانے کی مہم زوروں پر تھی، عالم گیر خود اس زمانے میں دکن میں بیٹھا تمام معرکوں کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس کی عمر بیاسی برس کی ہو چکی تھی تاہم اس بوڑھے مگر جوان ہمت بادشاہ نے بعض نہایت مشکل معرکوں کی خود کمان کی اور تمام قلعے ایک ایک کر کے فتح کر لیے۔ ہندوستان کے وسیع ملک میں کوئی اس کا حریف نہ تھا اور کسی کو اس کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہ تھی۔

سرمد کا قتل:

اورنگ زیب کے ابتدائے عہد سلطنت کا ایک اہم واقعہ سرمد کے قتل کا ہے۔ سرمد اصلاً یہودی تھا اور یہودیوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا جو ربین کہلاتے ہیں، بعد میں مسلمان ہو گیا تھا اور ایران کے جلیل القدر فضلا سے علم حاصل کیا تھا۔ وہ تجارت کی غرض سے ہندوستان آیا اور سندھ کے راستے ٹھٹھے سے ہوتا ہوا دہلی پہنچا۔ سرمد اچھا شاعر بھی تھا۔ اصحاب تصوف سے وہ بالخصوص تعلق رکھتا تھا۔ دہلی میں داراشکوہ سے اس کے مراسم پیدا ہوئے اور ایک صوفی اور ولی کی حیثیت سے شہرت پائی۔ اس زمانے میں شاہ جہان تخت حکومت پر جلوہ افروز تھا۔ سرمد کا شہرۂ ولایت بادشاہ تک پہنچا تو اس نے عنایت خاں آشنا کو سرمد سے ملنے اور اس کے کشف و کرامات کا حال معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔ عنایت خاں آشنا نے وہاں بجز برہنگی کے کچھ نہ پایا اور واپس آ کر سرمد کے کشف پر طنز کرتے ہوئے بادشاہ کے حضور یہ شعر پڑھا۔

برسر مد برہنہ کرامات تہمت است
کشفے کہ ظاہر است از و کشف عورت است

۱۶۵۸ء میں عالم گیر، اورنگ ہند پر متمکن ہوا اور ملک میں شرعی قوانین و احکام کی تنفیذ کا سلسلہ شروع کیا تو اس کے نزدیک سرمد کا حالت عریانی میں رہنا خلاف شرع فعل اور قابل سزا جرم تھا۔ شہنشاہ نے ملا عبدالقوی کو سرمد کے پاس بھیجا کہ اسے کپڑے پہننے کی تاکید کی جائے۔ ملا ممدوح نے سرمد سے پوچھا کہ ''عریاں کیوں رہتے ہو؟'' سرمد نے بے ساختہ جواب دیا ''شیطان قوی است'' اور ساتھ ہی ایک رباعی پڑھی۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوسکتا ہے ملاعبدالقوی کو اپنے نام کی مناسبت سے ''شیطان قوی است'' کے الفاظ ناگوار گزرے ہوں۔

عریانی و برہنگی کے علاوہ سرمد نے ایک رباعی میں معراج سے بھی انکار کیا ہے۔ وہ اور بھی بہت سے خلاف شرع امور کا مرتکب تھا اور اس کا برملا اعلان و اعتراف کرتا تھا۔ لیکن اورنگ زیب نے جو کہ طبع محتاط رکھتا تھا، شاید ان باتوں کو سزا کے لیے کافی نہ سمجھا۔ اس نے علما کو سرمد کے پاس بھیجا کہ وہ کلمہ طیبہ پڑھے۔ علما کے سامنے سرمد نے فقط لا الٰہ پڑھا، اس سے آگے کچھ نہ کہا۔ علما نے اعتراض کیا اور کلمہ کے اس جزو اول کو اللہ کے وجود کی نفی کا اعلان قرار دیا۔ سرمد نے کہا ابھی تو میں حالت نفی میں مستغرق ہوں، مرتبہ اثبات تک نہیں پہنچا۔ وہاں پہنچوں گا تو الا اللہ بھی کہوں گا۔

اس پر علما نے فتویٰ دیا کہ فقط لا الٰہ کہنا کفر ہے۔ اگر سرمد توبہ کرے تو بہتر ورنہ واجب القتل ہے۔ سرمد اپنی بات پر قائم رہا اور توبہ نہ کی۔ چنانچہ دوسرے دن قتل کرنے کے لیے اسے دہلی کی جامع مسجد کے سامنے لایا گیا۔ کہتے ہیں اس وقت وہ نہایت خوش و خرم تھا۔ جلاد آیا تو سرمد اسے دیکھ کر مسکرایا اور کہا۔

فدائے تو شوم بیا بیا کہ بہر صورتے کہ می آئی، من ترا خوب می شناسم۔

(میں تم پر قربان۔ آؤ آؤ۔ تم جس شکل میں بھی آؤ گے، میں تمھیں خوب پہچانتا ہوں۔)

یہ کہہ کر مندرجہ ذیل شعر پڑھا اور تلوار کے نیچے گردن رکھ دی۔

شورے شد و از خواب عدم دیدہ کشودیم
دیدم کہ باقی است شب فتنہ غنودیم

شیخ محمد اکرام سرخوش کے تذکرے کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ سرخوش بیان کرتا ہے کہ ایک دن میں اور ناصر علی سرہندی اور مرزا عبدالقادر بیدل دہلی کی جامع مسجد میں حوض کے کنارے بیٹھے شعر خوانی کر رہے تھے کہ ادھر سے سرمد کا گزر ہوا۔ ہمیں دیکھ کر مسکرایا اور یہ شعر پڑھا۔

عمر یست کہ افسانۂ منصور کہن شد
من از سر نو جلوۂ دہم دار و رسن را

اس کے جلد ہی بعد وہ قتل ہو گیا۔

سوال یہ ہے کہ اس کے قتل کے اصل اسباب کیا تھے؟ صرف مذہبی تھے یا اس کی تہہ میں سیاست بھی کارفرما تھی؟ بلا شبہ عالم گیر خلاف مذہب باتوں کو پسند نہ کرتا تھا اور ملک کو منافی اسلام امور سے پاک کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن ہر دور میں سرمد جیسے بے شمار مجذوب اور کتنے ہی فاتر العقل لوگ گلی کوچوں میں ننگ دھڑنگ گھومتے نظر آتے ہیں اور کوئی ان کو پوچھنے والا نہیں۔ اسلام کا انکار کرنے والوں اور خدا اور رسول کی نافرمانی کرنے والوں کا بھی کوئی شمار نہیں۔ یقیناً اورنگ زیب کے زمانے میں بھی ایسے لوگ ہوں گے۔ اتنے بڑے ملک میں ایک سرمد ہی تو نہیں ہوگا، جس کی خلاف اسلام باتوں سے بادشاہ کو اتنا غصہ آیا کہ اسے قتل کر ڈالا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ داراشکوہ کی اس سے مصاحبت تھی اور اس کی مجلس میں کئی اور ملنگ اور مجذوب بھی آتے جاتے ہوں گے، جو عالم گیر کے خلاف باتیں کرتے ہوں گے۔

مآثرالامرا کے مصنف کا کہنا ہے کہ اگر سچ پوچھا جائے تو قتل کا اصل سبب داراشکوہ کی مصاحبت تھی۔

شیخ محمد اکرام مرحوم ایک اور تذکرہ نگار کے حوالے سے لکھتے ہیں

گویند کہ او بہ داراشکوہ نیز سِرّے داشت و اکثر اوقات نیز بہ ماتم عالم گیر مشغوف بود، لہٰذا بہ قتل رسید۔ واللہ اعلم بحقیقۃ حال ❶۔

(یعنی کہا جاتا ہے کہ سرمد سے داراشکوہ کے بھی تعلقات تھے۔ دونوں راز کی باتیں کرتے اور عالم گیر کے ماتم میں مشغول رہتے تھے، اس لیے وہ قتل ہوا۔ اصل حقیقت کا علم اللہ ہی کو ہے۔)

مولانا ابوالکلام آزاد نے سرمد کے حالات میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے، ان کا خیال بھی یہی ہے کہ سرمد کے قتل کے اصل اسباب سیاسی تھے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

''ایشیا میں ہمیشہ سے پالیٹکس مذہب کی آڑ میں رہا ہے اور ہزاروں خون ریزیاں جو پولیٹکل اسباب سے ہوئی ہیں، انھیں مذہب کی چادر اڑھا کر چھپایا گیا ہے۔''

بہر حال اصل حقیقت تو اللہ کو معلوم ہے، ہمارے سامنے دونوں باتیں ہیں یہ بھی کہ عالم گیر کی غیرت دینی اور حمیت مذہبی سرمد کی خلاف شریعت باتوں کو برداشت نہ کر سکی اور اسے قتل کرا دیا۔ یہ بھی کہ سرمد اور دارا شکوہ کے باہمی تعلقات بہت گہرے تھے، جس سے فتنہ وفساد کے پھیلنے اور عالم گیر کے خلاف ایک محاذ قائم ہونے کا خطرہ تھا۔ اتفاق سے اس کی مذہبی حالت بھی قابل اعتراض اور لائق عقوبت تھی، لہٰذا اسے قتل کر دیا گیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اوصاف وکمالات کی ایک جھلک:

تیمور کے جانشینوں میں اورنگ زیب عالم گیر وہ حکمران ہے جس کے گوناگوں کمالات کی فہرست بڑی دراز ہے، اس کی زندگی کے شب وروز بے شمار خصوصیات سے مملو ہیں اور کتنے ہی حیرت انگیز واقعات ہیں جو قطار باندھے سامنے کھڑے ہیں اور ہر واقعہ زیب قرطاس بننے کے لیے بے قرار ہے۔ قلم حیران ہے کہ کس کا انتخاب کرے اور کس کو چھوڑے۔ عالم گیر کی طویل حیات مستعار کے تمام لیل ونہار کو شدید آزمائشوں اور بوقلموں امتحانوں کی آماج گاہ سے تعبیر کرنا چاہیے۔ اس مردآہن کی بے پناہ ہمت کی داد دیجیے کہ ہر امتحان میں پورا اترتا اور ہر آزمائش میں کامیاب ہوتا ہے۔ اس نے مرہٹوں کو زیر کیا۔ دکن کی تسخیر کی، آسام پر علم اقتدار لہرایا۔ تبت کی انتہائی سرحدوں پر تسلط جمایا اور ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام باغی طاقتوں کو

❶ رود کوثر: ص ۴۳۷۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بیخ و بن سے ہلا ڈالا۔ اس کے عہد اقتدار میں ہندوستان کی سلطنت مغلیہ جن فتوحاتِ ملکی اور وسعت حدود سے آشنا ہوئی، اس کی نظیر برصغیر کی تاریخ میں ناپید ہے۔

اورنگ زیب عالم گیر کے اوصاف و کمالات اور شجاعت و بہادری کے متعدد واقعات گزشتہ صفحات میں درج ہو چکے ہیں لیکن پھر بھی تشنگی کا احساس ہوتا ہے اور بہت سی باتیں ابھرابھر کر سامنے آرہی ہیں جو معرض تحریر میں آنے کے لیے بے تاب ہیں۔ ہر چند کہ اختصار سے کام لیا جا رہا ہے اور ہر مقام پر عنان قلم کھینچ کھینچ کر چلنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم بعض واقعات بیان کرنا ضروری ہیں۔ ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

۱۔ اورنگ زیب کی بہادری اور قابلیت کی ایک بہت بڑی امتحان گاہ جنگ تخت نشینی کے موقع پر ساموگڑھ کا میدان تھا۔ دارا شکوہ اور عالم گیر کی فوجیں نہایت شدت سے لڑ رہی تھیں اور گھمسان کا رن پڑا تھا۔ دارا کے ہاتھی پر حملہ ہوا تو وہ ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ فوج نے سمجھا کہ شہزادہ مارا گیا اور وہ تتر بتر ہوگئی۔ بعض مورخین کا فیصلہ ہے کہ دارا کی یہی غلطی اس کی ہزیمت کا باعث بنی۔ عالم گیر کو بھی جب وہ کھجوہ کے مقام پر شجاع سے نبرد آزما تھا، یہی صورت حال پیش آئی۔ عالم گیر ہاتھی پر بیٹھا شجاع کے مقابلے میں دادِ شجاعت دے رہا تھا کہ ناگہاں اس کے ہاتھی پر ایک مست اور طاقت ور جنگی ہاتھی نے حملہ کر دیا۔ یہ نہایت نازک موقع تھا۔ اس وقت اگر بادشاہ کا ہاتھی بھاگ اٹھتا تو اس کی ساری فوج منتشر ہو جاتی، لیکن عالم گیر کی جرأت مردانہ اور قوت فیصلہ دیکھیے کہ ہاتھی کے پاؤں میں بیڑیاں ڈلوادیں تاکہ وہ گھبرا کر بھاگ نہ سکے۔

۲۔ جب اورنگ زیب اور دارا شکوہ کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے پر اتریں تو اورنگ زیب کے ہم رکاب صرف پچیس تیس ہزار کی نفری تھی، ادھر دارا شکوہ ایک لاکھ سوار اور بیس ہزار کی جرار پیدل فوج کے ساتھ حملہ آور ہوا تھا۔ جب جنگ میں تیزی آئی اور کشتوں کے پشتے لگنے لگے تو تاریخ گواہ ہے کہ عالم گیر کے ساتھ صرف ایک ہزار آدمی رہ گئے تھے۔ اس انتہائی نازک وقت میں عالم گیر نے جس شجاعت اور دلیری کا مظاہرہ کیا، اس کو لین پول کا قلم ان الفاظ میں رقم کرتا ہے۔

جنگ کی حالت انتہائی نازک شکل اختیار کر گئی تھی اور قریب تھا ... ب ہزیمت سے دوچار ہو جائے کیوں کہ اس کے چیدہ چیدہ رسالے بھی پسپا ہو چکے تھے اور وہ میدان میں تنہا کھڑا تھا۔ مشکل سے ایک ہزار آدمی اس کے گرد ہوں گے اور ان کو بھی دارا کے حملوں کا انتظار تھا۔ اس سے زیادہ استقلال اور رستمانہ شجاعت کے امتحان کا چشم فلک نے کبھی موقع نہ دیکھا ہوگا۔ لیکن اورنگ زیب کے بدن میں بجائے پٹھوں کے فولاد کے تار تھے۔ صرف اس کی شجاعت تھی، جس نے ایک ہزار افراد کو ایک لاکھ سے زائد فوج پر فتح دی۔

۳۔ بڑھاپا اور کمزوری بھی اس کے عزم و ہمت میں ضعف کے آثار پیدا نہ کر سکے۔ ستارا کے مقام پر مرہٹوں نے جب ایک سرنگ کو اڑا دیا اور بڑی تعداد میں مغل فوج تباہ ہوئی تو عالم گیر کی عمر اس وقت بیاسی برس کی ہو چکی تھی۔ پتا چلا تو جھٹ گھوڑے پر سوار ہوا اور مقام حادثہ پر پہنچا۔ فوجیوں کی لاشیں اپنی نگرانی میں

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نکلوائیں۔اس حادثہ جانکاہ سے اس قدر متاثر ہوا کہ مرہٹوں پر حملے کی تیاری شروع کر دی اور خود فوج کی کمان کرنے کا فیصلہ کیا۔امرائے فوج بڑی مشکل سے شہنشاہ کو فیصلہ واپس لینے پر آمادہ کر سکے۔

۴۔ سیواجی مرہٹہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سنبھا جی باپ کا جانشین ہوا تو اس نے برہان پور پر اچانک حملہ کر کے وہاں کی آبادی کو ہدف ظلم بنایا، نہایت سفاکی اور بے دردی سے شہر کو لوٹا اور پھر اس میں آگ لگا دی۔برہان پور کے علما و مشائخ اس سے انتہائی پریشان ہوئے اور ایک محضر تیار کر کے عالم گیر کی خدمت میں بھیجا۔اس محضر میں انھوں نے دلائل سے ثابت کیا کہ یہ ملک دارالحرب ہو گیا ہے۔عالم گیر نے علما کا یہ محضر پڑھا تو بے حد افسوس اور تاسف کا اظہار کیا اور جواب میں انھیں لکھا کہ مرہٹوں کی بیخ کنی کے لیے میں خود فوج لے کر آرہا ہوں۔

۵۔ رام راج مرہٹہ کی موت کے بعد اس گروہ کے لوگ شاہی علاقوں سے نکل گئے تھے لیکن ان میں سے کچھ کوکن وغیرہ کی خطرناک اور تنگ و تاریک وادیوں میں جا چھپے تھے۔ان کے کلی استیصال کے لیے ان پر فوج کشی ضروری تھی۔شہنشاہ اورنگ زیب نے باوجودیکہ اسی سال سے متجاوز ہو چکا تھا، اس مہم کی قیادت خود اپنے ہاتھ میں لی اور نہایت ہمت واستقلال سے مرہٹوں کو تاراج اور ان کے مشہور قلعوں کو مسخر کرنے کے لیے نکلا۔یہ قلعے چاروں طرف سے خطرناک اور مہیب غاروں اور خندقوں سے گھرے ہوئے تھے۔بعض دو دو میل کی بلندی پر واقع تھے۔ان میں ایک نہایت مضبوط قلعہ راج گڑھ کا تھا جسے سیواجی کا پایہ تخت کہنا چاہیے۔اس قلعے کا پھیلاؤ بارہ میل کا تھا۔راستے انتہائی دشوار گزار اور پُر پیچ تھے۔کئی کئی دن کے مسلسل سفر سے بہ مشکل ایک ایک کوس کا فاصلہ طے ہو پاتا تھا۔بسنت گڑھ، ستارا، تُوانا، کھیسنا، پرنالہ اور بھوسان گڑھ وغیرہ کے تمام قلعے اسی قسم کے تھے۔انھیں مرہٹوں کے مرکز کہا جاتا تھا۔اورنگ زیب نے یہ قلعے ایک ایک کر کے فتح کیے۔اس کے بعد یا تو مسمار کر دیے گئے یا ان میں شاہی فوج بٹھا دی گئی۔

۶۔ یہ اورنگ زیب کا عالم پیری کا واقعہ تھا۔دور شہزادگی کا یہ واقعہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جب وہ بلخ کی مہم پر عبدالعزیز خاں کے خلاف محاذ آرا تھا، تو عین حالت جنگ میں نماز ظہر کا وقت آ گیا۔دشمن کی فوجیں ہر طرف سے تیر برسا رہی تھیں، لیکن یہ استقلال کا پیکر اور بہادری کا پتلا کمال اطمینان سے گھوڑے سے اترا، وضو کیا، نماز کی صف آراستہ کی، با جماعت فرض ادا کیے اور حضور قلب کے ساتھ سنت اور نفل پڑھے۔عبدالعزیز والی بلخ نے یہ منظر دیکھا تو یہ کہہ کر لڑائی سے دست بردار ہو گیا کہ ایسے شخص سے لڑنا ہلاکت کو دعوت دینا ہے۔

۷۔ عالم گیری فوج کے سب سے دلیر اور بہادر سپاہی بارہ کے سادات مانے جاتے تھے۔اسی وجہ سے یہ لوگ بہت خود سر اور مغرور ہو گئے تھے۔انھوں نے اہل دربار اور معززین کو زدو کوب کیا۔عالم گیر نے یہ مقدمہ قاضی کی عدالت میں پیش کرنے کا حکم دیا، لیکن سادات بپھر گئے اور کہا کہ ہم اپنا فیصلہ خود کریں گے۔عالم گیر سادات بارہ کی یہ گستاخانہ حرکت اور محکمہ قضا کی توہین برداشت نہ کر سکا۔غصے سے آستینیں چڑھالیں اور کہا جو

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لوگ میری تلوار کی دھار دیکھ چکے ہیں، وہ شریعت کے مقابلے میں ایسے الفاظ منہ سے نکالتے ہیں، ان سے کہہ دو سب مل کر آئیں۔ اس کے بعد انھیں انتظامی اور فوجی ذمے داریوں سے برطرف کر دیا۔ سادات کا سب غرور خاک میں مل گیا۔

۸۔　شہزادہ اکبر کو جو اورنگ زیب کا چوتھا بیٹا تھا، راجپوتوں نے اسے بادشاہ بننے کا چکمہ دیا اور اس سلسلے میں اس کی حمایت کی قسمیں کھائیں۔ نادان شہزادہ باپ کی مخالفت اور بغاوت پر اتر آیا۔ ستر ہزار کے لگ بھگ لشکر جرار اس کی کمان میں تھا۔ عالم گیر کو پتا چلا تو بیٹے کی بغاوت فرو کرنے کو نکلا۔ صرف ایک ہزار افراد اس کے ساتھ تھے، جنھیں ستر ہزار کے مقابلے میں فوج کہنا لفظ فوج کا مذاق اڑانا ہے۔ شہنشاہ کی فوجیں اس وقت دور دراز مقامات پر فرائض خدمت انجام دے رہی تھیں۔ حالات ایسے تھے کہ انھیں بلانا مناسب نہ تھا۔ عالم گیر کی جبین استقلال پر ذرا شکن نہیں پڑی اور وہ بالکل نہیں گھبرایا۔ کامل اطمینان سے میدان میں نکلا اور شہزادے کی ستر ہزار فوج کو ایک ہزار افراد سے پسپا کر دیا۔ بعد ازاں شہزادہ اکبر ادھر ادھر کے چکر کاٹنے کے بعد سمندر کے راستے سے ایران چلا گیا تھا اور وہیں ۱۱۱۸ھ (۱۷۰۶ء) میں فوت ہوا۔

۹۔　عالم گیر کو تلوار اور قلم دونوں سے برابر کا تعلق تھا اور دونوں کو اس کی اطاعت گزاری پر فخر تھا۔ اگرچہ محمد حسین آزاد کو عالم گیر کی تعریف کرنے سے تکلیف ہوتی ہے تاہم بقول شبلی ''آزاد کو بھی بادل ناخواستہ'' یہ لکھنا پڑا کہ ''اس کی تحریریں دیکھ کر اسے تعجب آتا ہے کہ جس طرح اورنگ سلطنت زیر قدم رکھتا تھا اسی طرح کشور سخن بھی زیر قلم ہے۔''

۱۰۔　اورنگ زیب عالم گیر کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ روزانہ دو تین مرتبہ دربار عام منعقد کرتا تھا جس میں ہر چھوٹا بڑا آدمی بغیر کسی جھجک اور روک ٹوک کے آ سکتا اور اپنی حاجت بیان کر سکتا تھا۔ وہ ہر شخص کی بات توجہ سے سنتا، ان کی عرضیاں خود وصول کرتا اور اپنے ہاتھ سے ان پر حکم لکھتا تھا۔ عام طور پر وہ کھڑے ہو کر رعایا کی باتیں سنتا تھا۔ علامہ شبلی نے اس ضمن میں الفنسٹن کے حوالے سے ڈاکٹر جیلی کریری کا ایک چشم دید واقعہ بیان کیا ہے، جس میں وہ کہتا ہے کہ میں نے عالم گیر کو دیکھا کہ وہ اٹھتر (۷۸) برس کی عمر کو پہنچ گیا تھا، صاف وسفید ململ کی پوشاک پہنے ہوئے عصائے پیری کے سہارے امیروں کے جھرمٹ میں کھڑا تھا۔ اس کی پگڑی میں زمرد کا بڑا ٹکڑا ٹنکا ہوا تھا۔ وہ دادخواہوں کی عرضیاں لیتا جاتا اور بلا عینک پڑھ کر اپنے ہاتھ سے دستخط کرتا جاتا تھا۔ اس کے ہشاش بشاش چہرے سے صاف مترشح ہوتا تھا کہ وہ اپنی مصروفیت سے نہایت شاداں وفرحاں ہے۔

اورنگ زیب عالم گیر نے بادشاہ ہونے کے بعد جب دکن کی باغی ریاستوں اور سفاک مرہٹوں کے استیصال کا منصوبہ بنایا اور وہاں رہ کر معاملات کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تو اس کی عمر پینسٹھ سال سے زیادہ ہو چکی تھی۔ جوانی نے رخت سفر باندھ لیا تھا اور بڑھاپا تیزی سے قبضہ جما رہا تھا۔ لیکن اس نے بے حد جرات سے کام لیا اور عمر کے آخری حصے میں تمام سنگین حالات پر انتہائی عقل مندی اور دلیری سے قابو پایا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سخاوت اور غریب پروری:

اورنگ زیب عالم گیر بلاشبہ ہندوستان کا عظیم بادشاہ تھا۔ کشور کشا اور جنگ جو۔۔۔اس کے رعب و دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ دور دراز علاقوں میں بیٹھے ہوئے سرکش سے سرکش لوگ بھی اس سے لرزتے تھے۔ لیکن اس کی زندگی کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ اس کے اندر انسان کا دل تھا اور دل میں خدا ترسی اور رحم کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ وہ رعایا کے لیے انتہائی مشفق اور سخی تھا۔ اس سلسلے کے بہت سے واقعات مآثر عالم گیری، عالم گیر نامہ اور اس زمانے کی دیگر کتابوں میں مرقوم ہیں۔

مآثر عالم گیری کے مصنف محمد ساقی مستعد خاں نے جلوس عالم گیری کے سترھویں سال ۱۰۸۴ھ (۱۶۷۴ء) کے واقعات میں یہ واقعہ تفصیل سے بیان کیا ہے کہ جب اورنگ زیب حسن ابدال گیا تو وہاں کے باغ میں قیام پذیر ہوا۔ باغ کی دیوار کے ساتھ ایک ضعیف بڑھیا کا مکان تھا، جس میں اس نے ایک پن چکی لگا رکھی تھی اور پن چکی کو پانی باغ سے آتا تھا۔ ملازمین شاہی نے پانی روک لیا اور پن چکی بند ہوگئی۔ بادشاہ کو پتا چلا تو فوراً پانی کھلوا دیا۔ رات کو جب کھانے پر بیٹھا تو اپنے خادم ابوالخیر کے ہاتھ بڑھیا کے لیے کھانا اور پانچ اشرفیاں بھیجیں اور کہا کہ میری طرف سے بڑھیا کو سلام کہو اور اس سے معذرت کرو کہ ہماری وجہ سے تم کو جو تکلیف ہوئی ہے اس کی معافی چاہتا ہوں۔ نیک خصال شہنشاہ نے اس پیغام پر ہی اکتفا نہیں کیا، صبح ہوئی تو پالکی بھیج کر بڑھیا کو بلایا اور حرم سرا میں بھیجا۔ بیگمات شاہی کے دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ بڑھیا غریب اور تنگ دست ہے۔ اس کی دو غیر شادی شدہ لڑکیاں اور دو لڑکے ہیں۔ بادشاہ نے دو سو روپے عنایت کیے اور مستورات نے زر و جواہر دیے۔ دو تین دن کے بعد بڑھیا کو پھر بلایا اور لڑکی کی شادی کے لیے دو ہزار روپے عطا کیے۔ محل کی عورتوں اور شاہزادوں نے روپے اور اشرفیاں دیں۔ چند روز کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ غریب بڑھیا امیر ہو چکی تھی۔

اورنگ زیب عالم گیر کی غریب پروری اور مستحقین کے لیے اس کی عطا و اعانت کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ علامہ شبلی کے زمانے میں ندوۃ العلما لکھنؤ کے ارباب حل و عقد نے ایک مرتبہ بنارس میں ندوہ کی علمی نمائش گاہ قائم کرنے کا اہتمام کیا۔ اس نمائش گاہ میں کثرت سے سلاطین تیموریہ کے عہد کے فرامین بہم پہنچائے گئے تھے۔ ان میں دو ثلث سے زیادہ عالم گیر کے فرامین تھے اور یہ تمام فرامین کسی عالم یا درویش کی جاگیر یا مدد معاش کے متعلق تھے۔ اہل علم کے وظائف کے سلسلے کے اکثر فرامین وہ تھے جو عالم گیر کے دربار سے جاری ہوئے تھے[1]۔

عالم گیر نے ملک کے ہر حصے میں راہ گیروں کے لیے مسافر خانے اور سرائیں تعمیر کرائیں اور اس

---

[1] اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر: ص ۱۱۷۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طرح کا اہتمام کیا کہ حالت سفر میں راستوں میں لوگوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ نیز کنوئیں کھدوائے کہ پانی کی قلت باقی نہ رہے۔ بہت سے مرکزی مقامات پر غلہ خانے قائم کیے کہ قحط کے زمانے میں غربا و مستحقین کو مفت غلہ تقسیم کیا جائے۔

بردباری اور متحمل مزاجی:

مآثر عالم گیری میں ایک واقعہ مندرج ہے، جس سے بادشاہ کی بردباری اور حلم ولینت کا ثبوت ملتا ہے۔ سولھویں سال جلوس ۱۰۸۳ھ / مارچ ۱۶۷۳ء میں اورنگ زیب نماز عید الاضحیٰ سے فارغ ہو کر واپس آ رہا تھا کہ ایک شخص نے لکڑی پھینک کر ماری جو بادشاہ کے زانوں پر لگی۔ بادشاہ کے گرز بردار اس شخص کو پکڑ کر حضور میں لائے، لیکن حلیم الطبع شہنشاہ نے اس کو چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ غور کیجیے یہ کوئی معمولی بات نہ تھی، ہمارے اس دور جمہوریت میں بھی اس قسم کے واقعات کو بہت اہم سمجھا جاتا ہے اور ایسی حرکت کرنے والے کے پورے کردار اور ماضی کے واقعات کی تفتیش کے لیے ایک خاص عملہ مامور کر دیا جاتا ہے۔ تین چار سو سال پیشتر کے دور مطلق العنانی میں تو یہ انتہائی عظیم حادثہ تھا، لیکن اورنگ زیب نے اس کو کوئی اہمیت نہ دی۔

اسی طرح کا ایک واقعہ اورنگ زیب کے حالات میں مرقوم ہے کہ بادشاہ جامع مسجد سے واپس آ رہا تھا کہ ایک شخص تلوار لہراتے ہوئے اس کی طرف دوڑا۔ لوگوں نے اسے فوراً گرفتار کر لیا اور قتل کر دینا چاہا۔ لیکن رحم دل بادشاہ نے ایسا کرنے سے منع کیا اور اس کے لیے آٹھ آنے یومیہ وظیفہ مقرر کر دیا۔

قیاس کہتا ہے کہ حملہ آور کا بیان لیا ہو گا اور وہ بے کار اور نادار ہو گا اسی لیے بادشاہ نے اس کا یومیہ وظیفہ مقرر کیا۔ لیکن یہ قیاس اگر صحیح بھی ہو تو حکمران کے قتل سے اقتصادی مسئلہ حل تو نہیں ہو جاتا۔ اس بحث سے قطع نظر بتانا صرف یہ ہے کہ یہ واقعہ نہایت سنگین نوعیت کا تھا مگر عالی ظرف بادشاہ نے نہ صرف کسی قسم کی بازپرس اور تحقیق و تفتیش کی ضرورت محسوس نہیں کی، الٹا حملہ آور کو معاف کر کے باقاعدہ اس کا روزینہ لگا دیا۔

اصلاحی اقدامات:

اورنگ زیب عالم گیر نے تخت ہند پر متمکن ہوتے ہی بہت سے اصلاحی اقدامات کیے اور ان متعدد رسوم کو ختم کیا جو اسلام کے منافی تھیں اور پہلے سے جاری تھیں۔ ان کی جگہ ایسی چیزیں نافذ کیں جو شریعت اسلامی سے ہم آہنگ تھیں۔ مثلاً مغلیہ عہد میں سکوں پر کلمہ طیبہ کندہ کیا جاتا تھا اور یہ سکہ ہر قسم کے پاک اور ناپاک ہاتھوں میں گردش کرتا تھا۔ اس سے کلمہ طیبہ کی حرمت مجروح ہوتی تھی، لہٰذا عالم گیر نے ملکی سکے پر کلمہ طیبہ لکھنا ممنوع قرار دے دیا۔ اس نے شمسی تقویم کے بجائے قمری اور ہجری تقویم کو مروج کیا۔ جشن نوروز جو عالم گیر سے پہلے شان و شوکت سے منایا جاتا تھا اور اس میں امرا و وزرا بادشاہ کو مختلف قسم کے نذرانے پیش کرتے تھے،

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دور عالم گیری میں یہ بھی بند ہوا۔ بھنگ اور چرس کی کاشت پر پابندی عائد کر دی گئی۔ مسلمانوں کے اخلاق و کردار کی اصلاح اور عادات واطوار کی تطہیر کے لیے محکمہ احتساب قائم کیا گیا اور قصبات و بلاد میں محتسب مقرر کیے گئے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے، معاشرتی برائیوں کے ارتکاب سے روکتے، مے نوشی، قمار بازی اور دیگر منہیات سے سختی کے ساتھ منع کرتے اور امور خیر کی تلقین وتبلیغ کرتے تھے۔ پھر غلاموں کی خرید و فروخت کا بھی سد باب کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ درباری سلام کے تمام غیر شرعی طریقے ختم کر کے صرف مسنون طریق سلام یعنی السلام علیکم کہنے کا حکم جاری کیا گیا۔ یہ حکم بھی جاری ہوا کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کو السلام علیکم کہا کریں۔ اس نے مدارس جاری کیے اور ان میں قابل مدرس مقرر کیے۔

علاوہ ازیں اورنگ زیب نے ایک اصلاحی قدم یہ اٹھایا کہ دربار میں رقص وسرود کی محفلوں کے انعقاد کا سلسلہ سرے سے ختم کر دیا اور رقاصوں اور مغنیوں کو مناسب وظیفے دے کر دربار کی اس خدمت سے سبک دوش کر دیا۔ شعرا کی سرکاری سرپرستی بھی ختم کر دی اور دربار میں طویل عرصے سے ملک الشعرا کا جو منصب چلا آرہا تھا، وہ بھی باقی نہ رہنے دیا۔ سرکاری اہتمام میں تاریخ نویسی بھی بند کر دی اور سرکاری مورخین کو سرکاری سرپرستی سے آزاد کر دیا گیا۔ بادشاہ کے ماتھے پر تلک لگانے، اس کے لیے زمین بوس ہونے اور جھروکے کے درشن وغیرہ سے بھی ممانعت کے احکام جاری کر دیے گئے۔

ولادت اور تخت نشینی کے مواقع کی تقریبات سادہ طریقے سے منانے کا حکم دیا گیا۔ بادشاہ کو سونے چاندی میں تولنے کی رسم بھی موقوف کر دی گئی۔ امرائے دربار کے لیے زیورات اور ریشمی لباس ممنوع قرار دیا گیا۔ شوہر کی وفات کے موقعے پر ہندو عورتوں میں ستی کی رسم جو عرصہ دراز سے چلی آرہی تھی، سختی کے ساتھ بند کر دی گئی۔ اورنگ زیب کے تخت نشین ہونے کے وقت ملک میں تقریباً اسی (۸۰) ٹیکس وصول کیے جاتے تھے جو راہ داری، پنڈاری اور دریائے گنگا اور جمنا میں نہانے وغیرہ کے بالکل ناروا قسم کے ٹیکس تھے، وہ یک قلم منسوخ کر دیے گئے۔ یہ ٹیکس حکومت کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ تھے۔ صرف راہ داری ٹیکس سے حکومت کو پچیس لاکھ روپے کی آمدنی ہوتی تھی۔

اورنگ زیب نے ایک اہم اصلاحی قدم یہ اٹھایا کہ مسلمانوں سے زکوٰۃ کی وصولی لازمی قرار دی اور ہندوؤں پر جزیہ عائد کیا۔

نیکی اور تدین:

ہندوستان کے اس شہنشاہ کو علمی لحاظ سے عالم دین کہنا چاہیے۔ یہ متعدد مروجہ علوم وفنون میں مہارت رکھتا تھا۔ فقہ حنفی میں بالخصوص درک حاصل تھا۔ اس کا قول ہم دوشِ عمل اور کردار ہم سرِ شریعت محمدی تھا۔ ورع و تقویٰ میں ممتاز، نماز باجماعت کا پابند، تہجد گزار اور قائم اللیل تھا۔ اگر دہلی میں مقیم ہوتا نماز جمعہ بالالتزام وہاں

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی جامع مسجد میں پڑھتا۔ تراویح کا التزام کرتا اور رمضان کے عشرۂ آخر میں اعتکاف کرتا، ہر سوموار، جمعرات اور جمعہ کو روزے رکھتا۔ اس کے علاوہ جن ایام میں رسول اللہ ﷺ سے روزے رکھنا ثابت ہے، ان میں باقاعدہ روزے رکھتا۔ رمضان کے روزوں کا تو اس درجہ اہتمام کرتا کہ شدید گرمیوں میں بھی اس ماہ مبارک کے روزے اس سے قضا نہ ہوتے۔ زکوٰۃ ادا کرتا اور غربا و مساکین کی کھل کر امداد کرتا۔ اپنی ملکی اور انتظامی مجبوریوں کی بنا پر خود تو حج بیت اللہ کی سعادت حاصل نہ کر سکا البتہ بہت سے لوگوں کو ہر سال اپنے خرچ سے حرمین شریفین بھیجتا۔ قرآن مجید کی کثرت سے تلاوت کرنا اس کا معمول تھا۔ بیواؤں، یتیموں اور بے سہارا مردوں اور عورتوں کو معقول رقمیں عطا کرتا۔ وظائف بہ کثرت پڑھتا اور ادعیہ ماثورہ یعنی جو دعائیں کتب حدیث میں رسول اللہ ﷺ سے مروی و منقول ہیں، وردِ زبان رکھتا۔ سنن و نوافل کی پابندی کرتا اور ہمیشہ باوضو رہتا۔ غیر شرعی لباس سے خود بھی اجتناب کرتا اور امرائے مملکت اور وزرائے سلطنت کو بھی اس سے سختی کے ساتھ روکتا، منہیات سے دامن کشاں رہتا۔ مساجد میں جاتا اور ملک میں مسجدوں کی آبادی و تعمیر کا اہتمام کرتا۔ مساجد میں امام مقرر کیے جاتے اور انتظام کے لیے انھیں خرچ دیا جاتا۔ علما و مشائخ کی صحبت میں بیٹھتا اور ان سے مستفید و مستفیض ہوتا۔ اس کھانے پینے کے شاہانہ تکلفات سے مجتنب رہتا۔ خوراک بہت سادہ اور کم کھاتا۔ الغرض اس کی زندگی اسلام کے قالب میں ڈھلی ہوئی تھی اور ہندوستان کا یہ عظیم بادشاہ دین محمدی کا مطیع و فرماں بردار تھا۔

قرآن مجید سے شغف و محبت:

قرآن مجید سے بہ درجہ غایت شغف و تعلق خاطر رکھتا تھا۔ بعض سورتیں تو ابتدا ہی سے حفظ تھیں، مریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد پورا قرآن مجید حفظ کیا۔ کسی نے ابتدائے حفظ کی تاریخ سورۂ اعلیٰ کی اس آیت سے نکالی۔ سنقرئك فلا تنسى (۱۰۷۱ھ) ❶۔

واقعہ یہ ہے کہ اس سے بہتر کوئی تاریخ نہیں ہو سکتی تھی۔ قرآن پورا حفظ کر لیا تو لوح محفوظ (۱۰۷۲ھ) تاریخ ہوئی۔

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ حفظ قرآن کی نہایت دلچسپ تاریخ مرزا روشن ضمیر نے کہی جو شاہ جہان کے عہد میں بخشی اور عالم گیر کے زمانے میں بندرگاہ سورت کے امین تھے۔

محی الدین و مصطفیٰ حافظ تو ‌‌ ‌ صاحب سیفی و مرتضی حافظ تو
تو حافظ شرع و حافظ تو شارع ‌ ‌ تو حافظ قرآن و خدا حافظ تو

غالباً سات ہزار روپے انھیں بطور انعام ملے ❷۔

---

❶ یہ سورہ الاعلیٰ کی آیت نمبر ٦ ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں: ''اے پیغمبر ﷺ ہم آپ کو قرآن مجید اچھی طرح پڑھا دیں گے۔ پھر آپ اسے بھولیں گے نہیں۔''

❷ المعارف لاہور، بابت ماہ مارچ ۱۹۶۸ء۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حدیث رسول سے محبت:

حدیث رسول ﷺ سے بھی اس شہنشاہ ہند کو نہایت شغف و محبت تھی۔ اگرچہ اس زمانے کے ہندوستان میں کتب حدیث کی زیادہ نشر و اشاعت نہیں ہوئی تھی، لیکن جو کتابیں میسر آتیں، اورنگ زیب ان سے پورا استفادہ کرتا اور حدیث کی معرفت اور آگاہی کے لیے کوشاں ہوتا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ تخت نشین سلطنت ہونے سے پہلے کتاب الاربعین مرتب کی، جس میں رسول اللہ ﷺ کی چالیس حدیثیں جمع کیں۔ پھر مسند نشین مملکت ہونے کے بعد بھی چالیس احادیث پر مشتمل ایک اربعین مرتب کی۔ بعد ازاں دونوں اربعین کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا اور ان پر تعلیقات و فوائد تحریر کیے۔

علم فقہ میں درک اور فتاویٰ عالم گیری کی تدوین:

اورنگ زیب عالم گیر مسائل فقہیہ میں عبور رکھتا اور اس کی جزئیات کا ماہر تھا۔ فقہ کے متعلق اس کی بہت بڑی خدمت یہ ہے کہ دیار ہند کے علمائے کرام کی ایک عظیم جماعت سے ''فتاویٰ ہندیہ'' مرتب کرایا جو فتاویٰ عالم گیری کے نام سے مشہور ہے۔ یہ فتاویٰ عربی زبان میں ہے اور چھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ ترتیب و تالیف کے بعد یہ فتاویٰ بہت سے لوگوں نے نقل کیا اور اس کے متعدد نسخے مختلف اسلامی ممالک حجاز، مصر، شام اور روم وغیرہ میں پہنچے اور شائع و ذائع ہوئے اور وہاں کے علمائے دین واصحاب افتا نے اس سے استفادہ کیا۔

فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب و تدوین کے بعد عالم گیر نے اپنے تمام ممالک محروسہ میں حکم جاری کر دیا تھا کہ عدالتی فیصلوں میں اسی کو سامنے رکھا جائے اور اسی کے مطابق فیصلے کیے جائیں۔ اس کے لیے ہندوستان کے مختلف شہروں اور علاقوں میں اہل علم قاضی مقرر کیے تاکہ وہ شریعت کی روشنی میں فیصلے صادر کریں اور اس ضمن میں کسی نوع کی مداہنت کا ثبوت نہ دیں۔ ہر معاملے میں دیانت دارانہ تحقیق و تفتیش کے بعد صحیح نقطہ نظر تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

مضامین و مندرجات کے اعتبار سے فتاویٰ عالم گیری فقہ کی نہایت مفصل کتاب ہے جو مختلف اوقات میں ہندوستان کے مختلف مقامات لکھنؤ اور کلکتہ وغیرہ کے مطابع میں زیور طبع سے آراستہ ہوتی رہی۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں اس کے ایک حصے کا قلمی نسخہ بھی موجود ہے، جس کا نمبر ۸۹۵۲ ہے۔ یہ نسخہ ۱۴۱۱ اوراق پر محیط ہے اور بہترین خط نسخ میں ہے۔ یہ نسخہ مندرجہ ذیل مضامین کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

کتاب الدعویٰ، کتاب الاقرار، کتاب العلم، کتاب المضاربتہ، کتاب الودیعہ، کتاب العاریہ، کتاب الھبۃ، کتاب الاجارہ، کتاب المکاتب، کتاب الولاء، کتاب الاکرا، کتاب الحجر، کتاب الماذون، کتاب الغصب۔

اسلامی ہند میں فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب و تدوین بہت بڑی علمی اور فقہی خدمت تھی جو ایک نیک

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دل اور صاحب علم حکمران کی سعی سے برصغیر کے نامور فقہا کی ایک منظم جماعت کے ہاتھوں انجام پائی۔ اس اہم کام کا جس انداز سے آغاز ہوا، جس نہج سے یہ مختلف مراحل سے گزرا اور پھر جس اسلوب سے یہ تکمیل پذیر ہوا، اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ کہنا چاہیے کہ اس کے مرتبین نے مسائل فقہ کا ایک دل آویز گلستاں سطح کاغذ پر سجا دیا ہے اور صفحات قرطاس پر مباحث بوقلموں کی ایک فکر انگیز جنت بسا دی ہے۔ اس میں عبادات اور معاملات کے ہر پہلو کو پوری وضاحت سے بیان کیا گیا ہے اور ہر مسئلے کے ہر گوشے کو کتب فقہ کے حوالوں سے منقح کیا گیا ہے۔ کسی حصے میں بھی حتی الامکان تشنگی باقی نہیں رہنے دی گئی۔

فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب وہی ہے جو دیگر کتب حدیث وفقہ کی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ بہت مفصل اور مبسوط ہے۔ نئے مضامین باقی کتابوں کی طرح ''کتاب'' کا عنوان قائم کر کے شروع کیے گئے ہیں۔ پھر سوائے کتاب اللقیط، کتاب اللقطہ، کتاب الاباق اور کتاب المفقود کے باقی تمام عنوانات میں الگ الگ باب مقرر کیے گئے ہیں اور ہر باب میں ''فصل'' کے تحت کچھ ذیلی عنوانات قائم کر کے مسئلہ زیر بحث سے متعلق بہت سے ضمنی مسائل کی وضاحت کی گئی ہے۔ مثلاً کتاب الطہارت سات ابواب پر مشتمل ہے، جنھیں باب اول، باب ثانی، باب ثالث، باب رابع، باب خامس، باب سادس، باب سابع کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ پھر ہر باب کے تحت کچھ فصول ہیں جنھیں فصل اول، فصل ثانی، فصل ثالث کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔

فتاویٰ عالم گیری میں جو مسائل معرض بیان میں آئے ہیں، دو وجہ سے بالخصوص انھیں بڑی اہمیت اصل ہے۔

ایک وجہ یہ کہ یا تو وہ راجح اور مفتیٰ بہ ہیں یا ظاہر الروایت کے ہیں۔ یعنی فقہ حنفی کی ان چھ معروف کتابوں سے ماخوذ ہیں، جو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہیں، اور جنھیں ظاہر الروایت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور وہ ہیں، جامع الکبیر، جامع الصغیر، المبسوط، الزیادات، السیر الکبیر اور السیر الصغیر۔ یہ کتابیں علمائے فقہ حنفیہ میں بہت بڑی اہمیت کی حامل ہیں اور فقہ حنفی کی عمارت ان ہی کتابوں کی بنیاد پر استوار ہے۔

اس کی فقہی اہمیت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ فقہ کی تمام اہم اور قابل ذکر کتابوں کا نچوڑ ہے اور اس کے مآخذ ومراجع فروع فقہ میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

فتاویٰ عالم گیری اپنے اندر جو خصوصیات رکھتا ہے اور جن اوصاف کا حامل ہے، ان کی وجہ سے وہ فقہ حنفیہ کی دوسری تمام کتابوں سے ممتاز ہے، اور وہ خصوصیات واوصاف مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اس کی ترتیب وتدوین صرف ایک شخص یا دو چار علما کی علمی کوششوں کا نتیجہ نہیں، بلکہ یہ علمائے دین اور فقہائے کرام کی ایک بڑی اور ممتاز جماعت کی مساعی جمیلہ سے معرض تصنیف میں آیا۔ عالم گیر نے جن علمائے کرام کو اس کی ترتیب وتدوین کے لیے منتخب کیا، وہ اس دور کے علمی میدان میں اپنا کوئی حریف نہ رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں زہد وتقویٰ اور تدین وورع میں بھی ان کا مقام بہت بلند تھا۔ انھوں

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے بہ درجہ غایت عرق ریزی سے یہ فریضہ انجام دیا۔ پھر چوں کہ یہ علمائے فقہ کی ایک پوری جماعت کی تگ و تاز علمی کا نتیجہ ہے، اس لیے اس میں فقہ احناف کے لحاظ سے غلطی کا امکان کم ہے اور ہر مسئلہ تفصیل سے بیان ہوا ہے۔

۲۔ اسلامی ہندوستان میں علم فقہ کی یہ پہلی مفصل و مبسوط کتاب ہے، جو ایک دین دار بادشاہ کی ذاتی سعی و محنت سے لکھی گئی اور اس پر عمل کی دیواریں تعمیر کی گئیں۔ پھر یہ کتاب کئی دفعہ کتابت و طباعت کی منزلوں سے گزری۔ فارسی اور اردو زبانوں میں اس کے ترجمے کیے گئے تاکہ اس کے مشمولات و مندرجات سے زیادہ سے زیادہ لوگ مستفید ہو سکیں۔ اس کتاب کے علاوہ بھی مختلف حکمرانوں کے دور میں فقہا نے فتاوے ترتیب دیے جو اس دور کے حکمرانوں کے نام منسوب ہوئے۔ لیکن یا تو وہ ایک "قلمی کتاب" سے آگے کی منزل کو نہ پہنچ سکے یا پھر ان میں سے کوئی فتاویٰ ایک قدم آگے بڑھ کر طباعت کے مرحلے سے گزرا بھی تو کما حقہ، شہرت نہ پا سکا۔ لیکن فتاویٰ عالم گیری اس باب میں سب سے فوقیت لے گیا اور علمی دنیا میں ایک اونچے مقام پر پہنچا۔

۳۔ اس میں فقط حصۂ عبادات ہی کو اہمیت نہیں دی گئی، اس کا حصۂ معاملات بھی متعدد ضروری تفصیلات و جزئیات پر محیط اور اہم مسائل کو محتوی ہے۔ مثلاً قضا، تجارت، بیوع، شفعہ، قصاص اور حدود وغیرہ کے احکام تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

۴۔ اس میں ہر مسئلے کے اصل ماخذ کا حوالہ دیا گیا ہے اور اگر اصل کتاب (جس کا حوالہ دیا گیا ہے) سامنے نہیں ہے اور مسئلہ دوسری کتاب سے نقل ہوا ہے تو ناقلا عن فلان کا لفظ لکھ کر اصل ماخذ کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

بہر حال اپنے مآخذ فقہی، مصادر علمی اور خصوصیات گوناگوں کے اعتبار سے یہ فتاویٰ خاص اہمیت کا حامل ہے۔

فتاویٰ عالم گیری کی تصنیف و ترتیب کا آغاز کب ہوا اور کتنی مدت میں یہ اہم کام پایۂ تکمیل کو پہنچا؟ اس ضمن میں قطعیت اور یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ البتہ منشی محمد کاظم نے اپنی کتاب "عالم گیر نامہ" میں جو اورنگ زیب کے پہلے دس سالہ دورِ حکومت کے واقعات پر مشتمل ہے، فتاویٰ عالم گیری کی جمع و تالیف کا تذکرہ کتاب کے آخری یعنی دسویں سن جلوس میں کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس فتاویٰ کی تدوین اس وقت شروع ہوئی جب اورنگ زیب کو تخت ہند پر متمکن ہوئے دس سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور شہنشاہ کی عمر پچاس سال کو پہنچ گئی تھی اور سن ہجری ۱۰۷۷ھ یا ۱۰۷۸ھ/ ۱۶۶۷ء تھا۔ لیکن اس کی ترتیب کا سلسلہ کتنے سال چلا اور یہ اہم کام کب اختتام کو پہنچا، اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔

عام طور پر مشہور ہے (جس کا صحیح ثبوت ہمیں نہیں ملا) کہ فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب و تدوین پر دو

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سال کی مدت صرف ہوئی۔ اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو اس کی تالیف کا آغاز ۱۰۷۷ھ یا ۱۰۷۸ھ میں ہوا اور تکمیل ۱۰۸۰ھ یا ۱۰۸۱ھ میں ہوئی۔ فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین میں بہت سے فقہائے ہند شامل تھے اور نیک اطوار بادشاہ نے اس کے لیے متعدد حضرات کی خدمات حاصل کی تھیں۔ لیکن ہمیں اٹھائیس فقہا کے اسمائے گرامی کا علم ہوسکا ہے۔ اس کی ترتیب کا اہتمام شیخ نظام برہان پوری کے سپرد تھا جو منقولات و معقولات کے ماہر تھے اور فقہ کے مختلف گوشوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ بادشاہ ان کی بے حد قدر کرتا تھا۔ جن علماء وفقہا کو اس عظیم کام کی انجام دہی کے لیے مامور ومنتخب کیا گیا تھا، اس میں بھی ان کا مشورہ شامل تھا اور یہی اس گروہِ فقہا کے سربراہ اور مہتمم تھے۔ بادشاہ اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود فتاویٰ کی ترتیب میں پوری دلچسپی لیتا تھا۔ شیخ نظام برہان پوری جو فقہ میں درجہ اجتہاد پر فائز تھے، روزانہ ایک صفحہ یا دو صفحے بادشاہ کے سامنے پڑھتے اور بادشاہ ایک ایک لفظ اور ایک ایک مسئلے کو کامل توجہ سے سنتا۔ الفاظ دیکھتا۔ عربی عبارات پر غور کرتا۔ استنباط مسائل کو سمجھتا اور کاتبوں کی غلطیاں خود درست کرتا۔ اس سے اس کی فقہ میں مہارت کا پتا چل سکتا ہے۔

فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین نہایت محنت اور جاں فشانی سے یہ خدمت انجام دیتے تھے اور انھیں شاہی خزانے سے اس کا معاوضہ دیا جاتا تھا اور کتابیں بھی مہیا کی جاتی تھیں۔

اورنگ زیب اس فتاویٰ کی اشاعت کے لیے بہت کوشاں رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ ذخیرۂ فقہ صرف عربی زبان تک محدود نہ رہے بلکہ اس عہد کے ہندوستان کی اصل علمی زبان (فارسی) میں بھی اسے منتقل کیا جائے۔ چنانچہ اس کے لیے اس کی نگاہِ انتخاب مشہور ترکی عالم عبداللہ چلپی پر پڑی۔ سرزمین ترکستان کا یہ عالم دین اورنگ زیب کے باپ شاہ جہان کے عہد حکومت میں فقیروں کے لباس میں ہندوستان آیا اور دہلی میں اقامت گزیں ہوا۔ اس کا رابطہ شاہ جہان کے وزیر اعظم سعداللہ خاں سے پیدا ہوا تو وہ اس کے علم وفضل سے بہت متاثر ہوا اور اس کا باقاعدہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ پھر شاہ جہان سے ملاقات ہوئی تو اس نے اس پیکر علم کو یومیہ وظیفے کا مستحق گردانا۔ شاہ جہان کے بعد اورنگ زیب عالم گیر وارث تخت ہند ہوا تو اس نے ان کو اپنی نوازشہائے شاہانہ اور عنایاتِ خسروانہ کے لیے مختص کر لیا اور فتاویٰ عالم گیری کے فارسی ترجمے پر مامور کیا۔

فتاویٰ عالم گیری کے دوسرے فارسی مترجم قاضی القضاۃ نجم الدین کاکوروی ہیں۔ ان کی تاریخ ولادت ۱۵ ربیع الاول ۱۱۵۷ھ/ ۱۷ اپریل ۱۷۴۴ء اور تاریخ وفات ۱۳ ربیع الثانی ۱۲۲۹ھ/ ۴ اپریل ۱۸۱۴ء ہے۔ یہ بھی ارض ہند کے بہت بڑے عالم اور عظیم فقیہ تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف اور شارح تھے۔ انھوں نے فتاویٰ عالم گری کی کتاب الجنایات تک کا مع فارسی شرح کے ترجمہ کیا۔ موصوف نے یہ خدمت لارڈ سر جان شور (۱۷۹۳ء۔ ۱۷۹۸ء) کے مشورے سے سرانجام دی تھی۔

افسوس ہے فتاویٰ عالم گیری کے پہلے فارسی ترجمے کا، جس کا خود اورنگ زیب عالم گیر نے حکم دیا تھا کوئی پتا نہیں چلتا۔ البتہ اس کا دوسرا ترجمہ جو مع شرح کے قاضی نجم الدین نے کتاب الجنایات تک کیا تھا، موجود

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ یہ ترجمہ کلکتہ اور لکھنؤ کے مطبعوں میں کئی بار چھپ بھی چکا ہے لیکن ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ اس کے قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ (حیدر آباد دکن) میں "ترجمہ فتاویٰ عالم گیری" کے نام سے اور خدا بخش لائبریری پٹنہ میں "کتاب الحدود والسرقہ" کے نام سے موجود ہیں۔ پٹنہ لائبریری کے نسخے پر کتاب اور مصنف کا نام درج نہیں۔ البتہ اس کی پشت پر "کتاب الحدود" مرقوم ہے۔ لیکن بقول مرتب یہ ترجمہ قاضی نجم الدین کے ترجمے سے حرف بحرف مطابقت کرتا ہے، اس لیے گمان ہوتا ہے کہ یہ وہی ترجمہ ہے۔

فتاویٰ عالم گیری کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے اور اتفاق ملاحظہ ہو کہ قبول و تداول کے لحاظ سے یہ ترجمہ اصل عربی کتاب سے فوقیت لے گیا ہے۔ یہ ترجمہ مشہور عالم دین مولانا سید امیر علی ملیح آبادی مرحوم (متوفی ماہ رجب ۱۳۳۷ھ/ اپریل ۱۹۱۹ء) نے کیا تھا، جو مفسر قرآن اور کئی علمی کتابوں کے مصنف اور شارح و مترجم تھے۔ یہ ترجمہ منشی نول کشور (لکھنؤ) نے کرایا تھا اور سب سے پہلے اسی مطبع میں شائع ہوا تھا۔ فاضل مترجم نے اس پر ایک مبسوط اور مفصل مقدمہ بھی سپرد قلم کیا جو بے شمار معلومات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ پاکستان اور ہندوستان میں اصل عربی کتاب کی نسبت اہل علم میں یہی اردو ترجمہ زیادہ متداول اور رواج پذیر ہے۔

مولانا سید امیر علی ملیح آبادی، حضرت مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی (متوفی ۱۰ رجب ۱۳۲۰ھ/ ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۲ء) کے شاگرد اور مولانا ابوالکلام آزاد کے رفیق خاص اور نامور عالم مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے استاذ تھے۔ مسلکاً اہل حدیث تھے[1]۔

یہاں یہ یاد رہے کہ اورنگ زیب عالم گیر چاہتا تھا کہ اس کے ملک ہندوستان (اور دیگر اسلامی ملکوں) میں فتاویٰ عالم گیری کے مطابق کاروبارِ حکومت چلایا جائے، دیگر ملکوں کو تو چھوڑیے خود اپنے ملک میں بھی وہ اس کے مطابق حکومت نہ چلا سکا۔ کہیں بھی اس پر عمل نہ ہوا، نہ عدالتوں میں نہ دیگر محکموں میں۔

عالم گیر کا کتب خانہ:

شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر بے حد علمی ذوق کا مالک تھا۔ اس کا اپنا ایک ذاتی کتب خانہ تھا جو ساڑھے تین سو سال پیشتر کے ہندوستان کے حالات کے مطابق بڑا وسیع اور مختلف علوم و فنون سے متعلق بہت سی کتابوں پر مشتمل تھا۔ فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب و تدوین پر جو علمائے کرام اور فقہائے عظام مقرر ہوئے وہ زیادہ تر اسی کتب خانے سے مدد لیتے تھے۔ "عالم گیر نامہ" کا مصنف لکھتا ہے کہ یہ کتب خانہ اطراف و اکناف عالم سے فراہم کیا گیا ہے اور اس میں بلند پایہ مستند کتابیں اور ہر موضوع کی مبسوط و مفصل تصانیف موجود ہیں۔

[1] فتاویٰ عالم گیری کی جمع و تدوین اور اس کے مرتبین و مترجمین کے مفصل حالات نیز اس کے مشمولات و مندرجات کے لیے ملاحظہ ہو، راقم السطور کی کتاب "برصغیر میں علم فقہ" از صفحہ ۲۴۵ تا ۲۶۴۔ شائع کردہ کتاب سرائے الحمد مارکیٹ اردو بازار، لاہور

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علمائے وقت تحقیق و تدقیق اور غور رانیق کے لیے اس کتب خانے کی طرف رجوع کرتے ہیں ❶۔

اس سے آگے وہ رقم کرتا ہے کہ جو علمائے کرام ترتیب فتاویٰ کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، ان کے علمی مرتبے کے مطابق ان کے وظائف و عطایا کا انتظام بھی کیا گیا ہے اور ان کے لیے بادشاہ کے کتب خانہ خاص سے کتابیں بھی مہیا کی جاتی ہیں ❷۔

عالم گیر کا یہ کتب خانہ اس کے آبا و اجداد کے زمانے سے چلا آ رہا تھا اور مغلیہ خاندان کا ہر بادشاہ اپنے ذوق علمی کی روشنی میں انتہائی شوق سے اس کو ترقی دیتا اور اس میں اضافہ کرتا تھا۔ عالم گیر کے والد شاہ جہان کو بھی کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا اور یہی شوق عالم گیر کو بھی ورثے میں ملا اور اس نے اپنے پیش روؤں کے کتب خانے میں مزید توسیع کی۔ چنانچہ ''ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے'' کے فاضل مصنف سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے اپنی کتاب میں ''کتب خانے'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے، جس میں انھوں نے شاہانِ ہند اور شاہانِ مغلیہ کے کتب خانوں کے بارے میں خاصی تفصیلات بہم پہنچائی ہیں۔ ''عالم گیر کا کتب خانہ'' کے ضمنی عنوان کے تحت بتایا گیا ہے کہ عالم گیر نے اپنے پہلے حکمرانوں کے کتب خانے کو مزید ترقی دی۔ الفاظ حسب ذیل ہیں:

''سلطان اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں اس کتب خانے کو اور زیادہ ترقی ہوئی۔ اس کا ناظم محمد صالح تھا جو عیسیٰ خاں ترخان (سندھ) کا دوسرا لڑکا ہے اور مہتمم مہابت خاں کا پوتا منصور مقرر ہوا۔ اس کو مکرمت خاں کا خطاب بادشاہ نے عطا فرمایا۔ ۱۰۶۹ھ/ ۱۶۵۹ء میں اس کے مہتمم سید علی حسینی ہوئے، جیسا کہ ایک کتاب (قرآن شریف) کی مہر سے ظاہر ہوتا ہے جو اس وقت رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے میں موجود ہے ❸۔''

عہد عالم گیری کے علمائے کرام:

اورنگ زیب عالم گیر کے عہد کو علم و فضل اور تحقیق و کاوش کے لحاظ سے عہد زریں سے تعبیر کرنا چاہیے۔ اس عہد میں بے شمار علمائے کرام، فقہائے عالی مقام اور مشائخ عظام سرزمین ہند میں موجود تھے۔ ان حضرات کے جگہ جگہ مدارس قائم تھے جن میں کثیر تعداد میں تشنگان علوم اپنی علمی تشنگی بجھاتے تھے۔ پھر مشائخ کی خانقاہیں تھیں، جن سے لوگ روحانی فیوض حاصل کرتے تھے۔ خود بادشاہ علما و مشائخ کی خدمت میں حاضر ہوتا

❶ عالم گیر نامہ: ص ۱۰۸۶۔

❷ ایضاً: ص ۱۰۸۷۔

❸ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے: ص ۲۸۰، ۲۹۱۔ بحوالہ ماہ نامہ ''معارف'' (اعظم گڑھ) جلد ۱۴، ص ۴۲۲۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور ان سے علمی اور روحانی مسائل دریافت کرتا تھا۔ وہ ان کا بے حد قدر دان اور ان کی انتہائی تعظیم کرتا تھا۔ اس عہد کے علماو مشائخ کے اسمائے گرامی "فقہائے ہند" کی مختلف جلدوں میں مرقوم ہیں۔

فنون لطیفہ اور تعمیرات:

عالم گیر اپنے اسلاف کی طرح فنون لطیفہ اور تعمیرات سے بھی پوری دلچسپی رکھتا تھا۔ کئی بڑی بڑی عمارتیں، مشہور مسجدیں، متعدد سرائیں اور بہت سے مدرسے اس کے عہد کی تعمیرات میں شامل ہیں۔ مثلاً قلعہ آگرہ میں حصار شیر حاجی تعمیر کی گئی، اسی قلعے میں سنگ مرمر کی ایک خوب صورت مسجد خطیر رقم سے بنائی گئی جو آٹھ سال میں تیار ہوئی، دہلی کے لال قلعے میں سنگ مرمر کی ایک مسجد تعمیر ہوئی جو موتی مسجد کہلاتی ہے۔ بنارس میں ایک شان دار مسجد بنائی گئی۔ اسی طرح لاہور کی عظیم الشان مسجد جو بادشاہی مسجد کے نام سے موسوم ہے، اورنگ زیب کے ذوق تعمیر کا عمدہ ترین نمونہ ہے۔ سنگ مرمر کی یہ مسجد ۱۰۸۷ھ/ ۱۶۷۶ء میں فدائی خان کوکہ کی نگرانی میں کئی لاکھ روپے کے خرچ سے مکمل ہوئی۔ اس کے علاوہ حصار، دہلی، متھرا، آگرہ، گوالیار، احمد آباد، بنگال، لاہور اور کشمیر وغیرہ میں بہت سی عمارات اس کے عہد کی یادگار اور مغل فن تعمیر کا زندہ نقوش ہیں۔

عالم گیر کے اساتذہ:

شاہ جہان کو اہل علم سے خاص دل بستگی تھی اور اس کا دربار علما کے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس میں دور دور سے اصحاب کمال کو دعوت دی جاتی اور مختلف مسائل میں مباحث کا سلسلہ جاری رہتا۔ اس نے شہزادوں کی تعلیم کا بھی نہایت عمدہ انتظام کیا تھا۔ پھر اورنگ زیب چوں کہ ذاتی طور پر بھی شائق علم اور گرویدۂ علما تھا، اس لیے اس نے خود بھی متعدد مشاہیر اصحاب علم سے استفادہ کیا۔ اس کے اساتذہ کا ابتدائی سطور میں ذکر ہو چکا ہے۔ اب ذیل میں اختصار کے ساتھ ان کا تعارف کرایا جاتا ہے۔

۱۔ مولانا عبداللطیف سلطان پوری: عالم گیر کے یہ استاذ محترم جلیل القدر عالم تھے اور معقولات و منقولات میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ۱۰۳۶ھ/ ۱۶۲۷ء میں فوت ہوئے۔ مرآۃ العالم کی روایت کے مطابق ۱۰۴۳ھ/ ۱۶۳۴ء کو وفات پائی۔

۲۔ مولانا محمد ہاشم گیلانی: تفسیر، حدیث، فقہ اور امور دینیہ میں ماہر اور علوم حکمیہ میں کامل تھے۔ بارہ سال حجاز کی مقدس سرزمین میں قیام پذیر رہے۔ اسی (۸۰) سال عمر پا کر ۱۰۶۱ھ/ ۱۶۵۱ء کو اورنگ آباد میں انتقال کیا۔

۳۔ شیخ محی الدین بہاری: اورنگ زیب کے یہ استاذ ارض ہند کے مشاہیر فقہا میں سے تھے اور ملا موہن بہاری کے عرف سے معروف تھے۔ نہایت طباع اور تیز فکر تھے۔ چوراسی سال عمر پا کر ۱۰۶۸ھ/

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

١٦٥٨ء میں سفر آخرت اختیار کیا۔

۴۔ علامہ محمد شفیع یزدی: یہ شفیعائے یزدی کے نام سے مشہور ہیں۔ اقلیم ہند کے نامور فضلا میں سے تھے اور نواب دانش مند خاں کے لقب سے ملقب تھے۔ ١٠ ربیع الاول ١٠٨١ھ/ ١٨ جولائی ١٦٧٠ء کو راہی ملک بقا ہوئے۔

۵۔ سید محمد قنوجی: اورنگ زیب عالم گیر کے یہ استاذ جید عالم اور مشہور فقیہ تھے۔ فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین کی جماعت میں شامل تھے۔ بادشاہ ان کا بے حد احترام کرتا تھا اور ہفتے میں تین روز امام غزالی کی احیاء علوم الدین، کیمیائے سعادت اور فتاویٰ عالم گیری کے بارے میں ان سے مذاکرہ کرتا اور ان کے علم و فضل سے مستفید ہوتا۔ شاہ جہان بھی ان کا بے حد مداح تھا۔ شاہ جہان نے سریر آرائے سلطنت ہونے کے بتیسویں سال انھیں اپنے پاس بلایا اور پھر زندگی کے آخری سانس تک اس پیکر علم کو اپنے پاس رکھا۔ آگرہ کے قلعے میں اس کی نظر بندی کے ایام میں یہ اس کے پاس تھے۔ اس کی تجہیز و تکفین میں بھی شریک رہے۔ اس کی وفات کے بعد عالم گیر سے وابستگی اختیار کی۔ ١١٠١ھ/ ١٦٩٠ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

٦۔ علامی سعد اللہ خان: شاہ جہان کے وزیر اعظم تھے۔ علم و فضل اور وسعت معلومات میں یگانۂ روزگار تھے۔ عقل و فکر اور فہم سیاست میں ممتاز تھے۔ اصلاً پنجاب کے قصبہ چنیوٹ کے باشندے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد عرصے تک لاہور کی مسجد وزیر خاں میں علوم دینیہ کا درس دیتے رہے۔ ١٧ رمضان المبارک ١٠٥٠ھ/ ٢١ دسمبر ١٦٤٠ء کو شاہ جہان کے دربار میں گئے۔ وہ ان کی قابلیت سے بے حد متاثر ہوا اور بہت سے مناصب عطا کیے۔ ٢٦ جمادی الاخریٰ ١٠٦٦ھ/ ١١ اپریل ١٦٥٦ء کو اس جہان فانی سے عالم جاودانی کو رخصت ہوئے۔

٧۔ شیخ احمد معروف بہ ملا جیون امیٹھوی: بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ملا جیون بھی اورنگ زیب عالم گیر کے استاذ تھے۔ تفسیر احمدی، نور الانوار اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ملا جیون ٩ ذیقعدہ ١١٣٠ھ/ ٢٣ ستمبر ١٧١٨ء کو ٨٣ سال کی عمر پا کر فوت ہوئے۔

٨۔ شیخ عبدالقوی: یہ بھی عالم گیر کے استاذ تھے اور اس اعزاز پر نازاں تھے۔

٩۔ حاجی قاسم خوش نویس: ان کا ذکر ''عالم گیر نامہ'' میں عالم گیر کے ساتویں سال جلوس (١٠٧٤ھ/ ١٦٦٤ء) کے واقعات میں کیا گیا ہے۔ بہترین خوش نویس تھے۔ عالم گیر نے ان سے خط نسخ سیکھا۔

١٠۔ شیخ علی خطاط: دور مغلیہ کے فاضل بزرگ اور اس زمانے کے نامور خطاط تھے۔ شاہ جہان نے انھیں عالم گیر کا اتالیق مقرر کیا اور جواہر رقم کے لقب سے نوازا۔ عالم گیر نے ان سے خط نستعلیق کی مشق کی۔ اچھے شاعر بھی تھے۔ عالم گیر نے تخت نشین ہونے کے بعد ان کو اپنے کتب خانے کا مہتمم بنا دیا تھا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۱۔ شیخ سیف الدین سرہندی: اورنگ زیب عالم گیر کے مرشد تھے اور وہ ان کا انتہائی معتقد تھا۔ شیخ محمد معصوم سرہندی کے بیٹے اور حضرت مجدد الف ثانی کے پوتے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں مشہور تھے۔ ۱۰۴۹ھ/ ۱۶۳۹ء میں بمقام سرہند پیدا ہوئے اور ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۰۹۶ھ/ ۱۳؍ اپریل ۱۶۸۵ء کو صرف سینتالیس سال کی عمر میں وفات پائی۔

۱۲۔ شیخ محمد معصوم سرہندی، حضرت مجدد الف ثانی کے فرزند رشید تھے۔ نہایت متقی اور عبادت گزار۔ ۱۱؍ شوال ۱۰۰۷ھ یا ۱۰۰۹ھ/ ۲۷؍ اپریل ۱۵۹۹ء یا ۱۶۰۱ء کو سرہند میں پیدا ہوئے۔ اورنگ زیب ان سے بیعت تھا اور ان کو بے حد لائق احترام گردانتا تھا۔ شیخ ممدوح نے ۹؍ ربیع الاول ۱۰۷۹ھ/ ۷؍ اگست ۱۶۶۸ء کو سرہند میں وفات پائی۔

بزرگان سرہند سے تعلق خاص:

بزرگان سرہند سے عالم گیر کو خاص تعلق ارادت اور بے پناہ عقیدت تھی۔ وہ خود بھی ان کا مرید تھا اور دوسروں کو بھی ارادت کے لیے ان کے پاس بھیجتا تھا۔ اس کا ثبوت بہت سے واقعات سے ملتا ہے جن میں ایک واقعہ مآثر عالم گیری میں اس طرح درج ہے کہ ایک مرتبہ عالم گیر کے پاس ایک شخص آیا اور کہا کہ میں بادشاہ کا مرید ہونے کے لیے بنگالہ کے دور دراز ملک سے آیا ہوں۔ بادشاہ کو اطلاع ہوئی تو اس نے مسکرا کر جیب سے کچھ نقدی نکالی اور ملازمین سے کہا کہ یہ شخص ہمارے فیض سے جس چیز کا امیدوار ہے، وہ یہی ہے، یہ اسے دے دو۔ لیکن اس شخص نے بادشاہ کا عطیہ پھینک دیا اور مایوس ہو کر دریا میں چھلانگ لگا دی۔ قریب ہی شاہی خیمے نصب تھے، دریا میں پیراک کود پڑے، اسے نکالا تو بادشاہ نے ہندی کا ایک شعر پڑھ کر کہا کہ اس شخص کو میاں محمد نافع سرہندی کے پاس لے جاؤ اور انھیں کہو کہ اسے مرید کر کے سرہندی ٹوپی اس کے سر پر رکھیں [1]۔

اورنگ زیب عالم گیر ہندوستان کا وہ شہنشاہ تھا جو متبع سنت اور خادم اسلام تھا۔ علما و فقہا کی صحبتوں میں بیٹھتا اور ان سے مستفید ہوتا۔ اگر کسی مسئلے کا اسے علم نہ ہوتا اور اسے بتا دیا جاتا تو بے حد خوش ہوتا اور فوراً اس پر عمل کرتا۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا وہ مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے خاندان کے بزرگوں کا نہایت عقیدت مند تھا اور ان کو اکثر دربار میں تشریف لانے کی تکلیف دیتا۔ خاندان مجددیہ کے بزرگوں میں ایک بزرگ شیخ سیف الدین سرہندی تھے، جو حضرت مجدد کے پوتے اور خواجہ محمد معصوم سرہندی کے فرزند رشید تھے۔ ۱۰۴۹ھ/ ۱۶۳۹ء میں پیدا ہوئے اور ۲۶ جمادی الاولیٰ ۱۰۹۶ھ/ ۲۰ اپریل ۱۶۸۵ء کو صرف سینتالیس سال کی عمر پا کر فوت ہوئے۔ بہ درجہ غایت نیک اور متقی تھے۔ بہت بڑے عالم و فاضل اور فقیہ تھے۔ ایک مرتبہ اورنگ زیب نے خواجہ محمد معصوم کو

[1] مآثر عالم گیری: ص ۲۳۳۔ ۲۳۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خط لکھا جس میں درخواست کی کہ مہربانی کر کے وعظ و نصیحت کے لیے کسی بزرگ کو دہلی بھیجا جائے۔ چنانچہ خواجہ ممدوح نے بادشاہ کے اس خط کو درخور اعتنا گردانا اور اپنے بیٹے شیخ سیف الدین سرہندی کو اس کے پاس دہلی بھیجا۔ بادشاہ نے نہایت تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا اور قلعے میں تشریف لانے کی درخواست کی۔ شیخ ممدوح جب بادشاہ اور امرا و وزرا کی معیت میں دہلی کے لال قلعے میں داخل ہونے لگے تو دیکھا کہ صدر دروازے پر دو ہاتھیوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں، جن پر دو فیل بان سوار ہیں۔ شیخ وہیں رک گئے اور قلعے میں جانے سے انکار کر دیا۔ فرمایا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ جس گھر میں تصویر ہو، اس میں رحمت کا فرشتہ داخل نہیں ہوتا۔ لہٰذا جو گھر رحمت خداوندی سے محروم ہے، سیف الدین اس میں نہیں جا سکتا۔ چنانچہ بادشاہ کے حکم سے ہاتھی اور فیل بانوں کی تصویریں توڑ دی گئیں اور شیخ قلعے میں داخل ہوئے۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ تذکروں میں مذکور ہے کہ شیخ سیف الدین دہلی گئے تو ایک روز بادشاہ نے ان کو باغ حیات کی سیر کو جانے کی درخواست کی۔ شیخ سیر کرتے کرتے تالاب پر پہنچے تو اس میں سونے کی مصنوعی مچھلیاں پڑی تھیں، جن کی آنکھوں پر جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ شیخ انھیں دیکھ کر نہایت کبیدہ خاطر ہوئے اور فرمایا جب تک ان مچھلیوں کو توڑا نہیں جائے گا میں یہاں نہیں بیٹھوں گا۔ باغ کے محافظوں نے تالاب کی خوب صورتی میں کمی واقع ہونے کے خیال سے مچھلیوں کو توڑنے میں تامل کیا، لیکن بادشاہ نے شیخ کی نصیحت کے مطابق اسی وقت مچھلیاں تڑوا ڈالیں اور کہا کہ مچھلیوں کی نسبت خاطر شیخ ہمارے لیے زیادہ نفع بخش ہے۔

شیخ واپس سرہند تشریف لے گئے تو بادشاہ نے خواجہ محمد معصوم کو شکریے کا خط تحریر کیا اور شیخ سیف الدین کے پند و مواعظ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تحسین کی۔ خواجہ ممدوح نے بھی بادشاہ کو جواب میں مکتوب ارسال کیا، جس میں رقم فرمایا کہ

الحمدللہ والمنة کہ فقیر زادہ منظور نظر و قبول گشتہ واثر صحبت بحصول انجامیدہ واز امر معروف و نہی منکر کہ شیوہ فقیر زادہ است اظہار شکر و رضا مندی نمودہ بودند، شکر خداوندی جل شانہ بریں عطیہ بجا آور دو سبب از دیاد دعا گوئی نمودہ آمد، چہ نعمتے است کہ بایں ہمہ طمطراق بادشاہی و دبدبہ سلطانی کلمہ حقہ بسمع قبول انند و گفتہ نامرادے موثر شود۔

(یعنی اللہ کا بے پایاں شکر ہے کہ فقیر زادہ کو منظور نظر اور لائق التفات سمجھا گیا اور اس کے اثر صحبت کو نتیجہ خیز قرار دیا گیا۔ نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا فقیر زادے کی فطرت میں داخل ہے۔ اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے اس نعمت عظمیٰ سے اسے بہرہ مند فرمایا۔ یہ اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ آپ نے طمطراق بادشاہی اور دبدبۂ سلطانی کے باوجود کلمہ حق سنا اور اسے تسلیم کیا۔)

یاد رہے یہ تصویریں وغیرہ اورنگ زیب سے پہلے سے چلی آ رہی تھیں، ورنہ خود اسے ذاتی طور پر اس قسم کا کوئی شوق نہ تھا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہندو امرا اور منصب داروں کی تعداد میں اضافہ:

اورنگ زیب چوں کہ پابند شریعت اور شیدائی اسلام تھا، اس لیے عدل و انصاف اور عفو و کرم کو سب سے مقدم گردانتا تھا۔ یہ قدرتی بات ہے جو شخص جتنا پکا مسلمان ہوگا، اتنا ہی رحم دل اور دوسروں کا خیر خواہ ہوگا، کیونکہ اسلام اپنے متبعین کو یہی تعلیم دیتا ہے۔ بالخصوص حکمران کو وہ اس سلسلے میں زیادہ ہدایات سے نوازتا ہے۔ اسی بنا پر اورنگ زیب نے عنان حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد اپنی ہندو رعایا کو بے حد مراعات دیں اور ان کے متعدد افراد کو باقاعدہ امرائے حکومت میں شامل کیا۔ جن ہندو امرا نے اسے قدم قدم پر دھوکا دیا تھا، انھیں بھی مہربانیوں کا مستحق ٹھہرایا۔

یہاں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ مغل عہد کے ہندوستان میں ہندوؤں کی طاقت کے تین اہم اور مشہور مرکز تھے۔ جے پور، جودھ پور اور اودے پور۔ جے پور اور جودھ پور نے مرکزی حکومت کی کلی طور پر اطاعت قبول کر لی تھی۔ لیکن بابر سے لے کر شاہ جہان تک اودے پور کی یہ حالت رہی کہ حملہ ہوا تو گردن جھکا لی اور خطرہ ٹلا تو پھر سر کشی پر اتر آیا۔ جے پور کا رئیس راجا جے سنگھ تھا۔ یہ مغل حکومت کا کامل وفادار تھا اور جودھ پور کا حکمران راجا جسونت سنگھ تھا۔ یہ دونوں راجے مغل حکومت کے حلقۂ امرا اور طبقۂ ملازمین میں شامل تھے۔ اودے پور کے مہارانا جگت سنگھ کی موت کے بعد اس کا بیٹا مہارانا راج سنگھ اس کا قائم مقام ہوا۔ اس نے وفات پائی تو اورنگ زیب کی طرف سے اس کے بیٹے اندر سنگھ کو دو ہزاری منصب اور بہادر سنگھ کو ایک ہزاری و پانصدی منصب عطا ہوا تھا۔

جسونت سنگھ کے بارے میں گزشتہ سطور میں بتایا جا چکا ہے کہ اس نے اورنگ زیب کے ساتھ بار بار غداری کی مگر فراخ دل بادشاہ نے ہر مرتبہ اس کو معاف کیا۔ جب عالم گیر کا اپنے بھائی شجاع سے معرکہ پیش آیا تو شجاع کے مقابلے میں جسونت سنگھ کو فوج کا حاکم مقرر کر کے بھیجا۔ لیکن جسونت سنگھ نے اس کمینگی کا ثبوت دیا کہ شجاع سے سازش کر کے رات کی تاریکی میں نصف شب کو عالم گیر کی فوج سے نکل کر اپنی تمام فوج کے ساتھ جو مجموعی لحاظ سے آدھی تھی، شجاع سے جا ملا۔ اس کی فوج نے شاہی مال اسباب اور خزانے پر بھی دست درازی کی، جس کے نتیجے میں نہایت ابتری اور افراتفری پھیل گئی۔ یہ بڑا نازک موقع تھا، جس پر عالم گیر نے انتہائی فہم و فراست سے قابو پایا اور جبین استقلال پر شکن تک نہیں پڑی۔ بعد ازاں اس کو سیوا جی کے مقابلے میں بھیجا تو اس وقت بھی غداری سے باز نہ آیا، مگر عالم گیر کا دل گردہ دیکھیے کہ اس نے نہ صرف اسے کوئی سزا نہ دی بلکہ اس کے خواست گار معافی ہونے پر ہر مرتبہ اسے معاف کیا اور منصب و خطاب اور جاگیر سے نوازا۔

اورنگ زیب عالم گیر نہایت فراخ حوصلہ بادشاہ تھا۔ وہ رعایا کے ہر شخص کو خواہ ہندو یا مسلمان لائق اعتماد قرار دیتا اور مملکت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز کرتا۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے مقالہ نگار پروفیسر شیر محمد گریوال کی تحقیق کے مطابق شہنشاہ اکبر کے عہد میں جسے ہندوؤں کا بہت بڑا خیر خواہ بلکہ محافظ سمجھا جاتا ہے، ہندو امرائے مملکت کی تعداد باون (۵۲) تھی اور اورنگ زیب کے عہد میں جسے مذہبی اعتبار سے ''متعصب'' قرار دیا جاتا ہے، یہ تعداد اکسٹھ تک پہنچ گئی تھی۔ اکبر کے دور حکومت میں ہندو منصب داروں کی تعداد چونسٹھ تھی، لیکن اورنگ زیب کے زمانے میں ایک سو اسی (۱۸۰) ہو گئی تھی، تقریباً تین گنا بڑھ گئی۔

پھر اورنگ زیب عالم گیر نے ہندوؤں کے مندروں اور عبادت خانوں کی بھی پوری حفاظت کی۔ البتہ متھرا، بنارس، کھنڈیلہ اور بعد میں اودے پور کے وہ بت خانے جن میں مسلمانوں کے خلاف سازشیں کی جاتی تھیں اور جو اسلامی حکومت کے خلاف بغاوتوں کا مستقل مرکز بن گئے تھے، منہدم کرا دیے گئے تھے۔ انہدام کی نوبت اس وقت آئی جب متھرا وغیرہ کے نواح میں ہندوؤں نے بے حد شورش بپا کی اور وہاں کے فوج دار عبدالنبی خاں کو قتل کر دیا۔ جب معاملہ یہاں تک پہنچ جائے تو اورنگ زیب کیا کوئی حکومت سازشوں اور بغاوتوں کے لیے نہ مذہبی مقامات کے استعمال کی اجازت دے سکتی ہے اور نہ کسی مخالف حکومت اڈے کے قیام کو برداشت کر سکتی ہے۔

قرآن مجید کی کتابت کا سلسلہ:

اورنگ زیب عالم گیر اپنے اوضاع و اطوار میں دیگر بادشاہوں سے بالکل ایک ممتاز نوعیت کا بادشاہ تھا۔ وہ نہایت خوش خط تھا۔ خط نسخ میں بالخصوص مہارت رکھتا تھا۔ قرآن مجید کی کتابت کا اسے بہت شوق تھا۔ دو قرآن مجید اپنے قلم سے لکھ کر حرمین شریفین بھیجے۔ واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرے مشاغل کے ساتھ ساتھ غالباً قرآن مجید کی کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ اس کے ہاتھ کے کتابت شدہ قرآن کے نسخے مختلف انداز میں بعض ذرائع سے لوگوں میں فروخت ہوتے رہتے تھے۔ یہ رقم الگ رکھی جاتی تھی۔ ایک روایت کے مطابق بادشاہ ٹوپیاں سی کر بھی فروخت کرتا تھا۔

عدل و انصاف:

شہنشاہ جہاں گیر کے پوتے اورنگ زیب عالم گیر کی ذات میں عدل و انصاف اور معدلت گستری کی خصوصیات بڑی نمایاں نظر آتی ہیں۔ اس کے عہد حکومت کا یہ روشن کارنامہ ہے، جس میں اپنے بیگانے، غریب و امیر اور دوست و دشمن سب ایک ہی صف میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کا ذکر وہ خود ایک خط میں کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ معاملات انصاف میں شہزادوں کو رعایا کے عام آدمیوں کے برابر سمجھتا ہوں۔

لین پول اورنگ زیب کے انصاف کی بڑی تعریف کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ مغل اعظم عدل کا دریائے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اعظم ہے۔ اس سلسلے میں اس کی نظر بڑی ہمہ گیر ہے۔ کوئی شخص اسے دھوکا نہیں دے سکتا۔ شہنشاہ کے حضور سفارش اور منصب و امارت کو اہمیت دینے کی کوئی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کی بھی وہ اس مستعدی اور توجہ سے بات سنتا ہے، جس طرح کہ بڑے سے بڑے حاکم اور امیر کی۔

اس کے عدل و انصاف کے بہت سے واقعات میں سے یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ مرزا کام بخش، عالم گیر کا نہایت چہیتا بیٹا تھا۔ اس کے رضاعی بھائی پر قتل کا الزام عائد ہوا۔ عالم گیر نے عدالت میں تحقیقات کا حکم دیا۔ کام بخش نے بھائی کی حمایت کی۔ بادشاہ کے علم میں یہ بات آئی تو اس نے کام بخش کو دربار میں طلب کیا۔ کام بخش اپنے اس رضاعی بھائی کو بھی دربار شاہی میں ساتھ لے گیا، کیوں کہ وہ اس کو اپنے ساتھ ہی رکھتا تھا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ رضاعی بھائی کے ساتھ کام بخش کو بھی قید کر دیا جائے۔ چنانچہ فوراً حکم کی تعمیل ہوئی اور دونوں کو جیل بھیج دیا گیا۔

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ شہنشاہ اورنگ زیب انتہائی نرم خو اور کشادہ دل تھا۔ دیوان عدالت میں ہر فریادی کو آنے اور اپنا مدعا پیش کرنے کی اجازت تھی۔ وہ ہر شخص کی فریاد نہایت اطمینان اور غور سے سنتا۔ بعض لوگ اپنا مدعا بیان کرنے اور مطالبات پیش کرنے میں تیز کلامی اور مبالغہ آرائی سے بھی کام لیتے، لیکن عالم گیر کی پیشانی پر کبھی شکن نہ پڑتی، نہ زبان سے کسی قسم کی خفگی کا اظہار ہوتا۔ بعض درباریوں اور مصاحبوں نے عرض بھی کیا کہ مستغیث جسارت اور عجلت کا مظاہرہ کرتے ہیں، اس کی انھیں اجازت نہیں دینی چاہیے۔ بادشاہ جواب دیتا کہ تلخ کلمات سننے سے ہمارے ملکۂ تحمل کو تقویت پہنچتی ہے۔

خبر رسانی کا اہتمام:

آج سے ساڑھے تین چار سو سال پہلے کے برصغیر کے بلاد و امصار دور دراز فاصلوں پر واقع تھے اور آبادی کا سلسلہ وہ نہ تھا جو آج نظر آ رہا ہے۔ اس میں خبر رسانی اور مخابرت کے ذرائع بہت محدود تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر نے اس شعبے کو بڑی وسعت دی۔ اس نے ملک کے حالات سے باخبر اور رعایا کے معاملات سے مطلع رہنے کے لیے واقعہ نگاری اور پرچہ نویسی کے محکمے کو اس دور کی صورت حال کے مطابق انتہائی ترقی کی منزل میں پہنچا دیا۔ بلاشبہ اس محکمے میں دیانت دار افراد کی ضرورت ہے، راشی اور خود غرض لوگ ملک کی بربادی اور حکومت کی تباہی کا موجب ہو سکتے ہیں، لیکن اورنگ زیب چوں کہ اس خطرے سے خوب آگاہ تھا اس لیے اس نے اس کی توسیع کے ساتھ ساتھ اس کی بے حد نگرانی کی اور نہایت احتیاط سے کام لیا۔ وہ کمال حکمت عملی سے وقائع نگاروں کو ہدایات دیتا اور اپنی گرفت میں رکھتا تھا۔

پرچہ نویسی اور مخابرت کے عمدہ انتظام کی وجہ سے اس وسیع برصغیر کے ہر حصے اور ہر گوشے کی تمام خبریں باقاعدہ بادشاہ کو پہنچتی تھیں۔ وقائع نگار بادشاہ کو تمام حالاتِ ملک سے باخبر رکھتے تھے اور بادشاہ لوگوں کی فلاح و بہبود اور ملک کی ترقی کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے شہزادوں، عاملوں، صوبے داروں اور مختلف محکموں کے سربراہوں کی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غلطیوں کی نشان دہی کرتا اور واقعہ نگار کے حوالے سے حالات کی اصلاح کی طرف انھیں توجہ دلاتا تھا۔ اس کا نظام مخابرت اس درجے حیرت انگیز طور پر وسیع تھا کہ اگر طول طویل فاصلے پر بھی کسی سوداگر یا راہ گزر کی کوئی چیز ضائع ہو جاتی تو اس کی اطلاع ممکن عجلت سے بادشاہ کو پہنچ جاتی اور وہ وہاں کے عامل یا حاکم سے سخت باز پرس کرتا۔

رعایا کے کوائف سے بادشاہ کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ اس کی نظر عمیق ہر چھوٹے بڑے واقعہ پر حاوی تھی۔ نہ کوئی بہ ظاہر معمولی واقعہ اس کی نگاہ تیز سے اوجھل تھا اور نہ کوئی بڑا اور اہم معاملہ اس کے علم و آگاہی سے مخفی۔ وہ اپنی عظیم مملکت کی ہر بات سے باخبر رہتا اور کامل غور و فکر کے بعد ان کے بارے میں مناسب ہدایات و احکام جاری کرتا۔

بادشاہ کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کا حق:

دنیا کے بادشاہوں کی طویل قطار پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ اس گروہ میں عالم گیر وہ تنہا بادشاہ ہے، جس نے اپنی مملکت میں یہ حکم جاری کیا کہ اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ بادشاہ کی طرف سے کسی معاملے میں حق تلفی ہوئی ہے یا بادشاہ نے غیر شرعی اقدام کیا ہے تو وہ بلا تامل عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے۔ اسے بادشاہ کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ پھر اس نے یہ حکم بھی جاری کیا کہ رعایا کے نادار اور غریب لوگوں میں مراحلِ تحقیق کے مصارف ادا کرنے کی استطاعت نہیں ہوتی، اس لیے شرعی وکیل مقرر کر دیے جائیں جو اس قسم کے مقدمات کی تحقیق میں ان کی پوری مدد کریں۔ بہ الفاظ واضح بادشاہ پر یہ نالش کا حق تھا جو اس نے ملک کی رعایا کے ہر فرد کو دے دیا تھا۔

چاندی کے بجائے چینی کی دوات:

اورنگ زیب نے حتیٰ الامکان احکام اسلام سے ہم آہنگ ہو کر حکمرانی کے فرائض انجام دیے۔ اس نے غیر شرعی لباس کی ممانعت کر دی اور سلطنت کے تمام تکلفات کو ترک کر دیا۔ اس سے پہلے بادشاہ چاندی کی دوات استعمال کرتے تھے، اس نے چاندی کی دوات کے بجائے چینی کی دوات لانے کا حکم دیا۔ انعام کی رقمیں بھی چاندی کی سینیوں میں رکھ کر پیش کی جاتی تھیں، اس نے ڈھال میں رکھ کر لانے کا حکم جاری کیا۔ ہندوستان کے اس خوش خصال بادشاہ نے زربفت وغیرہ کے خلعت بھی بند کر دیے۔

جیب خاص کے مصارف میں کمی:

سابق بادشاہوں کے زمانے میں بادشاہ کی جیب خرچ کے لیے کروڑوں روپے کی آمدنی کے علاقے مخصوص ہوتے تھے، جن سے بادشاہ کے ذاتی مصارف ادا ہوتے تھے۔ عالم گیر نے یہ سلسلہ ختم کر کے چند گاؤں

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور چند نمک سارا اپنے مصارف کے لیے مخصوص کر لیے تھے۔ باقی تمام علاقے اور مال واسباب کو بیت المال کی ملکیت قرار دے دیا تھا۔

عالم گیر کی زندگی کا اسلوب بالکل سادہ اور زاہدانہ تھا۔ ایک یورپین سیاح نے ۱۶۶۵ء میں اسے دیکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ اورنگ زیب بہت نحیف ونزار ہو گیا تھا اور اس کی کمزوری میں اس کی روزہ داری نے اور اضافہ کر دیا تھا❶۔

عالم گیر کی جیب خاص کے مصارف میں یہ حیرت انگیز کمی اور اکل وشرب اور رہن سہن کا یہ انداز اس کی اتباع شریعت کا بین ثبوت ہے۔

ملکی آمدنی میں اضافہ:

عالم گیر نے بہت سے ان ٹیکسوں کو جو پہلے سے چلے آرہے تھے، رعایا پر ناروا بوجھ اور شرعی طور پر ناجائز قرار دے کر منسوخ کر دیا تھا۔ لیکن اس نے مال گزاری کا کچھ ایسا عمدہ نظام مرتب کیا اور بندوبست اراضی میں کچھ ایسی بہترین ترامیم اور اصلاحات جاری کیں کہ محاصل سلطنت میں پہلے سے کئی گنا زیادہ اضافہ ہو گیا۔ مثلاً اکبر کے زمانے میں ایک کروڑ نوے لاکھ پونڈ اور شاہ جہان کے زمانے میں دو کروڑ ستائس لاکھ پچاس ہزار پونڈ وصول ہوتے تھے، مگر عالم گیر کے عہد میں یہ آمدنی بڑھ کر چار کروڑ پونڈ تک پہنچ گئی۔

یہاں یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ عالم گیر کے دور حکومت میں کئی نئے علاقے فتح کر کے حدود مغلیہ میں شامل کر لیے گئے تھے، مثلاً حیدر آباد، بیجاپور، آسام، چاٹ گام اور تبت کے علاقے زیر نگین ہوئے لہٰذا محاصل سلطنت میں اضافہ ضروری تھا۔

جواب یہ ہے کہ ان تمام مفتوحہ ملکوں کی آمدنی دس بارہ کروڑ روپے سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ اضافہ صرف عالم گیر کے اصلاحی اقدام اور بندوبست اراضی کی عمدگی کے باعث ہوا۔

مسلسل جدوجہد:

اورنگ زیب کی زندگی مسلسل جدوجہد اور پیہم تگ وتاز کا نام ہے۔ وہ عمر کے آخری دور میں بھی گھوڑے کی پیٹھ پر رہا اور ہتھیار کھول کر اطمینان سے نہیں بیٹھا۔ مملکت کا استحکام، فتنہ وفساد کا سد باب، ملک کا امن وامان، رعایا کی فلاح وبہبود اور باشندگان سلطنت کی ترقی وخوش حالی اس کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ اسی مقصد کی تکمیل اور اسی فرض کی انجام دہی کے لیے وہ عساکر شاہی کی قیادت کرتے ہوئے عمر بھر پہاڑوں اور جنگلوں میں پھرتا اور ندی نالوں کو عبور کرتا رہا۔ اتنے بڑے ملک کا وہ شہنشاہ ایسے ایسے مقامات میں گیا جہاں کسی

❶ اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر: ص ۱۱۶۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ادنیٰ حکمران نے بھی حالت امن میں قدم نہ رکھا ہوگا۔ بلند و بالا محلات وقصور کے اس مالک نے گرمیاں سردیاں اور برساتیں کپڑے کے نازک خیموں میں گزار دیں۔ اس سراپا جہاد اور پیکر سعی و ہمت کو گرد و غبار سے اٹے ہوئے خیمے سب سے زیادہ عزیز تھے۔ فتح و کامرانی کا مژدہ آتا تو ہرگز اظہار فخر نہ کرتا بلکہ بلا توقف بارگاہ خداوندی میں سربسجود ہو جاتا۔ امرائے مملکت اور حاکمان فوج ہدیہ تبریک پیش کرنے کے لیے حاضر خدمت ہوتے تو چہرے پر کبھی فاتحانہ تمکنت نمایاں نہ ہوتی۔ اگر کسی طرف سے ناخوش گوار اطلاع آتی تو بھی چہرہ غم و اندوہ کی کیفیت سے آشنا نہ ہوتا۔ صبر وسکون اور ضبط وثبات اس کا سرمایۂ حیات تھا اور اپنے اوقات شب وروز کو اس نے فرائض وواجبات کے ایک خاص سلسلے میں باندھ رکھا تھا۔

ادبیت اور حسن بیان:

اورنگ زیب کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اس کے رقعات اس کے شاہد ہیں جنھیں ادبیت اور حسن بیان کا بے مثال مرقع کہنا چاہیے۔ چھوٹے چھوٹے جملے نہایت بصیرت افروز اور پند و نصائح کا دل آویز مجموعہ ہیں۔ مناسب مواقع پر وہ قرآن کی آیات، رسول اللہ ﷺ کی احادیث اور مختلف شعرا کے اشعار بڑی خوب صورتی اور عمدگی سے درج کرتا ہے۔ قدیم و جدید شعرا کے بے شمار شعر اس کے حافظے میں محفوظ تھے۔ خود بھی شاعر تھا۔ یہ رباعی اسی کی ہے۔

دیروز پے گلاب می گردیدم پژمردہ گلے برسر آتش دیدم
گفتم کہ چہ کردہ ای کہ مے سوزندت گفتا کہ دریں دمے خندیدم

اورنگ زیب کی شعر و شاعری سے دلچسپی اور ادبیت کے سلسلے میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ زندگی کے آخری دور (۱۷۰۵ء) میں دکن کی متواتر و مسلسل مہموں میں وہ بیمار ہو گیا۔ عمر کم و بیش نوے سال کو پہنچ گئی تھی۔ لیکن اس حالت میں بھی تمام مشاغل حکمرانی بہ دستور جاری تھے۔ اس زمانے میں میر عبدالکریم جس کو امیر خاں کا خطاب عطا ہوا تھا، بادشاہ کا مقرب اور محرم خاص بن گیا تھا۔ وہ بیان کرتا ہے کہ اس بیماری کے دنوں میں ایک روز میں پلنگ کے قریب گیا تو بادشاہ سلامت پر ضعف ونقاہت کا غلبہ تھا اور آہستہ آہستہ یہ شعر پڑھ رہا تھا:

بہ ہشتاد ونود چوں در رسیدی بسا سختی کہ از دوراں کشیدی
وزانجا چوں بہ صد منزل رسانی بود مرگے بہ صورت زندگانی

میر خاں کہتا ہے، یہ شعر سن کر میں نے عرض کیا حضرت سلامت! شیخ نظام گنجوی نے یہ شعر اس بیت کی تمہید میں کہے تھے:

پس آں بہتر کہ خود را شاد داری دراں شادی خدارا یاد داری

یہ بیت سنا تو فرمایا پھر پڑھو۔ کئی مرتبہ پڑھوا کر کہا، لکھ دو۔ اگلی صبح بادشاہ سلامت کی بیماری ختم ہو چکی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھی۔ وہ صحت یاب ہو کر دیوان مظالم میں آ بیٹھے اور فرمایا تمھارے شعر نے ہمیں صحت کامل کی منزل میں پہنچا دیا اور جان ناتواں میں دوبارہ طاقت آ گئی۔

اس شعر میں خدا کو یاد رکھنے اور خوش رہنے کی تلقین ہے اور یہی تلقین اس نیک دل اور دین دار بادشاہ کے لیے دستاویز صحت بن گئی۔

عبادت گزاری اور شریعت کی پاس داری:

لین پول کے بقول مغلوں کی تاریخ میں عالم گیر سب سے پہلا بادشاہ تھا جو پکا مسلمان تھا۔ ممنوعات و مکروہات سے خود بھی پرہیز کرتا اور دوسروں کو بھی اس سے روکتا تھا۔ عبادت گزاری، عدل گستری، شریعت کی پاس داری، اصابت رائے اور شجاعت میں کوئی بادشاہ اس کی مثل نہ تھا۔ قرائن سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان میں یہ خالص اسلامی حکومت قائم کرنے کا خواہاں تھا اور اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہو گیا تھا لیکن انتظامی معاملات کی پیچیدگیوں اور مختلف حریف طاقتوں کی بے جا مداخلتوں نے اس کا پورا موقع فراہم نہ ہونے دیا۔

اورنگ زیب نے لمبی عمر پائی مگر اللہ نے اسے ہر قسم کی سنگین بیماریوں سے محفوظ رکھا اور حواس خمسہ میں باقاعدہ اعتدال قائم رہا۔ ایک روایت کے مطابق سماعت میں کسی قدر خلل آ گیا تھا مگر اس کا بھی کسی کو احساس نہ ہوتا تھا۔

دور آخر کا ایک رقت انگیز واقعہ:

مبارک اللہ واضح نے جو ارادت خاں کے خطاب سے سرفراز تھا اپنے تذکرے میں عالم گیر کے دور آخر کے بعض واقعات قلم بند کیے ہیں۔ اس کے حوالے سے مولانا غلام رسول مہر نے ایک نہایت رقت انگیز واقعہ نقل کیا ہے جو درج ذیل ہے

شہنشاہ اورنگ زیب کے انتقال سے ایک سال اور چند ماہ پیشتر ارادت خاں منڈو و مالوا کا قلعہ دار اور فوج دار مقرر ہوا تھا۔ رخصتی ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو بادشاہ نے خود خواب گاہ کا پردہ ہٹا کر اسے اندر بلا لیا اور فرمایا۔

''اب ہمارے اور تمھارے درمیان جدائی ہے۔ ملاقات کہاں ہو گی۔ تمھارے متعلق ہم سے دانستہ یا نادانستہ کوئی نامناسب امر پیش آیا تو اسے معاف کر دو اور تین مرتبہ کہو معاف کیا۔ اسی طرح تم نے ہماری بہت خدمت کی ہے، اگر دانستہ یا نادانستہ تم سے کوئی تقصیر ہو گئی ہو گی تو ہم بھی اسے معاف کرتے ہیں۔''

ارادت خاں کہتا ہے کہ شہنشاہ کی زبان سے یہ الفاظ سن کر شدتِ گریہ گلو گیر ہو گئی اور میرے حلق سے آواز نہیں نکلتی تھی، تاہم حضرت کے انتہائی اصرار پر میں نے حالت گریہ ہی میں تین مرتبہ ''معاف کیا'' کہا خود شہنشاہ بھی آب دیدہ ہو گیا اور دعائے خیر کے بعد مجھے رخصت کیا[1]۔

---

[1] ماہ نامہ ''المعارف'' (لاہور) بابت ماہ مارچ ۱۹٦۸ء۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آخری دور اور تجہیز و تکفین کی وصیتیں:

جنوری ۱۷۰۶ء میں اورنگ زیب احمد نگر پہنچ گیا تھا، جسے وہ اپنی آخری منزل بتاتا تھا۔ شہر سے دو میل باہر خیمہ نصب تھا۔ یہ اس کی حیات مستعار کا آخری سال تھا۔

مورخین کہتے ہیں کہ آخری ایام زندگی میں شہزادہ کام بخش اور شہزادہ محمد اعظم بھی احمد نگر میں باپ کے پاس پہنچ گئے تھے۔ کام بخش کو اس نے بیجا پور کا والی مقرر کر کے بھیجا اور محمد اعظم کو اس کے اپنے صوبے میں جانے کا حکم دیا۔ ان کے رخصت ہونے کے بعد بخار نے شدت اختیار کر لی۔ تاہم عالم گیر تین چار روز تک باقاعدہ نماز باجماعت ادا کرتا رہا۔ اس اثنا میں حمید الدین خاں نے نجومیوں کی تجویز کے مطابق عرض داشت پیش کی کہ اس موقعے پر ایک ہاتھی اور ایک بیش قیمت دانہ الماس بطور تصدق دینا چاہیے۔ صاحب تقویٰ بادشاہ نے اس عرض داشت پر تحریر کیا کہ ہاتھی تصدق کرنا ستارہ پرست ہندوؤں کا عقیدہ ہے۔ الماس اور ہاتھی تصدق کرنے کے بجائے چار ہزار روپے مستحقین میں تقسیم کرنے کے لیے قاضی القضاۃ کو دیے جائیں۔ ساتھ ہی بہ صورت وصیت لکھا کہ

۱۔ وفات کے بعد اس خاک سار کو جلد سپرد خاک کر دیں تابوت کے تکلف میں نہ پڑیں۔

۲۔ ٹوپیاں سینے کی اجرت سے چار روپے دو آنے عیسیٰ بیگ محل دار کے پاس موجود ہیں، اس سے کفن خریدا جائے۔

۳۔ تین سو پانچ روپے کتابت قرآن کی اجرت کے ہیں، وہ میری موت پر فقرا و مساکین میں بانٹ دیے جائیں۔

۴۔ میرا سر ننگا رکھا جائے، اس لیے کہ خدا کی بارگاہِ جلال میں ننگے سر جانے سے امید ہے کہ رحم و کرم کا مستحق ٹھہروں گا۔

وفات:

شہنشاہ اورنگ زیب کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ کاش اس کی وفات جمعہ کے روز ہو۔ جو شخص جمعہ کے دن فوت ہوتا اس پر بادشاہ رشک کرتا۔ ۲۸ ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ (۲۱ فروری ۱۷۰۷ء) کو جمعہ کا دن تھا۔ فجر کی نماز جماعت کے ساتھ بیٹھ کر پڑھی۔ نماز فجر کے بعد حسرت بھری نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ مطلب یہ تھا کہ کاش یوم رحلت جمعہ ہو۔ اشراق کی نماز بھی ادا کی۔ پھر بادشاہ غسل خانے میں گیا۔ غسل خانے سے پلنگ پر آیا۔ ہمیشہ باوضو رہنا اس کا معمول تھا۔ اگر کسی وجہ سے فوری طور پر پانی میسر نہ ہوتا تو پانی آنے تک تیمّم کر لیتا۔ پلنگ پر آنے کے بعد تیمّم کے لیے ابھی پہلی ضرب لگا کر چہرے پر ہاتھ پھیرے تھے کہ روح تنگ نائے بدن سے نکل کر اعلیٰ علیین میں پہنچ گئی۔ مبارک اللہ واضح کے بقول اس کے بعد بھی انگشت ہائے مبارک ایک ساعت

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تک معمول کے مطابق عقد انامل میں مصروف رہیں۔
احمد نگر آنے کے ایک سال ایک مہینا اور چند روز بعد وفات پائی۔

خلد آباد میں تدفین:

شہزادہ محمد اعظم باپ کی وفات کی خبر سنتے ہی راستے سے لوٹ کر احمد نگر پہنچ گیا اور انتہائی حزن و ملال اور سوز و محبت کے ساتھ والد کا نام لے لے کر روتا رہا۔ اپنی بہن زینت النسا بیگم اور دوسری خواتین کو تسلی دی اور صبر کی تلقین کی۔ وصیت کے مطابق جنازہ تیار کرایا۔ تھوڑی دور تک کندھا دیا۔ پھر جنازہ تدفین کے لیے شیخ زین العابدین کے مرقد کے قریب بھیج دیا۔ وفات کے بعد عالم گیر کا لقب ''خلد مکان'' قرار پایا۔ جہاں شہنشاہ کو دفن کیا گیا وہ مقام ''روضہ خلد آباد'' کے نام سے موسوم ہے۔

ہندوستان کے اس عدیم المثال شہنشاہ نے اکانوے (۹۱) سال تیرہ دن عمر پائی اور پچاس سال دو ماہ اور ستائیس دن حکومت کی۔ احمد نگر میں انتقال کیا اور اورنگ آباد سے بارہ کوس کے فاصلے پر ''روضہ خلد آباد'' میں دفن ہوا۔ وصیت کے مطابق اس کی تجہیز و تکفین نہایت سادہ طریقے سے ہوئی۔ اس کی قبر پر بھی کوئی عالی شان عمارت نہیں ہے۔

یہاں دو باتیں قابل ذکر ہیں۔

ایک یہ کہ عالم گیر کی تاریخ ولادت ''آفتاب عالم تاب'' کے لفظ سے نکلی تھی۔ جس تاریخ کو اس پر چتر شاہی سایہ فگن ہوا، وہ اس نے خود ''آفتاب عالم تاب'' سے نکالی اور تاریخ وفات میر سید عبدالجلیل بلگرامی نے ''فی آفتاب عالم تاب'' سے نکالی۔ یعنی آفتاب عالم تاب کا زوال۔ ''آفتاب'' اور ''عالم تاب'' کے الفاظ کو عالم گیر سے خاص مناسبت رہی۔

دوسرے یہ کہ ماہ ذی قعدہ کو بھی عالم گیر کے بارے میں ایک خصوصیت حاصل ہوگئی۔ وہ اسی مہینے میں ۱۵ ذی قعدہ ۱۰۲۷ھ (۲۴ اکتوبر ۱۶۱۸ء) کو پیدا ہوا۔ غرہ ذی قعدہ ۱۰۶۸ھ (۲۳ جولائی ۱۶۵۸ء) کو باغ اغرآباد (دہلی) میں جو بعد میں شالامار باغ کہلایا تخت حکومت پر بیٹھا۔ جمعہ کا دن تھا۔ اسی مہینے میں ۲۸ ذی قعدہ ۱۱۱۸ھ (۲۱ فروری ۱۷۰۷ء) کو جمعہ کے دن فوت ہوا۔

لیکن ایک بات:

گزشتہ صفحات میں اورنگ زیب عالم گیر کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی اختصار کے ساتھ نشان دہی کردی گئی ہے جس سے اس کے شب و روز کے متعدد گوشے نکھر کر قلب و نظر کے زاویوں میں آجاتے ہیں۔ بے شک وہ نہایت عاقل و فہیم، مردم شناس، کشور کشا، جرات مند اور عابد و متدین حکمران تھا۔ زبردست منتظم اور مملکت کے تمام نشیب و فراز پر گہری نگاہ رکھتا تھا۔ بڑے ٹھنڈے دل و دماغ کا مالک اور انتہائی بردبار اور

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حلیم الطبع تھا۔ قرآن کی تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم مروّجہ کا عالم تھا اور اپنے دور کے علما و فقہا اور مشائخ و صوفیا کا بے حد احترام کرتا تھا۔ ان کی صحبت میں بیٹھتا اور ان سے مستفید و مستفیض ہوتا تھا۔ متبع سنت اور حامیٔ دین متین تھا۔ لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود وہ انسان تھا اور اس کے ساتھ ہی پہلے شہزادہ اور پھر شہنشاہ تھا۔ معصوم ہرگز نہ تھا۔ غلطیاں اس سے بھی سرزد ہو سکتی تھیں اور ہوئیں۔

اس نے باپ کو نظر بند اور بھائیوں کو قتل کر کے تاج شاہی سر پر سجایا تھا۔ اس کی وجہ جواز بھی پیش کی جا سکتی ہے اور دلائل سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ جن حالات سے اسے دوچار کر دیا گیا تھا، ان کا تقاضا یہی تھا کہ وہ وہی قدم اٹھاتا جو اس نے اٹھایا، وہ اس میں حق بہ جانب تھا اور اسے یہی کچھ کرنا چاہیے تھا۔ خود اس کے خلاف بھی تو باپ اور بھائیوں کی طرف سے یہی کچھ کیا گیا تھا۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ یہ کامیاب ہو گیا اور باپ اور بھائی اپنے تمام منصوبوں میں ناکام رہے، مگر یہ بات ایک عام آدمی کی سمجھ سے بالا ہے کہ جب بھائی قتل ہو گئے اور خاندان میں کوئی اس کا حریف اور مدعیٔ سلطنت باقی نہ رہا تو باپ کو نظر بند رکھنے کی آخر کیا وجہ تھی؟ اس کا باپ شاہ جہاں بھی بہت منتظم، مصلح، قاطع بدعت، متبع سنت اور علما و مشائخ کا عقیدت مند تھا۔ ایام نظر بندی میں بہ ظاہر کوئی لائق اعتراض امر اس میں باقی نہ رہا تھا۔ وہ حکومت سے معزول ہونے کے بعد آٹھ سال زندہ رہا اور اس تمام عرصے میں عظیم القدر باپ کو پابندِ صوم وصلوٰۃ بیٹے نے نظر بند ہی رکھا۔ موت بھی اسی حالت میں آئی۔ عالم گیر کے بھائی واقعی امور سلطنت چلانے کے اہل نہ تھے۔ لیکن ان کو راستے سے ہٹانے کے بعد باپ کو بہ دستور محبوس رکھنا معلوم نہیں کیوں ضروری سمجھا گیا۔ اگر اسے رہا کر دیا جاتا تو یہ عالم گیر کا کوئی غیر سیاسی یا غیر اسلامی، غیر مدبرانہ فعل متصور نہ ہوتا۔ ہمیں مان لینا چاہیے کہ عالم گیر کا یہ فعل اس کے تدین و تقویٰ سے ہم آہنگ اور احترام والد سے ہم رنگ نہ تھا۔

اگرچہ شاہ جہان کو قلعے میں تمام سہولتیں میسر تھیں، تاہم وہ محبوس تھا۔ آٹھ سال کے طویل عرصے میں نہ کبھی وہ خود قلعے سے باہر نکلا اور نہ اسے نکالا گیا۔ اس کو موت نے رہائی دلائی اور اس کا جنازہ ہی باہر آیا اور تعجب کی بات یہ ہے کہ جنازہ بھی غیر معروف راستے سے رازداری کے ساتھ باہر لایا گیا۔

بہر حال یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ بادشاہوں کی تاریخ ہمیشہ اسی ڈگر پر چلتی رہی ہے جو عام طور سے تلوار کے قلم اور لہو کی روشنائی سے لکھی گئی ہے۔ وہ جو کچھ کرتے تھے اپنی صواب دید کے مطابق کرتے تھے۔ ان کے سامنے ملک کے استحکام کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کا استحکام بھی ہوتا تھا۔ اس میں نہ باپ بیٹے کو معاف کرتا تھا اور نہ بیٹا باپ کی پروا کرتا تھا۔ اس صورت حال کو ہم واقعات کے بہاؤ کے فطری نتائج یا تاریخ کے خطرناک موڑ سے تعبیر کر سکتے ہیں اور تاریخ کے خونی پہیے ہمیشہ گردش میں رہتے ہیں۔ انھیں کوئی طاقت کبھی روک نہیں سکتی۔ ان کا معاملہ اب اللہ کے ساتھ ہے اور وہ غفور رحیم ہے۔ ہماری نقد و جرح یا تنقید و تعریف ان واقعات و حوادث کو ہرگز متاثر نہیں کر سکتی جو تاریخ کے سینے میں ہمیشہ کے لیے نقش ہو چکے ہیں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اورنگ زیب کے بعد:

آخر میں یہ بتانا ضروری ہے کہ اورنگ زیب عالم گیر دودمانِ مغلیہ کا قابل فخر اور لائق صد ستائش فرزند تھا۔ یہ ہندوستان کا وہ حکمران تھا، جس نے اس وسیع ملک کی سرحدوں کو مزید ہم کنار وسعت کیا اور اس کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لیے اپنی تمام کوششیں وقف کر دیں۔ وہ خلیفہ نہ تھا لیکن اس کے جذبۂ دینی کی داد دینی چاہیے کہ نظام مملکت کو ہم دوش خلافت کرنے کے لیے ہر آن کوشاں رہا۔ وہ اسلام کا مبلغ اور دین کا داعی تھا۔ اس نے اپنے پیش روؤں کی ان تمام رسوم و عادات کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا تھا جو احکام شرع سے مطابقت نہ رکھتی تھیں۔ اس کی ذاتی زندگی ایک درویش کی زندگی کا پیکر حسین تھی۔ اس کے کارنامے تاریخ ہند کا ایک زریں باب بن گئے۔ اس کے اصول حکمرانی روشنی کا مینار تھے، لیکن افسوس ہے اس کے نااہل اخلاف نے ان کی پاسبانی نہ کی اور بے رحم مورخوں کو اپنے لائق اسلاف پر طعنہ زن ہونے کے مواقع بہم پہنچائے۔ ملک میں ہنگامہ آرائی کی ایسی فضا پیدا کر دی جو قتل و غارت پر منتج ہوئی اور پھر بابر کا یہ مفتوحہ ملک نہایت ذلت کے ساتھ ہمیشہ کے لیے ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔

اورنگ زیب کی وفات کے وقت اس کے تین بیٹے زندہ تھے۔ سب سے بڑا محمد معظم، اس سے چھوٹا محمد اعظم، اور سب سے چھوٹا کام بخش۔! باپ نے زندگی کے آخری دنوں میں وصیت کے ذریعے سے سلطنت ہند ان تینوں میں تقسیم کر دی تھی۔ بڑا لڑکا محمد معظم جو باپ کے بعد شاہ عالم بہادر شاہ اول کے لقب سے بادشاہ ہوا، اس وصیت پر عمل کرنا چاہتا تھا، لیکن اس کا بھائی محمد اعظم اس کے لیے تیار نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں بھائیوں کے درمیان جنگ ہوئی، جس میں محمد اعظم اور اس کے دو لائق بیٹے بیدار بخت اور والا جاہ مارے گئے۔ محمد معظم سب سے چھوٹے بھائی کام بخش کو بھی باپ کی وصیت کے مطابق اس کا علاقہ دینے پر آمادہ تھا، بلکہ کچھ زیادہ بھی دینے پر رضامند تھا۔ مگر بدقسمتی سے اس نے بھی یہ بات منظور نہ کی۔ بالآخر معرکۂ کارزار گرم ہوا اور کام بخش شدید زخم کھانے کے بعد وفات پا گیا۔

آگے چل کر مغل بادشاہوں میں تخت نشینی کے مسئلے پر پیہم خون ریزیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بہت سے قابل امرائے سلطنت مارے گئے اور رفتہ رفتہ ملک کے نظم ونسق کے تمام رشتے ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے۔ اس کی مناسب تفصیلات آئندہ جلدوں کے مقدمات میں بیان کی جا رہی ہیں۔

بندۂ عاجز

محمد اسحاق بھٹی

اسلامیہ کالونی۔ ساندہ۔ لاہور

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بارھویں صدی ہجری

الف

ا۔ سید آل محمد بلگرامی

سید آل محمد بن برکت اللہ حسینی واسطی بلگرامی ثم مارہروی ''سبع سنابل'' کے فاضل مصنف شیخ عبدالواحد بلگرامی (متوفی ۳ رمضان المبارک ۱۰۱۷ھ/ یکم دسمبر ۱۶۰۸ء) کی نسل سے تھے۔ پنجشنبہ کے روز ۱۹ رمضان ۱۱۱۱ھ/ ۲۸ فروری ۱۷۰۰ء کو بلگرام میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد گرامی سید برکت اللہ بلگرامی مارہروی (متوفی ۱۰ محرم ۱۱۴۲ھ/ ۲۵ جولائی ۱۷۲۹ء) ''صاحب البرکات'' کے لقب سے ملقب تھے اور عالم و فاضل بزرگ تھے۔ لائق بیٹے نے پدر بزرگ وار سے فقہ کی تعلیم حاصل کی اور اخذ طریقت بھی انہی سے کیا۔ ان کے سایۂ عاطفت میں تربیت باطنی کی بہت سی منزلیں طے کیں اور خرقہ خلافت سے سرفراز ہوئے۔ اپنے دور کے جلیل القدر عالم اور فقیہ تھے۔ والد کی وفات کے بعد اپنے آبائے کرام کے سجادۂ خلافت پر متمکن ہوئے۔ اتباع شریعت مطہرہ میں راسخ اور عمل و عقیدہ میں پابند سنت محمدیہ (علیہ الف الف تحیہ وسلام) تھے۔ ہمیشہ مطالعہ کتب میں مصروف رہتے اور اپنے وقت کا کوئی لمحہ غیر دینی کاموں میں صرف نہ کرتے۔ ان کے والد محترم سید برکت اللہ بلگرامی نے تصوف و معرفت پر جو کتابیں تصنیف کی تھیں، ان کا مطالعہ خصوصیت سے کرتے۔ ازالہ امراض قلبی میں مسیحا کی حیثیت رکھتے تھے اور سرگشتگانِ وادئ شوق سے انتہائی نرمی اور حلم سے بات کرتے۔ ہندوستان کے شہر مارہرہ میں سکونت پذیر تھے اور اس نواح کے اکثر لوگوں کو ان کے کوس مشیخت نے اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ حدود شریعت کے جادۂ مستقیم سے کبھی ادھر ادھر قدم نہ رکھتے۔

برصغیر کے اس صوفی عالم و فقیہ نے ۱۵ رمضان المبارک ۱۱۶۴ھ/ ۲۷ جولائی ۱۷۵۱ء کو مارہرہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ سید میر غلام علی آزاد بلگرامی نے ان اشعار میں تاریخ وفات نکالی۔

چراغ آل عبا شمع دود مان علا ـــ فزود جلوۂ او رونق حریم بہشت
افادہ کرد بہ من سال رحلتش ہاتف ـــ نصیب آل محمد بود نعیم بہشت (۱)

۱۱۶۴ھ

(۱) مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۱۱۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔ سید آیت اللہ رائے بریلوی

سید آیت اللہ حسنی نصیر آبادی ثم بریلوی، سید علم اللہ بریلوی (متوفی ۸ ذی الحجہ ۱۰۹۶ھ/ ۲۶ اکتوبر ۱۶۸۵ء) کے فرزند کبیر اور صالح عالم دین تھے۔ شجاع اور جواں مرد بھی تھے۔ علوم دینیہ اور تحصیل فقہ کے لیے اپنے والد گرامی قدر کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ حفظ قرآن کی نعمت بھی حاصل کی۔ قرآن مجید سے انتہائی شغف تھا۔ ایک مرتبہ نصیر آباد گئے ہوئے تھے کہ ہلال رمضان طلوع ہوا۔ والد گرامی نے پیغام بھیجا کہ رائے بریلی آجائیں اور نماز تراویح میں قرآن سنائیں۔ نصیر آباد میں ان کے عم محترم دیوان سید احمد فروکش تھے۔ انھوں نے اصرار کیا کہ جب تک ہمیں پورا قرآن نہ سناؤ گے، ہرگز رائے بریلی جانے نہ دوں گا۔ سید آیت اللہ نے پہلی ہی رات تراویح کی دو رکعتوں میں انتیس پارے ختم کر دیے اور باقی رکعتوں میں تیسواں پارہ تمام کر دیا۔ اس طرح عم محترم کی خواہش پوری کر کے یکم رمضان کو باپ کے حکم کی تعمیل میں رائے بریلی پہنچ گئے۔

آغاز شباب میں جہاد کا بڑا شوق تھا۔ اسی جذبہ شوق کے تحت چند اقربا کو ساتھ لے کر ناظم گورکھ پور کے پاس ملازم ہو گئے تھے۔ ایک دفعہ ایک جاگیردار کی سرکشی یہاں تک پہنچی کہ اس نے گورکھ پور پر حملہ کر دیا۔ جمعۃ المبارک کا دن تھا۔ سید آیت اللہ نماز کے لیے مسجد جا رہے تھے کہ ناظم گورکھ پور فوج لے کر اس سرکش جاگیردار کے مقابلے کے لیے نکل پڑا، سید آیت اللہ نے فرمایا پہلے جمعہ ادا کر لینا چاہیے، پھر لڑیں گے۔ ناظم بولا جب تک آپ جمعہ سے فارغ ہوں گے دشمن اپنا کام ختم کر کے چلتا بنے گا۔ آپ پیرزادہ ہیں، نماز ادا فرمائیں اور دعا کریں۔ ہم تو سب سے پہلے دشمن کا قلع قمع کریں گے۔

سید آیت اللہ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ مسجد میں گئے اور اطمینان سے جمعہ پڑھا۔ پھر اپنے ساتھیوں کو لے کر لڑائی کے لیے نکلے تو دیکھا کہ ناظم کا لشکر باغی جاگیردار کے مقابلے میں شکست کھا کر پسپا ہوتا ہوا شہر کے قریب پہنچ گیا ہے۔ سید آیت اللہ نے لشکر کو روکا اور جب دیکھا کہ یہ لوگ ہمت ہار چکے ہیں تو اپنی جماعت کو ساتھ لیا اور تلواریں سونت کر بجلی کی طرح دشمن کی صفوں میں جا گرے اور انھیں سراسیمہ وار بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس لڑائی میں سید ممدوح کے بہنوئی سید عبدالرحیم اور دو بھائی شریک تھے۔ سید عبدالرحیم نے اس معرکے میں جام شہادت نوش کیا۔

سید آیت اللہ رائے بریلوی نے آخری عمر میں ناظم کی ملازمت چھوڑ دی تھی۔

ایک دفعہ بعض خاندانی جھگڑوں کے فیصلے کے لیے سید آیت اللہ کو فرماں روائے ہند اورنگ زیب عالم گیر کے دربار میں دکن جانا پڑا۔ ایک بھائی دو بیٹے اور چند خادم ساتھ تھے۔ امور متنازعہ فیہ کا فیصلہ کرا کے واپس آرہے تھے کہ راستے میں بیمار پڑ گئے، یکایک حالت غیر ہو گئی، احتضار کا وقت قریب آیا تو سورہ زلزال پڑھی اور چادر اوڑھ کر لیٹ گئے۔ رفقائے سفر نے خیال کیا کہ آرام فرما رہے ہیں۔ ایک امیر جوان کے والد سید

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علم اللہ بریلوی کا ارادت مند تھا مزاج پرسی کے لیے آیا۔ کیفیت سنی تو کہنے لگا سید صاحب تو ابدی نیند سو گئے ہیں۔ کپڑا منہ سے ہٹا کر دیکھا تو واقعی جاں بحق ہو چکے تھے۔ یہ ۱۲ رجب ۱۱۱۶ھ (۳۰ اکتوبر ۱۷۰۴ء) کا واقعہ ہے۔ غسل و تکفین کے بعد میت کو تابوت میں ڈال کر رائے بریلی پہنچایا گیا اور وہیں والد ذی منزلت کے پہلو میں دفن ہوئے ❶۔

سید آیت اللہ بریلوی رحمۃ اللہ علیہ چوتھی پشت میں سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ (شہادت ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ/ ۶ مئی ۱۸۳۱ء) کے اجداد میں سے تھے۔

۳۔ مفتی ابوالبرکات دہلوی

مفتی ابوالبرکات کا سلسلۂ نسب یہ ہے: ابوالبرکات بن حسام الدین بن سلطان بن ہاشم بن رکن الدین بن جمال الدین بن سماء الدین دہلوی۔ مفتی ممدوح کبار فقہائے حنفیہ اور دیار ہند کے جلیل القدر علما میں سے تھے۔ دارالحکومت دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہیں نشو و نما پائی اور حصول علم کے بعد اسی شہر کی مسند افتا پر فائز ہوئے۔ پھر عہد عالم گیری میں منصب قضا پر مامور کیے گئے۔ ''مجمع البرکات'' کے نام سے ان کی ایک تصنیف بھی ہے جو مسائل فقہ پر محیط ہے اور دو ضخیم جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کتاب کا آغاز الحمد للہ الذی نور قلوب الموحدین بنور التوحید و الایمان کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ اس کتاب کا مقصد تصنیف، مختلف کتابوں میں بکھری ہوئی فقہی روایات کو خاص ترتیب کے ساتھ یک جا کرنا تھا تاکہ لوگوں کو ان مسائل سے علم و آگاہی میں کوئی دقت پیش نہ آئے اور وہ آسانی کے ساتھ صحیح نتیجے پر پہنچ سکیں۔ اس ضمن میں ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

لما كانت الروايات اشتاتاً متفرقة جمعتها جمعا ليسهل الوقوف بها و رتبتها ليتيسر الاطلاع عليها في هذا المختصر۔

مجمع البرکات کی تصنیف سے وہ ۹ ذی الحجہ ۱۱۱۶ھ/ ۲۳ مارچ ۱۷۰۵ء کو فارغ ہوئے۔

مفتی ابوالبرکات دہلوی کو فقہ و اصول سے خاص لگاؤ تھا اور ان کا شمار اس علم کے ماہرین میں ہوتا تھا۔ انھیں یہ شرف حاصل ہے کہ وہ فتاویٰ ہندیہ (فتاویٰ عالم گیری) کے مرتبین کی جماعت میں شامل تھے ❷۔

۴۔ قاضی ابوبکر مدراسی

قاضی ابوبکر مدراسی، شافعی المسلک تھے۔ اپنے عصر اور علاقے کے بہت بڑے شیخ اور نامور عالم اور فقیہ تھے۔ ان کی فراوانیٔ علم کی بنا پر نواب آصف جاہ نے ۱۱۵۷ھ/ ۱۷۴۴ء میں انھیں بلاد کرناٹک کا قاضی القضاۃ

❶ سید احمد شہید، ص ۴۷، ۴۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۰۱۔

❷ شمس التواریخ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۴۔ برصغیر میں علم فقہ، ص ۳۰۸، ۳۰۹۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقرر کر دیا تھا۔ شمس پلی میں نواب مذکور نے ان کو قطعہ زمین بھی عطا کر دیا تھا، جس سے انھیں بارہ ہزار روپے کی سالانہ آمدنی ہوتی تھی۔ نواب کے نزدیک وہ بڑی قدر و منزلت کے مالک تھے ❶۔

۵۔ شیخ ابوالحسن ویلوری

شیخ ابوالحسن ویلوری کا نسب نامہ یہ ہے: ابوالحسن بن عبداللطیف بن ابوالحسن بن عبداللطیف بن ولی اللہ بن عبداللطیف بن محمد بن عبدالحق بن قطب الدین بن عبدالفتاح عسکری احمد آبادی گجراتی ثم ویلوری مدراسی۔ ۱۱۱۷ھ/ ۱۷۰۵ء کو پیدا ہوئے۔ نہایت صالح عالم دین تھے۔ رفاہ عامہ کے کاموں میں پیش پیش رہتے تھے۔ ویلور میں مسجد، سرائے اور مکان تعمیر کیا۔ فقہ وعقائد اور تصوف میں مہارت رکھتے تھے۔ اس موضوع پر کتابیں بھی تصنیف کیں، لیکن ان کتابوں کے بارے میں پتا نہیں چل سکا کہ ان کے نام کیا تھے اور اب کہاں ہیں۔ فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ ۱۱۸۲ھ/ ۱۷۶۸ء کو فوت ہوئے ❷۔

۶۔ شیخ ابوالحسن سندھی کبیر

شیخ ابوالحسن نور الدین محمد بن عبدالہادی سندھی، عالم کبیر علامۂ وقت اور امام فی العلوم تھے۔ اصلاً سندھی تھے۔ لیکن مدینہ منورہ میں سکونت گزین ہو گئے تھے۔ اقلیم سندھ کے شہر ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی، پھر تستر چلے گئے، وہاں کے علما و شیوخ کی ایک جماعت سے تحصیل کی اور حدیث و فقہ اور دیگر علوم کی تمام اصناف میں بلند مرتبے کو پہنچے۔ تستر سے مدینہ منورہ کا عزم کیا اور وہاں قیام پذیر ہوئے اور مختلف علما سے اخذ علم کیا، جن میں شیخ محمد بن عبدالرسول برزنجی، شیخ ابراہیم بن حسن کورانی مدنی اور دیگر مشائخ حجاز شامل ہیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مدینہ شریف میں خود مسند تدریس آراستہ کی اور فضل و ذکا اور صلاح و تقویٰ کے اونچے مقام سے سرفراز ہوئے۔ دوران تدریس میں کئی بہترین کتابیں تصنیف فرمائیں، جن میں الحواشی الستة علی الصحاح الستة بالخصوص قابل ذکر ہے۔ صحاح ستہ پر انھوں نے حواشی سپرد قلم کیے۔ البتہ جامع ترمذی کا حاشیہ مکمل نہیں کر پائے۔ مسند امام احمد بن حنبل پر بھی نفیس اور مفید حاشیہ لکھا۔ ابن ہمام کی فتح القدیر پر بھی کتاب النکاح تک حاشیہ تحریر کیا۔ ابن قاسم کے حاشیہ جمع الجوامع پر ''الآیات البینات'' کے نام سے حاشیہ سپرد قلم کیا۔ امام نووی کی ''اذکار'' پر بھی حاشیہ قلم بند کیا۔ اس کے علاوہ اور بھی مفید حواشی تحریر کیے۔

شیخ ابوالحسن سندھی کبیر نے ۱۲ شوال ۱۱۳۸ھ/ ۲ جون ۱۷۲۶ء کو مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ ایک روایت کے مطابق ۱۱۳۶ھ/ ۱۷۲۴ء کو فوت ہوئے۔

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۵ بحوالہ اساس کرناٹک۔

❷ حدیقۃ المرام۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۵۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مدینہ منورہ میں اس جلیل القدر عالم کی وفات پر بڑے حزن و ملال کا اظہار کیا گیا۔ بے شمار لوگوں نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔ خواتین نے بھی ان کی وفات پر افسوس کا اظہار کیا اور گھروں سے جنازہ جاتے ہوئے دیکھا۔ دکان داروں نے فرطِ غم سے دکانیں بند کر دیں۔ حکومت کے ولات و عمال نے میت کو کندھا دیا۔ میت کو مسجد نبوی میں لایا گیا، وہیں نماز جنازہ پڑھی اور پھر اس عظیم سندھی الاصل عالم کو جنت البقیع کے قبرستان میں دفن کیا گیا❶۔

۷۔ شیخ ابوالحسن سندھی صغیر

شیخ ابوالحسن بن محمد صادق سندھی صغیر۔ یہ صغیر کے نام سے اس لیے مشہور ہوئے کہ شیخ ابوالحسن نورالدین محمد کبیر کے نام سے التباس نہ ہو۔ اپنے دور کے امام، عالم، محدث اور شیخ تھے۔ ارض سندھ میں پیدا ہوئے اور مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کی۔ اس زمانے میں مدینہ منورہ میں شیخ محمد حیات سندھی کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور طویل عرصے تک ان سے اخذ علم میں مصروف رہے۔ علوم سے فراغت کے بعد اسی سرزمین میں خود سرگرم تدریس ہوئے۔ ان کے عصر میں کثرت درس و افادہ میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ متعدد عمدہ کتابیں بھی تصنیف فرمائیں جن میں شرح جامع الاصول اور مختار الاطوار فی اطوار المختار لائق تذکرہ ہیں۔ خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔ ۲۵ رمضان المبارک ۱۱۸۷ھ/۱۰ ستمبر ۱۷۷۳ء کو مدینہ منورہ میں فوت ہوئے❷۔

۸۔ مولانا ابوالحسن کشمیری

مولانا ابوالحسن کشمیری علامہ وقت اور فاضل کبیر تھے۔ اپنے علاقے کے مشہور شیخ تھے۔ حنفی المسلک تھے اور شاہم بابا کے عرف سے معروف تھے۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہرین میں سے تھے۔ استحضار مسائل اور جزئیات فقہ پر عبور میں اپنے تمام معاصرین سے فائق تر تھے۔ حلاوت کلام اور عذوبت لسان میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ حفظ و ادراک اور اخذِ علوم میں اس نواح میں کوئی ان کا مدمقابل نہ تھا۔ تفسیر بیضاوی اور تعلیقات العصام کی عبارتیں کی عبارتیں متحضر تھیں۔ علمائے عصر سے مناظرہ و مباحثہ کے وقت قرآن مجید کی آیات کثرت سے پڑھتے۔ تفسیر بیضاوی اور دیگر کتب درسیہ پر مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے جو تعلیقات سپرد قلم کی ہیں، ان کو ہدف تنقید ٹھہراتے۔ ان کی علمی اور فنی غلطیوں کی نشان دہی کرتے اور پورے علمی اعتماد اور دلائل سے ان کو غلط قرار دیتے۔ بارھویں صدی ہجری کے اس نامور کشمیری عالم و فقیہ کی تاریخ ولادت و وفات کا علم نہیں ہو سکا۔ صرف اتنا پتا چل سکا ہے کہ یہ مغل حکمران شاہ جہاں کے عہد کے صاحب علم بزرگ تھے❸۔

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۵، ۶۔ بحوالہ سلک الدرر و تاریخ الجبرتی۔

❷ تحفۃ الکرام ص ۱۷۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۵۔

❸ حدائق الحنفیہ، ص ۴۵۷۔ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۴۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۷۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۱۔ روضۃ الابرار، ص ۲۵۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۹۔ مولانا ابوالخیر جون پوری

مولانا ابوالخیر بن قاضی ثناء اللہ فاروقی جون پوری، شیخ وقت، صالح عالم دین اور نامور فقیہ تھے۔ جون پور میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ ہوش سنبھالا تو حصول علم میں مشغول ہو گئے اور اس ضمن میں مختلف بلاد و امصار کا سفر کیا۔ متعدد علما سے تحصیل کی، علوم سے فارغ ہونے کے بعد خود درس و افادہ کی مسند آراستہ کی۔ زہد و عفاف اور تدین و قناعت کا پیکر تھے، عبادت گزار اور درس و تدریس میں کثیر الاشتغال تھے۔ ان کے علم و فضل کی وجہ سے انھیں ملک کا منصب افتا پیش کیا گیا۔ لیکن انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ علوم و فنون پر عبور و مہارت کا یہ عالم تھا کہ شرح عقائد تفتازانی اور شرح عقائد دوانی پر حواشی تحریر کیے۔

مولانا ابوالخیر جون پوری نے ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء کو جون پور میں وفات پائی اور اسی شہر میں اپنے والد قاضی ثناء اللہ جون پوری کے مدفن کے قریب دفن کیے گئے ❶۔

۱۰۔ سید ابوسعید بریلوی

سید ابوسعید بریلوی، سید علم اللہ بریلوی کے پڑپوتے اور سید احمد شہید بریلوی رحمہ اللہ کے اجداد میں سے تھے۔ مختصر سلسلۂ نسب یہ ہے: سید ابوسعید بن محمد ضیا بن آیت اللہ بن سید علم اللہ رائے بریلوی۔ نہایت متقی بزرگ تھے۔ بارھویں صدی ہجری کے دیارِ ہند کے صلحائے امت اور علمائے ربانیین میں سے تھے۔ رائے بریلی میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ مولانا عبداللہ امیٹھوی سے علم حاصل کیا۔ عالم شباب ہی میں اپنے عم محترم سید محمد صابر سے بیعت کر لی تھی۔ اپنے والد مکرم کے خلیفہ محمد یونس سے بھی استفادہ کیا۔ اس کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ سے تعلق پیدا کیا اور ان سے سلوک کی تکمیل کر کے خلافت کا منصب پایا۔ شاہ ولی اللہ، ان کے بھائی شاہ اہل اللہ، شیخ محمد عاشق پھلتی اور شاہ عبدالعزیز دہلوی سے خط کتابت کا سلسلہ جاری رکھا۔ بعض مکاتیب ''کلمات طیبات'' میں چھپ چکے ہیں۔ مکاتیب کا ایک مجموعہ مکتوب العارف کے نام سے سید ابوالقاسم ہسوی نے مرتب کیا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے سید ابوسعید کو اپنے مکتوبات میں جن الفاظ و القاب سے مخاطب فرمایا، وہ سید ابوسعید کی علوشان اور جلالت منصب کا بہت بڑا وثیقہ ہیں۔ مثلاً

- سیادت و نجابت مآب، حقائق و معارف آگاہ میر ابوسعید سلمہ اللہ تعالیٰ۔
- خلاصہ دودمان نجابت میر سید ابوسعید سلمہ اللہ تعالیٰ
- حقائق و معارف آگاہ، سیادت و نجابت دستگاہ، سلالۃ الاکابر میر ابوسعید۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ۳۰ محرم ۱۱۷۶ھ (۳۱ اگست ۱۷۶۲ء) کو فوت ہوئے۔ اس وقت خاندان علم

❶ تجلی نور، ج ۲ ص ۱۰۵۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۷۵۳، ۷۵۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۸۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الٰہی میں سے سید نعمان ان کے پاس تھے۔ انھوں نے سید ابوسعید کو یہ حزن افزا خبر جن الفاظ میں پہنچائی۔ ان کا ترجمہ یہ ہے:

''حضرت صاحب قدس سرہ آپ سے بہت خوشنود تھے اور آپ کے حال پر ان کی توجہات عالیات بیان میں نہیں آسکتیں۔ اکثر اوقات آپ کے حالات دریافت فرماتے رہتے تھے۔ شاید آپ سے آخری ملاقات کی آرزو تھی۔ ایک مرتبہ فرمایا: سید ابوسعید آنے کا ارادہ کیے ہوئے تھے، جلد پہنچ جائیں تو بہت اچھا ہو۔''

شیخ محمد عاشق پھلتی سے تفسیر، حدیث، فقہ اور کتب تصوف کی سند و اجازہ کا شرف حاصل تھا۔ نیز یہ علوم طلبا کو پڑھانے کی بھی اجازت تھی۔ علم نحو اور علم صرف کے درس کی اجازت سے بھی بہرہ مند تھے۔

سید ابوسعید بارعب، سخی، مہمان نواز اور غریب پرور تھے۔ ایک مرتبہ ایک لاکھ روپیہ کہیں سے آیا۔ جب تک پورے کا پورا مستحقین میں بانٹ نہ دیا گھر میں قدم نہ رکھا۔ اطراف مدراس میں ارادات مندوں کا وسیع حلقہ موجود تھا۔ ان کے خلفا میں سے مندرجہ ذیل حضرات کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

میر عبدالسلام بدخشانی، شیخ محمد مراد انصاری مکی، مولانا جمال الدین بن محمد صدیق قطب، مولانا عبداللہ آفندی، شیخ عبداللطیف حسینی مصری، شیخ عبدالقادر خالص پوری اور حاجی امین الدین بن حمید الدین کاکوروی۔

سید ابوسعید نے حج کی سعادت بھی حاصل کی۔ اس زمانے میں مدینہ منورہ میں شیخ ابوالحسن سندھی صغیر کا سلسلۂ درس جاری تھا۔ ان سے مصابیح کا درس لیا اور چھ مہینے قیام فرما رہے۔ پھر مکہ مکرمہ گئے۔ وہاں شیخ محمد میرداد انصاری سے جزریہ پڑھا، طائف بھی گئے۔ ہندوستان واپس آئے تو مدراس میں ٹھہرے۔ کافی عرصہ وہاں مقیم رہے۔ اس اثنا میں بے شمار اہل علم اور اصحاب سلوک نے ان سے استفادہ کیا۔

سید ابوسعید نے ۹ رمضان المبارک ۱۱۹۳ھ (۲۰ ستمبر ۱۷۷۹ء) کو اپنے وطن رائے بریلی میں وفات پائی۔ پسماندگان میں دو بیٹے تھے اور چار بیٹیاں۔ بیٹیوں میں سے ایک کا نام ناجیہ یا یافیہ تھا۔ یہ سید احمد شہید بریلوی رحمہ اللہ کی والدہ تھیں۔ بیٹوں میں سے سید ابواللیث، سید شہید کے حقیقی ماموں تھے جو حج سے واپسی پر کوڑیال بندر پہنچے تو بیمار ہوئے، وہیں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے [1]۔

۱۱۔ سید ابوسعید کالپوی

سید ابوسعید بن فضل اللہ بن احمد بن محمد بن ابوسعید حسینی ترمذی کالپوی، مشاہیر مشائخ ہند میں سے تھے۔ صالح اور متدین عالم دین تھے۔ کالپی میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت حاصل کی۔ اپنے والد شیخ فضل اللہ سے اخذ علم کیا، انہی سے علم فقہ کی تحصیل کی اور ان کی وفات کے بعد مسند مشیخت پر فائز ہوئے۔ والیٔ فرخ آباد نواب غضنفر جنگ ان سے بیعت تھے، امرا اور اعمال حکومت میں بڑی عزت و منزلت کے حامل تھے۔

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۰ تا ۱۲۔ سید احمد شہید، ص ۵۰، ۵۱۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سید ابوسعید کالپوی علمی اعتبار سے بڑے اونچے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ان کے دادا سید احمد اور پردادا سید محمد کالپوی بھی اجل علمائے برصغیر میں سے تھے۔ خاندانی اثراتِ علم اور آبائی علامات تصوف وصالحیت سے پوری طرح بہرہ یاب تھے۔ فارسی کے شاعر بھی تھے۔ لیکن ان کا شمار کم گوشعرا میں ہوتا ہے۔ عرفان تخلص کرتے تھے۔ اس نیک بخت عالم وفقیہ نے ۱۱۴۷ھ/ ۱۷۳۵ء میں وفات پائی ❶۔

۱۲۔ مفتی ابوسعید گوپاموی

مفتی ابوسعید کا نسب نامہ یہ ہے: ابوسعید بن علیم اللہ بن عبید اللہ بن عیسیٰ بن آدم شہابی گوپاموی ۱۷ ذی الحجہ ۱۰۸۴ھ/ ۱۵ مارچ ۱۶۷۴ء کو پیدا ہوئے۔ اور اپنے والد مکرم شیخ علیم اللہ گوپاموی سے علم حاصل کیا، یہاں تک کہ اپنے وقت کے شیخ اور عالم وفقیہ گردانے گئے۔ اصحاب دین اور اربابِ عمل علما میں سے تھے۔ اپنے والد کی وفات کے بعد گوپا مئو کی مسند افتا پر فائز ہوئے اور درس وافادہ کا منصب سنبھالا۔ مولوی وہاج الدین گوماموی اور خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔ ۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۸ء کو فوت ہوئے ❷۔

۱۳۔ شیخ ابوالطیب سندھی

شیخ ابوالطیب محمد بن عبدالقادر سندھی، شیخ صالح تھے اور علمائے محدثین میں سے گردانے جاتے تھے۔ ولادت اور نشو ونما علاقہ سندھ میں ہوئی اور انہی دیار میں علم حاصل کیا۔ بعد ازاں عازم حجاز ہوئے اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہاں شیخ حسن بن علی عُجیمی کا سلسلۂ درس جاری تھا، ان سے حدیث پڑھی۔ صحاح وسنن کی کتابوں کے لیے انہی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ علم حدیث کی اکثر کتابیں علامہ طاہر بن ابراہیم بن حسن کورانی مدنی کی شراکت میں پڑھیں۔ شیخ محمد سعید کوکبی قرشی سے بھی تحصیل کی۔ شیخ احمد البنا سے سند واجازہ کا شرف حاصل کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد عمر بھر درس و افادہ میں مصروف رہے۔ صدق وصلاح کے جوہر سے آراستہ تھے۔ جامع ترمذی کی عربی زبان میں شرح لکھی اور علم فقہ کی کتاب درمختار پر حاشیہ سپرد قلم کیا۔

شیخ ابوالطیب سندھی کا حلقہ تلامذہ بڑا وسیع تھا' ان میں شیخ عبدالرحمٰن بن عبدالکریم انصاری مدنی' شیخ عبداللہ بن ابراہیم البری مدنی' شیخ محمد بن علی شروانی مدنی' شیخ یوسف بن عبدالکریم مدنی اور علماے عظام کی بہت بڑی جماعت شامل ہے ❸۔

---

❶ مآثر الکرام، دفتر اول، در ترجمہ میر سید احمد بن میر سید محمد کالپوی، ص ۷۹ تا ۸۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۲۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۲۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۴۔ مولانا ابوالفتح کانی کشمیری

مولانا ابوالفتح بن عارف بن مولانا احمد کانی کشمیری، دیار کشمیر کے نامور فقیہ تھے، تمام عمر درس وافادہ میں سرگرم عمل رہے۔ طریقت وتصوف سے بھی تعلق تھا۔ یہ علم شیخ محمد چشتی اور شیخ محمد مراد نقشبندی سے حاصل کیا تھا۔ متبع سنت اور قاطع بدعت تھے۔ نہایت متواضع اور منکسر المزاج تھے۔ ۱۱۴۹ھ/ ۱۷۳۶ء میں فوت ہوئے ❶۔

۱۵۔ مفتی ابوالفتح کلو کشمیری

ارض کشمیر کے یہ ایک اور عالم دین تھے جو مفتی ابوالفتح کے نام سے معروف تھے۔ ان کی شہرت ''کلو'' کے عرف سے تھی۔ علم فقہ میں مہارت رکھتے تھے۔ معقول ومنقول کے جید علما میں سے تھے۔ کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ مولانا حیدر بن فیروز چرخی کشمیری سے اخذ علم کیا اور استدلال واستنباط مسائل میں شہرت پائی۔ فقہ واصول، علوم عربیہ اور استخراج مسائل میں اس مرتبۂ بلند کو پہنچے کہ اس نواح میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ آخر عمر میں کشمیر کے منصب افتا پر مامور ہو گئے تھے۔ شیعہ کے رد میں نہایت تیز تھے۔ ان کے عقائد کی مخالفت میں ''سیف السابین'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ مختلف کتب درسیہ پر تعلیقات لکھیں۔

مفتی ابوالفتح کلو کشمیری نے ۱۱۰۰ھ/ ۱۶۸۹ء میں وفات پائی اور سلطان زین العابدین کشمیری کے مقبرے میں دفن کیے گئے ❷۔

۱۶۔ قاضی ابوالفرج گجراتی

قاضی ابوالفرج گجراتی شیخ اور عالم وفقیہ تھے۔ سرزمین گجرات کے مشاہیر اہل علم میں سے تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں اپنے علم فضل کی وجہ سے قاضی عبداللہ بن محمد شریف گجراتی کی جگہ احمد آباد کی مسند قضا پر فائز ہوئے، عرصہ تک اس منصب جلیلہ پر متمکن رہے۔ ۱۱۲۱ھ/ ۱۷۰۹ء کو عالم گیر کے بیٹے شاہ عالم کے عہد میں معزول کیے گئے اور ان کی جگہ قاضی ابوالخیر کو قاضی مقرر کیا گیا۔ پھر وہ بھی جہاں دار شاہ کے عہد میں معزول ہوئے اور ان کی بجائے قاضی اطہر کو یہ منصب عطا ہوا۔ بعد ازاں انھیں بھی علیحدہ کر دیا گیا اور ان کی بجائے قاضی خیر اللہ کا تقرر عمل میں لایا گیا ❸۔

❶ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۲۶۰۔ ۲۶۱۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۵، ۱۶۔

❷ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۸۰۔ روضۃ الابرار، ص ۶۱، ۶۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۱۶۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۶۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۲۵۔ خزینۃ الاصفیا، ج ۲ ص ۳۵۸۔

❸ مرآۃ احمدی، ص۔ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۱۶۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۷۔ مولانا ابوالقاسم سندھی

مولانا ابوالقاسم بن مفتی داؤد ٹھٹھوی سندھی، علاقہ سندھ کے مشہور فاضل بزرگ تھے۔ فقہ، اصول اور علوم عربیہ کے ماہر علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ درس وافادہ میں سرگرم رہتے تھے۔ خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔ اورنگ زیب عالم گیر کو ان کے علم و فضل کی وسعت کا پتا چلا تو اس نے محکمہ دارالقضا میں وکیل شرعی مقرر کر دیا۔

مولانا ابوالقاسم سندھی نے ۱۱۱۳ھ/ ۱۷۰۱ء میں وفات پائی اور ان کے ایک شاگرد مخدوم رحمت اللہ نے ذهب العلم من السند تاریخ وفات نکالی ❶۔

۱۸۔ سید ابواللیث رائے بریلوی

سید ابواللیث بن ابوسعید بن محمد ضیا بن آیت اللہ بن شیخ علم اللہ رائے بریلوی۔ یہ سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی ماموں تھے اور فضل و صلاح کے زیور سے آراستہ۔ اپنے جد امجد اور دیار ہند کے معروف بزرگ سید علم اللہ رائے بریلوی کے زاویہ میں رائے بریلی میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت و تعلیم کی منزلیں طے کیں۔ اپنے والد مکرم سید ابوسعید بریلوی سے علم فقہ حاصل کیا۔ حصول علم کے بعد طریقت و تصوف کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ منزل بھی باپ کی نگرانی میں طے کی۔ پھر ارشاد و تلقین میں ان کی مسند پر بیٹھے۔ بعد ازاں ارض حجاز کا قصد کیا اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ پھر مراجعت فرمائے ہند ہوئے اور طویل عرصے تک مدراس میں مقیم رہے۔ وہیں وفات پائی۔ ان کی قبر ساحل سمندر پر کوڑیال بندر میں ہے ❷۔

۱۹۔ مفتی ابو محمد سہسوانی

مفتی ابو محمد بن محمد عاقل بن محمد فاضل بن عبدالشکور حسینی مودودی سہسوانی، شیخ صالح اور عالم وفقیہ تھے۔ گیارھویں صدی ہجری کے اوائل میں اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں پیدا ہوئے، علمی گھرانے کے فرزند اور دودمان فضل و کمال کے رجل رشید تھے۔ علوم معقول و منقول اور فروع و اصول میں درجہ امامت پر فائز تھے۔ صوری و معنوی کمالات میں مشہور فی الانام تھے۔ علوم دینیہ تفسیر و حدیث، فقہ و کلام اور اصول میں مجتہد کی حیثیت رکھتے تھے۔ احیائے سنت، رد بدعت اور وعظ و ارشاد میں نہایت تیز تھے۔ تحصیل علوم و فنون اپنے والد گرامی قدر سید مفتی محمد عاقل سہسوانی سے کی اور پھر ان کی وفات کے بعد ان کی جگہ مسند تدریس پر متمکن ہوئے۔ بہت سے لوگوں کو اپنے علم و عرفان سے متمتع فرمایا۔ عہد محمد شاہ میں پچیس سال تک فرائض شرعی انجام

❶ تحفۃ الکرام، ص ۲۷۶۔ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۱۶، ۱۷۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۶۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۷۔ سید احمد شہید، ص ۵۱۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیتے رہے۔ مفتی ابو محمد کے نام کے کئی شاہی پروانے اور فرامین جن پر شاہی مہر چسپاں ہے، حیات العلما کی روایت کے مطابق جو ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۲ء میں طبع ہوئی، سن مذکور تک ان کے گھر میں موجود تھے۔ ان وثیقوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ ان سے مخلصانہ اور عقیدت مندانہ تعلق رکھتا تھا اور ان کے زہد و تقویٰ اور علم کا معترف تھا۔

مفتی سید ابو محمد سہوانی نے ۱۱۵۵ھ/۱۷۴۲ء کے پس و پیش وفات پائی۔ ان کے بعد ان کے بیٹے خواجہ سید نظر محمد سہوانی مسند افتا پر متمکن ہوئے ❶۔

۲۰۔ مفتی ابو الوفا کشمیری

مفتی ابو الوفا اپنے عصر کے معروف عالم و شیخ تھے۔ کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ مولانا محمد اشرف چرخی اور شیخ امان اللہ بن خیر الدین کشمیری سے اخذ علم کیا اور استخراج مسائل فقہی میں شہرت پائی۔ عنفوان شباب ہی میں کشمیر کے صدر الصدور اکبر یار خاں گوجاری کی وساطت سے مغل حکمران شاہ عالم بہادر کے دربار میں حاضر ہوئے۔ شاہ عالم بہادر نے ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر کشمیر کے منصب افتا پر مامور کیا اور جاگیر عطا کی۔ بڑی تحقیق و کاوش سے چار ضخیم جلدوں میں مسائل فرعیہ فقہیہ جمع کیے۔ ایک رسالہ خصائص نبویہ ﷺ میں "انوار النبوۃ" کے نام سے تصنیف کیا۔ معارضہ و مباحثہ میں بڑے تیز تھے۔ کشمیر کے اس عالم و فقیہ نے ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء میں وفات پائی ❷۔

۲۱۔ شیخ احمد صدیقی امیٹھوی ــــ ملا جیون

شیخ احمد بن ابو سعید بن عبید اللہ بن عبد الرزاق بن خاصہ خدا، دیار ہند کے عالم کبیر اور مشہور فقیہ تھے۔ ملا جیون کے لقب سے مشہور تھے۔ "جیون" ہندی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں زندگی۔ شیخ عبد اللہ مکی کی اولاد سے تھے۔ منقول ہے کہ ان کا سلسلۂ نسب حضرت صالح علیہ السلام تک منتہی ہوتا ہے۔ نسباً صدیقی، مذہباً حنفی، اصلاً مکی، نسلاً صالحی اور مولداً امیٹھی تھے۔

ملا جیون منگل کے روز ۲۵ شعبان ۱۰۴۷ھ/۲ جنوری ۱۶۳۸ء کو امیٹھی میں پیدا ہوئے جو صوبہ یوپی کا مشہور شہر ہے۔ علم و فضل کی گود میں تربیت پائی اور اپنے والد مکرم شیخ ابو سعید کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے۔ نہایت ہونہار طالب علم تھے۔ حافظہ اس درجہ تیز تھا کہ سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ پھر کتب درسیہ کی تقدیم و تاخیر کا لحاظ کیے بغیر حصول علم میں مشغول ہوئے۔ تیرہ سال کی عمر کو پہنچے تو والد وفات پا گئے اور اکثر کتب درسیہ شیخ محمد صادق سترکھی سے اور بعض مولانا لطف اللہ کوروی سے پڑھیں۔ بائیس سال کی عمر میں

---

❶ حیات العلما، ص ۱۸، ۱۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۷۔

❷ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۲۶۶۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۸، ۱۹۔ روضۃ الابرار، ص ۶۸۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فارغ التحصیل ہوگئے تھے۔ پھر اپنے شہر امیٹھی میں سلسلۂ تدریس شروع کر دیا۔ چالیس سال کو پہنچے تو عازم اجمیر ہوئے۔ اجمیر سے دہلی کا قصد کیا۔ کافی عرصہ وہاں مقیم رہے اور درس و افادہ کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس اثنا میں خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔ پچپن سال کی عمر میں حرمین شریفین گئے اور فریضہ حج ادا کیا۔ خاصی مدت وہاں اقامت گزین رہے۔ جب واپس ہندوستان آئے تو ساٹھ سال کو پہنچ گئے تھے۔ چھ سال بلاد دکن میں اورنگ زیب عالم گیر کی فوجی چھاونیوں میں مقیم رہے۔ ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء میں دوبارہ سرزمین حجاز تشریف لے گئے اور مناسک حج ادا کیے۔ ایک مرتبہ والد کی طرف سے اور دوسری مرتبہ والدہ کی جانب سے۔ وہاں نہایت غور وفکر اور متعدد شروح سے مراجعہ و مطالعہ کے بعد صحیحین کا درس بھی دیا۔ ۱۱۱۶ھ/۱۷۰۵ء میں وطن (امیٹھی) واپس آئے۔

شیخ یٰسین بن عبدالرزاق قادری سے خرقہ تصوف حاصل کیا۔ اب کی مرتبہ دو سال امیٹھی میں اقامت پذیر رہے۔ پھر دہلی چلے گئے۔ اس وقت طلبائے علم کی ایک جماعت ان کے ساتھ تھی۔ کافی عرصہ دہلی میں مقیم رہے۔ اس اثنا میں اورنگ زیب عالم گیر کا بیٹا شاہ عالم دکن سے واپس لوٹا تو ملا جیون نے اجمیر پہنچ کر اس کا استقبال کیا اور اس کے ساتھ لاہور گئے۔ لاہور بھی کافی عرصہ قیام رہا۔ شاہ عالم کی موت کے بعد پھر دہلی چلے گئے اور تا دمِ واپسیں وہیں مقیم رہے۔ فرخ سیر سے بھی تقرب رہا۔

ملا جیون سے بے شمار علما و طلبا نے استفادہ کیا۔ لوگوں کی نفع رسانی میں بدرجہ غایت کوشاں رہتے اور بادشاہ سے ان کی سفارشیں کرتے۔ کسی دور میں نہ عوام سے علیحدگی اختیار کی اور نہ درس و افادہ کا سلسلہ منقطع کیا۔ حتیٰ کہ وفات کے روز بھی شام کو باقاعدہ طلبا کو درس دیا۔

اورنگ زیب عالم گیر ملا جیون کا بہت احترام کرتا اور عقیدت سے پیش آتا تھا۔ اسی طرح شاہ عالم بہادر شاہ بھی انھیں لائق اکرام گردانتا اور ان سے حسن ظن کا اظہار کرتا تھا۔

ملا جیون بہت سی عمدہ اور مشہور کتابوں کے مصنف تھے، جن میں سے درج ذیل کتابیں خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں۔

تفسیر احمدی: اسے تفسیرات احمدیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی یہ تفسیر عربی زبان میں ہے۔ اس میں فقہی انداز سے آیات احکام کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس کا آغاز انھوں نے ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۴ء میں کیا تھا، جب کہ صرف سولہ سال کی عمر کے تھے۔ اس زمانے میں مشہور درسی کتاب "حسامی" پڑھتے تھے۔ ۱۰۶۹ھ/ ۱۶۵۹ء میں اس کی تکمیل سے فارغ ہوئے۔ اس وقت "شرح المطالع" کا درس لیتے تھے۔ یہ کتاب اپنے شہر امیٹھی میں لکھی۔ پھر فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۰۷۵ھ/ ۱۶۶۵ء میں اس کی تصحیح کی۔ اس وقت ان کی عمر ستائیس سال تھی۔ یہ حضرت ممدوح کی مشہور تفسیر ہے، لیکن فاضل مصنف بعض مقامات میں لغزش فکر کا شکار ہو گئے ہیں اور توجیہ مسائل میں کتاب وسنت کے واضح احکام کی پابندی کرنے سے قاصر رہے ہیں۔

نور الانوار: شیخ ابوالبرکات نسفی (۷۱۰ھ/۱۳۱۰ء) کی تصنیف منار الانوار کو اصول فقہ میں متن متین کی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حیثیت حاصل ہے۔ ملا جیون نے ''نورالانوار'' کے نام سے اس کی شرح قلم بند کی۔ اس کا پورا نام ''نورالانوار فی شرح المنار'' ہے۔ یہ ایک متداول کتاب ہے اور مدارس میں مروج اور درس نظامیہ میں شامل ہے۔ خاصی ضخیم ہے اور خالص علمی وفنی نوعیت کی کتاب ہے۔ فاضل مصنف نے یہ قیام مدینہ منورہ کے زمانے میں تصنیف کی تھی۔ ان کے اشہب قلم کی تیزی اور فکر وذہن کی بے پناہ روانی کا اندازہ کیجیے کہ اس کی تصنیف کا آغاز انھوں نے یکم ربیع الاول ۱۱۰۵ھ/ ۱۲۱ اکتوبر ۱۶۹۳ء کو کیا اور ۷ جمادی الاولیٰ ۱۱۰۵ھ/ ۲۵ سمبر ۱۶۹۳ء کو کتاب مکمل کر لی۔ یعنی صرف دو مہینے سات دن میں اتنی ضخیم کتاب کی تصنیف سے فارغ ہو گئے تھے۔ یہ کتاب علما وطلبا میں بڑی مقبول ہے اور تعلیق وتدریس میں اہل علم نے اس سے بہت اعتنا کیا ہے۔ حلقۂ علما میں جو تلقی وقبولیت اس کتاب کو حاصل ہوئی، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ اب تک باقاعدہ داخل نصاب ہے۔ یہ کتاب بھی عربی میں ہے۔

السوانح: یہ کتاب مولانا عبدالرحمٰن جامی کی لوائح کے انداز کی ہے۔ قیام حجاز کے زمانے کی تصنیف ہے جب کہ وہ دوسری مرتبہ ۱۱۱۲ھ/ ۱۷۰۰ء میں وہاں تشریف لے گئے تھے۔

مناقب الاولیا: یہ کتاب مشائخ وعلما کے حالات وسوانح پر مشتمل ہے جو انھوں نے کبرسنی کے دور میں امیٹھی میں لکھی۔ اس میں خود ان کے اپنے حالات وکوائف بھی درج ہیں۔ اس کا تتمہ اپنے بیٹے عبدالقادر کے لیے تحریر کیا۔

آداب احمدی: یہ تصوف کے موضوع پر ہے اور سیر وسلوک کے بعض کوائف وواردات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ملا جیون کی یہ صغرسنی کے دور کی تالیف ہے۔

دیوان حافظ کی طرح ایک دیوان شعری لکھا جو پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔

مثنوی ومعنوی کے انداز واسلوب میں پچیس ہزار اشعار قلم بند کیے۔

جمعہ اور عیدین کے خطبات تحریر کیے۔ اپنے جد بزرگ وار شیخ عبیداللہ اور بڑے بھائی شیخ علم اللہ امیٹھوی کی تصانیف کو مرتب کیا۔ سفر حجاز پر روانہ ہوئے تو قصیدہ بردہ کے نہج پر ایک قصیدہ لکھا جو دو سو بیس اشعار کو محتوی ہے۔

جب بندرگاہ سورت پہنچے تو ایک عجیب وغریب قلبی کیفیت طاری ہوئی۔ بعد ازاں پہلے قصیدے کی طرح عربی ہی میں انتیس قصیدے اور لکھے۔ اپنے بارے میں یہ باتیں انھوں نے خود اپنی کتاب مناقب الاولیا میں تحریر کی ہیں۔

شیخ احمد امیٹھوی عرف ملا جیون بارھویں صدی ہجری میں دیار ہند کے وہ عالم وفقیہ تھے جو ذہانت وفطانت، اخذ وادراک اور حفظ وسماعت میں نہایت تیز تھے۔ بے شمار علما نے ان سے علم حاصل کیا اور بلند مرتبے کو پہنچے۔ ان کی کتاب ''نورالانوار'' تمام برصغیر کے مدارس عربیہ میں پڑھائی جاتی ہے اور اصول فقہ کی مشہور کتاب ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ عالم وفقیہ تراسی (۸۳) سال کی عمر پا کر منگل کی رات ۹ ذی القعدہ ۱۱۳۰ھ/۲۳ ستمبر ۱۷۱۸ء کو دہلی میں فوت ہوئے اور میر محمد شفیع دہلوی کے زاویہ میں دفن کیے گئے۔ پھر پچاس دن کے بعد ان کی میت کو ان کے شہر امیٹھی میں منتقل کیا گیا اور اپنے مدرسے میں دفن کیا گیا[1]۔

۲۲۔ شیخ احمد گوپاموی

شیخ احمد بن ابومنصور الخطیب گوپاموی عالم وفقیہ تھے اور اکابر فقہائے حنفیہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مولد ومنشا گوپامئو ہے۔ ان کے والد گرامی شیخ ابوالمنصور گوپاموی مشہور عالم وقت تھے۔ ان سے اور نامور عالم وفقیہ شیخ احمد امیٹھوی عرف ملا جیون سے اخذ علم کیا اور بحث و اشتغال میں مرتبہ کمال کو پہنچے، یہاں تک کہ فقہ واصول اور علوم عربیہ میں ماہر کامل ہوئے۔ ان کے علم وفضل اور مہارت فقہ کا شہرہ اورنگ زیب عالم گیر تک پہنچا تو اس نے ان کو فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین کی جماعت میں شامل کر لیا۔ ایک روپیہ یومیہ اور کچھ غلہ ان کا وظیفہ مقرر ہوا، جس کا عالم گیر کی طرف سے باقاعدہ ایک تحریری دستاویز کی صورت میں عہد کیا گیا۔ اس دستاویز پر ۱۱ر ذی القعدہ ۱۰۷۸ھ/۱۱ اپریل ۱۶۶۸ء کی تاریخ مرقوم ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ان کے لیے یہ وظیفہ شیخ وجیہ الدین گوپاموی کی تصدیق سے مقرر کیا گیا۔

منقول ہے کہ شیخ احمد گوپاموی نے اپنے استاد شیخ احمد امیٹھوی (ملا جیون) کے ساتھ حجاز مقدس کا سفر بھی کیا تھا۔ حج وزیارت سے سعادت اندوز ہوئے اور پھر اسی ارض پاک میں وفات پائی۔ یاد رہے ملا جیون نے دو مرتبہ حجاز کا سفر کیا تھا، پہلی مرتبہ ۱۱۰۳ھ میں جب کہ پانچ سال وہاں اقامت گزیں رہے۔ دوسری مرتبہ ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء میں۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ شیخ احمد ابوالمنصور ان کے ساتھ پہلی مرتبہ حجاز گئے یا دوسری مرتبہ۔

شیخ احمد گوپاموی کی تاریخ ولادت اور سن وفات کا علم نہیں ہو سکا[2]۔

۲۳۔ شیخ احمد رفاعی

شیخ احمد بن عبدالرحیم بن محمد بن صالح حسنی رفاعی کا شمار معروف رجال فضل وصلاح میں ہوتا ہے۔ ہندوستان کے مشہور شہر سورت میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت حاصل کی۔ گھر میں علم کی شمع روشن تھی اور والد

---

[1] مناقب الاولیا۔ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۰۶، ۲۰۷۔ خزینۃ الاصفیا، ج ۲، ص ۳۶۵، ۳۶۶۔ ابجد العلوم، ص ۹۰۷۔ سبحۃ المرجان، ص ۹۷۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۶۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۴۵۔ معجم المطبوعات العربیہ، ج ۲، ص ۱۱۶۴، ۱۱۶۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۹ تا ۲۱۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۶۵۸ تا ۶۶۲۔ بزم تیموریہ، ص ۲۲۴، ۲۲۵۔ برصغیر میں علم فقہ، ص ۳۱۰ تا ۳۱۲۔ قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب، ص ۲۰۴، ۲۰۵۔ رود کوثر ص ۴۷۵، ۴۷۶۔

[2] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۱، ۲۲۔ برصغیر میں علم فقہ، ص ۳۰۹۔ ۳۱۰۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گرامی شیخ عبدالرحیم مشہور علما میں سے تھے، علم فقہ انہی سے حاصل کیا اور جید و متقی علما و فقہا میں سے گردانے گئے۔
شیخ احمد رفائی نے ۱۲ شعبان ۱۱۱۲ھ/ ۱۱ جنوری ۱۷۰۱ء کو وفات پائی ❶۔

۲۴۔ شیخ احمد نائطی مدراسی

شیخ احمد بن عبداللہ نائطی کو شیخ نظام الدین مدراسی کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ ۱۱۱۳ھ/ ۱۷۰۱ء کو پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالا تو حصول علم میں مصروف ہوگئے۔ حدیث و فقہ اور علوم عربیہ وغیرہ کی کتابیں اس دور کے مختلف اساتذہ سے پڑھیں۔ تحصیل علم کے بعد محمد پور کے منصب صدارت پر فائز ہوئے۔ نہایت ذکی، امین و متین اور بہترین اخلاق کے مالک تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے جن میں سرور الصدور ترجمہ معرب الزبور، فیض الجلیل ترجمہ انجیل، فتح الوہاب المجید ترجمہ القول السدید، فیض الوہاب شرح خلاصۃ الحساب، فارسی زبان میں ہیں۔ انباء الاذکیا بتحسیب الطیب والنساء الی سید الانبیا اور وقائع نہضتہ بھی ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔ یہ دونوں کتابیں عربی میں ہیں۔ وقائع نہضتہ ناصر جنگ کی لڑائی کے بارے میں ہے جو اس کے بھتیجے مظفر جنگ سے ہوئی۔

شیخ احمد بن عبداللہ نائطی مدراسی نے ۲۲ رمضان المبارک ۱۱۸۹ھ/ ۱۶ نومبر ۱۷۷۵ء کو وفات پائی ❷۔

۲۵۔ شیخ احمد عثمانی لکھنوی

شیخ احمد بن غلام نقشبند بن عطاء اللہ عثمانی لکھنوی، فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہرین میں سے تھے۔ مولد و منشا لکھنؤ ہے۔ ان کے والد شیخ غلام نقشبند لکھنوی عالم و فاضل بزرگ تھے۔ لائق بیٹے نے انہی سے اخذ علم کیا۔ پھر شیخ نظام الدین انصاری سہالوی کی خدمت میں گئے، ان سے بھی استفادہ فرمایا۔ ان کے والد شیخ غلام نقشبند، شیخ پیر محمد سلونی کے مدرسے میں فرائض تدریس انجام دیتے تھے، ان کی وفات کے بعد بیٹے نے یہ مسند سنبھالی۔ مسند مشیخت کو بھی زینت بخشی۔ رسالہ قطبیہ کی روایت کے مطابق بہت سے علما و طلبا ان سے مستفید ہوئے۔ بحر زخار میں مرقوم ہے کہ شیخ احمد عثمانی لکھنوی نے پینتیس سال تک درس و افادہ کا ہنگامہ گرم کیے رکھا۔
شیخ احمد نے ۱۱۵۹ھ/ ۱۷۴۶ء میں وفات پائی۔ ان کے بعد ان کے بیٹے شیخ قطب الہدیٰ باپ کی مسند مشیخت پر فائز ہوئے ❸۔

---

❶ حدیقۃ احمدیہ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۲۔

❷ تاریخ النوائط، ص ۵۲۱، ۵۲۲۔ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۲، ۲۳۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۴ بحوالہ تذکرہ النبلا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۶۔ شیخ احمد ہرکامی

شیخ احمد بن مسعود حسینی ہرکامی، ہدیۃ کے عرف سے معروف تھے اور اپنے دور کے فاضل اور علامہ تھے۔ علم نحو اور علوم عربیہ کے ماہر علما میں سے تھے۔ ہرکام میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ اپنے عم محترم شیخ معز الدین بن شیخ محمد شفیع ہرکامی سے علم حاصل کیا، پھر درس وافادہ کی مسند پر متمکن ہوئے۔ بہت سی کتب ورسائل کے مصنف تھے جن میں ایک رسالہ میراث سے متعلق ہے جو ''الوجیز'' کے نام سے موسوم ہے۔ ایک رسالہ ''حسابا یسیرا'' کے نام سے علم حساب کے بارے میں ہے۔ یہ دونوں رسالے ۱۱۰۲ھ میں تصنیف کیے۔ ان رسالوں کے متن کی شرح بھی سپرد قلم کی۔ ''نادر البیان'' کے نام سے ایک مختصر سا رسالہ علم نحو کے موضوع پر لکھا۔ یہ رسالہ کبر سنی میں امیر غلام احمد خاں اور اپنے بیٹے خلیل الرحمٰن کے لیے قلم بند کیا تھا۔ ۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء میں ''باہر البیان'' کے نام سے اس کی شرح لکھی۔ علاوہ ازیں اور بھی کئی رسالے ضبط تحریر میں لائے۔

شیخ احمد ہرکامی نے ۱۹ شوال ۱۱۷۵ھ/۱۳ مئی ۱۷۶۲ء کو وفات پائی [1]۔

۲۷۔ قاضی احمد جون پوری

قاضی احمد بن ابو احمد عثمانی جون پوری مشہور شیخ اور معقولات ومنقولات کے جلیل القدر عالم تھے۔ اپنے جد امجد یوسف بن حامد عثمانی جون پوری سے کسب علم کیا اور اصحاب کمال علما کی جماعت میں گردانے گئے۔ اپنے عصر کے نامور عالم اور صاحب فتویٰ بزرگ تھے۔ استحضار مسائل اور جزئیات فقہیہ میں یگانہ روزگار تھے۔ شہر کوڑہ جہان آباد میں عہدہ قضا پر مامور ہوئے اور عمر بھر فرائض قضا انجام دیتے رہے۔ اسی شہر میں وفات پائی۔ جون پور میں ان کی میت لے جائی گئی اور وہاں کے محلّہ چاچک پور میں دفن کیے گئے [2]۔

بارھویں صدی ہجری کے اس ہندی عالم کی ولادت اور وفات کی تاریخ کا پتا نہیں چل سکا۔

۲۸۔ حاجی احمد دہلوی

حاجی احمد بن ابو احمد دہلوی فاضل کبیر اور محدث جلیل تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔ ان سے علم حدیث کی تکمیل کی۔ پھر شیخ فخر الدین بن نظام الدین دہلوی سے منسلک ہوگئے۔ طویل عرصے تک ان کی صحبت وملازمت اختیار کیے رکھی۔ ان سے اخذ طریقت بھی کیا۔ بعد ازاں عازم حجاز ہوئے اور حج وزیارت سے بہرہ مند ہو کر مراجعت فرمائے ہند ہوئے [3]۔

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۵۔

[2] تجلی نور ج ۲، ص ۴۶۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۷۱۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۵

[3] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۵

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۹۔ قاضی احمد حماد فتح پوری

قاضی احمد حماد بن جان محمد بن محمد دولت انصاری سہالوی ثم فتح پوری اپنے وقت کے شیخ اور عالم وفقیہ تھے اور بارھویں صدی ہجری میں دیار ہند کے فقہائے حنفیہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ فتح پور میں پیدا ہوئے۔ وہیں تربیت پائی اور اپنے عم محترم علامہ کمال الدین بن محمد دولت فتح پوری سے علم حاصل کیا۔ ان کے والد قاضی جان محمد فتح پور کے منصب قضا پر متعین تھے، ان کی وفات کے بعد فاضل بیٹے (قاضی احمد حماد) کو ان کی جگہ قاضی مقرر کیا گیا۔ نیک اور صاحب ورع عالم دین تھے۔ ستر سال سے زائد عمر پا کر فوت ہوئے ❶۔

۳۰۔ شیخ احمد عبدالحق لکھنوی

شیخ احمد عبدالحق بن محمد سعید بن شیخ شہید قطب الدین محمد انصاری سہالوی لکھنوی، ۱۹ یا ۲۷ رجب ۱۱۰۳ھ/ ۲۷ مارچ یا ۴ر اپریل ۱۶۹۲ء کو قصبہ سہالی میں پیدا ہوئے۔ اسی تاریخ کو ان کے جد امجد شیخ قطب الدین محمد انصاری نے وفات پائی تھی۔ کچھ بڑے ہوئے تو لکھنؤ آئے اور اپنے عالم و فاضل چچا شیخ نظام الدین انصاری سہالوی کے حلقہ تلمذ میں داخل ہوگئے، ان سے تحصیل علم کی اور اپنے تمام اقران و معاصرین سے فوقیت لے گئے۔ درس و افتا کی مسند پر فائز ہوئے اور اپنے استاد شیخ نظام الدین انصاری سہالوی کی زندگی ہی میں اکابر علما میں شمار ہونے لگے۔ اس عصر کے اکابر فضلا اور علمائے متبحرین و مشہورین میں سے تھے۔

شیخ احمد عبدالحق لکھنوی تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے اور تحشیہ نویسی میں بھی ماہر تھے، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ قاضی محب اللہ عثمانی بہاری (متوفی ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء) کی منطق کی مشہور کتاب ''سلم العلوم'' کی مبسوط و مفصل شرح لکھی۔ میر زاہد کے حاشیہ الرسالہ پر حاشیہ تحریر کیا۔ نیز میر زاہد نے جلال الدین دوانی کی ''شرح التہذیب'' اور ''شرح المواقف'' پر جو حواشی لکھے ہیں ان پر حواشی قلم بند کیے۔

شیخ احمد عبدالحق انصاری لکھنوی نے ۹ ذی الحجہ ۱۱۸۷ھ/ ۲۱ فروری ۱۷۷۴ء کو لکھنؤ میں وفات پائی ❷۔

۳۱۔ قاضی احمد علی سندیلوی

قاضی احمد علی بن فتح محمد سندیلوی اپنے دور کے شیخ اور علامہ تھے۔ بالخصوص منطق اور فلسفے کے ماہرین میں سے تھے۔ صوبہ یوپی کے مشہور شہر سندیلہ میں پیدا ہوئے۔ وہیں تربیت پائی اور اپنے سسر شیخ حمد اللہ بن شکر اللہ سندیلوی (متوفی ۱۱۶۰ھ/ ۱۷۴۷ء) سے (جو دیار ہند کے بہت بڑے ماہر منطق و حکمت تھے) علم حاصل

---

❶ اغصان الانساب ص۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۷۔

❷ تذکرۂ علمائے فرنگی محلی، ص ۲۳ تا ۲۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۸۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد سندیلہ کی مسند قضا پر متعین ہوئے، ہر وقت مطالعہ کتب میں مشغول اور تدریس طلبا میں مصروف رہتے۔ منطق وحکمت کی بعض درسی کتابوں پر تعلیقات وحواشی تحریر کیے۔ مثلاً ''الرسالہ'' پر سید زاہد کے حاشیہ پر حاشیہ لکھا۔ شرح تہذیب اور شرح المواقف پر بھی حواشی تحریر کیے۔ قاضی محبّ اللہ بہاری کی سلم العلوم کی ایک بسیط ومفصل شرح قلم بند کی۔ میراث کے موضوع پر ایک رسالہ لکھا۔

ان شروح وتعلیقات کے علاوہ قاضی احمد علی سندیلوی نے تدریسی خدمات بھی انجام دیں اور بہت سے علما وطلبا نے ان سے مختلف کتابوں کا درس لیا۔ ان کے شاگردوں میں شیخ حمد اللہ سندیلوی کے بیٹے شیخ حیدر علی شامل ہیں۔

قاضی احمد علی سندیلوی نے ۱۲۰۰ھ/ ۱۷۸۶ء میں سندیلہ میں وفات پائی ❶۔

۳۲۔ شیخ احمد اللہ خیر آبادی

شیخ احمد اللہ بن صفت اللہ حسینی رضوی خیر آبادی، اپنے علاقے اور عصر کے عالم کبیر تھے۔ ان کا شمار فقہ، اصول، کلام، اور علوم عربیہ کے ماہرین میں ہوتا ہے۔

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے شہر خیر آباد میں پیدا ہوئے، وہیں تربیت حاصل کی، صغر سنی ہی میں حصول علم میں مشغول ہوگئے تھے۔ کچھ عرصہ اپنے والد محترم شیخ صفت اللہ سے پڑھتے رہے، ان سے علم نحو، بعض علوم عربیہ اور فقہ کی کتابیں پڑھیں۔ حدیث بھی ان ہی سے پڑھی۔ پھر فتح پور کا عزم کیا۔ وہاں علامہ کمال الدین بن محمد دولت فتح پوری (متوفی ۱۴ محرم ۱۱۷۵ھ/ ۱۵ اگست ۱۷۶۱ء) کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہوئے اور مختلف علوم میں ان سے استفادہ کیا۔ بعد ازاں اپنے شہر خیر آباد کو مراجعت کی اور درس وافادہ میں مصروف ہوگئے۔ ان سے بہت سے علما وطلبا نے تحصیل کی۔

شیخ احمد اللہ خیر آبادی نے یکم رجب ۱۱۶۷ھ/ ۲۴ اپریل ۱۷۵۴ء کو خیر آباد میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے ❷۔

۳۳۔ مولانا احمد اللہ پانی پتی

مولانا احمد اللہ پانی پتی قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے بیٹے اور شاگرد اور مرزا مظہر جان جاناں دہلوی کے مرید تھے۔ حدیث وفقہ کے ماہر اور عابد وزاہد تھے۔ ۱۱۹۸ھ/ ۱۷۸۳ء کو عالم جوانی میں انتقال کیا ❸۔

❶ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۲۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۸۔

❷ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۸۹ در ترجمہ حاجی صفت اللہ خیر آبادی۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۹۔ مقامات مظہری، ص ۶۸۔

❸ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۴۔ خزینۃ الاصفیا، ج ۱ ص ۶۸۷۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳۴۔ شیخ اسماعیل غوری پشاوری

شیخ اسماعیل غوری نقشبندی پشاوری مشہور مشائخ میں سے تھے اور اپنے زمانے کے عالم اور زاہد وفقیہ بزرگ تھے۔ سیر وسیاحت کے شائق تھے اور علما و مشائخ سے ملاقات اور استفادے کو اپنے لیے ضروری قرار دیتے تھے۔ بہت سے طویل سفر کیے۔ متعدد ممالک میں گئے اور وہاں کے اصحاب علم اور ارباب تصوف سے مستفید ہوئے۔ پہلے حجاز مقدس کا عزم کیا اور حج وزیارت کی نعمت حاصل کی۔ وہاں سے بغداد، بخارا، کربلا، بسطام اور یمن گئے۔ ان علاقوں اور ملکوں میں مشائخ کرام کی ایک بڑی جماعت سے ملے اور ان سے اخذ فیض کیا۔ پھر ہندوستان کو معاودت کی اور شیخ سعدی بخاری لاہوری (متوفی ۳ ربیع الاول ۱۱۰۸ھ/۲۱ ستمبر ۱۶۹۶ء) سے تحصیل طریقت فرمائی اور ان سے منسلک ہوئے۔

شیخ اسماعیل غوری تجارت کرتے اور اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتے تھے۔ ۱۱۱۱ھ/ ۱۶۹۹ء کو پشاور میں فوت ہوئے❶۔

۳۵۔ شیخ اشرف قلی جائسی

شیخ اشرف قلی بن عبدالسبحان بن مبارک بن جلال بن مبارک اشرفی جائسی فاضل و علامہ تھے اور فقہ واصول، کلام اور علوم عربیہ کے علمائے ماہرین میں شمار ہوتے تھے۔ عمر بھر سلسلۂ درس وافادہ جاری رکھا۔ شیخ نظام الدین بن قطب الدین سہالوی لکھنوی نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور فقہ واصول اور علم کلام کی تحصیل کی❷۔

شیخ اشرف قلی جائسی کی ولادت ووفات کی تاریخ کا پتا نہیں چل سکا۔

۳۶۔ شیخ افضل راجیندروی

شیخ افضل کا سلسلہ نسب یہ ہے: افضل بن امین بن فاضل بن ابراہیم بن خوند میر حسینی رفاعی راجیندروی، معروف علما وصلحا اور نامور مشائخ میں سے تھے۔ مولد ومنشا راجیندری ہے، جو مدراس کے علاقہ ارکاٹ میں واقع ہے۔ شیخ شیخن اورنگ آبادی سے اخذ طریقت کیا اور ایک مدت تک ان سے وابستہ رہے۔ متعدد کتابوں کے مصنف تھے، جن میں مشہور کتابیں مرآۃ العارفین، معدن الجواہر، تحفۃ الصالحین، شرح فقہ الاکبر اور شرح نام حق ہیں۔ موخر الذکر دو کتابیں مسائل فقہ سے متعلق ہیں۔ ایک رسالہ وحدت الوجود کے بارے میں لکھا۔ مثنوی

❶ خزینۃ الاصفیا، ج ۱ص ۶۵۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۳، ۳۴۔

❷ تاریخ جائس، نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معنوی، فصوص الحکم، لوائح اور لمحات کا درس بڑے شوق اور وجد آفرین انداز میں دیتے تھے۔ ۱۵ رمضان ۱۱۹۳ھ/ ۲۶ ستمبر ۱۷۷۹ء کو راجیندری میں فوت ہوئے❶۔

۳۷۔ مولانا اکبر یار کشمیری

مولانا اکبر یار کشمیری دیار کشمیر کے شیخ و فاضل اور علوم عربیہ میں یگانہ تھے۔ ان کے والد مولانا خیر الدین کشمیری عالم وقت تھے، ان سے اخذ علم کیا۔ پھر عازم دہلی ہوئے۔ وہاں شیخ القراء عبد الخالق دہلوی سے قرأت و حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ اخذ طریقت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی اور دیگر مشائخ سے کیا۔ ۱۱۵۸ھ/ ۱۷۴۵ء میں وفات پائی❷۔

۳۸۔ شیخ اکرم الدین گجراتی

شیخ اکرم الدین بن محی الدین بن قاضی عبد الوہاب احمد آبادی گجراتی، فاضل بزرگ تھے اور معقول و منقول کے ماہر تھے۔ مولد و منشا احمد آباد ہے۔ شیخ نور الدین بن محمد صالح گجراتی سے اخذ علم کیا۔ اپنے والد شیخ محی الدین گجراتی کی وفات کے بعد ۱۱۰۰ھ/ ۱۶۸۹ء میں گجرات کے منصب صدارت پر متمکن کیے گئے اور پھر تمام عمر اس منصب پر فائز رہے۔ اورنگ زیب عالم گیر کے بیٹے شاہ عالم نے ان کو سیف الاسلام خاں کا لقب دیا تھا۔ ان کی قابل ذکر اور بہترین خدمات میں سے احمد آباد کا مدرسہ ہدایت بخش ہے۔ اس کی تعمیر پر انھوں نے ایک لاکھ چوبیس ہزار روپے خرچ کیے۔ ۱۱۰۲ھ/ ۱۶۹۱ء کو اس کی تعمیر کا آغاز کیا اور ۱۱۰۹ھ/ ۱۶۹۸ء کو تکمیل ہوئی۔ بعض لوگوں نے تکمیل کی تاریخ قرآن کی اس آیت سے نکالی۔

اسس علی التقوی من اول یوم۔

بعد ازاں ۱۱۱۱ھ/ ۱۶۹۹ء کو اس مدرسے کی عمارت میں مزید اضافہ کیا۔ ایک صاحب نے اس کی ان الفاظ میں تاریخ نکالی: مدرسة فیها الهدی للعلمین۔

طلبا کے مصارف کی غرض سے اعمال پٹن میں مدرسے کے لیے دو گاؤں وقف کیے اور ایک گاؤں نواح جانپانیر میں وقف کیا۔ اس طرح شیخ اکرم الدین گجراتی نے مدرسہ ہدایت بخش کے نام پر تین گاؤں وقف کیے اور کثیر رقم اس کی تعمیر پر خرچ کی۔ یہ ان کی بہت بڑی دینی، علمی اور اسلامی خدمت تھی❸۔

❶ محبوب ذی المنن، ص ۹۶ تا ۹۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۵۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۵۔ روضۃ الابرار، ص ۶۲، ۶۳۔

❸ مرآۃ احمدی، ص ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۶۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳۹۔ شیخ اللہ بخش گوپاموی

شیخ اللہ بخش بن عبدالحی بن عبدالقادر عمری قنوجی ثم گوپاموی عالم و فاضل اور فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ ہمیشہ علما و طلبا کو پڑھانے اور درس و افادہ میں مصروف رہتے ❶۔

۴۰۔ شیخ اللہ داد گوپاموی

شیخ اللہ داد گوپاموی بہت بڑے عالم، نہایت متقی اور اللہ کے صالح بندے تھے۔ شیخ اللہ بخش گوپاموی کے بیٹے تھے۔ اصول بزدوی پر مفید تعلیقات قلم بند کیں ❷۔

۴۱۔ شیخ امام الدین جون پوری

شیخ امام الدین بن سعد الدین بن نور الدین جعفر جون پوری ۱۰۷۷ھ/۱۶۶۷ء میں پیدا ہوئے۔ بعض کتب درسیہ اپنے جدامجد شیخ نور الدین جعفر سے اور اکثر اپنے والد گرامی شیخ سعد الدین سے پڑھیں۔ توضیح تلویح کا درس شیخ محمد افضل عباسی الہ آبادی سے لیا۔ کسب طریقت بھی انہی سے کیا، یہاں تک کہ اپنے علاقے کے عالم و فقیہ اور فنون عربیہ اور علوم دینیہ کے ماہر قرار پائے۔ شیخ محمد افضل عباسی الہ آبادی سے انھیں انتہائی تعلق خاطر تھا۔ سال کے بارہ مہینوں کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا، چھ مہینے جون پور میں قیام کرتے اور چھ مہینے شیخ محمد افضل کی خدمت میں الہ آباد رہتے۔ شیخ محمد یحییٰ بن محمد امین عباسی الہ آبادی (صاحب وفیات الاعلام) سے بھی رابطہ رکھتے تھے۔

شیخ امام الدین جون پوری، شاعر بھی تھے۔ انھوں نے فارسی میں نہایت اچھے شعر کہے۔ علاوہ ازیں عابد و زاہد، صلاح و تقویٰ کے زیور سے آراستہ اور صاحب طریقت بزرگ تھے۔ ماہ رجب ۱۱۲۶ھ/جولائی ۱۷۱۴ء میں فوت ہوئے ❸۔

۴۲۔ مولانا امان اللہ کشمیری دہلوی

مولانا امان اللہ بن خیر الدین کشمیری شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ صغر سنی ہی میں علوم درسیہ سے فراغت حاصل کر لی تھی اور محبوب اقران ہو گئے تھے۔ دیار کشمیر کے کبار علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ حسن اخلاق کے مالک

---

❶ تذکرۃ الانساب، مصطفےٰ علی خان گوپاموی، ص ۔ نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۳۶۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۶۔

❸ وفیات الاعلام، ص ۔ تجلی نور، ج ۲، ص ۵۷۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۲۰۷، ۲۱۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۷، ۳۸۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھے۔ کشمیر میں درس و افادہ کی مسند بچھائی اس لیے کشمیری کہلائے۔ پھر عازم دہلی ہوئے اور وہاں عہدہ صدارت پر متعین کیے گئے۔ للہذا دہلوی مشہور ہوئے۔ شیخ الاسلام کے منصب سے سرفراز ہوئے۔ کتب درسیہ پر تعلیقات و حواشی تحریر کیے اور اپنے وقت کے جید علما میں گردانے گئے۔ ۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۸ء میں پانی پت اور کرنال کے درمیان نادر شاہ درانی سے جو معرکۂ قتال گرم ہوا تھا، اس میں قتل کیے گئے ❶۔

۴۳۔ حافظ امان اللہ بنارسی

حافظ امان اللہ بن نور اللہ بن حسین بنارسی عالم کبیر اور شیخ وقت تھے۔ فقہ و اصول اور علم کلام کے ماہر تھے۔ مولد و منشا بنارس ہے۔ قرآن مجید حفظ کیا اور حصولِ علم کی غرض سے عازم سفر ہوئے۔ کتب درسیہ شیخ محمد ماہ دیوکامی، شیخ قطب الدین حسینی شمس آبادی اور دیگر علما و اساتذہ سے پڑھیں۔ پھر اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں لکھنؤ کی مسند صدارت پر مامور ہوئے۔ صاحب "سلم" اور "مسلم" قاضی محب اللہ بہاری سے ان کے مباحث و مناظرات کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مصنف و شارح بھی تھے۔ ان کی تصانیف میں اصول فقہ کے موضوع پر ایک کتاب "المفسر" ہے۔ پھر "المحکم الاصول" کے نام سے اس کی شرح سپرد قلم کی۔ تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھا۔ علاوہ ازیں عضدی، تلویح، حاشیۃ القدیم، شرح المواقف، شرح عقائد (جلال الدین دوانی) اور رشیدیہ (شیخ محمد رشید جون پوری) پر حواشی اور شروح لکھے۔ صاحب "الافق المبین" سید محمد باقر حسینی اور صاحب "الشمس البازغۃ" علامہ محمود جون پوری پر حکمت و فلسفہ کے بعض مسائل میں انھوں نے محاکمہ تحریر کیا۔ نیز شیخ محب اللہ الہ آبادی کی "تسویہ" کی شرح قلم بند کی۔

حافظ امان اللہ بنارسی نے ۱۱۳۳ھ/ ۱۷۲۱ء کو بنارس میں وفات پائی ❷۔

۴۴۔ مولانا امین الدین کنتوری

مولانا امین الدین بن مولانا بدیع الدین بن عطاء اللہ بن محمد شریف حسینی کنتوری، عالم و فقیہ اور اللہ کے صالح بندے تھے۔ کنتور میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی، شیخ نظام الدین سہالوی سے اخذ علم اور کسب طریقت کیا۔ شیخ صفت اللہ حسینی خیر آبادی محدث سے سند حدیث حاصل کی۔ اپنے والد مولانا بدیع الدین کنتوری کی ایک کتاب عطاء الایمان کی شرح لکھی۔

❶ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۲۶۶۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۲، ۴۴۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۸، ۳۹۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۲۷۔ روضۃ الابرار، ص ۶۰، ۶۱۔

❷ سبحۃ المرجان، ص ۷۸۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۲۷۔ ابجد العلوم، ص ۹۰۶۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۶، ۴۳۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۹۔ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۰۲، ۲۰۳۔ تذکرہ مشائخ بنارس، ص ۳۹، تا ۴۲۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا امین الدین کنتوری کے تین بیٹے تھے اور تینوں عالم تھے۔ ان کے نام یہ تھے: فائق علی، عبد الواسع، عبد الجامع ❶۔

۴۵۔ مولانا امین الدین مدراسی

مولانا امین الدین بن سیف الدین بن نظام الدین صدیقی مدراسی، اہل کمال بزرگ تھے اور مدراس کے علمائے مشاہیر میں گردانے جاتے تھے۔ ۱۱۶۲ھ/ ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوئے اور بعض کتب درسیہ اپنے علاقے کے نامور اساتذہ سے پڑھیں۔ پھر لکھنؤ گئے، وہاں مولانا نظام الدین بن قطب الدین انصاری سہالوی کا ہنگامہ درس جاری تھا اس میں شامل ہو کر اخذ علم کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد وطن کو مراجعت کی اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ ان سے خلق کثیر نے استفادہ کیا، جن میں شیخ محمد غوث بن ناصر الدین شافعی مدراسی کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔

مولانا امین الدین مدراسی اپنے علاقے اور زمانے کے جید عالم تھے۔ مروجہ علوم وفنون پر گہری نظر رکھتے تھے۔ کثیر الدرس اور کثیر الفوائد بزرگ تھے۔ ۶ رمضان المبارک ۱۱۹۵ھ/ ۲۶ راگست ۱۷۸۱ء کو رامنات میں فوت ہوئے اور حظیرہ امان اللہ خاں میں بلدۂ ویلور میں دفن کیے گئے ❷۔

۴۶۔ مولانا امین الدین جون پوری

مولانا امین الدین بن غیاث الدین محمود عمری جون پوری۔ اپنے علاقے اور عہد کے شیخ و فاضل بزرگ تھے۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہر علما میں سے تھے۔ ۲۵ رجب ۱۰۷۲ھ/ ۶ مارچ ۱۶۶۲ء کو جون پور میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ بعض درسی کتابیں صاحب رشیدیہ شیخ محمد رشید جون پوری کے بیٹے شیخ محمد ارشد جون پوری سے پڑھیں اور اکثر کتابوں کی تکمیل دیگر اساتذۂ عصر سے کی۔ بحث و اشتغال میں درجہ کمال کو پہنچے۔ فقہ اور دیگر علوم دینیہ کے علاوہ ہیئت، ہندسہ، حساب، اصطرلاب اور مواریث وغیرہ بہت سے فنون و مباحث میں مہارت رکھتے تھے۔ حصول علم کے بعد مسند تدریس پر فائز ہوئے۔

مولانا امین الدین جون پوری سے بہت سے علما وطلبا نے استفادہ کیا۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بڑا وسیع تھا، جن میں شیخ غلام رشید بن محب اللہ جون پوری بھی شامل ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے، ان کی تصانیف میں ایک کتاب ''وسیلۃ النجات'' ہے، جسے تذکرۂ مشائخ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں محمد رشید جون پوری سے لے کر شیخ معین الدین اجمیری تک کے حالات مندرج ہیں۔ ایک کتاب ''المقتنیات'' ہے جو شیخ عبدالحق محدث

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۹، ۴۰ بحوالہ بحر زخار۔

❷ حدیقۃ المرام، ص۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۴۰۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دہلوی کی "اشعۃ اللمعات" کی تلخیص ہے۔ ایک "منتخبات گنج ارشدی" ہے۔ "شرح المعمول" پر حاشیہ سپرد قلم کیا۔ ان کے علاوہ اور بھی بعض کتب و رسائل تحریر کیے۔

مولانا امین الدین جون پوری ۱۱۳۵ھ/ ۱۷۲۳ء تک زندہ تھے ❶۔

۴۷۔ مولانا انکنون جون پوری

مولانا انکنون صدر جہان حنفی جون پوری، شیخ اور عالم کبیر تھے۔ معقولات و منقولات میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ جون پور کے منصب صدارت پر فائز ہوئے اور نصف عمر تک یہ خدمت انجام دی۔ صالحیت، تدین اور عفت میں یگانہ تھے۔ قضا کے سلسلے میں بہترین کردار اور شہرت کے مالک تھے۔ مباحثہ و مناظرہ سے انتہائی دلچسپی رکھتے تھے اور درس و افادہ میں مصروف رہتے تھے۔ خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا ❷۔

۴۸۔ مولانا اوغلان خراسانی

مولانا اوغلان حسینی خراسانی مسلکا حنفی تھے۔ شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے عالم تھے۔ خراسان کے باشندے تھے۔ اپنے تلمیذ غازی الدین خاں کے ساتھ ہندوستان آئے اور اورنگ زیب عالم گیر سے تقرب پیدا کیا۔ عالم گیر نے ان کی علمی قابلیت سے متاثر ہو کر اپنے بیٹے کام بخش کا معلم مقرر کر دیا تھا۔ اس کے بعد ارتقا و ترقی کی مختلف منزلیں طے کرنے لگے۔ ۱۰۹۶ھ/ ۱۶۸۵ء میں عرض مکرر کا منصب عطا ہوا اور سیادت خاں کے لقب سے سرفراز کیے گئے۔ پھر دیوانِ خاص کے ناظر بنا دیے گئے۔ بعد ازاں ہندوستان کی صدارتِ عظمیٰ کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے، لیکن بہت تھوڑے دن اس منصب پر متمکن رہے اور ۱۱۰۹ھ/ ۱۶۹۸ء میں وفات پا گئے ❸۔

ــــــ ب ــــــ

۴۹۔ شیخ باسط علی قلندر الٰہ آبادی

شیخ باسط علی قلندر کا سلسلۂ نسب یہ ہے: باسط علی بن محمد ماہ بن فیروز بن سالم بن قاسم بن ناصر بن بہاء الدین نقوی نیساپوری کنتوری ثم الٰہ آبادی۔ شیخ باسط علی اعمال الٰہ آباد کے ایک گاؤں بدگدھا میں پیدا

❶ تذکرۃ العلماء، ج ۲، ص ۹۷۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۴۸۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۴۰، ۴۱۔

❷ تذکرۃ العلماء، ج ۲، ص ۹۷۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۴۸۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۴۱۔

❸ مآثر عالم گیری، ص ۲۷۴، ۵۱۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۴۱۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوئے۔ چند ابتدائی کتابیں پڑھیں اور شیخ اللہ دیہ احمد لاہر پوری سے بیعت ہو گئے۔ ایک سال ان کی خدمت میں رہے۔ پھر شیخ نے ان کو حصول علم کا حکم دیا اور وہ ۱۱۴۴ھ/ ۳۲-۱۷ء میں خیر آباد چلے گئے۔ وہاں شیخ صفت اللہ خیر آبادی کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہوئے۔ پانچ سال ان کے حلقۂ تلمذ میں رہے۔ ان سے ہدایۃ الفقہ، شرح المواقف مع حاشیہ سید زاہد اور باقی کتب درسیہ کی تکمیل کی۔ سند حدیث بھی انہی سے لی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے وطن الہ آباد تشریف لے گئے اور درس و افادہ کو اپنا مشغلہ بنا لیا۔ ان سے بہت سے علما و طلبا نے استفادہ کیا، جن میں شیخ عبدالقادر عمادی جون پوری، شیخ محمد کاظم قلندر کاکوروی اور خلق کثیر شامل ہے۔

شیخ باسط علی الہ آبادی مشہور مشائخ عصر، معروف علمائے وقت اور نامور فقہا میں سے تھے۔ انھوں نے ۱۷ ذی الحجہ ۱۱۹۶ھ/ ۲۳ نومبر ۱۷۸۲ء کو الہ آباد میں وفات پائی ❶۔

۵۰۔ شیخ بدرالدین جون پوری

شیخ بدرالدین جون پوری اپنے دور کے نامور عالم و فقیہ تھے۔ شیخ کبیرالدین انصاری کی اولاد سے تھے، جن کا سلسلۂ نسب شیخ الاسلام اسماعیل تک منتہی ہوتا ہے۔ علم طریقت شیخ پیر محمد لکھنوی سے حاصل کیا۔ تصوف و طریقت اور شعر و شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ ان کے اشعار میں سے چند شعر یہ ہیں ۔

گفتم بطبیب از درد نہاں   گفتا کہ زغیر دوست بر بند زباں
گفتم کہ غذا گفت ہمیں خون جگر   گفتم پرہیز گفت از ہر دو جہاں

قومی ہمہ نیستی زہستی نگرند   جمعی ہستی ز نیستی باز خرند
آنہاں کہ زہست و نیست آسان گزرند   بینا ترو آشنا ترو آسودہ تراند

شیخ بدرالدین جون پوری نے یکم ربیع الاول ۱۱۱۱ھ/ ۱۷ اگست ۱۶۹۹ء کو بہتر سال عمر پا کر جون پور میں انتقال کیا ❷۔

۵۱۔ شیخ بدر رفاعی

شیخ بدر بن غالب بن یعقوب بن شعبان حسینی رفاعی، گلبرگہ کے رہنے والے تھے۔ صالح عالم دین تھے۔ محدث و فقیہ، عارف و صوفی اور کمالاتِ ظاہری و باطنی سے متصف تھے۔ ۱۴ شعبان ۱۱۰۸ھ/ ۲۶ فروری ۱۶۹۷ء کو گلبرگہ (ہندوستان) میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے ❸۔

---

❶ اصول المقصود، ص ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۴۳۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۴۴، ۴۵۔ بحوالہ گنج ارشدی۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۴۵، ۴۶۔ بحوالہ مہر جہاں تاب۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۵۲۔ شیخ بدر عالم سادا موی

شیخ بدر عالم بن محمد باقر قدوائی سادا موی نے بعض کتب درسیہ حافظ محمد قاسم بن عبدالکریم بجنوری سے اور زیادہ تر دیگر اساتذہ سے پڑھیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد حافظ محمد قاسم سے اخذ طریقت کیا اور ایک مدت تک ان کی صحبت میں رہے۔ پھر خود مسند ارشاد بچھائی۔ فقیہ، مجاہد، مرتاض اور صاحب کشوف وکرامات تھے۔ شیخ غلام یحییٰ بہاری اور دوسرے حضرات نے ان سے فیض حاصل کیا۔ ۴ شعبان ۱۱۸۰ھ/ ۵ جنوری ۱۷۶۷ء کو سادامئو میں وفات پائی جو ہندوستان کے صوبہ یوپی میں ایک قریہ ہے ❶۔

۵۳۔ شیخ بہلول برکی

شیخ بہلول برکی جالندھری، فاضل بزرگ تھے اور علاقہ جالندھر کی اس افغان برادری سے تعلق رکھتے تھے جو برکی کہلاتے ہیں۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ اس زمانے میں جالندھر کو دیار پنجاب میں علم و فضل کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور وہاں سید عبدالرشید، سید کبیر اور سید عتیق اللہ کے درس و تدریس کے سلسلے جاری تھے، شیخ بہلول نے انہی سے استفادہ کیا۔ پھر شیخ محمد سعید بن محمد یوسف انبالوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے اخذ طریقت کیا اور مستفیض ہوئے۔ بعد ازاں لاہور کا قصد کیا اور شیخ بلاق لاہوری سے طریقہ قادریہ میں حصولِ فیض کیا۔

شیخ بہلول جالندھری کو تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی تھی۔ کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں فوائد الاسرار، احوال نامہ، شرح دیوان حافظ شامل ہیں۔ شیخ بہلول برکی شاعر بھی تھے۔ ان کا ایک دیوان شعری موجود ہے۔ ۱۱۷۰ھ/ ۱۷۵۷ء کو جالندھر میں فوت ہوئے ❷۔

ــــــ ت ــــــ

۵۴۔ مفتی تابع محمد لکھنوی

مفتی تابع محمد بن مفتی محمد سعید حسینی لکھنوی، شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ وہیں نشوو نما پائی۔ کچھ کتابیں اپنے والد مفتی محمد سعید سے پڑھیں۔ پھر شیخ احمد بن ابوسعید امیٹھوی معروف بہ ملا جیون کے

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۴۶، بحوالہ بحر زخار۔

❷ خزینۃ الاصفیا، ص ۴۹۸۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۳۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۴۸۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی بہ ضمن لفظ برکی۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ کافی عرصہ ان کی خدمت میں رہے، یہاں تک کہ علم وفضل میں ماہر کامل ہوئے اور اللہ نے فتویٰ وتدریس کی صلاحیت سے بہرہ یاب کیا۔ ان کے والد مفتی محمد سعید حسینی لکھنؤ کے منصب قضا پر متعین تھے۔ والد کی وفات کے بعد مفتی تابع محمد نے یہ مسند سنبھالی۔ فقہ حنفی میں عبور حاصل تھا، ۱۱۲۸ھ/ ۱۷۱۶ء میں اس موضوع پر ''السراج المنیر'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ اس کتاب کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

منك الهداية و اليك النهاية يا من نوّر بعلم الفقه قلوب اولى الالباب۔

سید عبدالحی حسنی لکھنوی تحریر فرماتے ہیں کہ یہ کتاب ندوۃ العلما لکھنؤ کے کتب خانے میں موجود ہے۔❶

۵۵۔ میر تاجو کشمیری

میر تاجو حسینی کشمیری، حنفی مسلک کے حامل تھے۔ شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ فقہ واصول اور علوم عربیہ کے ماہرین میں سے تھے۔ خواجہ حیدر چرخی کشمیری اور خواجہ محمد ٹوپی گر کشمیری کے شاگرد تھے۔ طویل عمر پا کر ۱۱۱۱ھ/ ۱۶۹۹ء میں انتقال کیا۔ زندگی کے آخری دم تک فقر وقناعت کی کیفیت طاری رہی اور علوم دینیہ کی تدریس میں مشغول رہے۔❷

ج

۵۶۔ مرزا جان جاناں دہلوی

علمی اور فکری لحاظ سے زرخیز اور پُرثروت ارض ہند نے جن نامور اصحاب علم اور مقتدر ارباب کمال کو جنم دیا، ان میں مرزا جان جاناں جو تاریخ میں مرزا مظہر جان جاناں کے نام سے معروف ہیں، ایک رفیع المرتبت عالم دین تھے۔ ان کے والد کا اسم گرامی مرزا جان، دادے کا نام عبدالسبحان اور پردادے کا نام محمد زمان علوی تھا۔ مرزا نسباً علوی تھے۔ انیس واسطوں سے ان کا سلسلۂ نسب محمد بن حنفیہ کے توسط سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ بارھویں صدی ہجری میں وہ اس برصغیر کے شیخ وامام، عالم ومحدث، فقیہ اور عابد وزاہد بزرگ تھے۔

مرزا جان جاناں کے والد مرزا جان مغل حکمران اورنگ زیب عالم گیر کے منصب دار تھے اور دکن میں متعین تھے۔ اورنگ زیب دکن میں تھا کہ انھوں نے ملازمت شاہی ترک کر دی اور تمام ساز وسامان غربا وفقرا میں تقسیم کر دیا۔ پچیس ہزار روپے اپنی بیٹی کی شادی کے لیے بچا کر رکھے تھے۔ ایک دوست کو ضرورت پڑی تو وہ

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۴۹۔

❷ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۹۱۔ خزینۃ الاصفیا، ج ۲، ص ۳۵۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۵۰۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کو دے دیے۔ مرزا جان حکومت کے منصب و جاہ سے الگ ہونے کے بعد اکبر آباد (آگرہ) جا رہے تھے کہ علاقہ مالوہ میں کالا باغ کے مقام پر قیام کیا اور وہیں جمعہ کی شب ۱۱ رمضان المبارک ۱۱۱۱ھ/ ۲۰ فروری ۱۷۰۰ء (ایک روایت کے مطابق ۱۱۱۳ھ/ ۱۷۰۲ء) کو ان کے ہاں بچے کی ولادت ہوئی۔ اس کی اطلاع بادشاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر کو پہنچی تو اس نے نومولود کا نام مرزا جان کے نام کی مناسبت سے جانِ جان رکھا اور کہا۔

پسر جانِ پدری باشد ازیں وجہ نامش جانِ جان مقرر کرویم

(بیٹا باپ کی جان ہوتا ہے اس لیے ہم نے ان کا نام جانِ جان قرار دیا۔)

جانِ جان بعد میں بدل کر جان جاناں ہو گیا۔ اس نام نے اتنی شہرت پائی اور اس درجہ مقبولیت حاصل کی کہ خود مرزا صاحب بھی اپنے خطوط میں یہی نام (یعنی جانِ جاناں) لکھنے لگے۔ شمس الدین حبیب اللہ ان کا لقب تھا اور مظہر تخلص کرتے تھے۔ پورا نام شمس الدین حبیب اللہ مرزا مظہر جانِ جاناں تھا۔

مرزا جانِ جاناں باپ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ آغوش پدری میں تربیت پائی۔ شفیق باپ نے ہونہار بیٹے کو آداب و اخلاق، فنون سپاہ گری اور دیگر مروجہ علوم و فنون کی تعلیم دی۔ چند فارسی رسائل بھی پڑھائے۔

مرزا صاحب نے قرآن مجید مع قرات و تجوید کے قاری عبدالرسول دہلوی سے پڑھا جو شیخ القرا عبدالخالق مصری کے تلمیذ تھے۔ اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچے تو والد وفات پا گئے۔ ان کے بعد حاجی محمد افضل سیالکوٹی سے تفسیر، حدیث اور فقہ وغیرہ کی تحصیل کی۔ ان علوم سے فارغ ہونے کے بعد خود مسند تدریس آراستہ کی اور بے شمار لوگوں کو مستفید فرمایا۔ پھر طریقت و تصوف کی طرف عنان توجہ مبذول کی اور نقشبندی سلسلے کے ایک بزرگ شیخ نور محمد بدایونی کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے۔ چار سال ان سے کسب فیض کرتے رہے اور ۱۱۳۵ھ/ ۱۷۲۳ء میں خرقہ و اجازت سے بہرہ مند ہوئے۔ شیخ نور محمد بدایونی سے مرزا صاحب کو انتہائی عقیدت تھی۔ ان کی وفات کے بعد ایک اور بزرگ حافظ سعد اللہ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ بارہ سال ان کی خدمت میں رہے۔ ان کے انتقال کے بعد شیخ محمد عابد سنامی سے بیعت ہوئے۔ ۱۱۵۵ھ/ ۱۷۴۲ء میں مرزا ممدوح نے خود سلسلۂ رشد و ہدایت کا آغاز کیا۔

خودنوشت حالات:

مرزا صاحب نے تین مقامات پر اپنے مختصر حالات لکھے ہیں۔ ایک جگہ کسی صاحب کے خط کے جواب میں، دوسرے اپنے فارسی دیوان کے دیباچے میں اور تیسرے میر سید غلام علی آزاد بلگرامی کی فرمائش پر ان کی تصنیف ''سرو آزاد'' کے لیے! یہ مرزا صاحب اور ان کے اجدادِ کرام کا بہت ہی مختصر سا تعارف ہے اور وہ بھی نہایت انکسار کے ساتھ۔ ان تینوں مقامات کا اردو ترجمہ یہاں دیا جا رہا ہے۔ ایک خط کے جواب میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ درج ذیل ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''برخوردار! تم نے دوبارہ التماس کی ہے کہ فقیر اپنا حسب ونسب لکھے۔ چوں کہ اس میں کوئی خاص فائدہ نہیں تھا، اس لیے میں نے تغافل کیا۔ اب جب کہ (تمھاری) منت سماجت حد سے بڑھ گئی ہے تو مختصر طور پر تحریر کیا جاتا ہے۔ معلوم ہونا چاہیے، حقیقت میں تو اس فقیر کے سرمایۂ وجود کا آغاز ایک قطرۂ آب اور انجام ایک مشت خاک ہے۔ اور اس عالم اعتبار میں خاک سار کی نسبت کا سلسلہ چھبیس واسطوں سے حضرت محمد بن حنفیہ کے توسط سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ فقیر کے اجداد میں سے ایک بزرگ (جن کا نام امیر کمال الدین تھا) آٹھویں صدی ہجری میں کسی وجہ سے (ترک وطن کر کے) طائف سے ترکستان آ گئے تھے۔ انھوں نے اس علاقے کے ایک حاکم (جو قبیلۂ الوس قاقشان کا سردار تھا) کی لڑکی سے شادی کر لی۔ اس حاکم کا کوئی لڑکا نہ تھا۔ لہٰذا اس علاقے کی حکومت کا تعلق ان کی اولاد سے ہو گیا۔ جب ہمایوں بادشاہ نے مملکت ہندوستان کو سرکش پٹھانوں سے نجات دلائی تو وہ اس خاندان کے دو بھائیوں محبوب خاں اور بابا خاں کو ساتھ لایا، جن کا سلسلہ تین پشت پر امیر کمال الدین سے ملتا تھا۔ ان دونوں کا حال عہد اکبری کی تاریخوں میں مرقوم ہے۔ ان بزرگوں کا مادری نسب نامہ امیر صاحب قران (تیمور لنگ) کے خاندان تک پہنچتا ہے اور فقیر کا سلسلہ چار واسطوں سے بابا خاں تک منتہی ہوتا ہے۔ خان مذکور (بابا خاں) نے عہد اکبری میں بغاوت کی تھی۔ اس جرم کی پاداش میں میرے والد بھی کم منصبی کی سزا میں گرفتار تھے۔ انھوں نے عمر کا بڑا حصہ اورنگ زیب عالم گیر کی خدمت میں گزارا۔ آخر ترک دنیا کی دولت سے مفتخر اور ممتاز ہوئے اور سلسلۂ قادریہ کے ایک بزرگ سے استفاضہ کیا۔ میرے والد نے ۱۱۳۰ھ/ ۱۷۱۸ء میں اس دنیا سے رحلت کی۔ فقیر کی ولادت ۱۱۱۳ھ/ ۱۷۰۲ء میں ہوئی۔ سولہ سال کی عمر میں یتیم ہو گیا تھا۔ بیس سال کی عمر میں کمر ہمت باندھ کر دنیا سے ہاتھ اٹھا لیا اور فقر کی راہ میں ریاضت شروع کی۔ علوم متعارفہ والد کے زمانے میں پڑھے اور کتب حدیث حاجی محمد افضل سیال کوٹی کی خدمت میں پڑھیں جو شیخ المحدثین شیخ عبداللہ بن سالم مکی کے شاگرد تھے۔ قرآن مجید شیخ القراء شیخ عبدالخالق شوقی کے شاگرد حافظ عبدالرسول دہلوی سے پڑھا۔ طریقہ نقشبندیہ کا خرقہ اور اجازت مطلقہ جناب سید السادات نور محمد بدایونی سے حاصل کی، جن کا سلسلہ دو واسطوں سے حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ سے ملتا ہے۔ ایک عمر ان کی خدمت میں گزاری۔ ان کی وفات کے بعد اس طریقے کے متعدد مشائخ سے استفادہ کیا اور پھر مدت تک فیض آشیانہ حضرت شیخ الشیوخ محمد عابد سنامی کے آستانہ پر جبہ سائی کی۔ ان کا سلسلہ بھی دو واسطوں سے حضرت مجدد سے ملتا ہے۔ ایک عرصے تک ان کی خدمت کر کے قادریہ سہروردیہ اور چشتیہ طریقوں کا خرقہ اور اجازت ان سے حاصل کی۔ آج تک کہ ۱۱۸۵ھ/ ۱۷۷۱ء ہے، ان بزرگوں کے حکم کے مطابق تیس سال سے طالبان خدا کی تربیت کر رہا ہوں۔ خدا خاتمہ بالخیر کرے۔۔۔۔۔۔ ۱۱۸۵ھ/ ۱۷۷۱ء۔

دیباچۂ دیوان فارسی میں لکھتے ہیں۔

''حمد وصلوٰۃ کے بعد فقیر جانِ جاناں، متخلص بہ مظہر پسر جان، جانی تخلص کہ علوی نسب و ہندی مولد و

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حنفی مذہب اور نقشبندی مشرب ہے، اپنے احوال دوستوں کی خدمت میں پہنچاتا ہے۔ سولہ سال کی عمر میں یہ خاک سار یتیم ہو گیا۔ اور بیس سال کی عمر میں درویشوں میں شامل ہو گیا۔ تیس سال تک مدرسہ اور خانقاہ میں جاروب کشی کی۔ باقی زندگی بھی اسی شغل شریف میں گزار دی۔ اللہ کی دی ہوئی ہمت اور توفیق سے پوری زندگی، دست طلب کو دنیا کی گندگی سے آلودہ نہیں کیا اور پائے سعی کو اس راہ میں نہ رکھا۔ آج کہ ۱۱۷۰ھ/ ۱۷۵۷ء ہے اور میری عمر ساٹھ سال ہے، بیس سال سے کنج عزلت میں پناہ گزین ہوں اور حضرات مشائخ کے احکام کے مطابق انسانوں کے نسخۂ وجود کی تصحیح میں مشغول ہوں، جن کی ذات کے فرد باطل میں ہزاروں غلطیاں ہیں۔ عہدِ جوانی میں شورِ عشق کی تحریک پر جو کہ جوانی کے خمیر کا نمک ہے، نالہائے دردموزوں کیے تھے، جس لیے شاعری میں میرا نام آ گیا۔ والا ہمتی کی وجہ سے اجزائے مسودات و مواد کلیات اکٹھا نہ کیا۔ بہت سا سرمایہ سخن برباد ہو گیا۔ باقی میں ارباب نقل و روایت نے نمایاں تصرف کر کے غلط کلام کو رواج دے دیا۔ کور سوادوں نے جو آنکھوں سے محروم تھے، انصاف کو پس پشت ڈال دیا۔ شاعری پر اعتراضات کیے اور مغز سخن کو نہ پہنچ پائے۔ ان اعتراضات کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوئی۔ اس کم فرصتی کے زمانے میں جب کہ موت کا خوف بہت زیادہ ہے اور یہ طویل سفر درپیش ہے، ان اعتراضات کا جواب میرے بس میں نہیں تھا۔ ایک نوجوان سراپا جان نے اس کلام کو ترتیب دینے اور تصحیح کرنے کے لیے کہا۔ بہت تلاش و جستجو کے بعد بیس ہزار اشعار میں سے تقریباً ایک ہزار ملے اور وہ بھی بے ترتیبِ ردیف، اور اکثر غزلیں ناتمام ہاتھ آئیں۔ اس مجموعے کے علاوہ جو کچھ سامنے آئے، اسے (میرے اشعار سے) خارج سمجھا جائے۔ ہاں وہ تازہ کلام جو کہنے کا بہت کم اتفاق ہوتا ہے اور جو کلام قدیم مسودات میں سے ملے اس میں شامل کر لیا جائے۔ بیس سال پہلے فقیر کے کچھ اشعار ایک عزیز فراہم کر کے میرے پاس لایا تھا اور اس پر کچھ لکھنے کی درخواست کی تھی۔ میں نے چند سطریں لکھ دی تھیں، اب اسے قابل اعتبار نہ سمجھا جائے۔ کیوں کہ وہ تمام اشعار بھی اسی میں شامل ہیں و السلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔"

میر سید غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنی تصنیف "سرو آزاد" کے لیے مرزا صاحب سے ان کے حالات طلب کیے تو مندرجہ ذیل سطور لکھ کر ارسال فرمائیں۔ ترجمہ ملاحظہ ہو

فقیر جانِ جاناں متخلص بہ مظہر پسر مرزا جان، تخلص جانی، نسباً علوی، مولداً ہندی، مذہباً حنفی، مشرباً نقشبندی ہے۔ ظاہری نشو و نما اکبر آباد میں ہوئی اور باطنی تربیت شاہ جہاں آباد میں حضرت سید نور محمد بدایونی نقشبندی مجددی کی خدمت میں ہوئی۔ سلسلۂ نسب اٹھائیس ❶ واسطوں سے محمد بن حنفیہ کے توسط سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر منتہی ہوتا ہے۔

"اس فقیر کے جد اعلیٰ امیر کمال الدین نویں ❷ صدی ہجری کے ابتدا میں طائف کے علاقے سے نکل

---

❶ اس سے پہلے چھبیس واسطے لکھا جا چکا ہے۔ قرین صحت معلوم نہیں کیا ہے، چھبیس یا اٹھائیس۔

❷ پہلے گزر چکا ہے کہ ایک مکتوب میں مرزا صاحب نے آٹھویں صدی ہجری تحریر کیا ہے۔ معلوم نہیں، صحیح کیا ہے؟

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کر ترکستان کے علاقے میں آباد ہو گئے اور اس ملک کے بعض فرماں رواؤں کے ساتھ زندگی گزاری۔ ان کی بہت زیادہ اولاد تھی۔ ان میں سے امیر مجنوں اور امیر بابا اس زمانے میں ہندوستان آئے جب ہمایوں بادشاہ نے ملک فتح کیا۔ اس کے بعد سلاطین مغلیہ کی خدمت اور رفاقت اس خاندان کا شعار رہا ہے۔ (میرے والد) مرزا جان جن کا سلسلۂ نسب چھٹی پشت پر امیر بابا سے اور بارھویں پشت پر امیر کمال الدین سے ملتا ہے، عہد اورنگ زیب بادشاہ رحمۃ اللہ علیہ میں منصب [1] عالی ترک کر کے گوشہ گیر ہو گئے تھے۔ بچپن ہی سے اس خاک سار کو ہوس جاہ و مال نے پریشان نہیں کیا۔ اس امید پر کہ دوسری دنیا میں چشم بصیرت وا ہو سکے، حصول ضروریات کے بعد اس فقیر نے خود کو فقرا کے دامن سے وابستہ کر لیا اور نقش قدیم کی طرح ان کے دروازے پر بیٹھ گیا۔ لہٰذا اس فقیر کا دماغ ضعف قوی کا شکار ہے۔ اس میں تدبیر اسباب کی تاب نہیں رہی، تجرید و تعزیر اختیار کر لی ہے۔ گل کی طرح تمام زندگی ایک ہی لباس میں گزار دی۔ شور عشق کی تحریک سے جو کہ اس کے خمیر کا نمک ہے، کبھی کبھی فریاد کے لیے لب کھولتا ہے۔ چوں کہ اس کا نالہ موزوں ہوتا ہے، اس لیے احباب جوہر شناسی کی وجہ سے انھیں اشعار سے تعبیر کرتے ہیں، ورنہ اپنی بے سرمائیگی کے پیش نظر غایت انصاف کی بنا پر اس نے دکان سخن نہیں لگائی۔"

مرزا کے بعض آباو اجداد:

مرزا صاحب کے خود نوشت مختصر حالات میں متعدد حضرات کے نام آئے ہیں۔ ان کے بعض آباو اجداد کے بھی اور بعض اساتذہ و مرشدین کے بھی۔! مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اختصار کے ساتھ ان کے حالات بھی بیان کر دیے جائیں۔ ان کے آباو اجداد میں امیر مجنوں، امیر بابا اور خود مرزا کے والد مکرم مرزا جان کے نام دکھائی دیتے ہیں اور مرشدین و اساتذہ میں حاجی محمد افضل سیالکوٹی اور سید نور محمد بدایونی کے۔! ان کا مختصر تذکرہ درج ذیل ہے۔

۱۔ امیر مجنوں خان کا نام ان لوگوں میں شامل ہے جو ہندوستان پر ہمایوں کے حملے کے زمانے میں اس کے ساتھ ہندوستان آئے۔ ہمایوں کی وفات کے وقت مجنوں خاں نارنول کا جاگیردار تھا۔ بعد میں حالات کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ مجنوں خاں دہلی آ گیا اور اکبر بادشاہ نے اسے مانک پور کی جاگیر عطا کر دی۔ مجنوں خاں امیر بابا کا بھائی تھا۔ اس نے بہت سے اہم معرکوں میں حصہ لیا۔ ۹۷۱ھ/۱۵۶۴ء میں جب جون پور کے صوبے دار علی قلی خاں نے اکبر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو اس کی سرکوبی کے لیے بادشاہ خود فوج لے کر آگے بڑھا۔ مجنوں خاں دائیں بازو کی فوج کا سپہ سالار تھا۔ اس معرکے میں شاہی فوج فتح یاب ہوئی۔

۹۷۶ھ/۱۵۶۹ء میں اکبر نے اسے تسخیر کالنجر پر مامور کیا۔ مجنوں خاں فوج لے کر گیا تو کالنجر کے حاکم رام چندر نے مقابلے میں آنے کی جرات نہیں کی اور بغیر جنگ کے ہتھیار ڈال دیے، اس سے اکبر کے دل میں

[1] اس سے پہلے مرزا صاحب نے خود لکھا ہے: "میرے والد بھی کم منصبی کی سزا میں گرفتار تھے۔"

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امیر مجنوں خاں کا احترام بہت بڑھ گیا۔ ۹۸۹ھ/۱۵۸۱ء میں جب شاہی فوج نے بنگال فتح کیا تو مجنوں خاں اور بابا خاں کو گھوڑا گھاٹ کی جاگیر عنایت کی اور مجنوں خاں کو سہ ہزاری منصب داروں میں شامل کیا۔ ۹۸۹ھ/۱۵۸۱ء ہی میں مجنوں خاں کا انتقال ہوگیا❶۔ مجنوں خاں کی وفات کے بعد گھوڑا گھاٹ کی جاگیر کا حق دار اس کا بیٹا جباری خاں تھا۔ لیکن اکبر نے تمام جاگیر بابا خاں کو دے دی تھی۔

بابا خاں بھی عہد اکبری کے امرا میں شامل تھا۔ اکبر کے زمانے میں گجرات کا صوبے دار مظفر خاں تھا۔ اس نے ''آئین داغ'' نافذ کیا تھا۔ اس آئین کی رو سے ضروری تھا کہ تمام جاگیر دار اپنی فوج بھیج کر سوار کا حلیہ لکھوائیں اور گھوڑے کے چہرے یا پچھلی ٹانگوں پر ایک داغ لگوائیں۔ لوگوں کی اکثریت اس قانون کے خلاف تھی۔ بابا خاں داغ کے لیے اپنے سوار بھیجتا تو مظفر خاں کے کارندے رشوت طلب کرتے۔ بابا خاں اکثر کہا کرتا تھا کہ میں ستر ہزار روپے خرچ کر چکا ہوں لیکن ابھی تک سو گھوڑے بھی نہیں داغے گئے۔ مظفر خاں کے مظالم سے تنگ آ کر جب معصوم خاں کابلی نے بغاوت کی تو مجنوں خاں کا لڑکا جباری خاں اور بابا خاں دونوں باغیوں میں شامل ہوگئے۔ مظفر خاں ٹانڈہ میں پناہ گزین ہوگیا تھا۔ وہ باغیوں کے ہاتھوں مارا گیا اور باغیوں نے تمام علاقے پر قبضہ کر لیا۔ فتح کے بعد منصب اور خطاب تقسیم ہوئے تو بابا خاں نے اپنے لیے خانِ خاناں کا خطاب اختیار کیا۔ اس کامیابی کے بعد بابا خاں بیمار پڑ گیا اور پھر اسی بیماری میں اس کی وفات ہوئی۔ اکبر نے جب باغیوں پر قابو پا لیا تو مجنوں خاں کے بیٹے جباری خاں کو گرفتار کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد جباری خاں نے بغاوت میں شمولیت پر اظہار ندامت کیا تو اکبر نے اسے رہا کر دیا۔

اس بغاوت کے نتیجے میں بادشاہ ہند جلال الدین اکبر نے اس خاندان کے لیے حکومت کے اعلیٰ مناصب بند کر دیے۔ اس سے طویل عرصے بعد اورنگ زیب عالم گیر کا دور آیا تو صرف مرزا مظہر جانِ جاناں کے والد مرزا جان جانی کا نام مغلیہ حکومت کے منصب داروں میں شامل ہوا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کی ملازمت کی کیا نوعیت تھی۔ وہ اعلیٰ مناصب کے لوگوں میں شامل تھے یا کم حیثیت کے ملازمین میں۔

مرزا کے والد مرزا جان اورنگ زیب کے شاہی ملازمین میں سے تھے۔ ۱۱۱۰ھ/۱۶۹۹ء میں وہ اورنگ زیب کے ساتھ دکن میں مقیم تھے۔ اسی سال انھوں نے ملازمت ترک کی اور مال و اسباب فقرا و مساکین کو دے دیا۔ منقول ہے کہ اپنی بیٹی کی شادی کے لیے پچیس ہزار روپے بچا کر رکھے تھے۔ ایک دن انھیں معلوم ہوا کہ ایک دوست کو روپے کی ضرورت ہے، ساری رقم اسے دے دی۔

مرزا جان کی قناعت اور توکل کے بارے میں کئی واقعات مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک بار انھوں نے گھر میں کدو کی بیل لگائی۔ ملازمہ نے کہا یہ بیل تو آپ نے لگا لی ہے ایسا نہ ہو کہ گھر میں کسی وقت تنگ دستی کی

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے: اکبر نامہ، ج ۲، ص ۳۵۷۔ آئین اکبری، ج ۱، ص ۲۲۳۔ مآثر الامراء، ج ۳، ص ۲۰۹ تا ۲۱۱۔ تذکرۂ ہمایوں و اکبر، ص ۲۴۱۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نوبت فاقے تک پہنچ جائے اور آپ اس بیل کے پتے کھانے لگیں۔ یہ بات شیوۂ توکل اور روحِ قناعت کے خلاف ہوگی۔ مرزا جان نے ملازمہ کی یہ بات سنی تو اسے معرفت الٰہی پر محمول کیا اور بیل جڑ سے اکھاڑ دی۔

مرزا جان سلسلۂ قادریہ سے منسلک تھے اور شاہ عبدالرحمٰن قادری سے بیعت تھے۔ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے اور جانی تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے نہ تصوف میں شہرت پائی نہ شاعری میں۔ گم نامی کی زندگی بسر کی۔ یہی وجہ ہے کہ شعرا اور صوفیا کے تذکروں میں نہ ان کے حالات ملتے ہیں نہ کلام کا پتا چلتا ہے [1]۔

اساتذہ اور مرشد:

مرزا صاحب نے کتب حدیث حاجی محمد افضل سیالکوٹی سے پڑھیں۔ حاجی صاحب موصوف حضرت مجدد الف ثانی کے فرزند گرامی شیخ محمد معصوم کے خلیفہ تھے۔ عالم اور متقی بزرگ تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی ان سے علم حدیث کی سند حاصل کی تھی۔ کتابوں کے اس قدر شائق تھے کہ کسی طرف سے جو آمدنی ہوتی اس سے کتابیں خرید لیتے۔ ایک مرتبہ کسی نے پندرہ ہزار روپے پیش کیے، انھوں نے اس تمام روپے کی کتابیں خرید لیں۔ ۱۱۴۶ھ/۱۷۳۳ء کو دہلی میں فوت ہوئے اور مقبرہ خواجہ باقی باللہ میں دفن کیے گئے۔

سید نور محمد بدایونی سے مرزا صاحب نے فیض طریقت حاصل کیا تھا۔ سید ممدوح سلسلۂ نقشبندیہ کے ممتاز بزرگوں میں سے تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے پوتے، شیخ سیف الدین بن شیخ محمد معصوم کے فیض یافتہ اور خلیفہ تھے۔ دیگر حضرات سے بھی کسب فیض کیا تھا۔ عابد و زاہد اور متبع سنت نبوی تھے۔ ۱۱ ذیقعدہ ۱۱۳۵ھ/۱۲ اگست ۱۷۲۳ کو دہلی میں وفات پائی اور بستی نظام الدین اولیا میں دفن ہوئے۔

ملوک و امرا سے کنارہ کشی:

مرزا صاحب خوش شکل، خوب رو، وجیہ اور بارعب عالم دین تھے۔ نہایت مہذب، با اخلاق اور درویش منش بزرگ تھے۔ دوسروں کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے اور اس کو رفع کرنے کی پوری کوشش کرتے۔ متوکل علی اللہ، مستغنی المزاج اور پیکرِ زہد و عبادت تھے۔ امرا و حکام اور اربابِ ثروت سے دور رہتے اور ان سے ملنے اور تحفے قبول کرنے سے ہمیشہ گریز کرتے۔ اگر کوئی کچھ پیش کرتا تو صاف لفظوں میں انکار کر دیتے۔ ایک امیر نے رہنے کے لیے ایک حویلی اور خانقاہ اور غربا و مساکین کے لیے کچھ ذرائع خدمت پیش کیے، مگر مرزا صاحب نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ جب مکان اور مال و متاع چھوڑ کر ہی دنیا سے جانا ہے تو اپنا ہو یا دوسرے کا، سب برابر ہے۔ ہر شخص کی روزی خدا کے ہاتھ میں ہے، جو ہر حالت میں بقدر حصہ پہنچتی ہے۔

ایک مرتبہ ہندوستان کے مغل حکمران محمد شاہ نے اپنے وزیر قمر الدین خاں کی وساطت سے پیغام بھجوایا

---

[1] ملاحظہ ہو: معمولات مظہریہ، ص ۱۵۔ مقامات مظہری، ص ۱۴ تا ۱۷۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ خدا نے ہمیں وسیع ملک عطا کیا ہے، جو علاقہ آپ مناسب سمجھیں قبول فرمائیے

مرزا صاحب نے جواب دیا قل متاع الدنیا قلیل ❶۔ متاع ہفت اقلیم قلیل فرمودہ است، نزد شما ہفتم حصہ آں قلیل، یک اقلیم ہندوستان است، پیش شما چیست کہ سرہمت فقرا بقبول آں فرود آید ❷۔

(یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ سے فرمایا کہ (اے رسول اکرم) دنیا کا مال واسباب بہت قلیل ہے۔ اللہ نے تو متاع ہفت اقلیم کو بھی قلیل قرار دیا ہے۔ آپ کے پاس تو اس قلیل کا بھی بہت کم حصہ ایک ہندوستان ہے۔ آپ کس بل بوتے پر یہ کہتے ہیں کہ فقرا اسے قبول کریں۔)

مرزا مظہر جانِ جاناں کے صبر و استغنا اور توکل کے بارے میں اس قسم کے بہت سے واقعات ان کے حالات میں مرقوم ہیں۔

اخذ وقبول نذر کے پیمانے:

انھوں نے تمام عمر مکان نہیں بنایا۔ ہمیشہ دوسروں کے مکان میں کرایہ پر یا عاریتاً مقیم رہے۔ خود کھانا نہیں پکاتے تھے، ضرورت کے وقت کھانا پکا ہوا لے آتے اور کھا لیتے۔ لباس کا یہ عالم تھا کہ کبھی دو جوڑے نہیں سلائے، ہمیشہ ایک جوڑا رکھا۔ میلا ہوا تو دھولیا۔ کسی کی نذر قبول نہیں کرتے تھے۔ البتہ اس ضمن میں انھوں نے چھ پیمانے مقرر کر رکھے تھے، کوئی اس معیار پر پورا اترتا تو اس کی نذر قبول فرما لیتے۔

۱۔ نذر پیش کرنے والا بلند کردار آدمی ہو۔
۲۔ امرا اور اہل دنیا سے اختلاط اور میل جول نہ رکھتا ہو۔
۳۔ مجموعی طور پر صالح اور متقی انسان ہو۔
۴۔ حلال اور حرام کی تمیز رکھتا ہو اور پھر اس پر عامل بھی ہو۔
۵۔ غصب ونہب سے متنفر اور لوٹ مار سے کنارہ کش رہتا ہو۔
۶۔ جو کچھ دینا ہو اس میں خلوص قلب کارفرما ہو۔

فرمایا کرتے کہ تحفے اور ہدیے کو ٹھکرا دینا اگرچہ ممنوع ہے، تاہم قبول کرنا بھی ضروری نہیں۔ میں اپنے انھی رفقا اور متعلقین کا تحفہ قبول کرتا ہوں، جن کے بارے میں یقین ہو کہ اخلاص اور احتیاط سے پیش کر رہے ہیں۔ میں اغنیا کا تحفہ قبول نہیں کرتا۔ ان کے تحائف و ہدایا عام طور سے مشتبہ اور مشکوک ہوتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اغنیا حقوق العباد کا خیال نہیں رکھتے، لہٰذا ان سے تحفہ قبول کرنا قیامت کے روز اللہ کے دربار میں

❶ یہ سورۃ النساء کی آیت نمبر ۷۷ کے الفاظ ہیں۔ ترجمہ یہ ہے: ''(اے رسول اللہ ﷺ!) فرما دیجیے کہ دنیا کا مال ومتاع چند روزہ ہے۔''

❷ مقامات مظہری، ص ۳۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باز پرس کا باعث بن سکتا ہے۔

اس ضمن میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ ایک مرتبہ نظام الملک نے ان کی خدمت میں تیس ہزار نقد روپے پیش کیے۔ آپ نے قبول نہیں فرمائے اور کہا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ نظام الملک نے عرض کیا، اگر آپ کو ذاتی ضرورت نہیں تو مجھ سے لے کر مسکینوں اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دیجیے۔ فرمایا میں تمھارا خازن نہیں ہوں۔ اگر تقسیم کرنا چاہتے ہو تو میرے گھر سے باہر جا کر خود ہی تقسیم کر دو۔

مرزا مظہر جان جاناں، بارھویں صدی ہجری کے ہندوستان کے عجوبۂ روزگار عالم دین تھے۔ ذکاوت وفطانت، زہد و ورع، قوتِ ادراک، اتباع سنت، ذکر الٰہی اور اقتضائے آثار سلف میں ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ وہ مشائخ وصوفیا کے رسوم وعوائد کے پابند نہ تھے۔ نہ ان کی مجالس میں جانے کے عادی تھے اور نہ خود اپنا ہی کوئی خاص حلقۂ تصوف وطریقت قائم کیا۔

اتباع سنت کا شدید جذبہ:

مرزا مظہر جان جاناں کے زمانے کے حالات پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ ہر طرف انحطاط ہی انحطاط اور زوال ہی زوال تھا۔ سلطنت مغلیہ کا اقتدار تقریباً ختم ہو چکا تھا اور اس کے عروج کا آفتاب لب بام آ گیا تھا۔ بادشاہ اور امرا و رؤسا سب عیش وعشرت میں مبتلا تھے۔ صوفیا اور علما میں سے بھی بعض لوگ منصب اصلاح کو ترک کر چکے تھے۔ عقائد صحیحہ کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ تعلیم قرآن اور اتباع سنت کا احساس تک بھی بہت سے ذہنوں میں باقی نہ رہا تھا۔ اس ماحول میں واقعی ایک مصلح کی ضرورت تھی، اور مرزا مظہر جان جاناں نے اس ضمن میں جو خدمات انجام دیں، وہ ہر اعتبار سے لائق تحسین ہیں۔ وہ اتباع کتاب وسنت کا اس درجہ التزام کرتے تھے کہ اس دورِ انحطاط میں اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ اس ضمن میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ ایک مرتبہ ان کے والد مرزا جان انھیں اپنے پیر و مرشد شاہ عبدالرحمٰن قادری کے پاس لے گئے۔ شاہ مذکور اس وقت سکر وسماع کی حالت میں تھے۔ اس حالت میں انھوں نے عصر اور مغرب کی نمازیں نہیں پڑھیں۔ مرزا صاحب نے شاہ عبدالرحمٰن کی یہ حالت دیکھ کر دل میں فیصلہ کر لیا کہ اگر والد نے ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو کہا تو انکار کر دیں گے۔ مگر خیریت گزری کہ والد نے بیٹے کو بیعت کے لیے نہیں کہا۔

مرزا صاحب ممدوح کی پوری زندگی اتباع سنت نبوی ﷺ کی واضح مثال تھی۔ وہ سلام کرنے میں بھی سنت رسول (ﷺ) کو ملحوظ رکھتے تھے۔ شاہ غلام علی لکھتے ہیں:

مردم را آداب سلام موافقِ سنتِ رسولِ خدا تاکید می نمودند، واز دست بر سر داشتن وخم شدن منع می فرمودند (1)۔

---

(1) مقامات مظہری، ص ۳۵۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق سلام کرنے کی تاکید کرتے، اور سلام کے لیے سر پر ہاتھ رکھنے اور جھکنے سے منع فرماتے۔)

مرزا صاحب جس طرح خود متبع سنت نبوی تھے، اسی طرح اپنے عقیدت مندوں اور دوسرے لوگوں کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے۔ وہ ان ہی لوگوں کو پسند فرماتے، جو اللہ اور رسول کے احکام کے پابند تھے۔ اپنے مریدوں سے کہا کرتے:

ایمان مجمل کہ ایمان آوردم بخدا و رسولِ خدا و آنچہ پیغمبر از خدا آوردہ است، دوست دارم، دوستانِ خدا و رسول را، و بے زارم از دشمنانِ خدا و رسول۔ بہ جہت نجات کافیست ❶۔

(میں اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) پر اور اس چیز پر جو رسول اللہ ﷺ اپنے خدا کی طرف سے لے کر آئے، ایمان لایا ہوں۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے پیار کرنے والوں سے پیار کرتا ہوں اور ان کے دشمنوں سے بے زار ہوں۔ بس نجات کے لیے یہی کافی ہے۔)

مرزا صاحب کی اتباع سنت کی وجہ سے لوگ ان کو مرکز محبت ٹھہراتے، ان کا احترام کرتے اور کثیر تعداد میں ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوتے۔ دوسرے لوگوں کے علاوہ روہیلوں کی بہت بڑی تعداد ان کے مریدین میں شامل تھی۔ جس قدر روہیلے ان کے مرید تھے، شاید ہی کسی دوسرے بزرگ کے ہوں۔

مرزا صاحب شاہ ولی اللہ کی نظر میں:

مرزا جان جاناں کے علم و فضل اور اتباع سنت کی وجہ سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ؒ ان کا انتہائی احترام کرتے تھے اور ان کی نظر میں مرزا صاحب بہ درجہ غایت قدر و منزلت کے حامل تھے۔ ایک مکتوب میں شاہ صاحب انھیں ان الفاظ سے مخاطب فرماتے ہیں:

''بنام مرزا صاحب خدائے عزوجل آں قیم طریقہ احمدیہ و داعی سنت نبویہ را دیرگاہ داشتہ مسلمین را متمتع و مستفید گرداند ❷۔

ایک اور مکتوب میں فرماتے ہیں:

”مرزا صاحب متع الله المسلمين با فادات قيم الطريقة الاحمديه دردى رياض الطريقة بتوجيهات النفس الزكيه❸۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اپنے دور کے عظیم عالم تھے۔ وہ مرزا صاحب کی عظمت کا اعتراف

❶ مقامات مظہری، ص ۳۶۔

❷ کلمات طیبات، ص ۱۵۸۔

❸ ایضاً، ص ۱۵۹۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہایت شان دار الفاظ میں کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

آنچہ قدر ایشاں ما مردم می دانیم شما چہ دانید، احوال مردم ہند بر ما مخفی نیست کہ خود مولد و منشا فقیر است، و بلادِ عرب را نیز دیدہ ام و سیر نمودہ۔ احوال مردم ولایت از ثقاتِ آں جا شنیدہ ایم و تحقیق کردہ ایم عزیزے کہ بر جادۂ شریعت و طریقت و اتباع کتاب و سنت ہم چنیں استوار و مستقیم باشد، و در ارشاد طالبان شانے عظیم و نفسے قوی دارد، دریں جز و زماں مثل ایشاں در بلاد مذکور دریافتہ نمی شود، مگر در گزشتگان، بلکہ در ہر جز و زمان وجود ایں چنیں عزیزاں کم تر بودہ است، چہ جائے ایں زمان کہ پُر فتنہ و فسادا است ❶۔

(یعنی ان حضرات کی جو قدر ہم جانتے ہیں، تم کیا جانو، ہندوستان کے لوگوں کے احوال ہماری نظر سے اوجھل نہیں ہیں۔ میں نے بلادِ عرب کو بھی دیکھا ہے اور وہاں گھوما پھرا ہوں۔ وہاں کے معتمد علیہ لوگوں سے اس عزیز (مرزا مظہر جان جاناں) کے دین و تقویٰ کے بارے میں سنا اور تحقیق کیا ہے۔ وہ جادۂ شریعت پر قائم، منزلِ طریقت کے راہ نورد اور کتاب و سنت کی صراط مستقیم پر گام فرسا ہیں۔ طالبان رشد و ہدایت میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے اور وہ عظیم کردار کے مالک ہیں۔ ان بلاد میں ان کے مرتبے کا کوئی شخص نہیں ہے۔ البتہ گزشتہ دور میں ان کے پایہ کے لوگ موجود تھے، مگر وہ بھی بہت کم۔ اس دورِ پُر فتن میں تو ان اوصاف کے حامل ناپید ہیں۔)

کیفیت نماز:

"ذکر طریق کیفیت صلوٰۃ" کے عنوان کے تحت نعیم اللہ بہرائچی معمولات مظہریہ کے صفحہ ۷۵ پر لکھتے ہیں:

معمول چنیں بود کہ صلوٰۃ خمسہ را در اوقات مخصوصہ و مستحبہ ادامی نمودند و رعایت اعتدال رکوع و سجود و قیام و قعود و قومہ و جلسہ بجامی آوردند و می فرمودند کہ شریعت عبارت از ہمیں اعتدال و اقتصاد است و دست را برابر سینہ می بستند و می فرمودند کہ ایں روایت ارجح است از روایت زیر ناف۔

(یعنی حضرت مرزا جانِ جاناں کا معمول یہ تھا کہ پانچوں نمازیں ان کے صحیح اوقات میں ادا کرتے اور رکوع، سجود، قیام و قعود اور جلسہ میں کامل اعتدال سے کام لیتے۔ فرمایا کرتے کہ شریعت اسی اعتدال و اقتصاد سے عبارت ہے۔ نماز میں ہاتھ سینے پر باندھتے اور فرماتے کہ سینے پر ہاتھ باندھنے کی روایت زیر ناف ہاتھ باندھنے کی روایت سے راجح ہے۔)

حدیث ہی کو مدارِ عمل ٹھہراتے:

مرزا ممدوح فقہی مسلک کے لحاظ سے حنفی تھے اور فروعات میں اسی مسلک کے پیرو تھے، لیکن اگر مسائل حنفیہ کے خلاف کوئی صحیح حدیث انھیں مل جاتی تو قول امام کو ترک کر دیتے اور اس حدیث کو مدارِ عمل

❶ کلمات طیبات، ص ۱۵۸ بر حاشیہ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ٹھہراتے۔ جو لوگ حدیث صحیح چھوڑ کر روایاتِ فقہیہ پر عمل کرتے ہیں، ان پر تعجب کا اظہار فرماتے، چنانچہ سید عبدالحی حسنی فرماتے ہیں:

ویقول، العجب کل العجب ان الحدیث الصحیح غیر المنسوخ لا یعمل به مع انه یروی عن النبی المعصوم عن الخطاء صلی الله علیه وسلم ببضع وسائط من الرواة و یعمل بالروات الفقهیة التی نقلها القضاة والمفتیون بوسائط عدیدة عن الامام غیر المعصوم مع ان ضبطهم وعدلهم غیر معلوم❶۔

(بڑے تعجب کی بات ہے کہ ان صحیح اور غیر منسوخ احادیث پر تو عمل نہ کیا جائے جو اللہ کے معصوم عن الخطا پیغمبر (ﷺ) سے ثقہ رواۃ کے واسطے سے مروی ہیں، اور اس کے برعکس ان فقہی روایات کو معمول بہا ٹھہرا لیا جائے جو امام غیر معصوم سے قضات اور ارباب فتویٰ حضرات نے ان واسطوں سے نقل کی ہیں، جن کا عدل وضبط بھی معلوم نہیں۔)

رفع سبابہ اور فاتحہ خلف الامام:

اسی طرح کتب تاریخ میں حضرت مرزا صاحب کے حالات کے ضمن میں مرقوم ہے کہ وہ تشہد میں رفع سبابہ اور فاتحہ خلف الامام پر عامل تھے۔ چنانچہ الیانع الجنی میں ہے:

ویقوی قرأة الفاتحة فیما لا یجهر الامام فیه بالقرأة❷۔

(یعنی حضرت مرزا مظہر جان جاناں کا یہ معمول تھا کہ وہ سرّی نمازوں میں سورۂ فاتحہ پڑھنے پر زور دیتے تھے۔)

مولانا محمد حیات سندھی مدنی محدث فرماتے ہیں کہ مسائل میں وہ عمل بالحدیث کو ضروری قرار دیتے تھے، اگرچہ ان کے مذہب (حنفیت) کے خلاف ہی ہو۔

عمل بالحدیث کی تاکید:

مرزا ممدوح ہر معاملے میں اتباع سنت کو ملحوظ خاطر رکھتے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے بارے میں منقول ہے کہ وہ رفع سبابہ یعنی نماز میں انگشت شہادت اٹھانے کے قائل نہ تھے، اس ضمن میں مرزا صاحب سے کسی بزرگ نے خط کے ذریعے استفسار کیا، تو اس کے جواب میں نہایت وضاحت سے لکھا کہ مجدد صاحب کو یہ حدیث نہیں

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۵۲۔

❷ الیانع الجنی، ص ۹۶۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہنچی۔ اگر پہنچتی تو اس پر ضرور عمل کرتے۔ ان کے فرزند شیخ محمد یحییٰ سرہندی رفع سبابہ کے قائل تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک رسالہ بھی لکھا ہے، جس میں حدیث کی روشنی میں رفع سبابہ کا ثبوت دیا ہے۔ مرزا صاحب مزید فرماتے ہیں کہ کسی اہل علم یا کسی امام یا کسی صحابی کو حدیث رسول ﷺ کا نہ پہنچنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اس ضمن میں ان کے فارسی خط کا اردو ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے تاکہ اس کی پوری وضاحت ہو جائے اور یہ معلوم ہو سکے کہ اس باب میں حضرت مرزا صاحب ممدوح کا نقطۂ نظر کس درجہ صاف اور واضح ہے۔ لکھتے ہیں:

”آپ نے لکھا تھا کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات میں سے ایک مکتوب میں رفع سبابہ (نماز میں انگشت شہادت اٹھانے) سے منع کیا ہے اور آپ (یعنی مرزا مظہر جانِ جاناں) حضرت مجدد سے اتنی محبت کے باوجود رفع سبابہ کو جائز قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ محبّ کے لیے ضروری ہے کہ اپنے محبوب کا اتباع کرے۔ مخدوما! اللہ تعالیٰ نے کتاب و سنت کی پیروی انسانوں کے لیے فرض ٹھہرائی ہے، چنانچہ فرماتا ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ﴾ ❶

نیز رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

لا یومن احدکم حتی یکون هواه تبعالما جئت به۔

(یعنی تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اپنی خواہش کو اس کے تابع نہ کر دے، جو میں لایا ہوں۔)

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ رسول اللہ ﷺ کے کامل نائب ہیں، انھوں نے اپنے طریقے کی بنیاد کتاب و سنت پر رکھی ہے، اور علما نے رفع سبابہ کے ثبوت میں بہت سے ایسے رسائل تصنیف کیے ہیں، جن میں فقہائے حنفیہ کی روایات اور صحیح احادیث سے اس مسئلے کو ثابت کیا گیا ہے، یہاں تک کہ حضرت مجدد کے چھوٹے صاحب زادے شیخ محمد یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس موضوع پر ایک رسالہ لکھا ہے۔ انھیں ایک بھی ایسی حدیث نہیں ملی، جس سے رفع سبابہ کی نفی ثابت ہوتی ہو۔ یاد رکھیے، حضرت مجدد الف ثانی کا ترک رفع سبابہ، امر اجتہادی ہے، اور وہ سنت جو منسوخ نہ ہوئی ہو، مجتہد کے اجتہاد سے بہر حال مقدم ہے۔ سنت نبوی ﷺ سے رفع سبابہ کا ثبوت مل جانے کے بعد محض اس وجہ سے ترک رفع کرنا کہ حضرت مجدد نے بھی ترک کر دیا تھا، معقول بات نہیں ہے۔ خود حضرت مجدد بھی تو سنت رسول ﷺ کے بارے میں بہت محتاط تھے۔ وہ حنفی مذہب کے حامل تھے، اور امام

❶ یہ سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۳۶ ہے۔ ترجمہ یہ ہے: اور کسی مسلمان مرد یا مسلمان عورت کو یہ لائق نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو پھر ان کو بھی اپنے کام میں کوئی اختیار باقی ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:

اذا ثبت الحدیث فھو ما مذھبی۔

(یعنی جب حدیث ثابت ہو جائے تو وہ میرا مذہب ہے۔)

نیز ارشاد ہے:

واترکوا قولی بقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(اور رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مقابلے میں میرا قول ترک کر دو۔)

اس لیے امید ہے کہ حضرت مجدد اس امر اجتہادی کو ترک کرنے اور صحیح احادیث کو قبول کرنے سے ناراض نہ ہوں گے ____ اور اگر لوگ یہ کہتے ہیں کہ کیا حضرت مجدد کو اپنے وسیع علم کے باوصف یہ معلوم نہیں تھا کہ احادیث سے رفع سبابہ کا ثبوت ملتا ہے، تو اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ ان کے زمانے تک ہندوستان میں ان کتابوں اور رسالوں نے شہرت نہیں پائی تھی، لہٰذا وہ ان کی نظر سے نہیں گزرے اور انھوں نے ترک سبابہ پر عمل کیا۔ اگر مل جاتے اور ان کے مطالعہ میں آجاتے تو ہرگز ترک رفع سبابہ نہ کرتے، کیونکہ وہ اس امت کے اکابر میں سے اتباع سنت کے سب سے زیادہ متمنی تھے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ کشف کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کی رضامندی نہ پا کر انھوں نے ترکِ رفع سبابہ کر دیا، تو ہم کہتے ہیں کہ کشف کو طریقت کے سلسلے میں تو قابل اعتبار مانا جا سکتا ہے، احکام شریعت میں کشف ہرگز حجت نہیں ہے۔ علاوہ ازیں حضرت مجدد نے اپنے اس مکتوب میں مسئلۂ زیر بحث کے بارے میں کشف کا کوئی دعویٰ بھی تو نہیں کیا۔ بہر حال یہ جزوی مخالفت سنت، حضرت مجدد کے قاعدۂ کلی یعنی ترغیب اتباع سنت کے ذیل میں آتی ہے اور بار آور ہوگی۔ والسلام [1]۔

انتقالِ مذہب اور تقلید کے سلسلے میں:

اسی طرح ایک اہل علم نے ایک مکتوب کے ذریعے انتقال مذہب یعنی ایک فقہی مسلک سے دوسرے فقہی مسلک میں منتقل ہو جانے کے بارے میں مرزا صاحب موصوف سے ایک استفسار کیا تو انھوں نے تفصیل سے اس کی وضاحت فرمائی اور جواب میں جو خط تحریر فرمایا، اس میں مولانا محمد حیات سندھی مدنی محدث کے اس رسالے کا فارسی میں خلاصہ تحریر کیا ہے، جو حضرت محدث ممدوح نے عربی میں لکھا ہے، نیز امام سیوطی کی تصنیف ''جزیل المواہب فی انتقال المذاہب'' کا حوالہ نقل کیا ہے۔ اس سے مختلف مذاہب فقہی سے متعلق مرزا صاحب کی صحت فکر کا پتا چلتا ہے اور واضح ہوتا ہے کہ مسائل کو سمجھنے اور ان پر عمل کی بنیادیں استوار کرنے کا ان کے

[1] کلمات طیبات ص ۲۷، ۲۸، مکتوب ۱۵۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نزدیک اصل پیمانہ کتاب وسنت ہے۔ ان کا زاویۂ نظر یہ ہے کہ جو فقہی مسلک، کتاب وسنت سے ہم آہنگ ہو، اسی کو قبول اور اختیار کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں مرزا صاحب کے فارسی خط کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے۔

''آپ نے حدیث کے مطابق عمل کرنے کی غرض سے ایک مسلک سے دوسرے مسلک میں منتقل ہونے کے بارے میں دریافت کیا ہے۔ مخدوما! حدیث کے مطابق عمل کرنے کے سلسلے میں شیخ محمد حیات مدنی نے ایک رسالہ لکھا ہے، جس کی تلخیص فارسی میں تحریر کی جاتی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ (آل عمران:۳۱)

(اے پیغمبر! لوگوں سے کہہ دیجیے کہ) اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔)

رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

لا یؤمن احدکم حتیٰ یکون هواه تبعالما جئت به[1]۔

(یعنی رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: تم میں کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا، جب تک اس کی خواہش ان امور کی تابع نہ ہو جنھیں میں لایا ہوں۔)

یہ صحیح حدیث ہے۔ ابوالقاسم بن اسماعیل بن فضل اصفہانی نے ''کتاب الحجۃ'' میں اسے روایت کیا ہے۔

''روضۃ العلما'' میں بھی مذکور ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے:

اترکوا قولی بخبر الرسول صلی الله علیه وسلم وقول اصحابه رضی اللہ عنہم۔

(کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث اور آپ کے صحابہ کرام کے قول کے مقابلے میں میرا قول ترک کردو۔)

امام ابوحنیفہ کا مشہور قول ہے:

اذا صح الحدیث فهو مذهبی۔

(حدیث رسول اکرم ﷺ ہی میرا مذہب ہے۔)

اگر اطلاع کے باوجود کوئی شخص حدیث صحیح پر عمل نہ کرے تو اس نے امام صاحب کے اس قول کی کہ ''رسول اللہ ﷺ کے مقابلے میں میرا قول ترک کردو'' مخالفت کی۔ اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ کسی بھی عالم نے تمام احادیث کا احاطہ نہیں کیا ہے۔ چنانچہ امام صاحب کا یہ قول کہ آنحضرت ﷺ کے فرمان کے مقابلے میں میرا قول ترک کردو، اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو تمام احادیث نہیں پہنچی تھیں، ان میں سے بعض رہ گئیں، اور کیوں نہ رہتیں، جب کہ اہل امت میں خلفائے راشدین جیسے بلند مرتبت حضرات سے بھی جو ہر وقت آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں رہتے تھے، بعض حدیثیں فوت ہوگئیں۔

[1] مشکوۃ، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، فصل ثانی۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہر وہ شخص جسے فن حدیث میں معارضت ہے، خوب جانتا ہے کہ امت کے افراد پر فقط اتباعِ پیغمبر واجب ہے، ائمہ میں سے کسی کا اتباع واجب نہیں۔ اس لیے ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ کسی بھی مجتہد کا فقہی مسلک اختیار کر لے۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ صحیح حدیث پر عمل کرنے سے انسان امام ابوحنیفہ کے مذہب سے نکل جاتا ہے تو اس کے پاس اپنے دعوے کے لیے جو دلیل ہے، اسے پیش کرے۔ البتہ ان مشہور مذاہب فقہیہ میں سے ایک مذہب سے دوسرے مذہب میں منتقل ہونے کے مسئلے کا بیان تفصیل چاہتا ہے۔

امام سیوطی نے ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام ''جزیل المواہب فی انتقال المذاہب'' ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مذہب سے دوسرے مذہب میں منتقل ہو جانا جائز ہے۔ امام رافعی نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ امام نووی بھی یہی کہتے ہیں۔ صاحب ''روضہ'' لکھتے ہیں کہ مذاہب فقہ کی تدوین کے بعد کیا یہ جائز ہے کہ مقلد ایک مذہب سے دوسرے مذہب میں چلا جائے۔؟ ہم کہتے ہیں کہ مقلد پر یہ لازم ہے کہ دونوں مذاہب کے مجتہدین کے مطابق طلبِ علم کرے، اور جب اسے یہ یقین ہو جائے کہ دوسرا مجتہد زیادہ عالم ہے تو انتقال مذہب جائز ہے، بلکہ لازم ہے۔ نیز اگر ہم اسے انتقال مذہب کا اختیار دے دیں تو بھی جائز ہے۔

مقلد کی بھی مختلف حالتیں ہوتی ہیں۔ یہ چار چیزوں سے خالی نہیں۔ مقلد، جاہل ہے یا عالم۔ پھر ان دونوں (یعنی مقلد جاہل یا مقلد عالم) کے انتقال مذہب کی وجہ دینی ہے یا دنیوی۔

اگر جاہل ہے، فقہ سے واقف نہیں اور اپنے مذہب کے بارے میں سوائے نام کے کچھ نہیں جانتا، صرف مال وجاہ حاصل کرنے کے لیے مذہب بدلتا ہے تو اس کی یہ حرکت صحیح نہیں ہے۔

اگر عالم اور فقیہ ہے اور صرف دنیوی غرض کے لیے مذہب بدلتا ہے تو یہ بات سخت ناپسندیدہ ہے، کیونکہ وہ فقط دنیوی مقاصد کے لیے مذہب سے کھیلتا ہے اور یہ بالکل ناجائز ہے۔

اگر فقیہ ہے اور مذہب بدلنے کی وجہ دینی اسباب ہیں، دوسرا مذہب اس کی نظر میں قوی دلائل کے ساتھ ترجیح کا حامل ہے تو ایسے شخص کے لیے انتقال مذہب واجب ہے، ایک روایت کے مطابق جائز ہے۔

اگر فقہ سے واقف نہیں ہے، کسی اور شخص نے اسے اپنے مذہب میں داخل کیا ہے، خود جاہل رہا ہے۔ دوسرے مذہب میں فقہ کی اہمیت سے واقفیت اور تفقہ حاصل کرنے کی امید رکھتا ہے تو ایسے شخص کے لیے بھی انتقال مذہب واجب ہے، کیوں کہ مذہب میں تفقہ، جہل سے بہتر ہے۔ کسی ایک مذہب میں درجہ فقاہت حاصل کرنا، تمام مذاہب کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جہل سے بہر حال اولیٰ ہے۔ غالباً جاہل کی عبادت بھی صحیح نہیں ہوتی۔

اگر انتقال مذہب کا کوئی دینی یا دنیوی مقصد نہیں ہے بلکہ محض عمل ہی اس کی وجہ ہے تو عام آدمی کے لیے جائز ہے، لیکن فقیہ کے لیے ممنوع ہے۔ کیوں کہ اس نے طویل مدت میں اس مذہب کی فقہ حاصل کی ہے۔ اب اگر دوسرے مذہب میں جائے گا تو اس کی فقہ حاصل کرنے کے لیے پھر ایک عمر چاہیے، اس پر عمل جو اصل مقصد ہے نہ ہو سکے گا۔ لہٰذا اس کے لیے مذہب تبدیل نہ کرنا بہتر ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی غیر حنفی، حنفی مذہب اختیار کر لے تو جائز ہے اور حنفی مذہب کا حامل دوسرے مذہب میں چلا جائے تو ناجائز ہے، یہ محض ان کا تعصب ہے۔ اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سب امام برابر ہیں۔ اگر حنفی مذہب یا کسی اور مذہب کی تقدیم کے بارے میں کوئی آیت یا حدیث وارد ہوتی تو اس مذہب کی تقلید امت کے ہر فرد پر واجب ہوتی، دوسرے مذہب کی تقلید ناجائز قرار پاتی۔ یہ نقطۂ نظر اجماع کے خلاف ہے۔

صاحب جامع الفتاویٰ حنفی مذہب کے ماننے والے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی مرد اور کسی عورت کا شافعی مذہب سے حنفی مذہب اختیار کر لینا یا حنفی مذہب سے شافعی مذہب میں منتقل ہو جانا جائز ہے۔ بزرگان دین میں سے بہت سے حضرات نے انتقال مذہب کیا ہے۔ اگر نا جائز ہوتا تو وہ ایسا نہ کرتے۔ جو کوئی اس کے خلاف کہتا ہے، اس کا قول بے دلیل اور غیر معقول ہے [1]۔

دورِ پیری کا ایک خط:

مرزا جانِ جاناں کے خطوط بڑے متوازن ہیں۔ لوگوں نے ان سے مختلف علمی سوالات کیے اور تصوف و طریقت کے پیچیدہ اور متنازعہ مسائل دریافت کیے، لیکن انھوں نے توازن اور اعتدال کی حدود میں رہ کر ان کے جواب دیے۔ ایک خط انھوں نے ایک بزرگ سید موسیٰ خاں دھبیدی کو لکھا۔ یہ مرزا صاحب کے دور پیری کا خط ہے۔ اس وقت حضرت مرحوم کی عمر اسی (۸۰) سال کے قریب ہو چکی تھی۔ یہ خط کسی علمی یا فقہی سوال کے جواب میں نہیں ہے، لیکن اس سے پتا چلتا ہے کہ اس عمر میں بھی وہ ذکر و فکر میں مشغول رہتے تھے اور ان کا باقاعدہ حلقہ تصوف قائم تھا۔ اس میں دنیا کی بے ثباتی اور ایام گزشتہ کا ذکر کرتے ہیں۔ فارسی خط کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے:

الحمدلله علی نواله والصلوٰة والسلام علی رسوله و صحبه و اله۔

بعد حمد و صلوٰۃ۔ فقیر جانِ جاناں کی طرف سے حضرت سید موسیٰ صاحب ملاحظہ فرمائیں۔ فقیر اس وقت اوائل ماہ صفر ۱۱۸۸ھ میں پانی پت کے اندر عافیت سے ہے۔ محلّہ دہلی کے لوگ بھی بخیر ہیں۔ میری عمر اب اسی (۸۰)

[1] کلمات طیبات، ص ۲۸ تا ۳۰، مکتوب ۱۶۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سال کے قریب پہنچ گئی ہے۔ بڑھاپے کا ضعف غالب ہے۔ روزانہ چار وقت حلقہ ہوتا ہے۔ صبح، دوپہر، شام اور رات کو۔لوگ حاضر ہوتے ہیں۔ علما و سادات کے گروہ کے گروہ اجازت حاصل کر کے (اپنے اپنے) شہروں کو جانے کی رخصت پاتے ہیں۔ اب میرے ہم عمروں میں کم لوگ باقی رہے ہیں۔ اس وقت ہندوستان کی حالت ابتر ہے۔ ہر طرف فتنہ برپا ہے۔ ارادۂ حج تھا، ناتوانی اور بے سامانی نے اجازت ہی نہ دی۔ اب سفر دراز آخرت درپیش ہے۔ حق تعالیٰ بزرگوں کی دعا سے آسانی کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچا دے۔ آپ کے جدا ہونے کے بعد سے آج تک آپ کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ بعد انتظارِ بسیار حاجی عبدالقادر نے جو آپ کے مخلصوں میں سے ہیں، آپ کی سلامتی کا پیغام پہنچایا، جس سے اس مردۂ صد سالہ کے جسم میں جانِ تازہ آ گئی اور ایام گزشتہ کی صحبتیں یاد آنے لگیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر اور ارشاد و تلقین میں برکت عطا فرمائے۔

آپ نے اس علاقے کو منور کر دیا ہے۔ آپ سے اظہار اشتیاق ملاقات کروں تو بے کار ہے۔ اسباب ظاہری کے پیش نظر آپ سے ملاقات کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ بشرط حسن خاتمہ، بہشت جاوداں میں خاطر خواہ ملاقات میسر آئے گی۔

چوں کہ بُعدِ مسافت کے باعث بہت کم ہندوستانی آپ کے علاقے میں آتے جاتے ہیں، اس لیے ارسال خط و کتابت سے بھی قاصر ہوں اور آپ بھی معذور ہیں۔ الحمدللہ دعا سے غافل نہیں ہوں۔ آپ بھی خاتمہ بالخیر کی دعا سے مجھ کو فراموش نہ فرمائیں۔

ہمارے ہم پیروں (پیر بھائیوں) میں سے اس ہندوستان میں سوائے مرزا مظفر کے جو کہ ارشاد و تلقین میں مشغول ہیں، اب کوئی زندہ نہیں رہا۔ بلکہ خاندان عالی شان میں بھی ایسے صاحب زادگان جو اصحاب ارشاد و تاثیر ہوں، نہیں رہے۔ والسلام۔

(دیگر یہ کہ) اقامت دہلی کو ترک کرنے کا سبب یہ ہے کہ طالبان خدا، شہر میں کم اور قصبات میں زیادہ ہیں۔ تنعم و تجمل کے اسباب جو سرمایہ غفلت ہوا کرتے ہیں، شہر میں زیادہ اور دیہات و قصبات میں کم ہیں۔ والسلام [1]۔

ہندو مذہب کے بارے میں:

مرزا مظہر جانِ جاناں سے ایک شخص نے ہندو مذہب، ہندوؤں کے معتقدات اور ہندوؤں کی کتابوں کے بارے میں استفسار کیا تو انھوں نے ایک مکتوب میں اس کی بھی وضاحت کی۔ خط طویل ہے، لیکن بعض علمی جزئیات کو محیط ہے لہٰذا پورے خط کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔ اس سے مرزا صاحب کی وسعت معلومات کا پتا چلتا ہے۔

[1] مرزا مظہر جانِ جاناں کے خطوط، ص ۲۱۹، ۲۲۰۔ بحوالہ ''الفرقان'' لکھنؤ۔ بابت جمادی الاخری ۱۳۸۱ھ/ نومبر ۱۹۶۱ء

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

”تم نے دریافت کیا ہے کہ آیا مشرکین عرب کی طرح کفار ہند کا دین بے اصل ہے یا اس کی کوئی حقیقت تھی، جو بعد میں منسوخ ہوگئی؟ اور یہ کہ ان کے پیش رووں کے متعلق کیا عقیدہ رکھنا چاہیے؟

”اختصار کے ساتھ اس کا تحقیق اور انصاف کی روشنی میں جواب تحریر کیا جاتا ہے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ اہل ہند کی قدیم کتابوں سے جو کچھ پتا چلتا ہے، وہ یہ ہے کہ بنی نوع انسان کی پیدائش کے آغاز میں رحمت الٰہی نے ان کی دنیوی اور اخروی اصلاح کے لیے ”وید“ نام کی ایک کتاب، ایک فرشتے کے ذریعے جو ”برہما“ ❶ کے نام سے موسوم ہے اور جو ان کے عقیدے کے مطابق دنیا کی ایجاد کا ذریعہ اور آلہ ہے، بھیجی تھی۔ یہ کتاب چار دفاتر کو محیط ہے اور امر و نہی کے احکام اور ماضی و مستقبل کی خبروں پر مشتمل ہے۔ ان کے علما نے اس کتاب سے چھ مذاہب استخراج کیے ہیں، اور اپنے اصولِ عقائد کی بنیاد اسی کو قرار دیا ہے۔ اس فن کو وہ ”دھرم شاستر“ کے نام سے پکارتے ہیں۔ یعنی فن ایمانیات، ہماری اصطلاح میں اسے ”علم کلام“ کہا جاتا ہے۔

”نوع انسان کو انھوں نے چار فرقوں میں منقسم کیا ہے اور اس کتاب سے چار مسلک اخذ کیے ہیں۔ ہر فرقے کا ایک مسلک ٹھہرایا ہے اور فروع اعمال کی اساس اسی پر رکھی ہے۔ اس فن کا نام ان کی بولی میں ”کرم شاستر“ ہے، یعنی فن عملیات، جسے ہم اپنی اصطلاح میں ”علم فقہ“ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ لوگ چوں کہ فسخ احکام کے قائل نہیں ہیں، اور ہر دور اور ہر زمانے کے اہل دانش کے طبائع کے مطابق تبدیلی ضروری ہے، لہٰذا انھوں نے دنیا کی طویل عمر کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر حصے کا نام ”جگ“ رکھا ہے۔ پھر ہر ”جگ“ کے لیے کتاب (وید) کے چاروں دفاتر سے طریق عمل اخذ کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے متاخرین نے اس میں جو تصرفات یا تغیرات کیے ہیں، وہ قابل اعتنا نہیں ہیں۔

”ان کے تمام فرقے اللہ کی توحید پر ایمان رکھتے ہیں اور دنیا کو حادث و مخلوق مانتے ہیں۔ فنائے عالم، حشر جسمانی اور نیک و بد اعمال کی جزا کا انھیں یقین ہے۔ ان لوگوں کے عقلی و نقلی علوم، ریاضات،

---

❶ اس لفظ کے حاشیے میں ڈاکٹر شیخ محمد اکرام ”رودِ کوثر“ (ص ۶۴۶، ۶۴۷) میں لکھتے ہیں کہ ”علامہ اقبال کا بھی کسی زمانے میں یہی خیال تھا۔ جب ”مخزن“ میں انھوں نے ہندووں کے مقدس بھجن گاتیری کا (۱۹۰۲ء) میں ترجمہ شائع کرایا تو اس میں ایک شعر یہ تھا:

ہر چیز کی حیات کا ہے پروردگار تو زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو

”زائیدگانِ نور“ کی ترکیب کے متعلق اقبال نے یہ نوٹ دیا تھا۔ ”زائیدگانِ نور“ یعنی دیوتے۔ سنسکرت میں لفظ دیوتا کے معنی زائیدۂ نور کے ہیں۔ یعنی ایسی ہستی جس کی پیدائش نور سے ہوئی ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندو، دیوتاؤں کو دیگر مخلوقات کی طرح، مخلوق تصور کرتے تھے، ازلی نہیں سمجھتے تھے۔ غالباً ان کا مفہوم وہی ہوگا، جس کو ہم لفظ فرشتہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیوں کہ فرشتوں کا وجود بھی نوری تسلیم کیا گیا ہے، اگرچہ ان کو مخلوق مانا گیا ہے۔ پس ہندو مذہب کو شرک کا موجب گردانا میرے نزدیک صحیح نہیں معلوم ہوتا۔“ (اقبال)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مجاہدات، تحقیق معارف اور مکاشفات میں بڑی دست رس حاصل ہے۔ ان کے کتاب خانے آج تک موجود ہیں۔ ان لوگوں میں بت پرستی کی جو رسم جاری ہے، اس کی تہہ میں شرک فی الالوہیت کا جذبہ کارفرما نہیں ہے، بلکہ اس کی حقیقت دوسری ہے۔

''ان کے عالموں اور دانش مندوں نے انسانی زندگی کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے، جس کی ترتیب یہ ہے۔ حصہ اول میں علوم و آداب کی تحصیل۔ حصہ دوم میں حصول معاش اور حصول اولاد۔ حصہ سوم تصحیح اعمال اور اصلاح نفس۔ حصہ چہارم میں ترک و تجرید کی مشق و ریاضت، جو انسان کی منتہائے کمال ہے، اور نجات کبریٰ جسے وہ ''مہا مکت'' کہتے ہیں، اسی حصۂ چہارم میں منحصر ہے۔

''ان کے دین میں مکمل نظم و نسق ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتب دین تھا، لیکن اب منسوخ ہو گیا ہے۔ شریعت اسلامی میں منسوخ شدہ مذاہب میں سوائے یہود اور نصاریٰ کے دین کے اور کسی دین کا ذکر نہیں، حالاں کہ ان کے علاوہ بھی بہت سے مذاہب منسوخ ہوئے اور بہت سے پیدا ہوئے اور ختم بھی ہوئے۔

''معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن کی آیات کریمہ: ﴿وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ﴾ ❶ (کہ کوئی امت ایسی نہیں، جس میں ڈرانے والا نہ بھیجا گیا ہو) اور ﴿وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ﴾ ❷ (اور ہر امت میں رسول آیا) کے مطابق ممالک ہند میں بھی نبی اور رسول بھیجے گئے ہیں، اور ان کے احوال ان کی کتابوں میں مرقوم بھی ہیں، نیز جو ان کے آثار باقی ہیں، ان سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کمال و تکمیل کے مرتبے تک پہنچ گئے تھے اور رحمت عام نے اس وسیع مملکت کے انسانی معاملات کو فراموش نہیں کیا تھا۔

''منقول ہے کہ خاتم الرسل ﷺ کی بعثت سے پہلے ہر قوم میں پیغمبر بھیجے گئے تھے اور پوری قوم پر اپنے پیغمبر کی اطاعت اور فرماں برداری واجب تھی، نہ کہ دوسری قوم کے پیغمبر کی۔ ہمارے پیغمبر ﷺ کے ظہور کے بعد (جو پوری دنیا کے لیے مبعوث فرمائے گئے ہیں اور خاتم الانبیاء ہیں اور جن کا دین مشرق و مغرب کے تمام ادیان کو منسوخ کر دینے والا ہے) جب تک دنیا باقی ہے، کسی کو ان کی اطاعت و فرماں برداری کے دائرے سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے آج تک کہ اس پر ایک ہزار ایک سو اسی سال گزر چکے، جو کوئی ان کی اطاعت میں نہ آیا، کافر ہے۔ لیکن آپ کی آمد سے پہلے لوگوں پر اس حکم کا اطلاق نہیں ہوتا۔ چوں کہ اسلام اس آیت کریمہ ﴿مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ﴾❸

❶ سورۂ فاطر: ۲۴۔

❷ سورۂ یونس: ۴۷۔

❸ یہ سورۂ مومن کی آیت نمبر ۷۸ کا ایک ٹکڑا ہے۔ آیت کے چند الفاظ یہ ہیں: ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ﴾ ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے: (اے پیغمبر) ہم آپ سے پہلے بہت پیغمبر بھیج چکے ہیں۔ ان میں سے بعض کا حال ہم نے آپ کو بتا دیا اور بعض کا نہیں بتایا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے مطابق بہت سے انبیا کے احوال سے متعلق خاموش ہے، لہٰذا ان کے بارے میں خاموش رہنا ہی اولیٰ ہے۔ نہ تو ہمیں ان کی پیروی کرنے والوں کے کفر و ہلاک کا یقین کرنا ضروری ہے اور نہ ان کی نجات پر ہی یقین کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں حسن ظن سے کام لینا ضروری ہے۔ بشرطیکہ طبیعتوں میں تعصب کا عمل دخل نہ ہو۔ اہل فارس کے بارے میں بھی بلکہ ہر ملک کے باشندوں کے بارے میں جو رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے گزرے ہیں، اور شریعت کی زبان جن کے متعلق خاموش ہے، یہی عقیدہ رکھنا بہتر ہے، اور بغیر کسی قطعی دلیل کے کسی کو کافر کہنا آسان نہیں سمجھنا چاہیے۔

''ان لوگوں کی بت پرستی کی حقیقت یہ ہے کہ بعض فرشتے جو اللہ کے حکم سے اس عالم کون و فساد میں تصرف رکھتے ہیں، یا بعض کاملین کی ارواح جن کا اجسام سے ترک تعلق کے بعد بھی اس کائنات میں تصرف باقی ہے، یا بعض ایسے زندہ افراد جو ان لوگوں کے عقیدے کے مطابق حضرت خضر کی طرح حیات جاوید رکھتے ہیں، یہ لوگ ان کے بت تراش کر ان کو مرکز توجہ ٹھہراتے ہیں، اور اس توجہ کی وجہ سے کچھ مدت بعد یہ صاحب صورت سے ربط پیدا کر لیتے ہیں، اور پھر اس ربط کی بنا پر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا اور آخرت کے تعلق کے سبب سے ان کی احتیاجیں پوری کرتے ہیں۔ ان کا یہ عمل اس ذکر رابطہ سے مشابہت و مماثلت رکھتا ہے، جو بعض مسلمان صوفیا کے ہاں مروج ہے کہ وہ اپنے پیر کی صورت کا تصور کرتے ہیں اور اس سے فیض اٹھاتے ہیں۔ (یعنی تصور شیخ) فرق صرف یہ ہے کہ مسلمان صوفیا، پیر کا بت نہیں تراشتے۔ لیکن یہ بات کفار عرب کے عقیدے سے مطابقت نہیں رکھتی، کیونکہ وہ بتوں کو اپنی ذات سے مؤثر اور متصرف جانتے تھے، اللہ تعالیٰ کے تصرف کا آلہ نہیں سمجھتے تھے۔ وہ لوگ ان بتوں کو زمین کا خدا قرار دیتے تھے اور خدا کو آسمان کا۔ یہ شرک فی الالوہیت ہے۔

''لیکن ان (کفار ہند) کا سجدہ ریز ہونا، سجدہ تہنیت ہے، سجدۂ عبودیت نہیں۔ یہ وہی سجدہ ہے جو ان لوگوں کے مذہب کے مطابق وہ ماں، باپ، پروہت اور استاد وغیرہ کو بھی سلام کی جگہ کرتے ہیں، اور اسے یہ ''ڈنڈوت'' کہتے ہیں۔ باقی رہا تناسخ، تو جاننا چاہیے کہ عقیدۂ تناسخ سے کفر لازم نہیں آتا۔ والسلام[1]۔''

اس خط سے کئی چیزوں کا پتا چلتا ہے۔ ایک یہ کہ مرزا جانِ جاناں، ہندو مذہب کے طریق عبادت سے بھی آگاہ تھے، اور ان کی مذہبی کتابوں کے مندرجات سے واقفیت رکھتے تھے۔ دوسرے کسی کو کافر قرار دینے کے بارے میں بہت محتاط تھے۔ تیسرے یہ کہ وہ وسیع القلب اور فراخ حوصلہ عالم دین تھے۔

بلندیٔ اخلاق اور بلندیٔ کردار کی تلقین:

مرزا صاحب نہایت بلند اخلاق اور بلند کردار عالم دین تھے، اور لوگوں کو بھی یہی تعلیم دیتے تھے۔ بالخصوص علما اور اپنے مریدین کو بار بار حلم اور بردباری کی تلقین کرتے۔ ایک خط میں ایک شخص شاہ محمد سالم کو لکھتے ہیں:

[1] کلمات طیبات، ص ۲۵ تا ۲۷۔ مکتوب ۶۷۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

——— "اپنی بد خلقی سے پیروں کو بدنام نہیں کرنا چاہیے۔ اگر کوئی تمھارے طریقے کی طرف رجوع کرے تو اس سے خدمت لینے کی بجائے، خود اس کی خدمت کرو۔ البتہ اگر وہ غلبۂ محبت کی وجہ سے خود ہی تمھاری خدمت کرے تو دوسری بات ہے[1]۔"

ایک خط میں ایک خاتون عقیدت مند کو اپنے سے بڑے کے لیے ادب اور چھوٹوں پر رحم و شفقت کی ان الفاظ میں تاکید فرماتے ہیں:

"اگر بزرگوں کے ساتھ ادب اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے زندگی گزارو تو کوئی تم سے برائی نہیں کرے گا۔ شوہر کی خدمت اور اطاعت کی پوری کوشش کرنی چاہیے، غصہ و غضب پی جانا چاہیے۔"

مرزا صاحب کی گھریلو زندگی بڑی تلخ تھی۔ ان کی بیوی انتہائی تند مزاج تھیں، پھر ان کو جنون کا عارضہ بھی لاحق ہو گیا تھا۔ وہ عمر بھر ان کے لیے دردِ سر بنی رہیں۔ شاہ غلام علی لکھتے ہیں:

حضرت ایشاں می فرمودند کہ ایشاں را عارضہ سودا لاحق گشت و غلبہ جنون عقل را مستور ساخت[2]۔

(حضرت مرزا صاحب فرمایا کرتے ہیں کہ ان کی اہلیہ کو سودا کی بیماری لاحق ہو گئی ہے اور غلبۂ جنون عقل پر چھا گیا ہے۔)

لیکن نہ کبھی بیوی پر سختی کی اور نہ کبھی دل میں علیحدگی اختیار کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ ہمیشہ اس کی خدمت اور خاطر داری کو شعار بنائے رکھا۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی جوان کے زمانے میں دیارِ ہند کے بہت بڑے عالم و فقیہ تھے، مرزا صاحب کے خاص مریدین میں سے تھے۔ مرزا صاحب کے ان سے انتہائی مخلصانہ مراسم تھے۔ ان کی بیمار بیوی قاضی صاحب مرحوم کے پاس پانی پت گئیں تو مرزا صاحب نے بیوی کے بارے میں ان کو خط لکھا کہ:

"ان کی درخواست پر پانی پت بھیجنے کا فیصلہ ہوا ہے۔ جب وہ پانی پت پہنچیں تو تمھارا فرض ہے کہ ان کی دل جوئی اور خاطر داری میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھو۔ وعظ و نصیحت میں ان پر سختی نہ کرنا، ان سے بہت ہی نرمی کا برتاؤ کرنا، اگر اس فقیر کی پس پشت برائی کریں تو ہرگز ان کا مقابلہ نہ کرنا، ان سے ہرگز بددل نہ ہونا، کیونکہ ہماری اور تمھاری خیریت اسی میں ہے۔"

مرزا صاحب کی بیوی کی حالت کبھی بہتر ہو جاتی تو نہایت مسرت کا اظہار کرتے اور خوش ہوتے کہ اب انھیں افاقہ ہے۔ اس کا اظہار انھوں نے متعدد خطوط میں کیا ہے۔

مرزا صاحب کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود تو اولاد سے محروم تھے، لیکن ان کی بیوی کا ایک عزیز تھا جس کا نام ہیر علی تھا، یہ بھی جنون اور سودا کا مریض تھا۔ اس کے اسلوبِ زندگی سے بھی مرزا صاحب بہت تنگ تھے، لیکن بے بس تھے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

---

[1] مرزا مظہر جانِ جاناں کے خطوط، ص ۱۳۶۔

[2] مقاماتِ مظہری، فصل شانزدہم، ص ۶۳۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سیاسی حالات:

سیاسی اعتبار سے مرزا صاحب کے زمانے کے حالات نہایت ابتر تھے۔ مغلیہ سلطنت زوال کا شکار ہو چکی تھی اور اس کی شان و شوکت ختم ہو رہی تھی۔ ملک کے مختلف علاقوں میں سکھ اور مرہٹے بالخصوص مسلمانوں پر بے پناہ ظلم ڈھا رہے تھے۔ لوگ اس صورت حال سے انتہائی پریشان تھے۔ خود مرزا صاحب اپنے بعض مکتوبات میں اس کا بڑے دکھ اور تکلیف کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ وہ ملک کے سیاسی نشیب و فراز سے پوری طرح باخبر تھے، دہلی اور ملک کے دوسرے شہروں میں جو کچھ اکھاڑ پچھاڑ ہو رہی تھی، اس سے وہ بدرجہ غایت نالاں تھے۔ خود مسلمان امرا و وزرا بھی ظلم و ستم ڈھانے میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ شاہ عالم ثانی کا وزیر نجف عالم بڑا ظالم شخص تھا۔ مرزا صاحب ایک خط میں اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

”جس دن سے نجف خاں آیا ہے، اس شہر (دہلی) میں فقیر سے لے کر بادشاہ تک ہر شخص کی حالت خراب ہے۔“

مرزا صاحب بڑی دور رس نگاہ رکھتے تھے۔ اس زمانے کے سیاسی اتار چڑھاؤ کی کوئی بات ان سے مخفی نہ تھی۔ غلام عسکری خاں کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

”شہر کے حالات سے لے کر محل کی خبروں تک فقیر سے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔ تمام حقائق فقیر تک پہنچ جاتے ہیں۔“

شعر و شاعری:

مرزا صاحب بہت سے اوصاف کے مالک تھے۔ وہ شاعر بھی تھے، جیسا کہ پہلے بتایا گیا، ان کے اشعار کا مجموعہ خود ان کی زندگی میں تیار ہو چکا تھا، جس پر انھوں نے مقدمہ بھی لکھا۔ یہ شعر انہی کے ہیں:

هوسِ عشق مکن اے دل بے صبر و قرار — عاشقی فن شریف است مگر کار تو نیست

ساقی بدہ آں مے کہ زمستی نشناسیم — پیمانہ کدام و لب جانا نہ کدام است

یہ اشعار بھی مرزا صاحب کے ہیں، جو وہ آخری دنوں میں شدت تکلیف اور عالم اضطراب میں پڑھتے تھے:

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن — خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

سیل خوں از سینۂ گرمم رواں کردست عشق — نازم اعجازش کہ طوفاں از تنور آوردہ است

زخم دلِ مظہر مبادابہ شود آگاہ باش — کایں جراحت یادگارِ ناوکِ مژگانِ اوست

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اردو کلام:

مرزا مظہر ممدوح نے اردو میں بھی شعر کہے ہیں۔ انھیں اردو زبان کا محسن کہنا چاہیے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا — لیکن اس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا
لوگ کہتے ہیں موا مظہرِ بے کس افسوس ہے — کیا ہوا اس کو کہ اتنا بھی وہ بیمار نہ تھا
چلے اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا — نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا
یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے — اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا
الم سے یاں تلک روئیں کہ آخر ہو گئیں رسوا — ڈوبویا ہائے آنکھوں نے مژہ کا خانداں اپنا
جو تو نے کی سو دشمن بھی نہیں دشمن سے کرتا ہے — غلط تھا جانتے تھے تجھ کو جو ہم مہرباں اپنا
کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو اے ظالم — کہ دولت خواہ اپنا، مظہر اپنا، جانِ جاناں اپنا

نہیں کچھ غم کہ کیوں جلتا نہیں پیاں گسل میرا — کہ میں روتا ہوں دل کی بے کسی پر ہائے دل میرا

جواں مارا گیا خوباں کے اوپر میرزا مظہر — بھلا تھا یا برا تھا زور کچھ تھا خوب کام آیا
زخمی تری نگہ کا اک پل جیا تو پھر کیا — صیاد کی بغل میں ٹک دم لیا تو پھر کیا

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار — ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار
لالہ و گل نے ہماری خاک پر ڈالا ہے شور — کیا قیامت ہے موؤں کو بھی ستاتی ہے بہار
ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن میں لیکن — جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار

اتنی فرصت دے کہ ہولیں رخصت اے صیاد ہم — مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آزاد ہم

گر گل کو گل کہوں تو ترے رُو کو کیا کہوں — بولوں نگہ کو تیغ تو ابرو کو کیا کہوں

توفیق دے کہ شور سے اک دم وہ چپ رہے — آخر یہ میرا دل ہے، الٰہی جرس نہیں

لوگ کہتے ہیں مر گیا مظہر — فی الحقیقت میں گھر گیا مظہر

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آج مت رنگِ حنا سے کفِ پا لال کرو
اے بتاں اس دلِ پُرخون کو پامال کرو

یہ بلبلوں کا صبا مشہدِ مقدس ہے
قدم سنبھال کے رکھیو ترا یہ باغ نہیں

کسی کے خون کا پیاسا کسی کی جان کا دشمن
نہایت منہ سے لگایا ہے سجن نے بیڑہ پان کو

آتش کہو، شرارہ کہو، کوئلا کہو
مت اس ستارہ سوختہ کو دل کہا کرو

اس گل کو بھیجنا ہے مجھے خط صبا کے ہاتھ
اس واسطے لگا ہوں چمن کی ہوا کے ہاتھ
آزاد ہو رہا ہوں دو عالم کی قید سے
مینا لگا ہے جب سے مجھ بے نوا کے ہاتھ
مرتا ہوں میرزایئے گل دیکھ ہر سحر
سورج کے ہات چنوری تو پنکھا صبا کے ہاتھ
مظہر چھپا کے رکھ دلِ نازک کو اپنے تو
یہ شیشہ بیچنا ہے کسی میرزا کے ہاتھ

تجلی گر تری پست و بلند ان کو نہ دکھلاتی
فلک یوں چرخ کیوں کھاتا، زمیں کیوں فرش ہو جاتی
حنا تیرے کفِ پا کو نہ اس شوخی سے سہلاتی
یہ آنکھیں کیوں لہو روتیں انھوں کی نیند کیوں جاتی
الٰہی درد و غم کی سرزمیں کا حال کیا ہوتا
محبت گر ہماری چشمِ تر سے منھ نہ برساتی

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے
کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے
نہ تو ملنے کے قابل رہا ہے
نہ مجکو وہ دماغ و دل رہا ہے
نہیں آتا کسی تکیہ اوپر خواب
یہ سر پانوں کے تیرے ہل رہا ہے
خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی ایک شہر میں قاتل رہا ہے

خدا کو اب تجھے سونپا ارے دل
یہیں تک تھی ہماری زندگانی

وفات:

مرزا مظہر جانِ جاناں کی موت قاتل کی گولی سے واقع ہوئی۔ اس کی تہہ میں سیاسی اور مذہبی دونوں اسباب کارفرما تھے۔ اس ستن کی تشریح یہ ہے کہ مرزا صاحب کے ارباب عقیدت اور اصحاب ارادت کی کثیر تعداد روہیلوں پر مشتمل تھی۔ وہ لوگ مغل حکومت کے لیے بہت بڑا خطرہ بن چکے تھے۔ نجف خاں کے زمانۂ وزارت میں جو شاہ عالم ثانی کے عہد حکومت میں اس منصب پر فائز تھا، روہیلوں کا زور بہت بڑھ گیا تھا اور انھوں نے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دہلی کے مختلف علاقوں میں باقاعدہ سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہ لوگ اس وقت تک عیش وعشرت سے دور تھے اور اپنے دست وبازو میں طاقت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نجف خاں سیاسی طور پر ان سے خوف زدہ رہتا تھا اور اپنے اقتدار کے لیے ان سے شدید خطرہ محسوس کرتا تھا۔ مرزا جانِ جاناں کی خانقاہ روہیلوں کا سب سے بڑا مرکز تھی۔ نجف خاں متعصب شیعہ تھا اور مرزا صاحب کے مسلکی افکار وتصورات اس سے بالکل برعکس تھے۔ لہٰذا اس کے نزدیک سوا اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ مرزا صاحب کو قتل کرادے۔ چنانچہ ۷؍محرم ۱۱۹۵ھ/۳؍جنوری ۱۷۸۱ء کی شب کا کافی حصہ گزر چکا تھا کہ کچھ لوگوں نے مرزا صاحب کے دروازے پر دستک دی۔ ملازم باہر آیا۔ اس نے نوواردوں سے آنے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے مرزا سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا۔ ملازم نے اندر جا کر اطلاع دی۔ مرزا صاحب خواب گاہ سے باہر آئے۔ ان میں سے ایک مغل نوجوان نے آگے بڑھ کر پوچھا: ''مرزا مظہر آپ ہی ہیں؟'' مرزا نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے دو ساتھیوں نے اس کی تصدیق کی۔ مغل نوجوان نے فوراً مرزا پر طمنچہ کی گولی داغ دی۔ گولی سینے میں بائیں جانب دل کے قریب پیوست ہوگئی۔ مرزا زمین پر گر پڑے، اور قاتل فرار ہوگئے۔ مسلمان جراحوں نے بہت علاج کیا، مگر افاقہ نہ ہوا۔

یہاں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ جب قاتل کا پتا نہ چلا تو بادشاہ دہلی نے مرزا صاحب کو پیغام بھیجا کہ قاتل کا سراغ نہیں ملتا۔ اگر آپ اس کے بارے میں کچھ بتائیں تو ہم اس کو سزا دیں۔ جواب میں فرمایا:

''فقرا کشتۂ رہِ خدا ہیں۔ مردے کو مارنا قتل نہیں کہلاتا۔ قاتل ملے تو آپ سزا نہ دیں، اسے یہاں بھیج دیں۔''

آخر تیسرے دن ۱۰ محرم ۱۱۹۵ھ/ ۶ جنوری ۱۷۸۱ء کو مغرب کے وقت مرزا انتقال کر گئے [1]۔

نماز کے لیے بے چینی:

مرزا صاحب، نماز اور روزے کے لیے ہر آن پریشان رہتے اور ہمیشہ وقت پر یہ فریضہ ادا کرتے۔ یہی کیفیت موت کے وقت بھی ان پر طاری تھی۔ شاہ غلام علی وفات کے موقعے پر ان کی خدمت میں حاضر تھے۔ وہ اس سلسلے میں ان کی بے چینی کا مندرجہ ذیل الفاظ میں اظہار کرتے ہیں:

از نہایت ضعف، آواز مبارک شنیدہ نمی شدہ، روز صوم، روز جمعہ بعد نماز صبح از بندہ پرسیدند کہ یازدہ نماز از وقضا شدہ، وتمام بدن خون آلودہ است، طاقت برداشتن سر نہ باشد، نماز موقوف باید داشت و باشارہ برو ادا کند شما دریں مسئلہ چہ معلوم است؟ عرض نمودم، مسئلہ آں است کہ حضرت ایشاں فرمودند۔ بعد از گزاشتن نیم روز ہر دو دست برداشتہ تا دیرے فاتحہ خواندند [2]۔

(انتہائی کمزوری اور ضعف کی وجہ سے آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ جمعہ کے روز، روزہ رکھتے تھے۔ نماز فجر

[1] مقامات مظہری، ص ۶۱۔

[2] مقامات مظہری، ص ۶۱۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے بعد مجھ سے پوچھا کہ گیارہ نمازیں قضا ہوگئی ہیں۔ تمام بدن خون آلودہ ہے۔ سر اٹھانے کی ہمت نہیں۔ اٹھ کر نماز نہیں پڑھی جاسکتی، اشارے سے پڑھتا ہوں۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ میں نے عرض کیا، مسئلہ وہی ہے جو آپ نے فرمایا۔ دوپہر کے وقت دونوں ہاتھ اٹھا کر دیر تک دعا کرتے رہے۔)

تدفین:

مرزا صاحب کو دہلی میں ترکمان دروازے کے باہر ایک حویلی میں دفن کیا گیا۔ یہ حویلی ان کی بیوی کی ملکیت تھی۔ بعد میں یہ حویلی خانقاہ شاہ غلام علی کہلائی۔ آج کل یہ خانقاہ شاہ ابوالخیر کے نام سے مشہور ہے۔ لوحِ قبر پر خود مرزا کا یہ شعر کندہ ہے:

بہ لوحِ تربتِ من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

اکثر معتقدین و معاصرین نے ان کی وفات کی تاریخیں کہیں، جن میں ایک میر قمرالدین منت ہیں، انھوں نے حدیث کے ان الفاظ سے تاریخ نکالی:

عاش حمیدًا ومات شهیدا۔

١١٩٥ھ

قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے قرآن مجید کی اس آیت سے تاریخ نکالی:

﴿اولئك مع الذين انعم الله عليهم﴾ ❶

١١٩٥ھ

مرزا صاحب کا وصیت نامہ:

مرزا جانِ جاناں نے وفات سے پہلے ایک وصیت نامہ لکھا تھا، جس سے ان کی اتباعِ کتاب و سنت کا پتا چلتا ہے۔ یہ وصیت نامہ حسبِ ذیل ہے:

''حمد و صلوٰۃ کے بعد فقیر جانِ جاناں محمدی مجددی، اس حالت میں کہ جس میں اقرار و مقر صحیح و معتبر ہوتا ہے، ان احباب کو چند وصیتیں کرتا ہے، جنھوں نے اس سے اخذ طریقت کیا ہے۔

''فقیر کی تجہیز و تکفین میں سنت نبوی پر عمل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا جائے۔ اس کے بعد میری قبر پر دکان نہ لگائی جائے، کیوں کہ میں زندگی میں بھی اس کا مخالف تھا۔ میں بندگانِ خدا میں سے ایک

❶ قاتلانہ حملے اور وفات کی تفصیلات شاہ غلام علی نے مقاماتِ مظہری میں بیان کی ہیں۔ دیگر تذکرہ نگاروں نے بھی اس سلسلے کے واقعات تحریر کیے ہیں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بندہ ہوں۔ میں نے صرف خدا کے نام پر تعلیم دی ہے اور بس۔!

''چند روز پہلے میری بیوی نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ اپنے امورِ آخری کی تدبیر ان پر چھوڑ دوں۔ میں نے اس سلسلے میں انھیں ایک تحریر دے دی ہے تا کہ میرے بعد میرے مخلص ان کی مخالفت نہ کریں۔ وہ جہاں چاہیں مجھے دفن کریں۔ میں نے اس بات کا زبانی اقرار کرلیا ہے۔ لیکن ان دنوں یہ مستورہ کسی قطعہ زمین کی مالک نہ تھیں۔ حال ہی میں انھوں نے ایک حویلی خرید لی ہے، میں اس جگہ سے سخت متنفر ہوں۔ اگر وہ مجھے اس جگہ دفن کرنا چاہیں تو دوستی کے تقاضے سے میرے احباب پر واجب ہے کہ ہرگز یہ بات منظور نہ کریں۔ ہاں اس جگہ کے علاوہ جہاں بھی جگہ میسر ہو، ان کی مرضی کا خیال رکھیں۔ بیرون ترکمان دروازہ مناسب تر جگہ ہے۔

''اس مستورہ نے عارضہ سودا اور طویل عمری کی وجہ سے مجھے پریشان کیا ہے، جو دوستوں سے مخفی نہیں، لیکن میں نے سب معاف کر دیا ہے۔ اس محبت کے خیال سے جو انھیں خدا اور رسول ﷺ سے ہے، میرے مخلصین پر میرے حق وفا کے مطابق ان کی دل جوئی لازم ہے۔

''میرے مخلصین کو یہی وصیت کافی ہے کہ تادم آخریں، اتباع سنت میں کوشاں رہیں اور خدا کے سوا کسی کو مقصودِ حقیقی اور رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی اور کو متبوع واجب الاتباع نہ سمجھیں۔ فقیروں کے طور طریق اپنائیں اور دنیا داروں سے میل جول سے گریز کریں، علوم دین کے شغل سے خود کو معذور نہ رکھیں۔ اللھم وفقھم [1]۔''

نجف خاں:

مرزا مظہر جانِ جاناں کو چوں کہ نجف خاں نے قتل کرایا تھا، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اختصار کے ساتھ اس کے حالات بھی بیان کر دیے جائیں۔

نجف خاں، ایرانی نژاد تھا اور ایران کے بادشاہ حسین خاں صفوی کے وزیر اعظم آغا نجف خاں کا پوتا تھا۔ ۱۷۳۷ء کو اصفہان میں پیدا ہوا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اپنی اس بہن کے ساتھ جو صفدر جنگ کے بھائی محمد محسن کے عقد میں تھی، ہندوستان آیا اور الہ آباد کے حاکم محمد قلی خاں کے ہاں ملازم ہو گیا۔ ۱۷۶۱ء میں شجاع الدولہ نے محمد قلی خاں کو قتل کر دیا تو نجف خاں فرار ہو کر بنگال چلا گیا۔ وہاں نواب قاسم علی خاں نے اسے ملازم رکھ لیا اور فوج کی تیاری کے لیے تین لاکھ روپے دیے۔ ۱۷۶۴ء میں جب بکسر کی لڑائی کے بعد نجف خاں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر شجاع الدولہ کو قتل کیا اور قلعہ الہ آباد پر انگریزوں کا قبضہ کرا دیا تو اسے شاہی جرنیل تسلیم کر لیا گیا، کیوں کہ انگریز سیاسی مصالح کی بنا پر شاہ عالم ثانی کی حمایت میں جنگ کر رہے تھے۔ پھر انگریزوں کی سفارش پر اسے کوڑا کا شاہی فوج دار مقرر کیا گیا، لیکن پورا لگان وصول نہ کر سکنے کے الزام میں تین سال بعد اس

---

[1] مرزا صاحب نے یہ وصیت نامہ تحریر کر کے اپنے خلیفہ نعیم اللہ بہرائچی کو دے دیا تھا، جنھوں نے یہ معمولات مظہریہ میں نقل کیا ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

منصب سے الگ کر دیا گیا۔ اس اثنا میں نجف خاں ایک سال الہ آباد میں بے کار پڑا رہا۔ مئی ۱۷۷۱ء میں جب مغل حکمران عالم شاہ ثانی الہ آباد سے دہلی آیا تو نجف خاں کو بھی ساتھ لے آیا۔ اب وہ شاہی فوج کا کپتان مقرر ہوا، اور فوج کو منظم اور مسلح کرنے کے لیے اسے پچاس ہزار روپے دیے گئے۔

یہاں یہ بات لائق تذکرہ ہے کہ جب بادشاہ الہ آباد سے دہلی آیا تو یہ شہر بادشاہ کے دشمنوں کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ جاٹ، مرہٹے، سکھ اور روہیلے اپنی اپنی طاقت آزمانے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ صرف نجف خاں ہی وہ شخص تھا، جس نے ان تمام طاقتوں کو کچلا۔ اس نے خاص طور پر روہیلوں کو اپنا نشانہ بنایا، جن کی بڑھتی ہوئی طاقت مغل حکومت کے لیے مستقل خطرہ بنتی جا رہی تھی۔

دہلی کا دربار عرصے سے شیعہ اور سنی فرقوں کا اکھاڑہ بن چکا تھا۔ ایرانی اور تورانی باشندوں کے باہمی جھگڑوں کی بنیادی وجہ یہی مذہبی اختلاف تھا۔ سلطان اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد جب ساداتِ بارہ کے دو بھائیوں نے طاقت پکڑی تو شیعیت کو بہت عروج حاصل ہوا۔ صفدر جنگ اور عماد الملک کی چپقلش کا بڑا باعث یہی چیز تھی۔ نجف خاں کٹر شیعہ تھا اور اس کے دورِ اقتدار میں سنی علما کو ہدفِ ستم ٹھہرایا گیا۔ اسی بنا پر بہت سے لوگ نجف خاں سے علانیہ اظہارِ نفرت کرنے لگے تھے۔ چنانچہ مرزا مظہر جانِ جاناں ایک خط میں صاف الفاظ میں فرماتے ہیں کہ جس دن سے نجف خاں دہلی آیا ہے، فقیر سے لے کر بادشاہ تک ہر شخص کی حالت خراب ہے۔

مصحفی نے تذکرۂ ہندی گویان میں لکھا ہے کہ میں نجف خاں کے دور میں بارہ سال تک خانہ نشین رہا۔ اس حشر اجساد و اموات میں، تلاش معاش کے لیے ہرگز گھر سے نہیں نکلا۔

مولانا فخر الدین جو مرزا مظہر جانِ جاناں کے معاصر اور بارھویں صدی ہجری کے بہت بڑے ہندی عالم، صوفی اور مدرس تھے، نجف خاں سے انتہائی نالاں تھے۔ مرتے وقت اس نے مولانا فخر الدین کو بلوایا۔ وہ اس کے پاس چلے تو گئے مگر فرمایا کہ ہمارا اور تمھارا کوئی باہمی تعلق نہیں ہے، صرف عیادت کو آ گیا ہوں۔ نجف خاں کے جنازے میں مولانا فخر الدین شامل نہیں ہوئے۔

نجف خاں، مئی ۱۷۷۱ء میں عالم شاہ ثانی کے ساتھ الہ آباد سے دہلی آیا اور اسے شاہی فوج کے کپتان کا منصب عطا ہوا۔ ۵ جون ۱۷۷۲ء کو اسے میر بخشی مقرر کیا گیا۔ ۱۷۷۹ء کو وکیل مطلق بنایا گیا۔ ۱۷۸۲ء/۱۱۹۶ھ کو اس کا انتقال ہو گیا۔

نجف خاں حکومت کے مختلف بلند مناصب پر فائز رہا، مگر انتظامی صلاحیتوں سے محروم تھا۔ عیاش بھی ہو گیا تھا۔ یہ تمام عیب اس کے زوال کا باعث بنے۔

آخر میں یہ پھر عرض کر دیں کہ حضرت میرزا مظہر جانِ جاناں، سرزمین برصغیر کے جلیل القدر عالم، بلند مرتبہ فقیہ، مشہور شیخ، معروف صوفی اور بہت متقی بزرگ تھے۔ فارسی اور اردو کے بہترین شاعر تھے۔ ان کے دور کے علما و مشائخ اور ادبا و شعرا کھلے دل سے ان کی تعریف کرتے اور انھیں مختلف قسم کے علمی اوصاف کا مالک قرار

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا علم ہم دوشِ عمل اور ان کا فکر ہم آہنگ تحقیق تھا۔

کتاب وسنت کے اس شیدائی کو اللہ نے مرتبۂ شہادت سے سرفراز کیا۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ❶۔

۵۷۔ مولانا جار اللہ سائیپوری

مولانا جار اللہ بن محمود بن عطاء اللہ بن عبدالحی بن علم الدین سائیپوری کے حالات اس سے زیادہ معلوم نہیں ہو سکے کہ وہ حدیث اور فقہ کے ممتاز علمائے ہند میں سے تھے۔ ''کتاب الشتی'' کے نام سے ان کی ایک مفید تصنیف بھی ہے۔ انھوں نے ۱۱۳۶ھ/۱۷۲۴ء میں وفات پائی❷۔

۵۸۔ مولانا جان محمد لاہوری

مولانا جان محمد لاہوری، بارھویں صدی ہجری میں بلدۂ لاہور کے مشاہیر افاضل میں سے تھے۔ حدیث، فقہ اور اصول فقہ میں مہارت رکھتے تھے۔ لاہور میں پیدا ہوئے اور اسی شہر میں تعلیم وتربیت کی منزلیں طے کیں۔ معرفت وطریقت میں بھی بڑی شہرت کے مالک تھے۔ لاہور کے محلہ پرویز آباد میں، جس کی آبادی شہر سے باہر تھی، سکونت پذیر تھے۔

مولانا جان محمد کے حالات میں مذکور ہے کہ صغرسنی میں شیخ اسماعیل (جو بڑے میاں کے عرف سے معروف تھے، اب بھی لاہور کے علاقہ باغ بان پورہ میں بڑے میاں کا درس موجود ہے) کے خلیفہ شیخ عبدالحمید سے تحصیل علم کرتے تھے۔ ایک روز اپنے استاذ (شیخ عبدالحمید) کے ساتھ میاں صاحب موصوف کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میاں صاحب نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا، اے لڑکے! اگر تم عالم وفاضل ہو جاؤ تو کیا ہمارے ساتھ حدیث کا تکرار کرو گے؟ مولانا جان محمد ابھی عمر کی ابتدائی منزلوں میں تھے، شرم وحیا اور پاس ادب سے خاموش رہے۔ شیخ عبدالحمید نے جو ان کے استاذ تھے، فرمایا، جواب دو کہ اگر آپ کی دعا اور توجہ سے تحصیل علم کی نعمت سے بہرہ ور ہو گیا تو حاضر خدمت ہوں گا۔ چنانچہ سعادت مند شاگرد نے میاں صاحب ممدوح کے سامنے یہی کلمات دہرا دیے۔ میاں صاحب نے ہاتھ اٹھا کر اللہ سے دعا کی جو درجہ قبولیت کو پہنچی اور جان محمد بہت

❶ مرزا مظہر جانِ جاناں کے حالات کے لیے دیکھیے: خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ۶۸۴ تا ۶۸۷۔ مقامات مظہری۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۵۳۔ انوار العارفین، ص ۴۲۲ تا ۴۲۵۔ سرود آواز، ص ۲۳۲۔ الیانع الجنی، ص ۶۷۔ گلزار اولیا، ص ۴۱ تا ۴۷۔ ملفوظات شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، ص ۴۵۰۔ کلمات طیبات۔ تذکرۂ بے نظیر، ص ۱۱۶ تا ۱۱۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۵۰ تا ۵۴۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۲۲۶، ۲۲۷۔ مفتاح التواریخ، ص ۳۵۸۔ مرقع دہلی، ص ۴۰، ۴۱۔ گل رعنا، ص ۱۲۰ تا ۱۳۲۔ معمولات مظہریہ۔ مکاتیب مرزا مظہر۔ مرزا مظہر جانِ جاناں کے خطوط۔ آب حیات، ص ۴۱ تا ۴۷۔ رود کوثر، ص ۴۴۶ تا ۴۴۹۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۵۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھوڑی مدت میں علم وفضل کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔ یہاں تک کہ علمی فضیلت وقابلیت میں اپنے استاد شیخ عبدالحمید سے بھی فوقیت لے گئے۔ شیخ عبدالحمید، لائق شاگرد کے علم وفضل اور ذہانت وقابلیت سے بہت خوش تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ اب شاگرد استاذ سے بھی آگے نکل گیا ہے اور اس کا طائر ہمت مزید بلندی کی طرف محوِ پرواز ہے تو اپنے سے علیحدہ کر کے خود ہی شیخ تیمور کے حلقۂ درس میں داخل کرا دیا، جو لاہور کے اکابر علمائے وقت میں سے تھے۔ کچھ عرصہ ان سے استفادہ کیا اور دستار فضیلت حاصل کی۔ اس کے بعد میاں اسماعیل عرف میاں کلاں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حسب وعدہ ان سے حدیث کا تکرار کرنے لگے۔ اس کے بعد اس کام کے لیے جمعہ اور دوشنبہ کا دن مقرر رہا۔ جب تک میاں صاحب زندہ رہے، ہفتے میں دو دفعہ بالالتزام دونوں کے درمیان تکرار حدیث کا سلسلہ جاری رہا۔

مولانا جان محمد لاہوری نے ۱۱۲۰ھ/ ۱۷۰۸ء کو لاہور میں وفات پائی ❶۔

۵۹۔ شیخ جلال الدین گجراتی

شیخ جلال الدین بن محمد بن جعفر بن جلال بن محمد حسینی بخاری گجراتی، ۲ر جمادی الاولیٰ ۱۰۶۲ھ/ یکم اپریل ۱۶۵۲ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد گرامی شیخ محمد گجراتی ایک نامور عالم تھے، بیٹے نے انھی سے علم حاصل کیا اور فقہ کی تحصیل بھی کی، طریقت وتصوف بھی انھی سے سیکھا، یہاں تک کہ علم وفضل اور فقہ وتصوف کے مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ دو رسالے بھی تصنیف کیے۔ ایک خوابوں کی تعبیر سے متعلق، جس کا نام ''مرآۃ الرویا'' ہے۔ دوسرا اذکار واشغال اور وظائف کے بارے میں، اس کا نام ''مفتاح الحاجات'' ہے۔

وفات سے پہلے سخت بیمار ہو گئے تھے۔ بیماری کچھ اس نوعیت کی تھی کہ غذا بالکل ترک کر دی تھی۔ البتہ تھوڑا سا پھل انار یا انجیر وغیرہ کھا لیتے تھے۔ ۲۰ر ذی الحجہ ۱۱۱۴ھ/ ۲۶ر اپریل ۱۷۰۳ء کو احمد آباد میں فوت ہوئے۔ ''محبوب ذی المنن'' کی روایت کے مطابق ۱۱۰۴ھ/ ۱۶۹۳ء کو وفات پائی ❷۔

۶۰۔ مولانا جلال الدین مچھلی شہری

مولانا جلال الدین جعفری ہاشمی مچھلی شہری، قاضی ثناء الدین جعفری زینبی ہاشمی کی نسل سے تھے۔ سلسلۂ نسب رسول اللہ ﷺ کے ابن عم حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ تک منتہی ہوتا ہے۔ ہندوستان کے صوبہ یوپی کے مشہور مقام مچھلی شہر میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ علم حاصل کیا اور فقہ و اصول کے ماہرین میں گردانے گئے۔ عمر بھر درس و تدریس اور افادۂ طلبا میں مصروف رہے۔ علم فقہ میں مہارت کا یہ عالم تھا کہ

❶ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۳۹۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۵۵۔ خزینۃ الاصفیاء، ص ۷۸۳، ۷۸۴۔

❷ محبوب ذی المنن، حصہ دوم، ص ۲۳۵، ۲۳۶۔ مرآۃ احمدی، ج ۲، ص ۲۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۵۶۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب وتدوین میں شامل ہونے کا شرف حاصل کیا۔ کہتے ہیں انھوں نے فتاویٰ عالم گیری کی پہلی جلد تصنیف کی ❶۔

۶۱۔ شیخ جمال الدین گجراتی

شیخ جمال الدین بن رکن الدین عمری چشتی گجراتی، عالم صالح اور اپنے دور کے مشہور شیخ تھے۔ ۱۰۸۸ھ/ ۱۶۷۷ء کو احمد آباد میں پیدا ہوئے اور اپنے والد گرامی شیخ رکن الدین گجراتی سے جو عالم کبیر تھے، علم حاصل کیا۔ عرصے تک ان سے منسلک رہے۔ طریقت وتصوف کی تحصیل بھی ان ہی سے کی۔ علوم سے فارغ ہونے کے بعد درس وافادہ میں مصروف ہو گئے۔ کئی کتابیں تصنیف کیں۔ متعدد کتابوں پر شروح وحواشی لکھے۔ صاحب جود وسخا اور پیکر کرم واحسان تھے۔ طلبا کی ایک جماعت ان سے استفادہ کرتی تھی، ان کے ساتھ انتہائی سخاوت کا برتاؤ کرتے۔ مسافروں کی مدد کرتے۔ ان کے شب وروز کے دو ہی مشاغل تھے، ایک عبادت، دوسرے تدریس وتصنیف، ان کی تصانیف وشروح میں سے مندرجہ ذیل کتابیں لائق تذکرہ ہیں۔

شرح جامی پر حاشیہ، منہل الصافی پر حاشیہ، زبدہ پر حاشیہ، قطب الدین رازی کی شرح شمسیہ پر حاشیہ، علم معانی وبیان کی مشہور کتاب مطول پر حاشیہ، سعد الدین تفتازانی کی شرح العقائد پر حاشیہ، حاشیہ الخیالی پر حاشیہ، مختصر المعانی پر حاشیہ، تلویح پر حاشیہ، تفسیر المدارک پر حاشیہ، تفسیر بیضاوی پر حاشیہ، تفسیر المحمدی پر حاشیہ، تفسیر حسینی پر حاشیہ۔ ان تفاسیر قرآن پر حواشی کے علاوہ خود انھوں نے تفسیر المختصر اور تفسیر نصیری کے نام سے تفسیریں لکھیں۔ علاوہ ازیں فتح الجمال تصنیف کی۔

پھر مولانائے روم کی مثنوی کی شرح سپرد قلم کی۔ سوانح جامی کی شرح لکھی۔ جام جہاں نما کی شرح لکھی، فصوص الحکم کی شرح لکھی، سید محمد بن یوسف حسینی کی ''اسماء الاسرار'' کی شرح لکھی، مرآۃ العارفین کی شرح، التعرف کی شرح، عوارف المعارف کی شرح، آداب المریدین کی شرح، اسرار الخلوت کی شرح، بحر الاسرار کی شرح بھی ان کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے۔ علاوہ ازیں درۃ التاج، مرقاۃ السلوک، قرۃ العین، نور الاولیا، رکن الطریقۃ، مشہد الجمال، آثار السلوۃ، مراصد الکمال، کمند وحدت، شرح التقسیم وغیرہ متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں۔ اس عالم دین کو ہر موضوع سے دلچسپی تھی، یہی وجہ ہے کہ ان کی تصانیف وشروح کا دائرہ بہت پھیلا ہوا ہے۔ کہتے ہیں ایک سو بیالیس شروح وتصانیف ان کی یادگار ہیں۔

شیخ جمال الدین گجراتی شاعر بھی تھے۔ چنانچہ فارسی کا ایک دیوان ان کے رشحاتِ فکر میں شامل ہے۔

اس عالم دین نے ۶؍ ربیع الثانی ۱۱۲۴ھ/ ۲؍ مئی ۱۷۱۲ء کو وفات پائی ❷۔

❶ تجلی نور، ج ۲، ص ۱۲۱، ۱۲۲۔ برصغیر میں علم فقہ، ص ۳۰۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۵۶، ۵۷۔ تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۷۶۶۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۵۸، ۵۹۔ محبوب ذی المنن، حصہ دوم، ص ۲۲۹ تا ۲۳۳۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ـــــ ح ـــــ

۶۲۔ مولانا حامد جون پوری

مولانا حامد جون پوری کبار فقہائے ہند میں سے تھے۔ جون پور میں پیدا ہوئے، لیکن آغاز جوانی ہی میں ترک وطن کر گئے تھے۔ زیادہ تر کتب درسیہ سید محمد زاہد بن سید محمد اسلم ہروی سے پڑھیں اور بعض کے لیے دانش مند خاں یعنی علامہ محمد شفیع یزدی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، پھر اس مرتبہ علمی کو پہنچے کہ اکثر علوم وفنون میں اپنے شیوخ واساتذہ کی زندگی میں ہی مہارت پیدا کر لی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود مسند تدریس آراستہ فرمائی اور علمی وفنی مباحث میں درجۂ کمال سے سرفراز ہوئے۔

ان کی فراوانیٔ علم سے متاثر ہو کر بادشاہ ہندشاہ جہان نے ان کے لیے یومیہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ بعد ازاں اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں ''فتاویٰ عالم گیری'' کی تدوین کا سلسلہ شروع ہوا تو عالم گیر نے اس خدمت علمی پر مامور کر دیا۔ عالم گیر نے ان کو اپنے بیٹے شہزادہ محمد اکبر کا اتالیق بھی بنا دیا تھا ❶۔

ڈاکٹر زبید احمد نے مولانا حامد جون پوری کے حاشیہ تفسیر بیضاوی کی نشان دہی بھی کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کا قلمی نسخہ بوہار لائبریری (ہوگلی) میں موجود ہے ❷۔

۶۳۔ شیخ حبیب اللہ بہاری

شیخ حبیب اللہ بن ذکی الدین بہاری، شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری کی اولاد سے تھے۔ بلدۂ بہار میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ اپنے والد شیخ ذکی الدین بہاری سے جو ایک عالم دین بزرگ تھے، تحصیل کی۔ بعد ازاں عازم جون پور ہوئے۔ وہاں شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری کے بیٹے شیخ محمد ارشد عثمانی جون پوری کا ہنگامۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور عرصے تک ان کی خدمت میں رہے۔ یہاں تک کہ مختلف علوم وفنون اور فقہ میں کمال حاصل کیا۔ پھر واپس اپنے شہر بہار تشریف لے گئے اور اپنے اسلاف کی مسند مشیخت کو زینت بخشی۔ تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ ہدیۃ السالکین اور تحفۃ الذاکرین کے نام سے دو کتابیں تصنیف کیں۔

جمعرات کے روز ۲۹ ربیع الاول ۱۱۱۸ھ/۳۰ جون ۱۷۰۶ء کو وفات پائی ❸۔

---

❶ تجلی نور، ج ۲، ص ۹۳، ۹۴۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۲۹، ۱۳۰۔ بزم تیموریہ، ص ۲۴۰، ۲۴۱۔ انفاس العارفین۔ سبحۃ المرجان۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۲۶۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۶۰۔ برصغیر میں علم فقہ، ص ۲۹۸، ۲۹۹۔ ''معارف'' اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۴۷ء۔

❷ عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ، ص ۲۷۳۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۶۰ بحوالہ گنج ارشدی۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۶۴۔ قاضی حبیب اللہ تاج پوری

قاضی حبیب اللہ تاج پوری عابد و زاہد، متقی و متورع اور نامور عالم و فقیہ تھے۔ تاج پور شہر کے منصب قضا پر فائز تھے۔ طریقت و تصوف سے بھی وابستگی تھی اور اس سلسلے میں شیخ محمد ارشد بن محمد رشید عثمانی جون پوری سے فیض یافتہ تھے۔ رشد و ہدایت کے پیکر تھے۔ فقہی مسلک کے لحاظ سے حنفی تھے۔ عمر بھر لوگوں کی ظاہری و باطنی اصلاح میں مصروف رہے۔ ۱۸/ ذی الحجہ ۱۱۰۸ھ/ ۲۸/ جون ۱۶۹۷ء کو وفات پائی۔ مدن پور میں مدفون ہیں، جو اعمال سارن میں ایک قریہ تھا❶۔

۶۵۔ شیخ حبیب اللہ قنوجی

شیخ حبیب اللہ قنوجی کا مولد و منشا شہر قنوج ہے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو حصول علم کے لیے سندیلہ کا عزم کیا۔ وہاں کے بعض علماء سے ''ضوء المصباح'' کا درس لیا۔ پھر جون پور گئے جو اس زمانے میں علم کا مرکز تھا۔ وہاں مولانا عبدالباقی صدیقی جون پوری کے مدرسے میں داخلہ لیا اور تمام مروجہ کتب درسیہ پڑھیں۔ پھر الہ آباد کا قصد فرمایا، وہاں شیخ عبدالجلیل الہ آبادی (متوفی ۶/ شعبان ۱۱۱۴ھ/ ۱۵/ دسمبر ۱۷۰۲ء) سے اخذ طریقت کیا اور عرصے تک ان کی خدمت میں رہ کر تصوف و سلوک کی منزلیں طے کیں۔

شیخ موصوف عالم باعمل اور فقیہ نام دار تھے۔ اور ناصح و واعظ۔ ان کی تصانیف میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱۔ مذاق الصوفیہ: یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اور تصوف سے متعلق ہے۔ آغاز ''حمد بے حد مر جلیلے را'' کے الفاظ سے ہوتا ہے۔

۲۔ خلاصۃ الاکتساب: یہ کتاب بھی سلوک و تصوف کے بارے میں ہے اور فارسی میں ہے۔ اس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں: سبحان اللہ منہ البدایۃ و النہایۃ۔

۳۔ جواہر الخمسہ۔

۴۔ تذکرۃ الاولیا۔

۵۔ روضۃ النبی فی الشمائل۔

۶۔ انیس العارفین۔

۷۔ ایک کتاب الفاضل کے نام سے مسائل فقہ کے بارے میں تصنیف کی۔

۸۔ ایک رسالہ علم منطق کے موضوع میں لکھا۔

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۶۱ بحوالہ گنج ارشدی۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شیخ حبیب اللہ قنوجی نے ۱۱۴۰ھ/ ۱۷۲۸ء کو قنوج میں وفات پائی۔ بعض علما نے اس عالم وفقیہ کی تاریخ وفات الموت حبس یوصل الحبیب الی الحبیب کے الفاظ سے نکالی❶۔

۶۶۔ سید حسن دہلوی عرف رسول نما

سید حسن بن ابوالحسن حسینی نارنولی ثم دہلوی، رسول نما کے عرف سے معروف تھے۔ شیخ وقت اور عالم وفقیہ تھے۔ نارنول میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ قرآن مجید اور فارسی کے چند مختصر رسائل پڑھنے کے بعد بچوں کو پڑھانے میں مصروف ہو گئے۔ پھر کچھ عرصے کے بعد جون پور چلے گئے اور وہاں کے بعض علما سے چند روز تک عربی کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ انہی دنوں جون پور کے ایک عالم بنارس کے سفر پر روانہ ہوئے تو ان کے ساتھ چلے گئے۔ پھر اس عالم نے بنارس سے الہ آباد کا قصد کیا تو سید حسن نے موضع بہلول کی راہ لی، جو ان دنوں لکھنؤ سے بیس میل کے فاصلے پر ایک قریہ تھا۔ بہلول کے رئیس کا نام چودھری جلال الدین تھا، وہ ان سے مل کر بہت خوش ہوا۔ بڑے اعزاز سے پیش آیا اور اپنے گاؤں میں ان کی آمد کو غنیمت جانا۔ کچھ عرصے کے بعد بہلول سے لکھنؤ چلے گئے۔ لکھنؤ میں ایک عالم دین مولانا عبدالقادر عمری لکھنوی اقامت پذیر تھے، ان سے تحصیل علم کی۔ جون پور، بنارس، بہلول اور لکھنؤ میں ان کی کل مدت قیام وسفر چودہ سال بنتی ہے۔

لکھنؤ سے اپنے وطن نارنول کا عزم کیا اور صوفیا وفقرا میں شمولیت اختیار کر لی۔ بارہ سال نارنول میں مقیم رہے۔ پھر دہلی چلے گئے اور تادمِ زندگی دہلی ہی کو اپنا مسکن قرار دیے رکھا۔

سید حسن ممدوح علم تفسیر، حدیث، اصول فقہ اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ اس دور کے علما و مشائخ میں علم وحلم، انکسار وتواضع، وقار واکرام اور ہیبت وجلال میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ ہمیشہ ریاضت ومجاہدہ میں مشغول رہتے، نہ خود اہل دنیا سے اختلاط رکھتے اور نہ اہل دنیا کو اپنے قریب آنے کا موقع دیتے۔

مشہور تھا کہ خواب میں ان کو رسول اللہ ﷺ کی زیارت ورویت کا شرف حاصل ہوتا تھا، لہٰذا لوگوں نے ان کو ''رسول نما'' کا لقب دے رکھا تھا۔

اس عالم وفقیہ نے ہفتے کے روز ۲۲ر شعبان ۱۱۰۳ھ/ ۲۹ر اپریل ۱۶۹۲ء کو وفات پائی❷۔

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۶۲۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۴۶۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۷، ۴۳۸۔ عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ، ص ۳۰۶، ۳۶۳۔

❷ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، مناقب الحسن رسول نما۔ منتخب اللباب، ج ۲، ص ۵۵۲، ۵۵۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۶۳، ۶۴۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۵۳۔ سمات الاخیار ص ۷۶۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۶۷۔ قاضی حسن سعید جون پوری

قاضی حسن سعید بن محمد سعید بن محمد مبارک حسینی جون پوری، شیخ وقت اور متقی عالم تھے۔ فقہ اور اصول فقہ کے ماہرین میں سے تھے۔ ان کا مولد و منشا جون پور تھا۔ طویل مدت تک حصول علم میں مشغول رہے، یہاں تک کہ فتویٰ اور تدریس کے منصب بلند پر فائز ہوئے۔ پہلے جون پور کی مسند افتا سنبھالی، پھر وہیں کے قاضی مقرر کیے گئے۔ ان کے والد شیخ محمد سعید جون پوری دہلی میں ملوک و امرا کے نزدیک بڑی عزت و احترام کے مالک تھے۔ قاضی حسن سعید نے بھی حکام وقت سے تقرب پیدا کر لیا تھا، جس کے نتیجے میں دہلی کے قاضی اکبر کے منصب کو پہنچے۔ پھر ہندوستان کی مسند قضا سے سرفراز ہوئے۔ بارھویں صدی ہجری کے اس جید عالم و فقیہ نے ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء میں وفات پائی ❶۔

۶۸۔ قاضی حیدر کشمیری

قاضی حیدر بن ابو حیدر کشمیری، شیخ و فاضل اور دیار کشمیر کے اکابر فقہا میں سے تھے۔ قاضی خاں کے عرف سے معروف تھے۔ کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ شیخ عبدالرشید زرگر کشمیری (متوفی ۱۱۵۵ھ/ ۱۷۴۲ء) اور دیگر علما سے علم حاصل کیا۔ جب مختلف علوم و فنون کی تحصیل سے فارغ ہو گئے تو تنگیٔ معاش کی وجہ سے ترکِ وطن کر کے دہلی کا عزم کیا اور اورنگ زیب عالم گیر کے لشکر میں آ گئے۔ وہاں سیادت خاں صدر الصدور سے تعلق پیدا کر کے بادشاہ (اورنگ زیب) کی خدمت میں حاضری دی۔ اورنگ زیب علمائے دین کا قدر دان تھا، اس کو ان کی وسعت علم کا پتا چلا تو اپنے پوتے محمد عظیم کا اتالیق مقرر کر دیا۔ کچھ عرصہ اس خدمت پر مامور رہے۔ پھر دہلی کے قاضی مقرر کیے گئے۔ ان کی معدلت گستری سے بادشاہ اتنا متاثر ہوا کہ ۱۱۱۷ھ/ ۱۷۰۵ء میں قاضی القضاۃ کا منصب عطا کر دیا۔

اورنگ زیب عالم گیر کے بیٹے شاہ عالم نے ان کو جودھ پور بھیج دیا تھا۔ وہاں جا کر مسجدیں تعمیر کیں اور گرجے ڈھا دیے۔ اس علاقے کے مختلف شہروں میں قاضی و والی مقرر کیے اور غیر مسلموں سے جزیہ وصول کیا۔ اس کشمیری عالم و فقیہ نے عارضہ اسہال سے ۱۱۲۱ھ/ ۱۷۰۹ء کو دکن میں وفات پائی، ان کی میت دکن سے کشمیر لا کر دفن کی گئی ❷۔

❶ تجلی نور، ج ۲، ص ۷۲۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۳۷۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۶۴، ۶۵۔

❷ مآثر عالم گیری، ص ۵۱۴، ۵۲۱، ۵۲۴۔ منتخب اللباب، ج ۲، ص ۶۰۶، ۶۰۷۔ خزینۃ الاصفیا، ج ۲، ص ۳۶۲۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۷۷۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۵۴۔ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۲۱۶، ۲۱۷۔ روضۃ الابرار، ص ۵۹۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ـــــ خ ـــــ

۶۹۔ خواجہ میر درد دہلوی

خواجہ میر درد دہلوی نجیب الطرفین سید تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب والد کی جانب سے گیارہ واسطوں سے حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند سے اور والدہ کی جانب سے پچیس واسطوں سے حضرت امام حسن عسکری سے ملتا ہے۔

خواجہ نقشبند:

خواجہ میر درد کے اجداد کرام میں سے جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا، ایک بزرگ خواجہ بہاء الدین نقشبند تھے جو سلسلۂ نقشبندیہ کے سرخیل تھے۔ ان کا نام محمد بن محمد بخاری تھا اور خواجہ بہاء الدین کے عرف سے معروف تھے۔ ''خواجہ'' ان کا لقب تھا، جس کا اطلاق ان کی اولاد میں بھی جاری رہا۔ اس لفظ کی وضاحت میں خود خواجہ میر اپنی کتاب ''علم الکتاب'' میں لکھتے ہیں:

''خواجہ بمعنی مالک وسردار وصاحب ومولیٰ است، لہٰذا اطلاق آں بر ذریات مولیٰ الموالی علیہ السلام کردہ اند، واکابر سادات ملقب بہ لقب خواجگان شدہ اند، وحضرت بہاء الدین نقشبند قدس سرہ العزیز کہ از سادات صحیح النسب اندو بایازدہ واسطہ جد پدری بندہ اند، نیز خواجہ می گفتند۔

(یعنی لفظ خواجہ مالک، سردار، صاحب اور مولیٰ کے معنی میں مستعمل ہے، اس لیے اس کا اطلاق حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد پر ہونے لگا اور اکابر سادات خواجگان کے لقب سے ملقب ہوئے۔ حضرت بہاء الدین نقشبند قدس سرہ العزیز بھی جو کہ صحیح النسب سادات میں سے تھے اور گیارہ واسطوں سے والد کی جانب سے میرے جدامجد ہیں، خواجہ کہلائے۔)

خواجہ بہاء الدین کو نقشبند اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کا پیش کمخواب بافی اور نقشبندی تھا۔ چنانچہ سفینۃ الاولیاء میں دارا شکوہ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

حضرت می فرمودند کہ من و پدرم بہ صنعت کمخواب بافی ونقشبندی مشغول بودیم۔

(کہ حضرت خواجہ بہاء الدین فرمایا کرتے تھے کہ میں اور میرے والد کمخواب بافی اور نقشبندی کا کام کرتے تھے۔)

خواجہ بہاء الدین کی وفات کے بعد ان کی اولاد نے بھی اپنے لیے لفظ خواجہ اور نسبت نقشبند کو اپنے اسما کے ساتھ برقرار رکھا۔ خواجہ نقشبند ممدوح ۷۱۸ھ/۱۳۱۸ء کو بخارا میں پیدا ہوئے۔ عمر بھر رشد و ہدایت میں مشغول

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہے۔ ۱۳؍ ربیع الاول ۷۹۱/ ۱۲؍ مارچ ۱۳۸۹ء کو بخارا میں وفات پائی۔ ’’قصر عارفاں‘‘ میں دفن کیے گئے جو اس زمانے میں بخارا سے ایک کوس کے فاصلے پر واقع تھا۔

برصغیر میں آمد:

خواجہ بہاء الدین نقشبند کے کم وبیش تین سو سال بعد ان کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ محمد طاہر نقشبند اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں وارد ہند ہوئے، اور یہی وہ بزرگ ہیں جنھیں خواجہ میر درد کے مورث اعلیٰ کہا جاتا ہے۔ اورنگ زیب بزرگان دین اور علمائے کرام کا بے حد قدر دان تھا، وہ ان سے انتہائی عقیدت سے پیش آیا، اپنے قریب بٹھایا اور حکومت کے اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کی درخواست کی، مگر خواجہ محمد طاہر نے اسے منظور نہ فرمایا۔ ان کے تین بیٹے تھے، خواجہ محمد صالح، خواجہ محمد یعقوب اور خواجہ فتح اللہ! خواجہ صاحب نے اپنے ان بیٹوں کو تو دہلی میں عالم گیر کے دربار میں چھوڑا اور خود حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ (ایک روایت کے مطابق بخارا چلے گئے تھے)۔ خواجہ صاحب کے دہلی سے جانے کے بعد اورنگ زیب بادشاہ نے ان کے تینوں بیٹوں کی بڑی توقیر کی اور ان کی شان کے مطابق مناصب عطا کیے۔ خواجہ محمد صالح اور خواجہ محمد یعقوب کی تو اپنے بھائی شہزادہ مراد کی دو بیٹیوں سے شادی بھی کر دی تھی۔ تیسرے بھائی خواجہ فتح اللہ کا عقد بھی بادشاہ نے ایک مغل شہزادی سے کرنا چاہا مگر انھوں نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ وہ صحیح النسب سید ہیں، مغل خاندان میں شادی کر کے اپنے نسب میں اختلال نہیں پیدا کرنا چاہتے۔

خواجہ فتح اللہ کے بیٹے نواب ظفر اللہ خاں اور نواب ظفر اللہ خاں کے بیٹے خواجہ محمد ناصر عندلیب تھے۔ خواجہ محمد ناصر کے والد (نواب ظفر اللہ خاں) اور دادا (خواجہ فتح اللہ خاں) کا شمار عہد عالم گیری کے امرا میں ہوتا تھا، لیکن خواجہ محمد ناصر عندلیب پر ترک دنیا اور درویشی کا غلبہ تھا اور مستغنی المزاج بزرگ تھے، اس لیے قبول امارت اور حصول منصب کو درخور اعتنا نہیں گردانا اور فقر وغنا کی زندگی بسر کرنا شروع کر دی۔ خواجہ محمد ناصر عندلیب کو تصنیف وتالیف سے بھی دلچسپی تھی۔ مندرجہ ذیل کتابیں ان کی تصانیف ہیں:

۱۔ نالۂ عندلیب: یہ کتاب فارسی نثر میں ہے۔ مصنف شہیر نے یہ کتاب ۱۱۵۳ھ/ ۱۷۴۰ء میں مکمل کی۔ حضرت نواب سید صدیق حسن خاں رحمہ اللہ (بھوپال) کے فرزند گرامی نواب سید نور الحسن خاں مرحوم کی سعی جمیلہ سے شائع ہوئی۔ اٹھارہ سو صفحات پر محیط ہے۔

۲۔ رسالہ ہوش افزا: یہ بھی نثر میں ہے اور فارسی زبان میں ہے۔

۳۔ دیوان عندلیب: خواجہ ممدوح شاعر بھی تھے۔ یہ ان کے فارسی کلام کا مختصر مجموعہ ہے۔

خواجہ محمد ناصر عندلیب عالم وصوفی اور صاحب طریقت بزرگ تھے۔ انھوں نے چھیاسٹھ سال کی عمر پا کر ۱۱۷۲ھ/ ۱۷۵۹ء کو انتقال کیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے لائق بیٹے خواجہ میر درد مسند نشین ہوئے، جن کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضروری حالات درج ذیل ہیں۔

باپ کی وفات کے وقت (۱۱۷۲ھ/ ۱۷۵۹ء میں) خواجہ میر درد کی عمر انتالیس سال تھی، لہٰذا ان کا سال ولادت ۱۱۳۳ھ/ ۱۷۲۱ء ہے۔ ان کا نام خواجہ میر ہے اور لفظ ''خواجہ'' نام کا جز ہے۔ یہ نام ان کے نانا میر سید محمد قادری بن میر احمد خاں شہید نے رکھا تھا۔ اس ضمن میں خواجہ میر درد خود لکھتے ہیں:

ایں اسم فقیر کہ خواجہ میر است وقت تولدِ بندہ والد بزرگ وار والدۂ ماجدۂ ام سید العارفین میر سید محمد حسینی قادری بن نواب میر احمد خاں شہید گزاشت اند ❶۔

(یعنی اس فقیر کا نام خواجہ میر ہے جو میری ولادت کے وقت میری والدۂ گرامی کے والد سید العارفین میر سید محمد حسینی قادری بن نواب میر احمد خاں شہید نے رکھا۔)

تعلیم و تربیت:

خواجہ میر نے علوم رسمیہ کی کتابیں اپنے والد محترم خواجہ محمد ناصر عندلیب سے پڑھیں۔ البتہ مثنوی مولانا روم کے لیے مفتی دولت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فارسی کی تعلیم سراج الدین علی خاں آرزو اکبر آبادی سے حاصل کی۔ خواجہ میر تمام علوم شرعیہ میں کامل تھے اور قرآن، علوم قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول اور تصوف وطریقت میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔

ابتدائے جوانی میں سپاہی پیشہ اور فوج شاہی میں ملازم تھے۔ بعد ازاں عین عالم شباب میں (انتیس سال کی عمر کو پہنچے تو) یہ سلسلہ ترک کر کے اور علائق دنیا سے الگ ہو کر فقر و درویشی کی زندگی اختیار کر لی اور سلوک وتصوف کی وادی میں قدم زن ہو گئے۔ پھر تمام عمر اسی راہِ حق کے مسافر رہے۔ وہ سلسلۂ نقشبندیہ کے چشم وچراغ تھے اور اپنے نام کے ساتھ ''محمدی'' کی نسبت رکھتے تھے۔ ''نقشبندی مجددی محمدی'' کہلاتے تھے۔ بڑے متقی اور پرہیز گار تھے۔

سلسلۂ نقشبندیہ میں سماع ممنوع ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ میر درد سماع کے قائل تھے۔ دہلی کے تمام بڑے بڑے مغنی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اس فن کی باریکیوں کا علم حاصل کرتے۔ سماع کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ سماع اور غنا کے سلسلے میں لوگ خود ہی میرے پاس آتے ہیں اور جب جی چاہتا ہے، چلے جاتے ہیں۔ میں نہ کسی کو بلاتا ہوں، نہ کسی کے پاس جاتا ہوں، نہ گانا سننے کو دوسروں کی طرح عبادت سمجھتا ہوں، نہ انکار کرتا ہوں، نہ اس کی اباحت کا فتویٰ دیتا ہوں۔ البتہ اس سلسلے میں میرا عقیدہ وہی ہے، جو میرے بزرگوں کا ہے۔۔۔۔ عقیدۂ من ہماں است کہ عقیدۂ بزرگان من است ❷۔

❶ علم الکتاب، ص ۸۴۔

❷ نالۂ درد، ص ۷۔ نالہ ۳۷۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بادشاہ کو سرزنش:

خواجہ میر درد بے حد مستغنی المزاج تھے۔ آداب محفل کا بھی انتہائی خیال رکھتے تھے، جو اس کا خیال نہ رکھتا اگرچہ وہ کتنی بڑی شخصیت کا مالک ہوتا خواجہ اسے فوراً ڈانٹ دیتے اور سرزنش کرتے۔ اس ضمن کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ ان کے ہاں ہر قمری مہینے کی دوسری اور چوبیسویں تاریخ کو محفل سماع منعقد ہوتی تھی، جس میں اس دور کے بڑے بڑے علما و مشائخ اور وزرا و امرا شامل ہوتے تھے، حتیٰ کہ اس زمانے کا مغل حکمران شاہ عالم ثانی بھی اس محفل میں شریک ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ شاہ عالم کے پاؤں میں شدید درد تھا، وہ اسی حالت میں محفل سماع میں آگیا، لیکن تکلیف اتنی بڑھی کہ وہ برداشت نہ کر سکا اور شدتِ درد سے مجبور ہو کر تھوڑا سا پاؤں پھیلا دیا۔ خواجہ میر درد کے فقر و بوریا نشینی نے بادشاہ کی اس حرکت کو اپنے روایتی آداب محفل کے منافی سمجھا اور فرمایا: ''یہ چیز فقیر کے آداب محفل کے خلاف ہے۔'' بادشاہ نے عذر بیان کیا اور معافی مانگی۔ فرمایا: ''اگر طبیعت خراب تھی تو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔''

خواجہ میر کا تخلص:

خواجہ میر کا تخلص درد تھا، لیکن تخلص کے لیے یہ لفظ کیوں پسند کیا؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ خود ہی لکھتے ہیں کہ میرے والد خواجہ محمد ناصر، عندلیب تخلص کرتے تھے، ان کے پیر شاہ سعد اللہ گلشن تخلص کرتے تھے اور ان کے پیر حضرت عبدالاحد، گل تخلص کرتے تھے، لہٰذا اس رعایت سے میں نے اپنے لیے درد تخلص تجویز کر لیا①۔

تخلص کے بارے میں وہ مزید لکھتے ہیں:

میرے ناموں کی طرح میرا تخلص بھی الہامی ہے۔ قرآن مجید میں پہلے پارے میں جو الف، لام، میم، حروف مقطعات آئے ہیں، ان کے متعلق بعض اہل معارف کا کہنا ہے کہ اگر انھیں ملا کر لکھا جائے تو ''الم'' بن جاتا ہے اور ''الم'' عربی میں 'درد' کو کہتے ہیں، اور یہی میرا تخلص ہے۔

عسرت اور تنگ دستی:

خواجہ میر درد کے والد مکرم خواجہ محمد ناصر عندلیب کو اللہ نے تمام نعمتوں سے نوازا تھا۔ ان کے آبا و اجداد بھی امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، لیکن خود انھوں نے علائق دنیوی سے کنارہ کش ہو کر درویشانہ زندگی اختیار کر لی تھی اور گوشہ نشین ہو گئے تھے، یہی اثر سعادت مند بیٹے (خواجہ میر درد) پر بھی پڑا۔ انھوں نے بھی ملازمت و مناصب کو ترک کر دیا۔ جائداد بھی چھوڑ دی اور اپنے آپ کو یادِ الٰہی کے لیے وقف کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

---

① آہ سرد، ص ۱۵۶۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غربت وافلاس نے آگھیرا اور گھر میں عسرت و تنگ دستی نے ڈیرے ڈال دیے۔ یہاں تک کہ فاقہ کشی تک نوبت آگئی۔ مگر اس مردِ خدا نے نہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور نہ کسی سے کبھی کچھ طلب کیا۔ امرائے مملکت اور وزرائے حکومت ان کے گھر آتے اور فیض حاصل کرتے، خود بادشاہ ان کی مجلسوں میں آتا اور استفادہ کرتا تھا، لیکن انھوں نے کسی کے حضور دامن طلب دراز نہیں کیا۔ اپنی بوریا نشینی اور فقر کے مقابلے میں متاع دنیا کو ہمیشہ حقیر گردانا۔ قدرتی طور پر گھر کے تمام افراد کو بھی یہی تربیت حاصل ہوگئی تھی۔ وہ تکلیف برداشت کر لیتے تھے، مگر عالم آخرت کے مقابلے میں اس جہان فانی کی کسی شی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ان کی عسرت وغربت کا لوگوں کو بھی علم تھا، لیکن کسی کو کچھ پیش کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی اور ان کے جذبۂ استغنائے قلب اور عاطفہ توکل علی اللہ سے سب مرعوب تھے اور کچھ کہنے کی اپنے آپ میں ہمت نہ پاتے تھے۔

خواجہ میر درد کی یہی ادائے خاص تھی، جس کی وجہ سے ان کی ذاتی عظمت ورفعت، خودداری و بلند ہمتی، ان کے علم وفضل، فقر واستغنا، توکل وقناعت، زہد وتقویٰ اور عجز وانکسار کا سب معاصرین کھلے اور واضح الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں۔

ان کے زمانے میں سلطنت مغلیہ انتہائی اضمحلال کا شکار ہوگئی تھی۔ ہر طرف انتشار اور اختلال پھیلا ہوا تھا۔ شہر دہلی ملک کا دارالحکومت تھا، لیکن یہ شہر گوناگوں شورشوں اور سیاسی سازشوں کا شکار ہوگیا تھا۔ امن و امان مفقود ہو چکا تھا۔ اہل کمال معاشی بدحالی کا نشانہ بن چکے تھے اور علمائے دین کی قدر و منزلت میں انتہائی کمی واقع ہوگئی تھی، جس کی وجہ سے بے شمار اصحاب کمال اور ارباب علم ترک شہر کر کے مختلف علاقوں کے نوابوں کے پاس چلے گئے تھے، مگر جن اصحاب فضل وکمال اور شعرائے عالی مقام نے اس دورِ ابتلا میں بھی دہلی کو اپنا مسکن ٹھہرائے رکھا، ان میں خواجہ میر درد اور مرزا مظہر جانِ جاناں کے اسمائے گرامی خاص طور سے لائق تذکرہ ہیں۔ کسی موقعے پر بھی ان کے پائے استقلال میں جنبش نہیں آئی اور دنیوی عز وجاہ کے عارضی اسباب ان کے فقر و درویشی کی وسیع اور دائمی دولت پر غلبہ نہیں پا سکے۔ یہ تادمِ آخریں دہلی میں مقیم رہے اور ان کی ذات ہمیشہ مرجع خلائق رہی۔

تصانیف:

خواجہ میر درد جہاں تصوف وطریقت کے مرتبۂ بلند پر فائز تھے اور شعر وشاعری میں بے حد شہرت کے مالک تھے، وہاں وہ صاحب تصانیف بھی تھے۔ انھوں نے بارہ کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں، جن میں دیوان فارسی سمیت گیارہ کتابیں فارسی زبان میں ہیں اور ایک اردو دیوان ہے۔ ان کتابوں کا مختصر الفاظ میں تعارف درج ذیل ہے۔

۱۔ اسرار الصلوٰۃ: یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے۔ خواجہ ممدوح نے یہ اس وقت تصنیف کیا تھا، جب ان کی عمر

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صرف پندرہ سال تھی۔ اس کا سالِ تصنیف ۱۱۴۸ھ/ ۱۷۳۵ء ہے۔ یہ ان کی اولین تصنیف ہے۔ اس میں نماز کے ارکان ہفت گانہ ''سر'' کے عنوان سے الگ الگ تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ یہ رسالہ حضرت نواب سید صدیق حسن خاں مرحوم کے لائق فرزند نواب سید نورالحسن خاں مرحوم کی سعی جمیلہ سے اشاعت پذیر ہوا۔

۲۔ واردات: یہ کتاب ایک سو گیارہ ''واردات'' پر مشتمل ہے۔ ہر ''وارد'' کا الگ عنوان قائم کیا گیا ہے، مثلاً وارد اول کا عنوان ہے، ''فاتح الواردات' اور وارد ثانی کا عنوان ہے، ''نور من اللہ'' اس طرح دیگر واردات چلتی ہیں۔ اس کی وجہ تالیف خود خواجہ میر درد نے یہ بیان کی ہے کہ بسا اوقات غلبۂ حالات میں یعنی شدتِ مشاہدہ اور استیلاءِ تالّہ سے جو معانی قلب پر منکشف ہوتے تھے، وہ رباعیات کی شکل میں ڈھل کر زبان سے نکل پڑتے تھے۔ انہی رباعیات کے مجموعے کو ''واردات'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ کتاب مقامات معرفت وحقیقت کے بیان پر مشتمل ہے۔ ہر وارد کا ایک دیباچہ مرقوم ہے۔ آغاز اور اختتام پر ایک رباعی ہے اور دونوں رباعیوں کے درمیان نثر میں تشریحات اور تعلیقات بیان کی گئی ہیں۔ واردات کا سن تکمیل ۱۱۷۲ھ/ ۱۷۵۹ء ہے۔ اسی سال خواجہ کے والد بزرگ وار خواجہ محمد ناصر عندلیب نے وفات پائی اور اسی سال وہ انتالیس سال کی عمر میں باپ کی جگہ مسند رشد و ہدایت پر متمکن ہوئے۔

یہ کتاب بھی خواجہ صاحب کی دیگر تصانیف کی طرح نواب سید نورالحسن خاں مرحوم کی مہربانی سے شائع ہوئی۔

۳۔ علم الکتاب: یہ کتاب بھی نواب سید نورالحسن خاں مرحوم کی کوشش سے معرض طباعت میں آئی۔ اور خواجہ میر درد کی یہ سب سے ضخیم کتاب ہے جو ۶۴۸ صفحات پر محیط ہے۔ یہ کتاب درحقیقت رسالہ واردات کی شرح ہے۔ رسالہ واردات ایک سو گیارہ واردات پر مشتمل ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی اور شاگرد خواجہ محمد میر اثر کی فرمائش پر اس کی شرح سپرد قلم کی جسے ایک سو گیارہ رسائل میں منتقل کر دیا اور پھر اس مجموعے کو ''علم الکتاب'' کے نام سے موسوم کیا۔

نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم نے ''علم الکتاب'' کی بڑی تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ خواجہ میر درد کے علم الٰہی میں تبحر اور ان کے کمالاتِ معرفت کی حقیقت اس تصنیف سے واضح ہوتی ہے۔ جابجا طویل عربی عبارتیں بے تکلف غایت و بلاغت کے ساتھ مثلِ چشمۂ رواں ہیں۔ مطالب حقہ کا ہجوم ہے۔ آیات اور احادیث اس روانی اور آسانی سے ہر موقعے پر درج ہوتی جاتی ہیں کہ پڑھنے والے کا قلب ان کے انوار سے پُرنور و معمور ہوتا جاتا ہے۔ سلوک کے مسائل کو آیات و احادیث سے مجتہدانہ اور عارفانہ قوت کے ساتھ ثابت کیا ہے۔ خود خواجہ میر درد ''نالہ درد'' میں فرماتے ہیں کہ ''نالہ عندلیب'' اور ''علم الکتاب'' طریقہ محمدیہ کے سلوک کے لیے کافی ہیں۔ یہ کتاب متانت اور قوت تحریر میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی بہترین تصانیف کے ہم پلہ ہے۔

۴۔ نالہ درد: یہ کتاب خواجہ ممدوح نے ۱۱۹۰ھ/ ۱۷۷۶ء میں مکمل کی۔ اس کے مقدمے میں وہ لکھتے ہیں کہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علم الکتاب ختم ہونے کے بعد جو نئے مطالب ان کے قلب وذہن پر وارد ہوئے، ان کو ان کے چھوٹے بھائی خواجہ میر اثر جمع کرنے لگے۔ جب یہ مجموعہ مکمل ہوگیا تو ''نالہ درد'' اس کا نام رکھا۔ یہ رسالہ ۱۲۱ صفحات کو محتوی ہے، اس کی طباعت بھی نواب سید نورالحسن خاں صاحب کی توجہِ خاص کی مرہون منت ہے۔

۵۔ آہ سرد: اس کا سن تکمیل ۱۱۹۳ھ/ ۱۷۷۹ء ہے۔ ۶۴ صفحات کا مختصر رسالہ ہے۔ اس کی طباعت بھی نواب سید نورالحسن خاں صاحب کی وجہ سے ہوئی۔

۶۔ شمع محفل: اس رسالے کی تصنیف کا آغاز انھوں نے اپنی عمر کے باسٹھویں سال یعنی ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء میں کیا تھا، اس کی تصنیف سے وہ ۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۵ء میں فارغ ہوئے، جب کہ ان کی عمر چھیاسٹھ برس کو پہنچ گئی تھی۔ یہ رسالہ اگرچہ ۱۲۶۷ھ میں مطبع کریمی سہسرام سے چھپ چکا تھا، تاہم نواب سید نورالحسن خاں صاحب نے دوبارہ شائع کرایا۔

۷۔ درد دل: اس کی اور شمع محفل کی تالیف کا آغاز ایک ہی سال (۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء) میں کیا گیا تھا اور اختتام بھی ایک ہی سال (۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۵ء) میں ہوا۔ دونوں رسالوں کی دوبارہ طباعت نواب سید نورالحسن خاں مرحوم کی کوشش اور توجہ سے ہوئی۔

۸۔ حرمت غنا: غنا کی حلت اور حرمت کی بحث میں ہے۔

۹۔ واقعات درد: مسائل تصوف پر مشتمل ہے۔

۱۰۔ سوز دل: یہ بھی تصوف وطریقت کے مسائل پر محیط ہے۔

۱۱۔ دیوان فارسی: خواجہ میر درد کا یہ فارسی دیوان اگرچہ مختصر ہے، لیکن لطافت وحلاوت، پختگی اور زورِ بیان میں اپنی مثال آپ ہے۔ یہ دیوان بھی خواجہ ممدوح کی دیگر تصانیف کی طرح نواب سید نورالحسن خاں کی مالی اعانت سے ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۲ء میں مطبع انصاری دہلی سے طبع ہوکر شائع ہوا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

شد منشاء ظہور دو عالم وجود ما ۔۔۔ جوشید نشأ تین ز جوش شرابِ ما

جوش زد بادۂ توحید بہ میخانۂ ما ۔۔۔ بحر دارد بہ گرہ قطرہ پیمانۂ ما
بے خودی پردہ کشائے حرم دل باشد ۔۔۔ بستہ احرام رہش لغزشِ مستانۂ ما
زینت و زیب زنان باد مبارک بزبان ۔۔۔ سازِ دنیا نکند ہمت مردانۂ ما

او دلبر و دل آزار مادل زدست دادہ ۔۔۔ یارب چہ پیش آمد آمادۂ بلائیم
ما از وفا نہ پرسیم تواز جفا نگوئی ۔۔۔ تاچند آزمائی تا چند آزمائیم

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

برسر کوئے تو ام یک بار باید گریست
ابر تاداند کہ ایں مقدور می باید گریست
نے دوائے راست می آید، نہ جاں ہم می رود
درد برحال من بیمار می باید گریست

ایک رباعی ملاحظہ کیجیے، کتنی عمدہ ہے:

برہستی خود اعتمادے می کن
نے بہر کس قصد فسادے می کن
چندے اگرت زمانہ ایں جادارد
خاکے شو وانتظار بادے می کن

۱۲۔ دیوان اردو: خواجہ میر درد کا اردو دیوان کئی مرتبہ چھپ چکا ہے۔ آخری اشاعت (۱۹۶۲ء) مجلس ترقی ادب لاہور کی ہے، جو جناب خلیل الرحمٰن داؤدی کے پُر از معلومات مقدمے کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ دیوان اردو کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

گزروں ہوں جس خرابے پہ کہتے ہیں واں کے لوگ
ہے کوئی دن کی بات یہ گھر تھا، یہ باغ تھا

مت جا ترو تازگی پہ اس کی
عالم تو خیال کا چمن ہے

اس زیست کا اعتبار کیا ہے
کوئی دم میں یہ زندگی ہوا ہے

قلبی واردات کے بارے میں درد کے یہ اشعار پڑھیے:

کچھ ہے خبر تجھے بھی کہ اٹھ اٹھ کر رات کو
عاشق تری گلی میں کئی بار ہو گیا

ہم جانتے ہیں درد اندھیرے میں رات کو
تو لگ رہا ہے کوچے میں جس گھات کے لیے

تم آکر جو پہلے ہی مجھ سے ملے تھے
نگاہوں میں جادو سا کچھ کر دیا تھا

یک بیک نام لے اٹھا میرا
جی میں کیا اس کے آ گیا ہو گا

دو رباعیاں پڑھنے کے قابل ہیں:

کیا جانیے کیا دل پہ مصیبت یہ پڑی ہے
ایک آگ سی کچھ ہے کہ وہ سینے میں گڑی ہے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس طرح سے اک لخت جو آنسو نہیں تھمتے — معلوم ہوا درد کہیں آنکھ لڑی ہے

دو نگاہیں جو چار ہوتی ہیں — برچھیاں دل کے پار ہوتی ہیں
بے وفائی پہ اس کی مت جا تو — ایسی باتیں ہزار ہوتی ہیں

غزلیات کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

دل مرا پھر دکھایا کس نے — سو گیا تھا، جگا دیا کس نے
وہ مرے چاہنے کو کیا جانے — یہ سندیسا سنا دیا کس نے
وہ بلائے سے بھاگتا تھا اور — درد تجھ تک بلا دیا کس نے

گل و گلزار خوش نہیں آتا — باغ بے یار خوش نہیں آتا
کیا جفا کے سوا تجھے کچھ اور — اے ستم گار! خوش نہیں آتا
درد ہم کو یہ رات دن تیرا — نالۂ زار خوش نہیں آتا

سب کے ہاں تم ہوئے کرم فرما — اس طرف کو کبھو گزر نہ کیا
کیوں بھویں تانتے ہو بندہ نواز — سینہ کس وقت میں سپر نہ کیا
کتنے بندوں کو جان سے کھویا — کچھ خدا کا بھی تو نے ڈر نہ کیا
دیکھنے کو رہے ترستے ہم — نہ کیا رحم تو نے پر نہ کیا
کون سا دل ہے وہ کہ جس میں آہ — خانہ آباد تو نے گھر نہ کیا
تجھ سے ظالم کے سامنے آیا — جان کا میں نے کچھ خطر نہ کیا

جتنی بڑھتی ہے اتنی گھٹتی ہے — زندگی آپ ہی آپ کٹتی ہے
زلف کی کج ادائیاں دیکھو — ہر گھڑی منہ سے جا لپٹتی ہے
آج ہے آہ کی ہوا کچھ اور — دیکھیے کس طرف پلٹتی ہے

کچھ اور اشعار ملاحظہ کیجیے:

بند و دل حسرتوں سے چھا گیا — بس، ہجومِ یاس، جی گھبرا گیا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حال مجھ غم زدے کا جس تس نے
جب سنا ہو گا رو دیا ہو گا

درد کا حال کچھ نہ پوچھو تم
وہ ہی رونا ہے، نت وہی غم ہے

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا
ہم سبھی مہمان تھے یہاں، اک تو ہی صاحب خانہ تھا

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

حیف! کہتے ہیں ہوا گلزار تاراجِ خزاں
آشنا اپنا بھی واں اک سبزۂ بیگانہ تھا

ہو گیا مہماں سرائے کثرتِ موہوم آہ
وہ دلِ خالی کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھا

بھول جا، خوش رہ، عبث وے سابقے مت یاد کر
درد یہ مذکور کیا ہے آشنا تھا یا نہ تھا

کس کی یہ چشم مست نے بزم کو یوں جھکا دیا
مثلِ حباب سرنگوں شرم سے ہر ایاغ ہے

جلتے ہی جلتے صبح تک، گزری ہے تمام شب
دل ہے کہ شعلہ ہے کوئی، شمع ہے یا چراغ ہے

پایئے کس جگہ بتا، اے بت بے وفا تجھے
عمر گزشتہ کی طرح گم ہی سدا سراغ ہے

سیرِ بہار و باغ سے، ہم کو معاف کیجیے
اس کے خیالِ زلف سے درد کسے فراغ ہے

وفات:

خواجہ میر درد نے چھیاسٹھ سال عمر پا کر بروز جمعہ ۲۴ رصفر ۱۱۹۹ھ/ ۶ رجنوری ۱۷۸۵ء کو دہلی میں وفات پائی۔ انھوں نے اپنی موت کی خود پیش گوئی کی تھی جو بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء میں خواجہ صاحب نے دو رسالے (شمع محفل اور دردِ دل) بہ یک وقت ضبط تحریر میں لانا شروع کیے تھے۔ ان دونوں کی تکمیل ۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۵ء میں ہوئی۔ ''دردِ دل'' کے آخر میں خود خواجہ صاحب رقم فرماتے ہیں کہ اب میری عمر کا چھیاسٹھواں سال ہے، اور سن ۱۱۹۹ھ ہے، جو سال اس رسالے کی تکمیل کا ہے، وہی سال میری وفات کا ہے۔ اسے قدرت خداوندی کہیے کہ خواجہ صاحب نے اسی سال رحلت فرمائی۔ ان کی قبر پر یہ الفاظ کندہ ہیں: ''رحلت ۲۴ رصفر ۱۱۹۹ھ یوم جمعہ قبل صبح صادق۔''

خواجہ صاحب مرحوم، دہلی میں ترکمان دروازے کے باہر اپنے والد بزرگ وار خواجہ محمد ناصر عندلیب کے قریب مدفون ہیں۔ آج کل اس مقام کو ''باغیچہ میر درد'' کہتے ہیں۔ یہ جگہ شہر پناہ کے باہر شاہ جی کے تالاب سے ملی ہوئی ہے [1]۔

[1] مقدمہ دیوان اردو، ص ۸۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اولاد:

خواجہ میر درد کے ایک ہی بیٹے تھے، جن کا نام خواجہ ضیاء الناصر تھا اور وہ آلم تخلص کرتے تھے۔ ان کے علاوہ دو لڑکیاں تھیں۔

خواجہ درد کی وفات کے بعد ان کے چھوٹے بھائی اور شاگرد خواجہ محمد میر آثر مسند نشین ہوئے۔ میر اثر کی وفات کے بعد درد کے صاحب زادے خواجہ ضیاء الناصر آلم نے مسند رشد و ہدایت کو زینت بخشی۔ ان کے بعد خواجہ محمد نصیر رنج نے یہ خدمت قبول کی۔ اس طرح یہ سلسلہ خواجہ میر درد کے خاندان میں جاری رہا❶۔

شاگرد:

خواجہ میر درد کے شاگردوں اور ان سے استفادہ کرنے والوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا، جن میں مسلمان بھی شامل تھے اور ہندو بھی۔ مسلمانوں میں ان کے شاگرد مندرجہ ذیل حضرات تھے۔

۱۔ شیخ محمد قیام الدین قائم چاند پوری (متوفی ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۷ء)

۲۔ ہدایت اللہ خاں ہدایت دہلوی (متوفی ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء)

۳۔ حکیم ثناء اللہ خاں فراق دہلوی (متوفی قبل از ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء)

خواجہ محمد میر اثر: یہ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کے مرید اور شاگرد بھی تھے۔ نیک اور متوکل علی اللہ بزرگ تھے۔ خواجہ صاحب کی وفات کے بعد مسند نشین ہوئے۔

لالہ سری رام دہلوی اپنی تصنیف خم خانۂ جاوید میں لکھتے ہیں:

"خواجہ میر درد کے عالم ضعیفی میں ان کے ایک مرید نے عرض کی کہ دنیا دارِ فانی ہے اور حضرت کا وقتِ آخر، حضور فرمائیں کہ آپ کے بعد کس کو آپ کا جانشین اور صاحبِ سجادہ مانا جائے۔ آپ یہ سن کر آنسو بھر لائے اور جواباً یہ قطعہ پڑھا:

موت کیا ہم سے فقیروں سے تجھے لینا ہے — مرنے سے پہلے ہی یہ لوگ تو مر جاتے ہیں
تاقیامت نہیں مٹنے کے دلِ عالم سے — درد ہم اپنے عوض چھوڑے اثر جاتے ہیں❷

چنانچہ میر اثر ہی کو ان کا جانشین مقرر کیا گیا۔

۵۔ میر محمد علی بیدار، عرف میر محمدی (متوفی ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۵ء)

۶۔ مرزا محمد اسماعیل طپش عرف مرزا حاجی: دہلی کے باشندے تھے، لیکن بعد میں لکھنؤ چلے گئے تھے۔

۷۔ محمد پناہ خاں، جو پہلے نثار تخلص کرتے تھے، بعد میں حکیم تخلص کرنے لگے تھے۔

---

❶ مقدمہ دیوان اردو، ص ۸۴۔

❷ خم خانۂ جاوید، ج ۱، ص ۱۱۲ (مطبوعہ ۱۹۰۸ء)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۸۔ خواجہ ضیاء الناصر الم: یہ خواجہ میر درد کے فرزند بھی تھے اور شاگرد بھی۔

ہندوؤں میں ان کے شاگرد مندرجہ تحت حضرات تھے:

۱۔ نرائن داس بیخود دہلوی: دہلی کے مشہور مہاجن تھے۔

۲۔ چھمن ناتھ جھمن: دہلی کے باشندے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

۳۔ لالہ بال مکند حضور: دہلی کے کھتری تھے۔ فارسی کے ماہر اور عربی سے آشنا تھے۔

۴۔ بھکاری لال عزیز دہلوی: بڑے خوش گو شاعر تھے۔

۷۰۔ قاضی خلیل اللہ حیدر آبادی

قاضی خلیل اللہ بن قاضی بابا بن آ قا رضی حسینی رضوی بخاری ثم حیدر آبادی۔ حیدر آباد (دکن) میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ ان کے والد قاضی بابا عالم دین بزرگ تھے، لائق بیٹے نے ان سے اور دیگر علمائے عصر سے اخذ علم کیا، اور اپنے دور کے نامور فقہا میں گردانے گئے۔ قاضی بابا، حیدر آباد کی مسند قضا پر متمکن تھے۔ ان کی وفات کے بعد یہ منصب ان کے بیٹے قاضی خلیل اللہ کے سپرد ہوا۔ قاضی خلیل اللہ، معاملات قضا میں نہایت اچھی شہرت کے مالک تھے۔ اللہ سے ڈرنے والے، متواضع اور عبادت گزار۔ ہمیشہ ذکر الٰہی اور اطاعت رسول ﷺ میں مشغول رہتے۔

بارھویں صدی ہجری کے اس عالم وفقیہ نے ۲۱ رجب ۱۱۵۲ھ/۱۳ اکتوبر ۱۷۳۹ء کو حیدر آباد میں وفات پائی ❶۔

۷۱۔ شیخ خوب محمد گجراتی

شیخ خوب محمد چشتی احمد آبادی گجراتی، اپنے زمانے کے عالم اور فقیہ تھے۔ معرفت وطریقت میں بھی کامل تھے اور علاقۂ گجرات کے مشاہیر مشائخ میں سے تھے۔ انھوں نے بام جہاں نما کی شرح لکھی اور تصوف کے موضوع پر کئی رسالے تصنیف کیے۔ ۲۴ شوال ۱۱۰۳ھ/ ۲۹ جون ۱۶۹۲ء کو احمد آباد میں فوت ہوئے ❷۔

۷۲۔ قاضی خیر اللہ جون پوری

قاضی خیر اللہ بن مبارک بن ابوالبقا حسینی واسطی جون پوری، بارھویں صدی ہجری کے یہ عالم وفقیہ شہر جون پور میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اپنے والد گرامی سید مبارک سے جو اس نواح کے جلیل القدر عالم

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۸۱۔ محبوب ذی المنن، حصہ دوم، ص ۶۲۸، ۶۲۹۔

❷ مرآۃ احمدی، ج ۲، ص ۱۰۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۸۱۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھے، اخذ علم کیا۔ نہایت ذہین اور طباع تھے۔ علوم متداولہ میں اس قدر دست رس حاصل کی کہ ان کا شمار کبار علما و فقہا کے زمرے میں ہونے لگا۔ وسعت معلومات کی بنا پر جون پور کے قاضی مقرر کیے گئے۔ علم و مطالعہ کا شوق طبیعت پر غالب تھا۔ زیادہ تر وقت درس و افادہ میں صرف کرتے❶۔

—— د ——

۷۳۔ سید درگاہی بلگرامی

سرزمین بلگرام علم و فضل اور معرفت و طریقت کے لحاظ سے نہایت شہرت کی حامل ہے۔ اس مردم آفرین خطے میں بے شمار علمائے عظام اور فقہائے عالی مقام پیدا ہوئے اور انھوں نے بڑی علمی خدمات انجام دیں۔ ان میں بارھویں صدی ہجری میں جن حضرات نے جنم لیا، ان میں سید درگاہی کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔

ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے:

سید درگاہی بن سید عبدالخیر بن سید درویش بن سید حاتم بن سید بدرالدین حسینی واسطی بلگرامی۔ سید درگاہی کا مولد و منشا بلگرام ہے۔ ابتدائے عمر ہی میں حصول علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ اس کے لیے سفر کی صعوبتیں برداشت کیں اور قاضی علیم اللہ کچندوی (متوفی ۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء) اور دیگر علما کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تحصیل کی۔ یہاں تک کہ فقہائے حنفیہ کی نامور جماعت میں ان کا شمار ہونے لگا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد قاضی علیم اللہ کچندوی کے عم محترم شیخ عبدالرسول سے کسب طریقت کیا اور علم و معرفت میں درجۂ کمال کو پہنچے۔ بعد ازاں مراجعت فرمائے بلگرام ہوئے اور ہمہ تن درس و افادہ میں مصروف ہو گئے۔ اسی کارِ خیر میں اپنی تمام توانائیاں صرف کر دیں۔ ۱۱۱۰ھ/ ۱۶۹۹ء کے بعد بلگرام میں رحلت فرمائی❷۔

۷۴۔ مفتی درویش محمد بدایونی

مفتی درویش محمد عثمانی بدایونی فقہائے حنفیہ میں سے تھے۔ حافظ رحمت خاں کے عہد میں بریلی کے منصب افتا پر مامور تھے۔

حافظ رحمت خاں ۱۱۲۰ھ/ ۱۷۰۸ء میں پیدا ہوا، اور حالات نے کچھ ایسی کروٹ بدلی کہ وہ روہیل کھنڈ (یعنی بریلی، شاہ جہان آباد اور پیلی بھیت) کا حکمران بن گیا، واقعات کی رفتار بدلتی رہی تا آنکہ ۱۱۸۸ھ/ ۱۷۷۴ء میں حافظ رحمت خاں اور نواب شجاع الدولہ کے درمیان کڑہ میراں پور کے مقام پر جنگ ہوئی۔ نواب

❶ تجلی نور، ج ۲، ص ۷۱۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۳۴۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۸۲۔

❷ مآثر الکرام دفتر اول، ص ۸۵، ۸۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۸۳، تقصار جنود الاحرار، ص ۲۰۷۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شجاع الدولہ کی اعانت کے لیے وارن ہیسٹنگز نے کرنل چمپئن کی سپہ سالاری میں انگریزی فوج روانہ کی۔ سخت مقابلہ ہوا اور حافظ رحمت خاں مارا گیا۔

حافظ رحمت خاں نہایت عادل، نیک اور رحم دل حکمران تھا۔ غریبوں کا حامی، مظلوموں کا مددگار اور علما وفضلا کا قدر دان تھا۔ اس کے عہد حکومت میں ہر طرف امن وامان تھا۔ اس نے علما کی بڑی سرپرستی کی، وہ پانچ ہزار علما کو اپنے خزانے سے وظائف ادا کرتا تھا۔ حافظ قرآن تھا اور اصحابِ فضل وکمال سے بہتر سلوک روا رکھتا تھا۔ مفتی درویش محمد بدایونی اس کے عہد میں بریلی کے منصب افتا پر فائز تھے ❶۔

۷۵۔ شیخ رحمت اللہ لکھنوی

شیخ رحمت اللہ بن غلام محمد بکری بجنوری لکھنوی اپنے زمانے کے نامور عالم، فقیہ اور صوفی تھے۔ انھوں نے مشائخ کے حالات میں ''تذکرۃ الاصفیا'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ سال تصنیف ۱۱۱۶ھ/۱۷۰۴ء اور مقام تصنیف لکھنؤ ہے ❷۔

۷۶۔ شیخ رحمت اللہ کشمیری

شیخ رحمت اللہ بن محمد مقیم بن مومن کشمیری، کشمیر میں پیدا ہوئے اور اسی سرزمین میں تربیت پائی۔ مولانا محمد محسن کشمیری (متوفی ۱۱۸۱ھ/ ۱۷۶۷ء) کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا۔ پھر خود مسند درس آراستہ کی اور سرگرم تدریس ہوئے۔ دیار کشمیر کے معروف عالم اور یگانہ فقیہ تھے۔ ذکی، فطین اور عابد وزاہد عالم تھے۔ ۱۱۶۳ھ/ ۱۷۵۰ء میں داعی اجل کو لبیک کہا ❸۔

۷۷۔ مولانا رستم علی قنوجی

مولانا رستم علی بن علی اصغر صدیقی قنوجی، عالم کبیر اور شیخ وقت تھے۔

۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء کو قنوج میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ اپنے والد مولانا علی اصغر صدیقی قنوجی سے، جو نامور عالم دین تھے اور جن کا سلسلہ درس جاری تھا، حصول علم کا آغاز کیا، زیادہ تر کتب درسیہ انھی سے

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۸۳۔ تاریخ فرخ آباد۔ حیات حافظ رحمت خاں۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۸۴۔

❸ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۲۶۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۸۵۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پڑھیں۔ جب (۱۵ر شعبان ۱۱۴۰ھ/ ۱۶ر مارچ ۱۷۲۸ء) کو والد وفات پا گئے تو عازم لکھنؤ ہوئے۔ وہاں استاذ الاساتذہ شیخ نظام الدین بن قطب الدین انصاری سہالوی کا ہنگامۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے، اور باقی کتابیں انہی سے پڑھیں۔ ۱۱۴۲ھ/ ۱۷۳۰ء میں فارغ التحصیل ہو کر قنوج واپس گئے اور اپنے والد کے مدرسے میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اپنے بھائی مولانا محمد کامل قنوجی (متوفی ۱۱۴۶ھ/ ۱۷۳۳ء) سے جو کبار علمائے عصر میں سے تھے، طریقہ نقشبندیہ میں فیض حاصل کیا۔

مولانا رستم علی قنوجی درس و تدریس اور علم و فضل میں مرتبہ امامت پر فائز تھے۔ درس و افادہ اور تصنیف و تالیف کے علاوہ ان کا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ بہترین مدرس اور بہترین مصنف تھے۔ عمر کے آخری دور میں جب کہ مرہٹوں نے قنوج پر تسلط حاصل کر لیا تھا، مولانا ممدوح قنوج سے فرخ آباد چلے گئے تھے۔ وہاں سے بریلی منتقل ہو گئے۔ اس نواح کا حکمران حافظ رحمت خاں تھا جو علما کا قدر دان تھا، اس نے ان کی بہت تکریم کی اور نہایت احترام سے پیش آیا۔ پھر انھوں نے بریلی ہی میں سکونت اختیار کر لی اور وہیں وفات پائی۔

مولانا رستم علی قنوجی مفسر قرآن بھی تھے۔ ایک طویل مضمون کو مختصر الفاظ میں بیان کرنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ انھوں نے تفسیر ''جلالین'' کے انداز پر قرآن مجید کی مختصر تفسیر لکھی، نیز ''نور الانوار شرح منار الاصول'' کا اختصار سپرد قلم کیا۔

اس عالم دین نے ۱۱۷۸ھ/ ۱۷۶۵ء کو بریلی میں انتقال کیا اور تدفین بھی وہیں ہوئی، لیکن چھ ماہ بعد ان کی میت کو بریلی سے قنوج لایا گیا اور اپنے والد مولانا علی اصغر علی صدیقی کے قریب دفن کیا گیا [1]۔

ــــــ ز ــــــ

۷۸۔ شیخ زین العابدین سرہندی

حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے خاندان کا ہر فرد علم فضل میں یگانۂ روزگار تھا۔ اللہ نے اپنی رحمت بے پایاں سے اس خاندان کو جس نعمت عظمیٰ سے نوازا، وہ دیار ہند کے چند ہی خاندانوں کے حصے میں آئی ہوگی۔ اس دودمانِ بلند مرتبت کے ایک بزرگ شیخ زین العابدین سرہندی تھے، جو حضرت مجدد الف ثانی کے پوتے اور شیخ محمد یحییٰ کے فرزند گرامی تھے۔

شیخ زین العابدین سرہندی ۱۰۷۴ھ/ ۱۶۶۴ء کو سرہند میں پیدا ہوئے اور علم و ارشاد کی گود میں تربیت پائی۔ شیخ حجت اللہ نقشبندی سرہندی سے کسب علم اور اخذ طریقت کیا۔ طویل عرصے تک ان سے منسلک رہے،

[1] تذکرۂ علمائے ہند، ص ۶۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۸۶، ۸۷۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۹۔ ابجد العلوم، ص ۹۳۲۔ خزینۃ الاصفیاء، ج ۲، ص ۳۷۲، ۳۷۳۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہاں تک کہ فقہ و اصول اور تصوف میں ماہر ہوئے، بہت سے فضائل باطنی اور کمالات ظاہری سے دامن بھرا۔ پھر تدریس وارشاد میں سرگرم عمل ہوئے۔ اس اثنا میں متعدد علما و فضلا نے ان سے استفادہ کیا۔

اس جلیل القدر عالم دین اور ماہر معقولات و منقولات نے ماہ رمضان المبارک کے آخری دن ۱۱۲۸ھ/ ۶ر ستمبر ۱۷۱۶ء کو سرہند میں رحلت فرمائی۔ وفات کے وقت ان کی عمر چون (۵۴) برس تھی ❶۔

ـــــ س ـــــ

۷۹۔ سید سعد الدین بلگرامی

سید سعد الدین بن سید جمال الدین بن سید مربی بن سید عبد النبی حسینی واسطی بلگرامی بارھویں صدی ہجری کے علمائے مشاہیر میں سے تھے۔ مرکز علم و عرفان بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ سید نعمت اللہ بلگرامی (متوفی ۵ر رمضان المبارک ۱۱۴۰ھ/ ۴ر اپریل ۱۷۲۸ء) سے علم حاصل کیا۔ پھر تلاش معاش کی غرض سے امرا و ملوک کی ملازمت کے لیے بلگرام سے نکلے اور عرصے تک اپنے مولد و مسکن سے باہر رہے۔ بعد ازاں وطن واپس لوٹے اور لوگوں سے منقطع ہو کر افادۂ طلبا اور مطالعہ کتب میں مصروف ہو گئے ❷۔

۸۰۔ مولانا سعد الدین کشمیری

مولانا سعد الدین بن مولانا امان اللہ شہید بن خیر الدین کشمیری، ۱۱۲۷ھ/ ۱۷۱۵ء میں پیدا ہوئے اور اپنے والد مکرم مولانا امان اللہ شہید (۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۹ء) کے سامنے زانوئے تلمذ کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس و تدریس کو اپنا مشغلہ ٹھہرایا اور ارض کشمیر کے کبار فقہا میں گردانے گئے۔ عالم شباب ہی میں علمی دنیا میں شہرت حاصل کر لی تھی، اور لوگ دور دور سے سفر کر کے ان کی خدمت میں آنے لگے تھے۔ بہترین مناظر بھی تھے۔ اکثر مباحث میں حریف پر بازی لے جاتے۔ بہت سے علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا اور بے شمار لوگ فیض یاب ہوئے۔

مولانا سعد الدین کشمیری نے اپنے والد گرامی مولانا امان اللہ کی شہادت کے اڑتیس (۳۸) دن بعد عین عالم جوانی میں صرف چوبیس برس عمر پا کر ۲۳ر ذی الحجہ ۱۱۵۱ء/ ۲۳ر مارچ ۱۷۳۹ء کو سفر آخرت اختیار کیا ❸۔

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۹۲۔

❷ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۸۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۹۵۔

❸ حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۲، ۴۴۳۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۷۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۹۵، ۹۶۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۸۱۔ سید سعد اللہ سلونی

سید سعد اللہ بن سید عبدالشکور حسینی سلونی، مضافات الٰہ آباد کے ایک قصبے ''سلون'' کے باشندے تھے۔ صغرسنی ہی میں اکتساب علم میں مشغول ہو گئے تھے اور بہت جلد طلب علم کی منازل طے کر لی تھیں، یہاں تک کہ معقولات ومنقولات کے ماہرین اور فحول علمائے ہند میں شمار کیے گئے۔ دور شباب میں مسند تدریس آراستہ کر لی تھی اور درس وافادہ کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ تصوف وطریقت میں بھی کامل تھے اور اس ضمن میں اپنے والد بزرگ وار سید عبدالشکور سلونی سے اخذ فیض کیا تھا۔

کچھ عرصہ تو دیار ہند ہی میں ہنگامۂ درس وافادہ بپا کیے رکھا، بعد ازاں حجاز مقدس تشریف لے گئے۔ وہاں بارہ سال اقامت گزیں رہے۔ حجاز کے علما سے علم حدیث حاصل کیا اور پھر ایک مدت تک وہاں پڑھاتے رہے۔ حجاز سے واپس آ کر شہر ''سورت'' کو اپنا مسکن بنا لیا۔

اورنگ زیب عالم گیر سید سعد اللہ سلونی کی بے حد تکریم کرتا تھا۔ اس نے ان کو دو گاؤں بطور جاگیر عطا کیے، جن سے انھیں آٹھ لاکھ روپے سالانہ آمدنی ہوتی تھی۔ سلطان اورنگ زیب کے دل میں ان کا اس درجہ احترام تھا کہ وہ ان کو خط لکھتا تو ''سیدی وسندی'' کے الفاظ سے خطاب کرتا۔

سید سعد اللہ سلونی کی عادت تھی کہ وہ بادشاہ سے حاجت مند لوگوں کی سفارشیں کرتے اور کوشش فرماتے کہ ان کے کام مکمل ہو جائیں۔ بادشاہ ان کی بات مانتا اور اپنے ہاتھ سے خط کا جواب لکھتا۔ ایک مرتبہ انھوں نے بادشاہ سے ایک عامل کی سفارش کی۔ بادشاہ نے اپنے کاتب کو حکم دیا کہ شیخ کو یہ خط لکھا جائے کہ وہ ظالموں کی سفارش نہ کیا کریں۔ اس کے بعد بادشاہ نے ان کو اپنے ہاتھ سے خط لکھنا بند کر دیا تھا، لیکن وہ برابر بادشاہ کو خط لکھتے رہے۔

سید سعد اللہ اپنے مکتوبات میں سلطان اورنگ زیب کو اہل بیت کے ائمہ اثنا عشرہ سے محبت رکھنے کی بھی تاکید فرماتے۔ جب اس سلسلے میں انھوں نے بار بار خط لکھے تو بادشاہ نے حاضرین دربار سے کہا کہ سید سعد اللہ سلونی مجھے جو محبت اہل بیت کی تلقین فرماتے ہیں، یہ تو بالکل صحیح ہے، لیکن اہلِ سنت کے نزدیک تو امامت بارہ اماموں میں منحصر نہیں ہے۔

سید سعد اللہ متعدد کتابوں کے مصنف اور شارح بھی تھے اور معقولات ومنقولات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کی تصانیف میں یہ کتابیں شامل ہیں: تعلیقات، ''حاشیہ قدیمہ وجدیدہ'' منطق میں رسالہ آداب البحث، فقہ میں ''یمین الوصول'' پر حاشیہ، رسالہ در ثبوت مذہب شیعہ، مثنوی معنوی کے چالیس اشعار کی شرح، حاشیہ بر ہدایۃ الحکمۃ، کشف الحق اور تحفۃ الرسول وغیرہ متعدد کتب ورسائل۔

دیار ہند کے اس عالم نے ۲۷ ر جمادی الاولیٰ ۱۱۳۸ھ / ۲۰ ر جنوری ۱۷۲۶ء کو شہر سورت میں وفات پائی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور وہیں مدفون ہیں ❶۔

مولوی فقیر محمد جہلمی نے حدائق الحنفیہ میں سید سعد اللہ کا سن وفات ۱۰۳۸ھ/۱۷۲۶ء لکھا ہے اور انھیں گیارھویں صدی ہجری کے علمائے کرام میں شامل کیا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ صحیح یہ ہے کہ وہ بارھویں صدی ہجری کے علما میں سے تھے اور ۲۷؍ جمادی الاولیٰ ۱۱۳۸ھ/ ۲۰؍ جنوری ۱۷۲۶ء کو فوت ہوئے۔

۸۲۔ شیخ سلطان محمد کرمانی

شیخ سلطان محمد کرمانی دہلوی کا شمار فقہائے حنفیہ میں ہوتا تھا۔ سید حسن نارتولی دہلوی مشہور بہ ''رسول نما'' کے شاگرد تھے۔ طویل عرصے تک ان کی صحبت ورفاقت میں رہے اور درس وافادہ طلبا کو اپنا مشغلہ قرار دیے رکھا ❷۔ بارھویں صدی ہجری کے اس ہندی عالم وفقیہ کے اس سے زیادہ حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

۸۳۔ سید سلطان مقصود کالپوی

سید سلطان مقصود بن احمد بن محمد حسینی ترمذی شہر کالپی میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو حصول علم کے لیے بلگرام کا عزم کیا اور شیخ سعد اللہ بن مرتضیٰ بلگرامی سے کتب درسیہ کی تحصیل کی۔ اور اپنے دور کے عالم وفقیہ اور علم نحو اور علوم عربیہ کے ماہر مانے گئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس وافادہ میں سرگرم ہوئے۔ بعض درسی کتابوں پر مفید تعلیقات وحواشی قلم بند کیے، میبذی کی شرح ہدایۃ الحکمۃ پر حاشیہ، شہاب الدین دولت آبادی کی شرح قصیدہ بردہ پر حاشیہ۔

سید سلطان مقصود کالپوی نے ماہ صفر ۱۱۲۳ھ/ مارچ ۱۷۱۱ء کو وفات پائی ❸۔

۸۴۔ شیخ سیف اللہ بخاری دہلوی

شیخ سیف اللہ بخاری ارض ہند کے جلیل القدر محدث اور فقیہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ کے پڑپوتے تھے۔ شیخ ممدوح تک ان کا سلسلۂ نسب اس طرح پہنچتا ہے: سیف اللہ بن نور اللہ بن نورالحق بن عبدالحق محدث بخاری دہلوی۔ حدیث وفقہ کے اجل علما میں سے تھے۔ فارسی میں شمائل ترمذی کی شرح لکھی اور اسے ''اشرف الوسائل فی شرح الشمائل'' کے نام سے موسوم کیا۔ یہ شرح انھوں نے ۱۰۹۱ھ/۱۶۸۰ء میں اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں لکھی ❹۔

❶ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۰۷، ۲۰۸۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۷۳۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۰۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۹۶، ۹۷۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۹۹، بحوالہ بحر زخار۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۹۹، ۱۰۰۔

❹ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۰۲، بحوالہ مرآۃ الحقائق۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ش

۸۵۔ مفتی شرف الدین لکھنوی

مفتی شرف الدین بن محی الدین لکھنوی اعظمی کا مولد و منشا لکھنؤ ہے۔ کافی عرصے تک اپنے والد مکرم مولانا محی الدین لکھنوی سے علم حاصل کرتے رہے، جو اس دور کے معروف علما میں سے تھے۔ پھر کورہ تشریف لے گئے۔ وہاں شیخ لطف اللہ کوروی کا سلسلۂ درس جاری تھا، ان سے درسی کتابوں کی تحصیل کی۔ بعد ازاں شیخ غلام نقشبند بن عطاء اللہ لکھنوی سے تفسیر بیضاوی پڑھی، اخذ طریقت بھی انہی سے کیا، یہاں تک کہ علم فقہ اور دیگر علوم میں مہارت پیدا کر لی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد، اس دور کے مغل حکمران اورنگ زیب عالم گیر سے قرب حاصل کیا۔ اس نے ان کے علم و فضل اور تحقیق و کاوش سے متاثر ہو کر چار صدی کے منصب سے نوازا اور بعض خدمات شرعیہ انجام دینے پر مامور کیا۔ سلطان محمد شاہ کے عہد تک اس منصب پر فائز رہے۔ پھر ان کو تین ہزاری کا منصب عطا کیا گیا۔ سالہا سال تک اس منصب سے مفتخر رہے۔

مفتی شرف الدین لکھنوی متعدد کتابوں کے مصنف و شارح بھی تھے، جن میں حاشیہ شرح المواقف اور حاشیہ تفسیر بیضاوی شامل ہیں۔

بارھویں صدی ہجری کے اس ہندی عالم و فقیہ نے ۲۷ ر ذی الحجہ ۱۱۳۳ھ / ۳۰ ر ستمبر ۱۷۲۱ء کو منیر میں وفات پائی [1]۔

۸۶۔ شیخ شکر اللہ جون پوری

شیخ شکر اللہ بن نور اللہ جنیدی جون پوری، شیخ معروف اشرف کی اولاد سے تھے، جن کا سلسلۂ نسب شیخ جنید ابوالقاسم بغدادی کی طرف منتہی ہوتا ہے۔ شیخ شکر اللہ کے پردادے کا نام اللہ داد، تھا۔ وہ جس گاؤں میں سکونت پذیر تھے، اس کا نام مخدوم پور تھا۔ شیخ اللہ داد، مخدوم پور سے نقل مکانی کر کے ایک اور گاؤں اللہ داد پور چلے گئے تھے۔ پھر ان کے والد گرامی، اللہ داد پور کی سکونت ترک کر کے، ایک دوسرے گاؤں حمزہ پور میں منتقل ہو گئے تھے، جو صوبہ یوپی میں اعمال دیمو میں واقع تھا۔ حمزہ پور ہی میں شکر اللہ کی ولادت ہوئی اور وہیں نشو و نما پائی۔ بعد ازاں جون پور گئے اور وہاں رشیدیہ کے مصنف شیخ محمد رشید عثمانی کے مدرسے میں داخل ہوئے اور کتب درسیہ کی تکمیل کی۔ پھر اپنے والد گرامی شیخ نور اللہ کے حکم کے مطابق سلطان اورنگ زیب عالم گیر کی فوجی چھاؤنی میں چلے گئے جو اس زمانے میں بیجاپور میں تھی۔ بیجاپور سے اورنگ آباد کا قصد کیا۔ وہاں ان کے چچا محمد

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۰۴، ۱۰۵ بحوالہ باغ و بہار۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زاہد مقیم تھے، ان کے پاس رہنے لگے۔ محمد زاہد، عالم آدمی تھے، ان سے مشکوٰۃ المصابیح کا درس لیا۔ اورنگ آباد سے پھر جون پور کا عزم فرمایا۔ جون پور میں شیخ محمد رشید عثمانی کے صاحب زادۂ گرامی شیخ محمد ارشد سے اخذ طریقت کیا اور پھر تمام عمر انہی کی خدمت میں رہے۔

شیخ شکر اللہ جون پوری، عالم وفقیہ، زاہد و عابد اور صاحب حسن اخلاق تھے۔ انھوں نے اپنے شیخ و مرشد محمد ارشد جون پوری کے ملفوظات بھی جمع کیے، جو کافی ضخیم ہیں۔ بعد ازاں ان ملفوظات کو ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۳ء میں شیخ محمد ارشد کے پوتے شیخ غلام رشید بن محب اللہ بن محمد ارشد عثمانی (متوفی ۵ رصفر ۱۱۶۷ھ/ ۲ر دسمبر ۱۷۵۳ء) نے مرتب کیا۔ گنج ارشدی کی ترتیب کے وقت اس کے جامع شیخ شکر اللہ جون پوری زندہ تھے ❶۔

۸۷۔ شیخ شمس الدین جون پوری

شیخ شمس الدین بن ملا انگنون صدر جہاں جون پوری، عالم وفقیہ تھے، مسلکاً حنفی تھے اور اپنے شہر جون پور کے نامور فقہا میں سے تھے۔

شمس الدین جون پور میں پیدا ہوئے، وہیں نشو ونما پائی اور اپنے والد گرامی ملا انگنون صدر جہاں جون پوری اور ملا محمد عسکری جون پوری کے سامنے زانوے شاگردی تہہ کیا۔ ان کے والد منصب صدر جہانی پر فائز تھے۔ ان کی وفات کے بعد خود اس منصب پر متمکن ہوئے۔

صالح، متدین اور عمدہ سیرت کے عالم دین تھے۔ کثیر الدرس والافادہ تھے ❷۔

۸۸۔ قاضی شہاب الدین گوپاموی

قاضی شہاب الدین بن محمد حسین بن عبدالسلام بن احمد بن شہاب الدین عمری گوپاموی، علامہ محبّ اللہ عمری الہ آبادی کے بھانجے تھے۔ صوبہ یوپی کے شہر گوپامئو میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ شیخ قطب الدین انصاری سہالوی (متوفی ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۲ء) سے علم حاصل کیا، یہاں تک کہ اپنے دور کے علامہ وفقیہ اور نامور شیخ قرار پائے۔ مآثر الکرام کی روایت کے مطابق انھوں نے قاضی عبدالرحیم مرادآبادی سے تحصیل علم کی۔

قاضی شہاب الدین گوپاموی، ہمیشہ سرگرم درس و افادہ رہے۔ منقول ہے کہ ان سے چار سو اصحاب نے استفادہ کیا، جن میں خود ان کے بیٹے قاضی قطب الدین گوپاموی (متوفی ۲۵ ررمضان ۱۱۶۰ھ/ ۱۹ر ستمبر ۱۷۴۷ء) مولانا محمد صالح بنگالی، مولانا محمد اشرف شارح سلم العلوم، قاضی محمد مبارک بن محمد دائم عمری گوپاموی

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۱۰۶، بحوالہ گنج ارشدی۔

❷ تذکرۃ العلما، ج ۲، ص ۹۷۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۴۸۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۰۷، ۱۰۸۔ تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۶۷۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور دیگر بہت سے حضرات شامل ہیں۔ ان بزرگوں نے دیار ہند کے مختلف علاقوں میں درس و تدریس کی مسندیں بچھائیں اور بے شمار علما وطلبا نے ان سے اخذ علم کیا۔

بارھویں صدی ہجری کے اس عالم وفقیہ کی تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا❶۔

۸۹۔ قاضی شیخ الاسلام گجراتی

قاضی شیخ الاسلام، علامہ وقت اور شیخ زماں تھے۔ مشہور فقہائے ہند میں سے تھے۔ علم وعمل، زہد و تقویٰ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں اپنی مثال آپ تھے۔ صدق وامانت اور عفت وصیانت میں ان کا درجہ بہت بلند تھا، معاملہ فہمی، حسن اخلاق، اخلاص ومروت اور خوف خدا میں خاص شہرت کے مالک تھے۔ عجز وانکسار اور رجوع الی اللہ میں یگانہ حیثیت کے حامل تھے۔ معقولات ومنقولات کے ماہر تھے، وسعت معلومات اور فقاہت میں درجہ امامت پر فائز تھے۔ عہد عالم گیری کے بلند مرتبت اصحاب علم وفضل میں شمار کیے جاتے تھے۔ قاضی القضاۃ عبدالوہاب احمد آبادی گجراتی کے لائق فرزند تھے۔ تقویٰ اور پرہیزگاری کا یہ عالم تھا کہ والد کی وفات کے بعد ان کی جائداد میں سے کوئی شے اپنے پاس نہیں رکھی۔ بعض چیزیں تو فقرا ومساکین میں بانٹ دیں اور باقی اعزہ واقارب کو دے دیں کہ ممکن ہے اس سے عنداللہ والد کے گناہوں کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔

بات یہ ہے کہ ان کے والد قاضی عبدالوہاب احمد آبادی گجراتی، اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں قاضی القضاۃ کے منصب علیا پر مامور تھے۔ لیکن مال ودولت جمع کرنے میں محتاط نہ تھے۔ اس ضمن میں ان کی شہرت بہت خراب تھی اور مشکوک طرز عمل کے مالک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وفات کے وقت انھوں نے بہت دولت چھوڑی۔ دو لاکھ اشرفیاں اور پانچ لاکھ روپے تو نقد تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے جواہرات اور بہت بڑی جائداد تھی۔ لیکن یہ سارا مال چوں کہ مشکوک اور مشتبہ تھا، لہٰذا قاضی شیخ الاسلام نے اس میں سے کوئی چیز بھی اپنے پاس نہیں رکھی، سب مال مختلف لوگوں میں تقسیم کر دیا۔

قاضی القضاۃ عبدالوہاب احمد آبادی کی وفات کے بعد سلطان اورنگ زیب عالم گیر نے ۱۰۸۴ھ/ ۱۶۷۳ء میں ان کی جگہ ان کے صاحب زادے قاضی شیخ الاسلام کو قاضی لشکر کے عہدے پر مامور ہونے کا حکم جاری کیا، مگر انھوں نے یہ منصب قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ عالم گیر کو انکار کی اطلاع پہنچی تو اس نے ذاتی طور پر انھیں مجبور کیا کہ وہ ہر صورت میں اس منصب پر فائز ہونے کی منظوری دیں۔ بادشاہ کے اصرار پر شیخ الاسلام نے یہ منصب بڑی بے دلی اور کراہت کے ساتھ قبول کیا۔ پھر جب اس منصب پر فائز ہو گئے تو عدل وقسط اور انصاف وعدالت میں اپنی تمام مساعی وقف کر دیں۔ اظہار حق، شہادتوں کی چھان بین اور تفتیش مقدمات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ جو مقدمہ ان کے سامنے پیش ہوا، پوری دیانت داری سے اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی

❶ مآثر الکرام دفتر اول، ص ۲۷۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۱۰۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اصل معاملے کے تمام پہلوؤں کو بے نقاب کیا۔ اس کے ہر گوشے کی تحقیق کی اور گواہوں کے صدق و کذب کے بارے میں پورا اطمینان حاصل کیا۔ کہیں کوئی جھول باقی نہیں رہنے دیا اور اس نتیجے تک پہنچنے کی امکان بھر سعی کی کہ کسی گواہ یا کسی ادنیٰ یا اعلیٰ اہل کار کو مدعی یا مدعیٰ علیہ نے کسی قسم کی رشوت تو نہیں دی۔ کوئی کسی نوع کے لالچ یا حرص و طمع میں تو نہیں آیا۔ اظہارِ حق اور قولِ صدق میں بادشاہ کی بھی کبھی پروا نہیں کی، اگرچہ بادشاہ کی مخالفت ہی ہوتی ہو اور اس کی طبعِ نازک پر ان کا انداز کلام گراں گزرتا ہوں۔

شاہ نواز مآثر الامرا میں قاضی شیخ الاسلام کی بادشاہ کے سامنے حق گوئی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ سلطان اورنگ زیب عالم گیر نے جب دکن پر چڑھائی کا ارادہ کیا اور وہاں کے حکمرانوں کو زیر کرنے کی ٹھانی تو قاضی شیخ الاسلام سے فتویٰ پوچھا۔ چوں کہ دکن کے حکمران بھی مسلمان تھے، لہٰذا شیخ الاسلام نے بادشاہ کی مخالفت کی اور فتویٰ دیا کہ اسے دکن پر فوج کشی نہیں کرنی چاہیے۔

شاہ نواز یہ بھی لکھتا ہے کہ قاضی شیخ الاسلام نے کافی مدت تک خدمت قضا پر متمکن رہنے کے بعد اس سے علیحدگی اختیار کر لی تھی، حالاں کہ بادشاہ عالم گیر مصر تھا کہ وہ ہر حال میں اس منصب پر فائز رہیں۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ منصب قضا چھوڑ دینے کے بعد وہ حجاز تشریف لے گئے تھے۔ وہاں حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ پھر ہندوستان واپس لوٹے تو احمد آباد میں اقامت گزین ہو گئے۔ جب عالم گیر کو ان کی معاودت ہند اور سکونت احمد آباد کا پتا چلا تو ان پر بڑی عنایات کیں اور ہدایا و عطایا سے نوازا۔ بادشاہ نے ان کو پہلے قضا اور پھر صدارت کی پیش کش کی، لیکن انھوں نے اسے قبول کرنے سے معذرت کر دی۔ جب بادشاہ نے بہت اصرار کیا تو بادل نخواستہ قبول منصب کی غرض سے اپنے شہر (احمد آباد) سے روانہ ہوئے، لیکن دورانِ سفر ہی میں انتقال کر گئے۔ بادشاہ کو ان کی وفات کا علم ہوا تو نہایت حزن و ملال کا اظہار کیا۔

درباری وقائع نگار محمد ساقی مستعد خاں نے اپنی تصنیف مآثر عالم گیری میں قاضی شیخ الاسلام کا کئی مقام پر ذکر کیا ہے اور ہر جگہ نہایت احترام سے ان کا نام لیا ہے۔ مثلاً ۱۰۸۶ھ/ ۱۶۷۵ء کے واقعات کے ضمن میں جو اورنگ زیب عالم گیر کا انیسواں سال جلوس اور قاضی عبدالوہاب کا سن وفات ہے، مستعد خاں لکھتا ہے:

”قاضی عدالت ملا عبدالوہاب نے ۱۵/ رمضان ۱۰۸۶ھ/ ۳/ دسمبر ۱۶۷۴ء کو دارالسلطنت میں وفات پائی۔ جہاں پناہ (بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر) نے قاضی مذکور کے بیٹے شیخ الاسلام کو جو دارالسلطنت کے قاضی تھے، اپنے حضور میں طلب فرما کر ان کے باپ کی جگہ قاضی لشکر مقرر فرمایا[1]۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ والد کی وفات کے وقت قاضی شیخ الاسلام، دارالسلطنت دہلی کے منصب قضا پر متعین تھے۔

دوسری جگہ جلوس عالم گیری کے ستائیسویں سال (ماہ ذی الحجہ ۱۰۹۴ھ/ نومبر ۱۶۸۳ء) کے واقعات

[1] مآثر عالم گیری، ص ۱۶۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں یہی وقائع نگار رقم طراز ہے:

''قاضی عبدالوہاب کے بیٹے شیخ الاسلام، اپنی ذاتی استعداد اور فطرتِ سلیم کے تقاضے کے تحت جذبۂ محبت الٰہی سے بے قرار ہوئے اور دنیا سے قطع تعلق کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ہر چند بادشاہ جہاں پناہ نے ان پر عنایات فرمائیں اور ترکِ خدمت سے منع کیا، اور عہدۂ قضا کو جو انہی جیسے پاک باز نفوس کو زیب دیتا ہے، انہی کی ذات سے وابستہ رکھنا چاہا، لیکن قاضی شیخ الاسلام نے اپنے ارادوں میں کسی طرح تبدیلی نہ کی۔ بادشاہ نے مجبور ہو کر قاضی ممدوح کی رائے سے سید ابوسعید کی جو عالی نسب سید اور قاضی عبدالوہاب کے داماد (اور قاضی شیخ الاسلام کے بہنوئی) تھے، عہدۂ قضا مرحمت فرمایا❶۔''

ایک اور مقام پر عالم گیر کے بیالیسویں سال جلوس اور ۱۱۰۹ھ/ ۱۶۹۸ء کے واقعات کے سلسلے میں محمد ساقی مستعد خاں، حسب ذیل الفاظ میں قاضی شیخ الاسلام کا ذکر کرتا ہے:

محبت، خدا دوستی اور شفقت بندہ نوازی کی وجہ سے بادشاہ نے شیخ الاسلام کے نام ایک اشتیاق آمیز فرمان ان کے برادر نورالحق کے ہاتھ ارسال فرمایا۔ فرمان کا مضمون یہ تھا کہ آپ شغل قضا سے مستعفی اور سفر حجاز سے مراجعت کے بعد ایک مرتبہ بھی حضور میں نہیں آئے۔ اگر اس طرف توجہ مبذول کریں تو مناسب ہوگا۔ شیخ الاسلام، اس وقت احمد آباد میں مقیم تھے۔ بادشاہ کا منشا یہ تھا کہ اگر شیخ مذکور حضور میں آجائیں اور صدارت کی خدمت قبول کر لیں تو یہ عہدۂ جلیلہ ان کو تفویض فرمایا جائے۔ لیکن اس کے برعکس شیخ الاسلام کا ارادہ دوبارہ طوافِ کعبہ کا احرام باندھنے کا تھا۔ اتنے میں دفعتاً مرض نے شدت اختیار کی اور مرحوم کو سفر آخرت طے کرنا پڑا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے❷۔

بہر حال قاضی شیخ الاسلام عہد عالم گیری کے جلیل القدر عالم اور فقیہ تھے۔ انھوں نے ۱۱۰۹ھ/ ۱۶۹۸ء میں وفات پائی اور دیگر لوگوں کے علاوہ بادشاہ نے بھی ان کی وفات پر انتہائی حزن و تاسف کا اظہار کیا❸۔

ص

۹۰۔ شیخ صبغت اللہ سرہندی

شیخ صبغت اللہ سرہندی، حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے پوتے اور حضرت شیخ محمد معصوم

❶ مآثر عالم گیری، ص ۲۵۵۔

❷ مآثر عالم گیری ص ۳۶۹۔

❸ منتخب اللباب، ج ۲ ص ۴۱۴، ۴۱۵۔ مآثر عالم گیری، ص ۱۴۸، ۲۱۰، ۲۲۵، ۲۳۹، ۲۵۱، ۳۳۹، ۳۹۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۱۱، ۱۱۲۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرہندی کے بیٹے تھے۔ ۱۰۳۲ھ/ ۱۶۲۳ء میں پیدا ہوئے اور علم ومعرفت کی گود میں پرورش پائی۔ شیخ محمد معصوم نے اپنے اس نیک بخت بیٹے کے چہرے پر تقویٰ وصالحیت کے آثار دیکھ کر اور ان کے ورع وعبادت سے متاثر ہو کر، انھیں مرتبہ قطب پر فائز ہونے کی بشارت دی تھی۔

شیخ صبغت اللہ سرہندی اپنے دور کے نامور عالم وفقیہ تھے۔ ان کے شب وروز لوگوں کو رشد وہدایت اور طریق حق کی دعوت دینے میں صرف ہوتے تھے۔ ہر وقت ترویج شریعت اور ترغیب سنت میں سرگرم عمل رہتے۔ اسی بنا پر لوگوں نے ان کو مروّج الشریعت کا لقب دے رکھا تھا، جس کا مطلب ہے، شریعت حقہ کے احکام کو رواج دینے والا۔

برصغیر پاک وہند میں حضرت مجدد الف ثانی کا خاندان علم وفضل، زہد وتقویٰ اور تصوف وطریقت میں خاص شہرت کا حامل ہے۔ جو خدماتِ دینیہ اس خاندان کے بزرگوں نے انجام دیں، وہ ارض ہند کے کسی اور خاندان کے حصے میں نہیں آئیں۔ شیخ صبغت اللہ سرہندی کا مرتبہ بھی اس سلسلے میں بڑا بلند ہے۔

خطۂ سرہند کے اس رفیع المنزلت عالم وفقیہ اور خانوادۂ مجددیہ کے بلند مرتبت مرد صالح نے ۹/ ربیع الاول ۱۱۲۱ھ/ ۸/ مئی ۱۷۰۹ء کو وفات پائی ❶۔

ـــــ ض ـــــ

۹۱۔ سید ضیاء اللہ بلگرامی

سید ضیاء اللہ بن خان محمد بن عبدالغفار بن تاج الدین حسینی واسطی بلگرامی، علمائے مشاہیر میں سے تھے۔ اپنے عہد کے شیخ، عالم اور نامور فقیہ تھے۔ مولد ومنشا بلگرام ہے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو حصولِ علم کا جذبہ بیدار ہوا۔ سب سے پہلے تجوید کے ساتھ قرآن مجید حفظ کیا۔ اس زمانے میں بلگرام کو علم وفضل کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی، اور وہاں مشہور علمائے کرام کا سلسلۂ درس جاری تھا۔ سید ضیاء اللہ نے حفظ قرآن کے بعد ان علما سے مختلف درسی کتابیں پڑھیں۔ پھر مزید تحصیل علم کی غرض سے دیگر مقامات کا قصد کیا اور مروجہ علوم کی بعض کتابوں کا درس لیا۔ کچھ عرصے بعد کالپی گئے۔ وہاں شیخ احمد بن محمد حسینی ترمذی کالپوی کی مسند طریقت آراستہ تھی، ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تصوف کی بعض کتابیں ان سے باقاعدہ درساً درساً پڑھیں۔ بعد ازاں علوم ظاہری وباطنی پر عبور حاصل کر کے اپنے شہر بلگرام واپس آئے۔

سید ضیاء اللہ بلگرامی گوناگوں اوصاف کے مالک تھے۔ معقولات ومنقولات میں مہارت کے ساتھ ساتھ انشا ومراسلہ نگاری میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ عربی اور فارسی کی نظم ونثر میں بھی ان کا مقام بہت بلند تھا۔

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۱۳ بحوالہ تذکرۃ الانساب از قاضی ثناء اللہ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بلگرام کے اس ہمہ اوصاف عالم وفقیہ نے منگل کے روز ۲۵ رشعبان ۱۱۰۴ھ/ ۲۱ راپریل ۱۶۹۳ء کو اس جہانِ فانی سے عالم جاودانی کا سفر اختیار کیا❶۔

ــــ ط ــــ

۹۲۔ سید طفیل محمد اترولوی بلگرامی

سید طفیل محمد بن سید شکر اللہ حسینی اترولوی ثم بلگرامی، معقول ومنقول کے مجمع البحرین، فقہ واصول کے ماہراور تفسیر وحدیث کے عالم تھے۔ ۷ر ذی الحجہ ۱۰۷۳ھ/ ۳ر جولائی ۱۶۶۳ء کو اترولی کے ایک سید خاندان میں پیدا ہوئے۔ اترولی ایک گاؤں کا نام ہے جو اس زمانے میں اعمال آگرہ میں واقع تھا۔ ان کے والد سید شکر اللہ حسینی بڑے نیک بزرگ تھے، انھوں نے سعادت مند بیٹے کو اوائل عمر ہی میں ایک معروف فاضل سید سعد اللہ حسینی بلگرامی (متوفی ۱۷ر شوال ۱۱۱۹ھ/ ۳۱ر دسمبر ۱۷۰۷ء) کے حلقہ ارادت میں داخل کرا دیا تھا۔ ابھی صغر سن میں تھے کہ ان کے عم محترم سید احسن اللہ انھیں اترولی سے دارالسلطنت دہلی لے گئے۔ علم صرف کی ابتدائی کتاب میزان الصرف کا ایک سبق تبرکاً سید حسن رسول نما نارنولی (متوفی ۲۲ر شعبان ۱۱۰۳ھ/ ۲۹ر اپریل ۱۶۹۲ء) سے پڑھا اور شرح جامی تک کتابیں اپنے عم مکرم سید احسن اللہ حسینی بلگرامی سے پڑھیں۔ پندرہ سال کی عمر میں ۱۰۸۸ھ/ ۱۶۷۷ء کے لگ بھگ کسب علم کی غرض سے اترولی سے بلگرام گئے۔ وہاں بعض کتب درسیہ کا درس سید مربی بلگرامی (متوفی ۱۶ر شعبان ۱۱۱۷ھ/ ۲۲ر اکتوبر ۱۷۰۵ء) اور سید سعد اللہ بلگرامی (متوفی ۱۷ر شوال ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۳ء) سے لیا اور بعض کے لیے قاضی علیم اللہ کچندوی (متوفی ۱۱۱۵ھ/ ۲۲ر اگست ۱۷۰۳ء) کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ مطولات سید قطب الدین شمس آبادی (متوفی ۱۱۲۱ھ/ ۱۷۰۹ء) سے پڑھیں۔ حدیث کی تحصیل سید مبارک بن فخر الدین حسینی واسطی بلگرامی (متوفی ۲۰ر ربیع الثانی ۱۱۱۵ھ/ ۱۷۰۹ء) سے کی۔ بعد ازاں مستقل طور پر بلگرام ہی میں سکونت اختیار کر لی اور اپنے آپ کو درس وافادۂ طلبا کے لیے وقف کر دیا۔

سید طفیل محمد چوں کہ اترولی میں پیدا ہوئے تھے، اس لیے اترولوی کہلائے اور پھر وہاں سے بلگرام میں نقل مکانی کر گئے تھے، لہٰذا بلگرامی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ بے حد متقی عالم دین تھے۔ سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ کبھی دل میں مال ودولت جمع کرنے کی حرص پیدا نہیں ہوئی۔ نہ مکان بنایا اور نہ شادی کی۔ ہمیشہ دنیا سے دور اور اس کے ساز وسامان سے نفور رہے۔ خلق کثیر نے ان سے اخذ علم کیا۔ ان کے تلامذہ کی بہت بڑی جماعت میں سید غلام علی آزاد بلگرامی بھی شامل ہیں۔

❶ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۳۰ تا ۲۳۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۱۸۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۹۸۔ سرو آزاد، ص ۲۵۰، ۲۵۱۔ تذکرۂ بے نظیر، ص ۸۴۔ مفتاح التواریخ، ص ۲۸۷، ۲۸۸۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سید طفیل محمد بلگرامی شاعر بھی تھے۔ ان کے بعض اشعار ان کے حالات سے متعلق کتابوں میں درج ہیں۔

سید ممدوح نے ۲۴ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ/۲۴ مارچ ۱۷۳۹ء کو بلگرام میں انتقال کیا اور وہیں دفن کیے گئے ❶۔

۹۳۔ سید طیب بلگرامی

سید طیب بن نعمت اللہ بن طیب بن عبدالواحد حسینی واسطی بلگرامی، بارھویں صدی ہجری میں بلگرام کے شیخ و فاضل تھے اور ان کا شمار اس دور کے معروف علما اور اللہ کے برگزیدہ بندوں میں ہوتا تھا۔

سید طیب حسینی، بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ سید عبدالہادی حسینی بلگرامی (۲۰ ربیع الاول ۱۱۳۳ھ/ ۸ جنوری ۱۷۲۱ء) سے اخذ علم کیا۔ حدیث کے لیے سید مبارک بن فخر الدین حسینی واسطی (متوفی ۲۰ ربیع الثانی ۱۱۱۵ھ/ ۲۰ اگست ۱۷۰۴ء) کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ سید طیب بلگرامی کے والد مکرم سید نعمت اللہ حسینی بلگرامی (متوفی ۵ رمضان ۱۱۴۰ھ/ ۴ اپریل ۱۷۲۸ء) بہت بڑے صاحب فضل اور عالم دین تھے، کتب درسیہ میں ماہر اور علوم حکمیہ میں اپنے تمام اقران و معاصرین سے فائق تھے۔ بحث و مناظرہ میں تیز تھے، مولانا قطب الدین شہید سہالوی (شہادت ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۲ء) کے شاگرد تھے، اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد بلگرام میں درس و افادۂ طلبا میں مشغول ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد اس لائق بیٹے (سید طیب حسینی بلگرامی) نے ان کی مسند سنبھالی اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔

سید طیب متعدد خصوصیات کے مالک تھے۔ وہ صحیح معنوں میں اپنے آبا و اجداد کے علوم و معارف کے وارث تھے اور اپنے دور کے قابل ذکر عالم دین تھے۔ ان کا خط بڑا خوب صورت تھا اور نہایت زود نویس تھے۔ انھوں نے کئی ضخیم درسی اور غیر درسی کتابوں کی کتابت کی مثلاً شرح جامی کی شروع سے آخر تک صرف ایک ہفتے میں کتابت کر دی تھی۔ اسی طرح محدث یمن اور دیار عرب کے مشہور بزرگ شیخ یحییٰ بن ابوبکر العامری الیمنی الشافعی (۸۱۶۔۸۹۳ھ/۱۴۱۳ء۔۱۴۸۸ء) کی کتاب ''بہجۃ المحافل'' جو سیرت نبوی ﷺ کے موضوع پر ہے اور ضخیم کتاب ہے، تیس روز میں لکھ ڈالی تھی۔ ان کا کتب خانہ بہت بڑا اور شان دار تھا جو نایاب اور عمدہ کتابوں پر مشتمل تھا۔ ان میں سے بیشتر کتابیں ان کی خود اپنی کتابت کردہ تھیں۔ وفات کے بعد یہ کتب خانہ ان کی ایک عظیم یادگار تھا۔ عالم جوانی میں کچھ دن ملازمت بھی کی مگر وظائف و اوراد اور مطالعہ کتب میں یہ دستور مشغول

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۱۳۳ تا ۱۴۰۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۹۸، ۹۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۱۸، ۱۱۹۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۲۔ سبحۃ المرجان، ص ۹۰ تا ۹۳۔ ابجد العلوم، ص ۹۱۰۔ سرو آزاد، ص ۲۵۱، ۲۵۲۔ تقصار جنود الاحرار، ص ۲۲۲۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ص ۱۴ تا ۱۸۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہے۔ والد کی وفات کے وقت احمد آباد (گجرات) میں ملازم تھے۔ ان کی وفات کی خبر سنتے ہی سلسلۂ ملازمت ترک کر کے فوراً بلگرام پہنچ گئے اور سجادۂ اسلاف پر متمکن ہو گئے۔

سید طیب بلگرامی چند کتابوں کے مصنف بھی تھے، جن میں ایک کتاب سیرت کے موضوع پر ہے، جسے ''الجامع الطیبی'' کے نام سے موسوم کیا۔ ایک کتاب، مسائل فقہ کے بارے میں تصنیف کی۔

بلگرام کے اس متعدد اوصاف کے حامل، صاحب علم و فضل بزرگ نے چہار شنبہ کے روز ۷/رجب ۱۱۵۲ھ/ ۲۹/ستمبر ۱۷۳۹ء کو بلگرام میں وفات پائی اور اپنے جد امجد سید عبدالواحد حسینی بلگرامی کے قریب دفن کیے گئے❶۔

ظ

۹۴۔ سید ظریف حسینی عظیم آبادی

ہندوستان کے صوبہ بہار میں ایک شہر برصغیر کی قدیم تاریخ میں 'عظیم آباد' کے نام سے معروف تھا۔ یہ شہر اس وقت ''پٹنہ'' کے نام سے موسوم ہے اور صوبہ بہار کا دارالحکومت ہے۔ یہ شہر کسی زمانے میں علم و فضل کا منبع تھا، تصوف و طریقت کا مرکز اور تحقیق و تدقیق کا گہوارہ تھا۔ اس میں بے شمار علماء پیدا ہوئے اور لاتعداد اصحابِ فضل نے درس و تدریس کی شمع روشن کی۔ ان میں بارھویں صدی ہجری کے ایک عالی قدر عالم سید ظریف حسینی عظیم آبادی بھی تھے، جو شیخ وقت اور علامہ عصر تھے۔ فقہ و اصول اور علم کلام میں انھیں دست رس حاصل تھی۔ شیخ نظام الدین انصاری سہالوی (متوفی ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء) کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد سید ظریف عظیم آبادی اپنے شہر عظیم آبادی میں سرگرم تدریس ہوئے اور مدرسہ سیف خاں میں مسند درس آراستہ کی۔ اپنے استاذ گرامی شیخ نظام الدین انصاری سہالوی سے انھیں شدید محبت و عقیدت اور قلبی تعلق تھا، ان کی موت کی خبر پہنچی تو آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور شدت غم سے روتے روتے آنکھیں ضائع ہو گئیں، لیکن بعد میں پتا چلا کہ شیخ زندہ ہیں اور انتقال کی خبر غلط تھی، لیکن اس اثنا میں لائق شاگرد کی بصارت ختم ہو چکی تھی۔

منقول ہے کہ سید ظریف حسینی چند کتابوں کے مصنف بھی تھی، مگر ان کی تصانیف کا علم نہیں ہو سکا۔ ان سے علما و طلبا کی ایک بڑی تعداد نے استفادہ کیا❷۔

www.KitaboSunnat.com

❶ مآثر الکرام، ص ۴۹ تا ۵۱۔ تقصار، ص ۲۰۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۱۹، ۱۲۰۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۲۱، بحوالہ رسالہ قطبیہ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ـــ ع ـــ

۹۵۔ شیخ عبدالباسط سندھی

شیخ عبدالباسط سندھی کے والد بزرگ وار کا اسم گرامی مخدوم علی احمد قُمری تھا۔ وہ بڑے خوش آواز اور خوش الحان تھے، اسی لیے "قُمری" کے عرف سے معروف تھے۔ صاحب کمال اور صاحب فضیلت شخص تھے۔ ان کے بیٹے شیخ عبدالباسط بھی اپنے زمانے اور علاقے کے جید عالم تھے اور فقہ واصول اور علوم عربیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ عالم گیر کے دربار میں گئے اور تاریخ فتح قلعہ اس آیت کریمہ سے نکالی: ﴿هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ ❶۔ قدر شناس بادشاہ نے اس کے انعام میں اور ان کے کمالات علمی کے پیش نظر انھیں ٹھٹھہ کے منصب قضا کے ساتھ "صدی" کا اعزاز بھی عطا کیا، جس پر وہ عرصے تک فائز رہے۔ آخری دنوں میں حجاز تشریف لے گئے اور حج وزیارت کا شرف حاصل کر کے واپس ٹھٹھہ آئے۔ ضعف پیری اور کبر سنی کے باوجود طلبا کو درس دینے میں مشغول رہتے ❷۔

۹۶۔ سید عبدالجلیل حسینی بلگرامی

سید عبدالجلیل بن سید امیر احمد حسینی واسطی بلگرامی، علامہ وقت، شیخ دوراں، فاضل عصر، صاحب مفاخر بیضا اور حامل مآثرِ غرا تھے۔ مشہور مؤرخ اور تذکرہ نگار میر غلام علی آزاد بلگرامی کے نانا تھے۔ حدیث، لغت اور سیرت میں ان کے استاذ بھی تھے۔ ۱۳؍شوال ۱۰۷۱ھ/ یکم جون ۱۶۶۱ء کو بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ کچھ بڑے ہوئے تو سید سعداللہ بلگرامی (متوفی ۱۷؍شوال ۱۱۱۹ھ/ ۳۱؍دسمبر ۱۷۰۷ء) سے مختصرات پڑھیں۔ بعد ازاں مزید حصول علم کے لیے علاقہ اودھ کے مختلف قصبات وبلاد کا سفر کیا اور مشاہیر اساتذۂ عصر سے فیض یاب ہوئے۔ پھر اس عہد کے معروف بزرگ شیخ غلام نقشبند لکھنوی (متوفی ۱۱۲۶ھ/ ۱۷۱۴ء) کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے استفاضہ کیا۔ حدیث کی سند سید مبارک بن فخر الدین حسینی بلگرامی (متوفی ۲۰؍ربیع الثانی ۱۱۱۵ھ/ ۲۲؍اگست ۱۷۰۳ء) سے حاصل کی۔ اس کے بعد عازم دکن ہوئے۔ ان دنوں سلطان اورنگ زیب عالم گیر دکن ہی میں فروکش تھا، اس سے ملاقات کی تو اس نے ۱۱۱۲ھ/ ۱۷۰۰ء میں بخشیگری کا منصب عطا کیا اور ساتھ ہی صوبہ پنجاب کے شہر گجرات کا سرکاری وقائع نگار مقرر فرمایا۔ پھر ان کی خدمات ۱۱۱۶ھ/ ۱۷۰۴ء کو علاقہ سندھ میں

❶ یہ سورہ ص کی آیت نمبر ۳۹ ہے۔ ترجمہ یہ ہے: (یہ ہماری عطا ہے، سو چاہے تو بخش دے اور چاہے تو اپنے پاس بغیر حساب کے رکھ لے۔)

❷ تحفۃ الکرام، ص ۶۸۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۳۶۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھکر اور سیوستان میں منتقل کر دیں۔ اس خدمت پر ۱۱۳۰ھ/ ۱۷۱۸ء تک مامور رہے۔ پھر اس سے معزول ہو گئے اور فرخ سیر کے عہد میں ان کی جگہ ان کے بیٹے سید محمد (متوفی ۱۱۸۵ھ/ ۱۷۷۱ء) کو اس منصب سے سرفراز کیا گیا۔

ترکِ منصب کے بعد سید عبدالجلیل بلگرامی، دہلی میں مقیم ہو گئے تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اسماء الرجال اور تاریخ کے بہت بڑے عالم تھے۔ معانی، بیان، بدیع اور تاریخ و سیرت میں بھی دست گاہ رکھتے تھے۔ عربی اور فارسی کے شاعر تھے۔ معقولات و منقولات کے جامع اور کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ لغت میں اس درجہ عبور تھا کہ گویا اس کے معدن اور مصدر تھے۔ اس کے تمام گوشوں، اس کی تمام باریکیوں اور نزاکتوں سے باخبر تھے۔ اس دور میں معرفت لغت میں غالباً ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ سب سے منفرد اور یگانہ تھے۔ عربی، فارسی، ترکی اور ہندی کے ماہر تھے۔ ان زبانوں میں فصاحت سے بات کرتے اور خوب صورت شعر کہتے۔ عربی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یا صاح لا تلم المتیم فی الهوی ہو عاشق لا ینثنی عن خلہ
یأبی الدواء سقامہ کعیونہ فعلی الطبیعة یا معالج خلہ

(اے صاحب! تو عاشق کو اس کی محبت میں ملامت نہ کر، وہ عاشق ہے اور اپنی عادت سے گریز نہیں کرے گا۔

اس کی بیمار آنکھیں دوا کو قبول نہیں کرتیں۔ پس اے معالج! تو اس کو فطرت کے فیصلے پر چھوڑ دے۔)

دو شعر اور ملاحظہ ہوں:

حبیبی قوس حاجبہ کنون وصاد بدین مقلة شکل عینہ
لعمری انہ نص جلی علیٰ ان الرمایة حق عینہ

(جو میرا دوست ہے، اس کی بھوؤں کی کمان نون اور صاد کی طرح ہے۔ اس کی آنکھوں کی ڈھیلے موٹے ہیں۔

میری زندگی کی قسم، یہ بات بالکل واضح ہے کہ تیر اندازی اس کی آنکھوں کا حق ہے۔)

ایک مرتبہ خواجہ عبدالباسط دہلوی سے زمخشری کی "ربیع الابرار" طلب کی تو یہ شعر لکھ بھیجے:

یا باسط الایدی یا غیث الندی صیرت مزرعة العطاء مریعا
لا غروان اطلب ربیعا منکم فالغیث یعطی العالمین ربیعا

(اے کشادہ حال، اے مددگار، تو عطا و بخشش کی خوش گوار کھیتی بن گیا ہے۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ میں تم سے ربیع طلب کر رہا ہوں، اور ابر کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ ایک دنیا کو ربیع یعنی موسم بہار سے نوازتا ہے۔)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک شعر یہ بھی پڑھیے:

ھو البدر الا انہ البحر زاخرا سوی انہ الفرض نمام لکنہ الوبل

(وہ چودھویں کا چاند ہے، مگر وہ ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا، سمندر بھی ہے، علاوہ ازیں وہ شیر بھی ہے، اور برسنے والا بادل بھی۔)

ایک شعر اور دیکھیے:

ھو القطب الا انہ البدر طالعا سوی انہ المریخ لکنہ السعد

(وہ قطب ہے، مگر وہ چودھویں کا چاند بھی ہے جو نمودار ہوا، اور ساتھ ہی وہ اگرچہ مریخ بھی ہے، تاہم سعد ہے۔)

زبان پر قدرت کا یہ عالم تھا کہ ۱۱۱۱ھ/ ۱۷۰۰ء کو اورنگ زیب عالم گیر نے قلعہ ستارہ فتح کیا تو ایک رات میں عربی اور فارسی میں گیارہ قطعے اس فتح کی تاریخ میں نظم کیے اور رسالے کے صورت میں مرتب کر کے اسے ''گل زارِ فتح شاہ ہند'' اور ''طوطی نامہ فیروزی شاہ عالم گیر'' کے نام سے موسوم کیا۔ یہ قطعے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیے اور الطاف خسروانہ سے سرفراز ہوئے۔ اس میں لطف کی بات یہ ہے کہ رسالے کے ان دونوں ناموں سے قلعہ ستارہ کے فتح کی تاریخ نکلتی ہے۔

اس عظیم المرتبت عالم نے ہفتے کی رات ۲۳ر ربیع الثانی ۱۱۳۸ھ/ دسمبر ۱۷۲۵ء کو دہلی میں وفات پائی اور ان کی وصیت کے مطابق میت کو بلگرام لے جا کر جمعے کے روز نمازِ عصر کے اول وقت ۶ر جمادی الاولیٰ ۱۱۳۸ھ/ ۳۰ر دسمبر ۱۷۲۵ء کو ان کے والد گرامی میر سید احمد بلگرامی کے قریب دفن کیا گیا❶۔

۹۷۔ سید عبدالحکیم لاہوری

سید عبدالحکیم کا نسب نامہ یہ ہے: عبدالحکیم بن بایزید بن نظام الدین بن محمد بن مبارک حسنی قادری لاہوری، معروف رجالِ فضل وصلاح اور مشہور مشائخ میں سے تھے۔ سلسلۂ نسب شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ تک منتہی ہوتا ہے۔ ۱۰۳۱ھ/ ۱۶۲۲ء کو لاہور میں پیدا ہوئے اور اسی شہر میں تربیت پائی۔ جید عالم دین، فقیہ، صالح، متقی ومتدین، متواضع، متحمل مزاج، حلیم الطبع اور بے حد منکسر تھے۔ ۱۱۰۸ھ/ ۱۶۹۷ء کو لاہور میں وفات پائی❷۔

---

❶ حیات جلیل (از مقبول احمد حمدانی) سبحۃ المرجان، ص ۹۷ تا ۹۴۔ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۴۵ تا ۲۶۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۱۳۹، ۱۴۰۔ ابجد العلوم، ص ۹۰۷، ۹۰۸۔ قضاء الارب من ذکر علما والنحو والادب، ص ۲۰۵، ۲۰۶۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۷۔ خزانۂ عامرہ، ص ۳۵۲ تا ۳۶۱۔ مفتاح التواریخ، ص ۳۱۰، ۳۱۱۔ تذکرہ بے نظیر، ص ۹۰ تا ۹۵۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۰۸، ۱۰۹۔ سرو آزاد، ص ۲۵۳ تا ۲۸۶۔

❷ خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۷۱، ۱۷۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۱۴۰، ۱۴۱۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۹۸۔شاہ عبدالرحیم دہلوی

حضرت شاہ عبدالرحیم دہلوی رحمۃ اللہ علیہ بارھویں صدی ہجری کے دیارِ ہند کے عالم کبیر، فقیہ نام دار، شیخ جلیل اور عارف باللہ تھے۔نسباً فاروقی تھے، شاہ وجیہ الدین عمری دہلوی کے لائق بیٹے اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے والد گرامی تھے۔

شاہ عبدالرحیم دہلوی کے حالات بیان کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر ان کے خاندان اور آباواجداد میں سے بعض بزرگوں کے حالات وکوائف بھی درج کردیے جائیں تاکہ پتا چل سکے کہ خاندانِ ولی اللہی علم وفضل اور تقویٰ وللّٰہیت میں ابتدا ہی سے کس اونچے درجے کا مالک تھا۔

مفتی شمس الدین:

شاہ عبدالرحیم دہلوی کا خاندان، برصغیر پاک وہند کا مشہورترین علمی خاندان ہے۔فضل وصلاح، علم وعرفان، عمل وکردار، جہاد فی سبیل اللہ، تصنیف وتالیف، درس وتدریس اور تحریر وتقریر میں ارض ہند کا کوئی خاندان اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔اس کے تمام افراد علمی جدوجہد، عمل وعزم، دعوت وارشاد، تبلیغ واشاعت دین، ہمت وحوصلہ، عبادت وریاضت، ورع وتقویٰ اور تدین وصالحیت کے ارفع اوصاف سے متصف تھے۔بدعات ومحدثات کی بیخ کنی اور توحید ورسالت کی نشر وترویج میں جو خدمات اس خاندان کے علمائے عالی مقام نے انجام دیں، اس میں کوئی اس کا حریف نہیں۔

اس خانوادۂ بلند مرتبت کے پہلے بزرگ جو ارض ہند میں وارد ہوئے، مفتی شمس الدین تھے، انھوں نے مشرقی پنجاب کے ایک شہر رہتک میں سکونت اختیار کی۔اس نواح میں وہ اسلام کے بہت بڑے مبلغ اور داعی تھے۔منقول ہے کہ وہ اصلاً عربی النسل تھے اور ہر طبقۂ فکر کے لوگوں میں عزت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم مروجہ میں درجہ اجتہاد پر فائز تھے۔نیکی اور اتقا میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔

مفتی کمال الدین:

مفتی شمس الدین کی وفات کے بعد ان کے بیٹے مفتی کمال الدین مسند افتا پر متمکن ہوئے۔وہ بھی باپ کی طرح صالح اور متقی تھے۔عالم وفاضل، متبع کتاب وسنت اور حامی دین متین تھے، دقیق النظر، بلند فکر اور روشن خیال تھے۔ریاضت ومجاہدہ کی بہت سی منزلیں طے کرچکے تھے۔ان کا زیادہ تر وقت تحقیق مسائل اور مطالعہ کتب میں صرف ہوتا تھا۔اس درجہ دینی کمالات کے مالک تھے کہ تھوڑے ہی عرصے میں اہل علم اور اصحاب فضل کے حلقوں میں مقبول ومشہور ہوگئے۔اپنے بلند مرتبت باپ کے صحیح جانشین تھے اور اللہ نے ان کو ہر قسم کی خوبیوں سے نوازا تھا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مفتی قطب الدین:

مفتی کمال الدین کا انتقال ہوا تو ان کے بعد ان کے لائق اور ہونہار فرزند مفتی قطب الدین کو منصب افتا تفویض کیا گیا۔ ان کے حالات زندگی کا پتا نہیں چل سکا، تاہم اتنا معلوم ہے کہ وہ بھی اس خاندان عالی قدر کی ایک ممتاز شخصیت تھے اور دعوت وارشاد اور تبلیغ واشاعت دین میں خاص شہرت کے حامل تھے۔

شیخ عبدالمالک:

مفتی قطب الدین راہیٔ ملک بقا ہوئے تو ان کے صاحب زادے شیخ عبدالمالک نے اس مسند کو زینت بخشی۔ شیخ عبدالمالک، عاقل وفہیم اور ذہین وطباع تھے۔ روحانیت وللّٰہیت کے اعلیٰ جوہر سے آراستہ تھے۔ ان کا دل علم کی روشنی سے تاباں اور فراست وفطانت کی ضو سے درخشاں تھا۔ ان کی فراوانیٔ علم سے اس خاندان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور اس کی نجابت وشرافت میں بے حد اضافہ ہوا۔

شیخ عبدالمالک نے ابتدائی درسی کتابیں اپنے ہی خاندان کے علما سے پڑھی تھیں۔ اس کے بعد مزید حصول علم کا شوق دامن گیر ہوا تو فنون مروجہ کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں۔ پھر تحصیل علم حدیث کی طرف عنان توجہ مرکوز فرمائی۔ قرآن مجید سے ان کو انتہائی لگاؤ تھا۔ زیادہ وقت تلاوت قرآن میں صرف کرتے اور لوگوں کو اس کے اسرار ونکات سے آگاہ فرماتے۔ بہترین واعظ اور مبلغ تھے اور ان کے پند ومواعظ کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ توحید کی تبلیغ اور بدعات کی تردید احسن طریقے سے کرتے۔ کتنے ہی لوگوں نے ان کے پیرایۂ وعظ سے متاثر ہو کر خلاف شرع رسوم وعوائد کو ترک کیا اور شریعت حقہ کو مشعل راہ ٹھہرایا۔ افسوس ہے انھوں نے زیادہ عمر نہ پائی اور عین عالم جوانی میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

قاضی بدھا:

شیخ عبدالمالک کی رحلت کے بعد رہتک کے قضا واحتساب اور افتا کا معزز عہدہ ان کے عزیز القدر فرزند قاضی بدھا کے حصے میں آیا۔ قاضی بدھا زیادہ پڑھے لکھے تو نہ تھے، البتہ بلندیٔ اخلاق اور تقویٰ وصالحیت میں اپنے دور اور گردونواح کی منفرد شخصیت تھے۔ عقل ودانش اور فکر وفہم میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔

قاضی قاسم:

قاضی بدھا کے دو بیٹے تھے۔ ایک قاضی قاسم، دوسرے قاضی منکن۔ بلاشبہ دونوں بھائی تقدس وپاک بازی میں ممتاز تھے اور علوم ظاہری وباطنی سے بہرہ ور۔ لیکن باپ کے منصب قضا کے وارث، قاضی قاسم قرار پائے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قاضی قادن:

قاضی قاسم کے بھی دو صاحب زادے تھے۔ بڑے قاضی قادن اور چھوٹے شیخ کمال الدین۔ دونوں بھائی عالم و فاضل، عقیل و فہیم اور ذہین و فطین تھے۔ مگر باپ کی رحلت کے بعد منصب قضا و افتا کے وارث قاضی قادن ہوئے، کیوں کہ وہ شیخ کمال الدین سے عمر میں بڑے تھے۔

شیخ محمود:

شیخ قادن نے بھی دو فرزند اپنی یادگار چھوڑے۔ بڑے شیخ محمود اور چھوٹے شیخ آدم۔ قاضی قادن کے ارتحال کے بعد شیخ محمود کو قضا و فتویٰ کا منصب عطا ہوا۔ وہ اس خانوادے کے برگزیدہ اور معزز و محترم فرد تھے۔ سب لوگ ان کی بے انتہا تکریم کرتے تھے۔ نہ صرف شہر رہتک میں ان کی علمی شان و شوکت مسلمہ تھی، بلکہ اس کے اطراف و جوانب میں بھی ہر طبقہ و خیال کے لوگوں میں انھیں تعظیم و توقیر کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن ان کی طبیعت میں انقلاب و تغیر کی کچھ ایسی لہر دوڑی کہ منصب قضا ترک کر کے اور اس کی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہو کر امورِ حکومت میں شامل ہو گئے اور سپاہیانہ زندگی اختیار کر لی۔

شیخ احمد:

شیخ محمود کے صاحب زادۂ گرامی قدر شیخ احمد تھے، جو عالم طفولیت ہی میں اپنے وطن رہتک سے نکل گئے تھے اور اس دور کے ایک عالم دین شیخ عبدالغنی بن شیخ عبدالحکیم کی خدمت میں چلے گئے تھے۔ شیخ احمد کی تعلیم و تربیت شیخ عبدالغنی کے ہاں ہوئی۔ ان کی فراست و قابلیت سے متاثر ہو کر شیخ عبدالغنی نے اپنی بیٹی ان کے عقد میں دے دی۔ شیخ احمد کافی مدت شیخ عبدالغنی کے پاس رہے۔ اس کے بعد دوبارہ رہتک آ گئے تھے اور قلعہ کے باہر ایک بہت بڑی عمارت تعمیر کرا کے خود بھی اسی میں رہنے لگے تھے اور اپنے تمام اعزہ و اقارب کو بھی اس میں ٹھہرایا۔ بیدار مغز اور عالم شخص تھے۔

شیخ منصور اور شیخ حسین:

شیخ احمد کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام شیخ منصور تھا اور دوسرے کا شیخ حسین! شیخ احمد کی آئندہ نسل کا سلسلہ انہی دو بیٹوں سے چلا۔ شیخ منصور متواضع اور بلند اخلاق تھے، شجاعت و بہادری اور تحمل و بردباری میں بے مثل تھے، شیخ حسین سے عمر میں بڑے تھے۔ چھوٹے بھائی شیخ حسین بھی تدین و تقویٰ میں ممتاز اور بہترین اوصاف سے متصف تھے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شیخ معظم:

شیخ منصور کی دو بیویوں سے چار لڑکے تھے۔ شیخ معظم اور شیخ اعظم ایک بیوی سے، اور شیخ عبدالغفور اور شیخ اسماعیل دوسری بیوی سے۔ سب سے بڑے شیخ معظم تھے۔ شیخ معظم بھی باپ کی طرح شجاع اور جری تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد سپاہیانہ طرز زندگی اختیار کر لیا تھا۔ کفار کے خلاف کئی معرکوں میں شریک ہوئے اور کامیاب رہے۔ جنگ جو اور مجاہد پیشہ تھے۔ اللہ نے انھیں علم و فضل اور نیکی و صالحیت کی دولت سے بھی مالا مال کیا تھا۔

شیخ وجیہ الدین:

شیخ معظم کے تین بیٹے تھے۔ شیخ جمال الدین، شیخ فیروز اور شیخ وجیہ الدین۔! شیخ وجیہ الدین بہت سی خوبیوں کے مالک اور متعدد اوصاف کے حامل تھے۔ جہاں یہ عرفان و ادراک، علم و معرفت، فضل و کمال اور اتقاو للّٰہیت میں یگانۂ روزگار تھے، وہاں فنون سپاہ گری اور شجاعت و بسالت میں بھی خاص شہرت رکھتے تھے۔ ان کے زمانے میں مغلیہ سلطنت کا نامور تاج دار شہاب الدین محمد شاہ جہان تخت ہند پر جلوہ افروز تھا۔ یہ اس کی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ شاہ جہان کی نظر بندی کے بعد ان کا بیٹا سلطان اورنگ زیب عالم گیر ملک کے اورنگِ سلطنت پر متمکن ہوا تو اس نے شیخ وجیہ الدین کی شجاعانہ سرگرمیوں سے متاثر ہو کر انھیں ایک ممتاز فوجی عہدے پر فائز کر دیا تھا۔ یہی شیخ وجیہ الدین ہیں جو حضرت شاہ عبدالرحیم دہلوی کے والد گرامی قدر اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے جد امجد تھے۔ ان کی پارسائی اور بہادری و جواں مردی کے متعدد واقعات کتابوں میں منقول ہیں۔

اس خاندان کے تمام افراد اپنے اپنے وقت کے فقید المثال لوگ تھے۔ یہ خاندان ارضِ ہند میں کوکب درخشاں اور مہر تاباں کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وہ خاندان ہے جس نے اس برصغیر کی دبیز ردائے ظلمت کو تار تار کیا اور اپنی علمی مساعی اور بھرپور عملی کوششوں سے ملک کو دین صحیح کے نور وضیا کی لازوال دولت سے روشناس کرایا۔ ان میں سے ہر ایک کی کتاب زندگی حیرت انگیز کوائف سے معمور اور سبق آموز واقعات سے مملو ہے۔ آیے، اس مختصر تمہید اور خاندانِ شاہ ولی اللہی کے اسلاف کرام کے سرسری تعارف کے بعد حضرت شاہ عبدالرحیم دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ضروری حالات کو مرکز توجہ ٹھہرائیں اور انھیں قلم و قرطاس کی گرفت میں لانے کی کوشش کریں۔

ولادت اور دیگر حالات:

شاہ عبدالرحیم ۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء کو دہلی میں پیدا ہوئے اور علم و فضل کی گود، ورع و تقویٰ کی فضا اور

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تصوف وطریقت کے ماحول میں پرورش پائی۔ اورنگ زیب عالم گیر کا زمانہ حکومت تھا اور شاہ صاحب کے والد شیخ وجیہ الدین، عالم گیر کی حکومت میں ایک معزز منصب پر فائز تھے۔

شاہ عبدالرحیم کے نانا کا نام شیخ رفیع الدین محمد تھا، جو ایک نیک اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ ان کے حالات میں مرقوم ہے کہ انھوں نے اپنی وفات سے پہلے گھر کا سامان جمع کیا اور شرعی حساب کے مطابق تمام ورثا میں تقسیم کر دیا۔ جب سب سے چھوٹی لڑکی کی باری آئی تو انھیں فوائد طریقت کے چند اجزا اور مشائخ کا شجرہ عطا فرمایا۔ اس پر شیخ کی بیوی نے عرض کیا، یہ لڑکی ابھی غیر شادی شدہ ہے، اسے کاغذ کے یہ چند اوراق دینا مناسب نہیں۔ اس کے لیے شادی کا سامان مہیا کرنا ضروری ہے۔ فرمایا کاغذ کے یہ اجزا ہمارے اسلاف کی یادگار اور بزرگوں کی میراث ہیں، ہم ان کاغذات کو دنیا کی تمام شوکت وحشمت سے زیادہ قیمتی اور وقیع ٹھہراتے ہیں۔ اس لڑکی کے ایک فرزند پیدا ہوگا، جو بڑا ہو کر اہل اللہ کی جماعت کا سربراہ قرار پائے گا اور بہت بڑا عالم دین اور مقتدر پیشوا ہوگا۔ درحقیقت وہ ہماری معنوی میراث کا صحیح حق دار ہوگا، لہٰذا یہ اوراق اس کے حوالے کر دینا۔ اس لڑکی کی شادی کے سامان اللہ خود مہیا کرے گا۔ وہ مسبب الاسباب ہے، تم اس کے متعلق کوئی فکر نہ کرو۔

اس لڑکی کی شادی شیخ وجیہ الدین سے ہوئی اور اس سے شاہ عبدالرحیم پیدا ہوئے۔ جب وہ سن رشد و شعور کو پہنچے تو یہ کاغذات ان کے حوالے کر دیے گئے۔

شاہ عبدالرحیم نے ابتدائی درسی کتابیں اپنے بھائی ابوالرضا محمد دہلوی سے اور علوم مروجہ کی انتہائی کتابیں قاضی محمد زاہد بن محمد اسلم ہروی سے پڑھیں۔ شرح عقائد کے کچھ اسباق شیخ عبداللہ بن عبدالباقی نقشبندی دہلوی سے پڑھے اور ساتھ ہی ان سے بہت سے روحانی فیوض حاصل کیے۔ ان سے بیعت ہونے کی بھی درخواست کی لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور سید عبداللہ اکبر آبادی کے حلقۂ بیعت میں داخل ہونے کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ وہ ان سے طریقہ نقشبندیہ کے مطابق بیعت ہوئے اور کافی عرصہ ان سے منسلک رہے۔ پھر شیخ ابوالقاسم اکبر آبادی سے وابستہ ہو گئے اور ان سے بہت استفاضہ کیا۔ مشہور بزرگ شیخ عظمت اللہ بن عبداللطیف اکبر آبادی سے خرقۂ چشتیہ حاصل کیا۔

بادشاہوں کی مجالس میں حاضری سے گریز:

شاہ عبدالرحیم کا شمار کبار مشائخ چشتیہ میں ہوتا تھا۔ قرآن وحدیث اور فقہ کے جلیل القدر علما اور عابد و زاہد اہل علم اور اصحابِ معرفت ان کے زہد وورع اور فضل وکمال پر متفق ہیں۔

شاہ عبدالرحیم گوشہ گیر عالم دین تھے۔ ملوک وامرائے مملکت کے درباروں میں جانے سے قطعی انکار کر دیتے۔ ان کے زمانے میں اورنگ زیب عالم گیر ہندوستان کا حکمران تھا جو نیک دل اور متدین بادشاہ تھا۔ اس کی خواہش کے باوجود شاہ صاحب اس کے پاس نہ جاتے۔ چنانچہ اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا جاتا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے جو حسب ذیل ہے:

شاہ عبدالرحیم کا ایک مخلص اور بے ریا معتقد بادشاہ اورنگ زیب کے سلسلۂ خدام میں داخل تھا۔ ایک دفعہ وہ عالم گیر کو پنکھا کر رہا تھا کہ دفعۃً اس پر محویت غالب ہوئی اور پنکھا ہاتھ سے چھوٹ کر اس زور سے بادشاہ پر گرا کہ وہ چونک پڑا۔ بیدار ہونے کے بعد دریافت کیا کہ یہ بے جا حرکت کرنے کی کیا وجہ ہے؟ غریب خادم نے کانپتی ہوئی زبان اور تھرتھراتی ہوئی آواز سے شاہ عبدالرحیم کا کچھ حال اور ان کی طرف اپنے انتساب کا ذکر کیا اور بتایا کہ اس وقت ان کا خیال ذہن میں آ گیا تھا، جس کی وجہ سے وہ یہ بھول گیا کہ بادشاہ کو پنکھا کر رہا ہے۔ اس خیال میں کچھ اس طرح کھو گیا کہ پنکھا ہاتھ سے گر پڑا۔ عالم گیر نے یہ بات پورے غور اور توجہ سے سنی اور غائبانہ مشتاقِ ملاقات ہو کر بولا کہ شاہ صاحب کو میرے پاس بلا کر لاؤ۔ خادم نے نہایت ساجت سے عرض کیا کہ بادشاہوں کی محفلوں اور امیروں کے گھروں میں جانا شاہ صاحب کا دستور نہیں۔ چونکہ عالم گیر مذہب کا سخت پابند اور اہل اللہ کا انتہائی معتقد تھا لہٰذا خادم کا یہ جرأت مندانہ جواب سن کر اس کے دل میں شاہ صاحب سے اشتیاق ملاقات کی آگ بھڑک اٹھی اور اپنے دربار کے ایک معتمد علیہ شخص کو، جو شاہ صاحب سے غایت درجہ کا اعتقاد رکھتا تھا، شاہ صاحب کی خدمت میں روانہ کیا اور اشتیاق ملاقات کے لیے جو اضطرابی کیفیت طاری تھی، بیان کی۔ اس شخص نے شاہ صاحب کو بادشاہ ہند کا پیغام پہنچایا، اور اس کے دربار میں جانے کی درخواست کی۔ مگر شاہ صاحب نے جانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں بادشاہ سے ملاقات کے لیے اس کے دربار میں نہیں جا سکتا۔ عالم گیر کے فرستادہ نے مایوس ہو کر شاہ صاحب سے عرض کیا کہ آپ کاغذ پر لکھ دیجیے تاکہ میں وہ تحریر بادشاہ کو دکھا دوں اور وہ آپ کے نہ جانے کو میری تقصیر پر محمول نہ کرے۔ آپ نے ایک بوسیدہ کاغذ کا ٹکڑا زمین سے اٹھایا اور یہ عبارت لکھی:

''اہل اللہ کی جماعت کا اس پر اجماع ہو چکا ہے کہ بئس الفقیر علیٰ باب الامیر اور اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: ﴿فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ﴾ ❶ قرآن مجید کے ان الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر آپ کو دنیاوی اعزاز اور حشمت و شوکت حاصل ہے، وہ اس کائنات کے کل کا ایک نہایت ہی اقل القلیل جز ہے۔ اگر میں یہ تسلیم بھی کر لوں کہ آپ مجھ سے مل کر خوش ہوں گے اور اپنی دنیاوی شوکت و حشمت میں سے کچھ مجھے دیں گے تو اس سے بڑھ کر اور کچھ نہیں کہ ایک جز دیں گے اور میں اس جز کے لیے اپنا نام خدا کے دفتر سے خارج نہیں کرانا چاہتا، کیونکہ بزرگان چشتیہ کے ملفوظات میں لکھا ہے کہ جس شخص کا نام بادشاہ کے رجسٹر میں درج ہو جاتا ہے، خدا تعالیٰ کے رجسٹر سے اس کا نام کھرچ دیا جاتا ہے۔''

یہ الفاظ لکھ کر شاہ عبدالرحیم نے عالم گیر کو بھیج دیے۔ بادشاہ نے یہ الفاظ بار بار پڑھے اور بڑے غور سے پڑھے۔ ان الفاظ سے اس کو ہر دفعہ ایک نیا لطف محسوس ہوتا۔ کاغذ کا یہ پرزہ اس کے نزدیک اس درجہ محبوب

❶ یہ سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۳۸ کا ایک جز ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: (آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کا فائدہ کم ہے)۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھا کہ اس نے اسے جیب میں ڈال لیا اور بصورت تعویذ اپنے پاس رکھا۔ جب وہ نیا خلعت زیب تن کرتا، اسے جیب سے نکال کر دوسری جیب میں رکھ لیتا۔ فرصت کے وقت اسے باقاعدہ پڑھتا اور زار و قطار روتا❶۔

مسائل فقہی پر تعامل:

فقہی مسائل پر تعامل کے سلسلے میں شاہ عبدالرحیم ایک خاص نقطۂ نظر کے حامل تھے۔ اکثر مسائل میں حنفی مسائل کے مطابق عمل کرتے اور حنفی فقہ کو پیش نظر رکھتے، لیکن بعض مسائل کے بارے میں ان کی تحقیق یہ تھی کہ فقہ حنفی کے ان مسائل پر حدیث کو ترجیح حاصل ہے۔ ان مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ وہ نماز میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے قائل تھے، اسی طرح نماز جنازہ میں بھی سورۂ فاتحہ ترک نہ کرتے ___ ایک روز شیخ عبدالاحد سرہندی (متوفی ۲۷/ ذی الحجہ ۱۱۲۷ھ/ ۱۳/ دسمبر ۱۷۱۵ء) نے جو شیخ محمد سعید کے بیٹے اور شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے پوتے تھے، اس مسئلے پر بحث چھیڑ دی اور اپنے اسلاف سے ایک متواتر نقل اس طرح پیش کی کہ نماز باجماعت کی مثال ایسی ہے جیسا کہ کچھ لوگ بہ صورت جماعت ایک پُر شوکت بادشاہ کے سامنے کھڑے ہو کر عرض احوال کریں اور ظاہر ہے کہ بادشاہ کا درباری ادب اس امر کا مقتضی ہے کہ اس کے سامنے سب لوگ بہ یک وقت اپنی حاجتیں پیش نہ کریں بلکہ ایک ہی شخص سب کی نمائندگی کا فرض انجام دے۔

شاہ عبدالرحیم نے جواب میں فرمایا کہ نماز کو بادشاہ کے سامنے اس کے دربار میں معروضات پیش کرنے پر قیاس کرنا صحیح نہیں۔ اللہ کے حضور خاص شکل و انداز سے دعا اور الحاح و خضوع سے مناجات کرنا اور ایک مخصوص طریقے سے نفس کو تہذیب و تزکیہ سے آراستہ کرنا نماز کہلاتا ہے۔ اللہ، سمیع ہے، اگر تمام دنیا کے لوگ ایک ہی میدان میں کھڑے ہو جائیں اور ان میں سے ہر شخص الگ زبان اور دوسرے سے مختلف الفاظ و انداز میں اللہ سے کچھ طلب کرے تو وہ علیحدہ علیحدہ ہر شخص کی سنتا ہے۔ اس کے حضور ایک کی دعا و مناجات دوسرے کی دعا و مناجات میں خلل انداز نہیں ہو سکتی۔

قبولیت دعا:

شاہ عبدالرحیم کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتوں سے نوازا تھا، جن میں ایک نعمت یہ عطا فرمائی کہ وہ مستجاب الدعوات تھے۔ ان کی قبولیت دعا کے متعلق ان کے حالات میں متعدد واقعات مرقوم ہیں۔ ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ ان کے بڑے لڑکے صلاح الدین کسی خطرناک مرض میں مبتلا ہوئے اور مرض نے یہاں تک طول پکڑا کہ زندگی کی امید بالکل منقطع ہو گئی اور ظاہری اسباب دیکھ کر شاہ صاحب ان کی زندگی سے مایوس ہو گئے۔ خود شاہ صاحب یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب میں نے دیکھا کہ صلاح الدین کی رگِ

❶ حیات ولی، حاشیہ، ص ۱۹۸ تا ۲۰۰۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حیات کٹ چکی ہے تو لوگوں کو کفن خرید کر لانے اور قبر تیار کرنے کا حکم دیا، لیکن اس کے ساتھ ہی فوراً میرے دل میں ایک جذبہ بیدار ہوا اور میں نے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اللہ کے حضور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ جب میری الحاح و عاجزی بہت بڑھ گئی تو ایک فرشتہ آیا اور اس نے صلاح الدین کی حیات و صحت کی بشارت دی۔ اسی اثنا میں صلاح الدین کو چھینک آئی اور کروٹ بدل کر کھڑے ہو گئے۔

شاہ عبدالرحیم کی قبولیت دعا کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ دہلی میں بارش کا سلسلہ بند ہو گیا اور قحط سالی کے آثار پیدا ہو گئے، جس سے لوگوں میں بے چینی اور بے قراری پھیل گی۔ لوگ دعا کے لیے شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر اللہ سے دعا کی۔ دعا ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ آسمان پر ابر نمودار ہوا اور ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی۔ شاہ صاحب نے فرمایا کثرتِ باراں ہماری کچی دیواروں کو کسی چیز سے ڈھانپ دینے پر موقوف ہے۔ غیبی تدبیر ہمارے مکان کی دیواروں کو ڈھانے اور مسمار کرنے سے احتراز کرتی ہے۔ ان کے یہ الفاظ سن کر لوگوں نے فوراً بانس اور گھاس ان کے مکان کی دیواروں پر ڈال دیا۔ بعد ازاں اتنی موسلا دھار بارش ہوئی کہ خشک چشمے اور سوکھی نہریں پانی سے ابل پڑیں اور عرصے تک بارش کی ضرورت نہ رہی۔

تبحر علمی:

شاہ عبدالرحیم علم و فضل میں بڑی فوقیت رکھتے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ اس نیل گوں آسمان کے نیچے شیخ عبدالرحیم سے زیادہ فن حدیث کا ماہر اور عالم ان کے عہد میں کوئی نہ تھا۔ اگر میں انصاف سے اس سلسلے میں رائے ظاہر کروں تو بلا تامل اس حقیقت کا اعتراف کروں گا کہ میں نے ان جیسا ایک شخص بھی نہیں دیکھا جو تمام علوم میں عموماً اور حدیث و فقہ میں خصوصاً تبحر رکھتا ہو۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بعد شاہ صاحب کے پایہ کے کسی محدث و مفسر اور فقیہ کو ہندوستان کی گود میں پرورش پانا بہت کم نصیب ہوا ہو گا۔ شاہ صاحب کو صحاح کی اکثر حدیثیں ازبر تھیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ تمام احادیث مع اسناد کے بلا توقف بیان کرنے میں انھیں ملکہ خاص حاصل تھا۔

طالب علمی کا ایک واقعہ:

شاہ صاحب بچپن ہی سے نہایت ذہین تھے اور جودتِ فکر میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ اس ضمن میں ان کا طالب علمی کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے جو درج ذیل ہے:

میر محمد زاہد ہروی کے مدرسے میں ملا حامد جون پوری، شاہ صاحب کے ہم درس تھے اور دونوں شرح مواقف پڑھتے تھے، جو نہایت دقیق اور مشکل کتاب ہے۔ ملا حامد بھی بڑے طباع اور تیز ذہن تھے۔ شاہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صاحب کتاب کی عبارت پڑھتے تھے اور کہیں نہ رکتے تھے، نہ کوئی بات استاد سے پوچھتے تھے۔ ملا حامد اس پر نالاں تھے۔ وہ ہر مسئلہ استاذ سے بتفصیل سمجھنا چاہتے تھے۔ ایک روز شاہ صاحب کتاب کا ایک مشکل مقام پڑھ رہے تھے۔ ملا حامد کو یقین تھا کہ شاہ صاحب یہاں ضرور رکیں گے اور استاذ سے پوچھیں گے، مگر وہ مسلسل پڑھتے چلے گئے۔ اس سے ملا حامد کو سخت غصہ آیا اور ان سے مخاطب ہو کر کہا: آپ کچھ سمجھتے بھی ہیں یا یوں ہی آگے کو بھاگے جا رہے ہیں؟ شاہ صاحب نے نرمی سے جواب دیا، میرا خیال تھا آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ اگر کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی، تو فرمایئے، میں آپ کو سمجھائے دیتا ہوں۔ ملا حامد نے کتاب کے اس دقیق اور مشکل مقام پر انگلی رکھ کر کہا، بتایئے اس کا کیا مطلب ہے؟ انھوں نے تفصیل و وضاحت سے اور آسان الفاظ میں بات سمجھا دی۔ اس وقت ان کے استاذ میر محمد زاہد ہروی بھی تشریف فرما تھے اور ہم درس طلبا بھی موجود تھے۔ وہ ان کی حدتِ فہم سے متعجب بھی ہوئے اور خوشی کا اظہار بھی کیا۔

شوق شعری:

علوم عقلیہ و نقلیہ میں مہارت تامہ کے ساتھ ساتھ، شاہ عبدالرحیم شعر و شاعری کا بھی ذوق رکھتے تھے اور ان کی شاعری میں پند و نصائح کا رنگ غالب تھا۔ مثلاً یہ رباعی انھی کی ہے:

اے کہ نعمت ہائے تو از حد افزوں — شکرِ نعمت ہائے تو از حد بروں
عجز از شکرِ تو باشد شکرِ ما — گر بود فضلِ تو مارا رہنموں

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میرے والد نماز ظہر کے بعد اچانک میری طرف متوجہ ہوئے اور برجستہ یہ دو شعر ارشاد فرمائے:

اگر تو راہِ حق بخواہی اے پسر — خاطرِ کس را مرنجاں الحذر
در طریقت رکن اعظم رحمت است — ایں چنیں فرمود آں خیر البشر

یہ رباعی پڑھ کر فرمایا: ”ولی اللہ! قلم دوات پکڑو اور یہ رباعی لکھ لو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے دفعتاً میرے دل میں اس مضمون کو اسی غرض سے القا فرمایا ہے کہ تمھیں وصیت کروں۔

اہل اللہ اور مجاذیب سے ملاقات:

حضرت شاہ عبدالرحیم چونکہ خود بھی اہل اللہ اور صاحب تقویٰ تھے، اس لیے وہ اس قسم کے حضرات سے بہت تعلق رکھتے تھے۔ مجذوبوں سے بھی ان کو انس تھا اور متعدد مجذوبوں سے انھوں نے ملاقات بھی کی۔ اس نوع کے بہت سے واقعات خود شاہ صاحب نے بیان کیے ہیں۔ ان میں ایک واقعہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ کسی تقریب سے سونی پت گیا۔ اتفاقاً دل میں خیال آیا کہ یہاں منور مجذوب کو دیکھنا چاہیے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چنانچہ میں وہاں پہنچا جہاں وہ قیام پذیر تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ مگر جوں ہی اس نے میری آہٹ محسوس کی، چاروں طرف سے اپنی گدڑی سمیٹ کر اس میں لپٹ گیا اور ہوش و حواس بحال کر کے خاموشی سے بیٹھ گیا۔ میں تھوڑی دیر بیٹھا اور جب دیکھا کہ وہ کوئی بات نہیں کرتا تو خود میں نے گفتگو شروع کی اور کہا، مجھے آپ سے ایک سوال پوچھنا ہے، اگر عقل و ہوش سے جواب دیں تو عرض کروں۔ اس نے کہا، آپ بات کیجیے، میں حتی الامکان احتیاط سے جواب دوں گا۔ میں نے کہا، صرف اتنی بات بتائیں کہ آپ کو ایسی کون سی چیز حاصل ہے، جس نے آپ کی ساری عقل و تمیز ختم کر کے رکھ دی ہے اور ہوش و حواس سلب کر لیے ہیں۔ مجذوب نے میری بات سن کر پہلے تو سکوت اختیار کیا جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا ہو۔ پھر سر اٹھا کر بولا۔ عزیز من! یہ ایسا نازک اور باریک سوال ہے، جس کا جواب عبارت کے قالب میں ڈھالنا اور الفاظ کے پیرایہ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ البتہ ایک مثال کے اسلوب میں تم پر اس کی کیفیت ظاہر کرتا ہوں۔ سنو! جس چیز نے ہماری عقل و تمیز سلب کر کے ہمیں مجنونوں اور دیوانوں کے زمرے میں داخل کیا ہے، اسے ایک ایسی کیفیت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ ایک شخص نے مقدار سے زیادہ گرمی محسوس کی اور پسینے میں غرق ہو گیا۔ ناگہاں نہایت سرد اور خوش آئند ہوا کے جھونکے شروع ہو گئے، جن سے اس کو راحت کلی حاصل ہوئی۔ بس یہی کیفیت ہم لوگوں پر طاری ہو کر ہمیں اس درجے کو پہنچا دیتی ہے۔ میں نے کہا، اس سے بہتر کیفیت تو سالکوں کو حاصل ہوتی ہے، مگر پھر بھی ان کی عقل بحال اور حواس قائم رہتے ہیں۔ اس نے جواب دیا۔ عزیز من! یہ مشیت الٰہی ہے، جس شخص کو جیسا چاہتا ہے رکھتا ہے۔

صوفیا کا لباس:

شاہ عبدالرحیم صاحب فرماتے ہیں، ایک دفعہ مجھے خیال آیا کہ صوفیا کے لباس میں مقید رہنا بہر کیف تکلف سے خالی نہیں۔ اس خیال نے مجھ پر اتنا اثر کیا کہ میں نے اسی آن وہ لباس اتار پھینکا اور سپاہیانہ لباس پہن لیا۔ یعنی عمامہ باندھا، کمر میں تلوار لگائی اور گھوڑے پر سوار ہو کر باہر نکل پڑا۔ ابھی تھوڑی دور گیا تھا کہ ایک مجذوب سامنے سے آ کر کہنے لگا، کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص چاند کو پیالے سے چھپا لے؟ ہرگز نہیں۔ عزیز من! تیرے معبود کی قسم۔ یہ لباس تیری شان کے سزاوار نہیں۔ اسے اتار ڈال اور لباس صوفیا زیب تن کر۔ چنانچہ اسی وقت میں نے بالالتزام صوفیا کا سا لباس اختیار کر لیا۔ اس کے علاوہ کسی قسم کا لباس پہننا پسند نہیں کیا۔

مدرسہ رحیمیہ کی بنیاد:

ہندوستان میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ نے خدمت علم حدیث کی بنیاد ڈالی، مگر اس زمانے میں چونکہ چاروں طرف جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی، لہٰذا حضرت شیخ کی تمام تر مساعی کے باوجود اس کی پوری

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طرح اشاعت وترویج نہ ہوسکی۔ ان کے بعد اللہ تعالیٰ نے شاہ عبدالرحیم کو پیدا کیا اور انھوں نے دہلی میں مدرسہ قائم کیا، جس نے مدرسہ رحیمیہ کے نام سے شہرت پائی۔ اس مدرسے میں انھوں نے لوگوں کو علم حدیث کی تعلیم دینا شروع کی۔ اس میں دور دراز مقامات سے کثیر تعداد میں علما و طلبا علم حدیث پڑھنے کے لیے آنے لگے اور لوگوں میں اس کے حصول کے لیے ایک تحریک پیدا ہوگئی اور پھر آہستہ آہستہ بے شمار شائقین علوم دینی اس چشمۂ علم سے سیراب ہوئے۔

علمی مباحث:

شاہ عبدالرحیم دہلوی کی خدمت میں مختلف مقامات سے علمائے دین تشریف لاتے اور ان سے بعض دلچسپ علمی بحثیں ہوتیں۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ شاہ ولی اللہ یہ تحریر فرماتے ہیں کہ ایک دن میرے والد (شاہ عبدالرحیم) نے مجھ سے بیان کیا کہ سید علیم اللہ نے، جو شیخ آدم قدس سرہ کے اکابر اصحاب میں سے ایک نہایت مقتدر اور جلیل القدر شخص ہیں اور جن کے فضل و کمال اور علمی کارناموں کی بڑی شہرت ہے، حرمت تمباکو کے موضوع پر ایک پُرزور رسالہ لکھا اور دو افغانیوں کی معرفت علمائے دہلی کے پاس بھیجا۔ سب سے پہلے وہ رسالہ مجھے دکھایا گیا۔ اس رسالے میں قرآن کی آیت: ﴿فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ﴾ ❶۔ اور اسی نوع کے چند اور دلائل سے حرمت تمباکو میں استدلال کیا گیا تھا۔ میں نے رسالہ پڑھا تو اُن افغانی حضرات سے صاف الفاظ میں کہا کہ حرمت تمباکو سے متعلق یہ تمام استدلال بالکل کمزور ہیں۔ ان سے کام نہیں چلے گا۔ اس کے بعد میں نے اس میں درج شدہ روایات کی تفصیل سے تردید کی اور مذکورہ بالا آیت کی صحیح تفسیر بیان کی۔ اس ضمن میں وہ اقوال پیش کیے جو معتبر و مستند مفسرین سے منقول ہیں۔ اگرچہ میری تقریر مدلل اور معلومات سے پُر تھی، تاہم وہ افغانی نہ تو اس سے متاثر ہوئے اور نہ انھوں نے اس میں کوئی دلچسپی لی، بلکہ ناراض اور ناخوش ہوکر مجلس سے اٹھے اور ملا یعقوب کے مدرسے میں پہنچ گئے۔ ملا یعقوب دہلی کے مشہور عالم اور فاضل شخص تھے، مگر تمباکو نوشی کے سخت عادی تھے اور اسے قطعی مباح سمجھتے تھے۔ یہ لوگ ان کے مدرسے میں گئے تو وہ برسر مجلس اور دورانِ درس حقہ پی رہے تھے۔ افغانی طلبا نے اس پر اعتراض کیا تو ملا یعقوب نے کہا، میں برسر مجلس اس لیے حقہ پیتا ہوں کہ لوگوں کو اس کی اباحت معلوم ہوجائے اور اگر کسی کو اس کے مباح ہونے میں شبہ ہو تو دلیل پیش کرے، میں اس کا جواب دوں گا۔

سید علیم اللہ کے فرستادوں یعنی افغانی طلبا نے جرأت مندانہ انداز میں کہا، چونکہ اس مسئلے کا ماخذ موجود ہے، اس لیے اس کا فیصلہ بہت آسانی سے ہوسکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس رسالے میں سے چند فقہی دلائل پیش کیے۔ ملا یعقوب نے فوراً ان کی تردید کر دی، اور وہ لوگ زورِ دلائل میں ان کا مقابلہ نہ کر پائے۔ اب وہ

❶ یہ سورۂ دخان کی آیت ۱۰ ہے۔ ترجمہ یہ ہے: (اس دن کا انتظار کرو کہ آسمان سے واضح طور پر دھواں نکلے گا۔)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوبارہ شاہ عبدالرحیم کی خدمت میں آئے اور ملا یعقوب سے مباحثہ ومناظرہ کی کیفیت بیان کی۔ شاہ عبدالرحیم نے فرمایا، حرمت تمباکو سے متعلق تمھارا استدلال غلط ہے، اس لیے تمھارے ساتھ یہی کچھ ہونا چاہیے تھا۔

شاہ صاحب نے ان سے کہا، مغموم ہونے کی ضرورت نہیں، اب میں تمھیں ایک دلیل بتاتا ہوں۔ تم ملا یعقوب کے پاس جاؤ اور اسی طرح بات کرو جس طرح میں تم سے کہتا ہوں۔

تم ان سے قرآن کی آیت ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ أَحَلَّ ٱللَّهُ لَكَ﴾ ❶ کی شانِ نزول دریافت کرو۔ وہ اس کا جواب یہ دیں گے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی زوجۂ مطہرہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے گھر شہد تناول فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ تمام ازواج مطہرات نے حضرت زینب پر رشک کرتے ہوئے آپس میں مشورہ کیا کہ آج آنحضرت ﷺ جس بیوی کے پاس تشریف لائیں، وہ آپ سے افسوس ناک لہجے میں عرض کرے کہ حضور کے مبارک منہ سے گندنے (مغافیر) کی بو آرہی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، میں نے گندنا (مغافیر) تو نہیں کھایا، البتہ شہد کھایا ہے۔ اس پر ایک زوجہ مطہرہ نے عرض کیا، معلوم ہوتا ہے شہد کی مکھی گندنے کے درخت پر بیٹھی ہے اور اس کی بو شہد میں سرایت کرگئی ہے۔ یہ بات سن کر آنحضرت ﷺ نے اپنے آپ پر شہد کو حرام ٹھہرالیا اور نتیجتاً یہ آیت نازل ہوئی۔

شاہ صاحب نے مزید فرمایا کہ جب ملا یعقوب اس آیت کی شان نزول کے بارے میں تقریر کرچکیں تو آپ ان سے سوال کریں کہ آخر آنحضرت ﷺ کے نزدیک شہد کی علت کراہت کیا تھی؟ ملا یعقوب بجز اس کے کچھ نہ کہہ سکیں گے کہ علت کراہت بدبو تھی۔ اس پر آپ ان سے پوچھیں کہ حدیث شریف میں جو یہ الفاظ وارد ہیں کہ من اکل هاتين الشجرتين فلا يقربن مسجدنا ❷ تو اس میں علت نہی کیا ہے؟ ملا یعقوب جواب دیں گے ''بوئے بد''، اس کے بعد آپ بے دھڑک ہوکر پوچھیں کہ حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ خوشبو سے رغبت اور بدبو سے نفرت کرتے تھے تو یہ صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح ہے تو ہم آپ سے سوال کرتے ہیں کہ تمباکو میں بدبو ہے یا نہیں؟ اگر اس سوال کے جواب میں ملا یعقوب یہ کہیں کہ تمباکو میں بدبو نہیں ہے، تو آپ ان سے پوچھیں کہ جن لوگوں نے کبھی تمباکو نہیں پیا ہے، ان سے دریافت کرنا چاہیے کہ اس کی بو دماغ کو اچھی معلوم ہوتی ہے یا بری۔؟ اور جب اس میں ازراہ تجربہ ومشاہدہ بوئے بد کا پایا جانا ثابت ہوتا ہے تو اصحاب علم اور اہل ورع وتقویٰ کے نزدیک مناسب یہی ہے کہ تمباکو نوشی ترک کردیں۔

---

❶ یہ سورۂ تحریم کی آیت نمبر ا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: (اے پیغمبر! جو چیز اللہ نے آپ کے لیے حلال قرار دی ہے، آپ اسے اپنے لیے حرام کیوں ٹھہراتے ہیں۔)

❷ یہ حدیث الفاظ کے تھوڑے سے تغیر وتبدل کے ساتھ مختلف کتب احادیث میں موجود ہے۔ سنن ابی داؤد کے کتاب الاطعمہ میں بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص ان دو پودوں (یعنی لہسن اور پیاز) کھانے کے بعد (اس وقت تک) مسجد میں نہ جائے (جب تک اس کی بو باقی رہے)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چنانچہ وہ دونوں افغانی طلبا دوبارہ ملا یعقوب کے پاس گئے اور اسی طرح سلسلہ گفتگو شروع کیا جس طرح شاہ عبدالرحیم نے فرمایا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملا یعقوب نے ان باتوں کا اعتراف کیا اور اسی وقت چلم اور نے کو توڑ ڈالا اور تمبا کو نوشی ہمیشہ کے لیے ترک کردی۔

شاہ صاحب سے ملا عبداللہ چلپی کی بیعت:

ایک مرتبہ ایک مجلس میں شاہ عبدالرحیم صاحب کی ملاقات ملا عبداللہ چلپی سے ہوئی، جنھوں نے بعد میں فتاویٰ عالم گیری کا فارسی میں ترجمہ کرنے کی سعادت حاصل کی۔ اس ملاقات کے نتیجے میں وہ شاہ عبدالرحیم سے بیعت بھی ہوئے۔ اس ملاقات کی تفصیل بڑی دلچسپ ہے، جو حضرت شاہ ولی اللہ اپنے والد محترم حضرت شاہ عبدالرحیم کی زبانی بیان فرماتے ہیں۔ ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

عبداللہ چلپی ایک داعی تھا، جو روم (ترکستان) سے ایران اور ایران سے ہندوستان آیا۔ اس کے بارے میں عجیب وغریب باتیں لوگوں میں مشہور تھیں۔ ان میں ایک بات یہ تھی کہ وہ چالیس روز بے آب ودانہ حجرے میں معتکف رہتا ہے۔ باہر سے حجرے کا دروازہ بند کردیا جاتا ہے اور وہ چالیس دن بعد صحیح اور تندرست حالت میں باہر نکل آتا ہے۔ یہ بھی سنا جاتا تھا کہ اندھیرے میں بیٹھ کر قرآن مجید لکھتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زمین میں گھس جاتا ہے اور جہاں سے چاہتا ہے، نکل آتا ہے۔ ان باتوں کی جہ سے اس کا شمار اولیاء اللہ اور اصحاب کرامات بزرگوں میں کیا جانے لگا۔ شاہ عبدالرحیم فرماتے ہیں، عبداللہ چلپی کے اس قسم کے کمالات و فضائل سن کر میرے دل میں اس سے اشتیاق ملاقات کا جذبہ ابھرا اور میں اس سے ملنے کے لیے روانہ ہوگیا۔ ان دنوں وہ بادشاہ سے چھپ کر ایرانیوں کے مکان میں قیام پذیر تھا۔ وہ شیعہ تھے، میں وہاں پہنچا۔ مذہبی معاملے میں ان سے بحث کا سلسلہ جاری رہا اور انھوں نے بلا تکلف بتایا کہ وہ میری باتوں سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔

غرض میں نے عبداللہ چلپی سے ملاقات کی۔ یقین جانیے، میں جس بے تابی اور جذبۂ شوق سے اس سے ملنے گیا تھا، اس کی شکل دیکھ کر اس کے لیے میرے دل میں اس سے کہیں زیادہ نفرت اور کراہت پیدا ہوئی۔ میں نے نظر اول ہی سے معلوم کرلیا کہ یہ شخص اولیاء اللہ کے آداب واسالیب سے بالکل ناآشنا ہے۔ اسی بنا پر میں نے اس کی تعظیم سے گریز کیا۔ میں نہایت مکدر ہوکر واپس آنے لگا تھا کہ میرے چہرے کا یہ فوری تغیر ایک ایرانی نے بھانپ لیا اور بولا" کیا وجہ ہے کہ جس شوق سے آپ عبداللہ کی ملاقات کو تشریف لائے تھے، اس سے کہیں زیادہ اسے دیکھ کر اعراض اور پہلو تہی کی"؟ میں نے صاف الفاظ میں جواب دیا کہ" میں عبداللہ کو اللہ کا ولی سمجھتا تھا، لیکن دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ ولی نہیں ہے بلکہ صاحب دعوت ہے۔" عبداللہ نے میری یہ بات سنی تو کہا" شیخ سچ کہتے ہیں۔"

اس کے بعد عبداللہ نے دعائے سیفی پڑھنا شروع کی اور پڑھتے پڑھتے ایسے مقام پر پہنچا، جہاں

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اگرچہ قواعد نحوی کے لحاظ سے اعراب میں دونوں طرح کا احتمال تھا تاہم وجدان کے اعتبار سے صرف ایک ہی وجہ متعین تھی اور عبداللہ نے دوسری وجہ اختیار کی تھی۔ اس پر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں بول اٹھا۔ ''عبداللہ! تم نے غلط پڑھا ہے۔'' اس کے جواب میں اس نے پورے زور سے کہا: ''نہیں۔ میں نے غلط نہیں پڑھا۔ میں نے صحیح پڑھا ہے۔ آپ مجھے غلط بتا رہے ہیں۔'' اس پر بحث شروع ہوگئی اور دعائے سیفی کے وہ نسخے فراہم کیے گئے جو اساتذہ سے پہنچے تھے۔ مختلف اساتذہ کے بارہ نسخے دیکھے گئے اور اتفاق کی بات یہ کہ ان میں اعراب وہی درج تھا جو عبداللہ نے پڑھا تھا۔ اب تیرھواں نسخہ دیکھا گیا۔ یہ نسخہ شیخ احمد جام کے تبرکات میں سے تھا اور سب نسخوں سے زیادہ معتبر اور مستند مانا جاتا تھا۔ یہ نسخہ بہت مشکل سے کسی اہل علم امیر حکومت کے کتب خانے سے منگوایا گیا تھا۔ اس میں وہ اعراب لکھا تھا، جو میں کہتا تھا۔ اس پر عبداللہ نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور میری تحسین کی۔

اس کے بعد اس نے ایرانیوں سے مخاطب ہو کر کہا: ''تم جانتے ہو، میں نے اس سلسلے میں اتنی تحقیق اور چھان بین کیوں کی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب میں دعائے سیفی پڑھتے پڑھتے اس مقام پر پہنچتا تھا جس کے نحوی اعراب کے بارے میں شیخ نے مجھ سے اختلاف کیا، تو میں اپنے سامنے ایک ظلمت اور تاریکی پاتا تھا۔''

بالآخر عبداللہ چلپی نے نہ صرف شاہ عبدالرحیم کی بات تسلیم کر لی بلکہ ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گیا اور ان سے بیعت ہو کر طریقہ قادریہ میں شامل ہوا۔

فتاویٰ عالم گیری میں حصہ:

شاہ عبدالرحیم دہلوی رحمہ اللہ فقہ اور اس کے مختلف گوشوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ فتاویٰ عالم گیری کے سلسلے میں بھی انھوں نے خدمات انجام دیں۔ وہ فتاویٰ عالم گیری کے باقاعدہ مرتبین کی جماعت میں تو شامل نہ تھے، البتہ اس کی ترتیب و تدوین کے بعد اس پر نظر ثانی میں ان کا حصہ ہے۔ فتاویٰ کی ترتیب کے بعد اس پر نظر ثانی کا مرحلہ پیش آیا تو اس کا اہتمام شیخ حامد جون پوری کے سپرد کیا گیا تھا۔ شیخ حامد جون پوری اپنے وقت کے جید عالم و فقیہ تھے اور علامہ محمد زاہد ہروی کے مدرسے میں شاہ عبدالرحیم دہلوی کے ہم سبق رہ چکے تھے، اس بنا پر شاہ صاحب کی فقہی عظمت اور علمی قابلیت سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ ایک دن وہ شاہ صاحب کے پاس آئے اور کہا کہ اگر آپ فتاویٰ کی دوبارہ تدوین اور نظر ثانی میں مجھ سے تعاون کریں تو اس کے صلے میں ایک معقول رقم روزانہ آپ کی خدمت میں پیش ہوتی رہے گی۔ لیکن شاہ صاحب مستغنی المزاج اور بے نیاز قسم کے عالم تھے، انھوں نے شیخ حامد کی اس پیش کش کو کوئی اہمیت نہ دی اور بے توجہی سے ان کو ٹال دیا۔ اتفاق سے شاہ صاحب کی والدہ ماجدہ نے یہ بات سن لی تھی، انھوں نے بیٹے کی بے پروائی پر خفگی کا اظہار کیا اور گھر کی مالی کمزوریوں کی وجہ سے اصرار کیا کہ وہ یہ خدمت بہر حال قبول کر لیں۔ چنانچہ شاہ صاحب نے والدہ کے حکم سے مجبور ہو کر شیخ حامد کی بات مان لی اور فتاویٰ پر نظر ثانی کرنے کی ذمہ داری قبول کر لی۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک دن شاہ عبدالرحیم فتاویٰ کے ایک مقام کا مطالعہ کر رہے تھے کہ ایسی عبارت پر نظر پڑی، جس میں بہت الجھاؤ اور اختلال تھا اور اس اختلال کی وجہ سے مسئلہ زیر بحث کی اصل صورت بالکل بدل گئی تھی۔ شاہ صاحب نے شیخ حامد کو فتاویٰ عالم گیری کے اس حصے کے مؤلف کی اس لغزش سے متنبہ کیا اور فرمایا کہ میرے نزدیک یہ عبارت مختل اور الجھی ہوئی ہے اور اصل مسئلہ یوں معلوم ہوتا ہے۔ لیکن شیخ حامد جون پوری نے شاہ صاحب کی بات پر توجہ نہ کی اور مؤلف کی وسعت نظر پر اعتماد کر کے آگے بڑھنے کو ترجیح دی۔

شاہ صاحب نے اپنے نقطۂ نظر کی تائید اور وضاحت کے لیے جب مسئلہ زیر بحث کا ماخذ تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ دو کتابوں میں مختلف عبارتوں میں لکھا گیا ہے۔ مگر یہاں صورت حال یہ تھی کہ فتاویٰ عالم گیری کے مؤلف نے دونوں عبارتوں کو بلا کسی فرق اور امتیاز کے ایک ہی جگہ درج کر دیا تھا، جس کی وجہ سے اختلال پیدا ہو گیا تھا، لہٰذا شاہ صاحب نے فتاویٰ کے حاشیے پر یہ عبارت لکھ دی:

من لم يتفقه في الدين قد خلط فيه ، هذا غلط ، وصوابه كذا۔

کہ جو دین کی سمجھ سے بہرہ مند نہیں، اس نے اصل بات کو خلط ملط کر دیا ہے، یہ غلط ہے۔

اصل مسئلہ یوں ہے۔

جس زمانے میں فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب و تدوین اور نظر ثانی کا مرحلہ درپیش تھا، اس زمانے میں خود اورنگ زیب اس میں انتہائی دلچسپی لیتا تھا۔ اس میں اس کی محنت اور اہتمام کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ شیخ نظام برہان پوری اس کام کے نگران تھے۔ ان کا فقہی مرتبہ بہت بلند تھا۔ وہ نظر ثانی شدہ مواد کے روزانہ ایک یا دو صفحے بادشاہ کے سامنے پڑھا کرتے اور بادشاہ کامل توجہ اور انہماک سے ایک ایک مسئلے کو دیکھتا اور پورے غور سے سنتا تھا۔ وہ کاتبوں کی غلطیاں بھی خود درست کرتا تھا۔ جب شیخ نظام برہان پوری معمول کے مطابق بادشاہ کے سامنے کتاب پڑھنے لگے اور اس مقام پر پہنچے، جسے شاہ صاحب نے مختل اور الجھا ہوا قرار دیا تھا، تو شاہ صاحب کے حاشیے کی عبارت کو متن کے ساتھ ملا کر پڑھ دیا۔ بادشاہ نے یہ عبارت سنی تو بڑا حیران ہوا۔ پھر جب اس نے دیکھا کہ شیخ برابر پڑھتے ہی جا رہے ہیں، رکتے نہیں ہیں تو کہا:

ایں عبارت چیست؟

(یہ کیا عبارت ہے؟)

ذرا پھر پڑھیے۔ شیخ نظام دوسری مرتبہ بھی حاشیہ اور متن کا فرق سمجھے بغیر اسی طرح پڑھ گئے۔ اب عالم گیر نے شیخ سے اس مقام کی وضاحت چاہی تو وہ کوئی جواب نہ دے سکے، اور کہا:

ایں مقام را مطالعہ نہ کردہ ام فردا بہ تفصیل عرض خواہم کرد۔

(میں نے اس مقام کا مطالعہ نہیں کیا، کل تفصیل سے بتاؤں گا۔)

شیخ بڑے حیران اور پریشان ہوئے۔ عالم گیر سے فارغ ہوئے تو فوراً شیخ حامد جون پوری کے پاس

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہنچے اور خفگی کا اظہار کیا۔ فرمایا، میں نے یہ مسودہ آپ کے اعتماد پر چھوڑ دیا، مگر آپ نے اس پر غور نہیں کیا اور مجھے بادشاہ کے سامنے نادم ہونا پڑا۔

شیخ حامد نے یہ بات سنی تو شاہ عبدالرحیم کے پاس آئے اور سارا واقعہ بیان کیا۔ شاہ صاحب نے وہ دونوں کتابیں جو مسئلہ زیر بحث کا اصل ماخذ تھیں، شیخ حامد کے سامنے رکھ دیں اور عبارت کی بے ربطی اور اختلال واضح کیا❶۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ شاہ عبدالرحیم کے والد گرامی وفات پا چکے تھے اور آمدنی کی کوئی صورت نہ تھی۔ والدہ کے مجبور کرنے پر فتاویٰ عالم گیری کی تدوین اور نظر ثانی کے شعبے میں ملازمت کرنا پڑی۔ ادھر ان کے مرشد خلیفہ ابوالقاسم کو پتا چلا تو وہ خفا ہوئے اور ترکِ ملازمت کے لیے کہا۔ شاہ صاحب نے ان سے والدہ کے اصرار اور مالی ضرورت کی بات کی اور ساتھ ہی فرمایا کہ دعا کیجیے، ملازمت خود بخود چھوٹ جائے۔ بادشاہ کے پاس مدونین فتاویٰ کے ناموں کی فہرست وقتاً فوقتاً پیش ہوتی رہتی تھی۔ اب یہ فہرست پیش ہوئی تو اس نے شاہ عبدالرحیم کا نام اس سے خارج کر دیا اور کہا۔

اگر خواستہ باشد ایں قدر زمین بدہیدہ۔

(یعنی اگر وہ چاہیں تو جتنی ان کو تنخواہ دی جاتی ہے، اس قدر زمین دے دی جائے۔)

لیکن شاہ صاحب فرماتے ہیں:

قبول نہ کردم و شکرانہ بجا آوردم و حمد خدا تعالیٰ گفتم❷۔

(یعنی میں نے اس پیش کش کو قبول نہ کیا، بادشاہ کے اس اقدام پر اس کا شکریہ ادا کیا اور ترکِ ملازمت پر الحمدللہ کے الفاظ کہے۔)

انتقال:

انتقال سے کچھ عرصہ پہلے شاہ عبدالرحیم جسمانی طور پر خاصے کمزور ہو گئے تھے۔ اسی کمزوری اور نقاہت کی حالت میں رمضان المبارک کے روزے رکھے۔ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں کہ میں ان دنوں زیادہ تر انہی کے پاس رہتا تھا۔ ان کی زبان پر استغراللہ الذی لا الہ الا ھوالحی القیوم۔ کے الفاظ جاری رہتے۔ ماہ صفر میں ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی، لیکن اس حالت میں بھی نماز کا بہت خیال رکھتے اور وقت پر نماز ادا کرتے۔ ۱۲/صفر ۱۱۳۱ھ/۲۴/دسمبر ۱۷۱۸ء کو صبح پو پھٹنے سے پہلے ان پر موت کے آثار نمودار ہوئے۔ اس کرب کے علائم میں بھی دل میں نماز کا خیال تھا۔ اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں سے بار بار پوچھتے کہ فجر کی نماز کا

❶ انفاس العارفین، ص ۲۴۔

❷ انفاس العارفین، ص ۲۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وقت ہوگیا ہے؟ لوگوں نے کہا نماز کا وقت ابھی نہیں ہوا۔ اس پر قدرے خفگی سے فرمایا۔ اگر تمھاری نماز کا وقت نہیں ہوا تو نہ سہی، ہماری نماز کا وقت تو ہو چکا ہے۔ فرمایا، مجھے قبلہ رخ کر دو۔ چنانچہ قبلہ رخ کر دیے گئے۔ نماز کے وقت میں اگرچہ کچھ دیر تھی، مگر آپ نے اشاروں سے نماز فجر ادا کی۔ اس کے بعد اسم ذات کے ذکر میں مشغول ہو گئے اور اسی حالت میں انتقال کر گئے۔

شاہ عبدالرحیم نے چہار شنبہ کے روز ۱۲/ صفر ۱۱۳۱ھ/ ۲۴/ دسمبر ۱۷۱۸ء کو ستتر (۷۷) سال کی عمر پا کر فرخ سیر کے عہد میں بمقام دہلی، داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کی وفات کے پچاس روز بعد مغل بادشاہ فرخ سیر گرفتار ہوا، اور دہلی میں بڑے سخت واقعات رونما ہوئے، جن کی وجہ سے ایک عام بے چینی اور اضطراب کی فضا پیدا ہو گئی[1]۔

۹۹۔ شیخ عبدالرحیم حسینی بیجاپوری

شیخ عبدالرحیم حسینی بیجاپوری، شیخ و فاضل اور فقہ، اصول فقہ اور مروجہ علوم عربیہ کے ماہرین میں سے تھے۔ شہر بیجاپور میں پیدا ہوئے، وہیں نشو ونما پائی اور بچپن ہی سے حصول علم میں مشغول ہو گئے۔ مختصرات اپنے شہر کے اساتذہ سے پڑھیں۔ پھر جب قاضی ابوالبرکات نے سلطان اورنگ زیب عالم گیر کی رکاب میں بیجاپور کا سفر کیا تو ان کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو گئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود مسند تدریس آراستہ کی اور بے شمار لوگوں کو اپنے علم و فضل سے مستفید فرمایا۔

شیخ عبدالرحیم بیجاپوری نے چہار شنبہ کے روز ۱۹/ جمادی الاخریٰ ۱۱۶۸ھ/ ۲/ اپریل ۱۷۵۵ء کو وفات پائی[2]۔

۱۰۰۔ قاضی عبدالرسول سہالوی

شیخ عبدالرسول بن یوسف بن سلیمان بن سعد اللہ انصاری سہالوی کا مولد و منشا نواح لکھنؤ کا ایک قریہ سہالی ہے۔ انھوں نے دہلی کے اساتذہ سے علم حاصل کیا، اور اپنے دور کے کبار فقہائے حنفیہ میں گردانے گئے۔ بعد ازاں علاقہ اودھ میں تشریف لے گئے اور سید عبدالرزاق حسنی قادری بانسوی سے اخذ طریقت کیا۔ طویل عرصے تک ان سے منسلک رہے۔ پھر اعمالِ ڈھاکہ میں ایک مقام ''کونہیٹہ'' کے منصب قضا پر مامور ہوئے۔ سرزمین بنگال میں اس عالم و فقیہ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور بہت سے لوگوں نے ان سے استفادہ کیا[3]۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے، انفاس العارفین اور حیات ولی وغیرہ کتابوں کے وہ حصے جن میں شاہ عبدالرحیم کے حالات مرقوم ہیں

[2] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۴۵۔ محبوب ذی المنن حصہ اول، ص ۵۰۶، ۵۰۷۔

[3] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۴۸، بحوالہ اغصان الانساب۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۰۱۔ شیخ عبدالصمد چریا کوٹی

قاضی عبدالصمد بن قاضی ابوالحسین بن ملا محمد ماہ بن قاضی منصور عباسی، عالی طبع اور روشن ذہن عالم تھے۔ جلیل القدر فقہا میں شمار ہوتے تھے۔ اپنے والد گرامی قاضی ابوالحسن چریا کوٹی سے تحصیل کی۔ پھر سند قضا حاصل کرنے کے لیے، جو ان کا موروثی منصب تھا، والد کے حکم سے دہلی گئے۔ وہاں تمام علما میں صاحب فضل و کمال قرار پائے، یہاں تک کہ ارکانِ شاہی نے ان کو فقہ و اصول اور دیگر علوم منقول و معقول میں یگانہ تسلیم کیا۔ بادشاہ دہلی محمد شاہ کے فرمان سے انھیں پرگنہ چریا کوٹ اور دیگر مقامات کا منصب قضا عطا ہوا۔ مگر انھوں نے فقط پرگنہ چریا کوٹ کے منصب قضا کو ترجیح دی، دیگر مقامات کا عہدۂ قضا ان کے قدیم مستحقین کے سپرد کر دیا۔ دہلی سے چریا کوٹ آئے تو قضا کی نازک ذمہ داریوں میں مصروف ہو گئے اور فصل خصومات کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ اپنے مفوضہ فرائض کامل دیانت داری سے انجام دیتے، جس کی وجہ سے بڑی شہرت پائی۔ یگانۂ آفاق حافظ محمد اسحاق ان کے شاگرد تھے۔

قاضی عبدالصمد چریا کوٹی نے ۱۱۷۱ھ/ ۱۷۵۸ء کو وفات پائی۔ ''قاضی منصف'' مادہ تاریخ وفات ہے [1]۔

۱۰۲۔ قاضی عبدالصمد عثمانی جون پوری

قاضی عبدالصمد جون پوری، ایک فاضل شخص تھے اور فقہ و اصول کے چوٹی کے علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ سرزمین ہند کے جلیل القدر عالم و فقیہ شیخ محمد رشید بن مصطفیٰ عثمانی جون پوری (مصنف رشیدیہ۔ متوفی ۱۹ر رمضان ۱۰۸۳ھ) کے بھتیجے اور شاگرد تھے۔ عرصے تک ان سے وابستہ رہے، یہاں تک کہ تمام متداول علوم و فنون میں سب سے فوقیت لے گئے۔ پھر دہلی گئے اور علمائے کرام کی اس جماعت میں شامل ہوئے جو فتاویٰ عالم گیری کی تصنیف پر مامور تھے۔ بعد ازاں دکن کے ایک شہر میں عہدۂ قضا پر متعین کیے گئے اور خاصی مدت اس منصب پر فائز رہے۔ پھر لکھنؤ منتقل ہو گئے، وہاں آٹھ سال اقامت گزین رہے۔ بادشاہِ ہند اورنگ زیب عالم گیر ان کی انتہائی تکریم کرتا تھا۔ اس نے انھیں کئی گاؤں بطور جاگیر عنایت کیے۔ ۲۷ر رجب کو (سن وفات کا ذکر نہیں ملا) علاقہ دکن میں وفات پائی اور میت کو ایک گاؤں میں جو ''سوکلائی'' کے نام سے موسوم تھا، لایا گیا اور وہیں قاضی باغ (حدیقۃ القاضی) میں مدفون ہوئے [2]۔

---

1. تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۲۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۵۲۔
2. نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۵۲، بحوالہ باغ بہار۔ برصغیر میں علم فقہ، ص ۳۰۳۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۰۳۔ مولانا عبدالصمد دیوی

شیخ عبدالصمد اعظمی دیوی، مفتی عبدالسلام اعظمی کی اولاد سے تھے۔ قصبہ دیوہ (یوپی) میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما کی منزلیں طے کیں۔ اپنے عصر کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، اور فقہ واصول اور علوم عربیہ میں مہارت پیدا کی۔ تفسیر قرآن مجید میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اور بہترین تفسیری نکات بیان فرماتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک رسالہ بھی تالیف کیا۔ احمد شاہ کے عہد میں دارالسلطنت دہلی میں امراو ملوک کی سلکِ ملازمت میں منسلک ہو گئے تھے۔ کافی عرصہ یہ خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر فرخ آباد چلے گئے۔ وہاں نواب غالب جنگ نے اپنے بیٹے مظفر جنگ کا اتالیق مقرر کر دیا تھا۔ وفات تک اس منصب پر مامور رہے [1]۔

۱۰۴۔ مولانا عبدالفتاح صمدانی

مولانا ابوالفرح عبدالفتاح بن ہاشم حسینی صمدانی کا شمار بارھویں صدی ہجری کے مشاہیر فقہائے ہند میں ہوتا ہے۔ انھوں نے مرکز علم جون پور میں سید محمد جون پوری سے اخذ علم کیا۔ پھر دہلی تشریف لے گئے، وہاں سید محمد زاہد ہروی کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شریک ہو گئے اور سید ممدوح کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔ علم وتحقیق اور فضل وکمال میں یہاں تک ترقی کی کہ فقہائے عظام اور علمائے کرام کی اس جماعت میں شامل کیے گئے، جنھوں نے فتاویٰ عالم گیری مرتب کرنے کی فقہی خدمت انجام دی۔ یعنی مولانا عبدالصمد حسینی صمدانی بارھویں صدی ہجری میں عہد اورنگ زیب عالم گیر کے وہ فقیہ نامور تھے، جو فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین میں باقاعدہ شامل تھے اور جنھوں نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے بے حد کوشش کی تھی [2]۔

۱۰۵۔ مولانا عبدالقادر گجراتی

مولانا عبدالقادر بن عبدالغفور گجراتی کا لقب نواب محی الدولہ قادر یار خاں بہادر تھا۔ فقہ اور اصول فقہ کے جید عالم تھے۔ سورت سے اورنگ آباد منتقل ہو گئے تھے، وہاں ایک مدت تک تکیہ شیخ محمود مسافر اورنگ آبادی میں مقیم رہے۔ پھر حیدر آباد کے نواب نظام علی خاں سے تقرب پیدا کیا جو اس زمانے میں علاقہ برار کے والی تھے۔ انھوں نے ان کی قابلیت سے متاثر ہو کر فوج کے منصب قضا پر مامور کر دیا۔ اس کے بعد ۵ ربیع الاول ۱۱۸۲ھ/ ۲۰ جولائی ۱۷۶۸ء کو جب خود نواب نظام علی خاں اپنے بھائی صلابت جنگ کی جگہ سربراہ مملکت ہوا تو مولانا عبدالقادر گجراتی کو محکمۂ احتساب اور صدارت عظمیٰ پر فائز کیا۔ نیز ''محی الدولہ قادر یار خاں بہادر'' کے

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۵۳ عہد بنگش کی سیاسی، علمی اور ثقافتی تاریخ (اردو ترجمہ تاریخ فرخ آباد) ص ۲۲، ۲۳۔

[2] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۵۶، ۱۵۷۔ بحوالہ عزیز التواریخ۔ برصغیر میں علم فقہ، ص ۳۱۲۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لقب سے سرفراز کیا۔ عرصے تک اس عہدے پر فائز رہے۔ اس عالم وفقیہ نے غالباً ۱۱۸۸ھ/ ۱۷۷۴ء میں وفات پائی۔ ان کے بھائی حکیم جعفر کو اسی سال ان کے بعد منصب صدارت تفویض ہوا تھا❶۔

۱۰۶۔ شیخ عبدالقادر پٹنی مکی

شیخ عبدالقادر پٹنی بن شیخ ابوبکر مفتی مکہ معظمہ، شیخ محمد طاہر پٹنی کی اولاد سے تھے۔ فصاحت و بلاغت میں ممتاز، نامور فاضل اور مستند فقیہ تھے۔ مروجہ علوم کی تحصیل شیخ عبداللہ انصاری مکی شافعی سے کی۔ ان کی تصانیف میں چار جلدوں پر مشتمل فتاویٰ اور مجموعہ منشآت مشہور ہیں۔ ۱۱۸۳ھ/ ۱۷۶۹ء میں انتقال ہوا❷۔

۱۰۷۔ شیخ عبدالقادر لاہوری

شیخ عبدالقادر بن عمر بن ہشام حسنی گیلانی لاہوری کی لاہور میں ولادت ہوئی اور اسی شہر میں پلے بڑھے۔ اپنے ماموں شیخ اسماعیل بن قاسم اچی لاہوری (متوفی ۱۱/ ربیع الثانی ۱۱۴۱ھ/ ۴/ اکتوبر ۱۷۲۸ء) سے علم فقہ حاصل کیا۔ حدیث اور تفسیر کی تحصیل بھی انہی سے کی۔ شیخ عبدالرسول زنجانی لاہوری سے بھی کچھ کتابیں پڑھیں۔ بعض علوم میں سید محمد بن علاء الدین حسینی لاہوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود درس و افادہ کی مسند آراستہ کی۔ ان کا شمار مشائخ قادریہ میں ہوتا تھا۔ اس سلسلے کے متعدد حضرات نے ان سے استفاضہ کیا۔ کشف الاسرار الصغیر، کشف الاسرار الکبیر اور اسرار کتمانی ان کی تصانیف ہیں۔ ۲۸/ ذی الحجہ ۱۱۵۴ھ/ ۱۸/ فروری ۱۷۴۲ء کو وفات پائی❸۔

۱۰۸۔ سید عبدالکریم حسینی قنوجی

سید عبدالکریم بن محمد حسینی قنوجی، مغل حکمران اورنگ زیب عالم گیر کے عہد کے فاضل بزرگ تھے اور فقہ واصول کے ماہرین میں شمار ہوتے تھے۔ اورنگ زیب نے ان کے علم وفضل کی وجہ سے انھیں برہان پور شہر کا جزیہ وصول کرنے پر مامور کر دیا تھا۔ یہ اہم خدمت انھوں نے بہترین طریقے سے انجام دی۔ پھر بادشاہ نے یہی خدمت علاقہ دکن میں بھی اس کے سپرد کی۔ چنانچہ وہ دکن کے چار اقطاع کی وصولی جزیہ پر مامور ہوئے۔ نہایت فاضل، نیک سیرت، کریم النفس، متدین اور پاک باز امیر مملکت تھے۔ اس منصب کے ساتھ ساتھ درس وتدریس کی سرگرمیاں بھی جاری تھیں❹۔

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۵۸، بحوالہ تزک محبوبی۔

❷ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۲۸۔

❸ خزینۃ الاصفیا، ص ۱۹۱، ۱۹۲۔ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۱۵۹۔

❹ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۶۱۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۷۰۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۰۹۔ شیخ عبدالکرم صدیقی بلگرامی

شیخ عبد الکریم صدیقی بلگرامی اپنے وقت کے معروف اور جید عالم تھے۔ فقہ واصول اور دیگر علوم مروجہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ معقولات و منقولات کے ماہر تھے۔ بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ ابتدا میں قرآن مجید حفظ کیا، پھر بلگرام ہی کے علمائے کرام سے مختلف علوم کی تحصیل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد سرگرم درس و افادہ ہوئے۔ عربی ادبیات میں اس درجہ عبور حاصل تھا کہ مشہور درسی کتاب مقامات حریری زبانی یاد تھی اور عربی انشا پردازی میں بہت تیز تھے۔ عمر کے آخری دور میں مقامات حریری ہی کے انداز میں خود چند مقالے سپرد قلم کیے اور فارسی میں مقامات کی شرح بھی لکھی۔ حدت فکر اور کتابوں پر عبور کا یہ عالم تھا کہ نامور استاد اور محقق شیخ طفیل محمد اترولوی (متوفی ۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۸ء) کے لیے صرف تین دن میں معروف اور ادق درسی کتاب ''شمسیہ'' کی شرح تحریر فرمادی۔ عربی اور فارسی کا خط بڑا عمدہ تھا اور نہایت تیزی سے لکھتے تھے۔

بلگرام کے اس عالم وفقیہ نے بارھویں صدی ہجری کے آخر میں وفات پائی ❶۔

۱۱۰۔ قاضی عبدالکریم کشمیری

قاضی عبدالکریم کشمیری کا مولد و منشا کشمیر ہے۔ مفتی ابوالفتح کشمیری اور دیگر علما سے اخذ علم کیا اور دیار کشمیر کے جلیل القدر شیخ اور عالم وفقیہ ہوئے۔ سلطان اورنگ زیب عالم گیر کی فوجی چھاؤنی میں گئے، وہاں کچھ عرصہ مقیم رہے۔ پھر بادشاہ نے ان کو کشمیر کے منصب قضا سے سرفراز کیا، جس پر چوبیس سال مامور رہے۔ عالم گیر کے آخری ایام حکومت میں اس منصب سے علیحدہ ہوئے۔ منصب قضا کی انجام دہی میں نہایت محتاط تھے۔ ان کی عدالت میں کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو اس کے تمام پہلوؤں پر انتہائی غور کرتے اور صحیح فیصلے پر پہنچنے میں اللہ سے رو رو کر دعا کرتے۔ ان کی پوری کوشش ہوتی کہ کسی مقام پر لغزش فہم کا شکار نہ ہو جائیں۔ بہت نیک، عابد و زاہد، صلاح وتقویٰ کے زیور سے آراستہ اور شب بیدار تھے ❷۔

۱۱۱۔ مخدوم قاضی عبداللطیف ٹھٹھوی

مخدوم قاضی عبداللطیف بن عبدالرحمٰن بن محمد ہاشم ٹھٹھوی سندھی، حدیث، فقہ اور اصول کے ماہر تھے۔ ان کے والد شیخ عبدالرحمٰن بھی جید عالم تھے اور ان کا سلسلۂ درس جاری تھا۔ بلند بخت بیٹے نے بھی افادۂ علما وطلبا کو اپنا معمول ٹھہرایا اور والد مکرم اور جد امجد کے مدرسے میں سرگرم تدریس ہوئے۔ ان کا معمول تھا کہ ہر روز

❶ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۲۱۔ نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۱۶۱۔

❷ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۱۵، ۱۱۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۶۱۔ روضۃ الابرار، ص ۶۱۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نمازِ عصر کے بعد اپنی مسجد میں درس حدیث دیتے۔ ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء کو محمد سرفراز خاں کے لشکر میں منصب قضا پر فائز ہوئے۔ جمعۃ المبارک کے دن لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے تھے ❶۔

۱۱۲۔ شیخ عبداللہ حسنی لاہوری

شیخ عبداللہ کا سلسلۂ نسب یہ ہے: عبداللہ بن اسماعیل بن قاسم بن علی بن بدرالدین بن اسماعیل بن عبداللہ الشریف حسنی اچی لاہوری، مشہور علما و فقہا اور معروف ارباب فضل و صلاح میں شمار ہوتے تھے۔ ہمیشہ تدریس و تلقین میں مشغول رہتے۔ اصحاب ثروت اور امرا کے ہاں کبھی نہ جاتے۔ متوکل علی اللہ اور قانع عالم دین تھے۔ ۱۱ربیع الثانی ۱۱۴۱ھ/۴ر اکتوبر ۱۷۲۸ء کو لاہور میں فوت ہوئے ❷۔

۱۱۳۔ سید عبداللہ سندیلوی

سید عبداللہ بن زین العابدین حسینی سندیلوی، ہندوستان کے صوبہ یوپی کے قصبہ سندیلہ کے باشندے تھے۔ عالم اور فاضل بزرگ تھے۔ فقہ، اصول اور کلام کے ماہرین میں سے تھے۔ علامہ کمال الدین انصار سہالوی ثم فتح پوری (متوفی ۱۴ر محرم ۱۱۷۵ھ/ ۱۵ر اگست ۱۷۶۱ء) سے اخذ علم کیا۔ کافی عرصہ ان کی صحبت و رفاقت میں گزارا۔ جب علوم مروجہ میں شمس بازغہ تک پہنچے تو ارض ہند کے مشہور عالم شیخ حمداللہ سندیلوی کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے، جو فلسفہ و منطق میں یگانۂ روزگار تھے۔ انھی سے سند فراغت حاصل کی۔ پھر خود درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور طویل عرصے تک تشنگان علوم کو مستفید فرماتے رہے۔ بعد ازاں امیٹھی (یوپی) کے نامور عالم شیخ عبدالباسط امیٹھوی کے حلقۂ بیعت و ارادت میں شامل ہو گئے۔ یہ ان کا وہ دور تھا، جب کہ لوگوں سے بالکل علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ ذکی اور متقی عالم تھے۔ آخر عمر میں جنون و جذب کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اسی حالت میں فوت ہوئے ❸۔

ان کے استاذ حمد اللہ سندیلوی:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سید عبداللہ حسینی سندیلوی کے استاذ گرامی شیخ حمداللہ سندیلوی کا تعارف بھی کرا دیا جائے، کیوں کہ وہ اپنی معروف کتاب "حمداللہ" کی وجہ سے جو ان کے نام کے ساتھ ہی معروف ہے، ہمارے مدارس دینیہ سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔

❶ تحفۃ الکرام، ص ۶۹۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۶۲۔

❷ خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۸۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۶۳۔

❸ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۰۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۶۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہندوستان کے صوبہ یوپی میں ضلع ہردوئی کا ایک قدیم اور معروف قصبہ ''سندیلہ'' کے نام سے موسوم ہے۔ یہ قصبہ لکھنؤ سے تیس میل کے فاصلے پر مرادآباد جانے والی ریلوے لائن پر واقع ہے۔ مرقوم ہے کہ یہ قصبہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی (متوفی ۷۵۷ھ/۱۳۵٦ء) کے ایک مرید اور خلیفہ مخدوم سید علاء الدین (٦٩٠۔ ٧٦٤ھ) نے آباد کیا تھا۔ اس قصبے میں متعدد نامور اصحاب علم اور ارباب فضل پیدا ہوئے، جن میں بارھویں صدی ہجری کے جلیل القدر عالم اور مولانا سید عبداللہ سندیلوی کے استاذ گرامی شیخ حمداللہ سندیلوی کا نام نامی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہے۔ شیخ حمداللہ بن شکراللہ بن دانیال بن پیر محمد ''نسباً صدیقی، مذہباً شیعہ اور مولد و مسکن کے لحاظ سے سندیلوی تھے۔ ان کا مدفن بھی سندیلہ ہے۔ شیخ کمال الدین فتح پوری (متوفی ۱۴ر محرم ۱۱۷۵ھ/ ۱۵راگست ۱۷٦۱ء) اور فاضل اجل شیخ نظام الدین انصاری سہالوی (متوفی ۸ر جمادی الاولیٰ ۱۱٦۱ھ/ ۱۵راپریل ۱۷۴۸ء) کے تلمیذ تھے۔ یوں تو تمام علوم متداولہ میں عبور رکھتے تھے، لیکن فلسفہ و منطق اور علوم حکمیہ میں خصوصیت سے یگانۂ روزگار تھے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ اس سلسلے میں درجہ امامت اور مرتبہ اجتہاد پر فائز تھے۔ ان علوم کی تدریس میں انھوں نے نہایت شہرت پائی۔ یہی وجہ ہے کہ والیٔ اودھ ابوالمنصور خاں نے ارض ہند کے مغل حکمران احمد شاہ سے ان کی سفارش کی اور بادشاہ نے انھیں فضل اللہ خاں کا لقب عطا کیا اور کافی جاگیر بھی دی۔ پھر انھوں نے اپنے آبائی قصبہ سندیلہ میں بہت بڑا مدرسہ قائم کیا۔

شیخ حمداللہ نے متعدد علمی و فنی کتابوں پر حواشی و تعلیقات سپرد قلم کیں، جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

حمداللہ: یہ کتاب قاضی محبّ اللہ بہاری (متوفی ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء) کی منطق کی مشہور کتاب سلم العلوم کی مفصل و بسیط شرح ہے۔ یہ شرح خود ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتی ہے، جو اس کے فاضل شارح ''حمداللہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ اپنے موضوع سے متعلق کتاب کی علمی افادیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ یہ کتاب صدیوں سے برصغیر پاک و ہند کے مدارس دینیہ کے نصاب میں داخل ہے۔ علما و طلبا میں اس کتاب کو بے پناہ تلقی و قبولیت حاصل ہوئی۔

حواشی شمس البازغہ: شمس البازغہ، شیخ محمود جون پوری (متوفی ۱۹ر ربیع الاول ۱۰٦۲ھ/ ۱۹ر فروری ۱٦۵۲ء) کی شہرۂ آفاق کتاب ہے اور درس نظامیہ میں داخل ہے۔ اس کتاب کو اہل علم نے لائق اعتنا ٹھہرایا اور اس پر حواشی و تعلیقات لکھے۔ شیخ حمداللہ نے بھی اس پر حاشیہ لکھا۔

حاشیہ صدرا: قاضی محمد بن ابراہیم شیرازی ''مشہور عالم تھے، صدر الدین ان کا لقب تھا۔ ہمارے مدارس میں ''ملا صدرا'' کے نام سے معروف ہیں۔ ۱۰۵۰ھ/ ۱٦۴۰ء میں فوت ہوئے۔ بہت سی علمی و فنی کتابوں کے مصنف اور محشی تھے۔ انھوں نے ایک بہت مشہور متن ہدایۃ الحکمۃ کی شرح قلم بند کی، جس میں منطق اور طبیعیات والہیات کے مسائل کو زیر بحث لایا گیا۔ ہدایۃ الحکمۃ کے مصنف اثیر الدین مفضل بن عمر ابہری تھے، قاضی محمد بن ابراہیم شیرازی (صدر الدین) نے اس کی ایک مبسوط شرح لکھی، جو ان کے نام کی مناسبت سے ''صدرا'' کے نام سے مشہور

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوئی۔ یہ کتاب داخل نصاب ہے۔ شیخ حمداللہ سندیلوی نے اس کتاب (صدرا) کی شرح لکھی۔

شرح زبدۃ المقامات: شیخ محمد بن حسین بن عبدالصمد حارثی عاملی ہمدانی، ان کا لقب بہاء الدین تھا۔ مسلکاً شیعہ تھے۔ ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۲ء میں فوت ہوئے۔ بہت سی علمی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں بعض درس نظامیہ میں شامل ہیں۔ صرف بہائی بھی انھی کی تصنیف ہے۔ ان کی ایک تصنیف کا نام زبدۃ الاصول ہے۔ شیخ حمداللہ سندیلوی نے اس کی شرح قلم بند کی۔

بے شک شیخ حمداللہ دیارِ ہند کے صاحب کمال محقق و مصنف اور مدرس تھے۔ بے شمار تشنگان علوم نے ان کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔ ان کا سلسلہ تدریس بہت وسیع تھا۔ انھوں نے ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء کو دہلی میں وفات پائی ❶۔

۱۱۴۔ قاضی عبداللہ گجراتی

قاضی عبداللہ بن شریف گجراتی مسلکاً حنفی تھے۔ شیخ و فاضل اور فقہ و اصول کے جید عالم تھے۔ احمد آباد شہر کے قاضی تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کا بیٹا شہزادہ محمد اعظم گجرات کا والی ہو کر آیا تو اس نے ان کو عساکر شاہی کے منصب قضا پر متعین کر دیا۔ کافی عرصہ اس منصب پر مامور رہے۔ پھر خود سلطان اورنگ زیب عالم گیر نے ۱۰۹۵ھ/۱۶۸۴ء میں قاضی ابوسعید گجراتی کی جگہ انھیں قضائے اکبر کا اعزاز بخشا اور ہندوستان کا قاضی القضاۃ مقرر کیا۔ طویل مدت تک یہ خدمت ان کے سپرد رہی۔ پھر مسند صدارت تفویض کی گئی۔ ۱۱۰۹ھ/ ۱۶۹۸ء کو مرض فالج میں مبتلا ہو کر دنیائے فانی کو خیر باد کہا۔ ان کے بعد قاضی محمد اکرم دہلوی (متوفی ۱۱۱۶/۱۷۰۴ء) جو دارالحکومت کے موروثی مفتی تھے، عساکر کی خدمت قضا پر مامور ہوئے ❷۔

۱۱۵۔ مولانا عبداللہ امیٹھوی

مولانا عبداللہ امیٹھوی، فقہ و اصول اور علم کلام میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ شیخ نظام الدین انصاری سہالوی (متوفی ۸/جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ/ ۲۵/اپریل ۱۷۴۸ء) کے شاگرد تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود درس و تدریس میں مصروف ہو گئے تھے۔ بہت سے علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ ارض ہند کے مشہور شیخ و عالم سید علم اللہ حسنی بریلوی کے بعض اخلاف بھی ان سے مستفید ہوئے۔ بادشاہِ دہلی احمد شاہ کے عہد میں وفات پائی ❸۔

❶ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۵۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۷۴، ۷۵۔ تذکرۃ المصنفین درس نظامی، ص ۹۱ تا ۹۳۔ لباب المعارف العلمیہ، ص ۱۳۷، ۱۳۸، ۳۱۲۔ تراجم الفضلاء، ص ۸۔

❷ مآثر عالم گیری، ص ۳۶۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۶۵۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۶۶، بحوالہ رسالہ قطبیہ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۱۶۔ مولانا سید عبداللہ بلگرامی

مولانا سید عبداللہ حسینی بلگرامی کی ولادت اور نشو ونما بلگرام میں ہوئی۔ قرآن مجید اور ابتدائی کتابیں اپنے قصبے بلگرام میں پڑھیں۔ پھر کچندو کا عزم کیا جو یوپی میں دریائے گنگا کے کنارے ایک پرگنہ تھا۔ اس زمانے میں کچندو کو علم و فضل کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور وہاں قاضی علیم اللہ کچندوی (متوفی ۱۱۱۵ھ/ ۱۷۰۳ء) کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور طویل عرصے تک ان سے مصروف استفادہ رہے۔ یہاں تک کہ مختلف علوم و فنون پر عبور حاصل کیا اور کبار فقہائے حنفیہ میں گردانے گئے۔ کتابت میں بھی مہارت پیدا کی اور سات قسم کے رسوم الخط سیکھے۔ فنون حرب کی تربیت بھی حاصل کی۔ بعد ازاں نواب سر بلند خاں کے دربار میں پہنچے۔ اس نے پہلے محکمہ فوج میں پھر ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء میں احمد آباد کے منصب صدارت پر مامور کیا۔ وہیں علامہ وجیہ الدین علوی گجراتی کے نواسے شاہ اسد اللہ علوی سے شرح المواقف پڑھی اور شیخ قوام الدین گجراتی سے ہدایۃ الفقہ کا باقاعدہ درس لیا۔ وہیں علاقہ گجرات کے جلیل القدر عالم اور نامور فاضل شیخ نور الدین احمد آبادی (متوفی ۹ رشعبان ۱۱۵۵ھ/ ۲۸ ستمبر ۱۷۴۲ء) سے رابطہ پیدا ہوا۔ مآثر الکرام کی روایت کے مطابق شاہ اسد اللہ علوی سے مولانا سید عبداللہ نے یہ بھی کہا کہ محمد اعظم شاہ کے عہد حکومت میں ایک فاضل سے ایک تقریب ضیافت میں علمی مباحثہ ہو گیا، لیکن انھوں نے بات غصے اور رنج تک پہنچا دی۔ یہاں مباحثہ نہیں ہونا چاہیے۔ شاہ صاحب نے فرمایا: یہ لفظ آپ نے کیوں کہے، علمی بحثیں ہونی چاہئیں۔ لیکن غم وغصہ نہیں بلکہ افادہ و استفادہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد سید صاحب شاہ کے گھر گئے اور علمی مباحث کا سلسلہ شروع ہوا، جس سے خود شاہ صاحب بھی اور حاضرین مجلس بھی بہت محظوظ ہوئے۔

مولانا سید عبداللہ بلگرامی کو دہلی میں استسقا کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ اسی حالت میں انھیں بلگرام لایا گیا، انھوں نے ۱۱۳۲ھ/ ۱۷۲۰ء کو بلگرام میں وفات پائی ❶۔

۱۱۷۔ مولانا عبدالمقتدر بہاری

مولانا عبدالمقتدر بن عبدالنبی بہاری، علوم حدیث و فقہ میں مرتبۂ کمال پر فائز تھے اور اپنے عصر کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ ان کے والد مولانا عبدالنبی بہاری بھی صاحب فضل و کمال تھے۔ لائق بیٹے نے والد مکرم سے علم حاصل کیا، حدیث بھی انہی سے پڑھی ❷۔

---

❶ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۳۷، ۲۳۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۶۶، ۱۶۷۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۶۹۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۱۸۔ مفتی عبدالمومن کشمیری

مفتی عبدالمومن بن احسن اللہ کشمیری اپنے عہد کے معروف عالم وفقیہ تھے۔ کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ مولانا عبداللہ بن محمد فاضل کشمیری (متوفی شوال ۱۱۷۱ھ/ جون ۱۷۵۸ء) اور شیخ عبدالسلام کشمیری (متوفی ۱۸ر شوال ۱۱۷۱ھ/ ۲۵ر جون ۱۷۵۸ء) سے حصول علم کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد کریم داد خاں کے عہد میں کشمیر کی مسند افتا پر فائز ہوئے۔ ۱۱۹۷ھ/ ۱۷۸۳ء میں وفات پائی ❶۔

۱۱۹۔ قاضی عبدالنبی عثمانی احمد نگری

قاضی عبدالنبی بن عبدالرسول بن ابومحمد بن عبدالوارث عثمانی احمد نگری، اپنے زمانے میں دیار ہند کے مشہور عالم دین تھے۔ احمد نگر میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ ان کے والد شیخ عبدالرسول عثمانی گجراتی (متوفی ۱۹ر شوال ۱۱۳۰ھ/ ۴ر ستمبر ۱۷۱۸ء) اپنے دور کے علمائے مشاہیر میں سے تھے۔ لائق بیٹے نے مختصرات باپ ہی سے پڑھیں۔ باپ کی وفات کے بعد شیخ عبداللہ احمد نگری اور سید بخش حسینی کرمانی خیر آبادی سے اخذ علم کیا۔ پھر گجرات گئے اور حاشیہ قدیمہ وغیرہ کتب درسیہ شیخ قطب الدین عثمانی گجراتی سے اور اکثر کتب درسیہ شیخ محمد محسن بن عبدالرحمٰن صدیقی گجراتی سے پڑھیں اور کافی عرصہ ان کی خدمت میں رہے، یہاں تک کہ علم نحو اور علم منطق میں اپنے تمام ابنائے عصر سے فوقیت لے گئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد احمد نگر کے عہدۂ قضا پر مامور ہوئے۔ ساتھ ہی درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا اور خلق کثیر کو مستفید فرمایا۔

قاضی عبدالنبی عثمانی احمد نگری کو تصنیف وتالیف سے بھی تعلق تھا اور وہ اپنے دور کے کثیر التصانیف عالم دین تھے۔ ان کی تصانیف وشروح کی تفصیل درج ذیل ہے:

جامع الغموض ومنبع الفیوض: یہ علم نحو کی معروف کتاب کافیہ ابن حاجب کی ایک مبسوط شرح ہے۔ کتاب فارسی زبان میں ہے جو فاضل مصنف نے ۱۱۴۴ھ/ ۱۷۳۱ء میں علاقہ گجرات کے شہر احمد نگر میں لکھی۔

دستور العلما: یہ علوم وفنون کی اصطلاحات میں چار مجلدات پر مشتمل ہے۔

یزدی کی شرح تہذیب پر مبسوط ومفصل حاشیہ۔

میر زاہد ملا جلال پر حاشیہ۔

علم صرف کی درسی کتاب، دستور المبتدی پر حاشیہ۔

عاملی کی خلاصۃ الحساب پر حاشیہ۔

اصول الحسامی پر حاشیہ۔

علم معانی وبیان کی کتاب مطول پر حاشیہ۔

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۶۹۔ روضۃ الابرار، ص ۶۹۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علامہ سعد الدین تفتازانی کی شرح العقائد پر حاشیہ۔

حاشیہ الخیالی علیٰ شرح العقائد۔

علامہ محمد رشید عثمانی جون پوری کی علم مناظرہ کی کتاب، رشیدیہ پر حاشیہ۔

اسی موضوع سے متعلق ایک اور کتاب شریفیہ پر حاشیہ۔

سیف المبتدین فی قتل المفرورین۔

بہر حال قاضی عبدالنبی عثمانی احمد نگری بارھویں صدی ہجری کے جلیل القدر ہندی عالم تھے اور علوم متداولہ کے ہر گوشے پر عمیق نظر رکھتے تھے ❶۔

۱۲۰۔ مولانا عبدالولی طرخانی کشمیری

مولانا عبدالولی طرخانی کشمیری، عالم حدیث اور فقیہ و شیخ تھے۔ علاقہ ترکستان کے ایک شہر ''طرخان'' میں پیدا ہوئے اور اپنے علاقے کے علما سے اخذ علم کیا۔ پھر طرخان ہی سے حجاز تشریف لے گئے اور حج و زیارت سے مشرف ہوئے۔ وہاں صحاح ستہ کے محشی و شارح شیخ ابوالحسن سندھی مدنی سرگرم تدریس حدیث تھے، ان کے مدرسہ دارالشفا میں داخل ہوئے۔ ان سے علم حدیث اور تفسیر کا درس لیا اور سند و اجازہ سے بہرہ مند ہوئے۔ ارضِ حجاز سے ہندوستان آئے اور کشمیر میں سکونت اختیار کی۔ بارھویں صدی ہجری کے اس نامور عالم ربانی نے کشمیر میں درس و تدریس کا غلغلہ بلند کیا اور تفسیر و حدیث کی اشاعت کی۔

اس عالم و فقیہ سے مفتی قوام الدین محمد کشمیری، اور خلق کثیر نے اخذ علم کیا۔

مولانا عبدالولی چوں کہ موضع طرخان میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے تھے، اس لیے طرخانی کہلائے، اور پھر کشمیر کو اپنا مسکن ٹھہرالیا تھا، لہٰذا کشمیری مشہور ہوئے۔ اس جلیل القدر عالم نے ۱۱۷۱ھ/ ۱۷۵۸ء میں جام شہادت نوش کیا ❷۔

۱۲۱۔ میر سید عبدالوہاب منور آبادی

میر سید عبدالوہاب بن ہاشم حسینی منور آبادی خطۂ کشمیر کے باشندے تھے۔ عالم باعمل، فقیہ کامل اور متورع و متقی تھے۔ ان کا شمار کبار فقہائے ہند میں ہوتا تھا۔ تمام عمر قرآن و حدیث کی تدریس اور تحقیق مسائل میں مصروف رہے۔ خلق کثیر نے ان سے استفادہ اور اخذ علم کیا۔ اسی (۸۰) سال سے زائد عمر پا کر ۱۱۵۳ھ/ ۱۷۴۰ء کو اچھی صحت میں رحلت فرمائی ❸۔

---

❶ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۳۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۷۲، ۱۷۳۔

❷ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۳۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۷۴۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۵۔ روضۃ الابرار، ص ۷۱۔

❸ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۳۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۷۴، ۱۷۵۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۳۔ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۲۶۵۔ روضۃ الابرار، ص ۶۲۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۲۲۔ شیخ عتیق اللہ جالندھری

شیخ عتیق اللہ کا سلسلہ نسب یہ ہے: عتیق اللہ بن فاضل بن مصطفیٰ بن عثمان بن اللہ بخش بن قاسم بن اسماعیل بن ابراہیم حسینی بلخی سرہندی ثم جالندھری۔

شیخ عتیق اللہ کا سلسلۂ نسب حضرت زید بن علی بن حسین سے ملتا ہے۔ ان کے آباواجداد بلخ کے رہنے والے تھے، بعد میں وارد ہند ہوئے اور پنجاب کے شہر جالندھر کو اپنا مسکن ٹھہرایا۔ شیخ ممدوح کا مولد و منشا جالندھر ہے۔ انھوں نے مختلف علمائے عظام سے تحصیل کی اور فقہ واصول اور علوم عربیہ کے ماہرین میں شمار ہوئے۔ دل میں تصوف وطریقت کا جذبہ موج زن ہوا تو شیخ ابوالمعالی بن محمد اشرف حسینی انبیٹھوی (متوفی ۱۱۱۶ھ/۱۷۰۴ء) کی خدمت میں حاضری دی جو ضلع سہارن پور کے قریہ انبیٹھہ کے باشندے تھے اور ہندوستان کے مشاہیر مشائخ میں گردانے جاتے تھے۔

شیخ عتیق اللہ حسینی جالندھری نے ماہ شعبان ۱۱۳۱ھ/ جون ۱۷۱۹ء میں وفات پائی❶۔

۱۲۳۔ قاضی عثمان احمد عثمانی بلگرامی

قاضی عثمان احمد بن قاضی احسان اللہ عثمانی بلگرامی، اصحاب فضل وصلاح اور ارباب خیر ومعروف میں سے تھے۔ عالم وشیخ اور نامور فقیہ تھے۔ بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما کی منزلیں طے کیں۔ ابھی چار سال کے تھے کہ پیر محمد بن محمد فاضل حسینی قنوجی کے حلقۂ درس میں داخل کرادیے گئے۔ کچھ بڑے ہوئے تو عازم سندیلہ ہوئے۔ وہاں مولانا عبداللہ بن زین العابدین حسینی سندیلوی کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور بعض کتب درسیہ کی تکمیل کی۔ بعض کتابیں ایک اور بزرگ دین محمد بن وجیہ الدین سندیلوی سے پڑھیں۔ وہاں سے ملاوہ کا قصد کیا، جہاں شیخ محمد عظیم ملانوی بن کفایت اللہ فاروقی گوپاموی ثم ملانوی (متوفی بعد ۱۱۰۰ھ) سرگرم درس وافادہ تھے، ان سے کتب درسیہ میں سے مطولات کی تکمیل کی۔ مثلاً تفسیر بیضاوی اور صحیحین انہی سے پڑھیں اور انہی سے سند حدیث لی۔ بعدازاں اپنے وطن بلگرام تشریف لے گئے❷۔

۱۲۴۔ قاضی عصمت اللہ فاروقی لکھنوی

قاضی عصمت اللہ فاروقی لکھنوی، قاضی عبدالقادر فاروقی لکھنوی کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب اٹھارہ واسطوں سے حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ قاضی عصمت اللہ لکھنوی ارض ہند

❶ خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۲۹۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۱۷۷۔

❷ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۸۵، ۲۸۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۷۷۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے فاضل بزرگ تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور اسی شہر میں پرورش پائی۔ اپنے والد مکرم قاضی عبدالقادر فاروقی لکھنوی (متوفی ۲۷ر شعبان ۱۰۷۶ھ/۲۲ر فروری ۱۶۶۶ء) اور مفتی وجیہ الدین گوپاموی (متوفی ۵ر جمادی الآخریٰ ۱۰۸۳ھ/ ۱۸ر ستمبر ۱۶۷۲ء) سے جو مرتبین فتاویٰ عالم گیری میں شامل تھے، علم حاصل کیا۔ طریقت وسلوک کی منزلیں شیخ پیر محمد سلونی (متوفی ۲۲ر محرم ۱۰۹۹ھ/ ۱۸ر نومبر ۱۶۸۷ء) سے طے کیں۔ پھر بادشاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر سے منسلک ہو گئے۔ اس نے ان کو مراد آباد کا والی مقرر کر دیا۔ خاصی مدت اس منصب پر فائز رہے۔ بعد ازاں مختلف شہروں میں آنا جانا رہا۔

قاضی ممدوح ایک صاحب ثروت اور امیر عالم دین تھے۔ سخی، ایثار پیشہ اور مستحقین پر مال و دولت خرچ کرنے والے تھے۔ علما و مشائخ کا اس درجہ خیال رکھتے کہ انھیں خراجی زمینوں سے ایک لاکھ کاشت کار دیے، جن کے ساتھ کثیر تعداد میں مویشی بھی تھے۔ نیز اپنی جاگیروں سے سات گاؤں عطا کیے۔ طلبا سے تعلق خاطر کا یہ عالم تھا کہ روزانہ دو سو طلبا کو کھانا کھلاتے اور رمضان المبارک میں روزانہ ایک ہزار اشخاص کو اپنے ذاتی لنگر سے کھانا مہیا کرتے۔ علم فقہ اور اس کی جزئیات وفروع پر عبور کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مرتبین فتاویٰ عالم گیری کی جماعت میں شامل تھے۔ حافظِ قرآن اور علومِ عربیہ کے ماہر تھے۔

قاضی عصمت اللہ لکھنوی کی وفات ساحل نربدہ پر ۱۲ر رجب ۱۱۱۳ھ/۲ر دسمبر ۱۷۰۱ء کو اس وقت ہوئی جب وہ بلادِ دکن سے لوٹ رہے تھے۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۶۷ سال تھی۔

تذکرہ علمائے ہند کی روایت کے مطابق ہفتے کی رات ۲ر رجب ۱۱۱۳ھ/۲۲ر نومبر ۱۷۰۱ء کو دکن کے راستے میں موضع بربندہ میں وفات پائی اور جمعہ کے روز ۱۷ر شوال ۱۱۱۳ھ/ ۶ر مارچ ۱۷۰۲ء کو لکھنؤ کے قریب بھدانوہ میں دفن کیے گئے ❶۔

۱۲۵۔ شیخ عصمت اللہ سہارن پوری

شیخ عصمت اللہ بن محمد اعظم بن عبدالرسول سہارن پوری، مسلکاً حنفی تھے اور ہندوستان کے نامور محقق تھے۔ سہارن پور میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ دیارِ ہند کے مختلف اساتذہ سے علم حاصل کیا اور فقہ، اصول، فروع، معانی، بیان، ہیئت، ہندسہ، ریاضی وغیرہ علوم میں مہارت پیدا کی۔ یہ وہ ہندی عالم ہیں جن کی چشم بصارت غائب تھی لیکن چشم بصیرت تیز اور روشن تھی۔ ذہن اور دماغ کے تمام گوشے منور تھے۔ کتابوں پر استحضار کا یہ عالم کہ نابینا ہونے کے باوجود طلبا کو درس دیتے، علما کو مستفید فرماتے، مشکل ترین موضوع پر کتابیں تصنیف کرتے، کتب درسیہ کی شرحیں سپرد قلم کرتے اور باقاعدہ فتوے دیتے۔ یعنی وہ بہ یک وقت عالم، فقیہ، مدرس، مصنف، مفتی سب کچھ تھے۔ تصانیف وشروح درج ذیل ہیں:

❶ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۴۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۷۹، ۱۸۰۔ برصغیر میں علم فقہ، ص ۳۱۳ تا ۳۱۶۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حاشیہ شرح جامی: ملا عبدالرحمٰن جامی نے علم نحو کی انتہائی کتاب کافیہ کی جو ابن حاجب کی تصنیف ہے، فوائد ضیائیہ کے نام سے شرح لکھی۔ یہ شرح بڑی مفصل اور مبسوط ہے اور شرح جامی کے نام سے مشہور ہے۔ مدارس دینیہ کے نصاب میں داخل ہے۔ مولانا عصمت اللہ سہارن پوری نے شرح جامی پر حواشی تحریر کیے۔

شرح تشریح الافلاک: محمد بن حسین بن عبدالصمد حارثی عاملی ہمدانی، اپنے لقب بہاء الدین سے معروف تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں بعض کتابیں داخل نصاب ہیں۔ علم صرف کی صرف بہائی اور علم ہیئت کی تشریح الافلاک انہی کی تصانیف ہیں۔ انھوں نے ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۲ء کو اصفہان میں وفات پائی۔ مولانا عصمت اللہ سہارن پوری نے تشریح الافلاک کی نہایت عمدہ اور بسیط شرح لکھی۔

شرح خلاصۃ الحساب: علم ریاضی میں بھی خلاصۃ الحساب کے نام سے تشریح الافلاک کے مصنف شہیر بہاء الدین عاملی نے ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ مولانا سہارن پوری اس کی بھی بہترین شرح ضبط تحریر میں لائے۔ یہ علمی کام انھوں نے ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء میں مکمل کیا۔

رسالہ حرمۃ الغناء والمزامیر: یہ رسالہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے: سبحانك اللهم ارنا حقائق الاشياء كماهي، ولا تجعلنا من الناس من يشتري لهو الحديث والملاهي۔ یہ ان کی ۱۰۸۸ھ/ ۱۶۷۸ء کی تصنیف ہے، اور ایک مقدمہ، سات فصول اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔ مقدمہ غنا کے معنی اور مسئلۂ زیر بحث کی تعیین پر محیط ہے۔

اس سے آگے فصل اول میں وہ آیات قرآنی مندرج ہیں جو غنا اور مزامیر کی حرمت پر دلالت کناں ہیں۔ فصل ثانی میں وہ احادیث منقول ہیں جو اس کی حرمت پر دال ہیں۔ فصل ثالث ان اقوال مجتہدین کا احاطہ کیے ہوئے ہے جو اس کی حرمت میں وارد ہیں۔ فصل رابع حرمت غنا و مزامیر میں صوفیا کے اقوال کو گھیرے ہوئے ہے۔ فصل خامس حرمت رقص سے متعلق ہے۔ فصل سادس میں ان احادیث کی محدثانہ نقطہ نظر سے وضاحت کی ہے، جن سے غنا و مزامیر اور رقص و سرود کو مباح قرار دینے والے لوگ استدلال کرتے ہیں۔ فصل سابعہ میں مرقوم ہے کہ صوفیا میں اباحت غنا کی شہرت کے اصل اسباب کیا ہیں۔ خاتمۂ کتاب میں اہل غنا و رقص کے موقف کی شریعت کی روشنی میں تردید کے بعد حقائق کی روشنی میں تردید کی گئی ہے۔

رقیب باب المعروف والمنکر: یہ کتاب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے متعلق ہے۔ آغاز، الحمد لله الذي يامرنا بالعدل والاحسان کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ سن تالیف ۱۰۹۱ھ/۱۶۸۰ء ہے۔ کتاب ایک مقدمہ، چند فصلوں اور خاتمہ پر محتوی ہے۔ مقدمہ کتاب میں امر اور نہی کی اصل تعریف بیان کی گئی ہے۔ فصولِ کتاب میں فاضل مصنف نے پہلے وہ آیات و احادیث نقل کی ہیں جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے وجوب پر دلالت کرتی ہیں۔ پھر امر اور نہی کے ارکان و فرائض بیان کیے ہیں۔ بعد ازاں ان لوگوں کو ہدف تنقید و تردید ٹھہرایا ہے جو امر اور نہی کے سلسلے میں لوگوں سے تعرض نہیں کرتے اور ان سے سختی سے پیش نہیں آتے۔ اس

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے آگے امرا و سلاطین کو معروف کا حکم دینے کا بیان ہے۔ پھر ولایت وحکومت اور اس کی شرائط کی صراحت ہے۔ خاتمہ کتاب میں خلفائے راشدین اور دیگر زعمائے اسلام کی سیرت کا تذکرہ ہے۔

شیخ عصمت اللہ سہارن پوری نے ۱۱۱۳ھ/ ۱۷۵۱ء میں وفات پائی ❶۔

شیخ عصمت اللہ سہارن پوری کے حالات کے سلسلے میں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مآثر الکرام اور سبحۃ المرجان ❷ میں میر غلام آزاد بلگرامی نے، ابجد العلوم ❸ میں نواب حسن صدیق خاں نے، قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب ❹ میں سید ذوالفقار احمد نے تذکرہ علمائے ہند میں ❺ رحمان علی اور حدائق الحنفیہ ❻ میں مولوی فقیر محمد جہلمی نے شیخ عصمت اللہ سہارن پوری کا سالِ وفات ۱۰۳۹ھ/ ۱۶۳۰ء لکھا ہے۔ یعنی انھیں گیارھویں صدی ہجری کے علما میں شمار کیا ہے۔ صرف صاحب نزہۃ الخواطر علامہ عبدالحی حسنی لکھنوی نے ان کو بارھویں صدی ہجری کے ہندی علما کی فہرست میں تحریر کیا ہے اور سن وفات ۱۱۳۳ھ/ ۱۷۲۱ء لکھا ہے ❼۔ علامہ عبدالحی حسنی کا ماخذ سید محمد بن سعید عبدالجلیل حسینی بلگرامی (متوفی ۱۱۸۵ھ/ ۱۷۷۱ء) کی تصنیف تبصرہ الناظرین ہے۔ باقی سب تذکرہ نگاروں کا ماخذ میر غلام علی آزاد بلگرامی (متوفی ۱۲۰۰ھ/ ۱۷۸۶ء) کی مآثر الکرام اور سبحۃ المرجان ہیں۔ ہمارے خیال میں علامہ عبدالحی حسنی کا موقف صحیح ہے۔ کیونکہ تبصرۃ الناظرین نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ کے کتب خانے کی کتاب ہوگی۔ ان کا تمام کتب خانہ دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنو کی تحویل میں چلا گیا تھا۔ صاحب نزہۃ الخواطر نے شیخ عصمت اللہ سہارن پوری کے بارے میں اسی سے معلومات اخذ کی ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے شیخ ممدوح کے بارے میں جو تفصیلات درج کی ہیں، وہ کسی اور تذکرۂ نگار نے بیان نہیں کیں۔

یہاں یہ سوال ذہن میں ابھر سکتا ہے کہ اگر تبصرۃ الناظرین نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے کتب خانے کی کتاب ہے تو خود نواب صاحب نے ابجد العلوم میں شیخ سہارن پوری کا سن وفات ۱۰۳۹ھ/ ۱۶۳۰ء کیوں رقم فرمایا ہے؟ تو اس بارے میں یہ عرض ہے کہ ممکن ہے ان کی نظر اس پر نہ پڑی ہو، اور انھوں نے مآثر الکرام ہی کو پیش نگاہ رکھا ہو۔ لیکن نزہۃ الخواطر کے مصنف شہیر نے ان مصنفین گرامی کے تسامح کی نشان دہی نہیں کی۔ معلوم نہیں کیوں؟ واللہ اعلم بالصواب۔

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۸۰، ۱۸۱ بحوالہ تبصرۃ الناظرین از محمد بن عبدالجلیل بلگرامی۔

❷ دیکھیے ص ۱۹۴۔

❸ ص: ۹۰۰۔

❹ ص ۵۲۔

❺ ص ۱۹۷۔

❻ ص ۴۰۷۔

❼ ملاحظہ ہو، نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۸۰، ۱۸۱۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۲۶۔ شیخ عطاء اللہ دہلوی

شیخ عطاء اللہ بن حسن حسینی نارنولی ثم دہلوی، عالم و فقیہ اور مشاہیر مشائخ میں سے تھے۔ اصلاً نارنول کے رہنے والے تھے، اس لیے نارنولی کہلائے۔ لیکن ان کے والد گرامی سید حسن رسول (متوفی ۲۲ رشعبان ۱۱۰۳ھ/ ۲۹ راپریل ۱۶۹۲ء) نارنول سے دہلی منتقل ہو گئے تھے اور وہیں گھر بنا لیا تھا۔ شیخ عطاء اللہ ممدوح ان کے تیسرے بیٹے تھے۔ دہلی میں سکونت کی وجہ سے دہلوی مشہور ہوئے [1]۔

۱۲۷۔ شیخ علی اصغر قنوجی

شیخ علی اصغر بن عبدالصمد بکری کرمانی قنوجی، عالم کبیر اور شیخ وقت تھے۔ الفصول العمادیہ کے فاضل مصنف شیخ عماد الدین کرمانی کی اولاد سے تھے۔ سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک منتہی ہوتا ہے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، صرف و نحو اور علم بیان و معانی میں وحید العصر تھے۔ تصوف و سلوک سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ ۱۰۵۱ھ/ ۱۶۴۱ء کو قنوج میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ علوم درسیہ اور فنونِ متداولہ کی تحصیل سید محمد قنوجی (متوفی ۱۱۰۱ھ/ ۱۶۹۰ء) سے کی، جو اس زمانے میں قنوج میں سرگرم درس و افادہ تھے۔ شیخ عصمت اللہ سہارن پوری (متوفی ۱۱۳۳ھ/ ۱۷۲۱ء) کی خدمت میں بھی گئے، ان سے متوسطات و مطولات کی تکمیل کی۔ ان کے علاوہ اور بھی مختلف علمائے کرام سے استفادہ کیا اور علم و فضل کے مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ ان کے اساتذہ کی فہرست میں شیخ لطف اللہ کوروی، مولانا محمد زمان کاکوروی اور نواب دیانت خاں ایسے رفیع المرتبت علما کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ تصوف و طریقت میں لکھنؤ جا کر پیر محمد لکھنوی سے استفاضہ کیا۔ پھر اپنے وطن قنوج کو مراجعت کی۔ یہ وہ عالم و فقیہ ہیں جو تمام علائق دنیا سے منقطع ہو کر علما و طلبا کو پورے ساٹھ سال علوم مروجہ پڑھاتے رہے۔ اس طویل مدت میں بے شمار لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ قرآن مجید پر گہری نظر تھی۔ ثواقب التنزیل کے نام سے تفسیر جلالین کے انداز پر ایک تفسیر لکھی۔ یہ ان کی عمر کے آخری دور کی تصنیف ہے۔ اس سے پہلے تصوف و سلوک کے بارے میں بھی کچھ کتابیں تصنیف کیں۔ اس موضوع کی بعض کتابوں پر حواشی و تعلیقات بھی سپرد قلم کیے۔ برصغیر پاک و ہند کے یہ عالم و فقیہ تادم واپسیں مصروف تدریس رہے۔

ان کے حالات میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کے بعض آباواجداد مدینہ منورہ سے کرمان آئے اور وہاں سے ان کے ایک بزرگ شیخ مبارک بن عماد الدین وارد ہند ہوئے اور قنوج میں توطن اختیار کیا۔

شیخ علی اصغر قنوجی نے ۱۵ رشعبان ۱۱۴۰ھ/ ۱۶ رمارچ ۱۷۲۸ء کو وفات پائی [2]۔

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۸۲، بحوالہ بحر زخار۔

[2] مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۳۹، ۲۴۰، (بضمن ترجمہ قاضی علیم اللہ کچندوی) ابجد العلوم، ص ۹۳۰، ۹۳۱۔ خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۳۶۸۔ تقصار جنود الاحرار، ص ۱۸۹۔ ہدیۃ العارفین، ج ۱، ص ۷۶۶۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۸۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۴۱، ۱۴۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۸۷۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۲۸۔ مفتی علیم اللہ گوپاموی

مفتی علیم اللہ بن عبید اللہ بن عیسیٰ بن آدم شہابی صدیقی گوپاموی کا شمار ارضِ ہند کے علمائے اعلام میں ہوتا تھا۔ اپنے دور کے شیخ اور فقیہ تھے۔ ان کے والد مفتی عبید اللہ بھی اپنے علاقے کے جلیل القدر عالم تھے اور صوبہ یوپی کے شہر گوپامئو کی مسند افتا پر فائز تھے۔ والد کی وفات کے بعد لائق بیٹے (مفتی علیم اللہ گوپاموی) کو اس شہر کا مفتی مقرر کیا گیا۔ ۱۴ ذی الحجہ ۱۱۰۳ھ/ ۱۶ اگست ۱۶۹۲ء کو فوت ہوئے ❶۔

۱۲۹۔ سید عنایت اللہ بلگرامی

سید عنایت اللہ بن عبدالستار بن حاتم بن بدرالدین حسینی واسطی بلگرامی بہت بڑے فقیہ، جلیل القدر عالم دین اور اپنے دور کے بے نظیر طبیب تھے۔ نہایت ذہین، بلند فکر اور طباع تھے۔ ابتدا میں قرآن مجید حفظ کیا۔ اس وقت بلگرام میں میر سید اسماعیل بن سید قطب عالم حسینی بلگرامی (متوفی ۴ شوال ۱۰۸۸ھ/ ۲۰ نومبر ۱۶۷۷ء) کا ہنگامۂ درس جاری تھا، اس میں داخل ہو گئے۔

سید اسماعیل سے انھوں نے تمام درسی کتابیں باقاعدہ پڑھیں اور خوب علمی تربیت حاصل کی۔ یوں تو تمام علوم مروجہ میں درجۂ کمال پر فائز تھے، لیکن فقہ اور طب میں بالخصوص بہت مشہور تھے اور اس میں کوئی اس علاقے میں ان کا ہم سر نہ تھا۔ استخراج مسائل فقہیہ میں جماعت علما میں منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ ان کے عہد کے تمام اصحابِ فتویٰ فقہ و اصول میں ان کے تفوق کو مانتے اور ان کی بالادستی کے معترف تھے۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے ہر وقت مطالعہ کتب میں مصروف رہتے۔ مطالعہ کتب، افتا نویسی اور طبابت ان کا شب و روز کا مشغلہ تھا اور اس میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ بلگرام کے اس بلند مرتبہ عالم وفقیہ نے ۱۱۲۰ھ/ ۱۷۰۸ء کو وفات پائی ❷۔

۱۳۰۔ شیخ عنایت اللہ سندھی

شیخ عنایت اللہ بن فضل اللہ ٹھٹھوی سندھی، عالم کبیر اور فقیہ نام دار تھے۔ معقولات و منقولات کے ماہر تھے۔ مولانا احمد بن اسحاق ٹھٹھوی کے شاگرد تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود مسند تدریس بچھائی۔ ان کے شاگردوں میں مولانا ضیاء الدین بن ابراہیم ٹھٹھوی، شیخ محمد معین بن محمد امین سندھی مصنف ''دراسات اللبیب'' اور علما کی بڑی جماعت شامل ہے۔ ۱۱۱۴ھ/ ۱۷۰۲ء کو سرزمین سندھ میں فوت ہوئے ❸۔

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۹۱۔

❷ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۳۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۹۳۔

❸ تحفۃ الکرام، ص ۶۸۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۹۳، ۱۹۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۳۱۔ سید عنایت اللہ بالاپوری

سید عنایت اللہ بن محمد اللہ داد بن موسیٰ بن ظہیر الدین حسینی نجندی بالا پوری، شیخ اور عالم وفقیہ تھے۔ مشائخ نقشبندیہ میں سے تھے۔ شیخ ابوالمظفر نقشبندی، برہان پوری (متوفی تقریباً ۱۱۰۸ھ/ ۱۶۹۷ء) اور شیخ محمد معصوم بن شیخ احمد مجدد الف ثانی سرہندی (متوفی ۹ ربیع الاول ۱۰۷۹ھ/ ۷ راگست ۱۶۶۸ء) سے اخذ طریقت کیا۔ اس کے بعد ہندوستان کے مشہور شہر برہان پور سے چار میل کے فاصلے پر بالا پور کے مقام کو اپنا مسکن ٹھہرالیا اور صدق وعفاف، توکل واستغنا کے ساتھ لوگوں سے منقطع ہو کر عبادت الٰہی اور افادۂ عوام میں مشغول ہو گئے۔ بے شمار علما وطلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ نوافل وادعیہ سے متعلق عنایۃ الواصلین کے نام سے ان کی ایک تصنیف بھی ہے۔ ۱۱۱۷ھ/ ۱۷۰۵ء میں فوت ہوئے ❶۔

۱۳۲۔ شیخ عنایت اللہ شال کشمیری

شیخ عنایت اللہ شال کشمیری سرزمین کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ نامور علمائے کشمیر سے اکتساب علم کیا، جن میں مولانا ابوالفتح کشمیری اور مولانا عبدالرشید کشمیری شامل ہیں۔ ان کے علاوہ شیخ حیدر بن فیروز چرخی کشمیری کے فرزند گرامی سے بھی استفادہ کیا۔ کم عمری ہی میں معقول ومنقول کے ماہر ہو گئے، بالخصوص حدیث اور فقہ میں درجہ کمال کو پہنچے۔ حدیث رسول اللہ ﷺ سے شغف ومحبت کا یہ عالم تھا کہ چھتیس مرتبہ طلبائے علم کو صحیح بخاری پڑھائی۔ مثنوی مولانا روم نہایت ذوق وشوق سے پڑھتے تھے۔ علم وفضل میں اپنے اقران و معاصرین سے فائق تر تھے۔ اچھے شاعر تھے اور صوفیانہ انداز کے شعر کہتے تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے پوتے شیخ صبغت اللہ سرہندی (متوفی ۹ ربیع الاول ۱۱۲۱ھ/ ۸ مئی ۱۷۰۹ء) سے اخذ طریقت کیا۔ سخت قسم کے موحد تھے اور توحید میں یہ سختی اپنے مرشد شیخ صبغت اللہ سرہندی کی صحبت وارشاد کا نتیجہ تھی۔

ارض کشمیر کے اس ممتاز عالم وفقیہ نے اڑسٹھ (۶۸) سال کی عمر پا کر ماہ شعبان ۱۱۲۵ھ/ اگست ۱۷۱۳ء کو سفر آخرت اختیار کیا ❷۔

۱۳۳۔ شیخ عنایت اللہ قادری لاہوری

شیخ عنایت اللہ لاہوری قصوری کی کنیت ابوالمعارف تھی۔ اپنے عصر کے جلیل القدر عالم اور فقیہ تھے۔

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۹۴۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۲۷۲۔ محبوب ذی المنن، حصہ اول، ص ۶۱۳۔

❷ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۵۲۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۵۔ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۲۱۹، ۲۲۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۹۵۔ روضۃ الابرار، ص ۶۰۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں فقہ کی مشہور درسی کتاب شرح وقایہ پر ایک مفصل و بسیط حاشیہ بھی ہے۔ یہ حاشیہ دو جلدوں میں ہے اور ''غایۃ الحواشی'' کے نام سے موسوم ہے۔ مولانا عبدالحی لکھنوی فرنگی محلی نے اپنی کتاب ''عمدۃ الرعایہ'' کے مقدمے میں جو شرح وقایہ کا حاشیہ ہے، غایۃ الحواشی کا ذکر کیا ہے اور اس کی بڑی تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ انھوں نے غایۃ الحواشی کا مطالعہ کیا ہے، جو دو جلدوں پر مشتمل ہے اور بہت سے مسائل پر محیط ہے۔ اس کے علاوہ شیخ عنایت اللہ لاہوری کنز الدقائق کی بھی ایک مبسوط شرح ضبط تحریر میں لائے، جس کا نام ''ملتقط الحقائق'' رکھا۔ اس میں انھوں نے تشہد میں اشارۂ سبابہ کو مسنون قرار دیا ہے اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ تشہد میں انگشت شہادت اٹھاتے تے۔ صوم و صلوٰۃ اور دیگر ارکانِ اسلام اور عبادات کے بارے میں بھی ایک کتاب تصنیف کی۔ ۱۱۱۰ھ/ ۱۶۹۸ء میں مبحث وجود کے بارے میں ''تنقیح المرام'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔

شیخ عنایت اللہ قادری نے ۱۱۴۱ھ/ ۱۷۲۹ء میں وفات پائی ❶۔

غ

۱۳۴۔ شیخ غلام اخی عثمانی بلگرامی

شیخ غلام اخی بن محی الدین بن محمد امجد عثمانی بلگرامی، بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ بلگرام ہی میں تعلیم حاصل کی اور فقہ کے جلیل القدر علما میں شمار کیے گئے۔ حج و زیارت کی سعادت بھی حاصل کی۔ ''غنیۃ العلم'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جو حدیث اور مسائل فقہ کا ایک مجموعہ ہے۔ علم فرائض میں ''سراجی'' ایک مشہور درسی کتاب ہے، اس کا ترجمہ کیا۔ اس عالم و فقیہ نے ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء کو بلگرام میں وفات پائی ❷۔

۱۳۵۔ سید غلام حسین اورنگ آبادی

سید غلام حسین بن شہاب الدین بن محمد بن اسحاق بغدادی ثم ہندی اورنگ آبادی، نامور عالم و فقیہ اور اپنے عصر کے مشہور شیخ تھے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کی اولاد سے تھے۔ ''جبر'' نام کے ایک شہر میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں گجرات چلے گئے تھے۔ وہاں کے اساتذۂ عصر سے علم حاصل کیا۔ پھر شیخ علی رضا بن فرخ شاہ سرہندی ثم گجراتی (متوفی ۲۱؍ ذی القعدہ ۱۱۴۲ھ/ ۲۷؍ مئی ۱۷۳۰ء) کے دامن مشیخت سے وابستہ ہو گئے، ان

❶ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۵۲۔ خزینۃ الاصفیا، ص ۱۸۵ تا ۱۸۷۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۹۵، ۱۹۶۔ مقدمہ عمدۃ الرعایہ۔

❷ نزہۃ الخواطر ج، ج ۶، ص ۱۹۸۔ بحوالہ شرائف عثمانی۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے اخذ طریقت کیا۔ بعد ازاں اورنگ آباد کا عزم کیا اور وہاں سکونت اختیار کر لی۔ اورنگ آباد میں سب علائق دنیا سے منقطع ہو کر زہد و عبادت میں مشغول ہو گئے۔ ان کا تمام وقت تلاوت قرآن مجید، درود شریف، تہلیل و تسبیح اور دیگر وظائف و اوراد میں گزرتا۔ منقول ہے کہ پوری عمر میں کبھی نماز با جماعت ترک نہیں ہوئی۔ اس عالم دین نے ۲ر جمادی الاولی ۱۱۷۶ھ / ۱۹ر نومبر ۱۷۶۲ء کو اورنگ آباد (دکن) میں داعی اجل کو لبیک کہا۔❶

۱۳۶۔ میر سید غلام علی آزاد بلگرامی

قُسامِ ازل نے برصغیر پاک و ہند کی سرزمین کو جس بہت بڑی نعمت سے نوازا، وہ علم کی فراوانی ہے۔ علم کے جو چشمے اس خطۂ ارض سے پھوٹے اور جس قدر علما و فقہا، مشائخ و صلحا، محققین و مصنفین، معلمین و مدرسین، ارباب فضل اور اصحاب کمال یہاں پیدا ہوئے، وہ کم ہی علاقوں اور ملکوں میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ محلِ وقوع کے اعتبار سے ہندوستان مرکز اسلام سے بہت دور تھا اور صحیح معنوں میں کفرستان تھا، لیکن اس پر اللہ کے احسانِ بے پایاں کا ایسا شامیانہ سایۂ فگن ہوا کہ جگہ جگہ سے قال اللہ وقال الرسول کی دل نواز صدائیں بلند ہونے لگیں۔ علما سرگرم تدریس ہوئے، صلحا نے رشد و ہدایت کی مسندیں بچھائیں اور فقہا و محدثین نے قلم اور زبان سے لوگوں کی ذہنی، علمی اور روحانی تربیت کا بیڑا اٹھایا، اور بہت جلد صنم کدۂ ہند گہوارۂ اسلام کی حیثیت اختیار کر گیا۔ بت تراش، بت شکن ہو گئے اور دین و شریعت سے ناآشنا لوگ، اسلام کے داعی اور دین کے مبلغ بن کر ابھرے۔

اس سلسلے میں دیارِ ہند کے بہت سے علاقوں نے بے پناہ شہرت حاصل کی، جن میں لکھنؤ اور اس کے گردونواح کے متعدد قصبات و دیہات خاص طور سے مشہور ہیں۔ وہاں کے جو مقامات فی الواقع مردم آفرین اور علم و فضل کے مراکز کہلائے، ان میں بلگرام کی بستی کا نام تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ نقش رہے گا۔ واقعات و حالات میں خواہ کتنی بھی تبدیلی واقع ہو اور انقلاب و تغیر کی بے شک کتنی بھی لہریں اٹھیں، تاریخ کے صفحات بلگرام کو ابدالآباد تک اپنے دامن میں محفوظ رکھیں گے۔

فقہائے ہند کی پہلی جلدوں اور زیر مطالعہ جلد میں متعدد مرتبہ بلگرام اور وہاں کے علمائے کرام کا ذکر آچکا ہے۔ ان سطور میں ہم اس بستی کے ایک اور جید عالم اور نامور مورخ سید غلام علی آزاد بلگرامی کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس سے قبل کہ سید ممدوح کے بارے میں کچھ عرض کیا جائے، یہ بتانا ضروری ہے کہ پہلے پہل وہاں علم کی شمع کب روشن ہوئی اور خانوادۂ سادات نے کس طرح اسے اپنا مسکن ٹھہرایا۔

واسطی سادات کی بلگرام میں آمد:

واسطی سادات میں سے جو سب سے پہلے سید بلگرام میں آکر آباد ہوئے ان کا نام سید محمد صغریٰ تھا۔ وہ

❶ محبوب ذی المنن حصہ دوم، ۵۶۲، ۵۶۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۹۹۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خراسان سے آئے تھے اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ احیائے سنت اور اماتت بدعت میں پیش پیش رہتے تھے اور سلطان شمس الدین ایلتتمش کے حلقہ دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ ۶۱۴ھ/ ۱۲۱۷ء میں وہ ایک فوجی کی حیثیت سے غازیان اسلام کے ساتھ بلگرام آئے۔ اس زمانے میں ایک نہایت متعصب اور مغرور وسرکش راجا بلگرام کا حکمران تھا، جس کا نام سری تھا۔ سید محمد صغریٰ اس کی سرکوبی کے لیے تھوڑی سی فوج لے کر آئے۔ معرکہ قتال گرم ہوا، اور راجا اپنے تمام اقارب واعیان کے ساتھ جنگ میں مارا گیا اور سید ممدوح نے بلگرام فتح کر لیا۔ تاریخ فتح لفظ ''خداداد'' (۶۱۴ھ) سے نکلتی ہے۔ اس کے بعد سید محمد صغریٰ نے بلگرام ہی میں سکونت اختیار کر لی اور فرشوری شیوخ اور ترکمان بھی جو ان کے ساتھ تھے، یہیں رہ پڑے۔ سید غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

وبعد از فتح خود با شیوخ فرشوری وترکمانان دراں مقام طرح اقامت ریخت ❶۔

(یعنی بلگرام فتح کرنے کے بعد سید محمد صغریٰ نے فرشوری شیوخ اور ترکمانوں کے ساتھ اسی جگہ کو اپنا مسکن قرار دے لیا۔)

اس زمانے میں مال گزاری کا دستور یہ تھا کہ غلے کی پیداوار کا دسواں حصہ انھیں دیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ سلطان سکندر لودھی کے بیٹے سلطان ابراہیم لودھی کے عہد تک جاری رہا۔ چنانچہ اس ضمن میں فرماں روائے دہلی محمود شاہ بن محمد شاہ بن سلطان فیروز نے ایک فرمان میں جو ۲۷ربیع الثانی ۸۰۵ھ/ ۲۴ نومبر ۱۴۰۲ء کا لکھا ہوا ہے اور سید غلام علی آزاد بلگرامی نے اسے دیکھا ہے، یہ الفاظ مرقوم ہیں:

''چنانچہ درعہد سلاطین ماضیہ عشر عین غلہ دادہ اند ہم برآں جملہ بدہند۔'' ❷

سید غلام علی آزاد کے اسلاف پرگنہ بلگرام کے غلے کی پیداوار میں سے دسواں حصہ باقاعدہ سلطان ابراہیم لودھی کے عہد تک وصول کرتے رہے۔ لیکن جمادی الاخریٰ ۹۳۲ھ/ اپریل ۱۵۲۶ء کو جب مغل حکمران ظہیرالدین بابر نے ابراہیم لودھی کو پانی پت کے میدان میں شکست دے کر اسے قتل کر دیا اور اپنی حکومت قائم کر لی تو بقول آزاد بلگرامی، غلے کی وصولی کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

واز عہد بابر بادشاہ سررشتہ قدیم برہم خورد ❸۔

سید محمد صغریٰ عالم وفاضل اور صاحب دعوت بزرگ تھے۔ انھوں نے ۶۲۷ھ/ ۱۲۳۰ء میں سلطان شمس الدین ایلتتمش کے حکم سے بلگرام میں ایک بلند مقام پر شہر کے وسط میں قلعہ بھی تعمیر کرایا تھا۔ مرورِ ایام سے جب قلعے کی دیواریں ٹوٹ گئیں تو اس کے کتبے کا پتھر جس پر سلطان شمس الدین کا نام کندہ تھا، محلّہ سید واڑہ کی

❶ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۱۲

❷ ایضاً۔

❸ ایضاً۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسجد میں نصب کر دیا گیا۔ اس کتبے کی عبارت یہ ہے:

حامی البلاد، داعی العباد، ذی الامان لاھل الایمان، وارث ملك سلیمان صاحب الخاتم فی ملل العالم، ظل الله فی الخافقین، ابو المظفر ایلتمش السلطان ناصر امیر المومنین، دام الله تمکینه فی شهور سبع و عشرین و ستمأة۔

فتح بلگرام کے بعد سید محمد صغریٰ اکتیس سال زندہ رہے اور زندگی کے یہ لیل ونہار بلگرام ہی میں بسر ہوئے۔ انھوں نے ۱۴ر شعبان ۶۴۵ھ/ ۱۴ر دسمبر ۱۲۴۷ء کو وفات پائی۔

سید غلام علی آزاد انہی سید محمد صغریٰ کی اولاد میں سے تھے۔

سید غلام علی کی ولادت اور تعلیم وتربیت:

سید غلام علی آزاد، یک شنبہ کے روز ۲۵ر صفر ۱۱۱۶ھ/ ۱۸ر جون ۱۷۰۴ء کو بلگرام میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی سید محمد نوح حسینی واسطی تھا۔ علم وفضل کی گود میں پرورش پائی اور صالحیت ومشیخت کے ماحول میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ کتب درسیہ سید طفیل محمد اترولوی بلگرامی (متوفی ۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۸ء) سے پڑھیں، جو اس عہد کے مشہور فاضل اور نامور عالم تھے۔ عروض وقافیہ اور ادب کی بعض کتابوں کی تحصیل سید محمد بلگرامی (متوفی ۱۱۸۵ھ/ ۱۷۷۱ء) سے کی جو آزاد کے ماموں اور سید عبدالجلیل بلگرامی (متوفی ۲۳ر ربیع الثانی ۱۱۳۸ھ/ ۱۸ر دسمبر ۱۷۲۵ء) کے فرزند رشید تھے۔ اس زمانے میں سید عبدالجلیل بلگرامی کا شمار اساتذۂ روزگار میں ہوتا تھا۔ وہ آزاد کے نانا تھے اور سولہ برس کی طویل سیر وسیاحت اور ملازمت سلطنت کے بعد ۱۱۳۲ھ/ ۱۷۲۰ء میں اپنے وطن بلگرام آئے تھے۔ آزاد کی عمر ان دنوں سترہ برس کی ہو چکی تھی اور پہلی دفعہ دیار ہند کے اس فاضل کبیر کی زیارت کا موقع میسر آیا تھا۔ آزاد ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے حضور زانوئے شاگردی تہ کیا۔ کتب حدیث ان سے پڑھیں اور سند واجازہ سے بہرہ مند ہوئے۔ ۱۱۳۴ھ/ ۱۷۲۲ء میں سید عبدالجلیل نے پھر دہلی کا عزم کیا۔ آزاد نے چوں کہ ابھی تکمیل کی منزلیں طے نہیں کی تھیں، اس لیے یہ بھی ساتھ گئے اور تین برس تک ان کی خدمت میں رہ کر مزید استفادہ کیا۔ اب قاموس اللغۃ کا بڑا حصہ ان سے پڑھا اور حدیث کی بعض کتابیں مکمل کیں۔ سیرت کی کچھ کتابوں کے لیے بھی ان سے رجوع کیا۔ بعض دیگر مروجہ علوم وفنون بھی ان سے پڑھے۔

سید عبدالجلیل اپنے عصر کے جلیل القدر عالم تھے اور جوہر قابل کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ آزاد کی ذہانت اور استعداد وقابلیت سے وہ بڑے متاثر تھے۔ اکثر اظہار مسرت کرتے ہوئے آزاد سے کہتے:

می خواہم بہ وجود نشانی از من باقی ماند[1]۔

(مجھے امید ہے تمھاری وجہ سے میری علمی یادگار قائم رہے گی۔)

[1] مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۶۱۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنے نانا سید عبدالجلیل بلگرامی سے اکتساب علم کا ذکر آزاد اشعار میں بھی کرتے ہیں۔ ایک شعر میں کہتے ہیں:

آزاد ما کہ فضل و کمال رساند   خدمت نمود حضرت عبدالجلیل را

فارغ التحصیل ہونے کے بعد آزاد سواد بلگرام میں واپس آئے اور پھر کافی عرصہ یہاں مقیم رہے۔
آزاد طبعاً درویش منش اور صوفی مزاج تھے، اس لیے عین عالم جوانی (ماہ جمادی الاولیٰ ۱۱۳۷ھ/جنوری ۱۷۲۵ء) میں سلسلہ چشتیہ کے مطابق میر سید لطف اللہ بلگرامی المعروف بہ شاہ لدھا (متوفی شب یک شنبہ ۱۴ر جمادی الاولیٰ ۱۱۴۳ھ/۱۴ر نومبر ۱۷۳۰ء) سے بیعت ہوئے اور کسب فیض کیا۔

سیر و سیاحت:

اب آزاد کی سیر و سیاحت کا دور شروع ہوتا ہے۔ ۱۱۴۲ھ/۱۷۳۰ء میں وہ سندھ کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اس زمانے میں ان کے ماموں سید محمد بلگرامی بادشاہ دہلی کی طرف سے سندھ کے میر بخشی اور وقائع نگار تھے، اور سندھ کا ایک شہر سیوستان ان کا صدر مقام تھا۔ آزاد ان سے ملاقات کے لیے ذی الحجہ ۱۱۴۲ھ/ جولائی ۱۷۳۰ء میں بلگرام سے نکلے اور دہلی، لاہور اور ملتان سے گزرتے ہوئے، ربیع الاول ۱۱۴۳ھ/ستمبر ۱۷۳۰ء کے عشرۂ اول میں سیوستان پہنچے۔ یعنی یہ مسافت ایک برس تین مہینے میں طے ہوئی۔ اس سے اس دور کے سفر کی مشکلوں اور دشواریوں کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

میر سید محمد نے آزاد کی سیوستان میں آمد کو غنیمت جانا اور انھیں اپنا قائم مقام مقرر کر کے خود اپنے وطن بلگرام کا عزم کیا۔ پورے چار سال بعد وہ سندھ واپس آئے اور سیوستان پہنچے۔ آزاد نے میر ممدوح کی سرکاری ذمہ داریاں ان کے سپرد کیں اور ۱۱۴۷ھ/۱۷۳۴ء میں دہلی کا رخ کیا۔ یہاں آ کر انھیں پتا چلا کہ ان کے والد اپنے اہل و عیال سمیت الہ آباد تشریف لے گئے ہیں۔ یہ بات سنتے ہی وہ آگرہ ہوتے ہوئے الہ آباد پہنچے۔ جب شہر میں داخل ہوئے تو لوگ رمضان المبارک کا چاند دیکھ رہے تھے۔ والدین سے مل کر آزاد نہایت خوش ہوئے۔ الہ آباد میں تین سال مقیم رہے۔ اس تین سال کے زمانۂ قیام میں دو مرتبہ بلگرام بھی گئے۔

قصد حج:

بلگرام کے دوسرے سفر سے الہ آباد واپس آئے تو حریم دل میں سفر حج کے شوق نے کروٹ لی۔ منقول ہے کہ عہد طفولیت کے ایک خواب میں انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی زیارت کا شرف حاصل کیا تھا۔ اس خواب کی تعبیر کے لیے نہایت بے تاب رہتے تھے۔ بالآخر چارۂ ضبط نہ رہا اور ۳ر رجب ۱۱۵۰ھ/۱۶ر اکتوبر ۱۷۳۷ء کو بے اختیار گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ یہ ان کی زندگی کا نہایت ہی اہم سفر تھا۔ اس سے قبل کبھی پیادہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روی کا اتفاق نہیں ہوا تھا، لیکن اس طویل سفر پر وہ پا پیادہ ہی روانہ ہو گئے اور بغیر کسی کو اطلاع دیے چپکے سے عزم سفر کیا۔ تیسرے دن لوگوں کو ان کی روانگی کا علم ہوا۔ گھر کی عورتوں نے بالخصوص بڑی پریشانی کا اظہار کیا۔ آزاد نے متعارف اور معمول کا راستہ چھوڑ کر غیر متعارف راستہ اختیار کیا تھا کہ لوگوں کو پتا نہ چل سکے اور کوئی تعاقب میں نکلے تو پکڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ چنانچہ ان کے بھائی میر سید غلام حسن نے تین منزل تک ان کا تعاقب کیا، لیکن وہ ہاتھ نہ آئے، لہٰذا مجبوراً واپس آ گئے۔

آزاد کو غیر متعارف راستہ اختیار کرنے کی وجہ سے بڑی صحرا نوردی کرنا پڑی اور اس میں انھیں بہت تکلیفیں پہنچیں۔ ایک مثنوی میں جس کو وہ طلسم اعظم کے تاریخی نام سے موسوم کرتے ہیں، ان تکلیفوں کا ذکر کیا ہے۔

یوں تو آزاد سفر حج اور قصد بیت اللہ کے لیے بہت عرصے سے بے قرار تھے، لیکن اس اثنا میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے سوزِ دل کو مہمیز لگا دی اور وہ ہر ممکن عجلت کے ساتھ عازمِ بیت اللہ ہو گئے۔ ان کے شاگرد لچھمی نارائن شفیق نے گل رعنا میں وہ واقعہ خود آزاد سے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ان کے قیام الٰہ آباد کے زمانے میں مبارز الملک نواب سر بلند خاں صوبہ الٰہ آباد کے ناظم تھے۔ وہ اپنے لڑکے میر محمود خاں المخاطب بہ نواب شاہ نواز خاں کو اپنا نائب بنا کر اس عہد کے حکمران محمد شاہ کی خدمت میں دہلی گئے۔ آزاد کے والد میر سید محمد نوح بلگرامی اس زمانے میں نواب شاہ نواز خاں مذکور کی سرکار میں میر سامان تھے۔ ایک دن وہ اپنے دونوں بیٹوں، میر سید غلام حسن اور میر غلام علی آزاد بلگرامی کو نواب شاہ نواز کی خدمت میں لے گئے۔ نواب اپنے بنگلے میں بیٹھے تھے اور آزاد کے والد سید محمد نوح ان کے قریب کھڑے دستخطوں کے لیے کاغذات ان کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ یہ دونوں بھائی کچھ فاصلے پر ''سلام گاہ'' میں کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگے کہ نواب اس طرف نگاہِ التفات کریں تو یہ انھیں آداب بجا لائیں۔ لیکن نواب دستخط کرنے میں اتنے منہمک تھے کہ دیر تک اس کا موقع نہ آیا۔ چوب داروں کا قاعدہ تھا کہ ٹھہر ٹھہر کر اپنے آقا کو اشارہ کرتے تھے، مثلاً مجرائی کے لیے بلند آواز سے کہتے: ''با ادب با قاعدہ''۔ چوب دار نے دو تین مرتبہ صدا لگائی، لیکن نواب نے ادھر عنان توجہ مبذول نہ کی۔ آزاد کہتے ہیں کہ اس صورت حال سے میری غیرت جوش میں آئی اور میں نے دل میں سوچا کہ مخلوق کے دروازے پر اس قدر لجاجت کناں ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ میں وہاں سے واپس چلا آیا۔ والد گھر آئے تو مجھ سے پوچھا کہ تم نواب کو آداب بجا لائے بغیر کیوں چلے آئے۔ آخر تمھارا کیا ارادہ ہے؟ میں نے جواب دیا، جو آپ خیال فرمائیں۔ اسی دن سے میں نے عہد کر لیا کہ جتنی جلدی ہو سکے مخلوق کے دروازے سے کنارہ کش ہو کر خالق کے دروازے پر پہنچنا چاہیے۔

آخر وہ ساعت سعید آ گئی جب آزاد کی یہ تمنا پوری ہوئی اور انھوں نے مخلوق کے دروازے سے منہ موڑ کر درِ خالق کا رخ کیا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، آزاد بالکل خاموشی سے اس سفر پر روانہ ہوئے تھے، کسی کو اس کی اطلاع نہ دی تھی۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ والد گرامی یا کوئی اور شخص ان کے ارادے میں حائل نہ ہوں اور وطن میں مقیم رہنے اور حکومت کی ملازمت اختیار کرنے پر اصرار نہ کریں، چنانچہ اس میں وہ کامیاب رہے اور تلاش و تعاقب کے باوجود اعزہ واقارب کے ہاتھ نہ آئے۔ اثنائے راہ میں انھوں نے اپنے اعزہ کو ایک رقعہ لکھا، جس میں یہ شعر درج تھا:

رفتہ ام از خود چہ می پرسی دگر از حال ما کعبہ می آید در ایں وادی باستقبالِ ما

اس شعر سے واضح ہوتا ہے کہ آزاد کے دل میں شوقِ حج اور زیارت کعبہ کا جذبہ کس قدر موج زن تھا۔ انھوں نے بلگرام سے سرونج تک جو حدودِ مالوہ میں واقع ہے، پا پیادہ سفر کیا، اور چوں کہ اس طرح کے مشقت آمیز سفر کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا، اس لیے پاؤں میں آبلے پڑ گئے اور زمین پر قدم رکھنا مشکل ہو گیا۔ اس میں ان کا رفیق سفر محض تنہائی تھا۔ صبح سے شام تک چلنے سے پاؤں خون آلود ہو گئے تھے۔ ہر طرف پہاڑ اور ناہموار جنگل تھے اور خوف اور دہشت کا منظر تھا۔ لیکن ایک سچا عاطفۂ شوق تھا جو انھیں کشاں کشاں لیے جا رہا تھا۔ اس کیفیت کو مآثر الکرام میں آزاد ان اشعار میں بیان کرتے ہیں:

می بریدم رہے بہ بے پائی با رفیقے کہ بود تنہائی
صبح تا شام راہ می رفتم خون چکاں تر ز آہ می رفتم
ہمہ کہسار و دشت ناہموار قدم مورد ایں رہِ دشوار
ہر قدم رودہا و جیحونہا چوں دم تیغ تشنۂ خونہا
موج خوناب و جوش آبلہا ریختہ در راہ رنگ سلسلہا
فکر ہا دست زد بہ دامن دل کرد شمشیر کلفتم بسمل ❶

نواب آصف جاہ کے دربار میں:

آزاد جن دنوں علاقہ مالوہ میں پہنچے، ان دنوں نظام دکن نواب آصف جاہ مالوے میں فوجیں لیے پڑا تھا۔ نواب مذکور کے لشکریوں میں ایک نیک دل شخص نے آزاد کے حالات سے مطلع ہو کر نہایت فیاضی کا مظاہرہ کیا۔ گھر لے گیا۔ اپنا مہمان بنایا اور ایک نہایت شان دار رتھ سواری کو دیا۔ ان کے علم و فضل کا شہرہ چوں کہ دور دور تک پہنچ چکا تھا، لہٰذا نواب آصف جاہ کے دربار میں ایک تقریب کا انعقاد عمل میں لایا گیا اور ۲۲/شعبان ۱۱۵۰ھ/۴/دسمبر ۱۷۳۷ء کو نواب سے ملاقات کا موقع میسر آیا۔ آزاد نے زندگی میں کبھی امرا و ملوک کی مدح میں زبان آلودہ نہ کی تھی، لیکن سفر حج کے شوق اور زیارتِ بیت اللہ کی بے تابی میں اس خود داریٔ نفس کا رشتہ

❶ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۹۲۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہاتھ سے چھوٹ گیا اور دربار میں جا کر نواب کی مدح میں یہ رباعی پڑھی:

اے حامی دین، محیط جودو احسان — حق داد ترا خطاب آصف شایان
او تختِ بہ درگاہ سلیمان آورد — تو آلِ نبی رابہ در کعبہ رسان

مآثر الکرام میں یہ رباعی درج کرنے کے بعد خود آزاد اس کا ذکر کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

فقیر باوصف موزونی طبع مدت العمر زبان بہ مدح اغنیانہ کشودہ ام، الا ایں رباعی کہ دراستعانت سفر بیت اللہ سرزد، ودو بیت عربی کہ در دفتر ثانی درترجمہ نواب نظام الدولہ شہید مذکور می شود ❶۔

(یعنی اس فقیر نے شاعر ہونے کے باوجود عمر میں کبھی ارباب دولت کی مدح سرائی میں زبان نہیں کھولی۔ صرف یہی ایک رباعی ہے جو سفر بیت اللہ میں استعانت کے سلسلے میں نوک زبان پر آ گئی۔ یا مآثر الکرام کے دفتر ثانی میں جسے سرو آزاد کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، نواب نظام الدولہ شہید کے حالات کے ضمن میں عربی کے دو بیت موزوں ہو گئے۔)

میدان جنگ میں:

نواب آصف جاہ اس زمانے میں مرہٹوں سے برسر پیکار تھا، جس کے نتیجے میں رمضان کا پورا مہینا یوں گزرا کہ حدودِ بھوپال میں ہر طرف آتش جنگ مشتعل اور زلزلۂ قیامت بپا تھا۔ آزاد کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

القصہ دراں حدود نواب آصف جاہ متوجہ تنبیہ افواج مرہٹہ بود، تمام رمضان در سواد شہر بھوپال آتش حرب اشتعال داشت وزلزلۂ ساعت قائم بود ❷۔

(یعنی ان دنوں نواب آصف جاہ مرہٹوں کے لشکر کی سرزنش میں مصروف تھا، بھوپال کا شہر تمام رمضان المبارک میں جنگ کی آتش خیزیوں کا مرکز بنا رہا اور پورا مہینا قیامت کی سی کیفیت طاری رہی۔ درودیوار لرزتے اور کانپتے رہے۔)

خود آزاد بھی اس موقعے پر شمشیر بدست ہوئے اور جنگ میں حصہ لیا۔ اس کا ذکرہ وہ بڑے فخر کے ساتھ کرتے ہیں:

من ہم آں روز در صفِ اسلام — با یکے ذوالفقار خون آشام
قدم پُر دلانہ آفشردم — حملہ ہا بر مخالفان بردم
تشنگیہائے روزۂ رمضان — کردہ از کام تا جگر بریان
سفر کعبہ و صیام و جہاد — ایں سہ دولت بہم مرا روداد

❶ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۹۳۔

❷ ایضاً۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حج کو روانگی:

رمضان المبارک (۱۱۵۰ھ/ ۱۷۳۷ء) کے آخری دنوں میں نظام الملک نواب آصف جاہ نے مرہٹوں سے صلح کر لی اور جنگ ختم ہو گئی۔ اب نواب نے دکن کو مراجعت کی اور ہر طرف سے مطمئن ہو کر آزاد کے سفر حج کے لیے خرچ اور سواری کا معقول انتظام کیا۔ بقول آزاد:

"و بہ اعانت نواب زاد و راحلہ خاطر خواہ دست بہم داد ❶۔

صاحب شرائف عثمانی کے بیان کی رو سے نواب نے پانچ سو روپے عنایت کیے، جو اس زمانے میں واقعی "خاطر خواہ" رقم تھی۔

اوائل شوال میں آزاد، بھوپال سے نکل کر برہان پور گئے۔ وہاں سے روانہ ہوئے تو ۱۰/ ذی قعدہ کو سورت پہنچے۔ سورت کی بندرگاہ سے ۲۴/ ذی قعدہ کو جہاز میں سوار ہو کر کرۂ خاکی سے کرۂ آبی میں داخل ہوئے۔ ۱۸/ محرم ۱۱۵۱ھ/ ۲۷/ اپریل ۱۷۳۸ء کو ان کا جہاز بندرگاہ جدہ میں لنگر انداز ہوا۔ سورت سے جدہ تک کا سفر ایک مہینا اٹھارہ دن میں طے ہوا۔

شیخ محمد فاخر سے ملاقات:

شیخ محمد فاخر زائر الہ آبادی (متوفی ۱۱/ ذوالحجہ ۱۱۶۴ھ/ ۱۹/ اکتوبر ۱۷۵۱ء) جو برصغیر کے سلفی العقیدہ عالم کبیر، متبع سنت، مصنف شہیر، نامور محدث و فقیہ اور بلند منزلت صوفی و شاعر تھے، اس زمانے میں وہیں قیام فرما تھے۔ آزاد کے بہت قدر دان تھے۔ ان کی آمد کی خبر سن کر نہایت اشتیاق سے استقبال کو آئے۔ آزاد جہاز سے اترے تو سب سے پہلے انہی سے ملاقات ہوئی اور دونوں بڑی گرم جوشی سے ملے۔ آزاد لکھتے ہیں:

شیخ محمد فاخر متخلص بہ زائر الہ آبادی...... در جدہ تشریف داشت، خبر قدوم فقیر از مردم جہازی کہ دو روز پیش از جہاز ما رسیدہ بود، یافتہ، برلب دریا انتظار می کشید، ہمیں کہ قدم از بحر خشکی گزاشتم ملاقات شد، و سرور عجبی دست داد ❷۔

(یعنی شیخ محمد فاخر زائر الہ آبادی...... جدہ میں تشریف فرما تھے، جو لوگ ہمارے جہاز سے دو دن پہلے وہاں پہنچ چکے تھے، ان سے اس فقیر کی آمد کی اطلاع پا کر ساحل سمندر پر انتظار کر رہے تھے۔ جوں ہی میں نے سمندر سے خشکی میں قدم رکھا، ملاقات کا شرف حاصل ہوا، اور بے حد مسرت ہوئی۔)

مکہ مکرمہ میں حاضری:

آزاد کا دل سرزمین حجاز میں پہنچنے کے لیے انتہائی بے تاب تھا اور آنکھیں زیارت حرمین کے لیے

❶ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۹۳، ۲۹۴۔

❷ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۹۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بدرجہ غایت بے قرار تھیں۔ وہ ہر ممکن عجلت کے ساتھ جدہ سے روانہ ہوئے اور ۲۳ محرم ۱۱۵۱ھ کو مکہ مکرمہ کی ارض پاک پر قدم رکھا۔ وہاں ان کی جبینِ نیاز اپنے پروردگار کے حضور بیت اللہ میں سجدہ ریز ہوئی اور تسکین قلب و روح کا سامان بہم پہنچایا۔ خود فرماتے ہیں:

''وجبین ناز بآستان سائی بیت اللہ برافروختم۔''

حرم مقدس میں ان کے دل کے تار ہل چکے تھے اور باطن کی دنیا یک لخت بدل گئی تھی، چنانچہ سراپا عجز ہو کر ان کی زبان حق بیان سے یہ ترانہ بلند ہوا۔

الٰہی نالہ گرمی دل دیوانہ مارا ‏ کرامت کن نہاں آتشینی دانہ مارا
مدہ در دست زنگارِ ہوس آئینہ دل را ‏ زحسن خویش کن آباد حیرت خانہ مارا
کریماں را نظر برزشتی مہمان نمی باشد ‏ مبرا ز باغ بیروں سبزۂ بیگانہ مارا
دریں نرم کہن از دست مردم آبرو مشکن ‏ تو گردش دہ برنگ آسمان پیمانہ مارا
دل مادر چراغاں تجلی رنگ می بازد ‏ سمندر ساز و درآتش نشاں پروانہ مارا
تہی مگزار یک دم سینہ را از جنبش آہی ‏ بایں سنبل سراسر سبز کن ویرانہ مارا
صریر خامۂ آزاد را شور دو عالم کن ‏ نمک دہ از قبول خویشتن افسانہ مارا

مدینہ منورہ میں آمد:

مکہ مکرمہ میں آزاد اس وقت پہنچے تھے، جب موسم حج گزر چکا تھا، اور اگلے سال کے حج میں کئی مہینے باقی تھے، لہٰذا صرف تین دن وہاں رہے تھے کہ دل میں مدینہ منورہ کے لیے آتشِ شوقِ زیارت بھڑک اٹھی۔ خزانۂ عامرہ میں لکھتے ہیں:

چوں موسم حج دور بود، سہ روز در مکہ معظمہ ماندہ رو بمدینہ منورہ آوردم وغبارِ آستانِ رسالت راکحل الجواہر چشم نیاز ساختم ❶۔

(یعنی چوں کہ زمانۂ حج ابھی دور تھا، اس لیے صرف تین دن مکہ معظّمہ میں رہ کر مدینہ منورہ کا رخ کیا اور چشم عقیدت نے غبارِ آستانۂ رسالت کو سرمہ بنایا۔)

مآثر الکرام میں رقم طراز ہیں کہ ۲۶ محرم ۱۱۵۱ھ/ ۵ مئی ۱۷۳۸ء کو مکہ معظّمہ سے مدینہ طیبہ کا قصد کیا۔ ان کی عمر اس وقت چھتیس برس کی تھی۔

از آں جا کہ شوق مدینہ سکینہ جلوہ ریز بود، طاقت صبر در خود نیافتہ بست و ششم منہ روزِ جمعہ بعد ادائے نماز جمعہ رو براہِ مدینہ مقدسہ آوردم۔ بست و پنج ماہ صفر کہ دریں تاریخ از کتم عدم بہ شہرستان ہستی وارسیدہ ام،

---

❶ خزانہ عامرہ، ص ۱۲۵۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دمرحلہ سی وششم گزاشتم، وقت سحر از سوادِ مدینہ منورہ سرمۂ سعادت در چشم کشیدم، و دیدۂ آرزومند را برقبۂ روضۂ اقدس مالیدم ❶۔

(مکہ معظمہ سے دلِ بے قرار میں مدینہ منورہ کی شوقِ زیارت نے کروٹ لی، چنانچہ طاقت صبر نہ پا کر ۲۶/محرم کو جمعۃ المبارک کے دن، نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد مدینہ مقدسہ کی راہ اختیار کی۔ ۲۵/ماہ صفر کو کہ اسی تاریخ کو میں جہانِ عدم سے عالم وجود میں آیا تھا اور اب چھتیس سال کی عمر کو پہنچ گیا ہوں، سحری کے وقت، سوادِ مدینہ کا سرمۂ سعادت آنکھوں میں ڈالا اور دیدۂ آرزومند کو روضۂ اقدس کے آستانۂ مبارکہ کی دید سے بہرہ مند کیا۔)

اس دور میں سفر کس قدر دشوار تھا۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ آزاد نے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ تک کی مسافت ایک مہینے میں طے کی۔

مولانا محمد حیات سندھی سے اجازۂ حدیث:

جس زمانے میں میر غلام علی آزاد مدینہ منورہ میں آئے، اس زمانے میں وہاں کشور سندھ کے جلیل القدر محدث وفقیہ اور رفیع المرتبت عالم ومصنف مولانا محمد حیات سندھی مدنی (متوفی ۲۶/صفر ۱۱۶۳ھ/۲۴/جنوری ۱۷۵۰ء) کا ہنگامۂ درس جاری تھا اور بے شمار اصحاب فضل وکمال ان سے مستفید ہو رہے تھے۔ وہ سندھ کے چاچڑ قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور اعمال بھکر کے موضع عادل پور کے باشندے تھے۔ عنفوان شباب ہی میں حجاز تشریف لے گئے تھے اور مدینہ منورہ میں متوطن ہو گئے تھے۔ آزاد اگرچہ ہندوستان کے متعدد باکمال علما اور فاضل اساتذہ سے تحصیل کر چکے تھے اور اہل علم کے نزدیک بڑی قدر ومنزلت کے مالک تھے، لیکن تشنگی علم ہنوز باقی تھی اور وہ سیرابی ذہن وفکر کے مزید سامان تلاش کر رہے تھے۔ چنانچہ مدینہ منورہ پہنچے تو مولانا محمد حیات کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے اور ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ ان سے صحیح بخاری پڑھی اور صحاح ستہ کی سند لی۔ مولانا ممدوح کا آزاد نہایت احترام سے نام لیتے اور ان کے فضل وکمال کا فراخ دلی سے اعتراف کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

درشہور اقامت ایں بلدۂ طیبہ صحیح بخاری را خدمت مولائی واستاذی شیخ محمد حیات السندی المدنی نور اللہ ضریحہ سند کردم واجازتِ صحاح ستہ وسائر مفردات مولانا برگرفتم ❷۔

(یعنی جن مہینوں میں مجھے مدینہ کے بلدۂ طیبہ میں اقامت کا موقع ملا، میں نے مولائی واستاذی شیخ محمد حیات سندھی مدنی (اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے) کی خدمت میں حاضر ہو کر صحیح بخاری کا درس لیا اور صحاح

❶ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۹۴۔

❷ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۹۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ستہ کی سند واجازہ کا شرف حاصل کیا۔)

اس زمانے میں آزاد کا یہ معمول تھا کہ اکثر راتوں کو مسجد نبوی میں جا کر منبر رسول ﷺ کے قریب بیٹھ جاتے اور صحیح بخاری کا مطالعہ کرتے۔ ان دنوں ایک غزل کہی جس کا مطلع یہ ہے:

نمود جلوۂ اعجاز شمع مطلبی نماند شوخی چشم شرار بولہبی

چند روز کم آٹھ مہینے مدینہ منورہ میں قیام رہا۔

مکہ مکرمہ کو روانگی:

آزاد ۲۵؍صفر ۱۱۵۱ھ/ ۳؍جون ۱۷۳۸ء کو مدینہ شریف آئے تھے۔ ۱۴؍شوال ۱۱۵۱ھ/ ۱۴؍جنوری ۱۷۳۹ء کو قصد حج سے مکہ مکرمہ کو روانہ ہوئے۔ روانگی کے وقت وہ جس قلبی کیفیت سے دو چار تھے اور جو حالت ان پر طاری تھی، اس کا تذکرہ انھوں نے نہایت مؤثر انداز اور رقت آمیز الفاظ میں سبحۃ المرجان میں کیا ہے [1]۔

بارہ دن کے بعد ۲۶؍شوال کو وہ مکہ معظّمہ پہنچے۔ یہاں مناسک حج کی ادائیگی کے ساتھ تحصیل علم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ مکہ معظّمہ میں انھوں نے شیخ عبدالوہاب طنطاوی مصری سے جو اس دور کے مشہور محدث ہو گزرے ہیں، فن حدیث میں استفادہ کیا۔ آزاد لکھتے ہیں کہ جب شیخ عبدالوہاب کو میرے تخلص کا علم ہوا اور مجھ سے لفظ آزاد کے معنی سمجھے تو فرمایا: یا سیدی انت من عتقاء الله [2]۔

۱۱۵۲ھ/ ۱۷۳۹ء کے سال کا آغاز ان کو مکہ معظّمہ ہی میں ہو گیا تھا۔ چار مہینے سے زیادہ عرصہ وہ اس مقدس شہر میں مقیم رہے اور اس اثنا میں فریضۂ حج ادا کیا۔

ماہ ربیع الاول میں وہ مکہ مکرمہ سے طائف کی سیر کے لیے نکلے اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے مرقد پر پہنچے۔ وہاں ان اشعار میں اپنے جذبۂ اخلاص کا اظہار کیا:

اے صبا رو بہ مزار پسر عم نبی خاکِ آں روضہ کم از عنبر ترشنانی
کردہ ام خوب تماشا چمن طائف را نہ رسد ہیچ گلِ اوبہ گلِ عباسی

آخر ربیع الثانی ۱۱۵۲ھ/ جولائی ۱۷۳۹ء میں وہ طائف سے مکہ مکرمہ واپس آئے اور طواف وداع کرنے کے بعد جدہ کو روانہ ہوئے۔

مراجعت ہند:

۳؍جمادی الاولی ۱۱۵۲ھ/ ۲۸؍جولائی ۱۷۳۹ء کو آزاد مراجعت ہند کی غرض سے بندرگاہ جدہ سے

---

[1] دیکھیے، سبحۃ المرجان، ص ۱۲۰۔

[2] سرو آزاد، ص ۲۹۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جہاز میں سوار ہوئے، چھبیس روز کے بعد ۲۹ر جمادی الاولیٰ کو ان کا جہاز سورت پہنچا۔ ۲ر جمادی الاخریٰ کو وہ شہر سورت میں داخل ہوئے۔

آزاد اپنی تصنیف ''ید بیضا'' میں وطن واپسی کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ''اہل و عیال، بالخصوص والدین کی محبت مجھے چین نہیں لینے دیتی تھی اور اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وطن جا کر ان کی خدمت کروں اور مجھ پر جو ان کے حقوق عائد ہوتے ہیں انھیں ادا کرنے کا فرض انجام دوں۔'' لیکن یہ عجیب بات ہے کہ سورت پہنچ کر وہ فوری طور پر وطن نہیں گئے بلکہ پانچ مہینے سے بارہ تیرہ دن اوپر وہیں مقیم رہے۔ پھر وہاں سے نکلے تو دکن کا رخ کیا۔ شرائف عثمانی کے دیباچے میں شیخ غلام حسن ثمین ان کے دکن جانے کے بارے میں اس امکان کا اظہار کرتے ہیں کہ نظام الملک نواب آصف جاہ نے آزاد کو حج کے لیے رخصت کرتے وقت ان سے یہ استدعا کی تھی کہ واپسی پر اسی (دکن کے) راستے سے آئیں۔ ممکن ہے، سورت پہنچ کر انھیں نظام الملک کی یہ استدعا یاد آ گئی ہو، اور جذبۂ احسان مندی نے دکن جانے پر مجبور کر دیا ہو۔ لیکن اگر یہ صحیح ہے تو مسلسل ساڑھے پانچ مہینے سورت میں کیوں رکے رہے؟ سب سے پہلے انھیں دکن جانا چاہیے تھا۔

دکن کو روانگی:

۱۱ر ذوالقعدہ ۱۱۵۲ھ/ ۲۹ر جنوری ۱۷۴۰ء کو وہ سورت سے دکن کے لیے روانہ ہوئے اور ۲۷ر ذوالقعدہ کو اورنگ آباد پہنچے۔ وہاں انھوں نے بابا شاہ مسافر نقشبندی کی خانقاہ میں قیام کیا۔ اس خانقاہ میں آزاد نے مختلف اوقات میں سات سال کا طویل عرصہ گزارا۔ پہلی دفعہ کم و بیش دو سال مقیم رہنے کے بعد ۲ر رمضان ۱۱۵۴ھ/ ۳۱ر اکتوبر ۱۷۴۱ء کو اورنگ آباد سے نکلے اور قلعہ محمد آباد، بیدر، خاندیش، اور برار وغیرہ کی سیاحت کرتے ہوئے اس شہر میں پہنچے جو دکن کے سلاطین بہمنیہ کا دارالسلطنت رہ چکا تھا۔ اس شہر کا حال بیان کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں کہ اب یہ شہر خستہ حالت میں ہے اور بڑی بڑی شاہی عمارتیں کھنڈروں میں بدل چکی ہیں، جو دیکھنے والوں کے لیے سامانِ عبرت پیدا کرتی اور دنیا کی ناپائداری کا مرثیہ پڑھتی ہیں۔

۴ر محرم ۱۱۵۵ھ/ ۲۷ر فروری ۱۷۴۲ء کو وہ حیدر آباد میں وارد ہوئے۔ حیدر آباد کی وہ بہت تعریف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اس شہر کی عمارتیں بڑی عمدہ ہیں۔ شاہ راہیں کشادہ ہیں۔ یہاں پانی کی فراوانی ہے۔ درخت اور کھیت شاداب ہیں۔ ۱۹ر صفر تک وہ حیدر آباد میں مقیم رہے اور ۱۵ر جمادی الاولیٰ کو اورنگ آباد لوٹے۔

نظام الدولہ ناصر جنگ سے انسلاک:

۱۱۵۸ھ/ ۱۷۴۵ء میں نظام الملک نواب آصف جاہ نے اپنے بیٹے نواب نظام الدولہ ناصر جنگ کو اورنگ آباد کی صوبے داری پر مامور کیا۔ ۱۱۵۹ھ/ ۱۷۴۶ء میں آزاد کی اس سے ملاقات ہوئی۔ شفیق ''گل رعنا''

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں لکھتے ہیں کہ نواب نظام الدولہ سے اس ملاقات کی وجہ ایک دن آزاد نے ان سے یہ بیان کی کہ حجاز سے واپس آنے کے بعد میں سورت ہوتا ہوا، اورنگ آباد پہنچا۔ یہاں میں نے دس سال توکّل میں گزار دیے۔ اب میری عمر چالیس سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ قوائے جسمانی میں کمزوری کے آثار نمایاں ہو گئے تھے اور لازمی ضروریات کے لیے اپنے آپ کو دوسروں کا محتاج سمجھنے لگا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب توکل سے کام نہیں چل سکتا۔ انھی ایام میں نواب نظام الدولہ نے مجھ سے رفاقت وانسلاک کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے اسے قبول کر لیا۔

اس سلسلے میں شفیق مزید لکھتے ہیں کہ اس کے بعد آزاد نے فرمایا کہ ''نواب نظام الدولہ کی رفاقت اختیار کرنے کے بعد مجھے پتا چلا کہ کسی ایک شخص کے حلقۂ ملازمت میں رہنا، توکل کی زندگی اختیار کرنے سے بہتر ہے۔ کیونکہ بہ نسبت ہزار لوگوں پر نظر رکھنے کے ایک ہی شخص پر نظر رکھنا زیادہ اولیٰ ہے۔ جب ہر طرف سے نظر ہٹ کر ایک ہی شخص پر مرکوز ہو جاتی ہے تو یہ چیز جمعیت قلب اور سکونِ خاطر کا باعث بنتی ہے۔'' اور ہر کام خواہ وہ دینی ہو یا دنیوی بلا کسی تشویش کے پورا ہو جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں بھی آزاد نے اسی نقطۂ فکر کا اظہار کیا ہے:

توکل را نظر ہر روز بر تو خدمتے باشد ہماں بہتر کہ ایں کس یار صاحب دولتے باشد
اگر بستی میاں را در کشادہ کار محتاجاں تقرب باخدا وندانِ دولت طاعتے باشد
سواد فکر را از پرتوِ دولت چراغاں کن تر ازیں جامعیت باسلیمان نسبتے باشد

توکل کے بارے میں آزاد کی اس تعبیر سے ہر شخص کو اتفاق نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے، آزاد کے ذاتی حالات بہت زیادہ پریشان کن نوعیت اختیار کر گئے ہوں اور کئی قسم کی پریشانیاں ان پر مسلط ہو گئی ہوں، یا ان کی افتادِ طبع ہی ایسی ہو جس نے انھیں توکل سے منہ موڑ کر ایک صاحب دولت سے وابستہ ہونے پر مجبور کر دیا ہو۔ وجہ خواہ کچھ بھی ہو، ایک عالم دین اور صاحب فضل وکمال کا شیوہ یہی ہے کہ وہ اللہ پر توکل رکھے اور اسی کو کارساز سمجھے۔ سرکار سے وابستگی اور امرا سے انسلاک شرعاً ممنوع نہیں ہے، تاہم توکل، اللہ ہی پر رکھنا چاہیے، وہ انسان کے مناسب حال کوئی بہتر صورت پیدا کر دیتا ہے۔

بہر حال نواب نظام الدولہ ناصر جنگ، حسن اخلاق کا مالک اور اہل علم کا قدر دان تھا۔ اسی بنا پر وہ آزاد کا بہت مداح اور ان کے علم وفضل اور فہم وفراست کی وجہ سے ان کی بہت تکریم کرتا تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ ۱۱۵۹ھ/ ۱۷۴۶ء میں نواب نظام الملک آصف جاہ نے اسے حیدر آباد طلب کیا تو نظام الدولہ نے آزاد کو بھی ساتھ جانے پر مجبور کیا۔ چنانچہ وہ اس کی معیت میں ۲۷ر ذوالقعدہ ۱۱۵۹ھ/ ۳۰ر نومبر ۱۷۴۶ء کو اورنگ آباد سے چلے اور سری رنگ پٹن تک سیاحت کی، جو کہ مہاراجا میسور کی عمل داری میں واقع تھا۔ ماہ صفر ۱۱۶۱ھ/ فروری ۱۷۴۸ء میں وہ اورنگ آباد واپس آئے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حج ثانی کا خیال اور اس کا ترک:

اسی سال رمضان المبارک کے مہینے میں آزاد کے دل میں دوبارہ عرب جانے کا خیال کروٹ لینے لگا۔ وہ لکھتے ہیں:

درعشرۂ اخیر رمضان ۱۱۶۱ھ/ستمبر ۱۷۴۸ء مزاج بندہ را وحشتے بہم رسید، بخاطر افتاد کہ از ہمہ قطع نظر باید کرد و بار دیگر سری بہ دیار عرب باید کشید[1]۔

(یعنی رمضان ۱۱۶۱ھ/ستمبر ۱۷۴۸ء کے عشرۂ آخر میں میرے مزاج میں ایک شورش سی پیدا ہوئی اور دل نے چاہا کہ تمام امور سے قطع تعلق کر کے دوبارہ دیار عرب کو جانا چاہیے۔)

لیکن پھر ارادہ ترک کر دیا۔ کیوں؟ اس کی وجہ وہ خود ہی بیان کرتے ہیں۔

ناگاہ شب بیست و ہفتم ماہ مذکور، طرف سحر، در عالم رویا اندیشہ ام متوجہ شعر گردید، بیتے موزوں ساختم، ومعاً از خواب بیدار شدم، بیت بیاد ماند و آں اینست۔

چہ خوش گفت گویندۂ نامدار　　مکش دست از دامن روزگار

لختے بتامل رفتم، دانستم کہ گویندہ سروش غیبی است ومخاطب بندہ، امتثال امر غیب واجب دیدم و ارادۂ کہ تصمیم یافتہ بود، فسخ نمودم، وسرّ الہام آنست کہ حجے کہ فرض بود، پیش ازیں بتقدیم رسید، اگر دست از دامن علائق ظاہری می کشیدم و بہ تحصیل نافلہ شتافتم، چندیں حقوق واجب الادا فوت می باشد۔

ترک واجب نتواں کرد پے نافلہا[2]۔

(یعنی ۲۷؍رمضان المبارک کی شب کو سحری کے وقت جب کہ میں سویا ہوا تھا، اچانک خواب میں فکر شعری بیدار ہوا، اور توجہ ادھر منعطف ہوئی۔ ایک شعر موزوں ہوا، اور معاً آنکھ کھل گئی۔ وہ شعر مجھے یاد ہے، جو یہ ہے:

چہ خوش گفت گویندۂ نامدار　　مکش دست از دامن روزگار

کہ کہنے والے نے یہ کیا خوب بات کہی ہے کہ دامن روزگار سے ہاتھ نہ کھینچو۔

تھوڑی دیر کے لیے میں سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر سمجھا کہ کہنے والا آواز غیبی ہے اور مخاطب یہی بندہ (آزاد) ہے۔ امر غیب کو ماننا میرے نزدیک ضروری ہے۔ چنانچہ وہ ارادہ جسے میں پختہ کر چکا تھا، فسخ کر دیا۔ اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جو حج فرض تھا، وہ میں پہلے کر چکا۔ اب اگر علائق ظاہری سے دامن کشاں ہوں گا اور حصول نفل کے لیے سرگرداں ہوں گا تو اس سے وہ حقوق فوت ہو جائیں گے، جن کا ادا کرنا مجھ پر واجب ہے۔ اور نوافل کے لیے واجب کو ترک نہیں کرنا چاہیے۔)

---

[1] سرو آزاد، ص ۲۹۳۔

[2] سرو آزاد، ص ۲۹۲۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آزاد کی یہ بات بالکل صحیح ہے۔ حج زندگی میں ایک ہی مرتبہ فرض ہے۔ علائق ضروریہ کو ترک کر کے دوبارہ قصد حج کرنا حقوقِ واجب الادا سے صرفِ نظر کرنے کے مترادف ہے۔

برہان پور اور حیدر آباد وغیرہ کے سفر:

۱۱۶۲ھ/ ۱۷۴۹ء میں آزاد نے دوسری مرتبہ برہان پور کا سفر کیا۔ اسی سال وہ ۱۴؍شوال کو ارکاٹ گئے اور ایک سال چند مہینے وہاں رہے۔ ۱۱۶۴ھ/ ۱۷۵۱ء میں نواب نظام الدولہ ناصر جنگ کی شہادت کے بعد وہ اورنگ آباد چلے گئے۔ ۱۱۵۶ھ/ ۱۷۵۲ء میں نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں حیدر آباد گئے تو انھیں بھی ساتھ لے گئے۔ ۹؍رجب کو اورنگ آباد سے چلے اور ۷؍شعبان کو حیدر آباد پہنچے۔ پھر ۱۶؍ذوالقعدہ کو حیدر آباد سے نکلے اور ۵؍ذی الحجہ کو اورنگ آباد لوٹے۔ بعد ازاں ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء میں بھی آزاد حیدر آباد گئے اور ۱۱۶۸ھ/ ۱۷۵۵ء میں اورنگ آباد واپس آئے۔

جوان بیٹے کا انتقال:

آزاد کے ایک ہی بیٹے تھے اور سید نور الحسن ان کا نام تھا۔ وہ اپنے وطن بلگرام میں رہتے تھے اور بلگرام کے ایک تالاب میں غسل کرتے ہوئے عین عالم جوانی میں غرق ہو گئے تھے۔ یہ حادثہ ۱۱۶۸ھ/ ۱۷۵۵ء میں پیش آیا۔ آزاد کے لیے یہ نہایت غم انگیز حادثہ تھا۔ جوان بیٹے کی وفات پر انھوں نے دردناک مرثیہ لکھا، جس کا ایک شعر یہ ہے:

قیامت برسرایں بوستان رفت — کہ یک گل داشت آں ہم نوجواں رفت

(اس باغ پر قیامت گزر گئی، جس کا ایک ہی پھول تھا اور وہ بھی جوان)

اس حادثے کے بعد آزاد کی سیر و سیاحت کی تفصیل نہیں ملتی۔ ممکن ہے پھر انھوں نے زیادہ سفر نہ کیا ہو۔ ایک تو نوجوان بیٹے کی موت کا حادثہ انتہائی سخت تھا، دوسرے ان کی عمر اس وقت باون (۵۲) سال کی ہو چکی تھی اور وہ کہولت کی منزل میں داخل ہو گئے تھے، اس لیے ہو سکتا ہے، سیر و سیاحت کا سلسلہ ختم کر دیا ہو۔ خیال یہ ہے کہ ان کا حیدر آباد کا مذکورہ بالا سفر آخری تھا۔ اس کے بعد وہ اورنگ آباد ہی میں مستقل طور پر رہنے لگے تھے، اس سے باہر نہیں گئے۔ چنانچہ ۱۱۸۱ھ/ ۱۷۶۷ء میں ''گل رعنا'' میں لچھمی نرائن شفیق لکھتے ہیں کہ آزاد اورنگ آباد میں سکونت پذیر ہیں:

خود آزاد کا اپنا بیان بھی یہی ہے۔

چند بار بہ تماشائے اطراف ملک دکن برخاستم، اکنوں در دار الامن اورنگ آباد گوشہ گیرم ❶۔

---

❶ خزانہ عامرہ، ص ۱۲۵۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(یعنی کئی دفعہ ملک دکن کے اطراف وجوانب کی سیر وسیاحت کا لطف اٹھایا، لیکن اب اورنگ آباد کے دارالامن میں گوشہ گیر ہو کر بیٹھ گیا ہوں۔)

ایک اہل علم ولیم چیمبرز تھے، جو آزاد کے ہم عصر تھے۔ انھوں نے آزاد کی مشہور تصنیف ''خزانہ عامرہ'' کے بعض حصوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کے مقدمے میں وہ لکھتے ہیں:

(آزاد) اس وقت تک اورنگ آباد دکن میں بقید حیات ہیں اور سالہا سال تک علمی وادبی مشاغل اور سیر وسیاحت میں مصروف رہنے کے بعد اب عزت واحترام اور کسی قدر ٹھاٹھ کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ اس وقت ان کی عمر پچاسی (۸۵) برس ہے، موجودہ نظام حیدر آباد دوباران سے ملنے اورنگ آباد آچکے ہیں۔

ان الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ اورنگ آباد میں ان کی بڑی قدر ومنزلت تھی۔ خود نظام دکن ان کا بے حد احترام کرتا اور ملاقات کے لیے آتا تھا۔ اس شہر کے لوگوں اور اس کے در و دیوار سے آزاد بہت مانوس ہو گئے تھے اور اسی شہر کو جسے وہ دارالامن قرار دیتے ہیں، اپنا مستقل مسکن ٹھہرا لیا تھا۔

آزاد نے زندگی میں بہت سفر کیے اور مختلف مقامات کی سیاحت کو گئے، لیکن اس سے ان کا مقصد مال ودولت جمع کرنا ہرگز نہ تھا، فقط ایک شوق تھا جو انھیں جگہ جگہ لیے پھرتا تھا۔ خود لکھتے ہیں:

حق سبحانہ، علیم است کہ ہلال وار مقصود ازیں سیر وسفر نہ تن پرور باشد، حاشا وکلا بلکہ مانند بدر منظور شکست نفس بود [1]۔

(خدا گواہ ہے کہ اس سیر وسیاحت سے میرا مقصد ہلال کی طرح تھا، جو طلوع ہونے کے بعد نمایاں تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ تن پروری وخود نمائی نہ تھا بلکہ بدر کی مانند جو کمال پر پہنچنے کے بعد روبزوال ہو جاتا ہے، خواہش شکست نفس تھی۔)

بہرکیف آزاد کی زندگی کا بیشتر حصہ سیر وسیاحت میں گزرا اور انھوں نے دیار ہند کے متعدد شہروں اور علمی مرکزوں کا مختلف تقریبات کے سلسلے میں سفر کیا۔ ان کی بعض تصانیف کا آغاز اور اختتام بھی سفر اور سیاحت ہی کے دوران میں ہوا۔ آئندہ سطور میں ہم ان تصانیف کا ذکر کریں گے، جو کئی عنوانات پر مشتمل ہیں اور عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں ہیں۔

تصانیف:

آزاد کی تصانیف کا تذکرہ کرنے سے قبل یہ بتانا ضروری ہے کہ ان کی تصانیف سرزمین برصغیر میں اپنی نوعیت کی اولیں تصانیف ہیں۔ فن رجال اور علم تاریخ سے مسلمانوں کو ہمیشہ خاص لگاؤ اور تعلق خاطر رہا ہے، لیکن اسے ایک علمی حادثہ کہنا چاہیے کہ برصغیر میں اہل علم کی بہت بڑی اکثریت کے باوجود اس موضوع کو کسی

[1] سرور آزاد، ص ۲۹۵۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے بھی لائق التفات نہ گردانا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس خطہ ارض کے بے شمار اصحاب علم اور ارباب کمال کے حالات گم نامی کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں۔ اس نواح میں آزاد پہلے عالم اور اولین مصنف ہیں، جنھوں نے اس اہم موضوع کو ہدف فکر ٹھہرایا اور اس سرزمین کے علما و فضلا کے حالات ہمیشہ کے لیے صفحات قرطاس میں محفوظ کر دیے۔ انھوں نے اس اولیت پر متعدد مقامات میں اظہار فخر کیا ہے اور بلاشبہ اس فخر میں وہ حق بجانب ہیں۔ اب تصانیف کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

۱۔ ید بیضا: یہ فارسی شعرا کا تذکرہ ہے اور آزاد کی پہلی تصنیف ہے۔ یہ کتاب سیوستان (سندھ) کے زمانۂ قیام میں لکھی گئی جو ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۳ء میں مکمل ہوئی۔ اہل سیوستان نے آزاد سے اس کی کئی نقلیں لیں۔ ایک شخص اس کا ایک نسخہ دہلی بھی لے گیا تھا۔ آزاد جب سیوستان سے اپنے وطن بلگرام جاتے ہوئے لاہور آئے تو یہاں ان کی ملاقات محمد فقیر اللہ آفرین لاہوری سے ہوئی۔ انھوں نے بڑی خواہش کا اظہار کر کے ''ید بیضا'' کا ایک نسخہ ان سے لیا۔

ید بیضا کو بہت شہرت حاصل ہوئی اور اہل ذوق میں یہ اتنی جلد مقبول ہوئی کہ متعدد مقامات میں پھیل گئی۔ لیکن الہ آباد کے زمانۂ قیام میں، آزاد کو ''مواد تازہ'' میسر آیا اور انھوں نے اس کا پہلا نسخہ منسوخ کر کے ایک نیا نسخہ مرتب کیا۔ یہ نسخہ ۱۱۴۸ھ/۱۷۳۵ء میں مکمل ہوا۔ آزاد نے ''طبع کلیم ید بیضا نمود'' اس کی تاریخ کہی۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ انھوں نے ''اس کتاب کا اصلی مسودہ خود آزاد کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیکھا ہے[1]۔''

ید بیضا کا قلمی نسخہ پبلک لائبریری پٹنہ (بہار۔ ہندوستان) میں موجود ہے۔

۲۔ روضۃ الاولیا: یہ کتاب خلد آباد کے اولیائے کرام کے حالات میں ہے، اور ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء میں اس زمانے میں لکھی جب وہ برہان پور کی سیر کو گئے۔

۳۔ شمامۃ العنبر فی ماورد فی الہند من سید البشر: یہ کتاب آزاد نے ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء میں ان دنوں تصنیف کی جب وہ دوسری مرتبہ برہان پور گئے۔ تفسیر اور حدیث کی کتابوں میں ہند کا جو ذکر آیا ہے، وہ اس رسالے میں جمع کر دیا گیا ہے۔

۴۔ مآثر الکرام: حج بیت اللہ کے لیے جانے سے پہلے آزاد نے اپنے وطن بلگرام کے علما و فضلا اور قرا و شعرا کے حالات ضبط تحریر میں لانا شروع کیے تھے۔ اس کا کچھ حصہ وہ قلم بند بھی کر چکے تھے کہ ۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء میں حرمین شریفین کے سفر پر روانہ ہو گئے اور یہ اہم کام درمیان ہی میں رہ گیا۔ حرمین سے واپس آنے کے بعد جب دکن میں مستقل طور پر قیام فرمایا تو وہ نامکمل مسودہ وطن سے منگوا کر اس کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ یہ مسودہ دو جلدوں میں مکمل کیا گیا۔ ایک جلد مآثر الکرام کے نام سے موسوم ہے اور دوسری سرو آزاد کے نام سے۔ پھر مآثر الکرام کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا۔ حصہ اول جسے وہ فصل اول کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، ۸۱ فقرا و مشائخ

[1] مقالات شبلی، ج ۵ ص ۱۲۵۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے حالات پر مشتمل ہے۔ حصہ ثانی جسے فصل ثانی کہا جاتا ہے، اُسے فضلا کے حالات وکوائف پر محیط ہے۔

۵۔ سروآزاد: جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، یہ کتاب مآثر الکرام کی جلد ثانی ہے، اور شعرا کا تذکرہ ہے۔ یہ دونوں کتابیں یا دونوں جلدیں ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۳ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچیں۔ یہ کتابیں صرف بلگرام کے اہل علم کے حالات تک محدود نہیں ہیں بلکہ ارضِ ہند کے بعض دیگر علما و فضلا کے سوانح بھی ان میں بیان کیے گئے ہیں۔ ان کتابوں کو بنیادی کتب حوالہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ آزاد نے یہ کتابیں معرض تصنیف میں لا کر بہت بڑی علمی اور تحقیقی خدمت انجام دی ہے۔

یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ آزاد کی ان کتابوں پر بلگرام کے بعض حضرات نے اعتراضات بھی کیے اور ان کے جواب اور تردید میں آزاد ہی کے ایک ہم وطن شیخ غلام حسن ثمین صدیقی نے شرائف عثمانی کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ شیخ غلام حسن ثمین نے ان کتابوں کے بارے میں شرائف عثمانی کے مقدمے میں جو الفاظ لکھے ہیں، ان کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

''جب آزاد نے اپنی دو کتابوں، مآثر الکرام اور سرو آزاد، دکن سے بلگرام بھیجیں اور وہ بلگرام کے فضلا و رؤسا کی نظر سے گزریں تو وہ بڑے حیران ہوئے، کیوں کہ مآثر الکرام کے اکثر بیانات ''تاریخ واسناد و حقائق وفرامین'' کے خلاف تھے۔ اس کتاب کے متعلق اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ ''ساقط از اعتبار'' ہے۔ آزاد کے ماموں اور استاد سید محمد بلگرامی سے رجوع کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ میں نے اس سلسلے میں آزاد سے دریافت کیا، وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں۔''

غلام حسین ثمین صدیقی نے شرائف عثمانی میں آزاد کی تاریخی غلطیوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔

مآثر الکرام اور سرو آزاد کے جواب اور تنقید میں ایک اور کتاب "تحقیق السداد فی مزلات الآزاد" لکھی گئی۔ یہ کتاب ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء میں بلگرام کے ایک غیر معروف شاعر محمد صدیق سخنور عثمانی نے لکھی۔ اس کتاب میں آزاد کی تاریخی غلطیوں کو واضح نہیں کیا گیا بلکہ ان کے اسلوب بیان اور شاعری کو ہدف تنقید ٹھہرایا گیا ہے۔ اس کتاب کی وجہ تالیف ذاتی مخاصمت ہے اور اس کا لب ولہجہ نہایت درشت ہے۔ اس کے جواب میں آزاد کے ایک شاگرد عبدالقادر سمرقندی دہلوی نے "تادیب الزندیق فی تکذیب الصدیق" کے نام سے کتاب تصنیف کی۔ یہ کتاب بڑی متانت اور معقولیت سے لکھی گئی ہے اور مصنف کا انداز و اسلوب بہت عمدہ ہے۔

۶۔ خزانہ عامرہ: سید غلام علی آزاد نے شعرائے فارسی کے دو تذکرے لکھے، ید بیضا اور سروِ آزاد۔ لیکن یہ تذکرے عام نوعیت کے تھے۔ ان سے شعرا کے کسی خاص طبقے کی وضاحت نہیں ہوتی تھی۔ آزاد کے بھتیجے میر سید اولاد محمد نے ان سے یہ خواہش ظاہر کی کہ ایک ایسا تذکرہ مرتب کیا جائے جو صرف ان شعرا کے حالات پر محتوی ہو، جنھوں امرا اور ارباب ثروت کی مدح گستری کی ہو اور اپنے ممدوحین سے اس کا صلہ پایا ہو۔ آزاد اس بھتیجے کو بہت عزیز سمجھتے تھے، اس لیے آمادہ ہو گئے، اور ''خزانہ عامرہ'' کے نام سے ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں یہ تذکرہ معرض تصنیف میں آیا۔ اس کا قطعہ تاریخ خود آزاد نے کہا:

آزاد رقم نمود نو تذکرہ در جیب ورق ریخت نقوۂ سرہ
گنجور خرد گہر تاریخ فشاند حق دادہ عجب خزانۂ عامرہ

خزانۂ عامرہ میں ہندوستان اور ایران کے ایک سو پینتیس شعرا کے علاوہ نظام الملک آصف جاہ، نظام الدولہ ناصر جنگ، امیر الممالک سید محمد خاں اور بعض دیگر معاصر امرا کے حالات اور مرہٹوں اور احمد شاہ ابدالی کی جنگ کی روداد بھی بہترین انداز سے قلم بند کی گئی ہے۔ یورپین مؤرخین، اس کے مستند تاریخی مواد کی وجہ سے اس کو قابل اعتنا گردانتے ہیں۔ خزانہ عامرہ ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۳ء کی تصنیف ہے جب کہ آزاد کی عمر اکسٹھ برس کی ہو چکی تھی۔

۷۔ سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان: یہ کتاب عربی زبان میں ہے جو آزاد نے ۱۱۷۷ھ/۱۷۶۴ء میں تصنیف کی۔ کتاب چار فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل میں یہ تفصیل بیان کی ہے کہ احادیث و تفاسیر میں ہندوستان کا ذکر کہاں کہاں ہوا ہے اور کس انداز سے ہوا ہے۔ درحقیقت شمامۃ العنبر فی ماورد فی الھند من سید البشر کو جس کا تعارف اوپر کی سطور میں ہو چکا ہے، فصل اول میں شامل کر لیا گیا ہے۔ دوسری فصل علمائے ہند کے حالات میں ہے۔ یہ فصل بھی زیادہ تر آزاد کی ایک اور تصنیف ''تسلیۃ الفواد'' سے ماخوذ ہے۔ تیسری فصل محسنات کلام یعنی صنائع بدائع سے متعلق ہے۔ چوتھی فصل میں عاشق و معشوق کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے ہندوستانی موسیقی اور اس کی اقسام پر بھی مفصل بحث کی ہے۔

۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء میں یہ کتاب بمبئی سے شائع ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں یہ کتاب مصر میں بھی طبع ہوئی۔

سبحۃ المرجان کے تیسرے اور چوتھے باب کا ترجمہ خود آزاد نے ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء میں غزلان الھند کے نام سے فارسی میں کیا تھا۔ یہ ترجمہ انھوں نے اپنے دوست اور شاگرد عبدالقادر مہربان اور لچھمی نرائن شفیق کی فرمائش پر کیا تھا۔ لیکن خود لچھمی نرائن شفیق اپنی تصنیف گل رعنا میں لکھتے ہیں کہ آزاد نے یہ ترجمہ عبدالقادر مہربان کی خواہش پر کیا تھا۔

سبحۃ المرجان کے پہلے اور دوسرے باب کا فارسی ترجمہ بنارس کے راجا مہاراج ایسری پرشاد کی فرمائش پر سید شمس الدین بن شاہ وارث علی حسنی حسینی بنارسی نے کیا تھا۔ سید شمس الدین بنارسی اس زمانے میں راجا مذکور کے حلقۂ ملازمت میں شامل تھے۔

۸۔ مآثر الامرا: آزاد کے علمی اور تحقیقی کاموں میں مآثر الامرا کا تذکرہ نہایت ضروری ہے۔ مآثر الامرا موضوع اور ترتیب کے لحاظ سے فن تاریخ میں بقول علامہ شبلی ''ایسی کتاب ہے، جس کی نظیر عربی زبان میں بھی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باوجود اس وسعت اور فراوانیٔ مواد کے موجود نہیں۔'' اس کتاب کی تصنیف کا آغاز صمصام الدولہ شاہ نواز خاں نے کیا تھا جو نظام دکن کے مورثِ اعلیٰ نظام الملک آصف جاہ کے امرائے سلطنت میں سے تھے۔ شاہ نواز خاں صرف اس موضوع پر کتاب لکھنا چاہتے تھے کہ بابر کے زمانے سے عہد مغلیہ کے آخر تک جو بھی عہدہ دارانِ مملکت گزرے ہیں، ان سب کے حالات ضبط تحریر لائے جائیں۔ چنانچہ ''مآثر الامرا'' کے نام سے کتاب کی ترتیب وتدوین کا سلسلہ شروع کیا جو پورے پانچ برس جاری رہا۔

امیر صمصام الدولہ شان نواز خاں کا علمی پایہ بلاشبہ اس قدر بلند تھا کہ وہ اس قسم کی کتاب کی تصنیف سے عہدہ برآ ہو سکتے تھے، لیکن امارت میں جو آرام طلبی کے لوازم پائے جاتے ہیں، وہ کتاب کی تکمیل میں مانع تھے۔ امیر موصوف خود بھی اس مجبوری کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ انھوں نے حالات کا جائزہ لے کر سید غلام علی آزاد بلگرامی کو یاد کیا۔ آزاد ان دنوں اپنے وطن بلگرام میں تھے۔ وہیں قاصد بھیجا اور پورا سامانِ سفران کے لیے مہیا کیا۔ مسودۂ کتاب کس درجے ترتیب کا طالب اور سخت محنت کا متقاضی تھا، اس کا اندازہ علامہ شبلی مرحوم کے مندرجہ ذیل الفاظ سے ہوسکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں نے حیدر آباد میں خود آزاد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط دیکھا ہے، جس میں وہ ایک دوست کو لکھتے ہیں کہ نواب صمصام الدولہ نے مآثر الامرا کا مسودہ بھیجا ہے۔ کتاب اچھی ہے، لیکن ترتیب کے لحاظ سے سخت اصلاح کی محتاج ہے۔ میں نے نواب صاحب کو لکھا کہ یہ کام اتنی دور سے انجام نہیں پا سکتا۔ نواب نے میرے لیے پالکی کی ڈاک کا انتظام کر دیا ہے۔ دو مہینے میں اورنگ آباد پہنچوں گا اور مسودہ درست کروں گا[1]۔

اندازہ کیجیے، اس دور کے امرائے سلطنت کا علمی ذوق کتنا گہرا تھا کہ ملک کے دور دراز علاقوں کے اہل تحقیق کا انھیں علم تھا اور وہ انھیں یاد رکھتے تھے۔ بہرکیف آزاد اورنگ آباد پہنچے اور کتاب کی اصلاح وترتیب کا کام مکمل کیا۔ لیکن اس کے بعد سوئے اتفاق سے نواب شاہ نواز خاں ۱۱۷۱ھ/ ۱۷۵۸ء کو ایک لڑائی میں مارے گئے۔ ان کا گھر لٹ گیا۔ کتب خانہ تباہ ہو گیا۔ ساتھ ہی یہ کتاب بھی برباد ہو گئی۔ آزاد اس سے بڑے فکر مند ہوئے۔ انھوں نے کمال تلاش وتفحص سے پورے ایک سال کے بعد مسودے کا سراغ لگایا، لیکن مسودہ دیکھا تو تمام اجزائے کتاب درہم برہم ہو چکے تھے اور بہت سے حصے بالکل ضائع ہو گئے تھے۔ آزاد کو اس کا بے حد دکھ ہوا، اور انتہائی مشکل اور دیدہ ریزی سے ان اوراق پریشان کو مرتب ومدون کیا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ قطب الملک عبداللہ خاں کے حالات سرے سے درج ہی نہ تھے۔ امیر الامرا حسین علی خاں کا تذکرہ ابتدا سے ناقص تھا۔ آصف جاہ اور نظام الدولہ کا حال خود مصنف نے چھوڑ دیا تھا۔ آزاد نے ان سب کے حالات خود لکھے اور کتاب میں شامل کیے۔ ابوالفضل اور سعد اللہ خاں کے حالات سے بھی مسودہ خالی تھا۔ غرض آزاد نے کتاب

[1] مقالاتِ شبلی، ج ۵، ص ۱۳۰۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے تمام اجزا جمع اور مرتب کیے۔ نامکمل حالات کی تکمیل کی، خود مصنف کتاب نواب شاہ نواز خاں کے حالات لکھے۔ حمد ونعت لکھی اور ان کی محنت اور سعی و کاوش کے نتیجے میں اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک ایسی کتاب کا اضافہ ہوا، جسے ہر صورت میں جوہر نایاب کی حیثیت حاصل ہے اور جو اپنے دامن صفحات میں بے شمار معلومات کا ذخیرہ لیے ہوئے ہے۔ کتاب ۱۱۹۴ھ/ ۱۷۸۰ء میں مکمل ہوئی۔

۹۔ ضوء الدراری شرح صحیح بخاری: آزاد کو اللہ نے علم و تحقیق کے تمام گوشوں سے بہرہ ور کیا تھا۔ وہ حدیث سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ علم حدیث انھوں نے مدینہ منورہ میں شیخ محمد حیات سندھی سے اور مکہ مکرمہ میں شیخ عبدالوہاب طنطاوی مصری سے حاصل کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح بخاری سے انھیں خصوصی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا اور یہ کتاب ان کے زیر مطالعہ رہتی تھی۔ چنانچہ شروع سے لے کر کتاب الزکوۃ تک عربی میں اس کی شرح سپرد قلم کی ❶۔ کتاب غیر مطبوعہ ہے اور اس کے قلمی نسخے برصغیر میں موجود ہیں۔

سید مقبول احمد صمدانی کا کہنا ہے کہ آزاد کی ضوء الدراری درحقیقت شیخ شہاب الدین کی ارشاد الساری کا بعض فوائد کی زیادت کے ساتھ ملخص ہے ❷۔

۱۰۔ دو عربی دیوان: عربی کے ان دو دیوانوں کا آزاد نے سبحۃ المرجان میں ذکر کیا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ مجھ سے پہلے کسی ہندوستانی کا عربی دیوان مرتب نہیں ہوا، نہ کسی ہندوستانی عالم نے اس اسلوب کے اشعار کہے۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ میں نے یہ دونوں دیوان مدینہ منورہ کے بعض فضلا کی خدمت میں بھیجے۔ انھوں نے ان کو گنبد خضرا کے سامنے رکھا بلکہ روضۂ اقدس کی جالیوں کے اندر ڈال دیا۔ مجھے امید ہے کہ ان دواوین کو قبولِ عام حاصل ہوگا ❸۔ یہ دیوان حیدر آباد سے شائع ہو چکے ہیں۔

۱۱۔ السبعۃ السیارہ: یہ آزاد کے سات دواوین کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں ۱۱۷۹ھ سے ۱۱۹۴ء/ ۱۷۶۵ء سے ۱۷۸۰ء تک کا کلام درج ہے۔ سید مقبول احمد صمدانی کا بیان ہے کہ آزاد کے اس مجموعۂ کلام کا انتخاب ''مختار دیوان آزاد'' کے نام سے ۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء میں مطبع آسی لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔

۱۲۔ تسلیۃ الفواد فی قصائد آزاد: یہ آزاد کے قصائد کا مجموعہ ہے، جن میں زیادہ تر نعتیہ قصائد ہیں۔ اس کا کچھ حصہ آزاد نے تراجم العلما کے عنوان سے سبحۃ المرجان میں شامل کر لیا ہے۔

۱۳۔ مظہر البرکات: یہ ایک صوفیانہ مثنوی ہے جو سات دفتروں پر مشتمل ہے۔ پہلا دفتر ۱۱۹۴ھ/ ۱۷۸۰ء میں، دوسرا، تیسرا اور چوتھا ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء میں مکمل ہوا۔ پانچویں، چھٹے اور ساتویں دفتروں میں تاریخ اختتام درج

---

❶ سبحۃ المرجان، ص ۱۲۲۔

❷ حیات جلیل، حصہ دوم، ص ۱۷۵۔

❸ سبحۃ المرجان، ص ۱۲۲، ۱۲۳۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں ہے۔

۱۴۔ شفاء العلیل فی اصطلاحات کلام ابی الطیب متنبّی: یہ متنبّی کے کلام کی مخصوص اصطلاحات کی شرح ہے۔

۱۵۔ مکاتیب حضرت مجدد: سید مقبول احمد صمدانی کا بیان ہے کہ آزاد نے حضرت شیخ مجدد الف ثانی کے بعض مکاتیب کا عربی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ وہی مکاتیب ہیں [1]۔

۱۶۔ کشکول: اسے کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن کے کیٹلاگ میں عربی کتابوں میں رکھا گیا ہے۔ صاحب قاموس العالم شمس اللہ قادری اسے فارسی کتاب بتاتے ہیں، اسٹوری کا خیال ہے کہ یہ دونوں زبانوں (عربی اور فارسی) کے اشعار کا انتخاب ہوگا [2]۔

۱۷۔ شجرۂ طیبہ: سید غلام علی آزاد کی یہ کتاب ساداتِ بلگرام کے احوال و انساب پر مشتمل ہے، اور فارسی زبان میں ہے۔

۱۸۔ مرأۃ الجمال: یہ ان ایک سو پانچ اشعار پر محیط ہے، جن میں معشوق کا سراپا بیان کیا گیا ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کتب خانہ (سبحان اللہ کلیکشن) میں ایک مخطوطہ "مثنوی سراپائے معشوق" کے نام سے موجود ہے۔ اسٹوری کا خیال ہے کہ "مثنوی سراپائے معشوق" اور "مرأۃ الجمال" ایک ہی کتاب کے دو نام ہیں۔

۱۹۔ دیوانِ فارسی: یہ دیوان حیدر آباد میں ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء میں طبع ہو چکا ہے۔

۲۰۔ سند السعادات فی حسن خاتمۃ السادات: یہ ۳۲ صفحات کا رسالہ ہے جس میں آزاد نے سادات کے فضائل و مکارم بیان کیے ہیں، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سادات کا خاتمہ لازماً اچھا ہوتا ہے۔ یہ رسالہ ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء میں بمبئی سے چھپ چکا ہے۔

۲۱۔ مثنوی بجواب مثنوی میر عبدالجلیل بلگرامی: یہ میر عبدالجلیل بلگرامی کی مثنوی، فرخ سیر کی کتخدائی کے متعلق ہے۔

۲۲۔ چند منظومات اور رسائل: یہ وہ رسائل ہیں، جن کا ذکر خود آزاد نے کیا ہے [3]۔ ان منظومات میں ممکن ہے کہ مثنوی بجواب مثنوی میر عبدالجلیل بلگرامی بھی شامل ہو۔

۲۳۔ دیوانِ اردو: عرصہ ہوا، ہندوستان کے ایک نامور محقق جناب عبدالرزاق صاحب قریشی (انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی) نے سید غلام علی آزاد بلگرامی کے حالات میں ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ میں ایک مضمون لکھا تھا۔ یہی مضمون آزاد کی تصنیف مآثر الکرام (مطبوعہ لاہور ۱۹۷۱ء) میں شائع

---

1. حیاتِ جلیل، حصہ دوم، ص ۱۷۵۔
2. پرشین لٹریچر، جلد اول، حصہ دوم، ص ۸۲۲۔
3. ملاحظہ ہو، سبحۃ المرجان، ص ۱۲۳۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوا۔ اس مضمون میں قریشی صاحب لکھتے ہیں کہ آزاد کی کسی تحریر سے یہ پتا نہیں چلتا کہ انھوں نے اردو میں بھی شعر کہے ہیں۔ ان کے تذکرہ نگار اور سوانح نویس بھی اس بارے میں خاموش ہیں۔ بلکہ سید مقبول احمد صمدانی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اردو میں شعر کہنا آزاد ''اپنے مرتبۂ عالی سے پست اور دوں سمجھتے تھے۔'' لیکن اسد علی خان تمنا اورنگ آبادی نے ''گل عجائب'' میں ان کے اردو دیوان کا ذکر کیا ہے اور ان کے دو شعر بھی بطور نمونے کے نقل کیے ہیں [1]۔ اسد علی خاں تمنا چوں کہ آزاد کے شاگرد تھے، اس لیے ان کے بیان پر اعتماد نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں [2]۔

بلاشبہ آزاد نے بعض مقامات پر اس بات کی تصریح کی ہے کہ وہ ہندی زبان سے پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ خزانۂ عامرہ میں مسعود سعد سلمان کے حالات کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''من اگر چہ دو دیوان دارم، عربی و فارسی، لکن شعر ہندی را خوب می فہم و از چاشنی آں خط مستوفی دارم۔''

(یعنی میں نے اگر چہ دو دیوان لکھے ہیں جو عربی اور فارسی زبانوں میں ہیں، لیکن ہندی شعر بھی خوب سمجھتا ہوں اور اس کی چاشنی سے بہرۂ وافر رکھتا ہوں۔)

۲۴۔ گربہ نامہ: اردو کی ایک چھوٹی سی کتاب ''گربہ نامہ'' بھی ان کی طرف منسوب ہے، لیکن فی الحقیقت اس کتاب کے مصنف امروہی ہیں [3]۔

آزاد کی شاعری پر اہل علم کی تنقیدات:

کوئی محقق و مصنف اور شاعر و ادیب ایسا نہیں جس کے افکار و خیالات پر اس کے معاصرین یا بعد کے اہل نظر نے تنقید نہ کی ہو، آزاد بھی اس سے بچ نہیں سکے۔ ان کی مآثر الکرام وغیرہ پر جس انداز سے ان کے ہم عصروں نے تنقید کی اور جس اسلوب سے انھیں طعن و مخالفت کا ہدف ٹھہرایا وہ پہلے گزر چکا۔ ان کی شاعری پر جو اعتراضات کیے گئے، اب وہ سنیے۔ پاکستان کے نامور اہل علم ڈاکٹر وحید قریشی نے مآثر الکرام (مطبوعہ لاہور) پر ''پیش لفظ'' تحریر کیا ہے۔ اس میں انھوں نے ان حضرات کا ذکر کیا ہے، جو آزاد کی شاعری پر معترض ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ وارستہ سیالکوٹی نے بھی تذکرۃ الشعرا میں آزاد کی شعر و شاعری پر اعتراضات وارد کیے اور ان کی بعض تصانیف سے غلطیاں نکالیں۔

---

[1] گل عجائب، ص ۳۔

[2] مآثر الکرام، طبع لاہور۔ مضمون عبدالرزاق قریشی، ص ۱۵۔ بحوالہ ''معارف'' اعظم گڑھ۔

[3] رسالہ سہ ماہی صحیفہ، لاہور۔ ڈاکٹر نجم الاسلام کے دو مقالے۔ بعنوان ''گربہ نامہ''

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ملا محمد باقر آگاہ نے اپنی تصنیف ''چہار صد ایراد بر کلام آزاد'' میں آزاد کی تصانیف اور شاعری سے چار سو غلطیوں کی نشان دہی کی۔ آگاہ نے اس کتاب کا دوسرا تاریخی نام ''عشرات آزادیہ'' تجویز کیا۔ ابجد کے اعداد سے اس کا سال تصنیف ۱۱۹۹ھ نکلتا ہے، جو آزاد کی وفات سے ایک برس پہلے کا زمانہ ہے۔ یہ کتاب قلمی ہے۔

ملا محمد باقر آگاہ ۱۱۵۸ھ/ ۱۷۴۵ء میں پیدا ہوئے۔ سال وفات ۱۲۲۰ھ/ ۱۸۰۵ء ہے۔ یہ جنوبی ہند کے ممتاز عالم اور صاحب فضل و کمال تھے۔ آگاہ صرف آزاد ہی سے نبرد آزما نہیں ہوئے، اپنے ایک جلیل القدر ہم عصر عالم بحر العلوم مولانا عبد العلی (متوفی ۱۲۲۵/۱۸۱۰ء) سے بھی ان کے مناظرے اور مباحثے ہوتے رہے۔

''چہار صد ایراد بر کلام آزاد'' کی تصنیف کا باعث ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ آزاد نے آگاہ کو ''خاں صاحب'' لکھ کر خطاب کیا۔ آگاہ اس لفظ کو اپنے لیے ننگ اور عار سمجھتے تھے۔ للہٰذا برہم ہو گئے اور ترکی بہ ترکی جواب دینے کی غرض سے آزاد کو ''مرزا بیگ'' وغیرہ لکھا۔

ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں، کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتراضات کی ابتدا آگاہ کی طرف سے ہوئی تھی۔ آزاد نے جواب میں آگاہ کے اشعار کی چند فنی اور ادبی غلطیاں نشان زد کر کے بھیجیں، لیکن آگاہ نے اسے مجادلے پر محمول کیا اور میدان میں اتر آئے۔ کہا کہ: الحدید یلین بالحدید (لوہے کو لوہا نرم کرتا ہے۔) بس اتنی سی بات تھی، جس کے جواب میں پوری کتاب لکھ ڈالی[1]۔

علامہ شبلی، وہ اہل قلم ہیں جو آزاد کے علم و فضل، وسعت نظر اور تحقیق و تفحص کے بہت مداح ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''آزاد سب سے پہلے شخص ہیں، جس نے ہندوستان کے علما اور ارباب عمائم کے حالات قلم بند کیے۔ آزاد نے اس اولیت پر خود جا بجا فخر کا اظہار کیا ہے اور بجا کیا ہے۔'' وہ آزاد کی مآثر الکرام اور سبحۃ المرجان کے اختصار سے تو مطمئن نہیں، البتہ انھیں ''مستند'' قرار دیتے ہیں۔ لیکن ان کی عربی اور فارسی شاعری کو سخت لب و لہجے میں نشانۂ تنقید ٹھہراتے ہیں اور لکھتے ہیں:

آزاد کا عربی اور فارسی کلام اگرچہ کثرت سے ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے چہرۂ کمال کا داغ ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ عربی زبان کے بہت بڑے ادیب ہیں۔ نہایت نادر کتب ادبیہ پر ان کی نظر ہے۔ لغات اور محاورات ان کی زبان پر ہیں، لیکن کلام میں اس قدر عجمیت ہے کہ اس کو عربی کہنا مشکل ہے۔ ان کو اس پر ناز ہے کہ انھوں نے عجم کے خیالات، عربی میں منتقل کیے ہیں، لیکن نکتہ سنج جانتے ہیں کہ یہ ہنر نہیں بلکہ عیب ہے:

خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

---

[1] پیش لفظ مآثر الکرام، ص ۲۱، ۲۲۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فارسی کی بھی یہی حالت ہے۔ سیکڑوں، ہزاروں اشعار ہیں، ایک شعر بھی ایسا نہیں نکلتا جو اہل زبان کا کلام سمجھا جائے۔ آزاد نے والہ داغستانی کے حال میں لکھا ہے کہ ''چوں کہ میری اور ان کی بہت کم صحبت رہی، اس لیے نہ میں نے ان کا ذکر سروِ آزاد میں کیا، نہ انھوں نے میرا ذکر ریاض الشعرا میں کیا۔''

اپنے خیال کے مطابق جو کچھ آزاد نے لکھا، صحیح لکھا، لیکن والہ داغستانی کی نسبت ان کا نراحسن ظن ہے۔ والہ داغستانی، آزاد کے کلام کو اس قابل کب سمجھتا تھا کہ تذکرے میں درج کرتا۔ اس نے جا بجا تصریح کی ہے کہ ہندوستانی شعرا، جس زبان میں شعر کہتے ہیں خدا جانے کس ملک کی زبان ہے [1]۔

چند واقعات و لطائف:

آزاد نے بھرپور علمی و عملی زندگی گزاری اور ہر قسم کے لوگوں سے ان کی ملاقات رہی۔ دنیا کی حیات مستعار میں انھیں بے شمار معاملات پیش آئے۔ وہ نہایت زندہ دل عالم تھے۔ ان کے حالات میں بہت سے لطائف و واقعات مذکور ہیں، جن میں سے چند ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ لچھمی نرائن شفیق ان کے بہت مداح اور شاگرد تھے۔ وہ اپنی کتاب گل رعنا میں لکھتے ہیں کہ آزاد ایک دن مولوی قمر الدین اورنگ آبادی کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے مولوی صاحب موصوف کو بطور ہدیہ ایک کتاب پیش کی۔ درحقیقت اس شخص کو مولوی صاحب سے ایک کام تھا۔ کام یہ تھا کہ وہ ان سے ناظم شہر کے نام ایک سفارشی خط لینا چاہتا تھا۔ مولوی صاحب نے کتاب کو ''وجہ رشوت'' قرار دے کر لینے سے انکار کر دیا۔ آزاد نے اس شخص سے کہا کہ تم یہ کتاب بہ طور ہدیہ مجھے دے دو۔ اس نے دے دی۔ آزاد نے مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کی اور کہا کہ اب یہ کتاب میری ہے اور میں آپ کو دے رہا ہوں۔ اب اس میں شائبہ رشوت باقی نہیں رہا۔ مولوی قمر الدین مسکرائے اور کتاب لے لی۔ حاضرین مجلس آزاد کے اس نکتے سے بہت محظوظ ہوئے۔

۲۔ ایک دن سید غلام حسن اور مولوی فخر الدین میں نغمہ و سرود کے مسئلے پر بحث چھڑ گئی۔ سید غلام حسن اسے جائز قرار دیتے تھے اور مولوی فخر الدین ناجائز ٹھہراتے تھے۔ مجلس میں ایک شخص حاجی حسام الدین بیٹھے تھے جو عالم بھی تھے اور بہت بڑے سیاح بھی۔ وہ اس مسئلے میں سید غلام حسن کے موید تھے۔ بحث نے طول کھینچا تو اسے ختم کرنے کے لیے آزاد کو ایک تدبیر سوجھی۔ انھوں نے حاجی حسام الدین سے کہا کہ آپ نے مختلف مقامات کی بہت سیاحت کی ہے۔ آپ یہ فرمایئے کہ حضرت ہود علیہ السلام کی قبر کہاں ہے؟ انھوں نے جواب دیا، یمن میں۔ آزاد نے کہا، جی نہیں، حضرت ہود علیہ السلام کی قبر شام میں ہے۔ حاجی صاحب نے اصرار کرتے ہوئے کہا کہ یمن میں ہے، میں نے خود اس قبر کی زیارت کی ہے۔ آزاد نے جواب دیا، میں نے ایک معتبر کتاب میں پڑھا ہے کہ

[1] مقالات شبلی، ج ۵، ص ۱۲۹۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شام میں ہے۔ کچھ دیر دونوں میں اس پر بحث ہوتی رہی۔ سید غلام حسن اور مولوی فخر الدین اپنی بحث کو بھول کر اس بحث کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جب آزاد نے دیکھا کہ نغمہ وسرود کا جھگڑا ختم ہو چکا ہے تو حاجی حسام الدین سے کہا، آپ صحیح فرماتے ہیں، حضرت ہود علیہ السلام کی قبر یمن میں ہے۔

۳۔ جس زمانے میں آزاد شاہ محمود کی خانقاہ میں مقیم تھے، ایک مغل بخارا سے آیا اور اسے آزاد کے ساتھ والے کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ صبح کو وہ آزاد کے کمرے میں آیا اور بڑے بے تکلفانہ انداز سے کہا کہ میں تازہ وارد مہمان ہوں، آپ نے میری دعوت نہیں کی۔ آزاد نے برجستہ جواب دیا، اتنی قدیم آشنائی کے باوجود آپ میرے لیے کوئی تحفہ نہیں لائے۔

۴۔ ایک دن آزاد، نواب آصف جاہ کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک ہندو، مسلمان ہونے کی غرض سے آیا اور مشرف بہ اسلام ہوا۔ عرض بیگی نے عرض کی کہ یہ نومسلم چاہتا ہے کہ اس کا نام تجویز فرمایا جائے۔ نواب آصف جاہ نے آزاد سے کہا کہ اس کا کوئی ایسا نام تجویز کرو، جس سے دین اسلام کی وضاحت ہوتی ہو۔ آزاد نے کہا، دین محمد۔ نواب نے کہا، ابھی کل ہی ایک ہندو مسلمان ہوا، اور اس کا نام دین محمد رکھا گیا۔ آزاد نے فوراً جواب دیا، دین محمد جس قدر زیادہ پھیلے، بہتر ہے۔ نواب بہت خوش ہوا، اور یہی نام رکھا گیا۔

۵۔ میسور کے سفر میں ایک دن آزاد اور نواب نظام الدولہ ناصر جنگ ہاتھی پر سوار جا رہے تھے کہ ایک ہموار صحرا سے گزر ہوا، جہاں تک نگاہ جاتی تھی، سوار اور پیادے ہی نظر آ رہے تھے۔ نواب نے آزاد سے کہا، لشکر کا یہ منظر قابل دید ہے۔ آزاد نے جواب دیا کہ جبر واختیار کا مسئلہ جو مشکل ترین مسئلہ ہے، یہاں حل ہو جاتا ہے۔ ان تمام سپاہیوں کی حرکات ایک شخص کے تابع ہیں، اور وہ اس کے ارادہ (حکم) سے حرکت کرتے ہیں۔

۶۔ ایک رات نواب نظام الدولہ نے ساداتِ عرب کی دعوت کی۔ کھانے کے بعد قہوے کا دور چل رہا تھا۔ نواب کو قہوہ بہت مرغوب تھا۔ مدینہ منورہ کے ایک سید نے مزاحاً کہا: "القهوة محرمة عند بعض العلماء" نواب نے آزاد سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ کا اس مسئلے کے متعلق کیا خیال ہے؟ آزاد نے جواب دیا، سید صاحب کا مفہوم یہ ہے کہ قہوہ بعض علما کے نزدیک معظم ہے، کیوں کہ "محرمۃ" کا مطلب احترام ہے۔ نواب خاموش ہو گئے اور سید صاحب بھی بات سمجھ گئے۔ جب مجلس برخاست ہوئی تو سید ممدوح نے آزاد کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ نے میرے قول کی نہایت عمدہ توجیہ کی۔

۷۔ ارکاٹ کے زمانۂ قیام میں ایک روز ایک ہرن کو نواب نظام الدولہ کے خیمے کے پاس لا کر بٹھایا گیا۔ نواب نے حاضرین مجلس سے پوچھا، آپ کی کیا رائے ہے، اسے ذبح کیا جائے یا آزاد کر دیا جائے؟ نواب صاحب ہرن کے شکار کے بہت شوقین تھے۔ ان کی رغبت طبع کے پیش نظر حاضرین نے جواب دیا، ذبح کرنا چاہیے۔ نواب نے آزاد سے پوچھا تو آزاد نے کہا، مجھے ایک قصہ یاد آ گیا ہے، اگر اجازت ہو تو سناؤں۔ نواب نے کہا، سنائیے۔ آزاد نے کہا، ایک مرتبہ ایک بادشاہ نے ایک قیدی کے قتل کا حکم جاری کیا۔ قاعدے کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مطابق قتل سے پہلے اس شخص سے پوچھا گیا کہ تمھاری کوئی خواہش ہے؟ اس نے کہا، میری یہ خواہش ہے کہ قتل ہونے سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے مجھے بادشاہ کی مجلس میں باریابی کا شرف بخشا جائے۔ بادشاہ کو اس کی اطلاع دی گئی تو اس نے اسے دربار میں لانے کا حکم دیا۔ دربار میں اس سے پوچھا گیا کہ کچھ کہنا چاہتے ہو؟ اس نے عرض کیا، کچھ نہیں کہنا چاہتا، لیکن جب بادشاہ اٹھ کر جانے لگا تو قیدی عرض گزار ہوا کہ بادشاہ سلامت میں قصور وار اور قابل قتل ہوں، لیکن چند لمحے آپ کی صحبت میں گزار چکا ہوں۔ اس طرح آپ پر میرا حق ثابت ہوتا ہے۔ بادشاہ اس حسن ادا سے بہت خوش ہوا، اور اسے معاف کر دیا۔ یہ قصہ سنانے کے بعد آزاد نے کہا، یہ ہرن بھی آپ کی صحبت میں بیٹھ چکا ہے۔ آگے آپ کی مرضی! نواب صاحب مسکرائے اور ہرن کا نام آزاد رکھ کر اسے آزاد کر دیا۔

۸۔ ارکاٹ ہی کے دورانِ سفر کا واقعہ ہے کہ ایک دن آزاد چند احباب کے ساتھ خیمے میں بیٹھے تھے۔ اتنے میں ایک درویش شاہ جمیل نامی ان کے پاس آئے۔ وہ ان کی تعظیم میں کھڑے ہو گئے اور ان سے خوش اخلاقی سے باتیں کیں۔ جب شاہ جمیل چلے گئے تو حاضرین مجلس نے کہا، آپ نے بھی کس کی تعظیم کی، یہ تو فلاں شخص کا باورچی ہے۔ آزاد نے جواب دیا، میں نے لباس فقیر کی تعظیم کی ہے۔ اس کے بعد شاہ جمیل کی آمد و رفت کا سلسلہ جب تک جاری رہا، آزاد ان کی اسی طرح تعظیم کرتے رہے، جس طرح پہلے دن کی تھی۔ اتفاق سے نواب نظام الدولہ ناصر جنگ، ہمت خاں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ اس کے بعد شاہ جمیل، آزاد سے ملنے آئے تو ہمت خاں کے مدار المہام امانت اللہ خاں کو بھی ساتھ لائے۔ امانت اللہ خاں نے پچاس ہون طلائی دکنی سکے آزاد کی خدمت میں پیش کیے اور کہا کہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہمت خاں کی ذات سے آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔

۹۔ ایک دفعہ اورنگ آباد میں آزاد کی شال چوری ہو گئی۔ چند روز بعد ان کے ایک دوست نے دیکھا کہ ایک آدمی اسے بازار میں فروخت کر رہا ہے۔ اس دوست نے وہ شال خریدنے کے بہانے اس سے لے لی اور لا کر آزاد کو دکھائی اور کہا کہ اس آدمی سے پوچھنا چاہیے کہ یہ شال اس نے کہاں سے لی؟ آزاد نے کہا میں ایک چھوٹے آدمی کے ساتھ عدالت میں کھڑا ہونا پسند نہیں کرتا۔ اور یہ شال اسے واپس لوٹا دی۔

۱۰۔ جس زمانے میں نواب نظام الدولہ، مظفر جنگ سے، جس کو فرانسیسیوں کی امداد حاصل تھی، نبرد آزما تھا۔ ایک روز آزاد نے نمازِ مغرب میں سورہ ﴿اذجآء نصر الله والفتح﴾ پڑھی۔ شرکائے نماز بہت خوش ہوئے اور آزاد سے کہا کہ آپ نے یہ سورۃ بالکل برموقع پڑھی ہے، ان شاء اللہ ہماری فتح ہو گی اور ﴿یدخلون فی دین الله افواجا﴾ کے مطابق فوج نصاریٰ مطیع ہو جائے گی۔ آزاد نے کہا، میں نے یہ سورۃ قصداً فال لینے کی غرض سے پڑھی ہے۔ چنانچہ دوسرے روز نواب نظام الدولہ کی فتح کا اعلان ہوا، اور آزاد کی فال نے حقیقت کی شکل اختیار کر لی۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس قسم کے بہت سے واقعات و لطائف ہیں جو آزاد کے بارے میں مرقوم ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد بڑے عالی ظرف، نکتہ آفرین، بذلہ سنج، شگفتہ مزاج، بلند اخلاق اور حاضر دماغ تھے۔ پچھمی نرائن شفیق لکھتے ہیں کہ آزاد کی بزم میں ہزل کا گزر نہ تھا۔ ان کے قلم یا زبان پر کبھی تلخ اور متبذل لفظ نہیں آیا۔ خود ان کا اپنا شعر ہے:

زحرف تلخ مبرا است خامۂ آزاد　　　　کہ زہر ریختن از نیشکر نمی آید

اپنی اس خصوصیت کا وہ صاف لفظوں میں اظہار کرتے ہیں کہ لوگوں سے بہت زیادہ اختلاط کے باوصف اور ہر قسم کے افراد سے شدید امتزاج کے باوجود تکریم و تعظیم ہمیشہ میرا بنیادی وصف رہا ہے۔ میرا قلم ابتذال سے محفوظ اور میری زبان ہرزہ گوئی سے مصئون ہے۔ خود مجھے بھی سب نے سزاوارِ اکرام قرار دیا ہے۔ امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے روز بھی قربِ بساطِ عزت سے مسرور ہوں گا[1]۔

ضبط و تحمل:

آزاد نہایت صلہ کل، نرم خو اور حلیم الطبع عالم تھے۔ ضبط و تحمل کے پیکر تھے۔ لوگوں سے لڑنا اور جھگڑنا ان کا شیوہ نہ تھا۔ اگر کوئی ناگوار بات سنتے تو صبر کرتے اور خاموش ہو جاتے۔ کہا کرتے کہ اندمالِ زخم ہنر ہے اور انقطاع بے ہنری۔ دانش مند کو چاہیے کہ عمارت کو گرنے سے بچائے۔ ڈھانے کا کام تو ہر ایک کر سکتا ہے۔ انھوں نے طبیعت کچھ ایسی پائی تھی کہ کوئی شخص انھیں ذہنی یا مالی تکلیف پہنچاتا تو انتقام نہ لیتے اور بدی کے بدلے میں بھلائی کرتے۔ ان کا قول ہے کہ سب سے بڑا انتقام یہ ہے کہ مخالف تمھارے سامنے اپنی التجا پیش کرنے پر مجبور ہو جائے۔ ایک شعر میں کہتے ہیں:

آزاد من بدشمن خود بدنمی کنم　　　　نا منصف ست ہر کہ دغامی دہد مرا

ان میں یہ خوبی تھی کہ دو شخصوں میں کشیدگی یا تلخی پیدا ہو جاتی تو اپنے حسن تدبیر سے اس کو رفع کر دیتے۔ نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں ان کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

بررشتۂ دوستی ما گرہے عجب افتادہ بود، بناخن تدبیر شما واشد[2]۔

(ہماری دوستی کے تعلق میں عجب گرہ پڑ گئی تھی، لیکن آپ کے ناخن تدبیر سے کھل گئی۔)

فقیرانہ زندگی:

حاکم لاہوری نے ”مردم دیدہ“ میں آزاد کے اوصاف بیان کیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آزاد کی زندگی

[1] خزانۂ عامرہ، ص ۴۔

[2] منشآت شاہ نواز خاں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا بڑا حصہ ارباب دولت کی صحبت اور اصحاب امارت سے وابستگی میں گزرا، لیکن وہ جلب منفعت سے ہمیشہ گریزاں رہے۔ انھوں نے کبھی سرکاری اثر و رسوخ پر اظہارِ فخر نہیں کیا۔ کبھی اپنے آپ کو اقتدار و ثروت کی چوکھٹ پر نہیں گرایا اور کبھی منافعہ دنیا جمع کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ ان کی ساری زندگی فقیرانہ شان اور درویشانہ انداز سے گزری۔ وہ غرور سے پاک اور فخر سے مبرا تھے۔ تواضع، حلم اور نرمی ان کا اصل جوہر تھا۔ بلند اخلاق اور خوش مزاجی کی دولت سے مالا مال تھے۔ غریبوں کے ہمدرد محتاجوں کے معاون اور فقیروں کے مددگار تھے۔ سب سے خوش رہتے اور ہر ایک کو خندہ پیشانی سے ملتے ❶۔

لچھمی نرائن شفیق نے گل رعنا میں آزاد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جو اس دنیا میں سب سے کم درجے کا ہے، وہ عالم آخرت میں سب سے اونچے درجے پر فائز ہوگا۔

آزاد خود کہتے ہیں:

سرفراز آں جہاں باشد دلیل ایں جہاں   حرفِ ختم صفحہ تاجِ صفحہ آئندہ است

شفیق ان کی اس درجے تعریف کرتے ہیں کہ مبالغے کا شبہ ہوتا ہے، تاہم یہ بالکل صحیح ہے کہ خود آزاد نے اصحاب اقتدار سے اپنی ذات کے لیے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، البتہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے اور اپنے تعلقات ورسوخ سے فیض یاب کرنے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ وہ حکام وقت سے مخلوق خدا کی پُرزور سفارش کرتے اور جو شخص کسی کام سے ان کے پاس آ جاتا، بلا تامل اس کے ساتھ چل پڑتے۔ اس بارے میں وہ کتنی عمدہ بات بیان کرتے ہیں۔

"اس خادم خلائق کا نقطۂ نظر ہمیشہ یہ رہا ہے کہ اگر دستِ کوتاہ میں طاقت رسائی نہیں تو نہ سہی، پاؤں تو ضرورت مند کے ساتھ چل کر جا سکتے ہیں۔ اگر انگشت ناتواں میں طاقت گرہ کشائی نہیں تو کیا ہوا، زبانِ قلم سے تو سفارش کی جا سکتی ہے ❷۔

حاکم وقت سے راہ و رسم کی تلقین:

آزاد بلاشبہ طبعاً مستغنی اور بے نیاز قسم کے شخص تھے، اور ان کا اسلوبِ زندگی ایک حد تک درویشانہ اور فقیرانہ تھا، لیکن وہ راہ و رسم دنیا سے بھی خوب آگاہ تھے۔ ان کے ایک مداح شاگرد لچھمی نرائن شفیق لکھتے ہیں کہ آزاد کہا کرتے تھے، آدمی خواہ دنیا دار ہو یا فقیر، جس شہر میں رہے، اس کے حاکم سے تعلقات اور راہ و رسم ضرور رکھے، اس لیے کہ بیشتر امور میں حاکم کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ بلکہ بعض دفعہ انسان کسی ایسی ناگہانی مصیبت سے دوچار ہو جاتا ہے کہ حاکم کی اعانت کے بغیر اس کا رفع ہونا ممکن نہیں ہوتا۔

❶ مردم دیدہ، ص ۳۵۔

❷ خزانہ عامرہ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آزاد کے حالات سے پتا چلتا ہے کہ یہ محض ان کا خیال یا نظریہ نہ تھا بلکہ اس پر ان کا عمل بھی تھا۔ صمصام الدولہ شاہ نواز خاں نے جو خطوط آزاد کے نام تحریر کیے ہیں، ان سے واضح ہوتا ہے کہ آزاد دکن کے سیاسی حالات میں عملی دل چسپی لیتے تھے اور نواب نظام الدولہ اور صمصام الدولہ وغیرہ ملکی معاملات اور سیاسی مسائل میں ان سے باقاعدہ مشورہ لیتے تھے۔ ۱۱۷۰ھ/ ۱۷۵۷ء میں جب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں کو ان کے منصب سے معزول کر دیا گیا تو آزاد ہی نے شاہ نواز خاں کی حمایت کی اور وہ اپنے منصب پر بحال ہوئے۔

مال و دولت سے بے نیازی:

سید غلام علی آزاد کی زندگی کا بیشتر حصہ دکن کے حکمران نظام الدولہ ناصر جنگ کی رفاقت میں بسر ہوا، لیکن اس مردِ قلندر اور بندۂ خدا نے نہ کبھی کوئی دنیوی اعزاز حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی اور نہ کسی جاگیر کی تمنا دل میں پیدا ہوئی۔ نواب موصوف سے ان کی رفاقت خود نواب کے لیے وجہِ افتخار تھی اور وہ بربنائے عقیدت ان کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ آزاد کا اس میں کوئی دنیوی مقصد مضمر نہ تھا۔ اپنی اس خودداری کا وہ بڑے فخر کے ساتھ اعلان کرتے ہیں اور خزانۂ عامرہ میں سر اونچا کر کے واضح الفاظ میں لکھتے ہیں:

ہر چند با امرا ارتباط و بارؤسا اختلاط، اما سررشتۂ استغنا انگیختہ ام، و آبروئے فقر بر درِ غنا نریختہ۔ بلے عندلیب را از مصاحبت گل زرے و ماہی را از مجالست صدف گوہرے مطمحِ نظر نمی باشد، و دریں معنی زمزمہ می سنجم۔

حبابم مشت من از گوہر منت تہی آمد نباشد عیب گر خود را بدریا آشنا کردم [1]

(بلاشبہ میں نے وقت کے امرا و رؤسا سے ربط و تعلق کی بنیادیں استوار کیں، لیکن سررشتۂ استغنا کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا، اور آبروئے فقر کو دروازۂ ثروت پر نہیں جھکایا۔ عندلیب اگر مصاحبت گل اختیار کرتی ہے تو اس کا مقصود حصولِ زر نہیں ہوتا اور مچھلی ہم نشینئ صدف کو ترجیح دیتی ہے تو اس کے پیش نگاہ تلاشِ گوہر نہیں ہوتا۔ یہی صورتِ حال میری ہے اور میں نغمہ سنج ہوں کہ

میں وہ حباب ہوں جس کے ہاتھ زر و جواہر کی منت پذیری سے خالی ہیں، میں اس میں کوئی عیب نہیں سمجھتا کہ اپنے آپ کو دریا آشنا کر دوں۔)

فرماں روایانِ دکن آزاد سے بے حد عقیدت رکھتے اور ان کی انتہائی توقیر کرتے تھے۔ اگر آزاد چاہتے تو اس سے فائدہ اٹھا کر مال و دولت کے انبار لگا سکتے تھے۔ لیکن ان کی طبیعت میں اس درجہ استغنا بھرا ہوا تھا کہ انھوں نے جاہ و حشمت اور دولت و ثروت کو کبھی حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آنے دیا۔ نظام الملک نواب آصف جاہ کے انتقال کے بعد جب نظام الدولہ ناصر جنگ تختِ دکن پر متمکن ہوا تو آزاد کے دوستوں اور بہی خواہوں نے کہا کہ اب آپ جو منصب چاہیں حاصل کر سکتے ہیں اور اصرار کیا کہ اس موقعے سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے،

[1] خزانۂ عامرہ، ص ۴۳،۴۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیکن اس فقیر منش عالم نے جواب دیا:

آزاد شدہ ام، بندۂ مخلوق نمی توانم شد۔

(میں دنیا طلبی کے جھمیلوں سے آزاد ہوں، بندۂ مخلوق نہیں بننا چاہتا۔)

اور ساتھ ہی یہ شعر پڑھا:

دریں دیار کہ شاہی بہر گدا بخشند　　غنیمت ست کہ مارا ہمیں بما بخشند

بلا شبہ آزاد امرا و اغنیا اور ملوکِ وقت سے مراسم رکھتے تھے، چنانچہ افتخار دولت آبادی نے تذکرۂ بے نظیر میں لکھا ہے کہ وارستہ لاہوری نے آزاد کو "نوکر پادشاہی" قرار دیا ہے جو ان کے نزدیک صحیح نہیں، اور وہ کہتے ہیں کہ آزاد نے کبھی کسی بادشاہ یا امیر کی ملازمت اختیار نہیں کی ــــــ لیکن ہمارے نزدیک اس سلسلے میں افتخار دولت آبادی کا وارستہ لاہوری پر خفگی کا اظہار کرنا اور ان کی بات کو کلیۃً غلط قرار دینا محلِ نظر ہے۔

بلا شبہ امرائے مملکت سے آزاد کی تمام تر بے نیازی اور کامل استغنائے قلبی کے باوصف یہ ماننا پڑے گا کہ وہ نواب نظام الدولہ اور نواب صمصام الدولہ وغیرہ سے گہرے مراسم رکھتے تھے اور سفر و حضر میں اکثر و بیشتر ان کے ساتھ رہتے تھے، اور یہ نواب صاحبان ان کی مالی کفالت کرتے تھے۔ اس لیے وارستہ کے بیان کی کلیۃً تغلیط کرنا واقعات کے منافی ہے۔ آزاد نے ان حکمرانوں کی مدح گستری بھی کی ہے، اگرچہ وہ اس کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ یہ مدح انھیں حج بیت اللہ کے شوق بے تابی کے لیے کرنا پڑی۔ وجہ خواہ کچھ بھی ہو، یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ آزاد نے ان کی مدح میں قلم و زبان کو حرکت دی ہے۔ حج کے لیے زاد و راحلہ کا طالب ہونا اور پھر اس کے لیے اس کی تعریف کرنا بھی تو آخر کوئی شرعی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ بات شرائط حج میں کب داخل ہے کہ اگر اپنے پاس خرچ نہیں تو دوسرے سے مانگنا اور اس کی تعریف کرنا شروع کر دو۔

بہر حال اگر آزاد نے نواب کی مدح کی ہے، اور اس نے مدح سے متاثر ہو کر سفر حج کے لیے روپے کا انتظام کر دیا یا کسی حکمران نے آزاد کی کفالت کی ہے تو یہ کوئی بری بات بھی نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نواب ان سے بہت تعلق رکھتا تھا اور ان کا عقیدت مند تھا۔ آزاد اس کا صاف لفظوں میں ذکر کرتے ہیں۔

بافقیر و نواب نظام الدولہ محبت و اخلاص فوق البیان بود و از ابتدائے ملاقات تا انتہائے ایام حیات من آزاد را در دام حسن خلق خود مقید داشت، ہر چند خواستم کنارہ گیرم، نگزاشت، غفر اللہ ❶۔

(یعنی اس فقیر اور نواب نظام الدولہ کے درمیان اس قدر محبت و اخلاص تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ ابتدائے ملاقات سے لے کر نواب کی وفات تک یہی صورت حال رہی۔ یوں سمجھیے کہ مجھ آزاد کو اس نے اپنے اخلاقِ حسنہ کے دام میں قید کر رکھا تھا۔ ہر چند میں اس سے کنارہ کش ہونا چاہتا تھا، لیکن وہ مرحوم مجھے چھوڑتا ہی نہ تھا۔)

---

❶ خزانہ عامرہ، ص ۵۵۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تاہم ان سب باتوں کے باوجود یہ بہرکیف حقیقت ہے کہ آزاد کا جذبۂ استغنا بہت بلند تھا اور ہرگز کسی کے دست نگر ہونا پسند نہ کرتے تھے۔ نواب کی اگر انھوں نے مدح کی ہے، یا حج کے لیے زادِ راہ طلب کیا ہے، یا نواب نے دیا ہے تو اس کے پیچھے دونوں کا باہمی تعلق، بے پناہ محبت، پُرخلوص عقیدت اور بے تکلفی کارفرما ہے۔

فقر کی بہترین راہ:

سید غلام علی آزاد بلگرامی، جہاں علم و فضل میں باکمال تھے، وہاں فکر و عمل کے اعتبار سے بھی بلند مرتبے کے حامل تھے اور فقر و درویشی کی بہترین راہ پر گام فرسا تھے۔ اس سلسلے میں ان کا نقطۂ نظر شفیق نے گل رعنا میں درج کیا ہے، جو انھوں نے آزاد سے بیان کیا۔ فرماتے ہیں، حج بیت اللہ سے واپسی کے بعد میں نے اپنے دل میں سوچا کہ فقر کئی اقسام میں منقسم ہے، مجھے کون سا فقر اپنانا چاہیے۔ کامل غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ پیری اور مشیخت سے تو بہر طور آزاد ہی رہنا چاہیے، البتہ جادۂ صدق کو اختیار کرنا اور معاملات میں صاف رہنا ضروری ہے، کیوں کہ جھوٹ اگر دنیا کے معاملات میں فروغ نہیں پا سکتا تو امورِ دینی میں تو اور بھی بدتر ثابت ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ کرامات گوئی، خواب و رؤیا کا معاملہ اور پیری مریدی کا سلسلہ اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ اس کی اصلاح ناممکن ہے۔ صدق و صفا اور خوش معاملگی ناپید ہوگئی ہے اور عرس مجموعۂ بدعات بن کر رہ گئے ہیں۔ شفیق لکھتے ہیں کہ آزاد فرمایا کرتے تھے، عرس کو بے کمال لوگوں نے اپنی شہرت کا وسیلہ اور عوام کو بے وقوف بنانے کا ذریعہ بنا لیا ہے۔

آزاد رقم طراز ہیں کہ نفع دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک اخروی اور دوسرا دنیوی۔ صلۂ دنیوی دنیا داروں کی مداحی سے ملتا ہے اور صلۂ اخروی مدحت نبوی اور توصیف اکابرِ دین سے نصیب ہوتا ہے۔ میں نے مدحت رسول (ﷺ) میں اشعار کہے ہیں اور اس طرح اپنی شفاعت اخروی کے لیے ایک وسیلہ قوی پیدا کر لیا ہے۔

چوں مدح رسول کام من شد حسان الہند نام من شد ❶

ایں دریوزہ گر فیض الٰہی در تمام عمر خود لب بمدح امیرے نکشود و نامہ خود بستائش دولت مندے سیاہ نہ نمود، و دریں باب ہوی می کشم:

مہر برلب کرد آزاد از ثنائے اغنیا نیست ارباب دول را باب در دیوان ما ❷

(یعنی فیض الٰہی کے اس دریوزہ گر نے عمر بھر کسی امیر کی مدح میں لب نہیں کھولے اور کبھی اپنے نامۂ اعمال کو کسی دولت مند کی ستائش سے سیاہ نہیں کیا۔)

مآثر الکرام میں آزاد لکھتے ہیں کہ جس روز سے میں نے اپنے ناصیۂ اخلاص کو بیت اللہ کی چوکھٹ پر حضورِ خداوندی میں جھکایا ہے، دنیا کے تمام لوگوں سے بیگانگی اختیار کر لی ہے۔

---

❶ خزانہ عامرہ، ص ۴

❷ ایضاً، ص ۳۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حسان الہند:

سید غلام علی آزاد بلگرامی برصغیر کے وہ عالم دین ہیں، جنھوں نے علم وفضل میں بے حد شہرت حاصل کی اور تمام اصناف علم میں نام پیدا کیا۔ وہ اپنی فضیلت وکمال کی وجہ سے اپنے تمام معاصرین پر فوقیت رکھتے تھے اور اپنی زندگی ہی میں جید عالم اور نامور فاضل کے طور پر مشہور ہو گئے تھے۔ مدحت رسول ﷺ ان کا مرغوب اور دل پسند موضوع تھا۔ اسی بنا پر ان کے عہد ہی میں انھیں حسان الہند کے لقب سے یاد کیا جانے لگا تھا۔ اس لیے کہ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی طرح انھوں نے بھی رسول اللہ ﷺ کی مدح میں عربی زبان میں متعدد قصائد لکھے اور بے شمار شعر کہے۔ ان کا اپنا شعر ہے:

چوں مدح رسول کام من شد　　حسان الہند نام من شد

ان کے شاگرد قاضی عبدالقادر مہربان اورنگ آبادی اور دیگر حضرات نے انھیں اسی لقب سے یاد کیا ہے۔

معاصرین سے علمی صحبتیں اور ادبی لطیفے:

غلام علی آزاد کی ولادت سے دو سال بعد (۱۱۱۸/۱۷۰۶ء) دُودمانِ تیموریہ کے عظیم حکمران اورنگ زیب عالم گیر نے وفات پائی اور اس کے بعد دورِ زوال شروع ہو گیا۔ اس لحاظ سے آزاد اس عہد کے اہل علم ہیں، جب سلطنت مغلیہ کے عروج کا دور ختم ہو چکا تھا اور اس کے آفتابِ اقتدار کا وسعت پذیر سایہ سکڑ رہا تھا۔ اب ارکانِ دربار بھی اس مرتبہ علمی کے حامل نہ تھے جو تیموری درباروں کی علمی اور ادبی روایات کا خاصہ رہا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہندوستان علم وادب کی دولت سے تہی دامن ہو گیا تھا اور اس ملک کی گود قابل شخصیتوں کے وجود سے خالی ہو گئی تھی۔ یہاں سید عبدالجلیل بلگرامی، ملا نظام الدین انصاری، شیخ محب اللہ بہاری، والہ داغستانی اور شیخ علی حزین خاں آرزو جیسے اصحاب فضل وکمال اور نکتہ آفرین موجود تھے۔ یہ وہ حضرات ہیں، جن میں سے زیادہ لوگوں سے آزاد کی صحبتیں رہیں۔ ان صحبتوں سے پتا چلتا ہے کہ آزاد علم وفضل، عادات واطوار، حاضر دماغی، زود فہمی، نکتہ آفرینی اور بذلہ سنجی میں کتنے اونچے مرتبے کے حامل تھے۔ ان علمی صحبتوں اور ادبی لطیفوں کی چند مثالیں گزشتہ سطور میں بیان کی جا چکی ہیں اور چند مقالات شبلی میں علامہ شبلی نے بیان کی ہیں، جو بڑی دلچسپ اور معلومات آفرین ہیں۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ علامہ شبلی پہلے اہل قلم ہیں، جنھوں نے ''الندوہ'' لکھنؤ (اپریل ۱۹۰۵ء) میں آزاد پر مضمون لکھا اور اردو دان حضرات کو ان سے متعارف کرایا۔ اگرچہ یہ مضمون بہت مختصر اور تشنہ ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس اختصار میں بہت کچھ بیان کر دیا گیا ہے۔ ذیل کی چند سطور میں اسی مضمون سے استفادہ کیا گیا ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۔ ایک دن نظام الدولہ نواب ناصر جنگ شہید دربار میں آئے۔ اہل سخن اور شعرا و فضلا میں سے موسوی خاں، جرأت اورنگ آبادی، صمصام الدولہ شاہ نواز خاں، میرزا جان رسا، رضوی خان اور نقد علی خاں ایجاد وغیرہ ہم عنان تھے۔ نواب نے ایک تازہ غزل پڑھنا شروع کی، جو آزاد سے اصلاح پا چکی تھی۔ ایک شعر میں نواب موصوف نے ''سرو'' کو ''خراماں'' باندھا تھا۔ اس شعر پر تمام فضلائے حاضرین کی معترضانہ نگاہیں اٹھیں۔ نواب نے حیران ہو کر آزاد کی طرف دیکھا۔ مطلب یہ تھا کہ شعر آپ کی نظر سے گزر چکا ہے۔ آزاد نے فوراً سند میں مرزا صائب کا شاعر پڑھا:

یک رہ بر آراز آستیں دست نگاریں در چمن تادستہا پنہاں کند سرو خراماں در بغل

جرأت نے کہا تعجب ہے کہ مرزا صائب نے سرو کو خراماں باندھا۔ سرو چلتا پھرتا نہیں، خراماں کیوں کر ہوسکتا ہے؟ آزاد نے جواب دیا، شاعری کی بنیاد تخیل پر ہے۔ شاخیں ہوا کے اشارے سے ہلتی ہیں اور ان سے درخت جھومتا نظر آتا ہے۔ یہی درخت کا خراماں ہوتا ہے۔ اسی لیے عربی میں شاخ کو میاد کہتے ہیں۔ صائب کے علاوہ اور شعرا نے بھی سرو کو خراماں باندھا ہے۔ خواجہ حافظ کا شعر ہے:

سرو از صبا گردو چناں تاچوں قدرت باشد رواں ہر چند بخرامد بآں سرو خراماں کے رسد

۲۔ شیخ علی حزیں اپنے زمانے کے سب سے زیادہ مشہور شاعر تھے۔ وہ ایران سے ہندوستان آرہے تھے۔ جب سندھ کے علاقے سیوستان میں پہنچے تو سید غلام علی آزاد سیوستان سے روانہ ہو کر وطن جارہے تھے۔ راستے میں ایک مقام پر اتفاقیہ ملاقات ہوگئی۔ بڑی پُر لطف مجلسیں رہیں۔ حزیں کا معیار بہت اونچا تھا۔ وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے، لیکن آزاد کی بڑی قدر دانی کی۔ اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی غزلیں آزاد کو تحفۃً دیں۔ اس کے بعد آزاد نے بھی ان کے مرتبے کو خوب پہچانا، جس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ خان آرزو نے حزیں پر جو اعتراضات کیے ہیں، ان میں سے بعض کا جواب آزاد نے خزانۂ عامرہ میں دیا ہے اور اچھے انداز سے بادلائل ان کا دفاع کیا ہے۔

خان آرزو سے آزاد کا غائبانہ تعارف تھا۔ انھوں نے اپنے تذکرہ مجمع النفائس میں دو مقامات پر آزاد کا ذکر کیا ہے اور بہت اچھی طرح کیا ہے۔

۳۔ شاہ آفرین لاہوری پنجاب کے مشہور شاعر تھے۔ جس زمانے میں آزاد بلگرام سے سیوستان (سندھ) جارہے تھے، اس زمانے میں لاہور سے گزرتے ہوئے ۲۹ محرم ۱۱۴۳ھ/۳ اگست ۱۷۳۰ء کو ان سے ملاقات ہوئی۔ دوسری مرتبہ آزاد سندھ سے واپس بلگرام جاتے ہوئے رجب ۱۱۴۷ھ/دسمبر ۱۷۳۴ء کو لاہور اترے اور پانچ دن یہاں مقیم رہے۔ اس زمانے میں آزاد ید بیضا لکھ چکے تھے۔ آفرین نے بڑے اصرار سے اس کی نقل لی اور اپنی مثنوی ابیانِ معرفت ان کی نذر کی۔ ان پانچ دنوں میں دونوں فضلا کی بڑی علمی اور ادبی صحبتیں رہیں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴۔ حاکم لاہوری شاعر اور تذکرہ نگار تھے، شاہ آفرین لاہوری کے شاگرد تھے اور ابتدا میں دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ بعد کو یہ تعلق ختم کر کے واقف لاہوری کے ساتھ حرمین شریفین کا عزم کیا۔ واقف تو راستے میں بیمار پڑ گئے اور سورت ہی میں رہ گئے۔ حاکم کو البتہ سعادت حج نصیب ہوئی۔ حج سے واپس آئے تو حاکم اور واقف دونوں اورنگ آباد گئے۔ وہیں آزاد سے ملاقات ہوئی۔ حاکم نے اورنگ آباد کے زمانۂ قیام میں شعرا کا تذکرہ لکھا اور التزام یہ کیا کہ صرف ان شعرا کا حال قلم بند کیا، جن کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ کتاب مکمل ہوئی تو ''تحفۃ المجالس'' اس کا نام رکھا۔ آزاد سے کتاب کے بارے میں بات کی تو انھوں نے کہا موضوع کی مناسبت سے ''مردم دیدہ'' زیادہ مناسب رہے گا۔ حاکم پھڑک اٹھے اور یہی نام رکھا۔ خاتمہ کتاب میں اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

نسخۂ تازہ کردہ ام تالیف — کہ از و تازہ شد روانِ سخن
نام او کرد مردمِ دیدہ — آنکہ بودہ است راز دانِ سخن
اسم سامی او غلام علی است — سروِ آزاد بوستانِ سخن

۵۔ والہ داغستانی جو اپنے عہد کے بڑے شاعر اور سخن ور تھے، ان سے بھی آزاد کو ملنے اور کچھ عرصہ ہم مجلس رہنے کا موقع ملا۔ جس زمانے میں آزاد سیوستان سے دہلی جا رہے تھے، اتفاق سے انہی دنوں والہ داغستانی بھی ایران سے ہندوستان آ رہے تھے۔ دونوں کی راستے میں ملاقات ہوئی اور سیوستان سے دہلی تک دونوں ہم سفر و ہم عنان رہے۔ دورانِ سفر میں ایک دن والہ نے آزاد سے کہا کہ آؤ ہم دونوں گھوڑے دوڑائیں۔ آزاد نے پہلے تو انکار کیا، لیکن والہ کا اصرار بڑھا تو مجبوراً ان کی بات ماننا پڑی۔ والہ کا ایرانی گھوڑا آزاد کے ہندی گھوڑے کا مقابلہ نہ کر سکا اور پیچھے رہ گیا۔ آزاد آگے نکل گئے۔ والہ کو اس پر بڑا دکھ ہوا۔ اثنائے راہ میں ایک دن آزاد نے اپنا یہ شعر پڑھا:

زدہ ام برسر جہاں پاپوش — بے سبب ایں برہنہ پائی نیست

والہ نے خیال کیا کہ آزاد کو میدانِ شعری میں شکست دینے کا موقع ہاتھ آ گیا ہے۔ بولے ہمارے ملک میں ''کفش'' کہتے ہیں، ''پاپوش'' نہیں کہتے۔ آزاد ہار ماننے اور چپ رہنے والے کب تھے۔ فوراً اپنی تائید میں مرزا صائب کا یہ شعر پڑھ دیا:

چرخ دودے است کہ از خرمن من خاستہ است — خاک گردے است کہ افشاندۂ پاپوشِ من است

والہ صائب کا یہ شعر سن کر خاموش ہو گئے۔

ایک روز والہ نے آزاد سے پوچھا کہ لفظ ''طیار'' طائے حطی سے ہے یا تائے قرشت سے؟ آزاد نے جواب دیا میرزا محمد رفیع کے شعر سے ثابت ہوتا ہے کہ طائے حطی سے ہے:

دارد چو مرغ عمرت پرواز بس بہ سرعت — اسبابِ عیش و عشرت طیار گونہ باشد

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پھر کہا کہ میرزا سعید اشرف کا کلام بھی اس کی تائید کرتا ہے:

می پرد باز از ہوائے عشق اورنگ از زخم گرچہ بازنجیر موج بادہ طیارش کنم

۶۔ نور العین واقف سے آزاد کے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ مختلف مواقع پر آزاد نے ان کی بڑی مدد کی تھی۔ ایک مرتبہ وہ اورنگ آباد سے ہندوستان کے کسی علاقے کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں ڈاکوؤں کے چنگل میں پھنس گئے اور تمام مال و اسباب لوٹ لیا۔ صرف ایک عینک اور تھوڑا سا پارہ جو وہ اپنے پاس رکھتے تھے، بچ گیا۔ واقف نے بالا پور پہنچ کر آزاد کے پاس ایک آدمی بھیجا اور بذریعہ خط حقیقت حال سے مطلع کیا۔ خط میں یہ شعر لکھا:

عینکے و پارۂ سیماب باما ماندہ است چشم بے خواب و دل بے تاب باما ماندہ است

آزاد نے مدد کے لیے ہنڈوی کے ذریعے کچھ روپے ارسال کیے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دوستوں اور ضرورت مندوں کا کتنا خیال رکھتے تھے اور ان کی مدد کرنا کتنا ضروری سمجھتے تھے۔

۷۔ ایک دن نواب نظام الدولہ ناصر جنگ شہید کے ہاں اہل سخن جمع تھے۔ کسی نے مرزا صائب کا یہ شعر پڑھا:

اہل کمال را لب اظہار خامشی است منت پذیر ماہِ تمام از ہلال نیست

اس کے معنی میں سخت اختلاف ہوا، اور واقعی اس میں اختلاف کی گنجائش تھی۔

ماہِ تمام یعنی بدر کا ہلال سے منت پذیر نہ ہونا ایک بے معنی سی بات تھی۔ حاضرین بڑے زور و شور سے سرگرم مباحثہ تھے کہ دفعۃً آزاد نے کہا، یہاں ماہ تمام سے بدر مراد نہیں بلکہ پورے مہینے کا چاند مراد ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ اہل کمال کا چپ رہنا بھی ان کے کمال کا اظہار کر دیتا ہے۔ اس دعوے کی شاعرانہ دلیل یہ ہے کہ جو مہینا انتیس (۲۹) دن کا ہوتا ہے، ماہِ نو کا محتاج ہوتا ہے، لیکن جو مہینا پورے تیس دن کا ہوتا ہے، اس کو ہلال کی حاجت نہیں۔ سب نے آزاد کے ذہن رسا اور معنی فہمی کی داد دی[1]۔

دکن میں مستقل سکونت:

آزاد کی تربیت و تعلیم کی بیشتر منزلیں ان کے آبائی وطن بلگرام میں طے ہوئیں، بعد ازاں متعدد بلاد و امصار کی سیاحت کی۔ پھر ان کی زندگی کے تقریباً اڑتالیس سال دکن میں گزرے۔ یہ ان کی زندگی کا طویل ترین اور اہم دور ہے اور یہی آخری دور بھی ہے۔ اس طویل مدت میں آزاد کو کئی حوادث پیش آئے۔ ان کے والدین کا انتقال ہوا۔ ماموں اور استاد سید محمد بلگرامی نے وفات پائی۔ اکلوتا نوجوان بیٹا نور الحسن تالاب میں ڈوب کر مر گیا۔ خالہ زاد بھائی سفر آخرت پر روانہ ہوا، اور بھی بہت سے عزیز اور دوست دنیا سے رخصت ہو گئے، لیکن دکن کی محبت

[1] مقالات شبلی، ج ۵، ص ۱۳۱ تا ۱۳۵۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے دل پر کچھ ایسا قبضہ کیا اور وہاں کی مٹی نے ایسا دامن پکڑا کہ آزاد نے وہاں سے نکلنے کا نام تک نہ لیا۔ بھتیجے میر سید اولاد محمد ذکا اور پوتے امیر حیدر کو بھی پاس بلا لیا اور ان کی تعلیم و تربیت کی تکمیل کے بعد بلگرام واپس بھیجا۔

دکن میں ان کی سکونت اورنگ آباد میں تھی اور اس شہر سے ان کو انتہائی محبت تھی۔ عمر کے آخری دور میں ان کو بخار، پیچش، قولنج وغیرہ کے عوارض لاحق ہو گئے تھے۔ ساتھ ہی ضعف اور نقاہت کا بھی غلبہ ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں انھیں خطوط لکھتے اور تسلی دیتے رہتے تھے۔ ''منشات شاہ نواز خاں'' کے نام سے شاہ نواز خاں کے مجموعہ مکتوبات کا قلمی نسخہ بمبئی یونیورسٹی میں موجود ہے۔ اس کے حوالے اس زمانے کی تاریخ کی بعض کتابوں میں مرقوم ہیں۔ اس میں وہ خطوط درج ہیں جو شاہ نواز خاں نے آزاد کو ان کے آخری دور میں تحریر کیے۔ ان سے ان عوارض کا بھی پتا چلتا ہے جن میں آزاد مبتلا تھے۔

سفر آخرت کی تیاری:

مختلف عوارض کے ہجوم کی وجہ سے ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء میں آزاد کو یقین ہو گیا تھا کہ اب وقت رحلت قریب ہے۔ چنانچہ اپنی قبر کے لیے اورنگ آباد سے بارہ کوس کے فاصلے پر خلد آباد میں حضرت شاہ برہان الدین غریب کے مرقد کے قریب زمین کا ایک قطعہ بھی خرید لیا تھا۔ پھر سب احباب اور مشائخ و شعرا کو اپنے ہاں جمع کر کے ان کو بہترین کھانا کھلایا۔ ہر ایک سے الگ الگ معافی مانگی۔ ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا یہ دنیا دار الفنا ہے۔ اصل اور ہمیشہ کا ٹھکانا وہی ہے، جو مرنے کے بعد حاصل ہو گا۔ آخرت میں ہم سب یکے بعد دیگرے باہم ملیں گے۔ آج کی تقریب الوداعی تقریب ہے اور ھذا فراق بيني وبينكم کا معاملہ ہے۔ اس موقع پر آزاد بہت ہشاش بشاش تھے لیکن حاضرین پر رقت و حسرت طاری تھی[1]۔

وفات:

اس واقعہ سے پانچ سال بعد تک آزاد زندہ رہے اور ۲۴ / ذوالقعدہ ۱۲۰۰ھ/ ۱۸/ ستمبر ۱۷۸۶ء کو چھیاسی برس کی عمر پا کر فوت ہوئے۔ ان کی وصیت اور خواہش کے مطابق انھیں اورنگ آباد سے بارہ میل دور خلد آباد میں دفن کیا گیا۔ ان کی لوح قبر پر یہ الفاظ مرقوم ہیں:

هو الحی القیوم۔

حسان الہند میر غلام علی آزاد حسینی واسطی بلگرامی۔

ولادت: ۲۵/ صفر المظفر ۱۱۱۶ھ۔

وفات: ۲۴/ ذیقعدہ الحرام ۱۲۰۰ھ۔

---

[1] محبوب الزمن، ج ۱، ص ۲۸۵، ۲۸۶۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۳۷۔ قاضی غلام مصطفیٰ انصاری لکھنوی

قاضی غلام مصطفیٰ بن محمد اسعد بن شیخ قطب الدین انصاری سہالوی ثم لکھنوی، اپنے جد امجد اور جلیل القدر عالم شیخ قطب الدین انصاری سہالوی کی زندگی میں موضع سہالی میں پیدا ہوئے۔ پھر اپنے چچاؤں کے ساتھ سہالی سے نقل مکانی کر کے لکھنؤ چلے گئے تھے۔ ان کے ایک چچا شیخ نظام الدین انصاری سہالوی (متوفی ۸/ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ/ ۲۵/ اپریل ۱۷۴۸ء) تھے، جو اپنے دور کے ممتاز عالم اور ہندوستان کے مدارس دینیہ کے باقاعدہ نصاب تعلیم کے اولین بانی تھے۔ یہ نصاب تعلیم درسِ نظامیہ کے نام سے معروف ہے، اور کچھ تغیر و تبدل کے ساتھ ہمارے مدارس میں اب تک اس کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے۔ قاضی غلام مصطفیٰ انصاری نے لکھنؤ میں تربیت پائی اور اپنے انہی رفیع المرتبت عم محترم شیخ نظام الدین انصاری سے اخذ علم کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد قاضی غلام مصطفیٰ طلب رزق کے لیے دہلی چلے گئے تھے۔ وہاں جانے کے بعد وہ ملاوہ کے قاضی مقرر کیے گئے تھے۔ لیکن ملاوہ کے جس قاضی کو معزول کر کے ان کا تقرر عمل میں آیا تھا، وہ ان کے تقرر سے سخت نالاں تھے۔ چنانچہ اس نے ان کو معزول کرانے کی کوشش شروع کر دی۔ اس طرح دونوں میں کش مکش رہنے لگی۔ کبھی اس کی کوشش سے قاضی غلام مصطفیٰ اپنے منصب سے معزول ہو جاتے اور کبھی قاضی غلام مصطفیٰ کی جدوجہد سے وہ الگ ہو جاتے اور منصب قضا پر یہ فائز ہو جاتے۔ یہ سلسلہ کافی عرصے تک جاری رہا۔ بالآخر اپنے عہدے سے الگ ہو کر قاضی غلام مصطفیٰ دہلی سے اپنے وطن کو روانہ ہوئے۔ ان کے صاحب زادۂ گرامی محمد علی بھی ساتھ تھے۔ ان کے حریف قاضی کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے کچھ لوگوں کو ان کے پیچھے لگا دیا اور انھوں نے راستے ہی میں ان کو قتل کر دیا[1]۔

۱۳۸۔ سید غلام نبی بلگرامی

سید غلام نبی بن محمد ارشد بن خضر بن کمال الدین حسینی واسطی بلگرامی، اپنے زمانے کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ صلاح و تقویٰ میں جماعت علما میں خاص طور سے مشہور تھے۔ مولد و منشا بلگرام ہے، جو اس عہد میں علم و علما اور صلحا و اتقیا کا مرکز تھا۔ شعور کی آنکھیں کھولیں تو نامور عالم مولانا قطب الدین گوپا موی (متوفی ۲۵/ رمضان ۱۱۶۰ھ/ ۱۹/ ستمبر ۱۷۴۷ء) کے بعض تلامذہ سے چند کتب درسیہ پڑھیں۔ پھر مولانا احمد اللہ حسینی خیر آبادی (متوفی ماہِ رجب ۱۱۶۷ھ/ مئی ۱۷۵۴ء) سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ فلسفہ و حکمت کی کچھ کتابوں کی تحصیل بھی انہی سے کی۔ بعد ازاں علامہ کمال الدین انصاری فتح پوری (متوفی ۱۴/ محرم ۱۱۷۵ھ/ ۱۵/ اگست ۱۷۶۱ء) کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ ان سے باقی درسی کتابوں کی تکمیل کی۔ ان علمائے عظام سے اخذ علم کے بعد پھر

---

[1] اغصان الاربعہ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۱۰۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا احمد اللہ حسینی خیر آبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے باقاعدہ سند فراغت لی۔

سید غلام نبی بلگرامی، مشہور عالم و ادیب میر سید غلام علی آزاد بلگرامی کے معاصرین میں سے تھے۔ جب میر غلام علی آزاد اورنگ آباد (دکن) میں مقیم تھے تو یہ بھی ۲۰؍ذی الحجہ ۱۱۶۸ھ/ ۲۷؍ستمبر ۱۷۵۵ء کو ان کے پاس اورنگ آباد گئے اور کچھ عرصہ ان کے یہاں اقامت گزیں رہے۔ بعد ازاں ۱۹؍محرم ۱۱۶۹ھ/ ۲۵؍اکتوبر ۱۷۵۵ء) کو علاقہ مدراس کے شہر ارکاٹ اور ترچناپلی کے لیے رخت سفر باندھا❶۔

سید غلام نبی بلگرامی کے اس سے زیادہ حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ ان کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کا بھی علم نہیں ہو سکا۔ صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ وہ ۱۱۶۹ھ/ ۱۷۵۶ء میں زندہ تھے۔ ان کی علمی و تدریسی سرگرمیوں کے بارے میں بھی کتب تذکرہ و رجال خاموش ہیں۔

ـــــ ف ـــــ

۱۳۹۔ قاضی فتح علی قنوجی

قاضی فتح علی قنوجی کا شمار اونچے درجے کے علما میں ہوتا تھا۔ آبا و اجداد قنوج شہر کے منصب قضا پر فائز تھے۔ حصول علم کے بعد یہ بھی اسی مسند بلند پر متمکن ہوئے۔ مشہور عالم شیخ علی اصغر قنوجی (متوفی ۱۵؍شعبان ۱۱۴۰ھ/ ۱۶؍مارچ ۱۷۲۸ء) کے شاگرد رشید تھے۔ اپنے علاقے اور عہد کے فاضل، نامور ادیب، مشہور فقیہ اور شیخ تھے۔ علوم مروجہ اور فنونِ متداولہ میں مہارت رکھتے تھے۔ اور اس میں اپنے تمام اقران و معاصرین سے فوقیت لے گئے تھے۔ ان کی تصانیف میں حاشیہ شرح تہذیب اور حاشیہ مقاماتِ حریری شامل ہیں۔ معقولات و منقولات کے اس عالم نے ۱۲۰۰ھ/ ۱۷۸۶ء کے لگ بھگ وفات پائی❷۔

۱۴۰۔ مولانا فخر الدین مانک پوری بلگرامی

مولانا فخر الدین مانک پوری بلگرامی، نامور فاضل شیخ بہاء الدین نحوی بلگرامی کے فرزند رشید تھے۔ شیخ بہاء الدین درحقیقت بلگرام کے رہنے والے تھے لیکن کسی وجہ سے مانک پور تشریف لے گئے تھے، وہیں ان کے بیٹے مولانا فخر الدین پیدا ہوئے اور اسی شہر میں نشو و نما پائی۔ لہٰذا مانک پوری کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ مختصرات کتب درسیہ اپنے والد گرامی شیخ بہاء الدین سے پڑھیں۔ بعد ازاں ان کے حسب ارشاد استاذ المحققین میر سید طفیل محمد بلگرامی (متوفی ۲۴؍ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ/ ۲۴؍مارچ ۱۷۳۹ء) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے

❶ مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۸۶، ۲۸۷۔ سروِ آزاد، ص ۳۱۲ تا ۳۱۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۱۲۔

❷ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۷۲۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۵۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۱۷۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حلقہ شاگردی میں شمولیت کی۔ باقی درسی کتابیں انہی سے پڑھیں اور علم و فضل کے بلند مرتبے کو پہنچے اور سید غلام علی آزاد کے بقول "درفقاہت ید طولیٰ بہم رسانند" یعنی علم فقہ میں بڑی دسترس حاصل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد لغت کی مشہور کتاب تاج العروس کے مصنف سید مرتضیٰ حسینی زبیدی (متوفی ماہ شعبان ۱۲۰۵ھ/ اپریل ۱۷۹۱ء) کے جد امجد سید قادری حسینی بلگرامی (متوفی ۱۳/ ربیع الاول ۱۱۴۵ھ/ ۲۳/ اگست ۱۷۳۲ء) کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے اور اس زمانے کے دستور کے مطابق ان کی خدمت میں تصوف و طریقت کی منزلیں طے کیں۔ جب ہر لحاظ سے درجۂ کمال کو پہنچ گئے تو درس و تدریس کی مسند بچھائی۔ بے شمار لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔

مولانا فخر الدین مانک پوری بلگرامی، فضل و صلاح کے اوصاف سے متصف اور جلیل القدر علما و فضلا میں گردانے جاتے تھے۔ ۱۱۴۰ھ/ ۱۷۲۸ء کے بعد فوت ہوئے ❶۔

۱۴۱۔ مولانا فخر الدین دہلوی

مولانا فخر الدین بن شیخ محب اللہ بن شیخ نور اللہ بن شیخ نور الحق بن شیخ عبدالحق محدث دہلوی، شیخ وقت، عالم کبیر اور معروف محدث و فقیہ تھے۔ متعدد علوم کے ماہر اور کئی مشہور کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کے آبا و اجداد اس برصغیر میں حدیث و فقہ کے جید عالم اور بہت سی کتابوں کے مصنف و مؤلف اور مترجم تھے۔ درس و افادہ میں بھی انھیں خاص شہرت حاصل تھی۔ مولانا فخر الدین بھی اس سلسلے میں انہی کے نقش قدم پر چلے اور عمر بھر حدیث و فقہ کی خدمت میں مصروف رہے۔ فارسی زبان میں صحیح مسلم کی بسیط و مفصل شرح سپرد قلم کی، اسی طرح حصن حصین کی مبسوط شرح اور عین العلم کی شرح لکھی ❷۔

۱۴۲۔ شیخ فرخ شاہ سرہندی

شیخ فرخ شاہ سرہندی، حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے پوتے اور شیخ محمد سعید سرہندی کے بیٹے تھے۔ ۱۰۳۸ھ/ ۱۶۲۹ء میں پیدا ہوئے اور سن شعور کو پہنچے تو اپنے والد سے علم حاصل کرنا شروع کیا۔ فقہ، ادب اور دیگر علوم کی تحصیل کی۔ معقول و منقول کی کتابیں پڑھیں اور تمام فنونِ مروجہ میں ماہر ہوئے۔ بالخصوص حدیث و فقہ اور تصوف میں بڑا نام پایا۔ حافظہ تیز تھا اور قوتِ فہم میں شہرت رکھتے تھے۔ بحث و مناظرے سے بہ درجہ غایت دلچسپی تھی اور حدیث اور علم حدیث سے بے حد لگاؤ تھا۔ صاحب تقویٰ بزرگ تھے۔ حرمین شریفین گئے اور حج و زیارت کا شرف حاصل کر کے وطن واپس آئے تو درس و افادہ میں مشغول ہو گئے۔

---

❶ مآثر الکرام، ص ۱۴۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۱۷، ۲۱۸۔

❷ تذکرہ علمائے ہند، ص ۶۷ بضمن ترجمہ مولوی سلام اللہ محدث رام پوری۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۱۸۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۶۸، بضمن ترجمہ مولوی سلام اللہ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صاحب الیانع الجنی شیخ محسن ترہٹی کا بیان ہے کہ شیخ فرخ شاہ کو حدیث سے اس قدر محبت تھی کہ ستر ہزار احادیث مع متن واسناد اور جرح وتعدیل کے حفظ تھیں اور مسائل فقہیہ میں درجۂ اجتہاد پر فائز تھے، واللہ اعلم۔

الیانع الجنی کے فاضل مصنف نہایت تعجب سے کہتے ہیں کہ حدیث پر اس قدر عبور و استحضار کے باوجود انھوں نے ایک رسالہ لکھا، جس میں حالت تشہد میں اشارۂ انگشتِ شہادت سے منع کیا ہے، حالاں کہ تشہد میں اشارۂ انگشت شہادت کا واضح طور سے حدیث میں ثبوت موجود ہے۔

شیخ موصوف نے حدیث اور فقہ کے بعض مسائل پر رسائل تصنیف کیے۔ ایک رسالے میں ان اعتراضات کا جواب دیا جو بعض لوگ ان کے جد امجد حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ پر وارد کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں القول الفاصل بین الحق والباطل، کشف الغطاء عن وجوہ الخطاء رسالة فی حرمة الغناء، رسالة فی العقائد، رسالة فی الحقیقة المحمدیه اور حاشیه علیٰ حاشیة عبدالحکیم علی الخیالی، ان کی تصانیف ہیں۔

شیخ فرخ شاہ سرہندی نے ۴؍شوال ۱۱۲۲ھ/ ۱۵؍نومبر ۱۷۱۰ء کو وفات پائی ❶۔

۱۴۳۔ سید فرید الدین بلگرامی

سید فرید الدین بن معین الدین بن عبدالوہاب حسینی واسطی، شیخ و فاضل اور فقہ و اصول کے ممتاز علما میں سے تھے۔ بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ بچپن ہی میں اپنے شہر کے علما سے حصولِ علم میں مشغول ہوگئے تھے۔ بعدازاں دوسرے بلاد وامصار کا سفر کیا اور مختلف فضلائے عصر کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ شیخ احمد امیٹھوی (متوفی ۹؍ذوالقعدہ ۱۱۳۰ھ/ ۲۳؍ستمبر ۱۷۱۸ء) سے جو ملا جیون کے عرف سے معروف تھے اور اپنے زمانے میں ہندوستان کے جلیل القدر عالم اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، بعض درسی کتابیں پڑھیں۔ بعض کتابوں کی تکمیل علامہ غلام نقشبندی لکھنوی (متوفی ماہ رجب ۱۱۲۶ھ/ جولائی ۱۷۱۴ء) سے کی۔ سند فراغت بھی ان سے حاصل کی۔ اس کے بعد شیخ جنید بن عبدالواحد امیٹھوی سے اخذ طریقت کیا۔ سید قادری بلگرامی (متوفی ۱۳؍ربیع الاول ۱۱۴۵ھ/ ۲۳؍اگست ۱۷۳۲ء) کے ساتھ حجازِ مقدس گئے اور حج وزیارت کی سعادت حاصل کی۔ حج سے فارغ ہوکر ہندوستان واپس آئے تو سورت میں اقامت گزین ہوگئے اور اپنے آپ کو درس و تدریس اور افادۂ علما وطلبا کے لیے وقف کردیا۔

اس ہندی عالم وفقیہ نے ۱۱۲۰ھ/ ۱۷۰۸ء کے بعد سفر آخرت اختیار کیا۔ سید غلام علی آزاد بلگرامی جن کی وفات ۱۲۰۰ھ/ ۱۷۸۶ء میں اورنگ آباد (دکن) میں ہوئی، لکھتے ہیں کہ بہت سی درسی کتابیں، جن میں مطولات اور مختصرات شامل ہیں، سید فرید الدین کے قلم سے تصحیح شدہ اور محشیٰ بلگرام میں موجود ہیں ❷۔

❶ الیانع الجنی، ص ۹۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۲۲، ۲۲۳۔

❷ مآثر الکرام، ص ۱۲۷، ۱۲۸۔ نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۲۲۳۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۴۴۔ مولانا فصیح الدین پھلواروی

مولانا فصیح الدین بن ابو یزید بن محمد فرید بن محمد حسین بن عطاء اللہ ہاشمی جعفری پھلواروی، ان کے بارے میں سید عبدالحی حسنی لکھنوی نزہۃ الخواطر میں حدیقۃ الازہار کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ اپنے زمانے کے عالم وفقیہ اور شیخ تھے۔ پھلواری میں پیدا ہوئے جو ہندوستان کے صوبہ بہار کا مشہور شہر ہے اور جسے علم وفضل اور دعوت وارشاد کے سلسلے میں دیارِ ہند میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ پھلواری ہی میں نشو ونما پائی۔ مدت تک اپنے شہر کے اساتذہ سے حصول علم میں مصروف رہے۔ پھر دہلی کا قصد کیا اور شیخ احمد امیٹھوی معروف بہ ملا جیون سے اخذ علم کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے آبائی شہر پھلواری کو مراجعت کی اور سب امور سے منقطع ہو کر درس وافادہ کو مقصد حیات ٹھہرا لیا۔

سید عبدالحی حسنی لکھنوی برصغیر پاک وہند کے نامور عالم شاہ سلیمان پھلواروی کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب موصوف سے میں نے سنا کہ مولانا فصیح الدین نے ملا عوض وجیہ سمرقندی سے تحصیل علم کی تھی۔ شاہ صاحب کا بیان ہے کہ میں نے یہ بات ایک شاہی فرمان میں دیکھی ہے جو مغل حکمران سلطان اورنگ زیب عالم گیر کے بیٹے شاہ عالم نے ان کو بھیجا تھا❶۔

مولانا فصیح الدین پھلواروی وہ عالم دین اور نامور فقیہ ہیں، جو عہد عالم گیری میں فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین کی باکمال جماعت میں باقاعدہ طور پر شامل تھے۔ اس کا ذکر جناب عون احمد صاحب قادری نے ''معارف'' (اعظم گڑھ) میں مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے:

''ملا فصیح الدین کا وطن بہار کا ایک مردم خیز قصبہ پھلواری تھا۔ وہ اہل پھلواری کے مورثِ اعلیٰ حضرت امیر عطاء اللہ جعفری کے پڑپوتے تھے۔ تحصیل علم کے لیے دہلی گئے اور ملا عوض وجیہ کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر تکمیل کی۔ سلطان اورنگ زیب عالم گیر کا عہد تھا۔ استاد دربارِ شاہی کے ممتاز لوگوں میں سے تھے۔ ملا فصیح الدین اپنے استاد کے ذریعے عالم گیر کے دربار میں پہنچے اور اپنے تبحر علمی کی بنا پر فتاویٰ عالم گیری کی تدوین میں شریک کیے گئے۔ سلطان اورنگ زیب عالم گیر نے ان کی علمی قابلیت اور جوہر ذاتی کی قدر کر کے مددِ معاش میں ایک سو بیگہ اراضی اور ایک روپیہ یومیہ خرچ کے لیے عطا فرمایا۔

''جب دہلی سے اپنے وطن پھلواری واپس آئے تو اپنے آبائی مدرسے میں درس دینا شروع کیا۔ ان کے آبائی مدرسے کا تذکرہ بھی اگلے دور کی کتابوں میں ملتا ہے۔ یہ مدرسہ مسجد سنگی سے اتر کی جانب تھا۔ اس میں حضرت امیر عطاء اللہ کی اولاد سے علما وفضلا درس دیا کرتے تھے۔ یہ مدرسہ ۱۱۷۲ھ/۱۷۵۹ء تک نہایت عروج کے ساتھ آباد رہا۔

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۲۳، ۲۲۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''ملا فصیح الدین کا حلقۂ درس بہت وسیع تھا۔ پھلواری کے متقدمین علما میں ان کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ان کے تلامذہ کی تعداد کثیر تھی۔۔ ارشد تلامذہ میں موصوف کے چاروں صاحب زادے اور قاضی حیات مرید اور ملا غلام شرف الدین قابل ذکر ہیں۔

''بڑے لڑکے ملا صبیح الدین ان کے بعد مسند درس پر بیٹھے اور بہت سے لوگوں نے ان سے علمی فیض حاصل کیا۔ ان کے بعد اس مسند پر ان کے بھانجے ملا مبین جعفری بیٹھے جو بہ یک واسطہ ملا نظام الدین فرنگی محلی کے شاگرد تھے۔ ملا مبین کے بعد ملا فصیح الدین کی مسند تدریس کچھ دنوں خالی رہی۔ پھر ان کے بھائی ملا معین کے پوتے مولانا حافظ الغنی اس پر جلوہ افروز ہوئے اور ساٹھ برس تک اس مسند پر درس دیتے رہے۔

''ملا فصیح الدین نے ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء میں وفات پائی اور مسجد سنگی کے مشرقی جانب مقبرے میں مدفون ہوئے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

''ملا فصیح الدین کے صاحب زادے ملا صبیح الدین کے نام سلطان عالم گیر کی طرف سے جو فرمان تھا، اس میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ فرمان طویل ہے۔ یہاں اس کا وہ حصہ نقل کیا جاتا ہے، جس میں ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

''دریں وقت میمنت اقتران فرمان والاشان واجب الاذعان صادر شد کہ یک روپیہ یومیہ از خزانہ بلدہ عظیم آباد صوبہ بہار و یک صد و بست بیگہ زمین از پرگنہ پھلواری مضاف صوبہ بہار در مدد معاش بصلائے تدوین فتاویٰ بنام ملا شیخ فصیح الدین مقرر بود۔ الحال بمتعلقانِ ملا مذکور متوف بلا قید اسامی دیدہ و دانستہ حسب الضمن مقرر شد۔''

''یہ فرمان ملا فصیح الدین کے انتقال کے بعد (۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء) ۱۵ر رجب دوشنبہ ۱۱۲۰ھ/ ۱۹ر ستمبر ۱۷۰۸ء کو تجدید کیا گیا تھا۔ ملا فصیح الدین کے نام جو فرمان تھا اس میں بھی ان کی شرکت کا ذکر تھا، مگر وہ ضائع ہو گیا۔''

مولانا فصیح الدین پھلواروی کے بارے میں مولانا سید غلام حسنین شاہ پھلواروی نے بھی ''معارف'' (اعظم گڑھ) میں ایک مختصر سا مضمون تحریر کیا تھا، جو درج ذیل ہے:

''حضرت ملا فصیح الدین جعفری پھلواروی کا جامعین فتاویٰ عالم گیری میں ہونا یہاں کی خاندانی روایات پر مبنی ہے اور یہ روایت تحریر میں آئی تو بہت بعد میں۔ ان کے ہم عصروں میں سے یا ان کے متصل مؤلفین میں سے کسی کا نوشتہ موجود نہیں ہے۔ اس زمانے کا عام مذاق یہ تھا کہ تذکروں میں بزرگوں کے محض کشف و کرامات کا منضبط کر لینا کافی سمجھتے تھے۔ لیکن پھر بھی اہل علم خاندان میں جو روایت مسلسل چلی آ رہی ہو وہ بالکل بے اصل اور غیر وقیع نہیں ہو سکتی۔ اس خاندان کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے روایت کے وزن کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

''اس خاندان کے مورث خواجہ عطاء اللہ عہد ہمایوں و اکبری میں یہاں (پھلواری میں) آ کر مقیم ہوئے۔ خاندانی روایت کے بموجب تو یہ وزرائے شاہی میں سے تھے، لیکن وہاں ان کی کوئی اہم حیثیت ضرور تھی۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''ابوالفضل کے اکبر نامہ میں بضمن وقائع ۹۶۱ھ/۱۵۵۴ء خواجہ عطاء اللہ کا نام بھی ایک جگہ پر مذکور ہے۔ خدا بخش خاں صاحب مرحوم کی لائبریری میں شاہان وزرائے مغلیہ کے ساتھ ایک مرقع امیر عطاء اللہ کا بھی البم کی شکل میں موجود ہے۔ شیر شاہی خاندان کی تباہی کے بعد مغل سلاطین نے رہتاس سے لے کر راج گیر تک پٹنہ کے جنوب میں بہت سے مغل، شیوخ اور راجپوت خاندان مختلف مناصب کے ساتھ آباد کر دیے تھے تاکہ پٹھانوں کو سر اٹھانے کا موقع نہ دیں۔ اسی زمانے میں خواجہ عطاء اللہ بھی دہلی سے یہاں آئے۔ یہ عبداللہ ابن جعفر طیار کی اولاد سے تھے، اسی لیے یہ خاندان جعفری کہلاتا ہے۔ امیر عطاء اللہ نے یہاں سنگ سرخ کی ایک مسجد بنوائی جواب تک پھلواری کی جامع مسجد ہے، جہاں جمعہ و اعیاد کی سب سے بڑی جماعت ابھی تک ہوتی ہے اور خاکسار راقم الحروف کے زیر تولیت ہے۔ اسی مسجد میں ملا فصیح الدین درس و افتا کا مشغلہ رکھتے تھے اور اسی سے متصل ان کا مزار بھی ہے۔ چنانچہ شاہ عالم اول فرزند و جانشین عالم گیر نے از روئے فرمان مجریہ ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء ملا فصیح الدین کے لیے وظیفہ مقرر کیا تھا جو از روئے پروانگی و بمہر ''اخلاص خاں'' ملا صاحب موصوف کے فرزندوں کو ملا تھا۔ اس کی مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ ہو:

''......ملا مذکور شاگرد اخوند ملا عوض وجیہ...... متوطن قصبہ پھلواری سرکار و صوبہ بہار فاضل و متوکل است، نیم روپیہ و بست بیگہ زمین ❶ مدد معاش از سابق دارد بخرچ و فانمی کند امیدوار از تفصیلات ____ و یومیہ مسجد بآں قصبہ بنا کردۂ جد مشار الیہ مقرر است نیم روپیہ یومیہ بدستور اصل و بست بیگہ زمین مزروع اضافہ مرحمت شد و نیم روپیہ یومیہ مسجد دیدہ و دانستہ۔''

''اس فرمان سے ظاہر ہے کہ ملا فصیح الدین پھلواروی شہنشاہ عالم گیر کے ہم عصر تھے اور فاضل متعارف تھے۔ نیز یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ خاندان کئی پشت سے دربارِ شاہی سے متعلق تھا۔ پس فتاویٰ عالم گیری کے جمع کرنے میں انھوں نے بھی کچھ خدمت انجام دی ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، بلکہ ایسا ہونا بہت ہی قرین قیاس ہے۔ تاریخ تو بہت سے خاندانی رواجوں، روایتوں اور انفرادی نوشتوں، دفینوں اور سفینوں کو اکٹھا کر کے بنائی جاتی ہے۔ پھر پھلواری کے ذی علم و مقتدر خاندان کی روایت تاریخ کا ماخذ کیوں نہیں بن سکتی ❷۔

نزہۃ الخواطر اور ''معارف'' کی ان دونوں تحریروں سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا فصیح الدین پھلواروی بارھویں صدی ہجری کے متعارف فقہائے ہند میں سے تھے۔

۱۴۵۔ سید فضل اللہ کالپوی

سید فضل اللہ بن احمد بن محمد بن ابوسعید حسینی ترمذی کالپوی کا شمار علمائے مشاہیر اور فقہائے نام دار میں ہوتا تھا۔ مولد و منشا کالپی ہے۔ ان کے والد سید احمد بن محمد (متوفی ۱۹ر صفر ۱۰۸۴ھ/۲۶ر مئی ۱۶۷۳ء) بھی عالم

❶ یہ لفظ غالباً ''یک روپیہ و یک صد و بست بیگہ زمین'' ہے۔

❷ ماخوذ از معارف، اعظم گڑھ، اپریل ۱۹۴۷ء۔ نیز ملاحظہ ہو، برصغیر میں علم فقہ، ص ۳۳۰ تا ۳۳۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دین تھے۔ لائق بیٹے نے فقہ کی تعلیم باپ سے حاصل کی، اخذ طریقت بھی انہی سے کیا اور والد کی وفات کے بعد مسند مشیخت پر بیٹھے۔ سید فضل اللہ سے بھی خلق کثیر نے فیض حاصل کیا ۱۴ر ذوالقعدہ ۱۱۱۱ھ/ ۲۳ر اپریل ۱۷۰۰ء کو فوت ہوئے ❶۔

۱۴۶۔ شیخ فضل اللہ پرنیوی

شیخ فضل اللہ بن محمد فاضل بن رکن الدین پرنیوی، فضل وصلاح کے پیکر اور اپنے عہد کے عالم وفقیہ تھے۔ علاقہ بنگال کے ایک مقام "پرنیہ" میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ حصول علم کے شوق میں صغر سنی ہی میں جون پور آ گئے تھے، جس کو علم وعلما کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ اکثر درسی کتابیں شیخ محمد ارشد عثمانی جون پوری (متوفی ۲۴ر جمادی الاخریٰ ۱۱۱۳ھ/ ۱۵ر نومبر ۱۷۰۱ء) سے پڑھیں، جو صاحب رشیدیہ شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری (متوفی ۱۹ر رمضان المبارک ۱۰۸۳ھ/ ۲۹ر دسمبر ۱۶۷۲ء) کے فرزند رشید اور اس عہد کے جلیل القدر عالم تھے۔ کچھ کتابوں کے لیے بعض دیگر علما کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اخذ طریقت بھی شیخ محمد ارشد سے کیا اور مشیخت وتصوف کے مرتبہ بلند کو پہنچے۔ تکمیل علم اور حصولِ فیض کے بعد شیخ محمد ارشد نے انھیں وثیقۂ خلافت لکھ کر دیا اور اپنے وطن پرنیہ جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ وطن جا کر شادی کی اور درس وافادہ میں کمربستہ ہو گئے۔ اس اثنا میں ان سے بہت سے علما وطلبا نے استفادہ کیا۔

ارضِ بنگال کے اس عالم وفقیہ کو چہار شنبہ کے روز ۹ر رمضان المبارک ۱۱۸۰ھ/ ۸ر فروری ۱۷۶۷ء کو اپنے شہر پرنیہ میں شہید کیا گیا اور مکان کے قریب ہی دفن کیے گئے۔ منقول ہے کہ ان کی تصانیف بھی تھیں، لیکن اس ہنگامے میں ضائع ہو گئیں ❷۔

۱۴۷۔ مولانا فضل اللہ بہاری

شیخ فضل اللہ بن ابوالفضل بہاری فقہ واصول اور علوم عربیہ کے جید علما میں سے تھے۔ عالم شباب میں بہار سے فرخ آباد چلے گئے تھے۔ بعض کتب درسیہ قاضی محمد مربی حسینی پھانوی سے پڑھیں۔ پھر بعض دیگر بلاد کے سفر کو نکلے اور علامہ محمد حسن بن غلام مصطفیٰ لکھنوی (متوفی ۳ر صفر ۱۱۹۹ھ/ ۱۶ر دسمبر ۱۷۸۴ء) کے درس میں شریک ہوئے اور باقی درسی کتابوں کی تکمیل کی۔ حصولِ علم کے بعد فرخ آباد کا رخ کیا اور شیخ کرامت اللہ واعظ دہلوی کی صاحب زادی سے نکاح کیا۔ نہایت قانع، پاک باز اور متدین عالم تھے۔ شب وروز درس وافادہ میں سرگرم عمل رہتے۔ تاریخ فرخ آباد کے مصنف مفتی ولی اللہ بن احمد علی حسینی کہتے ہیں کہ میں نے ان سے متوسطات

❶ عہد بنگش کی سیاسی، علمی اور سیاسی تاریخ، ص ۲۶۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۲۵۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۲۵ بحوالہ گنج ارشدی۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کتب درسیہ میں سے بعض کتابیں پڑھیں۔

شیخ فضل اللہ بہاری نے ۱۱۸۲ھ/ ۱۷۶۸ء میں فرخ آباد میں انتقال کیا❶۔

۱۴۸۔ سید فیروز جائسی

سید فیروز بن جنید بن عبدالرحمٰن بن کمال بن جلال اشرفی جائسی، شیخ اور فاضل کبیر تھے۔ فقہ واصول اور علوم عربیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ شہر جائس میں مسند درس پر فائز تھے۔ بے شمار لوگوں نے ان سے حصول علم کیا❷۔

۱۴۹۔ خواجہ فیض الحسن سورتی

خواجہ فیض الحسن کا سلسلۂ نسب یہ ہے: فیض الحسن بن نورالحسن بن محمد بن ابوالحسن بن جمال الدین حسینی سورتی، ۱۰۹۸ھ/ ۱۶۸۷ء میں سورت میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ سورت ہی کے علما سے علم حاصل کیا اور بحث و اشتغال میں سرگرم ہوئے، یہاں تک کہ فقہ و اصول میں تمام معاصرین و اقران سے سبقت لے گئے۔ مسائل فقہ میں استحضار کا یہ عالم تھا کہ فتاویٰ نقشبندیہ تصنیف کیا۔ نیز شرح خلاصۃ الکیدانی الموسوم بہ فرخ شاہی تصنیف کی۔ یہ وہ عالم دین ہیں جو فضل و صلاح میں مشہور تھے اور باکمال آدمی تھے۔ ۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۸ء کو سورت میں فوت ہوئے❸۔

ـــــ ق ـــــ

۱۵۰۔ سید قاسم دہلوی

سید قاسم بن ہاشم بن حسن حسینی دہلوی اپنے زمانے کے عالم وفقیہ اور شیخ تھے۔ درحقیقت نارنول سے تعلق رکھتے تھے، لیکن ان کے دادا سید حسن جو علما و شیوخ کے حلقوں میں سید حسن رسول نما کے نام سے معروف تھے، نارنول سے دارالسلطنت دہلی منتقل ہو گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔

سید قاسم فضلا و اعیانِ علمائے ہند میں سے تھے۔ دن رات درس و تدریس میں منہمک رہتے۔ اس سے وقت ملتا تو عبادت اور یادِ الٰہی میں مشغول ہو جاتے۔ فقرا کے لباس میں ملبوس رہتے اور نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا❹۔

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۲۶۔ عہد بنگش کی سیاسی، علمی اور ثقافتی تاریخ، ص ۲۳۴۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۲۷، بحوالہ التحائف الاشرفیہ۔

❸ حدیقۃ احمدیہ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۲۷، ۲۲۸۔

❹ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ۲۲۹، بحوالہ بحر زخار۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۵۱۔مولانا قطب الدین شہید سہالوی

لکھنؤ سے تیس بتیس میل کے فاصلے پر ایک بستی "سہالی" کے نام سے موسوم ہے۔کسی زمانے میں یہ بستی علم و علما کا مرکز اور فضل و کمال کا سرچشمہ کہلاتی تھی۔گزشتہ تین سو سال سے برصغیر کے عربی اور دینی مدارس میں درس نظامی کے نام سے جو طریق تدریس جاری ہے، اس کے مرتب اسی بستی کے ایک عالم دین مولانا نظام الدین انصاری سہالوی تھے اور وہ انہی سرعنوان مولانا قطب الدین شہید سہالوی کے فرزند رشید تھے۔وہ درس نظامیہ کا جو کابل سے لے کر راس کماری تک تمام مدارس عربیہ میں تین صدیوں سے جاری ہے، اس کے بانی اگرچہ مولانا نظام الدین انصاری سہالوی تھے، لیکن ان سے قبل زیر تذکرہ بزرگ اور ان کے والد مولانا قطب الدین شہید سہالوی نے بھی اس کو ایک خاص اندازِ ترتیب بخشا تھا۔

مولانا قطب الدین شہید سہالوی علامہ وقت، معقول و منقول کے ماہر اور بارھویں صدی ہجری میں ہندوستان کے جلیل القدر فرد تھے اور انصاری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

اسلام جب حدودِ عرب سے نکل کر دیگر ممالک میں پھیلنا شروع ہوا تو عرب کے بہت سے خاندان جو ہجرت کر کے ان ممالک میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، ان میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے خاندان کے لوگ بھی شامل تھے۔ان میں سے ایک بزرگ نے ہرات کو اپنا مسکن ٹھہرالیا تھا۔انہی میں سے ایک شخص علاء الدین انصاری نے ہرات سے ہندوستان کا رخ کیا اور اس ملک میں مستقل طور پر مقیم ہو گئے۔ان کا مدفن قصبہ "برناوہ" میں ہے جو دہلی اور متھرا کے راستے میں واقع ہے۔انہی علاء الدین کی نسل سے ایک عالم دین شیخ نظام الدین انصاری ہوئے ہیں، جو لکھنؤ سے تیس بتیس میل کے فاصلے پر واقع ایک گاؤں "سہالی" چلے گئے تھے۔شیخ موصوف مستقل طور سے یہاں رہنے لگے اور درس و تدریس میں سرگرم عمل ہوئے۔بعد میں درس نظامیہ کے نام سے عربی دینی مدارس کے لیے مستقل نصاب مرتب کیا، جو اب تک برصغیر پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے مدارسِ دینیہ میں باقاعدہ پڑھایا جاتا ہے اور اپنے مرتب کے اسم گرامی کی مناسبت سے اسی نام کے ساتھ موسوم ہے۔

اس خاندان کا یہ طغرائے امتیاز ہے کہ دیارِ ہند میں کئی صدیوں سے اس کو سرچشمہ فضل و کمال کی حیثیت حاصل ہے۔شہنشاہ جلال الدین اکبر کے زمانے میں اس خاندان کے ایک بزرگ شیخ حافظ تھے جو علم و عمل کی دنیا میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔مغلیہ حکومت کا یہ ایک زریں کارنامہ تھا کہ پورے ملک میں ہر مقام پر وقائع نویس موجود رہتے تھے، یہ اہم کام بھی ان کے فرائض میں شامل تھا کہ بادشاہ کو یہ اطلاع دیتے رہیں کہ اصحاب علم اور اربابِ کمال کہاں کہاں موجود ہیں اور کیا خدمات انجام دے رہے ہیں۔جوں ہی بادشاہ ان کے مرتبۂ علمی سے آگاہ ہوتا، ان لوگوں کے لیے جاگیریں مقرر ہو جاتیں، جن کی مال گزاری ان کے لیے معاف کر دی جاتی۔شہنشاہ اکبر کو شیخ حافظ کے بارے میں وقائع نویس نے اطلاع دی تو فرمانِ شاہی کے ذریعے ان کی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھی جاگیر مقرر ہوگئی اور مال گزاری معاف کر دی گئی۔ اغصانِ اربعہ کے مصنف ولی اللہ کے بیان کے مطابق بادشاہ نے اس فرمان میں شیخ کے بارے میں نہایت تعظیم کے الفاظ استعمال کیے۔ شیخ حافظ نے جو مدرسہ قائم کیا، اس میں طلبا کے قیام و طعام کا باقاعدہ انتظام تھا اور تمام مصارف کی کفالت خود شیخ موصوف کرتے تھے۔

مولانا قطب الدین شہید چوتھی پشت میں انہی شیخ حافظ کی نسل سے تھے۔ مولانا ممدوح کے والد کا اسم گرامی شیخ عبدالحلیم انصاری اور دادا کا نام نامی عبدالکریم انصاری تھا۔ شیخ عبدالحلیم لاہور کے مدرسے میں مدرس تھے۔ لائق بیٹے نے اسی زمانے میں ان سے علم حاصل کیا۔ وہ صغر سنی ہی میں حصولِ علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنے دور کے جلیل القدر علما سے تحصیل کی اور علوم متعارفہ کے لیے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد صالحیت و طریقت میں بھی مرتبہ کمال کو پہنچے۔ بعد ازاں خود مسند تدریس آراستہ کی اور سرگرم درس و افادہ ہوئے۔ نہایت عابد و زاہد اور متدین عالم دین تھے۔ ان کا معمول تھا کہ دن کو درس دیتے اور شب کو مشغول عبادت ہو جاتے۔ ہفتے میں دو دن سہ شنبہ اور جمعۃ المبارک کو تصنیف و تالیف میں منہمک رہتے۔ ملوک و امرا سے بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ ان کے فضل و کمال کا چرچا بادشاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر تک پہنچا تو اس نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی، لیکن اس درویش صفت عالم نے اپنے اسلاف کی روایات کو ترک کرنا اور گوشۂ عزلت کو چھوڑ کر حکمرانوں کے دربار میں جانا مناسب نہ سمجھا۔

مولانا قطب الدین کا ایک خاص اسلوبِ درس تھا، جو خود انہی کا قائم کردہ تھا۔ وہ ہر فن کی صرف ایک مستند اور جامع کتاب پڑھاتے تھے اور اس سے شاگرد کو اس فن کے تمام مسائل پر عبور حاصل ہو جاتا تھا۔ اس ضمن میں مولانا عبدالاعلیٰ رسالہ قطبیہ میں لکھتے ہیں:

مولانائے شہید از ہر فن یک یک کتاب می خوانیدند، شاگردان محقق می شدند۔

یعنی مولانا قطب الدین ہر فن کی ایک ایک کتاب اس طریقے سے پڑھاتے تھے کہ شاگرد محقق کے مرتبے پر پہنچ جاتے۔

شہادت:

مولانا قطب الدین سہالوی کو درجہ شہادت نصیب ہوا تھا، اس لیے لفظ ''شہید'' ان کے نام کے ساتھ اس طرح التزام سے لکھا جاتا ہے کہ یہ لفظ گویا ان کے نام کا جز ہو گیا ہے۔ شہادت کی جو تفصیلات ان کے سوانح نگاروں نے لکھی ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

سہالی میں دو خاندان آباد تھے، ایک عثمانی خاندان اور دوسرا انصاری خاندان، جو مولانا قطب الدین کا خاندان تھا۔ سہالی کے گرد و نواح میں خان زادے مقیم تھے۔ ان کا سہالی کے ایک شخص محمد آصف چودھری سے جو انصاری خاندان سے تعلق رکھتے تھے، زمین کی سرحدوں کے سلسلے میں ہمیشہ جھگڑا رہتا تھا۔ محمد آصف وہاں کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ممتاز زمیندار اور مولانا قطب الدین کے سسر تھے۔ اس تعلق کی بنا پر خان زادوں کو مولانا ممدوح سے بھی عداوت ہوگئی تھی، لیکن مولانا کو چوں کہ سلطان اورنگ زیب کے دربار میں بے حد عزت و تکریم حاصل تھی، لہٰذا یہ لوگ انھیں کچھ کہنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ سوئے اتفاق سے سہالی میں عثمانی خاندان کے جو لوگ آباد تھے، ان کے اور محمد آصف انصاری کے مابین موضع بلرن کی آب پاشی کے بارے میں نزاع پیدا ہوگیا۔ اس قسم کے نزاع باشندگانِ دیہات کے لیے نہایت خطرناک نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔ یہاں بھی بالآخر یہی صورت حال سامنے آئی اور فریقین کی طرف سے شدومد کے ساتھ تیاریاں ہونے لگیں۔ لیکن مولانا قطب الدین بیچ میں پڑے اور دونوں طرف کے لوگ واپس چلے گئے۔

یہ بالکل عارضی سی بات تھی۔ اس کے بعد حالات ایسے پیدا ہوئے کہ موقع پا کر سہالی کے نواح میں رہنے والے خان زادوں نے سہالی پر پھر چڑھائی کر دی اور کئی سو آدمی گاؤں میں گھس آئے۔ انھوں نے انصاریوں کے خلاف عثمانی خاندان کے لوگوں کو خوب بھڑکایا اور کہا کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں، تم محمد آصف پر حملہ کر دو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب نے مل کر محمد آصف کے مکان پر ہلہ بول دیا۔ ایک روایت کے مطابق وہ اس وقت ایک تقریب کے سلسلے میں اپنے داماد مولانا قطب الدین کے گھر گئے تھے۔ سنگ دل حملہ آوروں نے مولانا کے مکان پر یلغار کر دی اور ان کا محاصرہ کر لیا۔ دیواروں میں نقب لگائی اور اندر گھس گئے۔ پھر تیروں، بندوقوں اور تلواروں کے اس طرح مسلسل وار کیے کہ مولانا موصوف جام شہادت نوش کر گئے۔

یہ واقعہ دوشنبہ کے روز ماہ رجب ۱۱۰۳ھ/ مارچ ۱۶۹۲ء میں پیش آیا۔ اس وقت ان کی عمر تریسٹھ سال کی تھی۔

مولانا کے ساتھ چند طلبا بھی جو اس وقت مشغولِ درس تھے، شہید کر دیے گئے۔ ستم گروں نے اس خوں ریزی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے گھر کا مال و اسباب بھی لوٹ لیا اور ان کا کتب خانہ بھی جو اس زمانے میں سیکڑوں کتابوں پر مشتمل تھا، جلا کر برباد کر دیا۔ مولانا کی لاش اور محمد آصف کا سر ساتھ لے گئے۔ تین چار دن کے بعد مولانا کے دونوں ہاتھ کاٹ کر اپنے پاس رکھ لیے اور لاش سہالی بھیج دی۔ چنانچہ ۲۷/ رجب ۱۱۰۳ھ/۴/ اپریل ۱۶۹۲ء کو نماز جنازہ پڑھ کر تجہیز و تکفین کی گئی۔

بعض تذکروں میں اس طرح مرقوم ہے کہ مخالفین نے پہلے چودھری محمد آصف کے مکان پر حملہ کیا۔ وہ مولانا کے پاس اعانت و مشورت کے لیے آئے تھے، مخالفوں نے تعاقب کیا اور ان کے ساتھ مولانا کو بھی شہید کر دیا۔

ایک روایت یہ ہے کہ شیخ قطب الدین کے دادا محترم نے عثمانی خاندان کے ایک غریب آدمی کو اپنی زمین میں جگہ دی۔ پھر آہستہ آہستہ ایک وقت آیا کہ اس شخص کی اولاد مال دار ہوگئی اور سہالی کے نواح میں کئی دیہات ان کی ملکیت میں آ گئے۔ بعد میں دونوں فریقوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا، جس کے نتیجے میں مولانا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قطب الدین ان کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ ان کا مکان نذرِ آتش اور کتب خانہ تباہ کر دیا گیا اور ان کے بیٹے نظام الدین کو، جو آگے چل کر درسِ نظامیہ کے بانی بنے اور اس وقت صرف چودہ سال کی عمر کے تھے، گرفتار کر لیا گیا۔

جب یہ واقعہ پیش آیا، اس وقت مولانا قطب الدین کے تین صاحب زادے موجود تھے۔ ایک محمد رضا، دوسرے نظام الدین، تیسرے محمد سعید۔ یہ اس جھگڑے میں زخمی ہو گئے تھے اور باپ کی شہادت کی اطلاع دینے کے لیے شہنشاہ اورنگ عالم گیر کے پاس گئے تھے جو اس زمانے میں علاقہ دکن میں تھا۔

مولانا موصوف کے ان صاحب زادوں نے باپ کی شہادت کے بعد بادشاہ کی خدمت میں ایک محضر لکھا، جس میں واقعہ کی پوری تفصیل بیان کی۔ اس پر سب مشہور علما، رؤسا اور عمالِ شاہی کے دستخط ثبت ہیں۔ اس محضر میں تمام واقعات اور قاتلوں کے نام درج ہیں۔ یہ محضر نہایت درد انگیز اور الم ناک ہے۔ چوں کہ یہ ایک بہت بڑی تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے، لہٰذا بعینہٖ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بحکم آیۂ کریمہ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ۔ سوال می کنم و گواہی می خواہم با جماعت ستم رسیدگان محمد سعید و نظام الدین و محمد رضا پسران مولوی قطب الدین ساکن قصبہ سہالی سرکار لکھنؤ صوبہ اودھ از قضاۃِ اسلام و مشائخ کرام و جمہورِ انام بر ایں معنی کہ بر اصاغر و اکابر ایں دیار روشن و ہویدا است کہ مولوی مذکور موصوف بکمالات انسانیہ و فضائل علمیہ و عملیہ و حافظ قرآن مجید بودند، و غیر اشغال تدریس و تکرار باطلبۂ علوم دینیہ و عبادت و طاعت کارے نداشتند، و در اوقات فراغ از درس و عبادت بہ تصنیف در علم تفسیر و حدیث و فقہ و اصول می پرداختند، بتاریخ رجب المرجب سن ۱۱۰۳ھ/ مارچ ۱۶۹۲ء مطابق روز دوشنبہ بر عادتِ قدیمہ از نمازِ فجر و وظائف فراغ اندوختہ در مدرسہ آمدہ، بدرس جمیع از فضلائے حاضر الخدمت مشغول شدند، چوں دو گھڑی روز برآمد، اسد اللہ و باقر و پیر محمد سکنہ روضہ عملۂ پرگنہ سہالی، و نور و غلام محی الدین بساون، و ساون ساکنان قصبہ سہالی و فقیر اللہ متوطن قصبہ دیوا، و انور ساکن استی معمولہ پرگنہ بجنور وغیرہ زمینداران گرد و پیش خانہ مولوی را محاصرہ نمودند و از ہر چہار طرف دیوار نقبہا زدہ اندرون در آمدند و مولوی را ایک زخم تیر و یک زخم تفنگ و ہفت ضرب شمشیر براور سانیدہ، شہید ساختند، و شیخ غلام محمد نبیرۂ زبدۃ الاولاد بندگی شیخ نظام الدین ساکن امیٹھی و دیگر شیخ شرف اللہ ساکن سندیلہ کہ بخواندنِ فاتحۃ الفراغ در خدمت بودند نیز از دست ظلمۂ مذکورین شہید شدند۔ و محمد آصف چودھری پرگنہ سہالی کہ برائے مدد مولوی رسیدہ، با ہمراہیانِ خود شہید شدند۔ بندہ محمد سعید و جمعے از طلبا و شیخ فضل اللہ برادر نائب قاضی عبد اللہ قاضی پرگنہ سہالی وغیرہ زخمی شدند۔

پس از آنکہ جملۂ مذکورین از قتل و نکارح فرغ شدند، بہ نہب اموال و امتعہ کہ در حویلی بود پرداختند، چنانچہ اثرے از اں نگذاشتند۔ و کتب مولوی وغیرہ از مردم کہ قریب آں مجتمع بود اکثرے از اں آتش دادہ سوختند، در آں میان مصحف مجید چہار جلد و مشکوٰۃ وغیرہ از کتب احادیث و مصنفات مولوی حاشیہ تلویح، شرح عقائد نسفیہ و

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعریفات بزدوی و حاشیہ مطول وغیرہ کتب کثیر الحجم مشتمل پر فوائد جمیلہ بودند، ہمہ سوختہ شد و ہمہ را بردند۔ با مستورانِ مولوی و برادران بانواع ہتک حرمت پیش آمدند۔ بعد ازاں بر خانہ شیخ حسام الدین عم زادِ حقیقی مولوی وغیرہ برادران و مردم غربا سکنہ قصبہ سہالی بر ریختند، مال و متاع ہر چہ بود بغارت بردند۔

چوں وقت دو پہر از کار ہائے مسطور فارغ شدند و مراجعت بمسکن خود کہ موضع پنیتی پور معمولہ پرگنہ فتح پور و دیوا وغیرہ باشد نمودند، بندہ نظام الدین پسر خرد مولوی را اسیر کردہ ہمراہ گرفتند، و نعش مولوی و سر محمد آصف چودھری نیز با خود بموضع مذکور بروند۔ بعد از سہ چہار روز از الحاح و عجز بعضے شرفائے فتح پور و دیوا بندہ نظام الدین را خلاص نمودند، و سر محمد آصف دادند و نعش مولوی را جا بجا مدفون می کردند و می برآوردند۔ آخر بعد نہ روز ہر دو دست بریدہ گرفتند و نعش بہ قصبہ سہالی فرستادند۔ چنانچہ جمع از مسلمین نماز جنازہ خواندہ بتاریخ بست و ہفتم شہر مذکور در قصبہ سہالی مدفون ساختند ❶۔

فارسی زبان کی اس عبارت کا ترجمہ یہ ہے:

ہم مظلومین محمد سعید، نظام الدین اور محمد رضا پسرانِ مولانا قطب الدین ساکن قصبہ سہالی سرکار لکھنؤ صوبہ اودھ پر جو ستم ڈھایا گیا ہے، اس کے متعلق ہم آیت مبارکہ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ❷ کی رو سے قضاتِ اسلام، مشائخ کرام اور تمام لوگوں سے سوال کرتے ہیں اور گواہی طلب کرتے ہیں کہ اس نواح کے تمام چھوٹے بڑوں پر یہ بات روشن اور واضح ہے کہ مولانا قطب الدین کمالاتِ انسانی اور فضائل علمی و عملی سے متصف تھے۔ وہ قرآنِ مجید کے حافظ تھے اور درس و تدریس، طلبا سے علوم دینیہ کے مباحث و تکرار اور عبادت و اطاعت الٰہی کے سوا کسی کام سے کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ ان کا یہ معمول تھا کہ درس و عبادت سے فارغ اوقات میں علم تفسیر و حدیث اور فقہ و اصول پر مشتمل کتابوں کی تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے۔ دوشنبہ کے روز ماہ رجب ۱۱۰۳ھ/ مارچ ۱۶۹۲ء کی ایک تاریخ کو نمازِ فجر اور وظائف سے فارغ ہو کر اپنے معمول کے مطابق مدرسے میں تشریف لائے اور ان تمام فضلائے کرام کو جو حاضر خدمت تھے، درس دینے لگے۔ ابھی دو گھڑی سورج چڑھا کہ سہالی کی نواحی بستی کے اسد اللہ، باقر اور پیر محمد، قصبہ سہالی کے نور، غلام محی الدین، بساون اور ساون، قصبہ دیوا کا فقیر اللہ، موضع استی علاقہ بجنور کے انور وغیرہ اور گرد و پیش کے دوسرے زمینداروں نے مولانا کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور چاروں طرف سے دیواروں میں نقب لگا کر اندر گھس آئے۔ مولانا کو ایک زخم تیر کا، ایک بندوق کا لگایا اور سات وار تلوار کے کیے، جس سے وہ شہید ہو گئے۔ شیخ نظام الدین ساکن امیٹھی کے نبیرۂ گرامی شیخ غلام محمد اور شیخ شرف اللہ ساکن سندیلہ بھی جو فاتحہ فراغت کے لیے مولانا کی

❶ منقول از مقالات شبلی، ج ۳، ص ۱۱۰، ۱۱۱۔

❷ یہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۸۳ کے چند مبارک الفاظ ہیں، جن کا ترجمہ یہ ہے کہ شہادت کو مت چھپاؤ، جو اسے چھپاتا ہے، اس کا دل گناہ گار ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خدمت میں حاضر تھے، ظالموں کے دست تظلم سے جام شہادت نوش کر گئے۔ محمد آصف چودھری بھی جو مولانا کی مدد کو آئے، اپنے ساتھیوں سمیت شہید کر دیے گئے۔ مجھ محمد سعید اور تمام طلبا اور شیخ فضل اللہ کو جو سہالی کے نائب قاضی، قاضی عبداللہ کے بھائی تھے اور دیگر لوگوں کو زخمی کر دیا۔

ان مذکورہ بالا لوگوں کو قتل اور زخمی کرنے کے بعد حویلی پر دھاوا بول دیا اور تمام سامان لوٹ لیا۔ کوئی چیز بھی باقی نہ چھوڑی۔ مولانا کی اور ان دیگر لوگوں کی کتابیں، جو ان کے پاس رہتے تھے، سب نذرِ آتش کر دیں۔ ان میں سے چار قرآنِ مجید اور کتب حدیث میں سے مشکوٰۃ وغیرہ پر مشتمل جو ذخیرۂ احادیث موجود تھا، سب جلا کر خاکستر کر دیا۔ خود مولانا کی تصانیف مثلاً حاشیہ تلویح، شرح عقائد نسفی، تعریفات بزدوی اور حاشیہ مطول وغیرہ سب کتابیں جو بڑی ضخیم تھیں اور بہترین فوائد و مضامین پر مشتمل تھیں، ایک ایک کر کے آگ میں جلا ڈالیں یا لوٹ لیں اور ضائع کر دیں۔ مولانا کے گھر کی خواتین اور اقارب کی بھی بہت توہین کی اور ان سے نہایت ہتک آمیز سلوک روا رکھا۔

اس کے بعد مولانا کے چچا زاد بھائی شیخ حسام الدین اور دوسرے عزیزوں کے گھروں کا رخ کیا۔ وہاں بھی جی بھر کر لوٹ مار کی۔ اس سے بھی صبر نہ آیا تو قصبہ سہالی کے دیگر غربا کو تختۂ مشق ستم بنایا، ان کا مال و متاع لوٹ لیا اور جو چیز نظر آئی غارت کر دی۔

جب یہ لوگ دوپہر کے وقت اس قتل و غارت سے فارغ ہوئے تو اپنے مسکن موضع پینتی پور، جو کہ پرگنہ فتح پور اور دریوا کے نواح میں واقع ہے، جاتے ہوئے مجھ نظام الدین کو جو مولانا قطب الدین کا ایک خرد سالہ بیٹا ہے، گرفتار کر کے اور مولانا کی نعش نیز محمد آصف چودھری کا سر تن سے جدا کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ تین چار روز کے بعد فتح پور اور دریوا کے بعض شرفا و نجبا کی منت و عاجزی سے مجھ نظام الدین کو رہا کیا اور محمد آصف کا سر واپس لٹایا۔ مولانا کی نعش کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ اسے جگہ جگہ دفن کرتے اور نکالتے رہے۔ بالآخر نو دن کے بعد ان کے دونوں ہاتھ کاٹ کر رکھ لیے اور نعش سہالی بھیج دی، جہاں تمام مسلمانوں نے ان کی نماز جنازہ پڑھی اور ۲۷ رجب ۱۱۰۳ھ/۴ اپریل ۱۶۹۲ء کو انھیں سہالی میں دفن کیا گیا۔

مولانا سے عداوت اور قتل کی وجہ:

تذکرہ نگاروں نے مولانا قطب الدین کی مخالفت اور قتل کی کوئی معقول وجہ بیان نہیں کی اور اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ یہ گروہ یکایک مولانا سے کیوں عداوت پر اتر آیا تھا۔ چودھری محمد آصف سے تو دشمنی اور مخالفت کی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے، لیکن مولانا قطب الدین کی حیثیت تو بالکل دوسری تھی۔ وہ ایک درویش منش اور گوشہ گیر آدمی تھے، ان سے آخر کیوں اس قدر عداوت ہوئی کہ معاملہ بے حد سنگین نوعیت اختیار کر گیا اور انھیں نہایت سفاکی اور بے دردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولوی ولی اللہ فرنگی محلی لکھنوی نے عمدۃ الوسائل میں جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قاتلوں کا یہ گروہ نہایت ظالم تھا اور یہ لوگ اپنے حلقۂ زمینداری میں اپنے ماتحتوں پر انتہائی ظلم ڈھاتے اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آتے تھے۔ ادھر مولانا قطب الدین بہت بڑے عالم، نہایت متقی اور متدین بزرگ تھے۔ ان کے ان اوصاف کی وجہ سے بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر بھی ان کا بہت احترام کرتا اور ان سے ربط و تعلق رکھتا تھا۔ وہ دربار کے امرا اور حکومت کے ذمہ دار اہل کاروں کو اکثر ان کی خدمت میں بھیجتا رہتا تھا۔ اس وجہ سے دوسرے فریق کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ ہمارے مظالم کی تفصیلات کہیں بادشاہ تک نہ پہنچ جائیں۔ چنانچہ انھوں نے اس خطرے کا سد باب ضروری سمجھا اور اپنی ستم رانیوں کو چھپانے کے لیے ان میں ایک زبردست ستم کا اضافہ کیا۔

بادشاہ کا فرمان اور قاتلوں کا انجام:

مولانا قطب الدین کے بیٹے محمد سعید مذکورہ بالا محضر لے کر اورنگ زیب عالم گیر کے پاس دکن پہنچے۔ بادشاہ کو مولانا کے قتل اور اس کی تفصیلات کا علم ہوا تو انتہائی افسوس کا اظہار کیا اور لکھنؤ کے عمال حکومت کے نام فرمان بھیجا کہ قاتلوں سے قصاص لیا جائے اور ان کا غرور و پندار خاک میں ملا دیا جائے۔ صوبے دار لکھنؤ نے فرمانِ شاہی دیکھتے ہی سرکاری سپاہی روانہ کیے، جنھوں نے قاتلوں کا گھر بار غارت کر دیا اور مخالفین مارے ڈر کے بھاگ کر وطن سے کہیں دور چلے گئے۔ آخر قاتلوں کے اہل خانہ اور اعزہ و اقارب نے یہ جعلی وفات نامہ تیار کر کے بادشاہ کے دربار میں پیش کیا کہ قاتل اپنی موت مر گئے ہیں۔ اصل قاتل کا نام اسد اللہ تھا جو سہالی کے نواحی گاؤں پینتی پور کا رہنے والا تھا۔ وہ روپوش ہو کر قصاص سے بچ گیا تھا اور کئی سال تک زندہ رہا۔ رسالہ قطبیہ کی روایت کے مطابق وہ شخص عام طور پر مولانا قطب الدین شہید کے فرزند شیخ نظام الدین کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ اس نے شیخ کی خدمت میں خون بہا کی پیش کش کی، لیکن انھوں نے قبول کرنے سے انکار کیا، بلکہ اپنا حصہ معاف ہی فرما دیا۔ وہ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، لیکن اس کے آنے سے انھیں تکلیف ہوتی تھی اور وہ اس کی طرف سے منہ پھیر لیتے تھے۔

عمدۃ الوسائل میں مولوی ولی اللہ فرنگی محلی بیان کرتے ہیں کہ میں ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۵ء میں پینتی پور گیا اور گاؤں کی حالت دیکھی تو ویران اور تباہ ہو چکا تھا، گاؤں والے کہتے تھے کہ یہ اسی خون ناحق کا نتیجہ ہے۔

بادشاہ کی طرف سے مکان کا عطیہ:

بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر نے ایک فرمان کے ذریعے مولانا قطب الدین کے صاحب زادوں کو لکھنؤ میں دو مکان عطیہ کیے۔ (جنھیں فرنگی محلی کہا جاتا ہے) اس شاہی فرمان کے جو اس خاندان میں موجود ہے، کچھ حصے درج ذیل ہیں:

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دریں وقت میمنت اقتران فرمان والا شان واجب الاذعان صادر شد کہ یک منزل حویلی فرنگی محل بامتعلقہ آں واقع بلدۂ لکھنؤ مضاف بہ اودھ کہ از امکنۂ نزولی است برائے بودن شیخ محمد اسعد و محمد سعید پسران ملا قطب الدین شہید حسب الضمن مقرر فرمودیم، باید کہ حکام و عمال و مصدیان مہمات حال و استقبال و جاگیرداران وکروریان آں رابنام مشار الیہما معاف ومرفوع القلم دانستہ بوجہ من الوجوہ مزاحم ومعترض نہ شوند، و اندریں باب شد مجدد نہ طلبہ ــــــ مرقوم غرہ ذی قعدہ سال سی وہفتم جلوس والا نوشتہ شد۔

فرمان کی پشت پر جو عبارت درج ہے، اس کا پہلا فقرہ یہ ہے:

شرح یادداشت واقع بتاریخ روز پنجشنبہ ۱۴ر شعبان المعظم سن ۳۷ جلوس والا موافق ۱۱۰۵ھ مطابق مرداد ماہ برسالہ صدارت ومشیخت پناہ، فضیلت وکمالات دست گاہ سزاوار مرحمت واحسان، صدر رفیع القدر فاضل خاں ونوبت واقعہ نویسی کم ترین بندگانِ درگاہِ خلائق پناہ حسام الدین حسین قلمی می گردد کہ بعرض مقدس ومعلیٰ رسید کہ شیخ محمد اسعد و محمد سعید پسران ملا قطب الدین شہید ساکن قصبہ سہالی بسبب شہادتِ پدرِ خود قصبہ مذکور را گزاشتہ جلاوطن گردیدند کدام مکان یا سکونت ندارند ــــــ

مولانا قطب الدین کی شہادت ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۲ء میں ہوئی تھی، اور فرمانِ شاہی کی تاریخ تحریر شعبان ۱۱۰۵ھ/۱۶۹۴ء ہے۔ عالم گیر اس زمانے میں دکن میں تھا، اس لیے شیخ محمد سعید کو وہاں پہنچنے اور فرمان جاری ہوتے دو برس کا عرصہ گزرا۔ اس فرمانِ شاہی کے بعد مولانا قطب الدین شہید کا تمام خاندان سہالی سے لکھنؤ منتقل ہوگیا۔ یہ خاندان فرنگی محل میں مقیم ہوا، جو علم وعمل کا مرکز بن گیا۔

فرنگی محل کی وجہ تسمیہ:

فرنگی محل کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ فرانس کا ایک سوداگر اس محلے میں تجارت کی غرض سے فروکش تھا۔ اس کے فرنگی ہونے کی وجہ سے اس محلے یا اس کے مکانات کو فرنگی محل کہا جاتا تھا۔ وہ وطن واپس چلا گیا تو اس کے مکانات سرکاری قبضے میں آگئے۔ بعد ازاں علما کا جو خاندان اس میں آباد ہوا، اس نے فرنگی محلی کی نسبت سے شہرت پائی اور پھر یہ علاقہ علوم وفنون کا گہوارہ اور ایک خاص نقطۂ فکر کی علامت بن گیا۔

تصانیف:

مولانا قطب الدین شہید سہالوی اپنے زمانے کے مصنف بھی تھے۔ انھوں نے ہفتے کے سات دنوں کو مختلف علمی کاموں کے لیے تقسیم کر رکھا تھا۔ جمعہ اور منگل کے دن وہ تصنیف وتالیف میں مصروف رہتے تھے۔ کئی کتابیں ان کی تصانیف تھیں جو ان پر حملے کے وقت مخالفین نے ضائع کر دی تھیں۔ ان کی تصانیف کا ذکر گزشتہ صفحات میں ان کے حالات کے ضمن میں آچکا ہے اور وہ یہ تھیں:

الامور العامہ پر حاشیہ، التلویح پر حاشیہ، شرح حکمت العین پر حاشیہ، شرح العقائد العضدیہ پر حاشیہ، شرح العقائد النسفیہ پر حاشیہ، مطول پر حاشیہ اور ایک رسالہ تحقیق دار الحرب۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا کے بیٹے:

مولانا قطب الدین شہید انصاری سہالوی کے چار بیٹے تھے۔ شیخ محمد اسعد، شیخ محمد سعید، شیخ نظام الدین اور شیخ محمد رضا____ شیخ محمد اسعد عمر میں سب سے بڑے اور علم میں ممتاز تھے۔ اپنے فضل و کمال کی وجہ سے باپ کی زندگی ہی میں برہان پور کے منصب صدارت پر فائز ہوئے۔ بادشاہ اورنگ زیب کے دربار سے تعلق رکھتے اور اس کے ہم رکاب رہتے تھے۔ رئیسانہ مزاج کے مالک تھے۔ حاشیہ قدیمہ پر حاشیہ تحریر کیا اور ایک مناظرے میں ملا جیون امیٹھوی پر فتح پائی۔ شاہ عالم کے زمانے میں فوت ہوئے۔ باپ کی شہادت کے وقت سہالی میں موجود نہ تھے۔

ملا قطب الدین کے دوسرے صاحب زادے شیخ محمد سعید تھے، جو باپ کی شہادت کے وقت سہالی میں موجود تھے۔ حملے کے وقت زخمی ہو گئے تھے اور دشمن انھیں قیدی بنا کر ساتھ لے گئے تھے۔ صحت یاب ہوئے تو بادشاہ کی خدمت میں محضر پیش کرنے اور اپنی مظلومیت کی تفصیل بتانے دکن گئے اور لکھنؤ میں اقامت کے لیے فرنگی محلی کے حصول اور معافی کا فرمان لائے۔ علم فقہ پر عبور کی وجہ سے فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین میں شامل ہوئے۔ عین عالم جوانی میں شاہ عالم کے عہد میں وفات پائی۔

مولانا کے تیسرے بیٹے شیخ نظام الدین تھے۔ باپ کی شہادت کے وقت چودہ پندرہ سال کی عمر تھی۔ بڑے بھائی محمد سعید کے ساتھ سہالی سے لکھنؤ چلے گئے تھے اور خاندان کے دیگر افراد کی معیت میں فرنگی محل میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ برصغیر کے جلیل القدر عالم، معقولات و منقولات کے ماہر اور نہایت ذہین تھے۔ برصغیر پاک و ہند کے دینی عربی مدارس میں تین سو سال سے درس نظامی کے نام سے جس نصاب تعلیم کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے، اس کے مرتب و مصنف یہی فاضل گرامی قدر تھے اور انہی کے نام کی نسبت سے اسے درسِ نظامی کہا جاتا ہے۔ ۸ر جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ/ ۲۵ر اپریل ۱۷۴۸ء کو سفر آخرت اختیار کیا۔

چوتھے لڑکے محمد رضا تھے جو سب سے چھوٹے تھے اور باپ کی شہادت کے وقت ان کی عمر صرف بارہ سال کی تھی۔ علوم متداولہ بڑے بھائی نظام الدین سے پڑھے اور غالباً انہی کی زندگی میں انتقال کر گئے تھے۔ درس و افادہ میں سرگرم رہتے تھے۔

مولانا قطب الدین کے حالات کے ضمن میں ان کے صاحب زادوں کا یہ مختصر سا تعارف ہے۔ ان کے جو حالات ہمیں میسر آسکے، ان شاء اللہ فقہائے ہند کی اگلی جلد میں اپنے اصل مقام پر حروفِ تہجی کی ترتیب سے بیان ہوں گے [1]۔

---

[1] مولانا قطب الدین کے حالات کے لیے ملاحظہ کیجیے: مآثر الکرام، ص ۱۹۸، ۱۹۹۔ سبحۃ المرجان، ص ۷۶۔ رسالہ قطبیہ۔ اغصانِ اربعہ۔ عمدۃ الوسائل۔ اغصان الانساب۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل، ص ۱۰ تا ۱۹۔ ابجد العلوم، ص ۹۰۴، ۹۰۵۔ احوال علمائے فرنگی محل، ص ۱ تا ۱۱۔ مقالاتِ شبلی، ج ۳، ص ۱۰۶ تا ۱۱۴۔ آثار الاول۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۶۷ تا ۱۶۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۳۰، ۲۳۱۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۲۹۔ برصغیر میں علم فقہ، ص ۳۱۸ تا ۳۳۱۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۵۲۔ سید قطب الدین شمس آبادی

سید قطب الدین حسینی شمس آبادی، درحقیقت امیٹھی کے سادات میں سے تھے۔ بعد میں شمس آباد منتقل ہو گئے تھے، جو اعمال قنوج میں واقع ہے، لہٰذا شمس آبادی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ اپنے دور کی عظیم شخصیت تھے اور ہندوستان کے فحول واکابر علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ تمام عمر درس وافادہ میں مصروف رہے اور بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ زمانۂ طالب علمی میں مولانا قطب الدین شہید سہالوی کے ہم درس تھے، لیکن مولانا قطب الدین ان سے پہلے فارغ التحصیل ہو گئے تھے اور خود اپنی مسند تدریس آراستہ کر لی تھی۔ اس زمانے میں یہ بھی مولانا قطب الدین کی خدمت میں گئے اور بقیہ کتب درسیہ کے لیے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔

نہایت قانع، بے نیاز، متوکل علی اللہ اور پاک باز عالم دین تھے۔ بڑی عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے، کئی کئی دن چولہے میں آگ نہ جلتی اور کوئی چیز کھانے کو میسر نہ آتی، لیکن نہ کسی سے اپنی ضرورت کا اظہار کرتے اور نہ حرف شکایت زبان پر لاتے۔ اسی حالت میں مصروف تدریس اور افادۂ طلبا میں سرگرم رہتے۔ طلبا اور مستفیدین سے خندہ پیشانی سے ملتے اور مسرت آمیز لہجے میں ان سے باتیں کرتے۔ کتب درسیہ کے مشکل اور پیچیدہ مسائل طلبا کی ذہنی اور علمی قابلیت کے مطابق انتہائی آسان الفاظ میں حل کر دیتے۔ علوم متداولہ پر گہری نظر تھی اور ہر آن طالبانِ علم کا ہجوم ان کے گرد وپیش رہتا۔

تذکرہ نگاروں کے بقول ان کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے، جن میں قاضی محبّ اللہ بہاری (متوفی ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء) حافظ امان اللہ بنارسی (متوفی ۱۱۳۳ھ/ ۱۷۲۱ء) اور سید طفیل محمد اترولوی بلگرامی (متوفی ۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۸ء) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں اور یہ وہ حضرات علما ہیں، جنھوں نے اس برصغیر میں اپنے علم وفضل اور تحقیق وکاوش کے میدان میں نہایت شہرت حاصل کی اور خلق کثیر کو مستفید فرمایا۔

سید قطب الدین شمس آبادی نے ۱۱۲۱ھ/ ۱۷۰۹ء میں ستر سال کی عمر پا کر وفات پائی [1]۔

۱۵۳۔ سید قطب الدین اورنگ آبادی

سید قطب الدین بن سعد اللہ حسینی بہاری ثم اورنگ آبادی، ۱۹ ربیع الثانی ۱۱۲۰ھ/ ۲۵ اگست ۱۷۰۸ء کو اورنگ آباد میں پیدا ہوئے، عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو حصولِ علم کا آغاز کیا۔ بعض کتابیں حافظ اسماعیل سے اور بعض مولانا حبیب اللہ سے پڑھیں۔ فنونِ ریاضی کی تحصیل حاجی حسام الدین سے کی اور مدت تک ان حضرات سے وابستہ رہے، یہاں تک کہ اصول وفروع میں مرتبۂ کمال کو پہنچے اور تمام علومِ مروجہ اور فنون متداولہ

[1] رسالہ قطبیہ۔ مآثر الکرام، ص ۲۰۰۔ سبحۃ المرجان، ص ۶۔ ابجد العلوم، ص ۹۰۵۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۴۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۶۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۳۱، ۲۳۲۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں نامور ہوئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے والد مکرم سید سعد اللہ حسینی کی جگہ مسند مشیخت کو زینت بخشی۔ سید صاحب موصوف بہت سے اوصاف سے متصف تھے۔ معقولات و منقولات میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور ہمیشہ درس و افادہ میں سرگرم رہتے۔ ۱۹ر جمادی الاولیٰ ۱۱۶۹ھ/ ۲۰ر فروری ۱۷۵۶ء کو فوت ہوئے ❶۔

۱۵۴۔ شیخ قطب الدین سرہندی

شیخ قطب الدین حنفی نقشبندی سرہندی، حدیث اور فقہ کے جلیل القدر عالم تھے۔ شیخ محمد زبیر سرہندی سے اخذ طریقت کیا اور مدت مدید تک ان کی صحبت میں رہے۔ ۱۱۷۳ھ/ ۱۷۶۰ء میں حرمین شریفین گئے اور حج و زیارت سے بہرہ مند ہوئے اور وہیں وفات پائی۔ اذکار و اشغال سے متعلق ''وہب الزبیر'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی ❷۔

۱۵۵۔ مولانا قطب الدین عباسی الہ آبادی

مولانا قطب الدین عباسی الہ آبادی، برصغیر کے رفیع المنزلت عالم اور مشہور مصنف حضرت مولانا محمد فاخر زائر عباسی الہ آبادی کے فرزند رشید تھے اور اپنے دور کے عظیم فضلا اور جید علما میں سے تھے۔ ابتدائے محرم ۱۱۳۸ھ/ ستمبر ۱۷۲۵ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں حصول علم میں مشغول ہو گئے۔ فلسفہ و منطق کی کتابیں شیخ برکت اللہ الہ آبادی سے پڑھیں۔ شیخ کمال الدین فتح پوری (متوفی ۱۴ر محرم ۱۱۷۵ھ/ ۱۵ر اگست ۱۷۶۱ء) کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ان کے والد گرامی قدر شیخ محمد فاخر حج کو گئے تو یہ لائق فرزند ان کی مسند رشد و ہدایت پر متمکن ہوئے۔ طویل عرصے تک نہایت عمدہ اسلوب اور کتاب و سنت کے مطابق یہ فرائض انجام دیتے رہے۔ صلاح و خیر، قناعت و ایثار اور عفت و تقویٰ کے اوصاف سے موصوف تھے۔

مولانا ممدوح بارھویں صدی ہجری میں دیار ہند کے عالم کبیر اور فقہ و اصول اور منطق و حکمت کے نامور فاضل تھے۔ شاعر بھی تھے اور فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، مصیب تخلص کرتے تھے۔ دونوں زبانوں میں ان کے مستقل دیوان بھی ہیں۔

دارالحرب کے مسئلے سے متعلق ایک رسالہ تصنیف کیا۔ علم منطق میں بھی ایک رسالہ لکھا۔ ان کا ایک ایسا مجموعہ کلام بھی ہے، جو ہم وزن مختلف اشعار پر مشتمل ہے، اس مجموعۂ کلام کا نام انھوں نے ''بستان الحقیقت'' رکھا۔

حج بیت اللہ کے ارادے سے حجاز مقدس گئے اور مکہ مکرمہ پہنچے تو حج سے پہلے ہی ماہ ذی قعدہ ۱۱۸۷ھ/ فروری ۱۷۷۴ء میں وفات پا گئے۔ مکہ مکرمہ میں دفن کیے گئے ❸۔

---

❶ مآثر الامرا، ج ۲، ص ۲۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۳۲۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۲۳۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۲۴۔ اتحاف النبلا بضمن ترجمہ مولانا محمد فاخر الہ آبادی، ص ۲۰۷۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۵۶۔ سید قطب احمد حیدر آبادی

سید قطب احمد حیدر آبادی، جلیل القدر عالم تھے۔ حیدر آباد کے مفتی، سید میراں بخاری بیجاپوری (متوفی ۱۱۲۵ھ/۱۷۱۳ء) کے فرزند رشید تھے۔ حیدر آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ اپنے والد مکرم سید میراں سے علم حاصل کیا اور درس وافادہ کو اپنا مشغلہ قرار دیا۔ اپنے علم وفضل کی بنا پر حیدر آباد کی مسند افتا پر فائز ہوئے۔ حیدر آباد اور اس کے نواح کے لوگ افتا و مسائل میں انھی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔ اس عالم وفقیہ نے ۴/شوال ۱۱۶۳ھ/ ۲۶/اگست ۱۷۵۰ء کو وفات پائی[1]۔

۱۵۷۔ قاضی قل احمد سترکھی

قاضی قل احمد بن احمد مسعود بن نعمت اللہ بن ولی محمد سترکھی، اپنے عہد کے مشہور فقہائے ہند میں گردانے جاتے تھے۔ سترکھ میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ اپنے والد گرامی اور دیگر علمائے وقت سے علم فقہ اور دیگر علوم کی تحصیل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے والد مرحوم کی جگہ سترکھ کے منصب قضا پر متعین ہوئے اور تا زندگی یہ فرائض انجام دیتے رہے۔ مغل حکمران محمد شاہ کے عہد میں وفات پائی[2]۔

۱۵۸۔ سید قمر الدین اورنگ آبادی

سید قمر الدین بن منیب اللہ بن عنایت اللہ حسینی بالا پوری ثم اورنگ آبادی، علوم عقلیہ ونقلیہ میں درجہ اجتہاد پر فائز تھے۔ ان کے آبا واجداد ساداتِ خجند میں سے تھے۔ ان کے اسلاف میں ایک بزرگ سید ظہیر الدین خجندی اپنے وطن سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور پنجاب میں ضلع گوجراں والا کے ایک قصبے ایمن آباد میں سکونت پذیر ہوئے۔ بعد ازاں سید ظہیر الدین کے پوتے سید محمد نے ایمن آباد سے دکن کا رخ کیا اور وہیں مستقل طور پر اقامت گزین ہو گئے۔

سید قمر الدین ۱۱۲۳ھ/۱۷۱۱ء میں پیدا ہوئے اور اپنے والد گرامی سید منیب اللہ (متوفی ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء) سے حصولِ علم کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے قرآنِ مجید حفظ کیا۔ سلسلۂ نقشبندیہ کے مطابق باپ سے اخذ طریقت بھی کیا۔ ۱۱۵۵ھ/ ۱۷۴۲ء میں دہلی گئے اور وہاں کے بعض علما ومشائخ سے علوم متداولہ کی کتابیں پڑھیں۔ دو سال دہلی رہے۔ ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء میں عازم سرہند ہوئے اور بعض اساتذۂ عصر سے تحصیل کی۔ پھر لاہور گئے اور یہاں کے علما ومشائخ سے ملے اور استفادہ کیا۔ ۱۱۵۸ھ/ ۱۷۴۵ء میں بالا پور گئے اور وہاں سے اورنگ آباد کا

[1] محبوب ذی المنن، حصہ دوم، ص ۶۲۳، ۶۲۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۳۵۔

[2] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۳۵۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قصد کیا۔ ایک عرصے تک وہاں قیام پذیر رہنے کے بعد ۱۱۷۴ھ/ ۱۷۶۱ء میں اپنے دو بلند مرتبت بیٹوں نورالہدیٰ اور نورالعلیٰ کے ساتھ حج بیت اللہ کے لیے گئے۔ ۱۱۷۵ھ/ ۱۷۶۲ء میں واپس آئے اور درس و افادہ میں سرگرم ہو گئے۔

سید قمرالدین اورنگ آبادی مشہور عالم و فقیہ اور معقولات و منقولات کے ماہر تھے۔ اس زمانے میں بحث و اشتغال میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا اور بے شمار علما و طلبا نے ان کے درس میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کی۔

سید موصوف مصنف بھی تھے۔ ان کی تصانیف یہ ہیں:

مظہر النور: یہ عربی زبان میں وحدت الوجود کے موضوع پر ایک مفصل و بسیط کتاب ہے۔ اس کا سال تصنیف ۱۱۶۴ھ/ ۱۷۵۱ء ہے۔

نور الکریمتین۔

نور الطہور۔

سید زاہد ہروی کی ایک لغزش علمی کے بارے میں جو ان سے حاشیہ قطبی میں سرزد ہوئی ایک رسالہ لکھا۔

مسائل فقہ میں ایک رسالہ تحریر کیا۔

تاویل رؤیا کے بارے میں ایک رسالہ قلم بند کیا۔

اس کے علاوہ کچھ اور کتب و رسائل بھی ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔

اس عالم و فقیہ نے پیر کے دن ۲ ربیع الاول ۱۱۹۳ھ/ ۱۹ مارچ ۱۷۷۹ء کو اورنگ آباد (دکن) میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے ❶۔

ــــ ک ــــ

۱۵۹۔ شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی

شیخ کلیم اللہ بن نور اللہ بن محمد صالح صدیقی جہاں آبادی، ۲۴ جمادی الاخریٰ ۱۰۶۰ھ/ ۱۴ جون ۱۶۵۰ء کو دارالحکومت دہلی میں پیدا ہوئے، وہیں پلے بڑھے اور اساتذۂ عصر سے حصول علم کیا۔ پھر حجاز مقدس گئے اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ طویل عرصے تک وہاں مقیم رہے اور مختلف علما و مشائخ سے اخذ علم اور کسب فیض کیا۔ بعد ازاں ہندوستان کو معاودت کی اور دہلی میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ عابد و زاہد اور متقی عالم دین تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ شیخ کلیم اللہ کے آباد اجداد معمار تھے جو مکانوں کی تعمیر کا کام کرتے تھے، لیکن کلیم اللہ کو اللہ نے

❶ سبحۃ المرجان، ص ۱۰۱ تا ۱۱۳۔ خزانہ عامرہ، ص ۳۸۰ تا ۳۸۴۔ ابجد العلوم، ص ۹۱۹۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۵۲، ۴۵۳۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۷۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۳۸، ۲۳۹۔ محبوب ذی المنن حصہ دوم، ص ۶۰۷ تا ۶۲۱۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعمیر قلوب اور اصلاح باطن کے لیے منتخب کیا۔ دہلی کی جامع مسجد جو شاہ جہان کے عہد حکومت میں تعمیر کی گئی، اسی شیخ کلیم اللہ کے جد امجد محمد صالح نے تعمیر کی تھی۔ وہ اپنے دور کے بہت بڑے مہندس اور انجینئر تھے۔

شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی، جہاں مشہور مدرس اور علوم عقلیہ ونقلیہ کے ماہر تھے، وہاں اچھے مصنف بھی تھے۔ مختلف عنوانات پر انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں قرآن مجید کی تفسیر بھی شامل ہے۔ باقی تصانیف کے نام یہ ہیں: کشکول، المرقع فی الرقی والتکسیر، سواء السبیل، عشرۂ کاملہ، رسالہ دررد روافض، مجموعہ مکتوبات کلیمی۔ انھوں نے شیخ بو علی سینا کی القانون کی شرح بھی سپرد قلم کی جس کا ایک نسخہ مکتبہ حامدیہ رام پور (ہندوستان) میں موجود ہے۔

شیخ موصوف نے ۲۴ ربیع الاول ۱۱۴۱ھ/ ۱۷ اکتوبر ۱۷۲۸ء (ایک روایت کے مطابق ۱۱۴۳ھ/ ۱۷۲۱ء) کو وفات پائی اور اپنی حویلی میں دفن کیے گئے جو دہلی کے خانم بازار میں واقع تھی❶۔

۱۶۰۔ سید کلیم اللہ مکی

سید کلیم اللہ محمد بن عبدالسلام بن محمد بن نور محمد، فاضل اور علامہ وقت تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔ سید کلیم اللہ کی ولادت مکہ مکرمہ میں ہوئی اور علم ومعرفت کی گود اور فضل وکمال کی آغوش میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ اپنے والد مکرم سید عبدالسلام سے تعلیم پائی۔ علم فقہ بھی انہی سے حاصل کیا، اخذ طریقت بھی انہی سے کیا، یہاں تک کہ اجل علما کے رتبے اور کبار مشائخ کے درجے کو پہنچے۔ بعد ازاں والد محترم کی اجازت سے ۱۱۰۵ھ/ ۱۶۹۴ء میں ہندوستان کا سفر کیا اور دکن آ گئے اور وہاں کے مشہور مقام بالکنڈہ میں جو اعمالِ حیدر آباد میں واقع ہے، اقامت اختیار کی۔

سید کلیم اللہ مکی جو ہندوستان میں مستقل قیام کی وجہ سے ہندی کہلائے، بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ نامور فقیہ اور پُر جوش مبلغ تھے۔ عوام کو رشد وہدایت کی راہ پر لگانا، ان کی زندگی کا بنیادی مقصد تھا۔ لوگوں سے بیعت لیتے تھے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں نہایت سخت تھے۔ زہد وعبادت کی تلقین فرماتے اور شریعت غرا پر استقلال واستقامت کی تاکید کرتے۔ زاہد وقانع، عبادت گزار، متوکل علی اللہ، مرقع حسن اخلاق، متواضع، حلیم الطبع اور نرم خو تھے۔ بہت سے لوگوں نے ان سے استفادہ واستفاضہ کیا۔

بارھویں صدی ہجری کے اس عالم وفقیہ اور دین اسلام کے سرگرم مبلغ نے ۱۱۵۰ھ/ ۱۷۳۷ء میں مالکنڈہ (دکن) میں داعی اجل کو لبیک کہا❷۔

❶ مآثر الکرام، ص ۱۴۱۔ تقصار جنود الاحرار، ص ۲۰۰۔ خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۴۹۴، ۴۹۵۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۷۲۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۸، ۴۳۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۴۰، ۲۴۱۔ مشائخ چشت، ص ۳۶۶۔ انوار العارفین، ص ۴۲۹، ۴۳۰۔ واقعات دار الحکومت دہلی، ج ۳، ص ۱۱۶، ۱۱۷۔ محبوب ذی المنن، حصہ دوم، ص ۲۷، ۲۸۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۴۱، ۲۴۲۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۶۱۔ شیخ کمال الدین سندھی

شیخ کمال الدین بن عنایت اللہ بھکری سندھی، عالم وفقیہ اور مشہور فاضل تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں دیوان حافظ کی ایک مفصل شرح اور اصطلاحات رضویہ شامل ہیں۔ اس سندھی عالم وفقیہ نے ۱۱۳۲ھ/۱۷۲۰ء میں وفات پائی ❶۔

۱۶۲۔ شیخ کمال الدین فتح پوری

شیخ کمال الدین بن محمد دولت بن محمد یعقوب انصاری سہالوی ثم فتح پوری، اپنے وقت کے عالم کبیر اور علوم متعارفہ کے امام تھے۔ شیخ قطب الدین انصاری سہالوی کے ابن عم تھے۔ ان کے والد گرامی قاضی محمد دولت جوارض ہند کے بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے، شیخ قطب الدین کی شہادت کے بعد ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۲ء میں سہالی سے فتح پور چلے گئے تھے، لہٰذا فتح پوری کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ ان کے زیر تذکرہ بیٹے کمال الدین فتح پور ہی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی، اس لیے انھوں نے آبا و اجداً سہالوی ہونے کے باوجود اپنے مولد و منشا کی وجہ سے فتح پوری کی نسبت سے شہرت پائی۔

شیخ کمال الدین نے بعض درسی کتابیں اپنے ایک ہم نام شیخ کمال الدین عظیم آبادی سے پڑھیں اور باقی کتب درسیہ کی تکمیل کے لیے درسِ نظامیہ کے بانی شیخ نظام الدین انصاری سہالوی (متوفی ۸/ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ/ ۲۵/اپریل ۱۷۴۸ء) کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ طویل عرصے تک ان کی صحبت میں رہے اور اس قدر استفادہ کیا کہ شیخ کے تلامذہ اور فیض یافتہ حضرات میں سے کوئی اس مرتبے کو نہیں پہنچ سکا، جس مرتبہ علمی کو یہ پہنچے۔ شیخ کی زندگی ہی میں سرگرم تدریس ہو گئے تھے اور اکابر علمائے ہند میں ان کا شمار ہونے لگا تھا۔ معقولات و منقولات میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ اصول و فروع میں کامل تھے، بالخصوص علم کلام اور منطق و حکمت میں اپنے سب اقران سے فائق تھے۔ حدیث و فقہ میں بھی مرجع مستفیدین تھے۔ ذکی اور ذہین تھے۔ جن معتدد علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا، ان میں مولانا محمد برکت اللہ آبادی، مولانا محمد حسن لکھنوی، مولانا محمد ولی لکھنوی، مولانا محمد اسلم سندیلوی، شیخ عبداللہ سندیلوی اور ملا حمداللہ سندیلوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

شیخ کمال الدین موصوف کئی دقیق علمی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں کبریت احمر، عروۃ الوثقیٰ، حاشیہ کمالیہ بر شرح عقائد جلالیہ، شرح تہذیب کے حاشیہ زاہدی پر تعلیقات وغیرہ شامل ہیں۔ ارض ہند کے یہ صاحب علم بزرگ ستر سال سے زائد عمر پا کر ۱۴/محرم ۱۱۷۵ھ/ ۱۵/اگست ۱۷۶۱ء کو سفر آخرت پر روانہ ہوئے ❷۔

❶ تحفۃ الکرام، ص۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۴۲۔

❷ مآثر الکرام، ص ۲۸۹، ۲۹۰۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۷۲، ۱۷۳۔ اغصان الانساب (از رضی الدین محمود فتح پوری)۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۴۲، ۲۴۳۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مراجع ومصادر

اس کتاب کی تصنیف میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا:

۱۔ ابجد العلوم: نواب صدیق حسن خاں۔ مطبع صدیقیہ بھوپال۔

۲۔ اتحاف النبلا: نواب صدیق حسن خاں۔ مطبع نظامی، کان پور۔

۳۔ احوال علمائے فرنگی محل: شیخ الطاف الرحمٰن۔ مطبع مجتبائی دہلی۔

۴۔ اخبار الصنادید: حکیم نجم الغنی رام پوری۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ

۵۔ ادبیاتِ سرحد: رضا ہمدانی۔ نیا مکتبہ، پشاور۔ ۱۹۵۳ء۔

۶۔ ادبیاتِ سرحد: فارغ بخاری۔ نیا مکتبہ، پشاور ۱۹۵۵ء۔

۷۔ اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ: پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ بہ ضمن ''مضمون ڈاکٹر محمد جہاں گیر خاں۔''

۸۔ اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ: پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ بہ ضمن ''ابوالمظفر اورنگ زیب عالم گیر'' مضمون شیر محمد گریوال۔

۹۔ اذکار الابرار: شاہ محمد تقی حیدر۔ شاہی پریس، لکھنؤ۔ ۱۳۵۷ھ۔

۱۰۔ ارمغان شاہ ولی اللہ: محمد سرور جامعی۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔

۱۱۔ انسان العین فی مشائخ الحرمین: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ مطبع احمدی۔ دہلی۔

۱۲۔ انفاس العارفین: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ مطبع مجتبائی، دہلی۔

۱۳۔ انوار العارفین: حافظ محمد حسین مراد آبادی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔

۱۴۔ اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر: علامہ شبلی۔ مطبوعہ، مشہور آفسٹ کراچی۔ ناشر اردو مرکز، گنپت روڈ، لاہور۔ طبع ششم۔ ۱۹۴۹ء۔

۱۵۔ برصغیر پاک وہند میں علم فقہ: محمد اسحاق بھٹی۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔

۱۶۔ برہان پور کے سندھی اولیا المعروف بہ تذکرہ اولیائے سندھ: سید محمد مطیع راشد برہان پوری۔ سندھی ادبی بورڈ، کراچی۔ طبع اول ۱۹۷۰ء۔

۱۷۔ بزم تیموریہ: سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ دار المصنفین، اعظم گڑھ۔

۱۸۔ بزم سخن: سید علی حسن خاں بن نواب سید صدیق حسن خاں، مطبع نامی مفید عام، آگرہ۔ ۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۱ء۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۹۔ بوستانِ اخبار: سعید احمد مارہروی۔ مطبوعہ آگرہ۔ ۱۳۳۱ھ۔
۲۰۔ تاریخ برہان پور: خلیل الرحمٰن برہان پوری۔ مطبع مجتبائی، دہلی۔ ۱۳۱۷ھ۔
۲۱۔ تاریخ تحفۃ الکرام: جلد اول، دوم، سوم۔ مطبع حسینی اثنا عشری، محلہ فراش خانہ، وزیر گنج، و مطبع ناصری، لاہور۔ ۱۳۰۴ھ۔
۲۲۔ تاریخ خورشید شاہی: غلام امام خاں تریں۔ مطبع خورشیدیہ، حیدر آباد (دکن)۔ ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۷۰ء۔
۲۳۔ تاریخ شیراز ہند جون پور: سید اقبال حسین۔ ادارہ شیراز ہند پبلشنگ ہاؤس، جون پور۔ ۱۳۸۴ھ/ ۱۹۶۴ء۔
۲۴۔ تاریخ کشمیر اعظمی: خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کشمیری۔ ناشر، غلام محمد نور محمد، تاجران کتب سری نگر۔ ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء۔
۲۵۔ تاریخ مشاہیر چشت: خلیق احمد نظامی۔ ندوۃ المصنفین، دہلی۔ ۱۹۵۳ء۔
۲۶۔ تاریخ معصومی: میر محمد معصوم بھکری۔ سندھی ادبی بورڈ، کراچی۔ ۱۹۵۹ء۔
۲۷۔ تاریخ النوائط: نواب عزیز جنگ بہادر۔ مطبوعہ عزیز المطابع، حیدر آباد (دکن) ۱۳۲۲ھ۔
۲۸۔ تجلی نور المعروف بہ تذکرہ مشاہیر جون پر: نور الدین زیدی، مطبع اعظم المطابع، جون پور۔ ۱۸۸۹ء۔
۲۹۔ تحفۃ الکرام: میر علی شیر قانع۔ سندھی ادبی بورڈ، کراچی۔ ۱۹۵۹ء۔
۳۰۔ تحفہ کشمیر: منشی گنیش لعل دہلوی۔ مطبع کوہ نور، لاہور۔ ۱۸۵۳ء۔
۳۱۔ تحقیقاتِ چشتی: نور احمد چشتی۔ پنجابی ادبی اکیڈمی، لاہور۔ ۱۹۶۴ء۔
۳۲۔ تذکرہ آثار الشعرا: سید محمد ممتاز۔ مطبع شاہ جہانی، بھوپال۔ ۱۳۰۴ھ۔
۳۳۔ تذکرۃ الابرار والاشرار: حضرت اخون درویزہ۔ ادارہ اشاعت سرحد، قصہ خوانی بازار پشاور۔
۳۴۔ تذکرہ علمائے بنارس: جلد اول، سید مظہر حسن کوروی۔ سلیمانی پریس بنارس۔ طبع اول۔ ۱۹۱۶ء۔
۳۵۔ تذکرہ جلوۂ خضر: فرزند احمد صفیر بلگرامی۔ مطبع نور الانوار، آگرہ۔ طبع اول۔ ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۴ء۔
۳۶۔ تذکرۃ الشعرا: میر دولت شاہ۔ مطبع مجیدی کان پور۔ ۱۳۲۶ھ۔
۳۷۔ تذکرہ شعرائے اورنگ آباد: مولوی سردار علی حیدر آبادی۔ شمس الاسلام پریس، حیدر آباد (دکن) ۱۳۴۵ھ
۳۸۔ تذکرہ شعرائے اردو: میر حسن دہلوی۔ مقدمہ حبیب الرحمٰن خاں شروانی۔ مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ۔ ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۲ء۔
۳۹۔ تذکرہ صوفیائے سندھ: اعجاز الحق قدسی۔ اردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۵۹ء۔
۴۰۔ تذکرۃ العلماء والمشائخ: محمد دین فوق۔ گلزار محمدیہ اسٹیم پریس، لاہور۔ ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۲۰ء۔
۴۱۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل: مولوی محمد عنایت اللہ۔ مطبوعہ لکھنؤ۔ ۱۹۳۰ء۔
۴۲۔ تذکرہ علمائے ہند: رحمان علی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۹۱۴ء۔
۴۳۔ تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ، محمد ایوب قادری)، ناشر: پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی ۱۹۶۱ء۔
۴۴۔ تذکرہ فارسی گویاں: غلام ہمدانی مصحفی۔ انجمن ترقی اردو، دہلی۔ ۱۹۳۴ء۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴۵۔ تذکرہ گلشن بے خار: نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ۔ مرتبہ، کلب علی خاں فائق۔ مجلس ترقی ادب، لاہور۔ ۱۹۷۳ء۔

۴۶۔ تذکرہ مشائخ بنارس: ابوالاثر عبدالسلام۔ ندوۃ المعارف، بنارس۔ ۱۳۷۱ھ۔

۴۷۔ تذکرہ مشاہیر کاکوری: محمد علی حیدر۔ مطبع اصح المطابع لکھنؤ۔ ۱۹۲۷ء۔

۴۸۔ تذکرہ مصنفین درس نظامی: اختر راہی۔ مسلم اکادمی، محمد نگر، لاہور۔ ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء۔

۴۹۔ تذکرہ مؤرخین: نبی احمد سندیلوی۔ مطبع سلیمانی، بنارس۔ ۱۹۲۶ء۔

۵۰۔ تذکرہ ہندی گویاں: غلام ہمدانی مصحفی۔ مرتبہ، عبدالحق، جامع برقی پریس، دہلی۔ ۱۹۳۳ء۔

۵۱۔ تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار: نواب صدیق حسن خاں۔ بھوپال۔ ۱۲۹۸ھ۔

۵۲۔ الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند: سید عبدالحی حسنی لکھنوی۔ مطبوعہ دمشق۔ ۱۹۵۸ء۔

۵۳۔ چمنستانِ شعرا: رائے لچھمی نرائن شفیق۔ مرتبہ: عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو حیدر آباد (دکن) طبع اول۔ ۱۹۲۸ء۔

۵۴۔ حالات مشائخ نقشبندیہ مجددیہ: محمد حسن نقشبندی مجددی مظہری۔ مطبوعہ، مسلم پریس لاہور۔

۵۵۔ حدائق الحنفیہ: مولوی فقیر محمد جہلمی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۶ء۔

۵۶۔ حدیقۃ الاولیا: مفتی غلام سرور لاہوری۔ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ ۱۸۷۷ء۔

۵۷۔ حکایات کشمیر: محمد دین فوق۔ کریمی پریس، لاہور۔ ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۹ء۔

۵۸۔ حیات حافظ رحمت خاں: سید الطاف علی بریلوی۔ اکیڈمی آف ایجوکیشنل برانچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی (طبع ثانی) ۱۹۶۳ء۔

۵۹۔ حیات العلما: سید عبدالباقی سہسوانی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۲ء۔

۶۰۔ حیاتِ ولی: مولانا محمد رحیم بخش دہلوی۔ مکتبہ سلفیہ، لاہور۔ ۱۹۵۵ء۔

۶۱۔ خزانۂ عامرہ: میر سید غلام آزاد بلگرامی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۹۱۴ء۔

۶۲۔ خزینۃ الاصفیا: مفتی غلام سرور لاہوری۔ مطبع نامی گرامی سراج پنڈت بیج ناتھ موسوم بہ ثمر ہند، لکھنؤ۔ ۱۲۹۰ھ۔

۶۳۔ خلاصۃ التواریخ: لالہ سجان رائے بٹالوی۔ بہ تصحیح ظفر احسن۔ مطبع جی اینڈ سنز، دہلی۔ ۱۹۱۸ء۔

۶۴۔ دولت مغلیہ کی ہیئت مرکزی: ابن حسن۔ ترجمہ، عبدالغنی نیازی۔ مجلس ترقی ادب، لاہور۔ ۱۹۵۸ء۔

۶۵۔ دہلی اور اس کے اطراف: سید عبدالحی حسنی لکھنوی۔ انجمن ترقی اردو، دہلی۔ ۱۹۵۸ء۔

۶۶۔ دیوانِ درد (اردو): مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی۔ مجلس ترقی ادب، لاہور۔ ۱۹۶۲ء۔

۶۷۔ دیوان میرزا مظہر جان جاناں: مطبع مصطفائی، کان پور۔ ۱۲۷۱ھ۔

۶۸۔ ذخیرۃ الخوانین: شیخ فرید بھکری۔ مقدمہ و تصحیح، ڈاکٹر سید معین الحق۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی۔

۶۹۔ رقعاتِ عالم گیری: مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۹۲۴ء۔

۷۰۔ رودِ کوثر: ڈاکٹر شیخ محمد اکرام۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۷۵ء۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۷۱۔ روضۃ الابرار: محمد دین۔ سراج المطابع، جہلم۔ ۱۳۰۲ھ۔

۷۲۔ روضۃ الاولیا: غلام علی آزاد بلگرامی۔ مطبع اعجاز صفدری، حیدرآباد (دکن)۔ ۱۳۰۱ھ۔

۷۳۔ ریاض الفصحا: (تذکرہ ہندی گویاں)۔ غلام ہمدانی مصحفی۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ جامع برقی پریس، دہلی۔ طبع اول۔ ۱۹۳۴ء۔

۷۴۔ سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان: غلام علی آزاد بلگرامی۔ طبع بمبئی۔ ۱۳۰۳ھ۔

۷۵۔ سخندانِ فارس: محمد حسین آزاد۔ مطبع مفید عام، لاہور۔ ۱۹۰۷ء۔

۷۶۔ سخن شعرا: عبدالغفور نساخ۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء۔

۷۷۔ سروِ آزاد: غلام علی آزاد بلگرامی۔ مطبع مفید عام، آگرہ۔ ۱۹۱۰ء۔

۷۸۔ سفینۃ الاولیا: داراشکوہ۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۸۸۴ء۔

۷۹۔ سید احمد شہید: غلام رسول مہر۔ کتاب منزل، لاہور۔ ۱۹۵۴ء۔

۸۰۔ سیرت سید احمد شہید: ابوالحسن علی ندوی۔ لاہور۔

۸۱۔ سیر الاولیا: محمد مبارک علوی المعروف بہ امیر خرد کرمانی۔ مطبع محب ہند، دہلی۔ ۱۳۰۲ھ۔

۸۲۔ سیر المتاخرین: غلام حسین خاں طباطبائی۔ نول کشور، لکھنؤ۔

۸۳۔ سیر المصنفین جلد اول: محمد یحییٰ تنہا۔ محبوب المطابع، دہلی۔ ۱۹۲۴ء۔

۸۴۔ سیر المصنفین جلد دوم: محمد یحییٰ تنہا۔ جامع ملیہ پریس، دہلی۔ ۱۹۲۸ء۔

۸۵۔ شبابِ کشمیر: محمد دین فوق۔ علمی پرنٹنگ پریس، لاہور۔ ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۹ء۔

۸۶۔ طرف الاماثل بتراجم الافاضل: مولانا ابوالحسنات عبدالحی لکھنوی، مطبع یوسفی، لکھنؤ۔ ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء۔

۸۷۔ عالمگیر نامہ: منشی محمد کاظم۔ کالج پریس، کلکتہ۔ ۱۸۶۸ء۔

۸۸۔ عہد اسلامی کا ہندوستان: ریاست علی ندوی۔ ادارۃ المصنفین، پٹنہ۔ ۱۹۵۰ء۔

۸۹۔ عہد بنگش کی سیاسی، علمی اور ثقافتی تاریخ: (ترجمہ تاریخ فرخ آباد، مفتی ولی اللہ فرخ آبادی) مرتبہ محمد ایوب قادری، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی۔ ۱۹۶۵ء۔

۹۰۔ فرحت الناظرین (شخصیات): محمد اسلم پسروری، ترجمہ و ترتیب، محمد ایوب قادری، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی ۱۹۷۲ء۔

۹۱۔ الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ: مولانا ابوالحسنات عبدالحی لکھنوی، مطبوعہ مصر، طبع اول۔ ۱۳۲۴ھ۔

۹۲۔ قاموس الاعلام: شمس اللہ قادری۔ حیدرآباد (دکن) ۱۹۳۵ء۔

۹۳۔ قاموس المشاہیر: جلد اول، دوم، سوم، نظام الدین حسین نظامی بدایونی۔ نظامی پریس، بدایوں۔ ۱۹۲۴۔ ۱۹۲۶ء۔

۹۴۔ قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب: ذوالفقار احمد۔ مطبع فیض منبع مفید عام، آگرہ۔ ۱۳۱۶ھ۔

۹۵۔ کلماتِ طیبات: ابوالخیر محمد بن احمد مرادآبادی۔ مطبع مجتبائی دہلی۔ ۱۳۰۹ھ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۹۶۔ گل رعنا: سید عبدالحی حسنی لکھنوی۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔ طبع سوم، ۱۹۶۴ء۔

۹۷۔ گلزار اولیا: مظفر حسین۔ مطبع سبحانی، حیدر آباد (دکن) ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء۔

۹۸۔ گلشن ہند: میرزا علی لطف۔ تصحیح وتحشیہ مولانا شبلی ومقدمہ مولوی عبدالحق، رفاہِ عام پریس، لاہور۔

۹۹۔ گل عجائب (تذکرۂ شاعراں): اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) طبع اول۔ ۱۹۳۶ء۔

۱۰۰۔ مآثر الامرا۔ جلد اول، دوم، سوم، شاہ نواز خاں۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ۔ ۱۸۸۸ء/ ۱۸۹۰ء۔

۱۰۱۔ مآثر عالم گیری: محمد ساقی مستعد خاں۔ بہ تصحیح آغا احمد علی، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ۔ ۱۸۷۱ء۔

۱۰۲۔ مآثر الکرام: غلام علی آزاد بلگرامی۔ مکتبہ احیاء العلوم الشرقیہ، لاہور۔ ۱۹۷۱ء۔

۱۰۳۔ محبوب ذی المنن تذکرہ علمائے دکن: عبدالجبار خاں ملکاپوری۔ مطبع رحمانی وحسن پریس، حیدر آباد (دکن) ۱۳۳۲ھ۔

۱۰۴۔ محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن: عبدالجبار خان ملکاپوری۔ مطبع رحمانی، حیدر آباد (دکن) ۱۳۲۹ھ۔

۱۰۵۔ مخزن نکات (تذکرہ شعرائے اردو): شیخ قیام الدین قائم چاند پوری۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) ۱۹۲۹ء۔

۱۰۶۔ مرأت احمدی: مرزا محمد حسن الملقب بہ علی محمد خاں بہادر۔ مطبوعہ کلکتہ۔ ۱۹۲۷ء۔

۱۰۷۔ مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط: مترجمہ ومرتبہ، خلیق انجم۔ مکتبہ برہان۔ جامع مسجد، دہلی۔ طبع اول ۱۹۶۲ء۔

۱۰۸۔ مشاہیر ادب۔ اردو: مہیش پرشاد۔ ناشر، نند کشور اینڈ برادرز، بنارس۔ طبع اول۔ ۱۹۳۲ء۔

۱۰۹۔ مشاہیر کشمیر: منشی محمد دین فوق۔ کریمی پریس، لاہور۔

۱۱۰۔ مشکوٰۃ المصابیح: ولی الدین۔ اصح المطابع، دہلی۔ ۱۳۵۰ھ/ ۱۹۳۲ء۔

۱۱۱۔ معارف (ماہ نامہ) اعظم گڑھ: بابت ماہ اپریل ۱۹۴۷ء۔ مضمون سید غلام حسین شاہ ندوی پھلواروی۔

۱۱۲۔ المعارف (ماہ نامہ) لاہور۔ بابت ذی الحجہ ۱۳۸۷ھ۔ مارچ ۱۹۶۸ء۔ مضمون مولانا غلام رسول مہر۔

۱۱۳۔ المعارف (ماہ نامہ) لاہور۔ بابت جمادی الاولیٰ ۱۳۸۸ھ/ اگست ۱۹۶۸ء۔ مضمون پروفیسر محمد اسلم۔

۱۱۴۔ معمولاتِ مظہری: نعیم اللہ بہرائچی۔ مطبع محمدی، لاہور۔ ۱۳۱۰ھ۔

۱۱۵۔ مفتاح التواریخ: منشی دانشور۔ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ ۱۲۸۴ھ۔

۱۱۶۔ مقدمہ رقعاتِ عالم گیری: نجیب اشرف ندوی۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔

۱۱۷۔ مقالاتِ شبلی، جلد سوم: دارالمصنفین اعظم، طبع دوم۔ ۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۵ء۔

۱۱۸۔ مقالاتِ شبلی (تاریخ حصہ اول) جلد پنجم: دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔ ۱۳۵۴ھ/ ۱۹۳۶ء۔

۱۱۹۔ مقاماتِ مظہری: شاہ غلام علی علوی مجددی۔ مطبع مجتبائی، دہلی۔ ۱۳۰۹ھ/ ۱۸۹۲ء۔

۱۲۰۔ مقدمہ نکات الشعرا (تذکرہ شعرائے اردو): میر تقی میر۔ مقدمہ حبیب الرحمٰن خاں شروانی، نظامی پریس، بدایوں۔ ناشر، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۲۱۔ مکاتیب میرزا مظہر جان جاناں: مرتبہ عبدالرزاق قریشی۔علوی بک ڈپو، بمبئی۔۱۹۶۶ء

۱۲۲۔ مناقب حسن رسول نما: سید محمد ہاشم۔گلزار ہند سٹیم پریس، لاہور۔۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء۔

۱۲۳۔ منتخب اللباب: جلد اول، دوم، محمد ہاشم المخاطب بہ خافی خاں۔ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ، ۱۸۶۹ء۔

۱۲۴۔ مؤرخین ہند: شمس اللہ قادری۔تاریخ آفس، حیدر آباد (دکن) ۱۹۳۳ء۔

۱۲۵۔ نزہۃ الخواطر: (جلد پنجم) سید عبدالحی حسنی لکھنوی۔دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد (دکن)۔۱۳۷۵ھ/۱۹۵۵ء۔

۱۲۶۔ نزہۃ الخواطر: (جلد ششم): سید عبدالحی حسینی لکھنوی۔دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد، (دکن) ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۷ء۔

۱۲۷۔ ہند عہد اورنگ زیب میں: مرزا یار جنگ سمیع اللہ بیگ۔تاج پریس، حیدر آباد (دکن) ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء۔

۱۲۸۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے: سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔ ۱۳۸۳ھ/۱۹۶۳ء۔

۱۲۹۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے: دارالمصنفین اعظم گڑھ۔۱۳۸۳ھ/۱۹۶۳ء۔

۱۳۰۔ ہندوستان گزشتہ وحال: رائے بہادر لالہ بیج ناتھ۔عثمانی پریس، آگرہ۔۱۹۰۴ء۔

۱۳۱۔ الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبدالغنی: محمد بن یحییٰ المدعو بہ محسن تیمی بکری ترہٹی۔مطبع صدیقی، بریلی۔۱۲۸۷ھ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فقہائے ہند

بارھویں صدی ہجری

حصہ دوم

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترتیب

♦	مقدمہ	۷۷۵
♦	شاہ عالم بہادر شاہ اول	۷۷۸
♦	معزالدین جہاں دار شاہ	۷۸۶
♦	فرخ سیر	۷۸۶
♦	رفیع الدرجات	۷۸۷
♦	رفیع الدولہ	۷۸۷
♦	ساداتِ بارہہ	۷۸۸
♦	محمد شاہ	۷۹۰
♦	احمد شاہ ابدالی	۷۹۶
♦	احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان پر حملے	۷۹۷
♦	احمد شاہ۔ مغل حکمران	۸۰۴
♦	عالم گیر ثانی	۸۰۵
♦	عالم شاہ ثانی	۸۰۶
♦	ایسٹ انڈیا کمپنی	۸۰۸
♦	اَوَدھ کی حکومت	۸۱۵
♦	سراج الدولہ	۸۱۷
♦	روہیل کھنڈ کی حکومت	۸۲۰
♦	حیدر آباد کی آصف جاہی حکومت	۸۲۵
♦	سلطنت خداداد میسور	۸۲۸
♦	حرفِ آخر	۸۳۲
♦	م	
♦	۱۔ شیخ مجیب اللہ جعفری پھلواروی	۸۳۵
♦	۲۔ قاضی محب اللہ بہاری	۸۳۵
♦	۳۔ سید محمد قنوجی	۸۴۰
♦	۴۔ شیخ محمد گجراتی	۸۴۴
♦	۵۔ قاضی محمد آصف نگرامی	۸۵۴
♦	۶۔ شیخ محمد ارشد جون پوری	۸۵۴
♦	۷۔ مولانا محمد اسعد انصاری سہالوی	۸۴۶
♦	۸۔ سید محمد اشرف حسینی بلگرامی	۸۴۷
♦	۹۔ شیخ محمد اشرف کشمیری	۸۴۹
♦	۱۰۔ مولانا محمد اعلیٰ تھانوی	۸۵۰
♦	۱۱۔ میر محمد افضل دہلوی	۸۵۱
♦	۱۲۔ قاضی محمد اکرم سندھی	۸۵۱
♦	۱۳۔ قاضی محمد اکرم دہلوی	۸۵۲
♦	۱۴۔ مفتی محمد امان گوپاموی	۸۵۲
♦	۱۵۔ قاضی محمد امیر فاروق گوپاموی	۸۵۲
♦	۱۶۔ مولانا محمد امین کشمیری	۸۵۳
♦	۱۷۔ سید محمد باقر بلگرامی	۸۵۴
♦	۱۸۔ شیخ محمد باقر سندھی	۸۵۴
♦	۱۹۔ مولانا محمد جمیل جون پوری	۸۵۴
♦	۲۰۔ قاضی محمد حافظ بلگرامی	۸۵۸
♦	۲۱۔ قاضی محمد حسین شافعی گجراتی	۸۵۹
♦	۲۲۔ سید محمد حکم بریلوی	۸۵۹
♦	۲۳۔ شیخ محمد حیات سندھی	۸۶۰
♦	والد کا اسم گرامی	۸۶۱

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

♦	مولد و مسکن اور ابتدائی حالات	۸۶۱
♦	مدینہ منورہ میں سکونت اور استاد کی جانشینی	۸۶۲
♦	علمی رفعت اور تذکرہ نگاروں کا اظہارِ عقیدت	۸۶۳
♦	تصانیف	۸۶۷
♦	اخلاق و عادات اور تدین و تقویٰ	۸۷۳
♦	صحت عقیدہ کا بہ درجہ غایت اہتمام	۸۷۴
♦	شیخ کا مسلک	۸۷۶
♦	تلامذہ	۸۷۸
♦	وفات	۸۸۰
♦	شیخ کے استادِ گرامی۔ شیخ ابوالحسن سندھی کبیر	۸۸۱
♦	۲۴۔ قاضی محمد حیات برہان پوری	۸۸۶
♦	۲۵۔ سید محمد مخدوم پھلواروی	۸۸۷
♦	۲۶۔ قاضی محمد دولت فتح پوری	۸۸۷
♦	۲۷۔ سید محمد راجے جون پوری	۸۸۸
♦	۲۸۔ مولانا محمد رضا انصاری سہالوی	۸۸۸
♦	۲۹۔ شیخ محمد رضا لاہوری	۸۸۹
♦	۳۰۔ مولانا محمد سعید انصاری سہالوی	۸۸۹
♦	۳۱۔ شیخ محمد سعید انبالوی	۸۹۰
♦	۳۲۔ مولانا محمد شجاع ہتگامی	۸۹۰
♦	۳۳۔ مولانا محمد شفیع بدایونی	۸۹۲
♦	۳۴۔ قاضی محمد شفیع گجراتی	۸۹۲
♦	۳۵۔ مولانا شیخ محمد صادق ٹھٹھوی سندھی	۸۹۲
♦	۳۶۔ شیخ محمد صالح بنگالی	۸۹۳
♦	۳۷۔ مولانا محمد صدیق لاہوری	۸۹۳
♦	۳۸۔ مولانا محمد طاہر عباسی الٰہ آبادی	۸۹۹
♦	۳۹۔ مولانا محمد طاہر حسینی شاہ جہان پوری	۹۰۰
♦	۴۰۔ مولانا محمد عابد سنامی لاہوری	۹۰۱
♦	۴۱۔ قاضی محمد عاشق کیرانوی	۹۰۱
♦	۴۲۔ سید محمد عدل بریلوی	۹۰۲
♦	۴۳۔ شیخ محمد علی بدایونی	۹۰۲
♦	۴۴۔ شیخ محمد غوث کاکوروی	۹۰۳
♦	۴۵۔ شیخ محمد فاخر زائر عباسی الٰہ آبادی	۹۰۴
♦	علم و فضل	۹۰۴
♦	حج بیت اللہ کے لیے مختلف سفر	۹۰۵
♦	شیخ کے متعلق اکابر علما کی رائے	۹۰۷
♦	شاہ ولی اللہ دہلوی سے ملاقات	۹۱۰
♦	تصانیف	۹۱۰
♦	شعر و شاعری	۹۱۲
♦	وصیت اور تدفین	۹۱۳
♦	اولاد	۹۱۴
♦	تلامذہ	۹۱۴
♦	۴۶۔ مولانا محمد فاضل سورتی	۹۱۴
♦	۴۷۔ سید محمد فیض بلگرامی	۹۱۵
♦	۴۸۔ شیخ محمد محسن دہلوی	۹۱۵
♦	۴۹۔ مولانا محمد محسن کشوکشمیری	۹۱۶
♦	۵۰۔ مولانا محمد محسن کشمیری	۹۱۶
♦	۵۱۔ مولانا محمد مراد لاہوری	۹۱۷
♦	۵۲۔ مولانا محمد مراد کشمیری	۹۱۷
♦	۵۳۔ مولانا محمد مراد سندھی	۹۱۸
♦	۵۴۔ شیخ محمد مراد رفیقی کشمیری	۹۱۸
♦	۵۵۔ مولانا محمد معصوم جائسی	۹۱۹

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۵۶۔ شیخ محمد معین سندھی	۹۱۹
۵۷۔ شیخ محمد ممتاز نصیر آبادی	۹۲۵
۵۸۔ شیخ محمد مومن الجزائری	۹۲۵
۵۹۔ شیخ محمد ناصر الہ آبادی	۹۲۶
۶۰۔ خواجہ محمد ناصر عندلیب دہلوی	۹۲۷
۶۱۔ شیخ محمد نصیر شیخ پوری	۹۲۸
۶۲۔ مولانا محمد نعیم جون پوری	۹۲۸
۶۳۔ سید محمد نور نصیر آبادی	۹۲۹
۶۴۔ سید محمد وارث حسینی بنارسی	۹۳۰
۶۵۔ مولانا محمد ہاشم ٹھٹھوی سندھی	۹۳۱
۶۶۔ سید محمد ہدیٰ نصیر آبادی	۹۳۲
۶۷۔ شیخ محمد یحییٰ عباسی الہ آبادی	۹۳۳
۶۸۔ مولانا محمود نائطی	۹۳۴
۶۹۔ سید محی الدین حسینی نیوتنی	۹۳۴
۷۰۔ شیخ محی الدین الہ آبادی	۹۳۵
۷۱۔ قاضی مراد الدین کشمیری	۹۳۵
۷۲۔ سید مربی بلگرامی	۹۳۵
۷۳۔ قاضی مربی پھانوی	۹۳۶
۷۴۔ سید مرتضیٰ ملتانی	۹۳۶
۷۵۔ شیخ مرتضیٰ عباسی چریاکوٹی	۹۴۰
۷۶۔ مرزا خان جالندھری	۹۴۰
۷۷۔ سید معظم شاہ سورتی	۹۴۱
۷۸۔ مولانا معین الدین عثمانی منیری	۹۴۲
۷۹۔ شیخ موسیٰ امیٹھوی	۹۴۲
۸۰۔ مفتی میراں بیجاپوری	۹۴۲
ن	
۸۱۔ قاضی نجم الدین برہان پوری	۹۴۳
۸۲۔ مولانا نجم الدین برہان پوری	۹۴۳
۸۳۔ سید نصیر الدین ہروی برہان پوری	۹۴۳
۸۴۔ شیخ نظام الدین انصاری سہالوی	۹۴۵
انصاری اور عثمانی خاندانوں کی کش مکش	۹۴۶
مولانا قطب الدین کی شہادت	۹۴۷
فرنگی محل لکھنؤ میں سکونت	۹۴۷
شیخ نظام الدین کی تحصیل علم	۹۴۸
مسندِ تدریس	۹۴۸
اخلاق و عادات	۹۴۹
انکسار و تواضع	۹۵۰
تصانیف	۹۵۱
درسِ نظامیہ کی ترتیب	۹۵۲
مدرسۂ نظامیہ اور درسِ نظامیہ	۹۵۴
شیخ نظام الدین کا نصابِ تعلیم اور اس کی خصوصیات	۹۵۶
تلامذہ	۹۵۸
اولاد	۹۶۰
مرض اور وفات	۹۶۱
۸۵۔ قاضی نظام الدین احمد آبادی	۹۶۲
۸۶۔ شیخ نعمت اللہ سندھی	۹۶۲
۸۷۔ حاجی نعمت اللہ نوشہردی	۹۶۳
۸۸۔ قاضی نور الحق گجراتی	۹۶۳
۸۹۔ مفتی نور الحق دہلوی	۹۶۳
۹۰۔ قاضی نور الحق انصاری کرانوی	۹۶۴
۹۱۔ شیخ نور الدین گجراتی	۹۶۴
۹۲۔ مولانا نور الدین گنت پوری	۹۶۵
۹۳۔ شیخ نور اللہ بنارسی	۹۶۶

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

♦	۹۴۔سید نور اللہ بلگرامی	۹۶۶
♦	۹۵۔مولانا نور اللہ کشمیری	۹۶۶
♦	۹۶۔شیخ نور اللہ برہانوی	۹۶۷
♦	۹۷۔شیخ نور محمد بدایونی	۹۶۷
♦	و	
♦	۹۸۔حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی	۹۶۸
♦	برصغیر کے چند مشہور علمی خاندان	۹۶۸
♦	شاہ ولی اللہ کے اسلاف	۹۷۰
♦	شاہ ولی اللہ کی ولادت	۹۷۱
♦	تعلیم و تربیت	۹۷۲
♦	شادی	۹۷۳
♦	بیعت و خلافت	۹۷۳
	قصدِ حجاز	۹۷۴
♦	مراجعت وطن	۹۷۵
♦	شاہ صاحب کا زمانہ	۹۷۵
♦	اوصافِ گوناگوں	۹۷۸
♦	تصانیف	۹۷۸
♦	خدمت قرآن مجید	۹۷۸
♦	علم حدیث کی خدمت	۹۹۰
♦	علم فقہ	۹۹۱
♦	اجتہاد اور تقلید	۹۹۳
♦	مسلکی نقطۂ نظر	۹۹۵
♦	علم تصوف	۱۰۰۴
♦	اقتصادی، معاشرتی اور اصلاحی نظریات	۱۰۰۶
♦	سیاسی بصیرت کی چند مثالیں	۱۰۱۲
♦	مکتوبات	۱۰۲۰
♦	شعر و شاعری	۱۰۲۱
♦	آخری مرض اور وفات	۱۰۲۳
♦	شاہ صاحب کے فرزندانِ گرامی	۱۰۲۶
♦	قرآن مجید کا اردو ترجمہ	۱۰۲۸
♦	ی	
♦	۹۹۔مولانا یار محمد لاہوری	۱۰۲۹
♦	۱۰۰۔شیخ یٰسین جون پوری	۱۰۳۱
♦	۱۰۱۔مفتی یعقوب فرنگی محلی لکھنوی	۱۰۳۱
♦	مراجع و مصادر	۱۰۳۲

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ فقہائے ہند کی جلد پنجم حصہ دوم کا مقدمہ ہے۔ اس سے قبل ہندوستان کے چھٹے مغل حکمران اورنگ زیب عالم گیر کی زندگی کے مختصر حالات بیان کیے گئے ہیں اور علما وفقہا سے اس کے تعلقات وروابط کی وضاحت کی گئی ہے، نیز بتایا گیا ہے کہ خود اورنگ زیب کے حدود علم کس قدر وسیع تھے اور مسائل دین میں اس کو کس درجے عبور حاصل تھا۔

اورنگ زیب نے قمری حساب سے اکانوے (۹۱) سال تیرہ دن عمر پائی اور پچاس برس دو ماہ ستائیس دن حکومت کی۔ وہ بہت سی خصوصیات کے لحاظ سے ہندوستان کا عدیم المثال بادشاہ تھا اور اس کا دور حکومت متعدد اعتبارات سے کامیابی اور کامرانی کا دور تھا۔ اس نے ۲۸ ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ (۲۱ فروری ۱۷۰۷ء) کو اس دنیائے فانی سے کوچ کیا۔ ہندوستان کے اس شہنشاہ نے بستر مرگ پر اپنے بیٹوں کو مخاطب کر کے جو آخری الفاظ کہے، ان سے پتھر کا دل بھی موم ہو جاتا ہے اور جس پیرائیہ بیان میں دنیا کی ناپائیداری اور اپنی بے بسی اور حرماں نصیبی کا ذکر کیا اس سے اس کے سخت سے سخت دشمن کا کلیجہ بھی شق ہونے لگتا ہے۔ اس کے فارسی الفاظ کا ترجمہ یہ ہے۔

جب میں پیدا ہوا تو میرے گرد لوگوں کا مجمع تھا اور اب موت کے وقت تن تنہا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ کیوں زندہ ہوں اور کس لیے دنیا میں آیا تھا۔ افسوس کہ مجھ سے مخلوق خدا کی بھلائی کا کوئی کام نہ ہو سکا۔ نہیں معلوم کہ میرا ٹھکانا کہاں ہوگا اور اس عاصی سَرتاپا اور آلودۂ گناہ کو بارگاہِ خداوندی میں کس سلوک کا مستحق ٹھہرایا جائے گا۔ اب میں دنیا سے رخصت ہوتا ہوں اور سب کو خدا کی حفاظت میں دیتا ہوں۔ میرے نامور اور سعادت مند بیٹوں کو آپس میں لڑائی جھگڑا نہیں کرنا چاہیے۔ نہ لوگوں کا جو بندگان خدا ہیں، قتل روا رکھنا چاہیے۔ میری تمام عمر رائیگاں گئی۔ اگرچہ خدا کی یاد ہمیشہ میرے دل میں رہی مگر میں اپنی تیرہ چشمی سے اس نور نظر کو پہچان نہ سکا۔ آئندہ مجھے اپنی زندگی کی کوئی امید نہیں رہی۔ مجھ سے بخار نے مفارقت اختیار کر لی ہے اور ہڈیوں کا ڈھانچا باقی رہ گیا ہے۔ لشکریوں میں بد نظمی پھیل گئی ہے اور وہ اسی طرح مایوس و بے یار و مددگار ہیں جیسے کہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں خود ہوں۔ میرے دل کو چین اور روح کو اطمینان نہیں۔ میں اپنے اعمال کی وجہ سے اپنے آپ کو خدا سے دور سمجھتا ہوں۔ جب خود میں نے ہی آس توڑ دی تو دوسروں سے کیا امید رکھ سکتا ہوں۔ تم میری آخری وصیت پر عمل کرو۔ ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں کا خون بہنے لگے اور ان کی موت کا وبال مجھ ناکارہ کی گردن پر رہے۔ میں بہت گناہ گار ہوں اور نہیں جانتا کہ کیا کیا عذاب میرے مقدر میں ہیں۔ دنیا میں آتے وقت کوئی چیز اپنے ساتھ نہیں لایا تھا۔ اب جانے لگا ہوں تو گناہوں کے بوجھ کی بھاری گٹھڑی سر پر لیے جا رہا ہوں۔ میں تم کو اور تمھارے بچوں کو خداوند عالم کی حفاظت میں دیتا ہوں اور تم سے رخصت ہوتا ہوں۔ والسلام علیکم ❶۔

اورنگ زیب نے ایک وصیت نامہ لکھا، جس کے چند الفاظ یہ ہیں۔

بے کس آمدیم و بے کس رفتیم۔ سر برہنہ آمدیم ورفتیم۔ ہمراہ تابوت، نشان ومور چال وغیرہ لوازمہ شاہانہ نماند۔ حمید الدین خاں کہ صادق الاعتقاد است، تابوت را بہ درگاہ شاہ برہان رساند وجائے قبر بہ دستور درویشاں دفن کنند ❷۔

(یعنی اکیلے آئے اور اکیلے جا رہے ہیں۔ ننگے سر آئے اور ننگے سر جا رہے ہیں۔ لوازم پادشاہی اور علم شاہانہ کوئی چیز ساتھ نہیں ہے۔ حمید الدین خاں جو کہ ہمارے ساتھ مخلصانہ تعلقات رکھتا ہے، شاہ برہان کی درگاہ میں جنازہ پہنچا دے اور درویشوں کی طرح لوگ مجھے قبر میں دفن کر دیں۔)

اورنگ زیب کی وفات کے وقت اس کے تین بیٹے زندہ تھے۔ سب سے بڑا محمد معظم۔ اس سے چھوٹا محمد اعظم اور سب سے چھوٹا کام بخش۔! باپ نے ایک وصیت کے ذریعے سلطنت ہند کو ان تینوں بیٹوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ بڑا بیٹا اس وصیت پر عمل کرنا چاہتا تھا لیکن اس کا بھائی محمد اعظم اس کے لیے تیار نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جاجو کے مقام پر دونوں بھائیوں کے درمیان جنگ ہوئی، جس میں محمد اعظم اور اس کے دو لائق بیٹے بیدار بخت اور والاجاہ مارے گئے۔ محمد معظم سب سے چھوٹے بھائی کام بخش کو بھی باپ کی وصیت کے مطابق اس کا علاقہ دینے پر آمادہ تھا۔ بلکہ کچھ زیادہ بھی دینے پر رضامند تھا۔ مگر بدقسمتی سے اس نے بھی یہ بات منظور نہ کی۔ آخر کار معرکہ کارزار گرم ہوا اور کام بخش شدید زخم کھانے کے بعد وفات پا گیا۔

آگے چل کر مغل بادشاہوں میں تخت نشینی کے مسئلے پر پیہم خوں ریزیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بہت سے لائق امرائے سلطنت مارے گئے اور رفتہ رفتہ ملک کے نظم ونسق کے تمام رشتے ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے۔ اور آخری نتیجہ یہ نکلا کہ اس ملک سے مغل حکومت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

اورنگ زیب عالم گیر کی وفات (۱۱۱۸ھ۔۱۷۰۶ء) کے بعد جو دور شروع ہوا۔ اسے مغل حکومت کے دورِ زوال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

---

❶ واقعات دارالحکومت دہلی، حصہ، اول، ص ۵۸۴-۵۸۵-

❷ واقعات دارالحکومت دہلی حصہ اول ص ۵۸۶

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سلسلہ فقہائے ہند کی گزشتہ جلدوں میں ہم سلطنت مغلیہ کے عہد عروج کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔ آیئے اب اس کے زمانۂ زوال اور دور انحطاط کے بعض افسوس ناک واقعات کا بھی مطالعہ کریں کہ تاریخ، قوموں کے اسی اتار چڑھاؤ کا نام ہے۔ آج ایک قوم داد حکمرانی دے رہی ہے تو کل دوسری اورنگ سلطنت پر قبضہ جمالیتی ہے۔ تاریخ کے بے رحم ہاتھوں سے کبھی کوئی محفوظ نہیں رہا۔ مغلوں پر بھی تاریخ کا یہ عمل جاری ہوا اور وہ اس کے خونی پہیوں کی گردش میں آکر رہے۔ ذیل کی سطور میں اختصار کے ساتھ اسی الم انگیز اور اذیت ناک داستان کی بعض تفصیلات بیان کرنا مقصود ہے۔

اورنگ زیب کی وفات یعنی ۱۷۰۷ء سے لے کر ۱۸۰۶ء تک سو سال کے عرصے میں مندرجہ ذیل مغل حکمران تخت ہندوستان پر بیٹھے۔

۱ محمد معظم شاہ عالم بہادر شاہ اول: ۱۷۰۷ء سے ۱۷۱۲ء تک۔

۲ معز الدین جہاں دار شاہ: ۱۷۱۲ء سے ۱۷۱۳ء تک۔ یہ فرخ سیر کے ہاتھوں قتل ہوا۔

۳ فرخ سیر: ۱۷۱۳ء سے ۱۷۱۹ء تک اسے قتل کر دیا گیا تھا۔ لاولد مرا۔

۴ رفیع الدرجات: ۱۷۱۹ء میں صرف چھ ماہ حکمرانی کر کے مرض دق سے وفات پائی۔

۵ رفیع الدولہ: ۱۷۱۹ء میں صرف تین مہینے حکمران رہا اور وفات پائی۔

۶ نیکو سیر: چند روز حکومت کی۔

۷ ابوالفتح نصیر الدین روشن اختر محمد شاہ عرف رنگیلا: ۱۷۱۹ء سے ۱۷۴۸ء تک حکمران رہا (محمد شاہ رنگیلا کی تخت نشینی کے چند ماہ بعد یکم اکتوبر ۱۷۲۰ء سے ۸ نومبر ۱۷۲۰ء تک صرف ایک مہینا آٹھ دن ابراہیم بھی تخت نشین رہا۔ اس مختصر مدت میں اس نے اپنے نام کا سکہ بھی جاری کرالیا تھا)

۸ مجاہد الدین ابوالنصر احمد شاہ: ۱۷۴۸ء سے ۱۷۵۴ء تک حکومت کی اور پھر معزول و مکحول ہوا۔

۹ ابوالعادل عزیز الدین محمد عالم گیر ثانی: ۱۷۵۴ء سے ۱۷۵۹ء تک بادشاہ رہا۔ اسے قتل کر دیا گیا تھا۔

۱۰ مرزا عبداللہ عالی گوہر شاہ عالم ثانی: ۱۷۵۹ء سے ۱۸۰۶ء تک حکومت کی۔ ۱۷۶۱ء میں مرہٹوں نے اس کی سلطنت کو درہم برہم کر دیا تھا اور یہ مغل بادشاہ انگریزوں کی حفاظت میں رہتا تھا۔

یہ دس (بلکہ ابراہیم سمیت) گیارہ مغل بادشاہ ہیں جو ۱۷۰۷ء سے ۱۸۰۶ء تک کے سو سال کے عرصے میں تخت نشین ہند ہوئے۔ یہ نہایت افراتفری اور انتہائی بدامنی کا زمانہ تھا۔ بادشاہ بے بس اور مجبور محض تھے۔ امرائے سلطنت جو چاہتے کرتے تھے، بادشاہ انھیں کچھ کہنا بھی چاہتے تو نہیں کہہ سکتے تھے۔ بادشاہوں کی کمزوری اور عدم جرأت کی وجہ سے ہندوستان کئی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں منقسم ہو گیا تھا اور مغل حکمرانوں کے تاج کی قدر و منزلت باقی نہ رہی تھی۔ اب تاریخی ترتیب کے ساتھ اس دور کے ضروری واقعات معرض تحریر میں لائے جاتے ہیں تاکہ پچھلا سلسلہ بھی قائم رہے اور آئندہ کے حالات بھی سامنے آجائیں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شاہ عالم بہادر شاہ اول:

اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا محمد معظم شاہ عالم بہادر شاہ اول تخت ہند پر متمکن ہوا۔ یہ ہندوستان کا ساتواں مغل حکمران تھا۔ ۳۰ رجب ۱۰۵۳ھ (۴/ اکتوبر ۱۶۴۳ء) کو برہان پور میں پیدا ہوا۔ اور سلطنت وحکومت کی گود میں پرورش پائی۔ کچھ دور اپنے جد نامدار شاہ جہاں کی حکومت کا دیکھا اور پورا زمانہ باپ کی حکمرانی کا آنکھوں کے سامنے گزرا۔ اس طرح باپ اور دادا دونوں کے زیر تربیت رہنے کے مواقع میسر آئے۔ سلطنت مغلیہ کی تاریخ میں اسے بہادر شاہ اول کہا جاتا ہے۔

بہادر شاہ نے کچھ ہوش سنبھالا تو قرآن مجید حفظ کیا اور مختلف اساتذہ سے علوم متداولہ کی تحصیل کی۔ فنون حرب سے بہراور ہوا اور آداب سلطنت میں دسترس حاصل کی۔ مجموعی اعتبار سے بہادر شاہ اول، بلند اخلاق، عمدہ خصال، نرم خو اور حلیم الطبع بادشاہ تھا۔

اورنگ زیب کی وفات کے وقت بہادر شاہ کابل کی ولایت پر متعین تھا اور اس کا چھوٹا بھائی محمد اعظم دکن کی صوبے داری پر مامور تھا۔ محمد اعظم ۱۲ شعبان ۱۰۶۳ھ/ ۲۸ جون ۱۶۵۳ء کو پیدا ہوا تھا اور محمد معظم یعنی بہادر شاہ سے عمر میں دس برس چھوٹا تھا۔ محمد معظم اورنگ زیب کی وفات سے بارہ روز بعد ۱۰ ذی الحجہ ۱۱۱۸ھ (۴/ مارچ ۱۷۰۷ء) کو بھاری لشکر کے ساتھ کابل سے روانہ ہوا۔ لاہور کے قریب پہنچ کر اپنی بادشاہت کا اعلان کیا اور ۱۲ جون ۱۷۰۷ء کو آگرہ کے قریب جاجو کے مقام پر آکر خیمہ زن ہوا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں اس کے باپ اورنگ زیب نے اپنے بھائی دارا شکوہ کو شکست دی تھی۔

ادھر محمد اعظم بھی فوج لے کر احمد نگر سے روانہ ہوا، اور امرائے سلطنت اور ارکان حکومت کی ایک بڑی جمعیت کے ساتھ بہادر شاہ کے قریب آکر پڑاؤ کیا۔ اب دونوں طرف کی فوجیں آگرہ اور دھول پور کے درمیان ایک دوسرے کے آمنے سامنے پڑی تھیں اور وہی ساموں گڑھ کا میدان تھا، جہاں ٹھیک اکیاون (۵۱) برس پہلے اورنگ زیب اور دارا شکوہ کے درمیان معرکۂ کارزار گرم ہوا تھا۔

بہادر شاہ طبعاً نرم مزاج اور صلح جو تھا۔ اس نے ہر چند بھائی کی طرف مصالحت کا ہاتھ بڑھایا اور جنگ سے بچنے کی کوشش کی۔ اس کی خواہش تھی کہ باپ کی وصیت پر عمل کیا جائے اور لڑائی سے محفوظ رہا جائے۔ لیکن محمد اعظم اس پر آمادہ نہ تھا۔ وہ پورے ملک کا خود بادشاہ بننا چاہتا تھا۔ بالآخر لڑائی ہوئی اور سخت خوں ریزی کے بعد بہادر شاہ فتح یاب ہوا، اور ہندوستان کا تاج شاہی سر پر رکھا۔

کہا جاتا ہے کہ فریقین کی فوج ساڑھے چھ لاکھ کی کثیر تعداد پر مشتمل تھی۔ جنگ کے نتیجے میں محمد اعظم اور اس کے دو لائق اور شجاع بیٹے بیدار بخت اور والاجاہ مارے گئے، اور بہت سے امرائے مملکت اور ماہرین جنگ قتل ہو گئے۔ یہ واقعہ اتوار کے دن ۱۸ ربیع الاول ۱۱۱۹ھ (۸/ جون ۱۷۰۷ء) کو پیش آیا۔ یعنی اورنگ زیب

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عالم گیر کی وفات سے صرف چار مہینے بعد۔

بہادر شاہ کا سب سے چھوٹا بھائی کام بخش تھا اور باپ کے زمانے میں بیجاپور کا والی تھا۔ اس نے اپنے نام کا سکہ جاری کیا اور خطبے میں بھی اپنا نام شامل کیا۔ بہادر شاہ لشکر کثیر کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوا اور حیدرآباد کے قریب جا پہنچا۔ ادھر کام بخش بھی اپنی سپاہ کے ساتھ نمودار ہوا۔ لڑائی کے شعلے بلند ہوئے اور کام بخش کو میدان جنگ میں شدید زخم آئے۔ اسی حالت میں گرفتار کر کے اسے شاہی کیمپ میں لایا گیا۔ بہادر شاہ نے اپنے بیٹے معزالدین کو کام بخش کے استقبال کے لیے بھیجا اور حکم دیا کہ اسے اعزاز و اکرام کے ساتھ لایا جائے۔ جب اس کو سخت زخمی حالت میں خیمے میں لایا گیا اور اس کے مرتبے کے مطابق جگہ دی گئی تو وہ زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا۔ بہادر شاہ بھائی کی ملاقات کے لیے آیا اور رقت آمیز لہجے میں کہا:

نمی خواستم کہ شمارا چنیں بہ بینم ❶۔

(میں آپ کو اس حالت میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔)

کام بخش نے بھی سرد آہ بھر کر بہادر شاہ کو انہی الفاظ میں جواب دیا اور وفات پا گیا۔ ''جان بجان آفرین سپرد ❷''

یہ واقعہ ۳/ ذی قعدہ ۱۱۲۰ھ (۱۳/ جنوری ۱۷۰۹ء) کو رونما ہوا۔ اور بہادر شاہ کابل سے لے کر کلکتہ کے آخری سرے تک ہندوستان کے وسیع ملک کا بادشاہ بنا۔

شاہ عالم بہادر شاہ اول بہت متحمل مزاج بادشاہ تھا۔ وہ علما و صوفیا کی مجالس میں بھی حاضر ہوتا اور ان سے مستفید ہوتا تھا۔ اگر اس قسم کی کسی مجلس میں مزاج شاہانہ کے خلاف بھی کوئی بات ہو جاتی تو خاموشی اختیار کر لیتا۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ اردو کے مشہور شاعر اور صوفی خواجہ میر درد کے ہاں ہر مہینے ارباب تصوف کا اجتماع ہوتا تھا۔ اس میں ایک مرتبہ شاہ عالم بلا اطلاع چلا آیا۔ اس روز اس کے پاؤں میں تکلیف تھی اور درد ہو رہا تھا اس لیے ذرا پاؤں پھیلا دیا۔ میر درد نے بادشاہ کو اس حالت میں بیٹھے ہوئے دیکھا تو کہا۔ ''یہ حرکت فقیر کے آداب محفل کے خلاف ہے۔'' بادشاہ شرمندہ ہوا اور کہا: ''معاف کیجیے پاؤں میں عارضہ ہے، اس لیے معذور ہوں'' میر درد نے کہا۔ ''عارضہ تھا تو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔''

یہ ایک مثال ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ دور زوال کے مغل بادشاہ بھی علما و صوفیا کی انتہائی قدر کرتے اور ان کے سامنے زبان کو حرکت نہ دیتے تھے۔ اگر ان سے کوئی غلطی ہو جاتی تو فوراً معذرت طلب کر لیتے تھے۔

مغل دور کی تاریخ بتاتی ہے کہ بہادر شاہ عالم و فاضل، بامروت، خوش اخلاق عمدہ کردار کا مالک،

❶ سیر المتاخرین، ج ۲ ص ۳۷۹

❷ سیر المتاخرین ج ۲ ص ۳۷۹

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عبادت گزار، صاحبِ عزم اور جرأت مند بادشاہ تھا۔ مطالعۂ کتب کا شائق اور علما کا عقیدت مند تھا۔ اصحاب فضل اور ارباب کمال کا احترام کرتا تھا۔ فیاض دل اور نیک طینت تھا۔ عادل ومنصف اور غریب پرور تھا۔ فریادی کی دادرسی کرتا اور درخواست گزار اس کے دربار سے مایوس نہ جاتا۔ لیکن تدبر سے محروم، سیاسی معاملات میں غور وفکر سے عاری اور قوت فیصلہ سے تہی دامن تھا۔ یعنی اس تلاطم خیز زمانے میں جس چیز کی اصل ضرورت تھی وہ اس میں نہیں پائی جاتی تھی۔ اس کے ان عیوب نے آگے چل کر مغل سلطنت کو بے حد نقصان پہنچایا اور اس کے نظم ونسق کی چولیں ڈھیلی کر دیں۔ بہادر شاہ کی بے بصیرتی اور بے تدبیری کی وجہ سے تین قومیں اس کی پریشانی کا باعث بنیں:

۱۔ مرہٹے۔

۲۔ سکھ۔

۳۔ راجپوت۔

مرہٹوں نے بہادر شاہ کے باپ اورنگ زیب عالم گیر کو بھی ہمیشہ پریشانی میں مبتلا کیے رکھا تھا۔ اگرچہ اس نے بہت حد تک مرہٹوں کو زیر اور ان کے بڑے بڑے ٹھکانوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن وہ ان کی جمعیت اور طاقت کو جو بڑا زور پکڑ چکی تھی کلیۃً ختم کر دینے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ چنانچہ اس کی وفات کے بعد انھوں نے پھر سر اٹھایا اور میدان میں نکل آئے۔ یہ نہایت بے رحم اور لٹیرے لوگ تھے جو صرف مسلمانوں ہی کے مخالف نہ تھے اور فقط انھی کو ہدف ستم نہ بناتے تھے، ہندوؤں کو بھی تنگ کرتے اور ان پر کئی قسم کے ظلم ڈھاتے تھے۔ یعنی بلا استثنا وہ سب کے دشمن تھے اور ہر طبقے کے لیے مصیبت کا باعث بنے ہوئے تھے۔ ان کے بے پناہ مظالم کی وجہ سے تمام لوگ ان سے پریشان تھے۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ بہادر شاہ کو ان کے سامنے جھکنا اور مجبوراً علاقۂ دکن کے خراج سے انھیں حصہ ادا کرنا پڑا۔ یہ پہلی بہت بڑی کمزوری تھی جس کا مرہٹوں کے مقابلے میں بہادر شاہ نے عملاً اظہار کیا۔ ایک مغل تاج دار اور اورنگ زیب عالم گیر کے وارث کا اس طرح مخالف کے سامنے سرنگوں ہو جانا انتہائی افسوس ناک بات تھی۔ آگے چل کر اس کے نہایت تکلیف دہ نتائج نکلے اور ہندوستان کی مغل سلطنت کے اسباب زوال میں اسے ایک اہم سبب قرار دیا گیا۔

دوسرا گروہ سکھوں کا تھا جو مغلوں کے لیے سخت پریشانی کا موجب بنا۔ سکھوں کی تاریخ کا آغاز پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں گرونانک سے ہوتا ہے۔ وہ توحید کی تبلیغ کرتے اور لوگوں کو اللہ کی عبادت کا درس دیتے تھے۔ ہندوؤں کے علاوہ مسلمان بھی ان کو احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ وہ فقیر طبع اور درویش منش آدمی تھے۔

گرونانک کی وفات کے بعد جو شخص ان کی گدی پر بیٹھا، اس کا نام انگد تھا، جو گروجی کا ایک مخلص

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

م اور پیروکار تھا۔ وہ تیرہ سال تک لوگوں میں گرونانک کی تعلیم کا پرچار کرتا رہا۔ انگد کی موت کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنے ایک ارادت مند امرداس کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ امرداس نے بائیس برس تک اس سلسلے کو چلایا اور اپنے داماد رام داس کو اپنا خلیفہ بنایا، جو سات سال اس مسند پر فائز رہے۔ بعدازاں ان کے بیٹے گرو ارجن نے باپ کی جگہ سنبھالی۔ وہ پچیس برس تک اپنے گروؤں کی تعلیم کو پھیلاتے رہے۔ انھوں نے اپنے فرقے کی جتھہ بندی کی۔ پھر ان کے بیٹے گرو ہرگوبند وارث ہوئے اور اڑتیس (۳۸) سال اس مسند پر متمکن رہے اور سکھوں میں فوجی روح پھونکی۔ گورو ہرگوبند نے اپنے بعد اپنے نواسے ہررائے کو اس تعلیم کے فروغ کے لیے مقرر کیا۔ ہررائے سترہ سال اپنے عقیدت مندوں کی رہنمائی کرتے رہے۔ پھر ان کے بیٹے ہرکشن گدی نشین ہوئے۔ وہ صرف تین سال ہی اپنے فرقے کی قیادت کر پائے تھے کہ فوت ہو گئے۔ ان کے بعد گرو ہرگوبند کے بیٹے گرو تیغ بہادر سکھ پنتھ کی خدمت کے لیے میدان میں نکلے۔

گرو تیغ بہادر کے زمانے میں اس فرقے کے لوگوں نے صرف بھگتی اور درویشی پر ہی قناعت نہ کی، بلکہ سیاست کے میدان میں اتر آئے۔ ان کے پیرو باقاعدہ مسلح ہو کر وسیع تعداد میں باہر نکلتے اور پوری آزادی سے گرو کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں گھومتے پھرتے۔ اس طرح یہ لوگ حصول اقتدار کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے اور حکومت پر قبضہ کرنے کی غرض سے منظم ہونے لگے۔ حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ لوگوں سے اپنی ضرورت کی چیزیں جبراً وصول کرتے اور ملک میں بدامنی پھیلاتے۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسی زمانے میں ایک مسلمان فقیر بھی جس کا نام حافظ آدم تھا، پنجاب میں لوٹ کھسوٹ کرتا پھرتا تھا۔ یہ شخص مسلمانوں کو پریشان کرتا اور گرو تیغ بہادر مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو مختلف طریقوں سے ہراساں کرتا تھا۔ شاہی وقائع نگاروں نے اورنگ زیب عالم گیر کو اطلاع دی کہ دو شخص درویشوں اور فقیروں کے بھیس میں رعایا میں خوف و ہراس پیدا کر رہے ہیں اور کچھ لوگ ان کے ساتھ مل گئے ہیں۔ اگر ان کے خلاف کارروائی نہ کی گئی اور ان کی سرگرمیوں کو فوری طور پر بند نہ کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ آگے چل کر یہ ملک اور حکومت کے لیے بہت بڑا خطرہ بن جائیں گے۔ چنانچہ اورنگ زیب نے ادھر توجہ کی اور لاہور کے صوبے دار کو لکھا کہ اس فتنے کو جس طرح ممکن ہو ختم کیا جائے۔ صوبے دار نے بادشاہ کے حکم پر عمل کیا اور باغیوں کو سزا دی۔ ظاہر ہے جب بادشاہ نے خود اپنے بھائیوں اور بیٹوں کی بغاوت کو برداشت نہیں کیا تو ان کی بغاوت کو جس کا دائرہ فقر و درویشی کی شکل میں روز برو وسیع ہو رہا تھا اور امن پسند رعایا جن کے مظالم سے سخت تکلیف میں مبتلا تھی، کس طرح برداشت کر سکتا تھا۔ اس نے مسلمان فقیر حافظ آدم کو ملک بدر اور سکھ گرو کو باغیانہ سرگرمیوں کی وجہ سے قتل کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی جمعیت منتشر ہو گئی۔

اس کے بعد دسویں گرو گوبند سنگھ کا زمانہ آیا۔ ان کا دور ۱۶۷۵ء سے شروع ہو کر ۱۷۰۸ء تک چلتا رہا۔ انھوں نے دوبارہ سکھ پنتھ کو مسلح اور منظم کیا۔ وہ مذہب جس کی ابتدا فقر و درویشی سے ہوئی تھی، گرو گوبند

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سنگھ کی کوششوں سے خنجر و شمشیر کا مذہب بن گیا اور اس کے ماننے والے ''خالصہ'' کا روپ دھار کر تلوار اور کرپان ہاتھ میں پکڑ کر میدان میں نکل آئے۔ جب ان کا باغیانہ رویہ حد سے بڑھ گیا تو مجبوراً شاہی فوج حرکت میں آئی۔ گرو جی بھاگ کر پہاڑی علاقے میں روپوش ہو گئے، لیکن انکے دو لڑکوں کو گرفتار کر کے بغاوت کے جرم میں قتل کر دیا گیا۔

یہاں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ وفات سے پہلے گرو گوبند سنگھ مغل فوج میں عہدے دار مقرر ہو گئے تھے اور پھر جب بہادر شاہ کے زمانے (۱۷۰۸ء) میں ایک پٹھان نے ذاتی عداوت کی بنا پر دکن میں انھیں زخمی کیا تو بہادر شاہ نے ان کے علاج کے لیے شاہی طبیب بھیجا تھا۔

گرو گوبند سنگھ کے بعد ایک اور شخص سامنے آیا، جس نے مسلمانوں پر بے پناہ ظلم کیے۔ اس کو تاریخ میں بندہ بیراگی، یا بندہ بہادر یا بندہ سنگھ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ شخص دراصل ہندو تھا اور اس کا نام لچھمن داس تھا۔ گورو گوبند سنگھ کے قیام دکن کے زمانے میں یہ ان کے پاس گیا۔ انھوں نے پوچھا ''کون ہو؟'' کہا ''بندہ۔''! اس کے بعد یہ اسی نام سے مشہور ہو گیا۔

یہ بہادر شاہ اول کا عہد تھا اور مغل حکومت روبہ زوال ہو چکی تھی۔ بندہ بیراگی نے موقع سے فائدہ اٹھا کر غیر مسلموں کی ایک جمعیت فراہم کر لی جو سکھوں اور ہندوؤں پر مشتمل تھی، پھر ان کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا اور اپنے آپ کو سکھوں کے گروؤں کا خیر خواہ ظاہر کر کے مسلمانوں کو انتہائی ظلم و ستم کا شکار بنایا۔ ان کے بچوں کو قتل کیا، جوانوں کو مارا، حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر دیے، بوڑھوں کو موت کے گھاٹ اتارا، اور ان کے گاؤں کے گاؤں جلا ڈالے۔ یہ انتہائی سفاک اور درندہ صفت آدمی تھا۔ اس کو انسان کہنا انسانیت کی توہین ہے۔ اس نے متعدد قصبات کو تاراج کیا اور کئی شہروں میں غارت گری کی۔ بے شمار زندہ لوگوں کو آگ میں جھونک دیا۔ ترس اور رحم نام کی کسی چیز سے یہ آشنا نہ تھا۔ سکھوں کا ایک فرقہ اس ستم گر کو گرو مانتا ہے۔

بندہ بیراگی اور اس کے گروہ کی دل خراش اور جگر فگار داستانیں سن کر خود بہادر شاہ اس کی گوشمالی کے لیے دہلی سے لاہور پہنچا، لیکن وہ اس کے قابو میں نہ آیا۔ اس کے بعد فرخ سیر نے اس کو ختم کرنے کا ارادہ کیا اور اس کے نامور امیر عبدالصمد خان نے اسے گرفتار کر لیا اور پھر اسے قتل کر دیا گیا۔

تیسرا اہم مسئلہ جس سے مغل حکمران دوچار ہوئے، راجپوتوں کا تھا۔ ان کے بارے میں مختصر طور پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ دہلی سے بجانب جنوب کم و بیش ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر ان کے مشہور قصبات واقع تھے جو آج بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ جے پور، جودھ پور وغیرہ علاقوں میں یہ لوگ بڑی تعداد میں آباد تھے اور کسی نہ کسی شکل میں ان کی حکومتیں قائم تھیں۔ ان کے مشہور ٹھکانوں اور اہم قصبوں میں سے بیانہ، کامہ، ڈیگ قابل ذکر ہیں، ان کا مرکزی مقام بھرت پور تھا، جو ریاست بھرت پور کا دارالحکومت تھا۔ آزادئ ملک کے بعد ریاستوں کی حیثیت باقی نہ رہی تو بھرت پور اس ضلعے کا صدر مقام ہو گیا۔ اس علاقے کی سرحدیں

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آگرہ اور متھرا سے ملتی ہیں۔ آگرہ سے بھرت پور زیادہ سے زیادہ پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر ہوگا۔ ہندوؤں کے نزدیک اس علاقے کو تاریخی عظمت بھی حاصل ہے اور مذہبی تقدس بھی، کیونکہ سری کرشن جی کی ولادت اسی علاقے میں ہوئی تھی اور ان کا خاندان اس علاقے میں سکونت پذیر تھا۔ یہ روایت بھی مشہور ہے کہ بھرت پور کرشن جی کے چچا کے نام پر آباد کیا گیا تھا۔ نیز کہا جاتا ہے کہ وہاں کے قصبے ''کامہ'' میں سری کرشن کے نانا اقامت گزین تھے۔

مغل بادشاہوں کے عہد عروج میں یہ علاقہ شاہی خاندان کے بعض افراد کو جاگیر کے طور پر عطا ہوا کرتا تھا۔ نور جہاں کو جو مغلوں کے زمانۂ عروج کی مشہور و ممتاز ملکہ تھی، جاگیر میں یہی علاقہ دیا گیا تھا۔ اس علاقے میں راجپوتوں کی آبادی تعداد میں شاید زیادہ نہیں ہوگی لیکن قوت و طاقت میں یہ لوگ ہمیشہ نمایاں اور غالب رہے۔ ان میں سے متعدد خاندانوں نے ہندو مذہب ترک کر کے اسلام قبول کر لیا تھا اور وہ اب میواتی کہلاتے ہیں، ان میواتیوں میں سے کچھ لوگ تو قیام پاکستان کے بعد نقل مکانی کر کے پاکستان آ گئے اور کچھ وہیں آباد ہیں۔

جب مغلیہ سلطنت کی مرکزی طاقت میں زوال کے آثار نمایاں ہونے لگے اور ملک میں طوائف الملوکی پھیلنے لگی تو علاقۂ بھرت پور کے راجپوتوں میں بھی اپنی خود مختار حکومت قائم کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ان کے سردار کا نام بدن سنگھ تھا۔ ۱۷۲۳ء میں ڈیگ کے مقام پر اس کو راج تلک دیا گیا۔ اس نے بھرت پور کو اپنی راج دھانی بنایا اور ایک با اختیار راجے کی حیثیت سے حکومت کرنے لگا۔ اس کے بائیس لڑکے تھے۔ سب سے بڑا لڑکا سورج مل تھا، جو بہت خردمند، با استعداد اور سیاست کے نشیب و فراز سے آگاہ تھا۔ بدن سنگھ نے سورج مل کو ولی عہد بنایا اور حکومت کا کاروبار اس کے سپرد کیا۔ بدن سنگھ نے تینتیس برس دو ماہ دس دن حکومت کر کے ۱۷۵۶ء (۱۱۷۰ھ) کو اس دنیائے فانی سے کوچ کیا۔ اس کے بعد سورج مل نے مستقل فرماں روا کی حیثیت سے ریاست کی زمام اختیار ہاتھ میں لی۔ وہ راجپوتوں کا اس قدر بلند حوصلے اور مضبوط عزم و ارادے کا حکمران تھا کہ اس دور کے ہندوستان کی ہر حکومت اس کی سیاسی طاقت کا وزن محسوس کرتی اور معاملہ فہمی سے متاثر تھی۔

اس سلسلے میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ جب احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کے خلاف محاذ آرائی کی اور ان کی طاقت کو ختم کرنے کے لیے میدان میں اترا تو مرہٹوں نے سورج مل کے دروازے پر دستک دی اور طالبِ امداد ہوئے۔ یہ بڑا نازک موقع تھا، لیکن سورج مل نے نہایت عقل مندی کا ثبوت دیا اور سیاسی بصیرت کی بنا پر اس جنگ میں ملوث ہونے سے بھی بچ گیا اور اپنی ریاست کو بھی محفوظ رکھا۔ اس نے مرہٹوں کو یہ دانشمندانہ مشورہ دیا کہ وہ چوں کہ گوریلا جنگ لڑنے کے عادی ہیں، اس لیے ابدالی کے مقابلے میں یہی جنگ لڑیں۔ بھاری اسلحۂ جنگ، شاہانہ خیمے اور حرم سرائیں اس موقعے پر ان کے لیے کارآمد نہیں ہوں گے۔ یہ سب چیزیں ان کے لیے مصیبت بن جائیں گی۔ مناسب یہ ہے کہ یہ ساز و سامان ریاست بھرت پور کے قلعوں میں

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محفوظ کر دیا جائے اور صرف خالی گھوڑوں پر سوار ہو کر ابدالی کا مقابلہ کیا جائے۔ مرہٹہ سرداروں نے سورج مل کی اس تجویز کو سراہا اور اس کی رائے سے اتفاق کیا، لیکن سداشیوراؤ بھاؤ جو مرہٹوں کا کمانڈر انچیف تھا، اس رائے سے متفق نہیں ہوا، اس نے یہ کہہ کر سورج مل کی تجویز رد کر دی کہ سورج مل ایک بڑا زمیندار ہے جس نے آرام وراحت کی زندگی اختیار کر لی ہے، اس کو لڑائی سے کیا واسطہ اور یہ کیا جانے کہ دشمن کا مقابلہ کس طرح کیا جاتا ہے۔ اس گفتگو کا نتیجہ یہ ہوا کہ سورج مل کو لڑائی سے محفوظ رہنے اور فریق جنگ نہ بننے کا بہترین موقع میسر آ گیا۔

لیکن سورج مل نے سیاست میں انتہائی زیرک ہونے کے باوجود ایک بہت بڑی غلطی بھی کی جو بالآخر اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔ نجیب الدولہ اس کا پرانا اور مخلص دوست تھا، اس نے اس کو اپنا مخالف بنا لیا۔ وہ اس طرح کہ اس کی بیماری کے زمانے میں کسی معمولی سی بات پر سورج مل نے دہلی کی طرف یلغار کی اور اس پر حملہ کر دیا، مگر نتیجہ سورج مل کی توقع کے خلاف نکلا۔ مخالف فوج میدان میں نکلی تو سورج مل مقابلے میں مارا گیا۔ یہاں یہ بات بھی لائق مطالعہ ہے کہ جب سورج مل زخمی ہو کر گر پڑا تو اس کے مخلص محافظوں میں سے ایک مسلمان پیرزادہ بھی تھا، جس کا نام شیخ احمد تھا اور فتح پور کا رہنے والا تھا۔ اس پر سورج مل بہت اعتماد کرتا تھا۔ یہ بھی سورج مل کی حفاظت اور مدافعت کرتا ہوا اس کے ساتھ ہی قتل ہو گیا۔ یہ واقعہ ۱۷۶۴ء (۱۱۷۷ھ) میں پیش آیا۔ سورج مل نے آٹھ سال دو ماہ پندرہ دن حکومت کی۔

بہرحال اورنگ زیب عالم گیر کے زمانے میں بھی اور اس کی وفات کے بعد بالخصوص مغل بادشاہوں کو جن خطرناک اور بڑے مسائل سے دوچار ہونا پڑا، ان میں مرہٹوں، سکھوں اور راجپوتوں کا ذکر بہت اہم ہے۔ آگے چل کر اس سلسلے میں جو واقعات رونما ہوئے اور جو طاقتیں ان کے لیے اذیت کا باعث بنیں، موقع و محل کی مناسبت سے ان کا مناسب الفاظ واسلوب میں ذکر کیا جائے گا۔

اورنگ زیب عالم گیر کے جانشین محمد معظم بہادر شاہ اول کے حالات میں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ وہ مسلکاً شیعہ تھا اور شیعیت کی تبلیغ بھی کرتا تھا۔ جب وہ لاہور آیا تو علما کو حکم دیا کہ وہ جمعہ اور عیدین کے خطبوں میں علی ولی اللہ ووصی رسول اللہ کے الفاظ کا اضافہ کریں۔ اس پر ایک ہنگامہ بپا ہو گیا اور علما نے جن میں مولانا محمد مراد لاہوری اور مولانا یار محمد لاہوری پیش پیش تھے، بادشاہ کے حکم کے خلاف سخت احتجاج کیا اور ماننے سے انکار کر دیا۔ لاہور کے عوام نے علما کا ساتھ دیا۔ لاہور کی بادشاہی مسجد میں لوگ ایک ہجوم کی شکل میں خطبۂ جمعہ میں شامل ہوئے اور بادشاہ کے اس حکم کی شدید مخالفت کی۔ بادشاہ نے علما کو طلب کیا اور فقہا و مجتہدین کے اقوال پیش کر کے دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس کا حکم مبنی بر صحت ہے۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا اور بحث ومناظرے میں علما کے دلائل وزنی ثابت ہوئے۔ بعض علما کو اس موقعے پر گرفتار بھی کیا گیا۔ لیکن اس کا بیٹا عظیم الشان جو سنی العقیدہ تھا، درمیان میں پڑا۔ اس نے علما کے موقف کی حمایت کی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور باپ کو اپنا حکم واپس لینے پر مجبور کیا۔ یہ واقعہ دیگر مؤرخین کے علاوہ منشی غلام حسین طباطبائی نے بھی سیر المتاخرین میں بیان کیا ہے، چونکہ یہ مورخ خود شیعہ ہے، اس لیے اس کے اسلوب بیان میں بادشاہ کی تائید اور علما کی مخالفت صاف نظر آتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ علما نے نہایت ''عصبیت'' سے کام لیا۔ ''بلوائے عام'' پر اتر آئے اور وہ ناصبی تھے۔ ''ناصبی شعارند❶''۔

مجموعی طور پر بہادر شاہ اچھا آدمی تھا اور علم و علما سے تعلق رکھتا تھا۔ ہمدرد و خیر خواہ اور رحم دل تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ تخت نشینی کے سلسلے میں یہ بھائیوں سے جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا اور مخلوق خدا کی خوں ریزی سے گریزاں تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ باپ کی وصیت کے مطابق سلطنت ہند کو تینوں بھائیوں میں تقسیم کرلیا جائے، لیکن دوسرے دونوں بھائیوں نے اس سے اتفاق نہ کیا اور باپ کی وصیت کو درخور اعتنا نہ سمجھا، تو مجبوراً اسے تلوار سے کام لینا پڑا۔ مگر اس کے باوجود مقتول بھائیوں کے بیٹوں سے نہایت اچھا سلوک روا رکھا اور ان کو برابر مستحق محبت والفت گردانتا رہا۔

بہادر شاہ کے زمانے میں کوئی اہم کام نہیں ہوا، بلکہ ملک میں کئی سیاسی الجھنیں پیدا ہوئیں اور سلطنت مغلیہ ترقی کے بجائے زوال سے روشناس ہوئی اور متعدد ایسے گروہ عالم وجود میں آ گئے جن میں سے آگے چل کر ہر گروہ مستقل خطرے کا نشان بن گیا۔

ہندوستان کے اس بادشاہ کو ''شہ بے خبر'' کہا جاتا تھا❷۔ یہ لفظ اس کے لیے کیوں استعمال ہوتا تھا؟ مورخین اس کی کوئی توجیہ نہیں بیان کرتے۔ لیکن اس زمانے کے حالات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے یہ لقب اسے اس لیے دیا تھا کہ وہ امور سلطنت میں اتنی دلچسپی نہیں لیتا تھا، جتنی اس کے آباواجداد لیتے تھے اور یہ کہ اس کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے سلطنت میں ضعف و اضمحلال پیدا ہوگیا تھا۔ حالانکہ وہ نہایت نازک دور تھا اور ہر طرف مخالفت کی مہیب گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور اس دور میں مغلیہ سلطنت کو مضبوط و مستحکم بنانے کے لیے انتہائی جدوجہد اور مستعدی کی ضرورت تھی، لیکن بہادر شاہ اس وصف سے بہرہ مند نہ تھا۔

بہادر شاہ کے آخری دور میں پنجاب سکھوں کے شدید مظالم کی زد میں آ گیا تھا اور ان کے لیڈر بندہ بیراگی نے اس پورے علاقے کو بے پناہ مصائب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اس کے سدباب کے لیے بہادر شاہ دہلی سے لاہور پہنچا، وہ کوشش کے باوجود باغیوں پر تو قابو نہ پا سکا لیکن اس اثنا میں وہ خود بیمار پڑ گیا اور ۲۱ر محرم ۱۱۲۴ھ/ ۹ر فروری ۱۷۱۲ء کو وفات پا گیا۔ اس کی میت لاہور سے دہلی لے جائی گئی اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مرقد کے جوار میں اسے دفن کیا گیا۔

بہادر شاہ نے ستر سال چھ مہینے عمر پائی اور پانچ سال ایک مہینا بائیس دن حکومت کی۔

❶ اصل فارسی الفاظ کے لیے دیکھیے سیر المتاخرین ج ۲ ص ۳۸۱

❷ منتخب اللباب حصہ دوم ص ۶۳۰۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معز الدین جہاں دار شاہ:

بہادر شاہ کی وفات کے بعد تخت نشینی کے مسئلے پر پھر اس کے بیٹوں کے درمیان جھگڑا ہوا، اور آتش جنگ مشتعل ہوئی۔ اب مغلیہ خاندان کے نااہل اسلاف نے لاہور کو میدان جنگ بنایا۔ پہلی جنگوں کی طرح یہ جنگ بھی نہایت ہولناک اور شدید تھی۔ اس جنگ میں بہادر شاہ کے بیٹوں میں سے جہاں دار شاہ، رفیع الشان اور جہاں شاہ ایک طرف تھے اور عظیم الشان ایک طرف! جنگ کے نتیجے میں عظیم الشان مارا گیا۔ لیکن اس کے تین دن بعد جہاں دار شاہ، رفیع الشان اور جہاں شاہ کے درمیان پھر معرکۂ قتال گرم ہوا اور رفیع الشان اور جہاں شاہ قتل ہوئے۔ ان کے بیٹے بھی مارے گئے اور معز الدین جہاں دار شاہ اورنگ سلطنت پر متمکن ہوا۔ یہ بادشاہ بالکل نااہل اور بعض وزرا و امرا کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا، اس کی اپنی کوئی رائے نہ تھی، وزیر جو چاہتے کرتے تھے۔ اس نے اقتدار ہاتھ میں لیتے ہی جہاں تک ممکن ہوا مغل خاندان کے ان تمام شہزادوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، جن سے کوئی خطرہ پیدا ہو سکتا تھا۔

فرخ سیر:

بہادر شاہ اول کے بیٹے عظیم الشان کا ایک بیٹا فرخ سیر تھا جو اس جنگ میں بارہہ کے سید حسین علی خاں (صوبے دار بہار) کی وجہ سے بچ گیا تھا۔ اس نے جہاں دار شاہ سے باپ اور بھائی کے خون کا بدلہ لینے کا عزم کیا اور بنگال سے بھاری لشکر کے ساتھ آگرے کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں دار شاہ کو اس کی آمد کی اطلاع ہوئی تو وہ بھی اپنے بڑے بیٹے اعز الدین کی معیت میں لشکر عظیم کے ساتھ مقابلے کو نکلا۔ اس وقت بارہہ کے سادات (دونوں بھائی) سید حسین علی خاں (صوبے دار بہار) اور سید حسن علی خاں (صوبے دار الٰہ آباد) بھی فرخ سیر کے ہم رکاب تھے۔ ۲۸ دسمبر ۱۷۱۲ء کو آگرہ کے قریب دونوں طرف کی فوجیں مقابلے میں اتریں اور سخت لڑائی ہوئی، جس میں فرخ سیر جیت گیا۔ ۱۷ ذی قعدہ ۱۱۲۴ھ/ ۵ دسمبر ۱۷۱۲ء کو جہاں دار شاہ جان بچا کر میدان محاربہ سے فرار ہوا اور دہلی کا رخ کیا۔ فرخ سیر فتح یاب ہونے کے بعد ۱۸ ذی قعدہ ۱۱۲۴ھ (۶ دسمبر ۱۷۱۲ء) کو آگرہ میں تخت حکومت پر متمکن ہوا۔ چند روز وہیں مقیم رہا۔ اس کے بعد دہلی کو لوٹا اور حالات کا جائزہ لیا۔ ۲۳ ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ/ ۱۰ جنوری ۱۷۱۳ء کو جمعے کے روز فرخ سیر کے حکم سے معز الدین جہاں دار شاہ کو قتل کر دیا گیا، اور اس کے ساتھ ہی اس کے امیر الامرا ذوالفقار خاں کا سر بھی تلوار سے اڑا دیا گیا۔

جہاں دار شاہ ۱۰۷۲ھ/ ۱۶۶۲ء کو پیدا اور ۲۳ ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ/ ۱۰ جنوری ۱۷۱۳ء کو قتل ہوا۔ ۵۲ سال نو مہینے عمر پائی۔ اپنے والد بہادر شاہ اول کی وفات سے لے کر آگرہ میں فرخ سیر کے ہاتھوں شکست کھانے تک دس مہینے حکومت کی۔ دہلی میں مقبرۂ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے قریب دفن ہوا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فرخ سیر نے سادات بارہہ یعنی سید حسین علی خاں اور سید حسن علی خاں کی مدد سے تاج شاہی سر پر رکھا۔ مغلیہ عہد کے امرائے مملکت میں یہ دونوں بھائی بہت اہمیت اختیار کر گئے تھے۔ حسین علی خاں صوبہ بہار کا اور حسن علی خاں صوبہ الہ آباد کا والی تھا۔ دونوں بھائی نہایت مغرور اور خود سر تھے۔ انھیں مغلوں کے دور زوال میں عملاً ''بادشاہ گر'' کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی، جس کو چاہتے تخت سے اتار دیتے اور جس کو چاہتے بٹھا دیتے۔ فرخ سیر بھی انہی کی مدد اور کوشش سے برسر اقتدار آیا تھا۔ فرخ سیر ایک محتاط اور معاملہ فہم حکمران تھا۔ رعایا کا خیال رکھتا تھا۔ علمائے دین سے بھی اس کے مراسم و روابط تھے۔ اس نے جب دیکھا کہ پنجاب میں بندہ بیراگی نے لوگوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنا رکھا ہے اور سکھ مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو پریشان کر رہے ہیں تو اس کی رگ حمیت جوش میں آئی اور ظالموں کو وہ سزا دی جس کے وہ واقعی مستحق تھے۔

پھر اس نے جب یہ محسوس کیا کہ بارہہ کے سید برادران اس پر چھا گئے ہیں اور وہ ان کی گرفت میں ہے تو ان سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کا نتیجہ اس کے حق میں نہایت اذیت ناک نکلا اور وہ ان کی قید میں بری طرح پھنس گیا۔ انھوں نے اس کو گرفتار کر کے آنکھوں میں لوہے کی سلائی پھیر دی اور بصارت سے محروم کر دیا۔ بعد میں انتہائی ذلت کے ساتھ اسے قتل کر دیا گیا۔

فرخ سیر ۱۰۹۸ھ/ ۱۶۸۷ء کو پیدا ہوا۔ ۱۸؍ ذیقعدہ ۱۱۲۴ھ/ ۶؍ دسمبر ۱۷۱۲ء کو بادشاہ بنا۔ ۱۱۲۸ھ کے شروع میں جسونت سنگھ راٹھور کے بیٹے مہاراجہ اجیت سنگھ کی لڑکی سے شادی کی۔ ۸؍ ربیع الثانی ۱۱۳۱ھ (۱۷؍ فروری ۱۷۱۹ء) کو بارہہ کے سید بھائیوں نے اس کو دہلی کے قلعے میں گرفتار کر کے قتل کر دیا۔

فرخ سیر کو ہمایوں کے مقبرے میں دفن کیا گیا۔ اس کی مدت حکومت ساڑھے چھ سال کے قریب بنتی ہے۔

رفیع الدرجات:

فرخ سیر کو قتل کرنے کے بعد سادات بارہہ نے ۹؍ ربیع الثانی ۱۱۳۱ھ/ ۱۸؍ فروری ۱۷۱۹ء کو رفیع الشان کے بیٹے اور بہادر شاہ کے پوتے شمس الدین محمد ابوالبرکات رفیع الدرجات کو تخت نشین کیا۔ اس سے قبل یہ قلعۂ سلیم گڑھ میں محبوس تھا، وہاں سے نکال کر حکومت ہند کی باگ ڈور اس کے سپرد کی گئی، لیکن یہ سل اور دق کا مریض اور نہایت نحیف و کمزور آدمی تھا۔ دو مہینے دس دن حکومت کے بعد ۱۹؍ رجب ۱۱۳۱ھ/ ۲۷؍ مئی ۱۷۱۹ء کو وفات پا گیا۔

رفیع الدولہ:

رفیع الدرجات کی وفات کے بعد سادات بارہہ نے اس کے بھائی شمس الدین محمد رفیع الدولہ شاہ جہان ثانی کو بادشاہ بنایا۔ ۲۰؍ رجب ۱۱۳۱ھ/ ۲۸؍ مئی ۱۷۱۹ء کو تاج شاہی اس کے سر پر رکھا۔ چند روز بعد یہ بھی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دنیا سے کوچ کر گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ ان سیدوں نے ہندوستان کی مغل بادشاہت کو کھیل بنا رکھا تھا۔ جس کو چاہتے بادشاہ بنا دیتے اور جب جی چاہتا اس کو موت کی نیند سلا دیتے۔ رفیع الدولہ کے بعد نیکو سیر کو بادشاہت عطا کی۔ کچھ عرصے کے لیے ایک شخص ابراہیم کو بھی اس اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ یعنی ۱۸ فروری ۱۷۱۹ سے ۲۷ اگست ۱۷۱۹ تک انھوں نے یکے بعد دیگرے رفیع الدرجات، رفیع الدولہ اور نیکو سیر تین شخصوں کو ہندوستان کے تخت سلطنت کا مالک بنایا۔

اس سے آگے محمد شاہ کا دور حکومت شروع ہوتا ہے جو خاصا طویل اور کئی سال کو محیط ہے۔ نیز بہت سے سنگین حوادث و واقعات کو اپنے دامن تاریخ میں سمیٹے ہوئے ہے۔ لیکن اس کا آغاز کرنے سے پہلے سادات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے، کیونکہ مغلوں کے اس دور کے حالات میں بار بار ان کا ذکر آتا ہے۔

سادات بارہہ:

سادات بارہہ سید ابوالفرح کی اولاد سے تھے جو بغداد کے قریب شہر واسط کے رہنے والے تھے۔ ان کا شجرۂ نسب سترھویں پشت میں زید شہید کے واسطے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) میں سید ابوالفرح اپنے بارہ بیٹوں کے ساتھ واسط کی سکونت ترک کر کے ہندوستان آئے اور صوبہ دہلی کی سرہند سرکار میں پٹیالہ کے قریب اس خاندان کے لوگ الگ الگ چار گاؤں میں آباد ہو گئے۔ بعد ازاں یہ سادات اس علاقے سے نکل کر گنگا اور جمنا کے دوآبے میں ضلع مظفر نگر (یوپی) چلے گئے اور مختلف مقامات میں اقامت اختیار کر لی۔

اکبر کے زمانے میں سادات بارہہ نے کئی مہموں میں حصہ لیا اور اپنی جواں مردی کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ اکبر کی وفات کے بعد تخت نشینی کا مسئلہ سامنے آیا تو سید خاں بارہہ نے انتہائی کوشش کی کہ جہاں گیر کے بجائے اس کے بیٹے خسرو کو ہندوستان کا بادشاہ بنایا جائے، مگر وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اورنگ زیب عالم گیر کے زمانے تک اگرچہ یہ سادات مغل فوج میں ملازم تھے لیکن ان کو کبھی کوئی اعلیٰ منصب عطا نہیں ہوا۔

مغل تاریخ کے دو سید برادران حسن علی اور حسین علی اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ضلع مظفر نگر (یوپی) کے قصبہ بارہہ کے باشندے تھے۔ انھوں نے اٹھارھویں صدی کے ابتدائی بیس سالہ دور میں ''بادشاہ گر'' کی حیثیت سے شہرت پائی۔ ان کے والد کا نام سید عبداللہ خاں تھا، جس نے اورنگ زیب عالم گیر کے بخشی ممالک روح اللہ کے زیر نگرانی ترقی کی منزلیں طے کی تھیں۔

سید عبداللہ خاں کے بیٹے حسن علی خاں اور حسین علی خاں حسینی واسطی مملکت تیموریہ کے معروف اور سخت مزاج امرا و وزرا میں سے تھے۔ حسن علی بڑا اور حسین علی چھوٹا تھا۔ حسن علی نے پہلے پہل اورنگ زیب عالم

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گیر سے تقرب حاصل کیا اور مدت تک اس کی سرکار میں خدمت انجام دیتا رہا۔ عالم گیر کی وفات کے بعد دونوں بھائیوں نے اس کے بیٹے شاہ عالم بہادر شاہ سے وابستگی اختیار کی اور جاجو کی لڑائی میں محمد اعظم کے خلاف داد شجاعت دی۔ بہادر شاہ نے فتح یاب ہونے کے بعد تاج شاہی سر پر رکھا تو حسن علی کو الہ آباد کا اور حسین علی کو پٹنہ کا والی مقرر کر دیا اور اعزاز و اکرام کا مستحق گردانا۔ بہادر شاہ نے سفر آخرت اختیار کیا تو ان سید بھائیوں نے اس کے جانشین معز الدین جہاں دار شاہ کو شکست دی اور فرخ سیر کو تخت حکومت پر بٹھا دیا۔ فرخ سیر نے اس کے صلے میں ان کو بہت سے اعزازات سے نوازا۔ حسن علی کو "قطب الملک، یمین الدولہ، سید عبداللہ خاں بہادر، ظفر جنگ، سپہ سالار، یار وفادار" کے القاب سے سرفراز کیا اور اپنا وزیر اعظم بنایا۔ حسین علی کو "عمدۃ الملک بہادر، فیروز جنگ، سپہ سالار، امیر الامرا" کے القاب کے علاوہ میر بخشی کا منصب عطا فرمایا۔ لیکن اس کے بعد ان سیدوں نے فرخ سیر کو بھی بہت بڑی سزا دی، اس کی آنکھیں بے کار کر دیں اور پھر قتل کر دیا۔ اس کے بعد رفیع الدرجات، رفیع الدولہ، نیکو سیر، ابراہیم اور محمد شاہ کو تخت حکومت پر بٹھایا اور بادشاہت کو ایک کھلونے کی حیثیت دے دی۔ لیکن محمد شاہ نے عقل مندی اور چال بازی سے ۶/ ذی الحجہ ۱۱۳۲ھ/ ۲۸/ ستمبر ۱۷۲۰ء کو اثنائے سفر میں حسن علی خاں کو قتل کرا دیا۔ حسین علی خاں اس وقت دہلی میں تھا۔ اسے بڑے بھائی کے قتل کی اطلاع ملی تو نہایت برافروختہ ہوا، جو شہزادے اور امرائے مملکت اس وقت اس کی سخت گیری کی وجہ سے محبوس تھے، انھیں رہا کیا اور ان سے محمد شاہ کے خلاف سازش کر کے ایک فوج تیار کی، اور جنگ کے لیے روانہ ہوا۔ شاہی فوج اور حسین علی کے ساتھیوں کے درمیان لڑائی ہوئی، نتیجہ یہ نکلا کہ حسین علی میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ مگر گرفتار کر کے قید خانے میں ڈالا گیا اور اسی حالت میں ذی الحجہ ۱۱۳۵ھ/ ستمبر ۱۷۲۳ء کی آخری تاریخ کو موت کی آغوش میں چلا گیا۔ بعد ازاں ۱۷۳۷ء میں جب روہیلوں نے مخالف قوتوں کو تاراج کیا تو ان سید برادران کی اولاد و احفاد کو بھی قتل یا منتشر کر دیا گیا اور پھر ان کا کہیں کوئی اثر باقی نہ رہا۔

یہ دونوں بھائی نہایت شجاع، جرأت مند، بہادر، جنگ جو اور دلیر تھے۔ شجاعت و مردانگی میں کوئی ان کا حریف نہ تھا، لیکن حسن علی خاں جاہل، متکبر، انتہائی خودسر اور مغرور تھا۔ سیاسی فہم و فراست سے عاری اور معاملات ملکی میں فکر و تدبر سے ناآشنا تھا۔ اس کے برعکس حسین علی عاقل و فہیم، صاحب جود و کرم اور بہت سے اوصاف کا مالک تھا۔ اہل علم سے تعلق رکھتا، ان کی مجالس میں بیٹھتا اور علمی مسائل میں ان سے بحث و مذاکرہ کرتا تھا۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مغل دربار میں ایک عرصے سے کئی قسم کے جھگڑے چل رہے تھے اور امرائے مملکت اور ارباب حل و عقد ان میں ملوث تھے۔ پھر ان کے نتائج کا سلسلہ دور تک چلتا تھا۔ ان جھگڑوں میں ایک جھگڑا ایرانی اور تورانی امرائے حکومت کا تھا، جو ابتدا میں خالص مذہبی نوعیت کا تھا اور چند لوگوں تک محدود تھا، یعنی امرا کی شیعہ سنی کش مکش۔ تورانی امرا اہل سنت سے تعبیر تھے اور ایرانی امرا شیعہ سے! امرا کی یہ باہمی کش مکش پرانی تھی جو اورنگ زیب عالم گیر کے زمانے میں بھی موجود تھی۔ لیکن چوں کہ وہ مغل حکومت کا دور

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شباب تھا اور حکمران ذاتی طور پر خاص وجاہت وشہامت کا مالک اور اپنا ایک دبدبہ وطنطنہ رکھتا تھا، اس لیے بات باہر نہیں نکلتی تھی اور اس زہر کے نتائج محسوس نہیں ہوتے تھے۔ لیکن عالم گیر کے انتقال کے فوراً بعد اندر کی تمام کمزوریاں سامنے آگئیں، عناصر حکومت میں ضعف یہاں تک بڑھ گیا کہ کہیں اعتدال باقی نہ رہا اور ان دو متضاد نظریوں کے اندرونی تصادم نے ایک مستحکم حکومت کی بنیادیں ہلا ڈالیں۔ سادات بارہہ وطناً ایرانی نہ تھے، مسلکاً ایرانی تھے۔ ان کے زمانۂ اقتدار میں ایرانی امرا کو تورانی امرا پر اتنی برتری حاصل ہوئی کہ بعض بڑے بڑے تورانی امرا امور حکومت سے دست کش ہو کر گھروں میں بیٹھ گئے اور کسی معاملے سے کوئی تعلق باقی نہ رکھا۔

سادات بارہہ کے عہد اقتدار میں یہ پرانا مسئلہ بہت افسوس ناک طریقے سے ابھر کر سامنے آیا اور اس کا انجام نہایت ہولناک ہوا۔ یکے بعد دیگرے کئی مغل حکمران تھوڑی تھوڑی مدت کے لیے آئے اور گئے، کسی کو استحکام نصیب نہ ہوا، اور کوئی بادشاہ ان سادات کی ذلت آمیز سازشوں کی بدولت اطمینان سے ملک کے نظم ونسق کی طرف توجہ نہ دے سکا۔

محمد شاہ:

ابوالفتح ناصر الدین محمد شاہ غازی۔ اس کا نام روشن اختر تھا۔ جہاں شاہ کا بیٹا اور شاہ عالم بہادر شاہ اول کا پوتا تھا۔ ۲۳/ ربیع الاول ۱۱۱۴ھ/ ۶/ اگست ۱۷۰۲ء کو جمعۃ المبارک کے روز پیدا ہوا۔ دیگر شہزادوں اور بیگمات شاہی کے ساتھ اس کو اور اس کی والدہ کو سید حسن علی خاں نے اس وقت سے قید کر رکھا تھا، جب اس کے والد جہاں شاہ کی وفات کے بعد جہاں دار شاہ کو تخت حکومت پر بٹھایا تھا۔ اب نئے بادشاہ کی ضرورت پڑی تو ماں بیٹا دونوں کو قید خانے سے نکالا اور ۱۵/ ذیقعدہ ۱۱۳۱ھ/ ۱۸/ ستمبر ۱۷۱۹ء کو آگرہ میں تخت ہند پر متمکن کیا۔ تخت نشینی کے وقت محمد شاہ کی عمر سترہ سال تھی۔ آگے چل کر یہ "محمد شاہ رنگیلا" کے نام سے مشہور ہوا۔

محمد شاہ کے زمانے میں سلطنت مغلیہ کئی حصوں میں بٹ گئی تھی اور مختلف علاقوں میں خود مختار حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ دکن کا صوبے دار نظام الملک آصف جاہ برائے نام بادشاہ کا ماتحت تھا، درحقیقت اس نے حیدر آباد میں الگ حکومت قائم کر لی تھی۔ لکھنؤ میں بھی اودھ کی ایک جداگانہ سلطنت وجود میں آگئی تھی۔ غرض ہندو، مسلمان اور غیر ملکی طاقتیں اس کے عہد میں میدان میں نکل آئی تھیں اور طوائف الملوکی پھیل گئی تھی، جس کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ پوری سلطنت انگریز کے ہاتھوں میں چلی گئی۔

محمد شاہ کے کارناموں میں ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے بارہہ کے سید بھائیوں (حسین علی اور حسن علی کو ختم کیا) لیکن یہاں اس کی متحمل مزاجی کی بھی داد دینی چاہیے کہ حسین علی کے قتل کا انتقام لینے کے لیے اس کا بڑا بھائی حسن علی بادشاہ کے مقابلے میں آیا تو متھرا کے شمال میں تقریباً تیس بتیس میل دور شیر گڑھ کے مقام پر گرفتار کر کے قید کر لیا گیا اور اسی حالت میں اس کو دہلی لایا گیا۔ لڑائی میں چونکہ وہ زخمی ہو گیا تھا، لہٰذا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دہلی آنے کے کچھ عرصہ بعد انہی زخموں کی وجہ سے اس کا انتقال ہو گیا۔ محمد شاہ کو متعدد سرکردہ لوگوں نے کہا کہ حسن علی کو حالت قید میں قتل کر دینا چاہیے کیونکہ اس نے کئی بادشاہوں، شہزادوں اور امیروں پر سخت مظالم ڈھائے ہیں، لیکن محمد شاہ نے وسعت قلب کا ثبوت دیا اور اس کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ کہا کہ ایک بھائی پہلے ہی قتل ہو چکا ہے اور ان کا زور ختم ہو گیا ہے، اب اس کو قتل کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔

محمد شاہ کے دور کو تاریخ ہند میں ابتری اور خون خرابے کے دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ بادشاہ ملکی معاملات میں غفلت اور بے پروائی سے کام لیتا تھا۔ دکن کا صوبے دار نظام الملک آصف جاہ ایک زیرک اور دور اندیش امیر تھا۔ وہ دکن میں اپنی خود مختار سلطنت قائم کرنے کے لیے فضا ہموار کر رہا تھا اور دہلی کی مرکزی حکومت پر بھی اپنا اثر اقتدار بحال رکھنا چاہتا تھا۔ دکن کے سیاسی حالات ایسے تھے کہ وہاں مرہٹوں سے بنا کر رکھنا اور تعلقات استوار کرنا ضروری تھا، اور اس نے یہی کیا۔ اپنی اس سلطنت کو محفوظ رکھنے کے لیے، جس کے مستقبل قریب میں قیام کا نقشہ وہ اپنے ذہن میں ترتیب دے رہا تھا، اس نے مرہٹوں سے دوستی گانٹھی۔

نظام الملک نے اپنے علاقے کو مرہٹوں کی دست برد سے بچانے اور بادشاہ دہلی کو پریشانی میں مبتلا کرنے کے لیے ۱۱۴۹ھ (۱۷۳۶ء) میں مرہٹوں کو اکسایا اور انھیں دلی کی طرف متوجہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باجی راؤ پیشوا نے دہلی پر یلغار کر دی اور شاہی لشکر کو اس کے گھر جا کر شکست دی۔ مرہٹوں کو اس سے یہ فائدہ پہنچا کہ ان کا ''چوتھ'' (یعنی ۲۵ فیصد) دینے کا مطالبہ جو ایک عرصے سے جاری تھا، مان لیا گیا۔ باشاہ کو علم تھا کہ مرہٹوں کو دہلی کا راستہ نظام الملک نے دکھایا ہے، مگر خاموش رہا، بلکہ اس کے عہدہ و منصب میں اضافہ کیا۔

پھر اسی نظام الملک نے نوابان اودھ کے مورث اعلیٰ برہان الملک نواب سعادت خاں سے ساز باز کر کے ایران کے بادشاہ قلی خاں کو جسے تاریخ میں نادر شاہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، ہندوستان پر حملے کے لیے تیار کیا۔ چنانچہ ۱۷۳۸ء میں وہ چھتیس ہزار کے لشکر جرار کے ساتھ ایران سے روانہ ہوا۔ محمد شاہ کی فوج بھی دہلی سے نکلی اور کرنال کے قریب جا کر پڑاؤ کیا۔ فریقین کے لشکر چند روز تک ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے رہے مگر کوئی مقابلہ نہ ہوا۔ پھر لوٹ مار شروع ہوئی، جس نے آگے چل کر جنگ کی شکل اختیار کر لی۔ محمد شاہ کی فوج دو لاکھ افراد پر مشتمل تھی، لیکن شکست کھا گئی۔ تاہم رزم گاہ میں موجود رہی۔ کچھ دن تذبذب اور پریشانی کی حالت میں گزرے، بالآخر جب امرائے سلطنت نے دیکھا کہ نظام الملک کا رجحان نادر شاہ کی طرف ہے تو مجبوراً محمد شاہ کو نادر شاہ کے حضور سر اطاعت خم کرنا پڑا۔

نادر شاہ نے محمد شاہ کو اسی عزت و احترام کا مستحق گردانا جو ایک بادشاہ ذی جاہ کے شایانِ شان تھا، لیکن ساتھ ہی امور سلطنت سے بے اعتنائی اور پست ہمتی کا طعنہ بھی دیا، یہ بھی کہا کہ میرا مقصد آپ سے سلطنت چھیننا نہ تھا، فقط انتظام مملکت کی طرف توجہ دلانا تھا۔ تاہم جب تک آپ مجھے تاوان جنگ ادا نہ کریں گے، دار السلطنت دہلی پر میرا قبضہ رہے گا۔ ۹ر مارچ ۱۷۳۹ء، کو پہلے محمد شاہ شہر میں پہنچا۔ اس کے پیچھے نادر شاہ قلعے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں داخل ہوا۔ نادر شاہ نے اپنی فوج کو سختی سے حکم دے دیا تھا کہ باشندگان دہلی سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے، لیکن بعد میں ایسے حالات پیدا ہوئے کہ نادر شاہ نے قتل عام کا حکم دے دیا اور چند گھنٹوں میں ایک لاکھ سے زیادہ آدمی موت کا لقمہ بن گئے۔ محمد شاہ نے اپنا سفیر نادر شاہ کی خدمت میں بھیجا، جس نے صاف لفظوں میں نادر شاہ سے معذرت کی۔ پھر کہیں قتل سے ہاتھ رکا۔

نادر شاہ نے سلطنت ہند پر قبضہ تو نہیں کیا، البتہ محمد شاہ سے چار کروڑ روپے تاوان جنگ کے طور پر طلب کیے، نیز صوبہ کابل، دریائے سندھ کا مغربی علاقہ اور پنجاب کے کچھ محالات (اضلاع) سلطنت ایران میں داخل ہوئے۔ اورنگ زیب کی پوتی نادر شاہ کے بیٹے کے حبالۂ عقد میں دی گئی۔ جاتے ہوئے نادر شاہ تخت طاؤس بھی ساتھ لے گیا۔ پورے ملک سے جو مال و دولت اس نے سمیٹا اس کا تخمینہ ۸۰ کروڑ روپے لگایا جاتا ہے۔ نادر شاہ کئی مہینے ہندوستان میں قیام کرنے کے بعد ۵ مئی ۱۷۳۹ء کو دہلی سے ایران روانہ ہوا۔ تب جا کر دہلی کے لوگوں نے کہیں سکھ کا سانس لیا۔

نادر شاہ نے قتل و غارت کے بعد محمد شاہ کو کچھ نصیحتیں بھی کیں، جن میں ایک یہ تھی کہ نظام الملک سے خبردار رہنا اور اس کے دھوکے میں نہ آنا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ نادر شاہ نے بانیٔ سلطنت اودھ برہان الملک سعادت خاں اور موسس حکومت آصفیہ نظام الملک آصف جاہ کو طلب کیا اور انھوں نے اس کو محمد شاہ کے خلاف دعوت جنگ دے کر جس ذلیل حرکت کا ارتکاب کیا تھا، اس پر سخت غیظ و غضب کا اظہار کیا۔ نادر شاہ کے تلخ و تند لہجے سے دونوں بہت نادم ہوئے اور مارے شرم کے اس کے سامنے سے ہٹ گئے۔ وہ اس پر آمادہ ہو گئے کہ اس بے عزتی سے تو زہر کھا لینا بہتر ہے۔ چنانچہ نظام الملک نے تو جھوٹ موٹ زہر کھایا اور تھوڑی بہت تکلیف کا اظہار کر کے کھڑا ہو گیا لیکن سعادت خاں نے سرطان کے شدید حملے سے انتقال کیا، تاہم کہا جاتا ہے کہ اس پر زہر کی علامتیں نمودار تھیں ❶۔ ممکن ہے یہ سرطان کا اثر ہو۔

اب بادشاہ کے نزدیک سب سے زیادہ قابل اعتماد شخص اعتماد الدولہ نواب قمر الدین خاں تھا، اس کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ یہ بہت لائق اور جرأت مند امیر تھا، لیکن حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کر لیا تھا کہ سلطنت کو گھن لگ چکا تھا اور نظم و نسق کی ساری چولیں ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔ صوبہ بنگال، بہار، اڑیسہ، اور روہیل کھنڈ سب اپنی اپنی جگہ خود مختار ہو گئے تھے۔ روہیل کھنڈ کے باغی سردار کو تو بادشاہ نے شکست بھی دی، لیکن پھر بھی اس کا علاقہ قبضے میں نہ آ سکا۔

نادر شاہ کے قتل و غارت گری کے بعد ایک آفت یہ پڑی کہ محرم ۱۱۶۱ھ/جنوری ۱۷۴۸ء میں درانی افغان احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ اس کے مقابلے کو برہان الملک سعادت خاں کے بھانجے اور داماد نواب منصور علی خاں صفدر جنگ کو سپہ سالار فوج بنا کر بھیجا گیا۔ نواب قمر الدین خاں وزیر اعظم بھی میدان جنگ

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے واقعات دار الحکومت دہلی ۲/۳۰ ...

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

موجود تھا اور اپنے خیمے میں نماز پڑھ رہا تھا کہ ناگاہ غنیم کی جانب سے توپ کا ایک گولہ اس کے قریب آکر گرا، اور اس کی زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔ یہ حادثہ جمعے کے روز ۲۲ ربیع الاول ۱۱۶۱ھ (۱۱ اپریل ۱۷۴۸ء) کو پیش آیا۔

اس لائق وزیر اعظم کی موت کے سانحے کا علم بادشاہ محمد شاہ کو ہوا تو شدت غم سے بے ہوش ہوگیا اور غش کھا کر گرا۔ ساتھ ہی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ یہ سانحہ جمعرات ۲۷ ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ (۱۶ اپریل ۱۷۴۸ء) کو رونما ہوا۔

محمد شاہ نے ۴۷ سال عمر پائی اور ۲۹ سال پانچ مہینے ۲۳ دن حکومت کی۔ دہلی میں مقبرہ نظام الدین اولیا میں دفن ہوا۔

محمد شاہ کا عہد مغلیہ سلطنت کے لیے مختلف النوع مصائب کا عہد تھا۔ اس کے زمانے میں پنجاب کے سکھوں نے بھی سر اٹھایا۔ چنانچہ کپورتھلہ کے جسا سنگھ نے ۱۷۴۳ء میں لاہور پر حملہ کیا اور اس کے صوبے دار زکریا خاں کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد جھگڑے اور تصادم کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ ۱۷۶۲ء میں وہ فوج لے کر آیا اور دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ احمد شاہ ابدالی کو اس کی اطلاع پہنچی تو وہ دہلی کی طرف بڑھا لیکن جسا سنگھ، ابدالی کی آمد کی خبر سن کر دہلی سے رخصت ہوگیا اور پہاڑوں میں جا کر پناہ لی۔ اس کے بعد اس نے دہلی کا رخ تو نہیں کیا، البتہ پنجاب کے مختلف علاقوں میں لوٹ مار جاری رہی۔ ۱۷۸۳ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔

محمد شاہ بے شک "محمد شاہ رنگیلا" کے نام سے مشہور ہوا، اور عرف عام میں لفظ "رنگیلا" اس کے نام کا جز قرار پایا، لیکن اس کا اصل نام روشن اختر تھا اور اس "روشن اختر" کی زندگی کے کچھ روشن پہلو بھی ہیں، جن کو بہر کیف ملحوظ رکھنا چاہیے۔ شاہ ولی اللہ کی تحریک تجدید و اصلاح کا آغاز اسی کے دور میں ہوا، جو اس ملک کا عظیم الشان اور عدیم المثال سلسلۂ دعوت و ارشاد ہے۔ شاہ صاحب کی ہمدردیاں بھی ہمیشہ اس بادشاہ کے ساتھ رہیں۔ اگر یہ فی الواقع اتنا ہی بدعنوان اور بدقماش ہوتا، جتنا کہ عام طور پر ظاہر کیا جاتا ہے تو شاہ صاحب ہرگز اس کو لائق اعتنا نہ گردانتے۔

یہاں یہ واقعہ بھی لائق توجہ ہے کہ شاہ ولی اللہ کے والد مکرم شاہ عبدالرحیم نے جس مدرسہ رحیمیہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا تھا، وہ ایک مختصر سی جگہ تھی، اور اس زمانے کے حالات کے مطابق شاید اسے کافی سمجھا جاتا ہوگا لیکن جب شاہ ولی اللہ تکمیل علم حدیث کے بعد حرمین شریفین سے واپس آئے تو یہ جگہ طلبائے علم کے لیے کفایت نہیں کرتی تھی، کیونکہ ملک کے اطراف و اکناف سے طلبا کھنچ کھنچ کر شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے لگے تھے۔ یہ اسی محمد شاہ رنگیلے کا عہد تھا، اس کے علم میں جب یہ بات آئی کہ مدرسہ رحیمیہ کی پرانی جگہ شاہ ولی اللہ کے حلقۂ درس کے طلبا کے لیے کافی نہیں رہی تو اس نے بقول مولوی بشیر الدین احمد دہلوی ان کو نئی جگہ عطا کی۔

"روشن اختر محمد شاہ کا زمانہ تھا، اس نے مولانا کو بلا کر شہر میں ایک عالی شان مکان دے کر آپ کو اندرون

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شہر رکھا۔ قدیم جگہ غیر آباد ہوگئی۔[1]"

شاہ صاحب کے اس مدرسے کی عمارت کے بارے میں جو ان کو محمد شاہ نے تدریس حدیث کے لیے عطا کی تھی، مصنف مذکور مزید لکھتے ہیں۔

"یہ مدرسہ کسی زمانے میں نہایت عالی شان اور خوب صورت تھا اور بڑا دارالعلوم سمجھا جاتا تھا۔[2]"

یہ مدرسہ کتنا وسیع اور کشادہ ہوگا اور اس کا پھیلاؤ کہاں تک ہوگا، اس کا اندازہ مصنف مذکور کے ان الفاظ سے ہوسکتا ہے جو انھوں نے ۱۸۵۷ء کی تباہی کے بعد اس وقت تحریر کیے، جب دہلی کے محلوں اور آبادیوں کا پرانا سلسلہ بالکل بدل دیا گیا تھا۔

"اب متفرق لوگوں کے مکانات اس جگہ بن گئے ہیں، مگر محلہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسے کے نام سے آج تک پکارا جاتا ہے۔[3]"

اس مدرسے کی وسعت کا اندازہ اس حقیقت سے کیجیے کہ اس میں شاہ ولی اللہ نے درس قرآن وحدیث دیا، ان کے بعد مولوی بشیر الدین احمد دہلوی کے الفاظ میں

"ان کے چاروں صاحب زادوں نے وہی مشغلہ جاری رکھا اور اس مدرسے نے تعلیم دینیات میں وہ نام پایا کہ ہندوستان میں شہرہ ہوگیا۔ جب شاہ صاحب کے صاحب زادوں میں کوئی نہ رہا تو مولانا محمد اسحاق (مہاجر مکی) نے مدرسے کی خدمت اپنے ذمے لی۔[4]"

بہر حال یہ کوئی بہت بڑی عمارت ہوگی جو شاہ ولی اللہ کو مدرسے کے لیے محمد شاہ نے دی۔ ملاحظہ کیجیے شاہ ولی اللہ کو محمد شاہ رنگیلے کے اس عطیے کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مناظر احسن گیلانی نے کیسے دلچسپ الفاظ تحریر کیے ہیں۔

فرماتے ہیں۔

"خصوصاً شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تو اس رنگیلے نے وہ رنگین سلوک کیا ہے کہ اگر مسلمان اس غریب کو محض اس کی اسی خدمت کی بنیاد پر بخش دیں تو وہ اس کا مستحق قرار پا سکتا ہے۔[5]"

محمد شاہ کے عہد میں دہلی کو بزرگان دین کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ بہ یک وقت بائیس ایسے علمائے کرام وہاں موجود تھے جو دعوت وارشاد کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رقم طراز ہیں۔

1. واقعات دارالحکومت دہلی ج ۲ ص ۵۸۶۔
2. ایضاً ص ۱۷۳۔
3. ایضاً ص ۱۷۴۔
4. واقعات دارالحکومت دہلی ج ۲ ص ۱۷۳۔
5. الفرقان، شاہ ولی اللہ نمبر، ص ۱۶۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

در عہد محمد شاہ بادشاہ بست و دو بزرگ صاحب ارشاد از ہر خانوادہ در دہلی بوو ند، و ایں چنیں اتفاق کم می شود[1]۔

(یعنی محمد شاہ کے زمانے میں دہلی میں ہر سلسلے اور طریقے کے بائیس صاحب ارشاد و دعوت بزرگ قیام پذیر تھے، اور یہ ایسا اتفاق ہے جو (کسی بادشاہ کے زمانے میں) کم ہی ہوتا ہے۔)

محمد شاہ کے عہد میں اردو شاعری کو بھی نشو و ارتقا کے مواقع میسر آئے اور یہ فن کافی آگے بڑھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس زمانے میں بادشاہ اخلاقی انحطاط اور عیش کوشی کا شکار ہو گئے تھے اور یہ مہلک مرض چند خاندانوں کو چھوڑ کر تقریباً پورے معاشرے میں سرایت کر گیا تھا اور زوال سلطنت کا یہ ایک بنیادی سبب تھا۔ حکیم مومن خاں مومن کے ایک شاگرد آقا محمود بیگ راحت نے زوال سلطنت کے اسباب کا بالکل صحیح تجزیہ کیا ہے اور اٹھارھویں صدی کے حالات کی عمدہ الفاظ میں تصویر کشی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''ایک روز ابو نصر محمد اکبر شاہ ثانی کے دربار میں ذکر زوال سلطنت آ گیا۔ بخشی محمود نے عرض کی، چار آدمیوں نے مملکت کو تباہ کر دیا۔

''اول حکیموں نے۔ فرماں روایان بیدار مغز کو وہ مقویات کھلائیں کہ تابِ تحمل نہ ہو سکی، مزاج عشرت طلب ہو گیا۔

''دوسرے کلاونتوں نے۔ ان کے گھر میں جو نو خیز ہوئی اس کو پیش کیا اور اس میں اپنا افتخار پیدا کیا۔ سلاطین کو رقص و سرود میں مائل رکھا۔ ڈوم ڈھاڑی مدار المہام ہوئے، انتظام فرماں روائی میں خلل واقع ہوا، دشمنوں نے سر اٹھایا، بدخواہوں نے پیر پھیلائے، جابجا خود سر ہو گئے، شرفا کو دربار میں مداخلت نہ ہوئی، ان کی بات کسی نے نہ سنی، وقت پر ان لوگوں نے طرح دی، غنیم کی بن آئی۔

تیسرے کثرت عیال نے۔ ادھر ازواج کی کثرت ہوئی، ادھر اولاد کی ترقی ہوئی، نزاع خانگی سے خلش ہوئی۔

چوتھے مشائخ و پیرزادوں نے۔ جب کبھی حاضر ہوئے اور کچھ ذکر سلطنت آیا، اپنے تئیں عرش پر پہنچایا، مسائل تصوف بیان کرنے لگے۔ کنج عزلت کی خوبیاں عرض کرنے لگے، خون بندگان خدا سے ڈرانے لگے، جب شیخ جی شیخی بگھار چکے، پھر اپنی کرامت جتانے لگے، ہم دعا کرتے ہیں، دعاؤں کا لشکر حضور کی فتح و نصرت کو کافی ہے، دشمن ادھر منہ بھی نہیں کرنے کا۔ خود پامالِ سم سمندانِ لشکر دعا سے دولت و اقبال ہوگا۔

فرماں روا ان کے دام میں آ گئے، پیر جی کی دعا پر تکیہ کیا، چار بالش عشرت پر تکیہ نشین ہوئے۔ اراکین گوشہ گزین ہوئے، غنیم نے قابو پایا، اقلیم پر زور لگایا، دعا کی فوج آتی رہی، حکومت جاتی رہی، لیکن زوال حکومت سے علوم اسلامی کی اشاعت میں ضعف نہ آیا، بلکہ ان کا زیادہ فروغ ہوا[2]۔

[1] ملفوظات، عزیزیہ ص ۱۰۶۔

[2] رود کوثر، ص ۶۰۲، ۶۰۳ بحوالہ نتائج المعانی، ص ۱۷۵، ۱۷۶۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بہر حال وہ دور ہر اعتبار سے انحطاط کا دور تھا۔ صرف محمد شاہ ہی نہیں بہت سے لوگ اخلاقی برائیوں کا شکار تھے۔

محمد شاہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا احمد شاہ اورنگ ہند پر متمکن ہوا، لیکن اس کے حالات کا مطالعہ کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان کے درانی حکمران احمد شاہ ابدالی کے بارے میں چند باتیں بیان کر دی جائیں، جو ہمارے موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان پر اس کے حملوں کا سلسلہ محمد شاہ کے عہد آخر (۱۷۴۷ء) سے شروع ہو گیا تھا، جو ۱۷۶۹ء تک جاری رہا۔

احمد شاہ ابدالی:

۱۷۳۷ء میں جب نادر شاہ نے قندھار پر فوج کشی کی تو جنگی قیدی کی حیثیت سے ایک شخص احمد خاں کو اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ نادر شاہ نے اسے دیکھا تو بہت متاثر ہوا، اور اسے اپنے ذاتی خدمت گاروں اور چوب داروں کی جماعت میں شامل کر لیا، جنھیں ''یساول'' کہا جاتا تھا۔ احمد خاں بڑی صلاحیتوں کا مالک تھا، وہ بہت جلد ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا، نادر شاہ کے اعلیٰ اور قابل اعتماد فوجی افسروں میں گردانا گیا۔ پھر ایک وقت آیا کہ نادر شاہ نے اس پر مزید اعتماد کیا اور اسے خزانے کا مہتمم بنا دیا۔ وہ نادر شاہ کی مجلسِ کارکن کا رکن بھی مقرر ہو گیا تھا۔ نادر شاہ کھلے دربار میں سب کے سامنے اس کی تعریف میں کہا کرتا تھا کہ میں نے ایران، توران اور ہندوستان میں کوئی شخص ان خوبیوں اور صلاحیتوں کا حامل نہیں دیکھا جو احمد خاں کی ذات میں پائی جاتی ہیں۔ نادر شاہ اکثر جنگی مہموں میں احمد خاں کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔

۹ مارچ ۱۷۳۹ء کو نادر شاہ فاتح کی حیثیت سے دہلی آیا اور محمد شاہ کے محل میں داخل ہوا تو احمد خاں اس کے ہم رکاب تھا اور دیوان عام میں نظام الملک آصف جاہ کے قریب بیٹھا تھا۔ نظام الملک نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے سے شہامت اور عظمت کے آثار نظر آئے، اور کہا کہ یہ شخص ضرور بادشاہ بنے گا۔ یہ بات نادر شاہ کے کانوں میں بھی پہنچ گئی۔ اس نے احمد خاں کو بلایا اور جیب سے چاقو نکال کر اس کے کان تھوڑے تھوڑے کاٹ دیے، اور کہا ''جب تم بادشاہ ہو جاؤ گے تو ان کو دیکھ کر میری یاد تازہ ہو جائے گی۔''

۲ جون ۱۷۴۷ء کو نادر شاہ اپنے کیمپ میں قتل کر دیا گیا۔ اس کی موت کے ساتھ ہی ملک میں انتشار پھیل گیا اور بدنظمی پیدا ہو گئی۔ یہ حالات احمد خاں کے لیے نہایت فائدہ مند ثابت ہوئے اور اس نے افغانستان میں اپنی حکومت قائم کر لی۔

یہاں یہ واقعہ بھی لائق ملاحظہ ہے کہ نادر شاہ کے قتل کے بعد جب احمد خاں افغانستان کی طرف بھاگا تو لاہور کے ایک بزرگ شاہ محمد صابر کو اپنے ساتھ لیا۔ شاہ محمد صابر نے نادر شاہ کے قتل سے تین دن پہلے پیشین گوئی کی تھی کہ احمد خاں بادشاہ ہوگا۔ ابھی یہ افغانستان بھی نہ پہنچے تھے کہ شاہ محمد صابر نے احمد خاں سے اصرار کیا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ اپنی بادشاہت کا اعلان کر دے۔ احمد خاں نے اعلان کرنے میں تامل کیا تو شاہ محمد صابر نے اس کو زبردستی مٹی کے ایک ڈھیر پر بٹھا دیا اور کہا ''یہ تمہارا تخت ہے۔'' پھر گیہوں کا ایک خوشہ اس کے سر پر رکھا اور کہا ''تم درانی بادشاہ ہو''۔ بہر حال احمد خاں نے احمد شاہ درانی کے نام سے حکومت کی باگ ڈور ہاتھ میں لی۔ ابدالی ایک معروف افغان قبیلہ ہے، جس سے احمد شاہ کا نسبی تعلق تھا، اس لیے احمد شاہ ابدالی کے نام سے مشہور ہوا۔

تخت نشینی سے قبل احمد شاہ کئی دفعہ ہندوستان آ چکا تھا اور اس ملک کے حالات سے اچھی طرح باخبر تھا۔ اس کے مال و دولت، مرکزی حکومت کے ضعف و اضمحلال، امرائے مملکت کی رقابتوں اور فساد انگیز حرکتوں کا اسے علم تھا اور تمام معاملات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء تک اس نے ہندوستان پر نو مرتبہ دھاوا بولا اور ہر مرتبہ اس کو زیر و زبر کیا۔ البتہ ان حملوں کے اسباب مختلف تھے۔ کبھی خود آیا اور کبھی اسے بلایا گیا۔

احمد شاہ ابدالی متعدد اعتبارات سے اپنے عہد کا ممتاز اور منفرد حکمران تھا۔ جہاں گیری و جہاں بانی، تدبر و سیاست، فوجی قابلیت، اور عسکری صلاحیت میں بے مثل تھا۔ پھر اس کی بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ مذہب سے پورا تعلق رکھتا تھا۔ علما و مشائخ کی قدر کرتا اور ان سے مشورے لیتا۔ دینی مسائل میں ان سے مذاکرہ کرتا اور شرعی امور میں ان کی بات کو حتمی قرار دیتا۔ لاہور، پشاور اور بٹالہ کے مشائخ کی خدمت میں کئی دفعہ حاضر ہوا۔ دہلی، اجمیر، اور پانی پت عقیدت کے جذبات کے ساتھ جاتا۔ پابند شرع اور سنی العقیدہ تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود وسیع النظر، فراخ دل اور غیر متعصب تھا۔ شیعہ، ہندو، عیسائی، سب مذاہب کے لوگ پوری آزادی سے اس کے ملک میں قیام پذیر تھے۔ حکمرانوں میں عام طور پر جو برائیاں پائی جاتی ہیں، احمد شاہ ان سے مبرا تھا۔ مے نوشی اور افیون وغیرہ کے استعمال سے اس کا دامن پاک تھا۔ شعائر مذہبی پر عامل تھا۔ سادہ لیکن باوقار زندگی بسر کرتا تھا، جس کی وجہ سے اس کو ہر طبقے میں معزز و محترم سمجھا جاتا تھا۔ اس کے ہاں رسائی حاصل کرنا بہت آسان تھا۔ عدل و انصاف کے تقاضوں کا خاص طور پر خیال رکھتا تھا۔ اس نے ۲۰ رجب ۱۱۸۶ھ (۲۳ اکتوبر ۱۷۷۲ء) کو سفر آخرت اختیار کیا۔

احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان پر حملے:

احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء تک ہندوستان پر مسلسل نو حملے کیے اور اس ملک کو خوب پامال کیا۔ سات حملے شاہ ولی اللہ کی زندگی میں ہوئے۔

۱۔ ۱۷۴۷ء میں پہلا حملہ پنجاب پر ہوا۔ اس حملے میں وہ لاہور اور سرہند پر بلا کسی مقابلے کے قابض ہو گیا، لیکن جب آگے قدم بڑھائے تو مغل فوج سے آمنا سامنا ہوا، اور ابدالی ہزیمت اٹھا کر واپس چلا گیا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔ ۱۷۵۰ء میں اس نے دوسری دفعہ پنجاب پر یلغار کی۔ صفدر جنگ نے مغل بادشاہ کے اصرار سے مجبور ہو کر مرہٹوں سے معاہدہ کیا، لیکن یہ معاہدہ ناکام رہا۔ اس زمانے میں معین الملک (میر منو) لاہور کا والی تھا، اس نے ابدالی کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا اور پنجاب کا کچھ حصہ اس کے حوالے کر دیا۔ کہتے ہیں کہ معین الملک کو یہ علاقہ ابدالی کے حوالے کرنے کی ہدایت مغل بادشاہ نے کی تھی۔

۳۔ تیسرا حملہ ۱۷۵۱ء میں کیا۔ معین الملک کو حملے کی اطلاع ہوئی تو ۹ لاکھ روپے ابدالی کی خدمت میں ارسال کیے، تاکہ یہ رقم لے کر وہ واپس چلا جائے، لیکن ابدالی نے پیش قدمی جاری رکھی۔ معین الملک نہیں چاہتا تھا کہ ابدالی سے برسرپیکار ہو، مگر پنجاب کے ایک بااثر امیر کوڑا مل نے حملہ آور ابدالی سے صلح کی شدید مخالفت کی۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد آخر کار جنگ کا فیصلہ کیا گیا۔ دونوں طرف کی فوجیں میدان محاربہ میں اتریں تو کوڑا مل لڑائی میں مارا گیا۔ اس کے بعد معین الملک کی ہمت ٹوٹ گئی اور اس نے صلح کی پیش کش کی۔ احمد شاہ ابدالی نے جواب دیا کہ میں کوڑا مل سے نمٹنا چاہتا تھا، اب وہ مر گیا ہے تو لڑائی ختم ہے۔ جتنے روپے کا میں نے مطالبہ کیا تھا، وہ بھیج دو۔

۴۔ ۱۷۵۲ء میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر چوتھی بار ہلہ بولا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے کشمیر کے گورنر سے اپنے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ گورنر نے انکار کیا تو ابدالی نے حملہ کر دیا۔ اس وقت کشمیر کا راجا رنجیت دیو تھا، جو ۱۷۳۵ء سے ۱۷۸۱ء تک اس خطے کا حکمران رہا۔ اس نے بہادری اور جگرداری سے ابدالی کا مقابلہ کیا، لیکن کامیاب نہ ہو سکا اور کشمیر ابدالی کے قبضے میں چلا گیا۔

۵۔ ۱۷۵۷ء میں ابدالی پانچویں مرتبہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا، لیکن اس حملے کی نوعیت پہلے حملوں سے مختلف تھی۔ اب وہ خود نہیں آیا تھا بلکہ بلایا گیا تھا۔ بادشاہ عالم گیر ثانی کا وزیر عماد الملک غازی الدین نہایت نخوت پسند تھا۔ بادشاہ اس کی وجہ سے بہت پریشان تھا، اس نے وزیر سے نجات حاصل کرنے کے لیے ابدالی کو دعوت دی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ عالم گیر ثانی نے ابدالی کو ہندوستان آنے کی دعوت نجیب الدولہ کے ذریعے دی تھی۔ اس زمانے میں مغل حکومت اس درجے کمزور ہو گئی تھی کہ احمد شاہ ابدالی اس ملک کی سیاست اور انتظامی معاملات میں دخیل ہو گیا تھا۔ وہ دہلی گیا، بادشاہی محل میں قیام کیا اور ملک کے تمام علاقوں سے حکومت کے وکیلوں اور امیروں کو بلایا گیا، انھوں نے ابدالی کو نذریں پیش کیں اور سب نے اس کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کیا۔ البتہ جاٹوں کے سردار اور نمائندے نہیں آئے۔ ابدالی نے عماد الملک غازی الدین کو وزارت سے علیحدہ کیا اور بادشاہ کے بڑے بیٹے علی گوہر کو نائب سلطنت مقرر کیا۔ خود اپنی شادی محمد شاہ بادشاہ کی بیٹی حضرت بیگم سے رچائی اور اپنے بیٹے تیمور شاہ کا عقد عالم گیر ثانی کی بہن سے کیا۔ www.KitaboSunnat.com

ان معاملات سے فارغ ہونے کے بعد ابدالی نے جاٹوں کی طرف توجہ کی اور ان سے معرکہ آزما

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوا۔ اس مہم میں عماد الملک غازی الدین اس کے ساتھ تھا۔ اس نے ابدالی کی بے حد مدد کی، جس سے ابدالی بہت خوش ہوا، اور عالم گیر ثانی کو لکھا کہ اس کو دوبارہ وزیر مقرر کر دیا جائے۔ عالم گیر ثانی نے ابدالی کی یہ بات ماننے سے نہایت ادب کے ساتھ انکار کیا، لیکن ابدالی اپنی بات پر اڑا رہا۔ قلم دان وزارت غازی الدین کے حوالے کیا اور نجیب الدولہ کو امیر الامرا کا منصب عطا فرمایا، اور بادشاہ اس قدر مجبور تھا کہ ابدالی سے کچھ نہ کہہ سکا۔

۶۔ ۱۷۶۰ء میں ابدالی نے چھٹی مرتبہ ہندوستان پر چڑھائی کی۔ اب ملک کے حالات بہت نازک صورت اختیار کر گئے تھے اور مرہٹوں نے آفت مچا رکھی تھی۔ ہندو، مسلمان، ملک کے راجے اور امرا وزرا سب ان سے نالاں تھے۔ ان تمام عناصر نے ابدالی کو دعوت دی۔ شاہ ولی اللہ اور نجیب الدولہ کے نام بھی انہی لوگوں میں شامل ہیں، جنھوں نے ابدالی سے مرہٹوں کے خلاف امداد کی درخواست کی تھی۔ اسی دعوت اور درخواست امداد کے نتیجے میں احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے درمیان پانی پت کے میدان میں جنگ ہوئی جو تاریخ ہند کی ایک مشہور جنگ ہے۔

یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملے کے بعد مغلیہ سلطنت کا نظام درہم برہم اور اس کا تمام تر ڈھانچا بے کار ہو گیا تھا۔ صوبے مرکز سے علیحدہ اور خود مختار ہو گئے تھے۔ چنانچہ نظام الملک آصف جاہ نے دکن میں، علی وردی خاں نے بنگال میں اور سعادت علی خاں نے اودھ میں اپنی اپنی آزاد حکومتوں کی بنیاد رکھ دی تھی۔ پنجاب کی بساط سیاست پر سکھ قدم جما رہے تھے۔ ملک کے جنوبی اور مغربی حصوں میں مرہٹے مسلط ہو گئے تھے اور اتنی طاقت پیدا کر لی تھی کہ بہار، بنگال اور اڑیسہ کے علاقوں کو تاراج و پامال کرنے پر اتر آئے تھے۔ خود دہلی کی مرکزی حکومت کا یہ حال تھا کہ ایرانی اور تورانی جھگڑا زوروں پر تھا۔ امرائے سلطنت باہمی بغض وعناد کا شکار تھے اور مخالف فریق کو نیچا دکھانے کے لیے مرہٹوں کے دروازے پر دستک دیتے اور ان سے طالب امداد ہوتے تھے، جس کے نتیجے میں دہلی کے گرد و نواح میں مرہٹوں کی طاقت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔

۱۷۵۶ء میں ملہار راؤ ہلکر اور رگھوناتھ راؤ نے جو مشہور مرہٹے تھے، شمالی علاقے کو زیر نگیں کرنے کی غرض سے جاٹوں کی مدد حاصل کی اور اگست ۱۷۵۷ء میں دہلی پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا سخت تھا کہ نجیب الدولہ ان کے سامنے جھکنے اور صلح کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے بعد مرہٹوں کی غضب ناک فوج نے پنجاب کو نشانہ بنایا اور اپریل ۱۷۵۸ء میں لاہور پر قابض ہو گئی اور اپنی طرف سے لاہور کی ولایت آدینہ بیگ کے سپرد کی۔ آدینہ بیگ کی وفات کے بعد پنجاب میں پھر مخالفانہ ہنگامے ہونے لگے تو داتا جی سندھیا نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ پنجاب کا رخ کیا اور صورت حال پر قابو پایا۔ اب اس نے پنجاب کی حکومت ایک مرہٹے سباجی سندھیا کے سپرد کی۔ یہ ملک میں مرہٹوں کے زور اور عروج کا زمانہ تھا اور ان کے حوصلے لحہ بہ لحہ بڑھ رہے تھے۔ انھوں نے اپنی طاقت کا مزید مظاہرہ کرنے کی خاطر روہیل کھنڈ پر یلغار کرنے کا عزم کیا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

تھا اور ابدالی کی فوج کے دستے پسپا ہونے لگے تھے۔ مرہٹوں کا توپ خانہ اتنا مضبوط تھا کہ اس نے مسلسل گولہ باری سے قیامت بپا کر دی، لیکن روہیلوں نے بھی مقابلے میں جان کی بازی لگا دی اور نہایت بہادری سے توپ خانے پر قبضہ کر لیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جنگ میں ابدالی کو اپنی فوج میں شکست کے آثار نظر آنے لگے، وہ انتہائی نازک وقت تھا۔ اس نے اپنی محافظ فوج کے جوانوں کو حکم دیا کہ بھاگنے والوں کو روکو، جو نہ رکیں انھیں قتل کر دو۔ چنانچہ ابدالی کی محافظ فوج نے میدان چھوڑ کر بھاگنے والوں کو سختی کے ساتھ روکا۔ اب فوج کے قدم جم گئے اور لڑائی زیادہ تیزی سے ہونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد مرہٹے پیٹھ دکھا کر بھاگنے لگے۔ سداشیو راؤ بھاؤ اور پیشوا کا بیٹا وشواس راؤ میدان میں مارے گئے۔ اور بڑے بڑے سردار اور فوجی قتل ہوئے۔ مادھوجی سندھیا (جو لنگڑا ہو گیا تھا) اور ملہار راؤ ہلکر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ بھاگتے ہوئے مرہٹوں کا ابدالی کی فوج نے جس میں روہیلے بھی شامل تھے، دور تک تعاقب کیا۔ میلوں تک مرہٹوں کی لاشیں نظر آتی تھیں۔ دیہات کی عورتیں بھی گھروں سے باہر نکل آئیں، انھوں نے مرہٹہ فوج کو خوب لوٹا۔ مقتولین کی تعداد ۳۲ ہزار کے قریب تھی اور جو لوگ قید ہوئے، وہ کم وبیش بائیس ۲۲ ہزار تھے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ مرہٹوں نے بھاگتے وقت میدان جنگ میں جو مال و دولت چھوڑا، اس کے علاوہ پچاس ہزار گھوڑے، دو لاکھ گائیں، کئی ہزار اونٹ اور پانچ سو ہاتھی ان کے کیمپوں سے ابدالی کی فوج کے ہاتھ آئے۔ شکست کے بعد مرہٹوں کی بے چارگی کا یہ واقعہ قابل بیان ہے کہ سورج مل جاٹ نے بیس ہزار مرہٹوں کو ایک ایک کمبل اور دو دو روپے فی کس دے کر دکن روانہ کیا۔

بہرحال پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو ابدالی کے مقابلے میں اس ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا کہ ایک مصنف کے بقول ''مرہٹوں کی طاقت چشم زدن میں کافور کی طرح اڑ گئی''۔ کہا جاتا ہے کہ اس جنگ کے بعد مہاراشٹر میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں صف ماتم نہ بچھ گئی ہو۔ مرہٹوں کے قومی رہنماؤں اور فوجی سرداروں کی ایک پوری نسل ایک ہی معرکے میں صفحۂ ہستی سے غائب ہو گئی۔ لیکن اس کے باوجود تاریخ کے تسلسل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مرہٹوں کی طاقت ختم نہیں ہوئی۔ ان کی تگ و تاز اس کے بعد بھی جاری رہی، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آیا کہ خود بادشاہ دہلی مرہٹوں کا محتاج ہو گیا۔

جنگ سے فارغ ہو کر ۲۹ جنوری ۱۷۶۱ء کو ابدالی دہلی میں داخل ہوا۔ مرہٹوں کے ایام اقتدار میں اس شہر کی حالت نہایت خستہ اور خراب ہو چکی تھی۔

اگر مغلیہ سلطنت میں تھوڑی بہت رمق باقی ہوتی اور اس کے حکمران عقل و شعور سے کام لیتے تو اس جنگ کے نتائج ان کے لیے نہایت فائدہ مند ہو سکتے تھے اور ان کے اقتدار کا زمانہ ہندوستان میں طول کھینچ سکتا تھا۔ لیکن مغل حکومت کے جسم سے جان نکل چکی تھی اور خالی ڈھانچا باقی رہ گیا تھا۔

احمد شاہ ابدالی جب پانی پت کے میدان میں مرہٹوں سے مصروف پیکار تھا، وہ مغل حکمران شاہ عالم

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

تھا اور ابدالی کی فوج کے دستے پسپا ہونے لگے تھے۔ مرہٹوں کا توپ خانہ اتنا مضبوط تھا کہ اس نے مسلسل گولہ باری سے قیامت بپا کر دی، لیکن روہیلوں نے بھی مقابلے میں جان کی بازی لگا دی اور نہایت بہادری سے توپ خانے پر قبضہ کر لیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جنگ میں ابدالی کو اپنی فوج میں شکست کے آثار نظر آنے لگے، وہ انتہائی نازک وقت تھا۔ اس نے اپنی محافظ فوج کے جوانوں کو حکم دیا کہ بھاگنے والوں کو روکو، جو نہ رکیں انھیں قتل کر دو۔ چنانچہ ابدالی کی محافظ فوج نے میدان چھوڑ کر بھاگنے والوں کو سختی کے ساتھ روکا۔ اب فوج کے قدم جم گئے اور لڑائی زیادہ تیزی سے ہونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد مرہٹے پیٹھ دکھا کر بھاگنے لگے۔ سداشیو راؤ بھاؤ اور پیشوا کا بیٹا وشواس راؤ میدان میں مارے گئے۔ اور بڑے بڑے سردار اور فوجی قتل ہوئے۔ مادھو جی سندھیا (جو لنگڑا ہو گیا تھا) اور ملہار راؤ ہلکر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ بھاگتے ہوئے مرہٹوں کا ابدالی کی فوج نے جس میں روہیلے بھی شامل تھے، دور تک تعاقب کیا۔ میلوں تک مرہٹوں کی لاشیں نظر آتی تھیں۔ دیہات کی عورتیں بھی گھروں سے باہر نکل آئیں، انھوں نے مرہٹہ فوج کو خوب لوٹا۔ مقتولین کی تعداد ۳۲ ہزار کے قریب تھی اور جو لوگ قید ہوئے، وہ کم و بیش بائیس ۲۲ ہزار تھے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ مرہٹوں نے بھاگتے وقت میدان جنگ میں جو مال و دولت چھوڑا، اس کے علاوہ پچاس ہزار گھوڑے، دو لاکھ گائیں، کئی ہزار اونٹ اور پانچ سو ہاتھی ان کے کیمپوں سے ابدالی کی فوج کے ہاتھ آئے۔ شکست کے بعد مرہٹوں کی بے چارگی کا یہ واقعہ قابل بیان ہے کہ سورج مل جاٹ نے بیس ہزار مرہٹوں کو ایک ایک کمبل اور دو دو روپے فی کس دے کر دکن روانہ کیا۔

بہر حال پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو ابدالی کے مقابلے میں اس ذلت آمیز شکست سے دو چار ہونا پڑا کہ ایک مصنف کے بقول ''مرہٹوں کی طاقت چشم زدن میں کافور کی طرح اڑ گئی''۔ کہا جاتا ہے کہ اس جنگ کے بعد مہاراشٹر میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں صف ماتم نہ بچھ گئی ہو۔ مرہٹوں کے قومی رہنماؤں اور فوجی سرداروں کی ایک پوری نسل ایک ہی معرکے میں صفحۂ ہستی سے غائب ہو گئی۔ لیکن اس کے باوجود تاریخ کے تسلسل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مرہٹوں کی طاقت ختم نہیں ہوئی۔ ان کی تگ و تاز اس کے بعد بھی جاری رہی، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آیا کہ خود بادشاہ دہلی مرہٹوں کا محتاج ہو گیا۔

جنگ سے فارغ ہو کر ۲۹ جنوری ۱۷۶۱ء کو ابدالی دہلی میں داخل ہوا۔ مرہٹوں کے ایام اقتدار میں اس شہر کی حالت نہایت خستہ اور خراب ہو چکی تھی۔

اگر مغلیہ سلطنت میں تھوڑی بہت رمق باقی ہوتی اور اس کے حکمران عقل و شعور سے کام لیتے تو اس جنگ کے نتائج ان کے لیے نہایت فائدہ مند ہو سکتے تھے اور ان کے اقتدار کا زمانہ ہندوستان میں طول کھینچ سکتا تھا۔ لیکن مغل حکومت کے جسم سے جان نکل چکی تھی اور خالی ڈھانچا باقی رہ گیا تھا۔

احمد شاہ ابدالی جب پانی پت کے میدان میں مرہٹوں سے مصروف پیکار تھا، وہ مغل حکمران شاہ عالم

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ثانی کا عہد تھا اور شاہ عالم ثانی اس زمانے میں بہار میں فروکش تھا۔ جنگ کے اختتام پر احمد شاہ ابدالی دہلی آیا تو اس نے شاہ عالم ثانی کو دہلی بلایا اور اپنا آدمی بھیجا کہ بعض ضروری مسائل کے متعلق اس سے گفتگو کرنا مقصود ہے، مگر وہ نہیں آیا۔ پھر ابدالی نے شاہ عالم ثانی کی والدہ نواب زینت محل سے عرض کیا اور ان سے بیٹے کے نام خط لکھوایا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

''احمد شاہ ابدالی قلعے میں آگئے ہیں ــــ آج رجب کی ۲۰ تاریخ تک میں ان سے کئی مرتبہ مل چکی ہوں۔ وہ تمھارے یہاں آنے کا شدت سے انتظار کر رہے ہیں ــــ میرے بیٹے! تم آؤ اور یقین رکھو کہ تمھارے آنے پر سب معاملات طے پا جائیں گے ــــ (احمد شاہ ابدالی کے بیٹے) تیمور شاہ نے بڑے خلوص اور محبت سے مجھے تحفے بھیجے ہیں۔ تمھارے بدخواہ بدگمانیاں پیدا کرنے کی کوشش کریں گے، تم ان کی باتوں میں نہ آؤ۔ میرے بیٹے! تم یہاں جلد پہنچو، اگر خدانخواستہ احمد شاہ ابدالی تم سے ملے بغیر چلے گئے تو پھر تم نئی مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ گے۔''

شاہ عالم ثانی کو دہلی بلانے کی متعدد وجوہ میں سے ایک وجہ یہ تھی کہ وہ انگریزوں کے حلقۂ اقتدار سے نجات حاصل کر لے اور دہلی آ کر احمد شاہ ابدالی کی موجودگی میں اپنی طاقت کا جائزہ لے اور اسے مستحکم کرنے کی طرف توجہ دے۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔

احمد شاہ ابدالی ۲۹ جنوری ۱۷۶۱ء کو دہلی میں داخل ہوا تھا، ڈیڑھ مہینے سے کچھ اوپر دہلی میں رہا۔ اس نے ۲۰ مارچ ۱۷۶۱ء کو اپنی فوج کو روانگی کا حکم دیا۔ اس کی فوج نے دہلی سے نکلتے وقت شہر میں خوب لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کیا اور تین دن تک لوگوں کو پریشانی میں مبتلا کیے رکھا۔ واپسی پر ابدالی پنجاب پہنچا تو سکھوں نے اس پر یلغار کر دی۔ فوج کے سپاہی مال غنیمت سے لدے ہوئے تھے، بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی، وہ نقصان اٹھا کر افغانستان پہنچے۔

۷۔ ہندوستان پر ساتواں حملہ احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۶۲ء میں کیا۔ اس حملے کا سبب سکھوں کے ہنگاموں کو ختم کرنا تھا۔

۸۔ ۱۷۶۷ء میں ابدالی نے ہندوستان پر آٹھویں مرتبہ دھاوا بولا۔ اس زمانے میں عام طور پر یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ اس حملے سے ابدالی کا مقصد انگریزوں کو سرزمین بنگال سے نکالنا ہے، چنانچہ انگریزوں نے اپنے دفاع کے لیے فوج کا ایک دستہ الہٰ آباد روانہ کر دیا تھا تاکہ اودھ کے علاقے میں ابدالی کا مقابلہ کیا جائے۔

۹۔ ۱۷۶۹ء میں ابدالی نے ہندوستان کو پھر یاد فرمایا اور سکھوں کو نشانہ بنایا۔ یہ اس کا نواں حملہ تھا، لیکن اس نازک موقعے پر ابدالی کی فوج کے بارہ ہزار سپاہیوں نے اس سے غداری کی اور اسے مجبوراً کابل واپس جانا پڑا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

احمد شاہ ابدالی بلاشبہ کئی بہتر اوصاف کا مالک تھا۔ مرہٹوں کی بپھری ہوئی اور بے لگام طاقت کو ختم کرنا اس کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ یہ بات بھی اس کے بہتر کارناموں کی فہرست میں شامل ہے کہ اس نے ہندوستان پر اپنی حکومت قائم نہیں کی، حالانکہ چاہتا تو کر سکتا تھا۔ وہ نو مرتبہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ اس نے بار بار حملے کر کے اس ملک کا کچومر نکال دیا۔ مغل حکومت کے اس دورِ زوال میں کسی کو اس کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہ تھی۔ نادر شاہ نے صرف ایک دفعہ ہندوستان کا قصد کیا اور چند گھنٹے دہلی میں قتل و غارت اور لوٹ مار کی۔ دریبہ کا دروازہ جو اب تک ''خونی دروازہ'' کے نام سے مشہور ہے، وہی دروازہ ہے جہاں سے نادر شاہی فوج نے باشندگان دہلی کے قتل کا آغاز کیا تھا، مگر یہ سلسلہ صبح کے آٹھ بجے سے دوپہر کے تین بجے تک جاری رہا تھا۔ لیکن ابدالی نے مستقل طور پر یہ راستہ دیکھ لیا تھا۔ اس کے منہ کو لہو لگ چکا تھا اور انسانی خون کی لذت سے اس کی زبان آشنا ہو گئی تھی، اس لیے وہ بار بار یہاں آیا اور اس کی فوجوں نے دہلی میں جو چاہا کیا۔

واقعات کی مختلف کڑیاں ملانے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ دیگر امور کے علاوہ مال و زر کی ہوس بھی ابدالی کو اس کمزور ملک کو تہہ و بالا کرنے پر اکساتی رہی۔ وہ جب واپس جاتا، بے پناہ دولت سمیٹ کر جاتا۔ مالی لحاظ سے اس نے ہندوستان کو نچوڑ لیا تھا۔ ایک حملے میں تو اس کی فوج نے دہلی کو دل کھول کر لوٹا، بعض شریف گھرانوں کی عورتوں نے خودکشی کر لی، متھرے میں بھی لوٹ کھسوٹ اور قتل کا بازار گرم ہوا۔ دریائے جمنا میں لاشیں تیرنے لگیں اور اس کا پانی متعفن ہو گیا۔ جب ابدالی کی فوجوں میں ہیضہ پھوٹا تو مجبوراً واپسی کا ارادہ کیا۔ لیکن چلتے چلتے ابدالی نے اپنی شادی محمد شاہ کی دختر حضرت بیگم سے رچائی اور اپنے بیٹے تیمور شاہ کا نکاح عالمگیر ثانی کی بہن سے کیا۔

یہ صحیح ہے کہ ابدالی مجموعی طور پر اچھا بادشاہ تھا۔ اسلام اور مسلمانوں کا درد اپنے دل میں رکھتا تھا۔ نادر شاہ کی طرح سفاک اور ستم گر نہیں تھا، لیکن اس کی فوج نہایت اجڈ، خودسر اور مغرور تھی۔ وہ حملہ آور کی حیثیت سے اس ملک میں وارد ہوتی، فاتح کی حیثیت سے لوٹ مار کرتی اور اس کے باشندوں سے وہی سلوک روا رکھتی جو مفتوح قوم سے رکھا جاتا ہے۔ اس نے بے شک پانی پت کی لڑائی میں مرہٹوں کو زیر کیا اور ان کی طاقت کو کچلا، لیکن روہیلوں اور شجاع الدولہ کی فوجیں بھی تو اس میں شامل تھیں، جو میدان میں باقاعدہ اپنی بہادری کے جوہر دکھا رہی تھیں۔ پھر خود نجیب الدولہ اور شجاع الدولہ بھی شریک جنگ تھے۔ روہیلوں نے مرہٹوں کے توپ خانے پر قبضہ کر کے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا تھا۔ ایک موقعے پر جب ابدالی کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ پسپا ہونے لگی تو روہیلوں ہی کے لشکر نے کمال شجاعت سے مرہٹوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا تھا۔ کیا اس بہادری کا صلہ بھی ابدالی ہی کو ملے گا اور ہندوستان کی فوجوں کے یہ کارنامے کسی شمار میں نہیں آئیں گے؟

کہا جاتا ہے کہ ابدالی کو شاہ ولی اللہ نے دعوت دی تھی ــــ یہ صحیح ہے۔ لیکن شاہ صاحب کی دعوت ایک سیاسی ضرورت پر مبنی تھی۔ وہ سیاسی ضرورت یہ تھی کہ مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مرہٹے پورے ملک میں پاؤں

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پھیلا رہے تھے اور بلا امتیاز مذہب وملت سب کو پریشان کرتے تھے۔ چنانچہ سیر المتاخرین کی روایت کے مطابق ہندو راجے اور امرائے مملکت بھی ان کے مظالم لامتناہی سے چیخ اٹھے تھے اور ان کا سر کچلنے اور باشندگان ملک کو ان سے نجات دلانے میں سب متفق اللسان تھے۔ اس کے لیے ان کی نظر احمد شاہ ابدالی پر پڑی اور وہ سب اس دعوت میں شریک تھے۔ شاہ صاحب سیاسی بصیرت کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچے کہ ایک اذیت کو دوسری اذیت قبول کرنے سے ہی رفع کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اس ضرورت سے مجبور ہو کر ابدالی کو صرف ایک مرتبہ دعوت دی تھی۔ اس کو یہ پٹا لکھ کر نہیں دے دیا تھا کہ تم سال دو سال کے بعد آ دھمکا کرو اور ہمیشہ اس ملک کو روندتے اور پامال کرتے رہو۔ شاہ صاحب ایک لمحے کے لیے بھی یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ملک پر جنگ کی گھٹائیں چھائی رہیں، اس کی اقتصادی حالت کو نقصان پہنچایا جائے، اس کے معاشی وسائل کو تہس نہس کیا جائے، اس کی دولت کے ذخائر دوسرے ملک میں منتقل کیے جائیں اور اس کے باشندے پریشانی کا شکار ہوں۔ شاہ صاحب ہمیشہ امن پسند رہے اور امن وسلامتی کے ساتھ تصنیف وتالیف اور خدمت قرآن وحدیث میں زندگی گزار دی۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

بعض حضرات کہا کرتے ہیں کہ احمد شاہ ابدالی جو دولت ہندوستان سے لے کر جاتا تھا، وہ مال غنیمت تھا اور فاتح شرعاً اس کا استحقاق رکھتا ہے۔ بے شک فاتح لشکر کو مال غنیمت کا حق پہنچتا ہے، اور مال غنیمت وہ ہے جو فاتح لشکر کو مفتوح فوج سے حاصل ہو۔ ملک کے عام باشندوں اور گھر بیٹھے شہریوں کے مال ودولت کو لوٹنے کا اسے ہرگز حق نہیں پہنچتا۔ یہ کھلی جارحیت اور ظلم ہے، دنیا کا کوئی مذہب اس لوٹ کھسوٹ کی اجازت نہیں دیتا۔ واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی کی فوج نے مختلف مقامات پر لوٹ مار کا سلسلہ جاری رکھا۔

احمد شاہ مغل حکمران:

احمد شاہ ابدالی کا تذکرہ درمیان میں آ گیا تھا۔ اس کے بعد اب پھر مغل حکمرانوں کی طرف آتے ہیں۔ محمد شاہ کی وفات کے وقت اس کا بیٹا مجاہد الدین محمد ابو النصر احمد شاہ وارث تخت ہوا۔ اس کو باپ کی موت کی اطلاع پانی پت میں ملی۔ نواب صفدر جنگ اس کے ہم عنان تھا۔ اس نے ۲ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ (۱۹/ اپریل ۱۷۴۸ء) کو چتر شاہی سر پر رکھا اور لوازم جلوس سے آراستہ ہوا۔ قلم دانِ وزارت نواب صفدر جنگ کے حصے میں آیا، جو خاندان اودھ سے تعلق رکھتا تھا۔ اب سلطنت مغلیہ کا وقار روز بروز گھٹتا جا رہا تھا اور مختلف علاقوں کے حکمران خود مضبوط اور مرکز سے باغی ہوتے جا رہے تھے۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ جمادی الاخریٰ ۱۱۶۷ھ (اپریل ۱۷۵۴ء) کے آخر میں بادشاہ کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی اور معدوم البصارت کر کے سلیم گڑھ میں قید کر دیا گیا۔ اس کے بعد صفحۂ تاریخ سے اس کا نام بالکل محو ہو گیا۔ لیکن ایک روایت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ مسند بادشاہت سے بیس سال بعد ۲۷ شوال ۱۱۸۸ھ (۳۱/ دسمبر ۱۷۷۴ء) کو قید خانے میں اس کی موت واقع ہوئی اور ہمایوں کے مقبرے میں دفن کیا گیا۔ دیگر مغل حکمرانوں کی طرح یہ بادشاہ بھی علما وفقہا کا قدر دان تھا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عالم گیر ثانی:

احمد شاہ کی معزولی کے بعد ۱۰ شعبان ۱۱۶۷ھ (۲ جون ۱۷۵۴ء) کو جہاں دار شاہ کے بیٹے عزیز الدین کو عالم گیر ثانی کا لقب دے کر تخت نشین کیا گیا۔ عزیز الدین ۱۰۹۹ھ/ ۱۶۸۸ء میں پیدا ہوا تھا اور فرخ سیر کے زمانے سے قید خانے میں پڑا تھا۔ اسے قید سے نکال کر بادشاہ بنایا گیا تھا، اور یہ اس کے بڑھاپے کا دور تھا۔ اس کی بادشاہت بالکل برائے نام تھی اور تمام اختیارات غازی الدین خاں کے ہاتھ میں تھے جو اس کا وزیر تھا۔ سلطنتِ مغلیہ گھٹتے گھٹتے اطراف دہلی کے چند اضلاع تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ پنجاب ہاتھ سے نکل چکا تھا، دکن اور اودھ دونوں خود مختار سلطنتیں ہو گئی تھیں۔ ملک کے بڑے حصے پر مرہٹوں کا قبضہ تھا۔ کچھ علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات میں شامل تھا۔ دہلی کا بادشاہ چند امیروں اور وزیروں کے رحم و کرم پر تھا اور اس کے تاج کی اب کوئی عزت باقی نہ رہی تھی، لیکن عیش و عشرت کا سلسلہ بدستور وہی تھا۔ بادشاہ ستر سال کی عمر کو پہنچ گیا تھا کہ فروری ۱۷۵۶ء میں محمد شاہ کی بیٹی حضرت بیگم سے (جو صرف سولہ سال کی تھی اور حسین و جمیل تھی) شادی رچانا چاہی، لیکن حضرت بیگم نے انکار کر دیا اور خودکشی کی دھمکی دی۔

عالم گیر ثانی کا وزیر غازی الدین نہایت شقی القلب اور ظالم شخص تھا۔ بادشاہ کی ذرہ بھر آبرو اس کے دل میں نہ تھی اور وہ اس کو کسی بہانے ختم کرنے پر تلا ہوا تھا۔ غازی الدین، دکن کے والی نظام الملک کا پوتا تھا اور ظلم و ستم اس کی سرشت میں داخل تھا۔ اس نے مغل بادشاہوں کے عزل و نصب اور قتل و غارت کا وہی سلسلہ شروع کر رکھا تھا جو اس سے قبل سادات بارہہ کا تھا۔ سادات بارہہ بھی اپنے زمانے میں بادشاہ گر کی حیثیت سے مشہور تھے، اور دکن کے نظام الملک کا خاندان بھی اب یہی ''خدمات'' انجام دے رہا تھا۔

غازی الدین نے عالم گیر ثانی کے قتل کا منصوبہ بنایا اور اس سے انتہائی سفاکانہ سلوک کیا۔ اس زمانے میں یہ بے کس و مظلوم بادشاہ امور سلطنت سے دست کش ہو کر خلوت نشینی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کا فکر و عقیدہ کچھ ایسا تھا کہ درویشوں اور فقیروں سے میل جول رکھتا اور ان کی صحبت کو اچھا سمجھتا تھا۔ ایک روز مہدی علی خاں نے جو غازی الدین خاں کا شریکِ سازش تھا، بادشاہ سے کہا کہ ایک درویش کامل کوٹلہ فیروز شاہ میں تشریف لائے ہیں اور قابل زیارت بزرگ ہیں۔ مہدی علی خاں نے ان کی چند کشوف و کرامات بھی بیان کیں۔ بھولا بادشاہ درویش کی عقیدت کے جوش میں مہدی علی خاں کے جھوٹ کے جال میں آ گیا اور فقیر باکرامت کی زیارت کو چل پڑا۔ جب پہلے دروازے پر پہنچا، تو مہدی علی خاں نے تلوار بادشاہ سے لے لی۔ پردہ اٹھا کر اندر لے گیا اور دروازے بند کر دیے۔ بادشاہ اندر پہنچا تو دیکھا کہ موت کے فرشتے انسانوں کی صورت میں سامنے کھڑے ہیں۔ چار ازبک تلواریں سونت کر بادشاہ پر پل پڑے۔ سر تن سے جدا کر دیا اور بے سر تن کو جمنا کی ریت پر پھینک دیا۔ ایک ظلم یہ کیا کہ لاش کے کپڑے بھی اتار کر لے گئے۔ کئی روز بعد بادشاہ کی لاش ملی اور ہمایوں کے مقبرے میں دفن ہوئی۔ بادشاہ کے اس مظلومانہ قتل کا سانحہ ۸ ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ (۹ دسمبر ۱۷۵۹ء) کو پیش آیا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عالم شاہ ثانی:

عالم گیر ثانی کے قتل کے بعد اس کا بیٹا ابوالمظفر جلال الدین سلطان علی گوہر شاہ عالم ثانی کے لقب سے بادشاہ ہوا۔ عالم شاہ ثانی ۱۷ ذیقعدہ ۱۱۴۰ھ/۱۴ر جون ۱۷۲۸ء کو پیدا ہوا، اور ۳۳ سال کی عمر میں ۴ جمادی الاولیٰ ۱۱۷۳ھ (۲۴ر دسمبر ۱۷۵۹ء) کو تخت حکومت پر بیٹھا۔

عالم شاہ ثانی کو احمد شاہ ابدالی نے عالم گیر ثانی کا ولی عہد نامزد کیا تھا۔ غازی الدین خاں اس کا مخالف تھا۔ وہ ابدالی کی موجودگی میں تو خاموش رہا، لیکن ابدالی کے دہلی سے واپس جانے کے بعد اس کو گرفتار کر کے جیل میں ڈالنے کی ترکیب سوچنے لگا۔ چنانچہ اس نے فوج کو حکم دے کر محل کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن شہزادے نے ہمت سے کام لیا اور گرفتاری سے بچ گیا۔ اپنے چند ساتھیوں کی مدد سے رات کی تاریکی میں محل کے روشن دان سے کودا اور دیواروں کو پھاند کر باہر آ گیا۔ باہر اس کے کچھ ساتھی گھوڑے لیے تیار کھڑے تھے۔ وہ گھوڑوں پر سوار ہوئے اور گھوڑے جمنا میں ڈال کر دریا پار کیا۔ مجنوں کے ٹیلے تک پہنچے تو وہاں ایک مرہٹہ سردار فوج لیے بیٹھا تھا۔ اس نے شہزادے کا استقبال کیا اور نہایت احترام سے اپنی نگرانی میں اسے فرخ نگر تک پہنچایا۔ وہاں موسیٰ خاں بلوچ سے ملاقات ہوئی، اس نے شہزادے کو کئی ہزار روپے کی پیش کش کی۔ مرہٹہ سردار تو واپس آ گیا اور شہزادہ وہاں سے نجیب الدولہ کے پاس سہارن پور پہنچ گیا، جہاں وہ آٹھ مہینے مقیم رہا۔ نجیب الدولہ نے اس کے شاہانہ مرتبے کے مطابق سامان سفر تیار کیا اور وہ مراد آباد، بریلی، لکھنؤ اور الٰہ آباد کی خاک چھانتا ہوا، عظیم آباد (پٹنہ) پہنچا۔ اسی سفر میں جب وہ بنگال جاتے ہوئے ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ (نومبر ۱۷۵۹ء) میں کرم باسا سے پار اترا تو اس کے والد عالم گیر ثانی کے قتل کا المیہ پیش آیا، جس کی اطلاع اسے کچھ عرصہ بعد صوبہ بہار کے ایک گاؤں "کاتونی" میں ملی۔ شہزادے نے یہ خبر سنتے ہی چند لوگوں کے سامنے کھانے کی دو میزیں ایک دوسری سے ملائیں، اور اوپر قالین بچھایا اور اسے تخت سلطنت قرار دے کر شاہ عالم ثانی کا لقب اختیار کر کے اس پر جلوس کیا۔

افراتفری کے اس زمانے میں مغل بادشاہت کی کیا قدر و منزلت رہ گئی تھی، اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ تخت نشین ہونے کے بعد یہ بادشاہ پورے دس سال تک اپنے دارالحکومت دہلی نہیں جا سکا۔ الٰہ آباد میں بیٹھا برائے نام حکومت کرتا رہا۔ امرا کی سازشوں اور وزراء کی رقابتوں میں گھرا، اور انگریزوں کے پنجۂ جبر میں پھنسا ہوا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے اس کو چھبیس لاکھ روپے سالانہ ملتے تھے اور یہ اس رقم کو غنیمت سمجھتا تھا۔ یہ چھبیس لاکھ روپے اسے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کے بدلے میں دیے جاتے تھے، بعد میں یہ بھی بند کر دیے گئے تھے۔ بادشاہ کے ذاتی مملوکہ علاقے بھی دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دیے گے۔ ادھر اس کا بیٹا مرزا جوان بخت مرہٹوں کے اثر و اقتدار میں پھنسا ہوا دہلی میں بیٹھا تھا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر ۱۷۶۳ء کے اواخر میں بھرت پور کے سورج مل جاٹ نے پہلے آگرہ پر چڑھائی کی، اس کے بعد بعض اور علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ تخت نشینی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے بارہ سال بعد ۲۵ دسمبر ۱۷۷۱ء کو بادشاہ شاہ عالم ثانی دہلی آیا، لیکن یہاں اسے نہایت تکلیف دہ حالات سے دوچار ہونا پڑا۔

ایک وقت ایسا آیا کہ غلام قادر روہیلہ کئی قسم کے حیلے بہانے کر کے بادشاہ کے قریب ہو گیا۔ بادشاہ نے اسے خلعت سے نوازا، اور منصب وزارت اور مرصع سپر سے سرفراز کیا، اور اس نے قرآن درمیان میں رکھ کر وفاداری کا عہد کیا۔ لیکن اس بدبخت نے بادشاہ کو سلیم گڑھ کے قلعے میں محبوس کر دیا، اور ایک محبوس شہزادے بیدار بخت کو جیل سے نکال کر تخت پر بٹھا دیا۔ اس ناہنجار نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، ۹ ذیقعدہ ۱۲۰۲ھ کو بادشاہ کی آنکھیں نکال دیں۔ پھر نہایت رعونت اور نخوت کے ساتھ بولا "اب تجھے کیا سوجھتا ہے" شاہ عالم نے جواب دیا۔ "مجھے وہ قرآن پاک دکھلائی دے رہا ہے جو تیرے اور میرے درمیان ہے۔"

جفا کار اور ستم گر غلام قادر کا انجام بھی نہایت عبرت ناک ہوا۔ پہلے تو بادشاہ کے اندھا کر دینے کی خبر دبی رہی، لیکن جوں ہی لوگوں کو اس کا علم ہوا، وہ تھرا اٹھے اور قلعے کے گرد جمع ہو گئے۔ مرہٹہ فوج بھی بادشاہ کی مدد کو پہنچی۔ غلام قادر رات کے اندھیرے میں گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگا، لیکن گھوڑا ایک گڑھے میں گر پڑا۔ گھوڑا تو اٹھ کر دوڑ گیا، مگر غلام قادر بے ہوشی کی حالت میں رات بھر وہیں پڑا رہا۔ صبح کو گرفتار کر کے اسے متھرا میں گوالیار کے مادھو جی سندھیا کے کیمپ میں لے جایا گیا۔ مرہٹے بعض وجوہ کی بنا پر اب بادشاہ کے حامی تھے۔ وہاں اسے گدھے کی دم کی طرف منہ کر کے سوار کیا اور بازار میں پھرایا گیا۔ غلام قادر نے گالیاں دینی شروع کر دیں تو زبان جڑ سے کاٹ دی گئی۔ پھر اندھا کر کے ناک، کان، ہاتھ پاؤں کاٹ کر شاہ عالم کے حضور بھیجا گیا۔ لیکن جو لوگ اسے لے جا رہے تھے، انھوں نے راستے میں اسے ایک درخت پر الٹا لٹکا دیا اور اسی حالت میں ۳؍ مارچ ۱۷۸۹ء کو اس کا دم نکل گیا۔ بیدار بخت جسے تخت پر بٹھایا گیا تھا، زندہ درگور ہوا۔

شاہ عالم ثانی نے جو طبع موزوں رکھتا تھا، اپنی مظلومیت پر دردناک شعر کہے۔

نابینا ہونے کے باوجود عالم شاہ ثانی کو دوبارہ تخت پر بٹھایا گیا۔ لیکن وہ صرف نام کا بادشاہ تھا۔ اس کے قبضے اور اختیار میں کوئی چیز نہ تھی۔ نو لاکھ روپے سالانہ پنشن مرہٹوں سے ملتی تھی، وہ بھی کبھی ملی، کبھی نہ ملی۔ دو ہزار روپے ماہانہ پنشن ایسٹ انڈیا کمپنی دیتی تھی۔ اس طرح وہ دو طرف سے دباؤ میں تھا۔ اس کے علاوہ نذرانوں اور چھوٹے چھوٹے رؤسا کی پیش کش کی آمدنی تھی، جس سے انگریز عہدے داروں کو بھی نذر دینی پڑتی تھی۔ پھر چھوٹے چھوٹے خلعتوں سے بھی بادشاہ معززین کو سرفراز کرتا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ عالم شاہ ثانی ایک دور اندیش، جرأت مند اور بلند حوصلہ بادشاہ تھا۔ ہندوستان پر انگریزوں کی گرفت اسے بہت ناگوار گزرتی تھی۔ اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس نے تگ و دو بھی کی، اور ان طاقتوں سے تعاون کے لیے بھی کوشاں ہوا جو انگریزوں سے برسر پیکار تھیں۔ پھر اس کی سزا بھی اسے بھگتنی پڑی اور بالآخر انگریزوں کے زیر نگیں آنے پر مجبور ہوا۔ افسوس ہے، اس کو اس وقت حکومت ملی جب

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پورے ملک میں سازشوں کا وسیع جال بچھا ہوا تھا اور ہر طرف ہنگامے بپا تھے۔ حالات بگڑ چکے تھے اور اصلاح کی کوئی صورت باقی نہ رہی تھی۔

شاہ عالم ثانی نے ۷ رمضان المبارک ۱۲۲۱ھ (۱۹ نومبر ۱۸۰۶ء) کو اس دنیائے فانی سے عالم آخرت کے لیے رخت سفر باندھا۔

بارھویں صدی ہجری اور اٹھارھویں صدی عیسوی کے شاہانِ مغلیہ کی یہ مختصر داستان تھی۔ اس کی بے شمار تفصیلات قلم زد کر دی گئی ہیں۔ اب اس حکومت کے دورِ زوال کے دو بادشاہ باقی ہیں۔ ابوالنصر معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی اور ابوالظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ۔ ان کے ضروری حالات ''فقہائے ہند'' کی اگلی جلد میں بیان کیے جائیں گے۔ ان شاء اللہ العزیز۔

ایسٹ انڈیا کمپنی:

یہ عالم ہست و بود بے شمار آلام وحوادث کی جولان گاہ ہے جو ہمیشہ زمانے کی رفتار کے ساتھ سطح ارض پر نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے دوائر عمل اتنے محدود اور اثرات و نتائج اس درجہ ناپائیدار ہوتے ہیں کہ انھیں ناقابل اعتنا سمجھ کر ترک کر دیا جاتا ہے اور تاریخ کے صفحات میں انھیں کوئی جگہ نہیں دی جاتی۔ بعض اپنے خوش گوار یا ناخوش گوار اثرات کی وسعت و شدت کی بنا پر عرصۂ دراز کے لیے یادوں کے گہرے نقوش اپنے پیچھے چھوڑ جاتے ہیں اور تاریخ کے اوراق انھیں نمایاں جگہ دیتے ہیں۔ پھر ان کی وجہ سے قوموں اور ملکوں کی تقدیر کا دھارا اپنا رخ بدلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اتوار کا دن، ۲۸ رمضان المبارک ۹۰۳ھ (۲۰ مئی ۱۴۹۸ء) کی تاریخ تھی کہ جنوبی ہند کی بندرگاہ کالی کٹ (ملیبار) کے ساحل پر ایک واقعہ پیش آیا، جو اس وقت اپنی نوعیت کے اعتبار سے اتنا معمولی اور اتنا چھوٹا تھا کہ کسی نے اس کو اہمیت نہ دی۔ لیکن آگے چل کر یہ واقعہ پاک و ہند کی تجارتی اور سیاسی فضا میں ایسے اسباب پیدا کرنے اور ایسے عناصر کے قدم جمانے کا باعث بن گیا کہ یہ برصغیر اجنبی اقتدار کی زنجیروں میں جکڑا گیا اور طویل مدت تک محکومی وغلامی کی سزا بھگتتا رہا۔ یہ پرتگیزوں کی آمد کا واقعہ تھا، جو واسکوڈی گاما کی قیادت میں چار چھوٹے جہاز لے کر ایک عرب ماہر بحریات احمد بن ماجد نجدی کی رہنمائی میں راس امید کا چکر کاٹتے ہوئے کالی کٹ کے ساحل پر اترے تھے۔ اس کے بعد انگریزوں کے یہاں تک پہنچنے کے لیے راستہ ہموار ہوا۔

پھر اس ملک کے سیاسی افق پر جس کا کاشانۂ تقدیر کافوری شمعوں سے جگمگا رہا تھا، سیاہ بادل چھا گئے اور وہ یورپی ممالک جو تجارتی لحاظ سے تاریک گوشوں میں سمٹے بیٹھے تھے، ممتاز حیثیت اور نئی شان وشوکت سے ابھر کر سامنے آئے۔

یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ پرتگیزوں کے ساحل ہند پر ورود سے قبل بحیرۂ روم، بحیرۂ اٹلانٹک،

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بحیرۂ قلزم، بحر ہند اور بحر الکاہل کے سینے پر عرب مسلمانوں کے سفینے تیرتے پھرتے تھے، جن کی ترکتازیوں کا سلسلہ چین اور جاوا تک پھیلا ہوا تھا۔ پھر حالات نے ایسی کروٹ لی کہ پرتگیزوں نے ان کے بیڑے تباہ کر دیے اور تجارت پر قبضہ کر لیا۔

یہ ایک طویل داستان ہے جو بہت سے تلخ حقائق اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ یہاں اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ساحل ہند پر پہلی بحری تجارتی یلغار کرنے والا یورپی قافلہ پرتگیزوں کا تھا۔ پھر ان کی جگہ ہالینڈ کے ولندیزیوں نے لی۔ ان کے بعد انگریز اور فرانسیسی جہاز راں بحر ہند میں وارد ہوئے۔ برصغیر کی سمندری تجارت کے اکھاڑے میں ان دونوں کے درمیان شدید مقابلہ ہوا، اور دونوں نے ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی بھرپور کوششیں کیں۔ بالآخر اس کش مکش میں انگریز غالب آئے اور پھر آہستہ آہستہ وہ برصغیر پر قابض ہو گئے۔

انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو آگے چل کر برصغیر کی فرماں روا بن گئی، ۱۶۰۱ء میں ہندوستان کو پہلے تجارتی جہاز روانہ کیے، اور شروع ہی میں اسے بے پناہ منافع حاصل ہونے لگا، یہاں تک کہ بارھویں سفر میں ہر حصے دار کو ۳۴۴ فی صد منافع ہوا۔ اس منافعے کی اصل وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کے تاجروں اور یہاں کی حکومت نے انگریز تاجروں کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا اور ان کو اپنے دامن محبت میں جگہ دی۔ جہاں گیر کے عہد میں جب کپتان ہاکنز دربار میں پہنچا تو بادشاہ نے فراخ دلی سے اس کا خیر مقدم کیا۔ ۱۶۰۸ء میں اس کو سورت میں جو اس زمانے میں مشہور بندرگاہ تھی، کوٹھی تعمیر کرنے کی اجازت ملی۔ یہ برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت کا دور تھا۔ اس کے پانچ سال بعد ۱۶۱۳ء میں سر طامس برطانوی سفیر کی حیثیت سے ہندوستان آیا تو جہاں گیر اس کی شائستگی اور قابلیت سے بہت متاثر ہوا، اور اسے اس مغل بادشاہ کی نجی صحبتوں میں شرکت کا اعزاز حاصل ہوا۔ اب سورت کے علاوہ احمد آباد، برہان پور، آگرہ، اجمیر اور کھمبایت وغیرہ شہروں میں انگریزوں کی کوٹھیاں اور کمپنی کے گودام تعمیر ہونے لگے۔ کمپنی کے ملازم لاکھوں کا لین دین کرتے تھے۔ ان سے برصغیر کے تاجروں کی ہمدردیوں کا یہ حال تھا کہ کسی انگریز کو مکان نہ ملتا تو ہندی تاجر اس کے لیے اپنا مکان خالی کر دیتا۔ قرض کی ضرورت ہوتی تو خوشی سے مطلوبہ رقم پیش کر دیتا، یا اس کا ضامن ہو جاتا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے بہت جلد بحری برتری حاصل کر لی تھی اور بحر ہند میں اس کے تجارتی جہاز دندناتے پھرتے تھے۔ ایک مرتبہ جہاں گیر کے عہد میں یہ انگریزی کمپنی اپنی بحری طاقت کے بل بوتے پر مغل حکومت سے باقاعدہ بحری جنگ پر تیار ہو گئی تھی۔ فریقین کے درمیان وجہ مخاصمت کمپنی کے کارندوں کی یہ شکایت تھی کہ شاہی ملازم تجارتی مال درآمد پر محصول لینے میں سختی کرتے اور رشوتیں لیتے ہیں، اور حکومت ہند کے کارکنوں کو یہ شکوہ تھا کہ بدیسی تاجر، ان دیہات سے جو ساحل سمندر پر واقع ہیں، بچے پکڑ کر لے جاتے ہیں اور غلام بنا کر انھیں فروخت کرتے ہیں۔ نیز ہندی تاجروں کے جہازوں کو سمندر میں لوٹ لیتے ہیں، اس طرح یہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لوگ بحری قزاقی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اس قسم کی باتوں سے جب لڑائی تک نوبت پہنچ جاتی تو بدیسی تاجروں میں میدان میں لڑنے کی طاقت تو تھی نہیں، وہ کوٹھیوں سے اپنا سامان اٹھا کر جہازوں میں منتقل کر دیتے اور سمندر میں ہندی جہازوں کو خوب لوٹتے اور عملے کے ارکان کو گرفتار کر لیتے۔ بالآخر ہندی تاجر فریاد لے کر حکومت کے پاس جاتے اور وہ ان کا یہ صحیح مطالبہ منظور کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ اس طرح کی دو لڑائیاں ____ ایک کلکتے میں اور دوسری سورت کے قریب ____ انگریزوں نے اورنگ زیب عالم گیر سے لڑیں اور یہ مضبوط مغل حکومت ان کے سامنے بے بس ہو گئی۔ اسی طرح ایسٹ انڈیا کمپنی احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت اور مرہٹوں کی بھی شدید مخالفت پر اتر آئی، لیکن اسے کوئی کچھ نہ کہہ سکا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز کارکن محض تاجر نہ تھے، سپاہی بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب برصغیر میں وسیع پیمانے پر طوائف الملوکی پھیلی اور امن عامہ خطرے میں پڑ گیا تو کمپنی کے کارپردازوں کی حفاظت کے لیے کوئی خاص انتظام نہیں کرنا پڑا۔ ان کی ساحلی کوٹھیاں جو بمبئی، سورت، مدراس اور کلکتے وغیرہ بڑے بڑے شہروں میں تھیں، پہلے ہی سے قلعہ بند تھیں، مسلح جوان ابتدا ہی سے ان کے حلقۂ ملازمت میں شامل تھے اور ان کے جہاز یوم اول ہی سے حربی ضروریات کو پیش نگاہ رکھ کر بنائے گئے تھے۔ ان کی یہی فوجی طاقت تھی، جس کو انھوں نے اورنگ زیب کے انتقال کے بعد برصغیر میں پوری آزادی کے ساتھ استعمال کیا اور اس سے خوب کام لیا۔

اٹھارھویں صدی میں مغلیہ سلطنت کی عظمت کا چراغ گل ہونے لگا تو برصغیر کے متعدد علاقوں میں نئی حکومتیں ظہور میں آئیں۔ مرہٹوں نے مغلوں کی شان و شوکت کے کھنڈروں پر اپنی طاقت کے محل تعمیر کیے، پورے مہاراشٹر اور وسطی ہند پر قبضہ جما لیا، اور مالوہ اور گجرات تک تگ و تاز کی۔ نادر شاہ ایران سے چلا اور دلی کو تہ و بالا کر دیا اور صدیوں کے جمع شدہ مال و متاع کو چشم زدن میں تاراج کر دیا۔ خود مغلوں نے جن لوگوں کو مختلف صوبوں کے والی اور حاکم مقرر کیا تھا، وہ اپنی اپنی جگہ خود مختار بن بیٹھے تھے۔ بنگال میں علی وردی خاں، اودھ میں برہان الملک سعادت علی خاں، روہیل کھنڈ میں افغان سردار اور دکن میں نظام الملک آصف جاہ نے بلا شرکت غیرے حکومت کی باگ ڈور ہاتھ میں لی۔ دہلی کی مرکزی حکومت کی اطاعت سے منہ موڑا، خراج دینا بند کیا اور نذرانے ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس صورت حال سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز کارکنوں کے حوصلے اور بڑھے اور وہ براہ راست سیاسیات میں دخل دینے لگے۔ پھر جن علاقوں کی حکومتیں مالی لحاظ سے کمزور تھیں، انگریز سرمایہ داروں نے ان کی روپے پیسے سے مدد کرنا شروع کی اور انھیں قرض دینے لگے تاکہ یہ ان کے زیر بار احسان رہیں اور ان کے سامنے دم نہ مار سکیں۔ چنانچہ جب انھوں نے اپنی مصلحتوں کی بنا پر محمد علی کو کرناٹک کی صوبے داری پر متعین کیا تو اسے روپے کی ضرورت پڑی کیونکہ وہ فوجیوں کی تنخواہیں بھی ادا نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت اس نے انگریزوں کی طرف رجوع کیا اور اپنی مجبوری بیان کی تو انھوں نے چند انگریز سرمایہ داروں سے اسے چار لاکھ اشرفی بہ طور قرض دلائی اور شرط یہ عائد کی کہ مدراس کی حکومت نواب کی ضمانت دے،

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور ساتھ ہی یہ بھی طے کیا گیا کہ چند اضلاع بہ صورت رہن قرض خواہوں کے سپرد کیے جائیں جن کی مال گزاری سے وہ سود وصول کرتے رہیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نواب کے صوبے کے کئی ضلعے عملاً انگریزوں کے ماتحت چلے گئے، وہ ان کا مالی لحاظ سے محتاج بھی ہو گیا اور اس کے علاقے میں کمپنی کا ولایتی مال بھی خوب فروخت ہونے لگا، یعنی یہ علاقہ ان کی ایک مستقل منڈی بن گیا۔

ابھی کرناٹک کا مرہونہ علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز سرمایہ داروں اور تاجروں کے قبضے میں تھا کہ ۱۷۵۷ء میں بنگال کا علاقہ بھی ان کے زیرنگیں آ گیا یعنی جنگ پلاسی میں انگریزوں کے مقابلے میں میر جعفر کی غداری سے سراج الدولہ کی شکست ایک عظیم انقلاب کا باعث بنی کہ جس سے برصغیر کی سیاسی فضا بالکل بدل گئی اور اس ملک میں انگریزوں کے قدم اور مضبوط ہو گئے۔ اس کی ضروری تفصیل آگے آ رہی ہے۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ جب مرکزی طاقت کے کمزور ہو جانے کے باعث صوبوں کے والی اور گورنر آزاد ہو گئے اور ان کے علاقوں کے خراج اور نذرانوں کی آمدنی جو مغل بادشاہ کے مرکزی خزانے میں جاتی تھی، بند ہو گئی، پھر حاکموں کے عزل و نصب کے بارے میں بھی بادشاہ کے حکم کو ناقابل تعمیل قرار دیا جانے لگا تو ملک کے تمام عمال و حکام خودسر ہو گئے اور باہم لڑائی جھگڑے پر اتر آئے۔ ان آزاد، خودسر اور خود مختار حکومتوں اور جماعتوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز اہل کار بھی شامل تھے، جو ڈیڑھ سو سال سے اس ملک میں رہ رہے تھے۔ طویل مدت میں ان کی حیثیت بالکل بدل گئی تھی۔ اب وہ محض غیر ملکی یا بدیسی نہیں رہے تھے، بلکہ ملک کے دوسرے باشندوں، افغانوں، مغلوں، مرہٹوں اور دیگر قوموں کی طرح ہندی اور دیسی ہو گئے تھے۔ یا یوں کہیے کہ اس برصغیر میں جو ہمیشہ مختلف قوموں کا ''عجائب خانہ'' رہا ہے ایک سفید فام قوم کا اضافہ ہو گیا تھا۔ انھوں نے ہندی طرز معاشرت اختیار کر لی تھی، شہری آبادیوں میں یہاں کے باشندوں سے گھل مل کر رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی زبان سیکھ لی تھی اور شعر و شاعری کی مجلسوں میں شریک ہوتے اور شعر کہتے اور پڑھتے تھے۔ پھر یہاں کے باہمی سیاسی جھگڑوں میں مختلف فریق ان سے مدد لیتے اور وہ مدد دیتے تھے۔ انگریز چونکہ ایک منظم قوم تھے اور برصغیر کے لوگ افراتفری اور انتشار کا شکار ہو گئے تھے، اس لیے آگے چل کر اپنی مضبوط تنظیم کی وجہ سے وہ اس ملک پر غالب آ گئے اور یہاں کے باشندے ان کی محکومی کی زنجیر میں جکڑے گئے۔

جنگ پلاسی کے بعد بنگال پر میر جعفر کی حکومت برائے نام رہ گئی تھی، تمام اہم معاملات اور سلطنت کے دروبست پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ تھا۔ اس سے کمپنی کو آگے قدم بڑھانے کے خوب مواقع میسر آئے اور وہ جلب مال و زر میں بے لگام ہو گئی۔ اس سے قبل فرخ سیر کے زمانے میں انگریزی مال کو محصول سے مستثنیٰ قرار دیا جا چکا تھا۔ وہ اس طرح کہ مغل بادشاہ فرخ سیر ایک مرتبہ بیمار ہو گیا۔ ڈاکٹر ہملٹن نے اس کا علاج کیا اور بادشاہ کو صحت ہو گئی۔ بادشاہ نے خوش ہو کر ڈاکٹر ہملٹن سے کہا کہ بتاؤ تمھیں کس انعام و اکرام سے نوازا جائے؟ ڈاکٹر نے اپنی ذات کے لیے کچھ نہیں مانگا۔ عرض کیا انگریزوں کے تجارتی مال سے محصول معاف کر دیا جائے۔ بہر حال

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انگریزوں کے حق میں برصغیر کے حالات روز بروز سازگار ہو رہے تھے اور کمپنی کے علاوہ انگریزوں نے نجی طور پر بھی تجارت شروع کر دی تھی۔ بنگال کی ہر منڈی میں انگریز تاجر موجود تھے اور وہ پان، بانس، چاول، گھی، بھس، نمک، چھالیہ، مچھلی، تمباکو وغیرہ کی خرید و فروخت کرتے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجتے تھے۔ ہندی تاجران کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے، کیونکہ دیگر اخراجات کے علاوہ ان کو محصول بھی ادا کرنا پڑتا تھا، اور انگریز تاجر اس محصول سے مستثنیٰ تھے۔

سراج الدولہ کے قتل کے بعد انگریزوں نے بنگال کی حکومت میر جعفر کے سپرد کر دی تھی، اس سے اختلاف ہوا تو اس کے داماد میر قاسم کو حکمران بنا دیا۔ میر قاسم کے پاس ہندی تاجروں کی طرف سے انگریز تاجروں کی کاروباری بدعنوانیوں کی شکایات آنے لگیں۔ نیز خود میر قاسم نے کمپنی کے حکام سے فریاد کی کہ انگریزوں کے ہر چھوٹی بڑی تجارت پر قبضہ کر لینے سے میری حکومت بہت خسارے میں ہے اور انگریز تاجروں سے محصول معاف ہونے کی وجہ سے حکومت کو پچیس لاکھ روپے سالانہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ لیکن ان شکایتوں اور فریادوں کا انگریزوں پر ذرہ اثر نہ ہوا۔ بالآخر میر قاسم نے ہندی تاجروں سے بھی محصول لینا بند کر دیا۔ یہ بات کاروباری نقطہ نظر سے انگریزوں کے خلاف جاتی تھی، لہٰذا انھوں نے ایک ہنگامہ بپا کر دیا اور نتیجتاً میر قاسم کو بنگال چھوڑ کر شمالی ہند کی طرف جانا پڑا۔ پھر وہاں سے وہ والئی اودھ شجاع الدولہ اور شاہ عالم بادشاہ کے پاس پہنچا۔ ان سے فوجی مدد لے کر بنگال کا رخ کیا اور ۱۷۶۴ء میں بکسر کے مقام پر انگریزوں سے جنگ لڑی اور شکست کھائی۔ اس سے اگلے سال ۱۷۶۵ء میں الہ آباد کا صلح نامہ مرتب ہوا، جس کی رو سے بادشاہ دہلی کی طرف سے کمپنی کو بنگال کا دیوان یعنی مال گزاری وصول کرنے والا حاکم مقرر کیا گیا اور اس کے بدلے میں کمپنی کی طرف سے بادشاہ کا نذرانہ مقرر ہو گیا۔ علاوہ ازیں بنگال کے میر جعفر (جسے میر قاسم کے حکومت چھوڑ جانے کے بعد دوبارہ برسرِ حکومت لایا گیا تھا) ذاتی مصارف اور انتظامی محکموں کے اخراجات کے لیے ایک رقم معین کر دی گئی اور طے پایا کہ ان دو مصارف کے بعد جو کچھ بچ رہے گا، وہ کمپنی کا ہوگا۔ اس معاہدے کی تحریر تک تو حکومت میں انگریزوں کا عمل دخل باقاعدہ نہ تھا، لیکن اس فرمانِ شاہی کی رو سے انھیں حکومت پر قبضہ کرنے کی باضابطہ سند حاصل ہو گئی۔

انگریزوں کی اس کمپنی نے محمد علی سے کرناٹک پر حکومت قائم کرنے کے صلے میں لاکھوں روپے کمائے اور کئی اضلاع حاصل کیے۔ اس کے علاوہ کمپنی نے میر جعفر سے بنگال کی حکومت کا سودا کیا۔ پہلے میر جعفر سے سراج الدولہ کو ختم اور اس کی گدی پر قبضہ کرنے کے بدلے میں ۱۷۵۷ء میں ساڑھے تین کروڑ سے زائد رقم وصول کی۔ پھر ۱۷۶۰ء میں میر جعفر کو ہٹا کر اس کی جگہ میر قاسم کو تخت نشین کیا، اور میر قاسم سے تقریباً ستائیس لاکھ روپے ملے۔ اس کے بعد ۱۷۶۳ء میں پھر میر قاسم کو الگ کر کے میر جعفر کو لایا گیا اور اس سے کم و بیش ڈیڑھ کروڑ روپے میں سودا چکایا۔ پھر ۱۷۶۵ء میں نجم الدولہ کی طرف رجوع کیا اور اس سے کوئی بیس لاکھ روپے لیے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور بنگال میں اس کی حکومت قائم کی۔ اس طرح کمپنی نے پانچ کروڑ روپے تو نقد کمائے اور جو مراعات حاصل کیں وہ اس کے علاوہ تھیں۔ اس قسم کے مختلف طریقوں سے ۱۷۷۱ء تک کمپنی اور اس کے اہل کاروں کو کوئی بیس کروڑ روپے کی رقم وصول ہوئی۔ پھر تھوڑے عرصے بعد یہ رقم چالیس کروڑ روپے کو پہنچ گئی۔ اندازہ لگایئے اس زمانے میں روپے کی قیمت کیا تھی اور اب کیا ہے؟ اور زمانۂ حال کے حساب کے مطابق ڈھائی سو سال قبل اس رقم کو کتنی اہمیت حاصل ہوگی۔

مشرقی ہند میں بنگال، بہار اور اڑیسہ بہت زرخیز اور بڑے صوبے تھے۔ انگریزوں نے سب سے پہلے یہیں قدم جمائے۔ بادشاہ دہلی سے جسے غلام قادر روہیلہ نے آنکھیں نکال کر اندھا کر دیا تھا، کمپنی نے چھبیس لاکھ روپے سالانہ دینے کے وعدے پر انہی تینوں صوبوں کی دیوانی لکھوائی، لیکن بعد میں بادشاہ کے چھبیس لاکھ روپے بھی ضبط کر لیے اور اس کے مملوکہ علاقے بھی دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دیے۔ یعنی نہ سراج الدولہ سے وفا کی، نہ میر جعفر اور میر قاسم کو معاف کیا، نہ بادشاہ دہلی کو قابل رحم سمجھا۔ جس سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہوئی، فائدہ اٹھایا، پھر اسے بے مصرف سمجھ کر پیچھے پھینک دیا۔

بکسر کی لڑائی کے بعد لارڈ ولزلی کے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے گورکھ پور، روہیل کھنڈ اور جنوبی دوآبے کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ پھر کرناٹک کے نواب کو معزول اور سلطان ٹیپو کو شکست دینے کے بعد وہ تمام علاقے ہتھیا لیے جو بعد میں احاطۂ مدراس میں شامل ہوئے۔

مرہٹے جن کا سرحد بنگال سے لے کر کاٹھیاواڑ تک اور گوالیار سے لے کر ستارا تک ڈنکا بج رہا تھا، نہایت سخت جان قوم تھے، کمپنی نے ان کو بھی ان کے علاقوں سے بزور شمشیر بے دخل کیا۔ اس سے قبل یہ اورنگ زیب عالم گیر سے بھی کئی معرکوں میں شکست کھا چکے تھے، اور احمد شاہ ابدالی سے بھی پانی پت کے میدان میں بری طرح ہزیمت اٹھا چکے تھے، لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ ان میں کمال یہ تھا کہ شکست کھانے کے بعد پھر ابھرتے اور بار بار میدان میں اترتے، ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقابلے میں بھی آئے اور کچلے گئے۔

اب کمپنی نے برصغیر میں تقریباً تمام مخالف طاقتوں کو ختم کر دیا تھا اور اس کے مقبوضات میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے ایک قدم یہ اٹھایا کہ اپنے مقبوضہ علاقوں کی اعلیٰ ملازمتوں سے برصغیر کے لوگوں کو ناقابل اعتماد سمجھ کر الگ کر دیا اور ان کی جگہ انگریزوں کو بھرتی کیا۔ عدالتوں میں بھی یہی صورت حال پیدا کر دی۔

۱۷۶۵ء میں کمپنی کے دیوانی یا صیغۂ مال پر قبضے کے سات سال بعد تک بنگال میں دوعملی سی قائم رہی۔ یعنی کمپنی کی حکومت بھی تھی اور نواب کی بھی۔ ۱۷۷۲ء میں گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے اس صورت حال کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اس نے پولیس اور فوج داری کا انتظام بھی کمپنی کے ہاتھ میں دے دیا۔ ہر ضلعے میں کلکٹر مقرر کیے جو مال گزاری وصول کرنے کے علاوہ مقدمات مال کے فیصلے بھی خود ہی کرتے تھے۔ اپیل کی سماعت کے لیے کلکتے میں دو عدالتیں قائم کیں، صدر نظامت اور صدر دیوانی۔ لیکن انگلستان کی پارلیمنٹ کے ارکان کو جب

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کمپنی کے کارپردازوں کی ان زیادتیوں کا پتا چلا جو انھوں نے باشندگان ہند پر روا رکھی تھیں، تو ۱۷۷۳ء میں ریگولیٹنگ ایکٹ پاس کیا، جس کی رو سے بورڈ آف کنٹرول یعنی جماعت نگران کار اور عدالت ہائی کورٹ قائم کیے۔ یہ پہلا ہائی کورٹ تھا جو شاہ انگلستان کی طرف سے کلکتے میں قائم ہوا اور مسٹر امپی اس کے چیف جسٹس انگلستان سے مقرر ہو کر آئے۔ ان کی تنخواہ آٹھ ہزار روپے ماہانہ تھی۔

یہاں یہ بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کلکتہ ہائی کورٹ پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا کوئی اثر نہ تھا۔ اس کے جج بعض فیصلے کمپنی کے مفادات کے خلاف بھی کر دیتے تھے۔ اب مسٹر وارن ہیسٹنگز نے یہ چال چلی کہ ان آٹھ ہزار روپے کے علاوہ جو مسٹر امپی چیف جسٹس کو انگلستان کے بادشاہ کے حکم سے ملتے تھے، کمپنی کی طرف سے مزید آٹھ ہزار روپے دینے کا اعلان کیا اور بیرونی اپیلیں بھی چیف جسٹس کے سپرد کر دیں۔ اس سے گورنر جنرل کا مقصد چیف جسٹس کو روپے کا لالچ دے کر کمپنی کے مفادات کا تحفظ کرانا تھا۔

بہر حال جب عدالتوں کا نظام بھی بہت بگڑ گیا، کمپنی کی زیادتیاں بھی حد کو پہنچ گئیں اور کمپنی کے اہل کاروں کے رویے سے ہندوستانیوں کی بلاوجہ تحقیر بھی ہونے لگی تو برطانوی پارلیمنٹ نے کئی سال بعد ۱۸۳۲ء میں کمپنی سے تجارت کا حق چھین لیا اور اس کے ہاتھ میں صرف ہندوستان کی حکومت رہ گئی، وہ بھی ۱۸۵۷ء میں ختم ہو گئی، اور اس سال سے پورا برصغیر براہ راست برطانوی حکومت کے تسلط میں چلا گیا۔

انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کا دور حکومت یوں تو برصغیر کے تمام لوگوں کے لیے انتہائی تکلیف کا دور تھا، لیکن مسلمان اس میں بالخصوص نہایت اذیت میں مبتلا تھے۔ کیونکہ انگریز انھی سے حکومت چھین رہے تھے اور انھی کے درپے آزار تھے تاکہ یہ دوبارہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہیں اور اپنی غصب شدہ حکومت کے حصول کے لیے میدان میں نہ اتر سکیں۔ لیکن انگریزوں کی بے پناہ الم ناکیاں ان کی جدوجہد کا راستہ نہ روک سکیں اور ان کے مجاہدانہ جوش و جذبے میں رکاوٹ نہ پیدا کر سکیں۔ چنانچہ برصغیر کے علمائے دین نے نعرۂ جہاد بلند کیا اور مسلمان ان کی رہنمائی میں میدانِ میں اترے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کا فتویٰ جاری کیا اور اس ملک کو دارالحرب قرار دیا۔ ان کے بھتیجے مولانا اسمٰعیل شہید دہلوی نے انگریزوں کے خلاف تقریریں کیں، عوام کو ان کی مخالفت پر ابھارا اور بالآخر شاہ عبدالعزیز کے ایک پاک باز مرید و شاگرد سید احمد شہید بریلوی کی قیادت میں ایک بہت بڑا لشکر تیار کیا اور انگریزی حکومت کے خلاف جنگ کرتے ہوئے ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ (۶ مئی ۱۸۳۱ء) کو جامِ شہادت نوش کیا۔ علمائے برصغیر کی عظیم جماعت ان کے ساتھ تھی۔ علاقۂ میوات کا ایک غیور مسلمان جس کا نام چیتو تھا، پندرہ ہزار سواروں کے ساتھ انگریزوں سے معرکہ آرا ہوا۔ غرض آزادی کی بہت سی تحریکیں جن میں مسلمان پیش پیش تھے اور بالخصوص علمائے دین جن میں مرکزی کردار ادا کر رہے تھے، ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں اٹھیں۔ ان سب تحریکوں کا ضروری تذکرہ فقہائے ہند کی آئندہ جلدوں میں ان حضرات کے حالات کے ضمن میں کیا جائے گا، جو ان تحریکوں کے قائد یا ان سے وابستہ رہے ہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اودھ کی حکومت:

اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ میں کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں معرض وجود میں آ گئی تھیں اور ان کے حکمران خود مختار ہو گئے تھے۔ ان ریاستوں میں اودھ کی ریاست کا نام سرفہرست ہے۔ اودھ ہندوستان کا ایک علاقہ ہے جو صوبہ یوپی کے کچھ اضلاع پر مشتمل تھا اور اس کا دارالسلطنت لکھنؤ تھا۔

اودھ کا پہلا حکمران محمد امین تھا جو نیشاپور کے خاندان سادات سے تعلق رکھتا اور نامور تاجر تھا۔ وہ عالم گیر کے بیٹے شاہ عالم بہادر شاہ اول کے دور حکومت میں دہلی پہنچا اور شاہی خدمات پر مامور ہوا۔ بہادر جرنیل، صاحب تدبیر اور بہت بڑا منتظم تھا۔ محمد شاہ بادشاہ نے سادات بارہہ (حسین علی خاں اور حسن علی خاں) سے نجات حاصل کرنے اور انھیں قتل کرنے کا منصوبہ بنایا، تو محمد امین بادشاہ کا شریک راز تھا۔ حسین علی خاں کے قتل کے بعد حسن علی خاں سے مقابلے اور قتل کی نوبت آئی تو اس وقت بھی اس نے بڑی مستعدی کا ثبوت دیا اور اس نازک موقعے پر فتح حاصل کی۔ اس شجاعت اور مستعدی کے صلے میں محمد امین پہلے صوبۂ اکبر آباد کی حکومت پر فائز ہوا، پھر اسے صوبۂ اودھ کا والی مقرر کیا گیا، بعد ازاں مرکزی حکومت کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اودھ کو اس نے ایک مستقل ریاست کی شکل دے دی اور زمام اختیار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ بادشاہ دہلی کی طرف سے برہان الملک اور سعادت خاں کے القاب سے سرفراز ہوا۔ نادر شاہ نے اسی سعادت خاں کی دعوت پر ہندوستان پر یلغار کی تھی اور اسی کے مشورے سے دہلی شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا تھا۔ پھر اس نے اسی اثنا میں ۹ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ (۹/ مارچ ۱۷۳۹ء) کو اودھ کے حکمران کی حیثیت سے وفات پائی۔

برہان الملک نواب سعادت خاں کے بارے میں یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ جب وہ اودھ کی عنان حکومت سنبھالنے کے لیے جا رہا تھا اور فرخ آباد سے کشتی کے ذریعے دریائے گنگا عبور کر رہا تھا تو آب گنگا کی موجوں میں سے ایک مچھلی برآمد ہوئی اور اچھل کر سعادت خاں کی جھولی میں آ پڑی۔ سعادت خاں نے اس کو نیک فال سمجھ کر پکڑ لیا۔ پھر اس کی سوکھی ہوئی ہڈیاں اودھ کے آخری حکمران نواب واجد علی شاہ کے عہد تک لکھنؤ کے عجائب گھر میں محفوظ رہیں۔ کہتے ہیں کہ غالباً یہی وہ تصور ہے جس کا اثر نہ صرف قیصر باغ وغیرہ کی تصویروں میں اب تک نمایاں ہے، بلکہ حکومت اودھ کے سکوں اور سرکاری کاغذات میں بھی مچھلی کی تصویر نے نمایاں جگہ حاصل کی ❶۔

سعادت خاں نے اپنے زمانۂ حکومت میں علاقۂ اودھ میں مکمل امن و امان قائم رکھا اور اس کی حدیں اتنی وسیع کر لیں کہ غازی پور، جون پور، بنارس اور چنار بھی اس میں شامل ہو گئے۔ سعادت خاں کی وفات کے بعد اس کے بھتیجے اور داماد صفدر جنگ کو ۱۷۴۸ء میں مغلیہ حکومت کا وزیر مقرر کیا گیا۔ یہ وہی حکمران تھا جس نے

❶ علمائے ہند کا شان دار ماضی، ج ۲ ص ۵۶ (حاشیہ نمبر ۱)۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روہیلوں کی مضبوط مسلمان قوم کے مقابلے میں مرہٹوں سے فوجی امداد طلب کی تھی۔ پھر اس ضمن میں جو جنگیں ہوئیں ان کے نتیجے میں مرہٹے اس طرح ابھر کر سامنے آئے کہ روہیل کھنڈ پر اپنے حقوق کا دعویٰ کرنے لگے۔

صفدر جنگ کے بعد ۱۷۵۴ء میں اس کا بیٹا شجاع الدولہ اودھ کا حکمران بنا۔ اس زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طاقت بہت بڑھ گئی تھی۔ شجاع الدولہ اس کے مقابلے میں آیا اور ۱۷۶۴ء کو بکسر کے مقام پر شکست کھائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اودھ کا صوبہ کمپنی کے قبضے میں آ گیا۔ ۱۷۶۵ء میں الٰہ آباد کا عہد نامہ ہوا، جس کی رو سے کان پور، الٰہ آباد اور فتح پور کو چھوڑ کر، اودھ کا باقی علاقہ شجاع الدولہ کو واپس دے دیا گیا۔ اس نے یہ بھی اقرار کیا کہ وہ پچاس لاکھ روپے کی رقم انگریزوں کو دے گا۔ ۱۷۷۳ء میں عہد نامۂ بنارس کی تکمیل ہوئی۔ اس عہد نامے کی رو سے پچاس لاکھ کی یہ رقم بادشاہ دہلی کو ادا کی گئی تاکہ وہ اپنا وقار و اقتدار بحال رکھ سکے۔ یہ ریاست چونکہ مرہٹوں اور بنگال کے درمیان واقع تھی، اس لیے انگریزوں نے اس کو اور زیادہ اپنے زیر اثر کر لیا۔ اور انگریزی فوجوں کے اخراجات جو دو لاکھ دس ہزار روپے ماہانہ تھے۔ اسی ریاست پر ڈال دیے گئے۔ علاوہ ازیں کڑہ اور الٰہ آباد کے اضلاع جو شاہ دہلی کے قبضے میں تھے، نوب اودھ کے ہاتھ پچاس لاکھ روپے میں فروخت کر دیے گئے، اس لیے کہ بادشاہ دہلی نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے قطع تعلق کر کے یہ اضلاع مرہٹوں کے حوالے کر دیے تھے۔

۱۷۷۵ء میں آصف الدولہ اودھ کا نواب مقرر ہوا تو وارن ہیسٹنگز کی کونسل کی مخالف اکثریت نے اس کا خراج دو لاکھ ۶۰ ہزار روپے ماہانہ تک بڑھا دیا اور مجبور کیا کہ وہ اضلاع جون پور، غازی پور اور بنارس کے شاہی حقوق مکمل طور پر کمپنی کو منتقل کر دے۔ آصف الدولہ نے ۱۷۹۷ء میں وفات پائی اور نواب سعادت علی خاں اس کی مسند پر بیٹھا۔

۱۸۰۱ء میں لارڈ ولزلی نے آصف الدولہ کے سوتیلے بھائی اور اس کے جانشین نواب سعادت علی خاں کو پورا روہیل کھنڈ اور دو آب کا ایک حصہ انگریزوں کے حوالے کرنے پر مجبور کیا، چنانچہ اس علاقے کی تمام آمدنی انگریزی فوج کے خرچ کے لیے وقف کر دی گئی۔

نواب سعادت علی خاں نے ۱۸۱۴ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا سب سے بڑا بیٹا غازی الدین حیدر وارثِ تخت ہوا۔ یہ پہلا حکمران تھا جس نے شاہ اودھ کا لقب اختیار کیا۔ اودھ کا یہ حکمران ۱۸۲۷ء میں سفر آخرت پر روانہ ہوا۔ اس کے بعد علاقۂ اودھ کے مندرجہ ذیل بادشاہ ہوئے

۱۔	ناصر الدین حیدر	۱۸۲۷ء تا ۱۸۳۷ء
۲۔	محمد علی شاہ	۱۸۳۷ تا ۱۸۴۲ء
۳۔	امجد علی شاہ	۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۷ء
۴۔	واجد علی شاہ	۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۶ء

۱۸۵۶ء میں لارڈ ڈلہوزی نے صوبۂ اودھ کا الحاق انگریزی علاقے سے کر دیا اور واجد علی شاہ کا وظیفہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ازاں کچھ اور کمک بھی بھیج دی گئی۔ ۳ جون ۱۷۵۶ء کو خود نواب سراج الدولہ بھی وہاں پہنچ گیا۔ سراج الدولہ انگریزوں کا سخت دشمن تھا، لیکن اس کے باوجود صلح کی فضا میں اور خوش اسلوبی سے تمام مسائل کو حل کرنے کا خواہاں تھا، لڑائی جھگڑے سے بہر حال گریزاں تھا۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے متعدد ذمے دار انگریزوں نے بھی اس کی تائید کی اور اس کے موقف کو صحیح قرار دیا، کیونکہ اس نے قاسم بازار کے گرفتار شدہ تمام انگریز قیدیوں کو رہا کر دیا تھا اور کمپنی کے اثاثے کو بھی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ لیکن فورٹ ولیم کے انگریز گورنر ڈریک نے نہ تو سراج الدولہ کی کسی تجویز کو لائق اعتنا سمجھا اور نہ اپنے انگریز ساتھیوں کی کسی بات کو قابل توجہ ٹھہرایا۔ وہ غصے سے لال پیلا ہو گیا اور جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ اس نے فوج کا ایک دستہ تو سکھ ساگر کی طرف روانہ کیا اور ایک قلعہ تھانہ کی جانب بھیجا، لیکن نواب سراج الدولہ کی فوج نے دونوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اب نواب کے لیے میدان جنگ میں نکلنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا، چنانچہ وہ ۱۶ جون ۱۷۵۶ء کو تیس ہزار فوج کے ساتھ فورٹ ولیم کے سامنے آ نمودار ہوا، اور ہر طرف سے انگریزوں پر حملہ بول دیا۔ چار دن تک شدید لڑائی جاری رہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں نے عورتوں اور بچوں کو جہاز میں سوار کر کے محفوظ مقامات پر بھیج دیا اور خود ڈریک میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس کی جگہ ایک اور انگریز ہال ویل آیا۔ اس نے آتے ہی حالات کا جائزہ لیا اور صلح کا جھنڈا بلند کر دیا۔ ۲۰ جون کو ہتھیار ڈال دیے اور سراج الدولہ کی فوجیں فورٹ ولیم میں داخل ہو گئیں۔

اس موقعے پر سراج الدولہ نے نہایت عالی ظرفی کا ثبوت دیا، نہ کسی انگریز پر ہاتھ اٹھایا، نہ کسی کو تشدد کا نشانہ بنایا، نہ کسی سے سختی کا سلوک روا رکھا اور نہ کوئی سامان لوٹا۔ فورٹ ولیم کونسل کا سیکریٹری کک کہتا ہے کہ نواب اور اس کی فوج کے شریفانہ اور ہمدردانہ رویے سے حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ اب تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے پا جائیں گے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز حکمران نواب کی عائد کردہ شرائط کے تحت جو بالکل صحیح ہیں، اپنا کاروبار جاری رکھ سکیں گے۔

لیکن اس کے بعد ایک بالکل غلط اور جھوٹا افسانہ تراشا گیا، وہ یہ کہ سراج الدولہ نے ۱۴۶ انگریز قیدیوں کو ایک اٹھارہ فٹ لمبی اور چودہ فٹ دس انچ چوڑی کال کوٹھڑی میں، جس کا نام "بلیک ہول" رکھا گیا، بند کر دیا تھا اور ان میں سے صرف ۲۳ زندہ بچے، باقی سب مر گئے۔ یہ نہایت سنگین الزام تھا اور سراسر کذب و افترا پر مبنی! خود دیانت دار انگریز مورخین بھی اس کی تردید کرتے ہیں، کیونکہ اتنی چھوٹی سی کوٹھڑی میں اتنے لوگ سما ہی نہیں سکتے، اور یہ نواب سراج الدولہ پر وسیع پیمانے پر حملہ کرنے اور انگریزوں کو اس کے خلاف مشتعل کرنے کی ایک سازش تھی۔

بہر حال سراج الدولہ کی انگریزوں کے مقابلے میں یہ بہت بڑی فتح تھی جس سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز حکام سخت پریشان تھے، دوسری طرف اس کے اندرونی دشمن بھی اس کو برداشت نہیں کرتے تھے اور اس کے درپے آزار رہتے تھے۔ بلیک ہول (کال کوٹھڑی) کی جھوٹی خبر بھی انگریزوں نے بہت مشہور کر رکھی

www.KitaboSunnat.com
محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ازاں کچھ اور کمک بھی بھیج دی گئی۔ ۳ جون ۱۷۵۶ء کو خود نواب سراج الدولہ بھی وہاں پہنچ گیا۔ سراج الدولہ انگریزوں کا سخت دشمن تھا، لیکن اس کے باوجود صلح کی فضا میں اور خوش اسلوبی سے تمام مسائل کو حل کرنے کا خواہاں تھا، لڑائی جھگڑے سے بہر حال گریزاں تھا۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے متعدد ذمے دار انگریزوں نے بھی اس کی تائید کی اور اس کے موقف کو صحیح قرار دیا، کیونکہ اس نے قاسم بازار کے گرفتار شدہ تمام انگریز قیدیوں کو رہا کر دیا تھا اور کمپنی کے اثاثے کو بھی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ لیکن فورٹ ولیم کے انگریز گورنر ڈریک نے نہ تو سراج الدولہ کی کسی تجویز کو لائق اعتنا سمجھا اور نہ اپنے انگریز ساتھیوں کی کسی بات کو قابل توجہ ٹھہرایا۔ وہ غصے سے لال پیلا ہو گیا اور جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ اس نے فوج کا ایک دستہ تو سکھ ساگر کی طرف روانہ کیا اور ایک قلعہ تھانہ کی جانب بھیجا، لیکن نواب سراج الدولہ کی فوج نے دونوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اب نواب کے لیے میدان جنگ میں نکلنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا، چنانچہ وہ ۱۶ جون ۱۷۵۶ء کو تیس ہزار فوج کے ساتھ فورٹ ولیم کے سامنے آ نمودار ہوا، اور ہر طرف سے انگریزوں پر ہلہ بول دیا۔ چار دن تک شدید لڑائی جاری رہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں نے عورتوں اور بچوں کو جہاز میں سوار کر کے محفوظ مقامات پر بھیج دیا اور خود ڈریک میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس کی جگہ ایک اور انگریز ہال ویل آیا۔ اس نے آتے ہی حالات کا جائزہ لیا اور صلح کا جھنڈا بلند کر دیا۔ ۲۰ جون کو ہتھیار ڈال دیے اور سراج الدولہ کی فوجیں فورٹ ولیم میں داخل ہو گئیں۔

اس موقعے پر سراج الدولہ نے نہایت عالی ظرفی کا ثبوت دیا، نہ کسی انگریز پر ہاتھ اٹھایا، نہ کسی کو تشدد کا نشانہ بنایا، نہ کسی سے سختی کا سلوک روا رکھا اور نہ کوئی سامان لوٹا۔ فورٹ ولیم کونسل کا سیکریٹری کک کہتا ہے کہ نواب اور اس کی فوج کے شریفانہ اور ہمدردانہ رویے سے حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ اب تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے پا جائیں گے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز حکمران نواب کی عائد کردہ شرائط کے تحت جو بالکل صحیح ہیں، اپنا کاروبار جاری رکھ سکیں گے۔

لیکن اس کے بعد ایک بالکل غلط اور جھوٹا افسانہ تراشا گیا، وہ یہ کہ سراج الدولہ نے ۱۴۶ انگریز قیدیوں کو ایک اٹھارہ فٹ لمبی اور چودہ فٹ دس انچ چوڑی کال کوٹھڑی میں، جس کا نام "بلیک ہول" رکھا گیا، بند کر دیا تھا اور ان میں سے صرف ۲۳ زندہ بچے، باقی سب مر گئے۔ یہ نہایت سنگین الزام تھا اور سراسر کذب و افترا پر مبنی! خود دیانت دار انگریز مورخین بھی اس کی تردید کرتے ہیں، کیونکہ اتنی چھوٹی سی کوٹھڑی میں اتنے لوگ سما ہی نہیں سکتے، اور یہ نواب سراج الدولہ پر وسیع پیمانے پر حملہ کرنے اور انگریزوں کو اس کے خلاف مشتعل کرنے کی ایک سازش تھی۔

بہر حال سراج الدولہ کی انگریزوں کے مقابلے میں یہ بہت بڑی فتح تھی جس سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز حکام سخت پریشان تھے، دوسری طرف اس کے اندرونی دشمن بھی اس کو برداشت نہیں کرتے تھے اور اس کے درپے آزار رہتے تھے۔ بلیک ہول (کال کوٹھڑی) کی جھوٹی خبر بھی انگریزوں نے بہت مشہور کر رکھی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھی، چنانچہ اس کا بدلہ لینے کے لیے کرنل کلائیو اور امیر البحر واٹسن بری اور بحری فوج لے کر مدراس سے بنگال پہنچے، اور بعض مقامات پر قبضہ کر لیا۔ ادھر سراج الدولہ کے بعض ذمے دار افسروں نے نہایت بے پروائی سے کام لیا اور انگریزی فوج کو قلعۂ کلکتہ پر قابض ہونے کے مواقع فراہم کر دیے۔ سراج الدولہ نے خود فوج لے کر انگریزوں کے مقابلے میں حرکت کرنے کا ارادہ کیا تو کئی بدخواہ آڑے آئے۔ اس پر شب خون مارنے کی بھی کوشش کی۔ اسی اثنا میں سراج الدولہ اور انگریزوں کے درمیان نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہو گیا، یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ انگریزی فوج نے ہگلی کو فتح کر لیا اور سراج الدولہ کے کمانڈر میر جعفر نے انگریزوں سے اس کے خلاف ساز باز شروع کر دی۔ اس سے انگریزوں کے حوصلے بڑھ گئے اور فتح قریب نظر آنے لگی۔ پھر مغربی سمت سے سراج الدولہ کو احمد شاہ ابدالی کے متعلق یہ خبر پہنچی کہ وہ بنگال پر حملہ کرنے والا ہے، چنانچہ اس نے مصلحتاً فروری ۱۷۵۷ء میں انگریزوں کی طرف دست مصالحت بڑھایا لیکن کلائیو کی نیت خراب تھی، وہ کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھا جو سراج الدولہ کو زیر کرنے کے لیے اس کی مدد کرے اور پھر اس کی مسند پر بیٹھ کر انگریزوں کے مفادات کا تحفظ کرے۔ چنانچہ اس کی نظر میر جعفر پر پڑی اور اسے بنگال کی حکومت کا لالچ دے کر ہاتھ میں لیا۔ امی چند سوداگر نے جو اس سازش میں شریک تھا، اپنی کوششوں کے صلے میں کلائیو سے تیس لاکھ روپے کی رقم طلب کی۔ کلائیو نے اس کے ساتھ یہ فریب کیا کہ اسے ایک جعلی عہد نامہ لکھ کر دیا اور امی چند اسے صحیح سمجھ کر مطمئن ہو گیا۔

میر جعفر سے کلائیو نے جو خفیہ معاہدہ کیا تھا، اس کی رو سے میر جعفر نے انگریزوں کے ساتھ سراج الدولہ کی جنگ کو ناگزیر بنا دیا۔ چنانچہ ۲۳ جون ۱۷۵۷ء کو کلائیو اپنی فوج کو جدید اسلحہ سے مسلح کر کے شمال کی جانب بڑھا اور بغیر کسی مقابلے کے سراج الدولہ کی فوج نے قتوہ کلائیو کے حوالے کر دیا، جہاں سے اس کو کافی سامان جنگ ہاتھ آیا۔ نواب سراج الدولہ ۵۰ ہزار پیادہ اور ۱۸ ہزار سوار اور ۵۰ توپوں کے ساتھ بھاگیرتی ندی کے کنارے جو پلاسی کے قریب بہتی ہے، خیمہ زن ہوا۔ بائیں بازو کی فوج میر جعفر کے زیر کمان تھی۔ پلاسی کے میدان میں جنگ شروع ہوئی۔ سراج الدولہ نے انگریزی فوج کو گھیرے میں لینے کی کوشش کی، لیکن انگریزوں کو گھیرے میں لینے والی فوج میر جعفر کے ماتحت تھی جو سراج الدولہ کے خلاف انگریزوں سے ساز باز کر چکا تھا۔ توپ و تفنگ کی لڑائی صرف قلب کی فوج نے کی، جس کا کمانڈر میر مدن تھا، میر مدن نے خوب داد شجاعت دی اور لڑتے لڑتے دشمن کی گولی کا نشانہ بنا۔ اس کی موت سے سراج الدولہ کا دل ٹوٹ گیا، اور شام تک میر جعفر کی غداری کا بھید بھی کھل گیا جو لڑائی سے الگ ہو گیا تھا۔

شب کی تاریکی میں سراج الدولہ میدان جنگ سے بھاگ کر مرشد آباد پہنچا اور اسلحہ، گھوڑے اور ہاتھی اور سب انگریزوں کے ہاتھ آئے۔ میر جعفر پہلا شخص تھا جو جنگ کے اختتام پر انگریزی فوج کے استقبال کے لیے آگے بڑھا۔ اس طرح پلاسی کی لڑائی میر جعفر کی غداری کی بنا پر انگریزوں کی ''فتح'' اور سراج الدولہ کی ''شکست'' پر منتج ہوئی۔ دراصل یہ جنگ نہیں تھی صریح دھوکا تھا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نواب سراج الدولہ اس شکست کے بعد نہایت پریشان ہوا، اور میر جعفر کی نمک حرامی اور عیاری نے، جو اس کا رشتے دار اور فوجوں کا کمانڈر تھا، اس کو انتہائی غم واندوہ میں مبتلا کر دیا۔ وہ مرشد آباد سے روانہ ہوا تو اس کی ہندو بیوی راج کنور جس کا اسلامی نام لطف النساء تھا، بہ اصرار اس کے ہم راہ ہوئی اور کہا کہ اس پریشانی کے عالم میں، میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔ تین دن کی بھوک پیاس اور انتہائی تکلیف کے بعد دونوں میاں بیوی بہرال کے مقام پر پہنچے اور کھانے پینے کی تلاش میں دانا شاہ کے مزار کی طرف روانہ ہوئے، لیکن پہچانے گئے۔ وہاں ایک شخص کے گھر میں پناہ لی، اس نے بھی غداری کی اور کسی میر صاحب نے روپے کے لالچ میں میر جعفر کے داماد میر قاسم کو خبر کر دی۔

نواب سراج الدولہ مع اہل وعیال کے گرفتار ہوا۔ لاکھوں روپے کے موتی اور جواہر میر قاسم کے ہاتھ آئے اور نواب کو پابہ زنجیر میر جعفر کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے اور اس کے بیٹے میرن نے اسی حالت میں جیل میں لے جانے اور قتل کرنے کا حکم دیا۔ لیکن نواب پر تلوار چلانے کے لیے کوئی تیار نہ تھا۔ آخر نواب سراج الدولہ اور اس کے نانا علی وردی خاں کا ایک پرانا نمک خور غلام آگے بڑھا اور کہا کہ "زنجیروں سے جکڑے ہوئے اس نواب پر یہ غازی تلوار چلائے گا۔" رات کا وقت تھا کہ یہ نمک حرام غلام قید خانے میں داخل ہوا۔ نواب اسے دیکھ کے چونکا اور بولا، "تم مجھے قتل کرنے آئے ہو؟" غلام نے نہایت بے باکی سے جواب دیا۔ "بے شک"! نواب فوراً اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوا، اور اپنے پروردگار سے گناہوں کی معافی مانگی۔ پھر سر اٹھایا اور جلاد سے کہا۔ "کیا میر جعفر اس پر راضی نہیں کہ میں کسی گوشے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کیا کروں؟" جلاد کڑک کر بولا۔ "چپ رہو۔" نواب پھر سجدے میں گر پڑا، اور جلاد نے اس کی گردن اڑا دی۔ جلاد نے نواب کا سر کاٹ کر میر جعفر کے حضور پیش کیا، اور بہت سے انعام واکرام سے نوازا گیا۔

اس طرح ۲۹ جون ۱۷۵۷ء کو اپنے ہی اہل کاروں کی سازش اور سپہ سالار (میر جعفر) کی غداری سے انگریزوں کے اس بہت بڑے دشمن کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ بارھویں صدی ہجری اور اٹھارھویں صدی عیسوی کا عظیم سانحہ ہے جو برصغیر کی تاریخ کا الم انگیز حصہ بنا۔

روہیل کھنڈ کی حکومت:

اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ہندوستان کے مختلف علاقوں میں جو حکومتیں معرض قیام میں آئیں، ان میں ایک حکومت علاقۂ روہیل کھنڈ میں، روہیلہ پٹھانوں کی تھی۔ برصغیر کے عہد زوال میں روہیلوں کی یہ ایک مستحکم حکومت تھی اور خطۂ ہند میں اس کے حکمران بڑے اثر ورسوخ کے مالک تھے۔ انگریزوں، مرہٹوں اور بعض دیگر طاقتوں سے یہ کئی دفعہ نبرد آزما ہوئے اور ہر حریف سے اپنی قوت وطاقت کا لوہا منوایا۔

اٹھارھویں صدی میں روہیلہ پٹھانوں کا نامور سردار اور ممتاز حکمران حافظ رحمت خاں تھا، جس کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جرأت مندانہ اقدامات اور صائب نقطۂ نظر نے بعض بڑی بڑی قوتوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ یہ شخص ۱۱۲۰ھ (۱۷۰۸ء) کو ''تور شہامت پور میں پیدا ہوا، جو ''روہ'' (افغانستان کے وسیع سلسلہ کوہستان) میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔

آج سے کم وبیش تین سو سال پیشتر اس علاقے کے پٹھانوں نے ترک وطن کر کے ہندوستان کے اس علاقے میں بود و باش اختیار کر لی تھی جو دامن ہمالہ میں واقع ہے اور تاریخ میں ''کھیڑ'' کہلاتا ہے۔ ان لوگوں کا اصل وطن چونکہ ''روہ'' تھا، اس لیے انھوں نے ہندوستان کے جس علاقے میں سکونت اختیار کی وہ ''روہیل کھنڈ'' کے نام سے مشہور ہوا۔

روہیلہ پٹھانوں کے سردار اور حافظ رحمت خاں کے والد شاہ عالم خاں کا غلام داؤد خاں پہلا شخص تھا جو روہ سے چل کر کھیڑ (ہندوستان) آیا اور اس علاقے کے راجوں اور زمینداروں کے ہاں فوجی خدمات انجام دینے لگا۔ اپنے حسن سلوک اور اوصاف گوناگوں کی بنا پر عوام وخواص میں داؤد خاں کو احترام واکرام کا مستحق گردانا جاتا تھا۔ اس نے یہاں تک ترقی کی کہ اپنی ایک علیحدہ ریاست قائم کر لی۔ اس کے عروج وشہرت کی خبریں اس کے وطن روہ میں پہنچیں تو وہاں کے بہت سے لوگوں نے ہندوستان کا رخ کیا، جن میں حافظ رحمت خاں کا والد شاہ عالم خاں بھی شامل تھا۔

شاہ عالم خاں چونکہ داؤد خاں کا آقا تھا، اس لیے داؤد خاں نے اس کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا۔ لیکن کچھ عرصے بعد دونوں میں کوئی ایسی رنجش پیدا ہوئی کہ داؤد خاں نے شاہ عالم خاں کو قتل کر ڈالا۔ اس سے تھوڑی مدت بعد خود داؤد خاں بھی مارا گیا۔

داؤد خاں کی وفات کے بعد اس کے متبنیٰ علی محمد خاں نے اس کی مسند سنبھالی۔ علی محمد خاں دلیر اور بہادر سپاہی تھا۔ اس زمانے کے مغل بادشاہ نے اسے طبل اور علم عطا کیا اور نواب کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ وزیر سلطنت قمر الدین خاں کا تقرب بھی اسے حاصل تھا۔ ۱۷۴۲ء میں جب اس نے راجا ہرنند کو شکست دے کر کھیڑ پر قبضہ کر لیا تو روہیلے پٹھان کثیر تعداد میں وہاں آباد ہو گئے تھے، جن میں زیادہ تر علی محمد خاں کے فوجی سپاہی اور خاندان کے لوگ تھے۔ یہ شخص خود تو روہیلہ نہیں تھا، لیکن روہیلوں کی مدد اور سرپرستی کی وجہ سے روہیلہ سردار کہلایا۔ اس کے زمانے میں روہیلے اس قدر جری ہو گئے تھے کہ علی محمد کی قیادت میں انھوں نے بریلی اور اس کے گرد ونواح کو تہ وبالا کر ڈالا۔ ان کی ان سرگرمیوں کی شکایت مغل بادشاہ محمد شاہ (۱۷۱۹ء۔ ۱۷۴۸ء) کو پہنچی تو اس نے ان کی سرکوبی کے احکام جاری کیے۔ شاہی فوج ان کے مقابلے کو نکلی لیکن ناکام رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روہیلوں کے حوصلے اور بڑھے، اپنی مہم کو زیادہ تیز کیا اور مزید علاقوں پر قبضہ کرنے کی ٹھانی۔ اب بریلی، پیلی بھیت، شاہ جہان پور اور بہت سے بلاد وقصبات پر ان کا پرچم اقتدار لہرا رہا تھا۔

روہیلوں کی فتوحات سے اودھ کا نواب صفدر جنگ بہت پریشان تھا۔ اس کی دو وجہیں تھیں، ایک یہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ وہ خود اپنی مملکت کی حدوں کو وسیع کرنے کے لیے سوچ رہا تھا اور روہیلے اس کے لیے رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ دوسرے یہ کہ وہ کٹر شیعہ تھا اور روہیلے سخت سنی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس ملک میں سنی اس طرح فتح حاصل کریں۔ اپنے عقیدے کی بنا پر وہ ان کو برداشت نہ کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے بادشاہ دہلی سے علی محمد خاں کی شکایت کی اور بادشاہ اس کے اکسانے پر روہیلوں کے مقابلے کے لیے خود فوج لے کر نکلا۔ علی محمد خاں نے شاہی فوج کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ وزیر المملک قمر الدین خاں کے کہنے پر بادشاہ نے علی محمد خاں کی جان بخشی تو کر دی، البتہ اسے قیدی بنا کر اپنے ساتھ دہلی لے گیا۔

اس زمانے میں علی محمد خاں کا دست راست اور بہت بڑا معاون حافظ رحمت خاں تھا، بادشاہ نے اسے کچھ نہیں کہا، لیکن روہیلوں نے علی محمد خاں کی گرفتاری کو قومی غیرت کا سوال بنا لیا اور اسے پٹھانوں کی توہین قرار دیا۔ اس کا انتقام لینے کے لیے رحمت خاں ایک بھاری فوج کے ساتھ دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ وزیر المملک قمر الدین خاں اور کچھ لوگوں کے درمیان میں پڑنے سے علی محمد خاں کو رہائی حاصل ہوئی اور ساتھ ہی سرہند کی صوبے داری تفویض کی گئی، جہاں سکھوں اور جاٹوں نے ہنگامے بپا کر رکھے تھے۔ کچھ دنوں بعد (۱۷۴۸ء میں) بادشاہ کو دہلی میں احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان پر حملے کی اطلاع پہنچی۔ اس نے اس خطرے کے پیش نظر کہ روہیلے کہیں اس کے ساتھ نہ مل جائیں، علی محمد خاں کو سرہند کی صوبے داری سے الگ کر کے روہیل کھنڈ میں اس کے پہلے منصب پر مامور کر دیا۔ اسی اثنا میں بادشاہ محمد شاہ کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ احمد شاہ نے سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی۔ کچھ عرصہ بعد ۳ شوال ۱۱۶۲ھ (۴ ستمبر ۱۷۴۹ء) کو علی محمد خاں بھی اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گیا۔ وفات سے دو دن پہلے اس نے حافظ رحمت خاں کو اپنا جانشین بنایا۔ لیکن رحمت خاں چونکہ مخلص آدمی تھا اور حکومت کا اسے کوئی لالچ نہ تھا، اس لیے علی محمد خاں کے چھوٹے بیٹے سعد اللہ خاں کے حق میں حکومت سے دست بردار ہو گیا۔ اس کے دو بیٹے تھے، ایک کا نام عبداللہ خاں تھا اور ایک کا فیض اللہ خاں۔ مگر دونوں افغانستان میں احمد شاہ ابدالی کی قید میں تھے۔ احمد شاہ ابدالی نے جب ۱۱۶۶ھ (۱۷۵۳ء) میں ہندوستان پر حملہ کیا تو ان کو رہا کر دیا تھا ___ یہ وہی فیض اللہ خاں ہے جو بعد میں ریاست رام پور کا بانی ہوا، جو آزادی کے بعد صوبہ یوپی میں ضم ہو چکی ہے۔

روہیل کھنڈ کی حکومت بہت سے نشیب و فراز سے گزری اور دوسرے امرائے ہند کے علاوہ خود علی محمد خاں کے تینوں بیٹوں کے درمیان بھی اس کے لیے بڑی کش مکش ہوئی۔ بالآخر اس کی زمام اختیار حافظ رحمت خاں کے ہاتھ میں آئی۔ اس نے اس کو قائم رکھنے اور اس کے انتظام کو بہتر طریقے سے چلانے کے لیے پوری کوشش کی۔ اودھ کے حکمرانوں سے جنگ کی، مرہٹوں سے برسر پیکار ہوا، ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز حکمرانوں کا مقابلہ کیا، دوسری حریف طاقتوں سے بھی کئی مرتبہ معرکہ آرائی کی نوبت آئی، لیکن یہ شخص نہایت استقلال سے اپنی جگہ پر قائم رہا۔ یہ ایک شجاع، بہادر اور دور اندیش حکمران تھا۔ ۱۱۷۵ھ (۱۷۶۱ء) میں جب احمد شاہ ابدالی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور مرہٹوں کے درمیان پانی پت کے میدان میں آخری مقابلہ ہوا، جس میں مرہٹوں کی حکومت ختم ہوگئی تو حافظ رحمت خاں، اس کے بیٹے عنایت خاں اور چچا زاد بھائی دوندے خاں نے جو نجیب الدولہ کا خسر تھا، عملاً حصہ لیا اور اپنی جاں باز فوجوں سے احمد شاہ ابدالی کی پوری مدد کی۔ احمد شاہ ابدالی نے رحمت خاں کی بہادری اور حربی قابلیت سے متاثر ہو کر اسے اٹاوا کا شہر عنایت کیا، جہاں ابھی تک مرہٹوں کا قبضہ تھا، رحمت خاں نے بزور شمشیر انھیں شہر سے باہر نکالا۔

۱۷۶۳ء میں علی محمد خان کے بیٹے نواب سعد اللہ خاں کا انتقال ہوا، تو روہیل کھنڈ کے لوگوں نے علی محمد خاں کے کسی بیٹے کو اپنا حاکم نہیں بنایا بلکہ حافظ رحمت خاں کی قیادت میں رہنا پسند کیا۔ ۱۷۶۸ء تک اس علاقے میں بالکل امن و امان رہا۔ یہ روہیلوں کے عروج کا زمانہ تھا۔

اب ملک کے حالات تیزی کے ساتھ نئے قالب میں ڈھل رہے تھے اور برصغیر کے سیاسی افق پر انگریزوں کی طاقت روز بروز نمایاں ہو کر ابھر رہی تھی۔ حافظ رحمت خاں بھی اس صورت حال کو خوب سمجھتا تھا اور کسی فریق سے خواہ مخواہ لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر ۱۱۸۴ھ (۱۷۷۰ء) میں نجیب الدولہ اور ۱۱۸۵ھ (۱۷۷۱ء) میں رحمت خاں کے چچا زاد بھائی دوندے خاں جو اس کا بہت بڑا حامی تھا، وفات پا گئے تھے، جس سے ہندوستان میں پٹھانوں کی سیاسی طاقت کو شدید دھچکا لگا۔

رحمت خاں تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ خاموشی کے ساتھ اپنے علاقے کی ترقی کے لیے غور کرنا اور اس کے باشندوں کی خدمت کرنا ہی اس دور کا اصل کام ہے، لیکن اودھ کے شجاع الدولہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریزوں نے اس کا رخ دوسری طرف موڑ دیا اور ایسے حالات پیدا کر دیے کہ اسے مجبور ہو کر میدان جنگ میں اترنا پڑا۔ شجاع الدولہ نے ایک طرف تو وارن ہیسٹنگز سے بات کی اور اس کو بیس لاکھ روپے نقد ادا کر کے اور پینسٹھ لاکھ روپے کا وعدہ کر کے کمپنی کی امداد طلب کی۔ دوسری طرف دہلی کے بادشاہ شاہ عالم کو یہ لالچ دے کر اس سے روہیل کھنڈ پر حملہ کرنے کی اجازت لی کہ اس کو فتح کرنے کے بعد آدھا علاقہ اس کی ملکیت میں دے دیا جائے گا۔ علاوہ ازیں ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ خود بعض روہیلہ سرداروں نے میدان جنگ میں اترنے سے انکار کر دیا۔

رحمت خاں کے لیے یہ نہایت پریشانی کا زمانہ تھا اور سب طاقتیں اس کے خلاف متحد ہوگئی تھیں۔ اس نے مجبور ہو کر صلح کی کوشش کی اور وارن ہیسٹنگز سے ملاقات کرنا چاہی، لیکن اس نے ملاقات کے بجائے کرنل چمپئن کی کمان میں شجاع الدولہ کی امداد کے لیے انگریزی فوج میدان میں اتار دی۔ کرنل چمپئن نے رحمت خاں کو خط لکھا کہ یا تو نواب شجاع الدولہ کو دو کروڑ روپے ادا کرو، یا جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ یہ نامعقول اور ناقابل قبول مطالبہ تھا، اور اس سے گفت و شنید کے دروازے بند ہو گئے تھے۔ جنگ کے بغیر اب کوئی چارۂ کار نہ رہا تھا۔ چنانچہ ۱۱۸۸ھ (۱۷۷۴ء) کو کڑھ میرا پور میں فریقین کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے میں

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آ ئیں۔ دشمن کی فوج بہت بڑی تعداد میں تھی اور روہیلوں کا لشکر اس کی نسبت بہت کم تھا۔ حافظ رحمت خاں خود میدان جنگ میں موجود تھا۔ لڑائی شروع ہوئی، توپوں کے منہ کھلے اور چاروں طرف آگ برسنے لگی۔ اتنے میں ایک گولہ رحمت خاں پر گرا، اور وہ اسی وقت دم توڑ گیا۔ ادھر سے اس کا ایک سابق ملازم سلطان آیا، اس نے اپنے آقا کا سر کاٹ کر شجاع الدولہ کی خدمت میں پیش کیا، جسے دیکھ کر وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ اس کے بعد اس کی لاش تلاش کی گئی، جو میدان جنگ سے ملی اور سر کو لاش کے ساتھ سی دیا گیا۔ پھر اسے بریلی بھیج دیا گیا، جہاں اس کو دفن کر دیا گیا۔ اس طرح ہندوستان میں روہیلوں کے قلیل المدت، مگر شان دار دور حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ سانحہ ہفتے کے روز ۱۱ صفر ۱۱۸۸ھ (۲۳ را پریل ۱۷۷۴ء) کو پیش آیا۔

حافظ رحمت خاں نے ایک شخص راؤ پہاڑ سنگھ کو کئی جاگیریں عطا کی تھیں۔ اس نے ۱۱۸۹ھ (۱۷۷۵ء) میں اپنے اس محسن کی قبر پر مقبرہ تعمیر کیا، اور ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء) میں رحمت خاں کے بیٹے ذوالفقار خاں نے اس مقبرے کی تکمیل کی۔

حافظ رحمت خاں کی وفات کے بعد فاتح شجاع الدولہ کے حکم سے روہیل کھنڈ کے پورے علاقے میں لوٹ مار شروع کر دی گئی۔ بے شمار گاؤں جلا دیے گئے، اور وہاں کے باشندوں کو یا تو قید کر لیا گیا یا موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ روہیلہ سرداروں کی تعمیر کی ہوئی سیکڑوں عمارتیں مسمار کر دی گئیں۔ رحمت خاں کے اہل و عیال اور رشتے داروں پر بے پناہ مظالم ڈھائے گئے، ان کی عورتوں اور بچوں کو سخت پریشانی میں مبتلا کیا گیا۔ شجاع الدولہ کی والدہ نے مختلف مظالم کے واقعات سنے تو وہ چیخ اٹھی اور بیٹے سے ظلم و ستم کا سلسلہ بند کرنے کی التجا کی، لیکن شجاع الدولہ نہیں مانا۔ اس کے بعد جب شجاع الدولہ خود خطرناک بیماری میں مبتلا ہوا، اور اسے یہ بھی اطلاع ملی کہ روہیلے دوبارہ جمع ہو کر لڑائی کی تیاری کر رہے ہیں تو دل میں کچھ نرمی پیدا ہوئی اور بعض قیدیوں کو رہا کر دیا۔

رحمت خاں، حافظ قرآن، پرہیز گار، نیک سیرت اور بلند اخلاق حکمران تھا۔ عادل و منصف، عالی دماغ اور رعایا کے لیے مشفق و مہربان تھا۔ علم و علما سے بے حد تعلق و عقیدت رکھتا تھا۔ اس نے روہیل کھنڈ میں بہت سے مدارس قائم کیے اور جگہ جگہ درس و تدریس کا انتظام کیا۔ اس کی قلمرو میں بے شمار علما و فضلا جمع ہو گئے تھے۔ وہ پانچ ہزار علمائے کرام کو ملک کے خزانۂ عامرہ سے وظیفے اور تنخواہیں دیتا تھا۔ طلبا کے اخراجات کی خود کفالت کرتا اور انھیں معقول ماہانہ وظائف سے نوازتا۔ اس نے دیہات و قصبات میں مسجدیں بنائیں اور ان میں باقاعدہ خطیب، مدرس، مؤذن اور خادم مقرر کیے، جن کے مصارف ملکی خزانے سے ادا کیے جاتے تھے۔ یہ روہیل کھنڈ کا اہل علم حکمران تھا اور اس کا بہت بڑا کتب خانہ تھا جو شکست کے بعد روہیل کھنڈ سے لوٹ کر شجاع الدولہ اپنے ساتھ لکھنؤ لے گیا تھا۔ بعد میں بعض کتابیں انگریزوں نے لندن میں بھی پہنچائیں جو انڈیا آفس لائبریری میں اب تک محفوظ ہیں۔

رحمت خاں بوقلموں اوصاف کا حامل تھا۔ شجاعت و بہادری اور فہم و فراست میں یکتا، متحمل مزاج اور

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

متین تھا سخاوت و جودت میں اپنی مثال آپ۔ فارسی اور پشتو کا اچھا شاعر تھا۔

اس نے زراعت و تجارت کو بھی خوب ترقی دی اور کسانوں، مزدوروں اور کاشت کاروں کا ہمیشہ خیال رکھا۔ اپنے علاقے میں شان دار عمارتیں تعمیر کرائیں، جن میں بیشتر شجاع الدولہ نے اس لیے بھی منہدم کرادی تھیں کہ ان کی ساخت و بناوٹ اس کے خاص عقیدہ و مسلک سے مطابقت نہ رکھتی تھی۔

رحمت خاں باجماعت نماز ادا کرتا، رمضان میں عام لوگوں کے ساتھ تراویح پڑھتا اور خود قرآن مجید سناتا، چھوٹے بڑے ہر شخص کی بات توجہ اور اطمینان سے سنتا اور لوگوں کو ہر موقعے پر حق کہنے کی تلقین کرتا۔ وہ اگرچہ مطلق العنان حکمران تھا مگر اس نے رعایا کے تمام افراد کو برملا بات کرنے اور حق و صداقت کا اعلان کرنے کی پوری آزادی دے رکھی تھی اور وہ حریت فکر و عمل کا داعی تھا۔ اس کا دروازہ ہر شخص کے لیے ہر آن کھلا رہتا اور کوئی فریادی یا ضرورت مند خالی ہاتھ واپس نہ جاتا۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ روہیلہ پٹھانوں کا ایک حصہ بنگش خاندان تھا، جس کا سربراہ اس زمانے میں نواب محمد خاں بنگش تھا۔ اس سلسلے کی ایک مضبوط کڑی نجیب خاں تھا، جس نے دربار شاہی میں رسائی حاصل کر کے رکن حکومت کی حیثیت حاصل کرلی تھی اور نجیب الدولہ کے خطاب سے سرفراز ہوا تھا۔ یہ سب اپنی اپنی جگہ عظیم لوگ تھے اور ملک کو اجنبی اقتدار سے پاک رکھنا چاہتے تھے، لیکن اس دور میں غدار اور عیار و مکار گروہ نے اپنی مخالفانہ سرگرمیوں کا جال اتنا وسیع کرلیا تھا کہ ان کی زد سے کوئی بھی محفوظ نہ رہ سکا۔

حیدر آباد کی آصف جاہی حکومت:

حیدر آباد (دکن) کی آصف جاہی حکومت بھی مغلوں کے دور زوال کی منت پذیر ہے، جس نے بارھویں صدی ہجری اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں جنم لیا۔ اس کے بانی کا نام فخر الدین تھا، جسے مغل دربار سے فتح جنگ اور نظام الملک آصف جاہ وغیرہ کے خطابات سے نوازا گیا تھا۔ اس کے دادا کا نام عابد خاں تھا جو سمرقند سے تین کوس کے فاصلے پر ایک گاؤں علی آباد میں پیدا ہوا، اور پھر اپنے علم و استعداد کی بنا پر شیخ الاسلام کے مرتبے کو پہنچا۔ مغل حکمران شاہ جہان کے عہد میں دہلی آیا اور دربار شاہی سے منصب و جاگیر کا مستحق قرار پایا۔ شاہ جہاں کے بعد اورنگ زیب عالم گیر کا تقرب حاصل کیا اور ماہولی کا قلعہ دار بنا۔

عابد خاں کا یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ جب اورنگ زیب نے قلعۂ گولکنڈہ پر حملہ کیا تو یہ اس کا ہم رکاب تھا اور توپ کے گولے سے زخمی ہوگیا تھا، لیکن صبر و ضبط کا یہ حال تھا کہ ایک درباری جملۃ الملک اسد خاں اس کی مزاج پرسی کو آیا تو یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جراح اس کے شانے سے ٹوٹی ہوئی ہڈی کی کرچیں نکال رہا ہے اور یہ شخص نہایت تحمل و استقلال کے ساتھ بیٹھا لوگوں سے باتیں کر رہا ہے اور ایک ہاتھ میں قہوے کی پیالی پکڑے اطمینان سے قہوہ پی رہا ہے اور ہنس ہنس کر کہہ رہا ہے کہ یہ جراح اپنے فن میں بڑا ماہر ہے۔ لیکن زخم اتنا کاری تھا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ عابد خاں اس سے صحت یاب نہ ہو سکا اور ۲۴ ربیع الاول ۱۰۹۸ھ (۲۸ جنوری ۱۶۸۷ء) کو وفات پا گیا۔

عابد خاں کا بیٹا میر شہاب الدین خاں تھا۔ اس کی ولادت بھی اپنے آبائی وطن علی آباد (سمرقند) میں ہوئی۔ باپ ہندوستان میں شاہی منصب پر فائز ہوا تو بیٹے کو بھی بلا لیا، وہ ۱۰۷۹ھ (۱۶۶۸ء) میں دہلی پہنچا اور دربار کی ملازمت و خطابات سے بہرہ مند ہوا۔ یہ بھی باپ کی طرح نہایت مستعد اور تیز آدمی تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ۱۱۰۰ھ/ ۱۶۸۹ء میں طاعون کی وبا پھیلی تو یہ اس کی لپیٹ میں آ گیا اور اس کے اثر سے نابینا ہو گیا، لیکن سرکاری فرائض اسی طرح انجام دیتا رہا، یہاں تک کہ بعض علاقوں میں فوجوں کی کمان بھی کی جو انتہائی مشکل کام ہے، آخر عمر تک اسی حالت میں یہ مشکل کام کرتا رہا۔ ۱۷ شوال ۱۱۲۲ھ/ ۲۷ نومبر ۱۷۱۰ء کو مرض استسقا سے احمد آباد میں فوت ہوا۔ اس نے اپنی زندگی میں دہلی کے اجمیر دروازے کے باہر ایک مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔ اس کے احاطے میں مقبرہ بھی بنوایا تھا، وفات کے بعد اس کی میت احمد آباد سے دہلی لائی گئی اور اسی مقبرے میں اسے دفن کیا گیا۔ یہی مدرسہ بعد میں دہلی کالج کے نام سے موسوم ہوا۔

میر شہاب الدین خاں کی شادی شاہ جہان بادشاہ کے نامور وزیر علامی سعد اللہ خاں کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ نظام الملک آصف جاہ، جس نے آگے چل کر حیدر آباد (دکن) کی آصف جاہی حکومت کی بنیاد رکھی، اسی خاتون کے بطن سے تھا۔

نظام الملک نہایت چالاک اور تیز نظر آدمی تھا۔ عہد انحطاط کے مغل دربار میں اسے بڑا اثر و رسوخ حاصل تھا۔ دہلی کی مرکزی حکومت کی طرف سے مختلف اوقات میں یہ کئی صوبوں کے منصب ولایت پر مامور رہا۔ بالآخر دکن کا قصد کیا۔ ایک طرف تو یہ دکن میں ایک خود مختار حکومت قائم کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا، دوسری جانب دہلی کی مرکزی حکومت پر بھی اپنا اثر قائم رکھنے کا خواہاں تھا۔ دکن اور اس کے گرد و نواح میں مرہٹے ایک زوردار طاقت تھے، جن سے اس کو ہر وقت خطرہ رہتا تھا۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو ان کی یلغار سے محفوظ رکھنے اور ان کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے ان کو دہلی پر حملے کے لیے آمادہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۱۴۹ھ (۱۷۳۶ء) میں مرہٹوں کا سیلاب دہلی کی طرف بڑھا اور فاتح کی حیثیت سے شہر میں داخل ہو گیا۔ کئی روز تک مرہٹہ فوج دہلی کے بازاروں میں دندناتی رہی، آخر بادشاہ دہلی محمد شاہ رنگیلا سے معاہدہ کر کے واپس گئی۔ نظام الملک اس حرکت سے خود تو مرہٹوں کی دست برد سے محفوظ ہو گیا مگر مغل بادشاہ کو ان کے مطالبات ماننے پر مجبور کر دیا۔ محمد شاہ کو معلوم تھا کہ مرہٹوں کے دہلی پر حملے میں نظام الملک کا ہاتھ ہے مگر وہ بعض ایسی مجبوریوں میں جکڑا ہوا تھا کہ اسے کچھ نہ کہہ سکا بلکہ الٹا اسے ''وکالت مطلقہ'' کے بہت بڑے عہدے، آصف جاہ کے خطاب اور ہشت ہزاری منصب سے مفتخر کیا۔

اس کے بعد ۱۱۵۲ھ (۱۷۳۹ء) میں نادر شاہ نے دہلی پر جو زبردست حملہ کیا اور اس شہر کو جس سفاکی کے ساتھ تاراج کیا اس میں برہان الملک کے ساتھ نظام الملک کا ہاتھ بھی کارفرما تھا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہاں اس حقیقت کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ نظام الملک ''وکالت مطلقہ'' کا منصب عالی حاصل کرنے کے کچھ عرصہ بعد حیدر آباد چلا گیا، اور دہلی میں اپنے بیٹے غازی الدین خاں کو اپنا نائب مقرر کر گیا۔ حالات کچھ ایسا رخ اختیار کر گئے تھے کہ دکن میں نظام الملک نے اور دہلی میں غازی الدین خاں نے اپنے سیاسی مستقبل کے تحفظ کا ذریعہ مرہٹوں کو قرار دے لیا تھا اور دونوں باپ بیٹا اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ان کا سہارا مرہٹوں کی طاقت ہے، لہٰذا ان کی مدد کرنا اور ان سے تعلقات استوار رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے حریفوں کو نیچا دکھانے کے لیے مرہٹوں کے دروازے پر دستک دی۔ غازی الدین خاں نے بادشاہ دہلی کو ہاتھ میں رکھنے کے لیے بھی مرہٹوں کا سہارا تلاش کیا، اودھ کے حکمرانوں کو زیر کرنے کے لیے بھی انہی سے استمداد کی، اپنے دوسرے مخالفوں کا زور توڑنے کے لیے بھی انہی سے مدد مانگی۔ دہلی کے بادشاہ عالم گیر ثانی کو بھی اسی شخص نے قتل کرایا۔ پانی پت کی لڑائی میں احمد شاہ ابدالی اور اس کے ہندوستانی حلیفوں کے مقابلے میں مرہٹوں کی امداد بھی اسی سلطنت کے معماروں نے کی۔ پھر میسور کی سلطنت خداداد کے بانی نواب حیدر علی اور اس کے بیٹے سلطان ٹیپو کے خلاف بھی حیدر آباد کے ارباب اختیار شمشیر بکف ہو کر میدان مبارزہ میں نکلے اور مرہٹوں اور انگریزوں کی کھل کر امداد کی۔ غرض اس ریاست کے اصحاب بست وکشاد نے ہر موقعے پر مرہٹوں اور انگریزوں کا ساتھ دیا۔

یہ ریاست دو سو سال تک ارض دکن میں قائم رہی۔ برصغیر کی آزادی کے بعد ستمبر ۱۹۴۸ء میں اس کا خاتمہ ہوا۔ دو سو سال کی اس طویل مدت میں اس کے حکمرانوں نے کئی بہت اچھے کام بھی کیے۔ اس کا آخری حکمران میر عثمان علی خاں تھا۔ اس کے عہد میں تو ہندوستان میں اس ریاست کو مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کا ایک نشان سمجھا جاتا تھا۔ اس ملک میں عربی اور اردو کی جو خدمت میر عثمان علی خاں کے دور میں ہوئی، وہ تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ نقش رہے گی۔ اس دور میں بے شمار علمی اور تحقیقی کتابیں شائع ہوئیں اور متعدد نایاب ونا پید کتابوں سے اہل علم محض حیدر آباد (دکن) کی وجہ سے متعارف ہوئے۔ پھر اس نے ایک عظیم الشان علمی ذخیرے کو عربی سے اردو میں منتقل کرایا۔ خدمت علم وتحقیق کے لیے بہترین ادارے قائم کیے اور برصغیر کے بے شمار اصحاب علم اور ارباب فضل نے ان اداروں میں خدمات انجام دیں۔ علما فضلا اور شعرا وادبا کا ایک مجمع وہاں مختلف تحقیقی وتصنیفی فرائض انجام دینے پر متعین ہوا۔

ریاست حیدر آباد نے اپنے خرچ پر تصنیف وتالیف کے ادارے قائم کیے، تحقیق وترجمے کے مراکز کھولے اور تعلیم وتدریس کے لیے حدود ریاست میں یونیورسٹی سے لے کر ابتدائی درجے کے مدارس کا جال بچھا دیا۔ پھر اس میں لباس، گفتگو اور میل جول میں ایسی ثقافت اور تہذیب کو عام کیا گیا جو ارض ہند میں مسلمانوں کی ایک دل کش اور جاذب نظر علامت بن گئی۔ کہنا چاہیے کہ دیارِ ہند میں اہل علم اور اصحاب فن کے مرکز کی حیثیت سے حیدر آباد کو وہی مرتبہ حاصل تھا جو بنو عباس کے عہد میں ممالک اسلامی میں بغداد کو حاصل تھا۔ اس کی تمام

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سیاسی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ اس کی علمی و تحقیقی خدمات کا پہلو بے حد ہمہ گیر اور وسعت پذیر ہے۔

سلطنت خداداد میسور:

بارھویں صدی ہجری اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں برصغیر کے مختلف حصوں میں جو حکومتیں قائم ہوئیں، ان میں میسور کی سلطنت خداداد خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ جنوبی ہند کی اس سلطنت کا بانی حیدر علی خاں تھا جو معمولی فوجی عہدے سے ترقی کر کے منصب حکمرانی پر فائز ہوا۔ یہ شخص بہت دلیر اور جنگ جو تھا۔ ملک گیری و جہاں بانی کے تمام اوصاف اس میں پائے جاتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز، ریاست حیدر آباد کے ارباب اختیار اور مرہٹے اس کے حریف تھے۔ اس نے ان سب سے ٹکر لی اور مختلف محاذوں میں ان سے بر سر پیکار رہا۔

اس دور میں ہندوستان کے مسلمانوں کی اصل دشمن دو طاقتیں تھیں۔ ایک ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز جو متعدد مقامات پر اپنے قدم جما چکے اور حکومت کے دروبست پر قابض ہو گئے تھے، اور ان کی فوجیں جنگی ساز و سامان سے لیس ہو کر اس ملک کے بیشتر حصوں میں دندناتی پھرتی تھیں۔ دوسرے مرہٹے جو حرب وضرب اور جنگ وجدال میں بڑی شہرت رکھتے اور برصغیر کے بعض گوشوں میں اپنی گرفت مضبوط کر چکے تھے۔ لیکن اس عہد کے ہندوستانی مسلمانوں کی حرماں نصیبی ملاحظہ ہو کہ مسلمانوں کی جو علاقائی حکومت ان دو طاقتوں سے پنجہ آزما ہونے کے لیے میدان میں اترتی، دوسری مسلمان حکومتوں کے اصحاب بست وکشاد اس کی گردن ناپنا شروع کر دیتے۔ چنانچہ بنگال میں سراج الدولہ انگریزوں کے مقابلے میں آیا تو خود مسلمان ہی اس کی شکست کا باعث بنے۔ حافظ رحمت خاں نے انگریزوں اور مرہٹوں سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تو اودھ کے شجاع الدولہ نے انگریزوں سے گٹھ جوڑ کر کے اس کو ختم کر ڈالا۔ پھر جنوبی ہند میں حیدر علی اور اس کے بعد اس کے بیٹے سلطان ٹیپو نے ان کے خلاف تلوار اٹھائی تو نظام حیدر آباد کی حکومت بھاری فوج لے کر سامنے آ کھڑی ہوئی اور انگریزوں اور مرہٹوں کے ساتھ مل کر میسور کی اس مسلمان سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ارکاٹ کا نواب محمد علی خاں والا جاہ بھی ان کا معاون تھا۔ اگر یہی مسلمان حکومتیں متحد ہو کر اپنے مشترکہ دشمن کا مقابلہ کرتیں تو کبھی بیرونی طاقت ان پر مسلط نہ ہو سکتی۔ انگریزوں نے پہلے تو ان کی باہمی مخالفت سے فائدہ اٹھا کر ان کی قوت کو منتشر کیا اور پھر انھیں مستقل طور پر اپنے حلقۂ غلامی میں جکڑ لیا۔

اٹھارھویں صدی میں ہندوستان کی علاقائی سلطنتوں میں میسور کی سلطنت خداداد خاص اہمیت وشہرت کی حامل تھی، جس کی بنیاد نواب حیدر علی خاں نے رکھی۔ حیدر علی تمام عمر گھوڑے کی پیٹھ پر سوار رہا اور ساری زندگی انگریزوں، مرہٹوں اور حکومت حیدر آباد سے جنگ کرتے ہوئے بسر کر دی۔ اس نے ۳۰ ذی الحجہ ۱۱۹۵ھ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی رات (۷ دسمبر ۱۷۸۲ء) کو ارکاٹ کے قریب نرسنگ رائن پٹ میں وفات پائی اور سرنگا پٹم میں دفن ہوا۔ حیدر علی کی وفات کے بعد اس کے بڑے بیٹے سلطان ٹیپو نے زمام اختیار ہاتھ میں لی۔

ٹیپو جمعے کے روز ۲۰ ذی الحجہ ۱۱۶۳ھ (۱۰ نومبر ۱۷۵۰ء) کو بنگلور سے بیس میل دور ''دلون ہلی'' کے مقام پر پیدا ہوا۔ ٹیپو کی ولادت سے قبل حیدر علی اولاد نرینہ سے محروم تھا اور بیٹے کی شدید خواہش دل میں رکھتا تھا۔ چنانچہ ارکاٹ کے ایک بزرگ ٹیپو مستان ولی کے مزار پر حاضر ہوا، اور اللہ تعالیٰ سے بیٹے کی پیدائش کی دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اور بیٹا عطا کیا تو اسی بزرگ کے نام پر بیٹے کا نام ٹیپو رکھا۔ ٹیپو پانچویں سال کو پہنچا تو حصول علم کا آغاز ہوا۔ عربی اور فارسی کی متداول کتابیں پڑھیں، انگریزی اور فرانسیسی زبانیں سیکھیں، فنون سپاہ گری یعنی تیر افگنی، نیزہ بازی، شمشیر زنی، اور تفنگ اندازی وغیرہ میں مہارت پیدا کی اور حرب وضرب اور رزم و پیکار کے پرانے اور نئے طریقوں کی تربیت حاصل کی۔

حیدر علی خاں چونکہ خود بڑا جنگ جو اور بہادر تھا، اس لیے بیٹے کو بھی اسی راہ پر لگایا اور دلیر بیٹے نے اس وادیٔ پُر خار کے تمام نشیب وفراز سے کامل واقفیت بہم پہنچائی۔ ۱۷۶۵ء میں حیدر علی نے ملیبار پر حملہ کیا تو ٹیپو کی عمر صرف پندرہ برس تھی، مگر جرأت اور حوصلے کا یہ حال تھا کہ تھوڑی سی فوج لے کر دشمن کا تعاقب شروع کر دیا اور اس کے لشکر کو ڈھکیلتا ہوا گھنے جنگل میں لے گیا، یہاں تک کہ وہ لوگ ٹیپو کے آگے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔

۱۷۶۷ء میں حیدر علی خاں نے نظام دکن کی خدمت میں قیمتی تحائف دے کر ایک وفد بھیجا، اس وفد کا قائد ٹیپو سلطان تھا، جس کی عمر اس وقت سترہ سال کی تھی۔ نظام نے شہزادے کو ''نصیب الدولہ'' اور ''فتح علی خاں بہادر'' کے خطاب دیے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ٹیپو کا اصل نام فتح علی خاں نہیں تھا بلکہ یہ خطاب تھا جو اسے نظام دکن نے دیا تھا۔ اس کے بعد یہ بھی نام کے طور پر بولا جانے لگا۔

ٹیپو سلطان جرأت مند باپ کا جرأت مند بیٹا تھا۔ انگریزوں، مرہٹوں، اور دوسرے حریفوں کے ساتھ حیدر علی کے جو محاربے ہوئے، ان سب میں ٹیپو شامل رہا اور ہر موقعے پر دشمن کا مقابلہ کیا۔ جون ۱۷۶۷ء میں انگریزوں کی جنگی سرگرمیوں کا پتا لگانے اور ان کے فوجی ٹھکانوں میں ہراس پیدا کرنے کے لیے حیدر علی نے جو فوج مدراس بھیجی، اس میں ٹیپو بھی شامل تھا۔ اس کے بعد مختلف محاذوں پر اس نے خوب داد شجاعت دی اور دشمن اس کی جنگی صلاحیتوں کا لوہا ماننے پر مجبور ہوا۔

حیدر علی خاں کی وفات اس وقت ہوئی جب وہ انگریزوں سے برسر پیکار تھا اور خود ٹیپو بھی محاذ جنگ پر تھا، اسے پانچویں روز (۱۱ دسمبر ۱۷۸۲ء) کو ملیبار میں عظیم باپ کی موت کی اطلاع ملی۔ وہ ۲۵ دسمبر ۱۷۸۲ء کو چکملور پہنچا، جہاں اس کا لشکر مقیم تھا۔ والد کی موت کے افسوس کی وجہ سے اس نے اپنے رسمی استقبال کی ممانعت کر دی تھی۔ وہ غروب آفتاب کے بعد خاموشی سے لشکر گاہ میں داخل ہوا، اور فرش زمین پر بیٹھ کر سلطنت کے سرداروں کو شرف باریابی بخشا۔ ۲۰ محرم ۱۱۹۷ھ (۲۶ دسمبر ۱۷۸۲ء) کو جمعرات کے دن مسند نشینی کی رسم ادا ہوئی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور سلطنت خداداد کی زمام حکومت ہاتھ میں لی۔ اس وقت ٹیپو کی عمر بتیس سال کی تھی۔

ٹیپو سلطان جب سلطنت خداداد کے منصب حکومت پر متمکن ہوا تو وہ برصغیر کی ایک اہم اور طاقت ور حکومت تھی۔ رقبے کے لحاظ سے وہ شمال میں دریائے کرشنا سے لے کر جنوب میں ریاست ٹراونکور اور ضلع تناولی تک پھیلی ہوئی تھی۔ مشرق میں اس کی حد مشرقی گھاٹ تھی اور مغرب میں اس کا دامن سمندر کو چھور ہا تھا۔ آبادی، زرخیزی اور حسن انتظام میں یہ ایک مثالی سلطنت تھی۔ قدرتی دولت بھی اللہ نے اس کو فراوانی سے عطا کی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جنگ و پیکار کا بھی ایک طویل سلسلہ اس سے وابستہ ہو گیا تھا۔ ایک طرف نظام حیدر آباد اور مرہٹے اس کو ہڑپ کرنے کے درپے تھے، دوسری طرف انگریز تھے جو پورے ہندوستان پر اپنا پرچم اقتدار لہرانے کے لیے ہر طرف سے یلغار کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور اس سلطنت کو اپنے راستے کی بہت بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔ ارکاٹ کا نواب محمد علی والا جاہ بھی اس کو ختم کرنے پر تلا ہوا تھا اور اپنے عارضی مفاد کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کا سخت حامی بن گیا تھا۔ میسور کا قدیم ہندو خاندان بھی، جس سے حیدر علی نے یہ حکومت چھینی تھی، ٹیپو کے درپے آزار تھا۔ اس طرح ٹیپو سلطان کم سے کم پانچ دشمنوں سے گھرا ہوا تھا۔ اور یہ اس کی عزیمت و حوصلہ مندی اور عقل و تدبر کے زبردست امتحان کا وقت تھا۔ اس کی نگاہِ دوررس اور سیاسی بصیرت نے تمام حریف طاقتوں کی نیتوں کو بھانپ لیا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس نے جو تاج شاہی سر پر رکھا ہے، وہ بے شک بہ ظاہر لعل و جواہر سے مزین ہے، لیکن درحقیقت یہ کانٹوں کا تاج ہے، اور اس پر چاروں طرف سے تلواریں گھوم رہی ہیں۔ اس نے نہایت استقلال کا ثبوت بہم پہنچایا اور مخالف قوتوں کا پامردی سے مقابلہ کیا۔

تاریخ کی ستم ظریفی یہ ہے کہ خود اس کے متعدد اہل کار اور عمال حکومت نے بھی اس کے خلاف غداریوں کا وسیع سلسلہ شروع کر دیا اور اس کے گرد و پیش سازشوں کا ایک خوف ناک جال بچھا دیا۔ ان غداروں اور نمک حرام لوگوں میں میر صادق، میر غلام علی لنگڑا، بدر الزمان خاں نائط، میر معین الدین، میر قمر الدین، میر قاسم علی اور پورنیا کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ حکومت کے اہم مناصب پر فائز تھے اور ٹیپو سلطان سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے ٹیپو کے دشمنوں سے رابطہ قائم کیا، ان پر حکومت کے راز ظاہر کیے اور بالخصوص انگریزوں سے گٹھ جوڑ کر کے اپنے مربی کے قتل اور اس کی حکومت کے خاتمے کا باعث بنے۔

ٹیپو سلطان اس برصغیر کی عظیم شخصیت تھی، وہ خود اہل علم تھا اور اہل علم کا قدر دان تھا اور پسندیدہ عادات و اطوار کا مالک، نیک اور عبادت گزار لوگوں سے اس کو محبت تھی۔ اس کا معمول تھا کہ نماز فجر کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتا اور ادعیۂ مسنونہ پڑھتا۔ ہمیشہ باوضو رہتا اور امور خیر میں وقت صرف کرتا۔ تقویٰ شعاری اور حیاداری کا یہ عالم تھا کہ حمام میں بھی کپڑا باندھ کر غسل کرتا، پاؤں اور ہاتھوں کے سوا جسم کا کوئی حصہ کبھی لوگوں کے سامنے ظاہر نہ ہونے دیتا۔ کبھی ایسا لباس زیب تن نہیں کیا جس میں نماز پڑھنا جائز نہیں۔ اس کے ملک کی اکثر ہندو عورتیں بازاروں اور گلیوں میں سر اور سینہ کھول کر چلنے کی عادی تھیں، سلطان اسے پسند نہ کرتا تھا، لہٰذا حکم

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاری کر دیا کہ کوئی عورت کرتے اور اوڑھنی کے بغیر باہر نہ نکلے۔

کتابوں سے اس کو بے حد تعلق خاطر تھا۔ عربی، فارسی، اردو اور ہندی کی کئی ہزار قلمی کتابیں اس کے ذاتی کتب خزانے میں محفوظ تھیں، جن میں سے بہت سی کتابیں اس کی شہادت کے بعد دوسرے سامان کے ساتھ لوٹ لی گئیں۔ ان میں س بے شمار کتابیں لندن کی انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہیں۔ یہ کتابیں تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم وفنون پر مشتمل ہیں۔

ٹیپو نے ملک میں زراعت اور صنعت کو بڑی ترقی دی، تجارت کو وسعت دینے کی غرض سے بیرونی ممالک سے روابط بڑھائے۔ اسلحہ سازی کے کارخانے قائم کیے اور رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے بے پناہ کوششیں کیں۔ وہ حکومت کو اللہ کی طرف سے امانت سمجھتا تھا اور اس امانت کا حق ادا کرنے کی جو صورت بھی ممکن ہوتی اس کو بروئے کار لاتا۔ بحری اور بری فوج کو نئے انداز سے منظم کیا اور ''فتح المجاہدین'' کے نام سے ایک کتاب لکھوائی، جس میں فوج کی تنظیم اور اس کی نقل وحرکت کے وہ قواعد بھی درج ہیں، جو اس زمانے میں مغربی ممالک میں رائج تھے۔ اور وہ قواعد بھی مرقوم ہیں جو خود سلطان نے اپنے تجربات کی روشنی میں وضع کیے۔ فن جہاز سازی سے بھی اس کو شغف تھا، اس سلسلے میں اس نے حالات کے مطابق بہت سی نئی چیزیں ایجاد کیں۔

بہرکیف ٹیپو سلطان اپنے دور کا عدیم المثال حکمران تھا، اپنی قلمرو میں اس نے جو اصلاحات نافذ کیں، وہ تاریخ میں زریں حروف سے لکھنے کے لائق ہیں۔ ارض ہند کے اس نامور جرنیل اور ممتاز حکمران کے کارنامے ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

ٹیپو سلطان نے ۲۷ ذیقعدہ ۱۲۱۳ھ (۴ مئی ۱۷۹۹ء) کو شہادت پائی۔ اس کی موت کا الم ناک حادثہ اس وقت پیش آیا جب بارھویں صدی ہجری اپنی بساط لپیٹ چکی تھی اور تیرھویں صدی ہجری نے اپنے سفر کے تیرہ سال پورے کر لیے تھے۔ عیسوی حساب سے اٹھارھویں صدی قریب الاختتام تھی۔ اس مرد مجاہد کا وقت آخر جہاں حسرت و افسوس کی ایک اندوہ ناک یادگار اپنے پیچھے چھوڑ گیا، وہاں اس کے عزم و حوصلہ اور جرأت و شجاعت کا ایک لافانی نقش بھی اوراق تاریخ پر ثبت کر گیا۔

یہ ایک انتہائی غم انگیز سانحہ ہے کہ جب شیر دل ٹیپو کو پتا چلا کہ وہ محل میں محصور ہو گیا ہے اور انگریزی فوج لحہ بہ لحہ اس کا محاصرہ تنگ کر رہی ہے تو آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کہا____ ''رضائے مولیٰ بر ہمہ اولیٰ''۔

۴ مئی ۱۷۹۹ء کا دن اس کی زندگی کا آخری دن تھا۔ شدید دھوپ میں دوپہر کے وقت وہ انگریزوں سے دست بدست جنگ کر رہا تھا، اس کے غدار ساتھیوں یہاں تک کہ اس خادم نے بھی جو ہاتھ میں پانی کی چھاگل لیے سامنے کھڑا تھا، ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ چند رفقائے خاص کے سوا سب اہل کار انگریز کے ہاتھ بک چکے تھے۔ دربار کے ذمے دار لوگوں نے انگریزی فوج کو قلعے میں داخل کیا اور جب بہادر سلطان اپنے چند محافظوں کے ساتھ دشمن کے سامنے سینہ سپر ہوا تو محافظ بھی پیچھے ہٹ گئے۔ عین اس وقت جب کہ وہ نہایت دلیری سے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دشمنوں پر تلوار کے فیصلہ کن وار کر رہا تھا، شدت پیاس سے بے قرار ہو کر خادم سے پانی طلب کیا، خادم خاموش کھڑا رہا۔ پھر اس نے خدا کا واسطہ دے کر پانی کا ایک قطرہ مانگا، سنگ دل خادم پر اس لجاجت کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ نہ اس کا ہاتھ حرکت میں آیا نہ چھاگل سے پانی کا گھونٹ باہر نکلا۔ بالآخر وہ شدید زخمی ہو کر پانی مانگتا ہوا گھوڑے سے گرا، اور جام شہادت نوش کر کے اپنی پیاس بجھائی، اور تاریخ جبر وستم کی پیشانی پر خون شہادت سے ہمیشہ کے لیے یہ فقرہ ثبت کر دیا۔

''شیر کی ایک دن کی زندگی گیڈر کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔''

لیکن ادھر جب انگریز جرنیل ہارس نے سلطان کی خون آلود لاش پر نگاہ ڈالی تو فرط مسرت سے پکار اٹھا۔ ''آج ہندوستان ہمارا ہے۔''

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اٹھارھویں صدی میں برصغیر کے جن مجاہدوں نے انگریزی اقتدار کا مقابلہ کیا اور اس کے نتیجے میں درجۂ شہادت کو پہنچے، ان میں تین شخصیتیں نمایاں ہیں:

ایک سراج الدولہ۔

دوسرے حافظ رحمت خاں روہیلہ۔

تیسرے ٹیپو سلطان۔

انھوں نے علی الترتیب ۲۹ جون ۱۷۵۷ء، ۲۳ اپریل ۱۷۷۴ء اور ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو جام شہادت نوش کیا۔

واقعات کی صحیح ترتیب سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی آخری جنگوں کو ''جنگ'' سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

سراج الدولہ لڑائی کے میدان میں نہیں آنا چاہتا تھا، لیکن اس کو دجل و فریب سے اس کے وزرا و امرا پلاسی کے میدان میں لائے اور اسے بعد میں گرفتار کر کے شہید کر دیا گیا۔

حافظ رحمت خاں کے ساتھ بھی دھوکا ہوا، جس کا نتیجہ اس کی موت کی شکل میں نکلا۔

ٹیپو سلطان سے بھی اس کے ساتھیوں نے غداری کی، انگریزی فوج کے لیے قلعے کے دروازے کھول دیے۔ ادھر وہ قلعے میں داخل ہوئی اور ادھر میر صادق نے اپنی فوج کو بلا کر تنخواہ دینا شروع کر دی۔ سلطان کو اس سے بے خبر رکھا گیا، اور وہ انگریزوں اور ان کے اتحادیوں کے اچانک حملے کے موقعے پر تنہا کھڑا تھا، لیکن یہ اس کی انتہا درجے کی بہادری تھی کہ اس نے دشمن کے سامنے جھکنا گوارا نہیں کیا اور شہادت سے ہم کنار ہو گیا۔

حرف آخر:

بارھویں صدی ہجری اور اٹھارھویں صدی عیسوی کے سیاسی واقعات وحوادث کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حکمرانوں کے خلاف امرائے سلطنت کی غداریوں اور عمال حکومت کی ریشہ دوانیوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا ہے۔ پھر ایک واقعے کے ساتھ دوسرا واقعہ اور دوسرے کے ساتھ تیسرا اس طرح پیوستہ ہے کہ کسی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بات کو خاص ترتیب سے بیان کرنا مشکل ہے۔ ہم نے اپنی حد تک کوشش کی ہے کہ تاریخ کے خس و خاشاک میں سے مطلب کی ضروری باتیں چھانٹ لیں اور انھیں قارئین کی خدمت میں پیش کر دیں۔ اس سعی میں ہم کہاں تک کامیاب ہیں، یہ فیصلہ کرنا قارئین کا کام ہے۔

یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ بارھویں صدی ہجری اور اٹھارھویں صدی عیسوی اگرچہ سیاسی اعتبار سے زوال وانحطاط کی صدی ہے اور اس میں حکمرانوں اور امرائے مملکت میں دین داری کا عنصر بھی کم ہی نظر آتا ہے لیکن اس میں علوم وفنون نے خوب ترقی کی، علما وفقہا کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا۔ حکمرانوں نے بھی علم کے فروغ میں پورا حصہ لیا اور اہل علم کی ہر موقعے پر پذیرائی کی۔ ان سے تعلقات بڑھائے اور انھیں عزت واکرام کے مستحق گردانا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر حکمران کے عہد میں اہل علم اور اصحاب فضل کی ایک جماعت موجود رہی ہے۔ ان کا تذکرہ اس کتاب میں کیا گیا ہے۔

اس کے بعد تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس صدی کے لیل و نہار مزید غم ناک واقعات کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہیں۔ اس میں صرف دو مغل حکمران ہندوستان کے افق سیاست پر باقی رہ گئے ہیں۔ ایک ابوالنصر معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی، جس کا دور بادشاہت ۱۸۰۶ء سے ۱۸۳۷ء تک اکتیس سال پر محیط ہے۔ دوسرا ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر جو ۱۸۳۷ء سے ۱۸۵۷ء تک بیس سال مسند بادشاہت پر متمکن رہا۔ یہ صرف نام کے بادشاہ تھے، حکم کمپنی بہادر کا چلتا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا اور پورے برصغیر پر انگریزوں کا پرچم اقتدار لہرانے لگا۔ اس کے نتیجے میں ہندوستان میں شدید ردعمل ہوا، اور انگریز کی مخالفت میں کئی تحریکوں نے جنم لیا۔ اس ضمن کے ضروری واقعات فقہائے ہند کی اگلی جلدوں میں بیان کیے جائیں گے۔

ان شاء اللہ العزیز۔ ربنا اتنا من لدنک رحمة وهيء لنا من امرنا رشدا۔

بندۂ عاجز

محمد اسحاق بھٹی

اسلامیہ کالونی، ساندہ، لاہور

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بارھویں صدی ہجری

م

۱۔ شیخ مجیب اللہ جعفری پھلواروی

شیخ مجیب اللہ بن ظہور اللہ بن کبیر الدین جعفری پھلواروی، اپنے عصر اور علاقے کے نامور فقیہ، جید عالم دین اور فضل و صلاح میں یگانہ تھے۔ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے، اس لیے جعفری کی نسبت سے مشہور تھے۔

شیخ مجیب اللہ پھلواروی ۱۱ ربیع الثانی ۱۰۸۹ھ/۲۳ مئی ۱۶۷۸ء کو پھلواری میں پیدا ہوئے، جو صوبہ بہار کے ضلع پٹنہ میں واقع ہے اور عرصۂ دراز سے علم و فضل کے مرکز کی حیثیت سے مشہور ہے۔ ہوش سنبھالا تو وہیں کے ایک بزرگ مولانا فصیح الدین پھلواروی کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے اور ان سے کتب درسیہ کی تکمیل کی۔ ایک روایت کے مطابق اپنے ماموں زاد بھائی مولانا عماد الدین جعفری پھلواروی (متوفی ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۱۲۴ھ/۱۴ جون ۱۷۱۲ء) کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ بعد ازاں عازم بنارس ہوئے۔ وہاں شیخ محمد وارث حسینی بنارسی (متوفی ۱۰ ربیع الثانی ۱۱۶۷ھ/۴ فروری ۱۷۴۵ء) کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شرکت کی اور باقی علوم مروجہ کی تحصیل فرمائی۔ پھر اپنے شہر پھلواری کو مراجعت کی، اور ۱۱۲۲ھ میں مولانا عماد الدین جعفری پھلواروی سے اخذ فیض کیا۔ کسب علم اور اخذ طریقت کے بعد اپنے شہر پھلواری میں مسند دعوت و ارشاد آراستہ کی اور خلق کثیر کو مستفید فرمایا۔

شیخ مجیب اللہ جعفری پھلواروی نے ۱۱۹۱ھ/۱۷۷۷ء میں وفات پائی ❶۔

۲۔ قاضی محبّ اللہ بہاری

قاضی محب اللہ بن عبدالشکور عثمانی صدیقی بہاری، دیار ہند کے نامور فقہا اور ممتاز علما میں سے تھے۔

❶ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۴۹، ۲۵۰۔ بحوالہ شجرۃ الشیخ بدر الدین۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

موضع کڑ میں پیدا ہوئے جو اعمال محبّ علی پور مضافات بہار شریف (ہندوستان) میں واقع تھا۔ ان کا خاندان ''ملک'' کہلاتا تھا اور اس علاقے میں شرافت اور علم و قابلیت میں مشہور تھا۔ قاضی محبّ اللہ اوائل شباب ہی میں تحصیل علم کے لیے پورب وغیرہ کے علاقوں میں چلے گئے تھے۔ متعدد مقامات میں گھومے پھرے اور کئی علما سے ابتدائی اور اوسط درجے کی کتابیں پڑھیں۔ بالآخر شیخ قطب الدین شہید انصاری سہالوی (سال شہادت ۱۱۰۳/۱۶۹۲ء) کی خدمت میں گئے اور ان سے کچھ درسی کتابوں کی تکمیل کی۔ بعض کتب درسیہ علامہ قطب الدین حسینی شمس آبادی (متوفی ۱۱۲۱ھ/ ۱۷۰۹ء) سے پڑھیں۔ یہاں تک کہ اللہ نے ان کو علم کا بحر ذخائر بنا دیا اور آسمان علوم وفنون کے ستاروں میں انھیں بدر کامل کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی کے بقول وہ ''بحرے است از علوم و بدرے است بین النجوم''۔

تحصیل علم کے بعد حکومت کے ایوانوں سے وابستہ ہونے کا عزم کیا اور شاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر کے دربار میں پہنچے جو ان دنوں بلاد دکن میں مقیم تھا۔ علما کے اس قدر دان بادشاہ نے ان کی قابلیت سے متاثر ہو کر لکھنؤ کے منصب قضا پر متمکن کیا۔ کئی سال اس عہدے پر فائز رہے۔ بعد ازاں معزول ہو گئے۔ دوسری مرتبہ پھر دکن کا عزم کیا اور بادشاہ سے ملاقات کی۔ اب اس نے ان کو حیدر آباد (دکن) کا قاضی مقرر کر دیا۔ کچھ عرصے بعد کسی وجہ سے بادشاہ ان سے ناراض ہو گیا اور انھیں منصب قضا سے علیحدہ کر دیا گیا۔

چند دنوں بعد لوگوں نے بادشاہ کے حضور ان کی سفارش کی اور قصور معاف کر دیا گیا۔ اب بادشاہ نے ان کو اپنے پوتے رفیع القدر کی تعلیم پر مامور کیا، جو محمد معظم (شاہ عالم) کا بیٹا تھا۔ پھر جب زندگی کے آخری دور میں اورنگ زیب عالم گیر نے کابل کی ولائت محمد معظم کے پسرد کی اور وہ اپنے بیٹے رفیع القدر کو ساتھ لے کر دکن سے کابل روانہ ہوا تو قاضی محبّ اللہ بہاری کو بھی ساتھ لے گیا۔ عالم گیر کی وفات کے بعد ۱۱۱۸ھ میں محمد معظم نے شاہ عالم کا لقب اختیار کر کے ہندوستان کی زمام حکومت ہاتھ میں لی تو اس نے قاضی محبّ اللہ بہاری کو ممالک ہند کی صدارت عظمیٰ کے منصب جلیلہ پر فائز کیا اور فاضل خاں کا لقب عطا فرمایا۔ یہ واقعہ ۱۱۱۹ھ کا ہے۔

قاضی محبّ اللہ بہاری علمی رفعت کے مالک اور جلالت قدر کے حامل تھے۔ ذہانت و فطانت میں یگانہ اور تحقیق و تدقیق میں منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ ہر گوشۂ علم پر ان کی نظر تھی۔ تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ، اور دیگر تمام علوم پر انھیں عبور حاصل تھا۔ فارسی اور عربی کے بہترین ادیب تھے۔ مولوی رحمان علی ''تذکرہ علمائے ہند'' میں ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

بحرے بود از بحار علوم و بدرے بود بین النجوم۔

(یعنی اگر علوم کے دریا جاری ہوں تو قاضی محبّ اللہ کی حیثیت علم کے تیز رو دریا اور ستاروں کے درمیان بدر کامل کی تھی۔)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہندوستان کی سرزمین کو جن اجلۂ علما کے قدم چومنے کا شرف حاصل ہوا ان میں قاضی محبّ اللہ بہاری کے نام نامی کو بڑی اہمیت حاصل ہے، وہ اونچے درجے کے مدرس، بلند مرتبہ شارح اور لائق مصنف تھے۔ ان کو اللہ نے بے حد شہرت عطا کی اور اپنے معاصرین میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے گئے۔ ان کو یہ سعادت بھی نصیب ہوئی کہ اسی دور میں ان کی کتابوں کو درس نظامیہ میں شامل کر لیا گیا اور ان کے حواشی و شروح معرض تحریر میں لائے گئے۔ ان کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ سلم العلوم: یہ کتاب علم منطق میں ہے اور اس فن کے نہایت دقیق اور مشکل مباحث کو محتوی ہے۔ درس نظامیہ میں شامل ہے اور علمائے منطق نے اس کو شروع ہی میں لائق اعتنا ٹھہرا لیا تھا۔ اس پر انھوں نے حواشی لکھے اور اس کی شرحیں سپرد قلم کیں۔

ہندوستان سے باہر کے ماہرین منطق کی دو ایسی کتابیں ہیں جنھیں طبقۂ علما میں عالم گیر شہرت حاصل ہوئی۔ پہلی کتاب نجم الدین عمر بن علی قزوینی کی ''الشمسیہ'' ہے اور دوسری علامہ سعد الدین تفتازانی کی ''تہذیب المنطق''۔ ان کتابوں کو اصحاب منطق میں بڑی پذیرائی حاصل ہوئی اور اس حلقے میں اس قدر متداول ہوئیں کہ انھیں داخل نصاب کیا گیا اور شروح و حواشی کے لیے شائستۂ التفات گردانا گیا۔ مدارس عربیہ میں ان کتابوں کے بعد قاضی محبّ اللہ بہاری کی ''سلم العلوم'' کی باری آتی ہے اور یہ کتاب طلبا کو باقاعدہ پڑھائی جاتی ہے۔ کتاب اگرچہ مختصر ہے مگر مشمولات منطق کے اعتبار سے اپنے اندر بڑی جامعیت رکھتی ہے۔ مصنف شہیر نے متعلقہ فن کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں رہنے دیا۔ تمام منطقی اشکالات اور اس فن دقیق کے نزاعی مباحث کا احاطہ کر لیا ہے۔ مصنف نے اس کے مقدمے میں اس تمنا کا اظہار کیا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ ''سلم العلوم، کتب درسیہ میں اس طرح چمکے جس طرح ستاروں میں چاند چمکتا ہے۔''

ان کی زندگی ہی میں ان کی یہ تمنا پوری ہو گئی تھی اور اہل علم نے اس کی شرحیں لکھنے کی طرف عنان توجہ مبذول کر لی تھی۔

سلم العلوم کی پہلی شرح کس نے لکھی، اس سلسلے میں مولانا فضل امام خیرآبادی (متوفی ۵ ذیقعدہ ۱۲۴۴ھ/ ۹ مئی ۱۸۲۸ء) جو دیار ہند کے نامور عالم ہیں، قاضی محمد مبارک گوپاموی (متوفی ۵ شوال ۱۱۶۲ھ/ ۲۷ ستمبر ۱۷۴۹ء) کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اول کسے کہ حاشیہ بر میر زاہد نوشت و سلم را شرح کرد، او بود۔

(یعنی قاضی محمد مبارک گوپاموی پہلے شخص ہیں، جنھوں نے میر زاہد پر حاشیہ لکھا اور سلم کی شرح سپرد قلم کی۔)

لیکن واقعات کی ترتیب اور دیگر حالات سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا فضل امام خیرآبادی کی یہ بات صحیح

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں، اس لیے کہ قاضی محمد مبارک گوپاموی نے اپنی شرح کے خاتمے پر لکھا ہے:

قد تم الشرح بفضل من الله تعالیٰ و تبارك من عبده محمد مبارك فی سنة الف ومائة واربعین وثلث من الهجره النبویة فی سابع شهر ربیع الاول یوم الخمیس فی بلدة شاه جهان اٰباد۔

(یعنی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس کے بندے محمد مبارک کے ہاتھوں یہ شرح ۷ ربیع الاول ۱۱۴۳ھ کو بروز جمعرات شہر شاہ جہان آباد (دہلی) میں مکمل ہوئی۔)

سلم العلوم کی ایک شرح بارھویں صدی ہجری کے دیار ہند کے ممتاز فاضل شیخ احمد عبدالحق فرنگی محلی لکھنوی (متوفی ۹ ذی الحجہ ۱۱۸۷ھ/ ۲۱ فروری ۱۷۷۴ء) نے تحریر فرمائی۔ وہ اپنی شرح (تصدیقات) کے خاتمے پر رقم طراز ہیں:

صنفه خادم الطلبة احمد عبدالحق بن فاضل الکامل محمد سعید بن ملا قطب الدین شهید قطب العلماء والعرفان الانصاری السهالی سنة الف ومائة وثلاثین من الهجره النبویة۔

(طلبا کے خادم احمد عبدالحق بن شیخ محمد سعید بن ملا قطب الدین شہید انصاری سہالوی نے یہ شرح ۱۱۳۰ھ میں تصنیف کی۔)

شیخ احمد عبدالحق فرنگی محلی کے الفاظ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قاضی محمد مبارک گوپاموی کی شرح کو اولیت حاصل نہیں ہے اور مولانا فضل امام خیرآبادی کا یہ کہنا تاریخی لحاظ سے درست نہیں کہ سلم العلوم کی شرح سب سے پہلے قاضی محمد مبارک گوپاموی نے لکھی، اس لیے کہ قاضی محمد مبارک نے اپنی شرح ۷ ربیع الاول ۱۱۴۳ھ کو مکمل کی اور شیخ احمد عبدالحق فرنگی محلی اس سے تیرہ سال پیشتر ۱۱۳۰ھ میں اس اہم کام سے فارغ ہو چکے تھے۔

لیکن اس کے باوجود یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ شیخ احمد عبدالحق کی شرح اولین شرح ہے، اس لیے کہ خود شیخ احمد عبدالحق کے الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی سلم العلوم کی کچھ شرحیں لکھی گئی تھیں۔ چنانچہ اپنی شرح کے خاتمے پر احمد عبدالحق رقم طراز ہیں:

وکنت بالغا فی الایضاح لم نجد مثله شرحا موضحا فائقا للابکار نافعا للطلاب۔

(میں نے مطالب کتاب کی وضاحت میں پوری کوشش کی ہے، ایسی واضح، عمدہ افکار میں ممتاز اور طلبائے علم کے لیے مفید کوئی دوسری شرح ہم نے نہیں پائی۔)

شیخ احمد عبدالحق کے ان الفاظ سے مترشح ہوتا ہے کہ اس سے قبل بھی سلم العلوم کی کچھ شرحیں قلم بند ہو

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چکی تھیں، لیکن ان میں الجھاؤ تھا اور وہ طلبا کے لیے زیادہ واضح اور سودمند نہ تھیں۔

بہرحال شیخ محب اللہ بہاری کی اس کتاب نے بڑی مقبولیت حاصل کی اور متعدد حضرات نے اس کی شرحیں لکھیں جن میں شرح احمد عبدالحق، شرح قاضی مبارک، شرح حمد اللہ سندیلوی، شرح ملا مبین اور شرح ملا مسافر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

۲۔ مسلم الثبوت: قاضی محب اللہ بہاری کی یہ کتاب اصول فقہ سے تعلق رکھتی ہے اور مدارس عربیہ کے نصاب میں داخل ہے۔ اس کتاب کا نام تاریخی ہے جس سے سال تالیف ۱۱۰۹ھ نکلتا ہے۔ یعنی یہ کتاب انھوں نے ۱۱۰۹ھ/ ۱۶۹۸ء میں تصنیف کی۔

مسلم الثبوت اپنے موضوع میں نہایت اہم کتاب ہے اور اصول فقہ کی اونچے مرتبے کی کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ علما و طلبا کے حلقے میں بہت مقبول و متداول ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے اصول فقہ کے بنیادی اور اصولی مباحث کو ہدف فکر و نظر ٹھہرایا ہے۔ برصغیر کے علاوہ یہ کتاب مصر کے علما و طلبا میں بھی مقبول ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ''مسلم الثبوت'' شافعی اور حنفی اصول فقہ سے متعلق ہے۔ یہ کتاب افغانستان کے مشہور عالم ملا حبیب اللہ قندھاری (تیرھویں صدی ہجری) کے ملاحظہ میں آئی تو انھوں نے ''مغتنم الحصول فی علم الاصول'' کے نام سے اس موضوع پر کتاب تصنیف کی، جس کا نقطہ نظر بعض امور میں ''مسلم الثبوت'' سے کافی حد تک مختلف ہے۔ کتاب اپنے مباحث و مندرجات کے اعتبار سے بڑی علمی ہے۔ یہ قلمی کتاب ہے، ہمارے علم کے مطابق پاکستان میں اس کے صرف دو ہی نسخے ہیں، ایک پشاور یونیورسٹی لائبریری میں اور ایک حضرت مولانا حافظ عبدالمنان وزیر آبادی رحمہ اللہ کے کتب خانے (وزیر آباد) میں۔ حضرت حافظ صاحب کے کتب خانے کا نسخہ ہمیں حضرت مولانا محمد عطا اللہ حنیف کی وساطت سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ نسخہ بڑے سائز کے ۲۴۷ اوراق پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ ۲۴ سطور کو محیط ہے۔ خط بہت اچھا ہے۔ ''مغتنم الحصول فی علم الاصول'' کے فاضل مصنف نے ''مسلم الثبوت'' کے بعض مقامات کا محاکمہ بھی کیا ہے۔ انداز فاضلانہ اور محققانہ ہے۔ یاد رہے یہ وہی ملا حبیب اللہ قندھاری ہیں، جو مولانا عبداللہ غزنوی (متوفی ربیع الاول ۱۲۹۸ھ/فروری ۱۸۸۱ء) کے استاذ اور مرشد تھے۔

۳۔ الجواہر الفرد: یہ بھی منطق کی کتاب ہے اور جزو لایتجزیٰ کے بارے میں ہے۔

یہ تینوں کتابیں مدارس عربیہ اور طبقۂ علما میں مروج و متداول ہیں۔

۴۔ مغالطۃ عامۃ الورود: یہ ایک رسالہ ہے جس میں یہ بحث کی گئی ہے کہ مذہب حنفیہ رائے اور قیاس کے سلسلے میں مذہب شافعیہ سے زیادہ بعید ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قاضی محبّ اللہ بہاری نے ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی اور شہر بہار (ہندوستان) کے محلہ چاند پور میں مدفون ہوئے ❶۔

وفات کی تاریخ ان الفاظ سے متخرج ہے:

قاضی مولوی محبّ اللہ　　　　رفتہ سوئے ارم حبیب اللہ

۱۱۱۹ھ　　　　۱۱۱۹ھ

''بزم تیموریہ'' میں سال وفات ۱۱۹۰ھ/ ۱۷۷۶ء لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہے۔

۳۔ سید محمد قنّوجی

سید محمد قنوجی کا سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد بن محمد بن محمد بن کدائی بن سید ملک بن عمادالدین بن حسین بن علاالدین علی بن محمد بن ضیاء الدین حسینی دہلوی ثم قنوجی۔!

سید محمد قنوجی سرزمین ہند کے مشاہیر فقہا اور کبار علما میں سے تھے۔ قنوج میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو حصول علم کے لیے رخت سفر باندھا اور قاضی عبدالقادر عمری لکھنوی (متوفی ۲۷ شعبان ۱۰۷۶ھ) کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور ان سے کتب درسیہ پڑھیں۔ پھر الٰہ آباد کا قصد کیا، وہاں شیخ محبّ اللہ الٰہ آبادی (متوفی ۹ رجب ۱۰۵۸ھ/ ۲۰ جولائی ۱۶۴۸ء) کا سلسلۂ تدریس جاری تھا، اس میں شرکت کی اور نعمت علم سے فیض یاب ہوئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے وطن قنوج تشریف لائے اور تمام دنیوی معاملات سے منقطع ہو کر گھر میں گوشہ گیر ہو کر بیٹھ گئے اور اپنے آپ کو عبادت الٰہی اور افادۂ طلبا کے لیے وقف کر دیا۔

اس زمانے میں مغل حکمران شاہ جہان تخت ہند پر متمکن تھا۔ وہ علم اور علما سے بے حد تعلق خاطر رکھتا تھا۔ سید محمد قنوجی کے فضل و کمال اور فراوانیٔ علم کا شہرہ اس تک پہنچا تو اس نے اپنے سال جلوس کے بتیسویں سال انھیں دربار میں طلب کیا اور پھر ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے اس درجے متاثر ہوا کہ عمر بھر اپنے سے جدا نہ ہونے دیا۔ حتیٰ کہ قلعہ آگرہ کے ایام اسیری اور زمانۂ نظر بندی میں بھی ساتھ رکھا۔ محمد صالح کمبوکی

---

❶ مآثر الکرام ص ۲۰۰، ۲۰۱۔ ابجد العلوم ص ۹۰۵۔ سبحۃ المرجان ص ۷۶، ۷۷۔ نزہتہ الخواطر، ج ۶، ص ۲۵۰ تا ۲۵۲۔ قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب ص ۲۰۲، ۲۰۳۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۳۱، ۴۳۲۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۷۵، ۱۷۶۔ ترجمۃ الفضلاء ص ۸۱۔ تذکرہ مصنفین درس نظامی ص ۲۱۰ تا ۲۱۴۔ بزم تیموریہ، ص ۲۵۲۔ مقدمہ سلم العلوم۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی ج ۱ ص ۴۰۵، ۴۰۶۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روایت کے مطابق شاہ جہان ان سے قرآن و حدیث اور دیگر کتب اسلامی سنتا تھا اور تمام حاضرین مجلس اس جلیل القدر عالم سے استفادہ کرتے تھے❶۔

شاہ جہان کی وفات کے وقت بھی سید موصوف اس کے پاس موجود تھے۔ جن حضرات نے اس کی تجہیز و تکفین کے فرائض انجام دیے اور میت کو قلعے کے برج مثمن کے دروازے سے حصار سے باہر لائے، ان میں ایک سید محمد قنوجی بھی تھے۔ پھر نماز جنازہ اور تدفین میں بھی شامل تھے۔

شاہ جہان کی وفات کے بعد ان کو اورنگ زیب عالم گیر نے اپنے ساتھ وابستہ کر لیا اور اپنے خاص مصاحبوں اور ندیموں میں شامل کیا اور فتاویٰ عالم گیری کی تدوین و ترتیب میں بھی ان کو شریک فرمایا۔ عالم گیر ان کی بے حد تکریم کرتا اور عجز و نیاز مندی سے پیش آتا۔ وہ انھیں ''استاذ'' کہہ کر پکارتا اور کہا کرتا تھا کہ یہ میرے بھی استاذ ہیں اور میرے والد کے بھی۔!

اورنگ زیب عالم گیر، سید محمد قنوجی سے امام غزالی کی تصنیفات بالخصوص احیاء علوم الدین اور کیمیائے سعادت کا درس لیتا۔ ہفتے میں تین روز وہ مجلس شاہی کے مذاکرۂ علوم میں سرگرم رہتے۔ اس اثنا میں بادشاہ ان سے دیگر کتابوں کے علاوہ حدیث، فقہ اور سلوک و تصوف کے موضوع سے متعلق مختلف کتابیں پڑھتا اور ان کے مندرجات کو سمجھنے کی کوشش کرتا۔ علاوہ ازیں فتاویٰ عالم گیری کے بارے میں مذاکرہ کرتا اور بحث میں باقاعدہ حصہ لیتا۔

سید محمد قنوجی جہاں علم و فضل میں یکتا تھے، وہاں فقر و بے نیازی میں بھی منفرد تھے۔ ان کا ہندوستان کے ان دو عظیم بادشاہوں سے انتہائی قریبی تعلق رہا۔ بادشاہ اگرچہ ان سے بدرجۂ غایت عقیدت رکھتے تھے لیکن سید ممدوح ان سے کبھی کسی منصب و امارت کے خواہاں نہیں ہوئے۔ امارت پر ہمیشہ درویشی کو ترجیح دی، اور دربار شاہی سے تعلق کے باوجود زندگی کے آخری دم تک علما کی خاص نوع کی وضع قطع اور مخصوص ہیئت کو اپنائے رکھا۔ وہ کسی لمحے بھی اس دائرۂ خاص سے باہر قدم نہیں رکھتے تھے۔ حالانکہ ان کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ اپنے شہر قنوج میں معقول مالی حیثیت کے حامل اور کئی گاؤں کے مالک تھے۔

سید محمد قنوجی کا ذکر حضرت سید نواب صدیق حسن خاں نے بھی ابجد العلوم میں کیا ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے علاقے اور شہر کے صاحب ثروت عالم دین تھے اور رفاہ عامہ کے کاموں میں خصوصیت سے روپیہ خرچ کرتے تھے۔ نواب صاحب کے عربی الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

''سید محمد قنوجی، سادات سے تعلق رکھتے تھے اور اورنگ زیب عالم گیر کے استاذ تھے۔ ان کی بہترین یادگاروں میں سے ایک عمارت مسافر خانے کی ہے، جس کی اس نواح میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ ان کا ایک باغ ہے، جس میں ایک بہت بڑا قبرستان ہے۔ اسی قبرستان میں خود ان کی اپنی قبر بھی ہے۔ علوم ریاضی اور علوم عربیہ میں انھیں بڑی دسترس حاصل تھی۔ انھوں نے معانی و بیان کی مشہور کتاب مطول پر حاشیہ تحریر کیا۔ وہ عظیم المرتبت،

❶ عمل صالح ج ۳ ص ۲۶۶۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حامل عزوجاہ، صاحب ثروت اور مال دار عالم تھے۔ علم وحکمت اور شوکت وشہامت کی دولت ان کی ذات میں سمٹ آئی تھی۔ اس شہر (قنوج) میں ان کے ورثا بھی رہتے ہیں لیکن وہ سب نااہل لوگ ہیں ❶۔

بہر حال سید محمد قنوجی اپنے دور کے جلیل القدر عالم وفقیہ اور فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین کی جماعت کے رکن تھے۔ جس طرح شاہ جہان ان کی وسعت معلومات سے متاثر ہو کر ان سے استفادہ کرتا تھا، اسی طرح اورنگ زیب عالم گیر بھی انھیں انتہائی اعزاز واحترام کا مستحق گردانتا اور ان سے مستفیض ہوتا تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ عالم گیر کے گیارھویں سال جلوس (۱۰۷۸ھ/۱۶۶۷ء) میں ۱۰ شعبان کو اس کے بیٹے شہزادہ محمد اعظم کی تقریب نکاح منعقد ہوئی تو سید محمد قنوجی کو وکیل نکاح بنایا گیا۔ اس کے بعد عالم گیر کے سولھویں سال جلوس (۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء) میں اس کے بیٹے شہزادہ محمد سلطان کا نکاح مراد بخش کی بیٹی دوست دار بانو بیگم سے ہوا تو سید محمد قنوجی کو بادشاہ کی طرف سے گواہ مقرر کیا گیا۔

اورنگ زیب نے مختلف مواقع پر انھیں انعام واکرام اور خلعت سے بھی سرفراز کیا۔

بلاشبہ سید محمد قنوجی اپنے عصر کی عظیم شخصیت تھے، گوناگوں اوصاف سے متصف اور علم وتحقیق میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ علما وفقہا، ارباب حکومت اور امرائے سلطنت میں بڑے مرتبہ وعزت کے حامل تھے۔ بادشاہ ان کی فضیلت علمی، تدین وپارسائی اور دقت نظر سے بہت متاثر تھا، اسی وجہ سے وہ ان پر پورا اعتماد کرتا اور اہم مواقع پر انھیں اپنے ساتھ رکھتا اور ان سے مشورے لیتا تھا۔

انھوں نے ۱۱۰۱ھ/۱۶۹۰ء میں وفات پائی ❷۔

اولاد:

سید محمد قنوجی کے تین بیٹے تھے۔ ایک کا نام سید احمد تھا، ایک کا سید شریف اور ایک کا میر عبدالکریم! تینوں بڑے منتظم اور قابل تھے اور عالم گیر کے حلقہ ملازمین سے منسلک۔! ان کے تفصیلی حالات تو معلوم نہیں ہو سکے، البتہ جو کچھ معلوم ہوسکا ہے وہ یہ ہے کہ سید احمد کو قاضی محمد حسین محتسب (جو فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین میں سے تھے) کے انتقال کے بعد اورنگ زیب کی طرف سے محتسب کا عہدہ تفویض کیا گیا تھا ❸۔

سید شریف کے متعلق مآثر عالم گیری میں جلوس عالم گیری کے تیسویں سال (۱۰۹۷ھ/۱۶۸۶ء) کے

❶ ابجد العلوم ص ۹۳۴۔

❷ ان کے حالات کے لیے یہ کتابیں بھی دیکھیے۔ مآثر الامراء، ج ۳ ص ۵۰۴-- عالم گیر نامہ صفحات ۳۴۷، ۳۹۷، ۴۲۷، ۴۰۸، ۹۳۲ تا ۹۳۵، ۱۰۶۰۔ مآثر عالم گیری صفحات ۷۲، ۹۴، ۱۳۸۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۸۳، ۲۱۵، ۲۱۶۔ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۵۳، ۲۵۴۔ بزم تیموریہ ص ۲۲۴۔ برصغیر میں علم فقہ ص ۲۸۹ تا ۲۹۵۔

❸ مآثر عالم گیری (اردو ترجمہ) ص ۱۱۲۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حالات کے ضمن میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی انتظامی صلاحیتوں کے مالک اور لائق شخص تھے۔

اس سال کثرت باراں کی وجہ سے شدید قحط پڑا تھا، اس موقعے پر انھوں نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ مآثر عالم گیری کا مصنف محمد ساقی مستعد خاں جن فارسی الفاظ میں ان کی خدمات کا ذکر کرتا ہے، ان کا ترجمہ درج ذیل ہے:

''اس زمانے میں شدید بارش کی وجہ سے زمین پر دریا بہنے لگے اور قحط پڑ گیا۔ شہر کے اردگرد غلے کی رسد بند ہوگئی اور رعایا میں ماتم بپا ہوگیا۔ لاکھوں بندگان خدا کی جانیں تلف ہوگئیں۔ مکان، دریا اور جنگل مردہ جسموں سے پٹ گئے۔ لشکر گاہ کی یہ حالت تھی کہ شب کو دولت خانۂ شاہی کے گرد مردہ جسموں کے انبار لگ جاتے، جن کو جاروب کش یا خاکروب روزانہ گھسیٹ گھسیٹ کر دریا میں ڈالتے تھے۔ صبح سے شام تک لاشوں کے اٹھانے کا سلسلہ جاری رہتا۔

''صورت حال یہاں تک ابتر اور تکلیف دہ ہوگئی تھی کہ لوگوں کو بھوک کی شدت سے مردار کھانے سے کوئی پرہیز نہ رہا تھا۔ مردوں کی لاشوں سے شہر کے تمام گلی کوچے پٹ گئے تھے۔ بارش کے مسلسل اور طویل سلسلے نے انسانوں اور حیوانوں کے گوشت پوست کو گلا دیا تھا، خطرہ یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ مردار کی سخت بدبو آب و ہوا میں تعفن پیدا کر کے ان لوگوں کو بھی موت کے منہ میں دھکیل دے گی جو زندہ بچ گئے تھے۔

''چند ماہ بعد بارش کا زور گھٹا اور دریا کی طغیانی کم ہوئی تو اطراف و جوانب سے شہر میں غلہ پہنچنے لگا۔ سردار خاں کی بجائے سید شریف خاں کرورہ گنج کی خدمت پر مامور ہوئے، یہ وہی سید شریف خاں ہیں جو حضرت فردوس آشیانی اور اورنگ زیب عالم گیر کے استاذ اعلیٰ قدوۃ المشائخ پیر سید محمد قنوجی کے فرزند گرامی تھے، اور سید محمد قنوجی فضل و کمال میں مشہور اور عقل و شعور میں معروف تھے۔ اس موقعے پر رعایا پرور بادشاہ کے حسن نیت سے گرانی رفع ہوئی اور ملک میں غلہ ارزاں ہوگیا[1]۔''

اورنگ زیب نے سید شریف کو ان کی قابلیت اور گوناگوں صلاحیتوں کی بنا پر امجد خاں کا لقب عطا کیا تھا۔ نزہۃ الخواطر میں ان کے حالات جن الفاظ میں مرقوم ہیں، ان کا ترجمہ یہ ہے:

''سید شریف محمد امجد بن محمد بن محمد حسینی قنوجی، نواب امجد خاں۔ سید محمد قنوجی کے بیٹے تھے۔ ان کا شمار اس عصر کے نامور علما کی جماعت میں ہوتا تھا۔ علوم و فنون اور طریقت میں اپنے باپ سید محمد قنوجی سے فیض حاصل کیا تھا اور عرصے تک ان کے ساتھ منسلک رہے تھے۔ حصول علم کے بعد اورنگ زیب عالم گیر کے مقربین میں شامل ہو گئے۔ اس نے قاضی محمد حسین جون پوری کی وفات کے بعد ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۶ء میں ان کو محکمہ احتساب پر فائز کر دیا اور امجد خاں کے لقب سے سرفراز کیا۔ طویل مدت تک، اس عہدے پر متمکن رہے۔ پھر

[1] مآثر عالم گیری ص ۲۹۲، ۲۹۳۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صدارت ہند کے منصب علیا پر فائز کیے گئے ❶"

سید محمد قنوجی کے تیسرے بیٹے سید میر عبدالکریم قنوجی تھے جو فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے نامور علما میں سے تھے۔ عالم گیر کی طرف سے برہان پور میں جزیہ وصول کرنے کے منصب پر مامور تھے۔ اس ضمن میں ان کی سرگرمیاں عالم گیر کے نزدیک اس درجے قابل قدر تھیں کہ ان سے متاثر ہو کر اس نے دکن کے چار علاقوں سے وصولی جزیہ کا عہدہ بھی ان کے سپرد کر دیا تھا۔ علم و فضل کی فراوانی کے ساتھ جود و سخاوت، عفت و تقویٰ اور حسن اخلاق کی نعمت سے بھی مالا مال تھے۔ ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ درسیاست میں کامل مہارت رکھتے تھے اور ان کے ہاں یہ سلسلہ ہر حالت میں جاری رہتا تھا۔ عالم گیر کی طرف سے امانت ہفت چوکی کے منصب کے ساتھ ساتھ جائے نماز خانہ کے داروغہ کی خدمت بھی ان کے سپرد تھی۔

تلامذہ:

سید محمد قنوجی کے تلامذہ اور فیض یافتگان کا حلقہ بھی خاصا وسیع تھا جس میں ہندوستان کے دو بہت بڑے مغل بادشاہ بھی شامل تھے۔ ایک شہاب الدین محمد شاہ جہان، اور دوسرے اورنگ زیب عالم گیر! ان کے علاوہ اور بھی متعدد حضرات نے ان سے مستفید ہونے کا شرف حاصل کیا۔ ان میں سے ایک شیخ علی اصغر قنوجی تھے، جو اپنے عہد کے مشہور عالم و فقیہ تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک منتہی ہوتا ہے۔ نہایت نیک، متقی اور پرہیز گار بزرگ تھے۔ قنوج میں ان کا ہنگامۂ درس جاری تھا۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف و سلوک وغیرہ میں ممتاز درجے پر فائز اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔

ان کے آبا و اجداد اصلاً مدینہ منورہ کے رہنے والے تھے۔ خاندان کے بعض حضرات نے مدینہ منورہ کی سکونت ترک کر کے کرمان میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ پھر وہاں سے خاندان کے ایک بزرگ نے جن کا نام شیخ مبارک بن عماد الدین تھا، ہندوستان کا رخ کیا اور قنوج میں متوطن ہو گئے۔ وہیں ۱۰۵۱ھ/۱۶۴۱ء میں شیخ علی اصغر کی ولادت ہوئی اور پھر یہ شہر مستقل طور سے ان کا مسکن قرار پا گیا۔

شیخ علی اصغر نے پورے ساٹھ سال قنوج میں مسند تدریس بچھائے رکھی، اور اس اثنا میں بے شمار حضرات نے ان سے استفادہ کیا۔ دیار ہند کے اس جید عالم و فقیہ نے ۸۹ سال عمر پا کر ۱۵ شعبان ۱۱۴۰ھ/۱۶/مارچ ۱۷۲۸ء کو وفات پائی۔

۴۔ شیخ محمد گجراتی

شیخ محمد بن جعفر بن جلال بن محمد حسینی بخاری گجراتی، حضرت شیخ جلال الدین بخاری اچی کی اولاد سے

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۲۸۳، ۲۸۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھے۔ ۲ ربیع الاول ۱۰۴۷ھ/ ۱۵ جولائی ۱۶۳۷ء کو پیدا ہوئے اور احمد آباد میں اپنے والد گرامی شیخ جعفر گجراتی اور دیگر علمائے عصر سے اخذ علم کیا، یہاں تک کہ اپنے زمانے اور علاقے کے جلیل القدر اور بلند مرتبہ فقیہ ہوئے۔
ان کا اصل مشغلہ درس و تدریس تھا، جس سے بہت سے علمائے کرام اور طلبا علم نے استفادہ کیا۔ تصنیف و تالیف میں بھی دلچسپی رکھتے تھے اور قرآن و حدیث پر اچھی نظر تھی۔ چنانچہ قرآن مجید کی ایک تفسیر تو فارسی میں لکھی، جس میں روایت اہل بیت کا التزام کیا۔ دوسری تفسیر عربی میں تفسیر جلالین کے انداز پر تحریر کی۔

کتب احادیث میں مشکوٰۃ کو ان دنوں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ شیخ محمد گجراتی نے اسے بھی مرکز التفات ٹھہرایا اور ''زینۃ النکات فی شرح المشکوٰۃ'' کے نام سے اس کی شرح سپرد قلم فرمائی۔ اس کے علاوہ مختلف مسائل سے متعلق اور بھی متعدد رسائل تحریر کیے۔

شیخ محمد گجراتی نے چونسٹھ (۶۴) برس عمر پا کر ۱۹ جمادی الاخریٰ ۱۱۱۱ھ/ ۲ دسمبر ۱۶۹۹ء کو احمد آباد میں انتقال کیا اور وہیں دفن کیے گئے ❶۔

۵۔ قاضی محمد آصف نگرامی

لکھنؤ کے نواح میں بہت سے قصبات و دیہات کو اہل علم کے مراکز کی حیثیت حاصل رہی ہے، ان میں ایک قریہ نگرام ہے، جس کی خاک سے متعدد اصحاب کمال پیدا ہوئے اور پھر ان کی علمی شہرت دور دراز علاقوں میں پہنچی۔ علمائے نگرام میں ایک بزرگ قاضی محمد آصف گزرے ہیں جو اس نواح میں اپنے عصر کے بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ ان کا کتب خانہ مختلف فنون کی بہترین کتابوں پر مشتمل تھا۔ انھوں نے ۲۲ ربیع الاول ۱۱۸۵ھ/ ۵ جولائی ۱۷۷۱ء کو نگرام میں وفات پائی ❷۔

۶۔ شیخ محمد ارشد جون پوری

شیخ محمد ارشد جون پوری، مشہور عالم اور درس نظامیہ کی معروف کتاب ''رشیدیہ'' کے مصنف شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری کے فرزند گرامی تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب انتیس واسطوں سے شیخ سری سقطی تک پہنچتا ہے۔ دیار ہند کے بہت بڑے عالم، شیخ اور متقی بزرگ تھے۔ ۱۰۴۱ھ/ ۱۶۳۲ء میں پیدا ہوئے اور علم و مشیخت کی گود میں پرورش پائی۔ قرآن مجید پڑھا اور خوش نویسی اور کتابت مختلف حضرات سے سیکھی۔ علم صرف کی ابتدائی کتابیں یعنی میزان الصرف سے لے کر دستور المبتدی تک ایک عالم مولانا نصر اللہ سے پڑھیں۔ اس کے بعد کتب نحو میں سے مائۃ عامل، ہدایۃ النحو، کافیہ اور شرح جامی وغیرہ کی تحصیل کی۔ اسی اثنا میں منطق کی ابتدائی کتابوں سے لے کر

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۲۵۷۔ بحوالہ مرآۃ احمدی

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۲۶۷۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انتہائی کتابوں تک مختلف اساتذہ کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ معانی و بیان، ہیئت و ریاضی، مناظرہ، فقہ، اصول فقہ، علم فرائض، اصول حدیث، فلسفہ، تفسیر اور حدیث وغیرہ مروجہ علوم کی تمام کتابوں کا جید و مشاہیر اساتذہ سے باقاعدہ درس لیا۔ اپنے والد مکرم شیخ محمد رشید جون پوری سے بھی متعدد فنون کی بہت سی کتابیں پڑھنے کا شرف حاصل کیا۔ بے حد ذہین تھے، حافظہ بڑا تیز پایا تھا۔ تمام متداول علوم کی تحصیل سے اکیس سال کی عمر میں فارغ ہوگئے تھے۔ والد کی زندگی ہی میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔

بے حد متدین عالم تھے۔ تدریس کے ساتھ تلقین و موعظت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ قناعت و عفت اور فقر و توکل میں وہی معمول تھا جو والد گرامی شیخ محمد رشید کا تھا۔ ہر شخص سے نرمی اور انکسار کے ساتھ پیش آتے۔ مریض کی عیادت کرتے اور جنازوں میں شامل ہوتے۔ چھوٹے بڑے کی دعوت قبول فرماتے اور کسی کے لیے اذیت رسانی کا باعث نہ بنتے۔ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے اور اس پر خوش رہتے۔ نماز باجماعت پڑھنے اور اول وقت ادا کرنے کا اہتمام کرتے اور اپنے تلامذہ و رفقا کو بھی اس کی تاکید فرماتے۔ سری نمازوں میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھتے۔

شیخ محمد ارشد جون پوری نے سلوک و تصوف کے موضوع پر چند رسائل بھی تصنیف کیے۔ ''گنج ارشدی'' کے نام سے خود ان کے ملفوظات ۱۱۳۵ھ/۲۳-۱۷۲۲ء میں ان کے شاگرد شیخ شکر اللہ جون پوری نے جمع کیے، اور شیخ غلام رشید جون پوری (متوفی ۵ صفر ۱۱۶۷ھ) نے ان ملفوظات کو مرتب کیا۔ گنج ارشدی کا قلمی نسخہ جون پور میں موجود ہے۔ اس میں بہت سے علما و فضلا اور صوفیا و اولیا کے حالات و کوائف مرقوم ہیں اور اس کے حوالے مختلف کتابوں میں ملتے ہیں۔

شیخ محمد ارشد جون پوری رحمہ اللہ نے ۲۴ جمادی الاخری ۱۱۱۳ھ/۱۵ نومبر ۱۷۰۱ء کو جون پور میں وفات پائی [1]۔

۷۔ مولانا محمد اسعد انصاری سہالوی

مولانا محمد اسعد انصاری سہالوی، برصغیر کے معروف عالم دین مولانا قطب الدین انصاری سہالوی شہید کے چار بیٹوں میں سے بڑے بیٹے تھے۔ موضع سہالی میں پیدا ہوئے جو لکھنؤ کے نواح میں اصحاب فضل کا مشہور قصبہ تھا۔ اپنے والد مولانا قطب الدین سہالوی سے اخذ علم کیا۔ بارھویں صدی ہجری کے جید علما میں سے تھے۔ اپنے علمی کمال کی وجہ سے باپ کی زندگی ہی میں برہان پور کے منصب صدارت پر فائز ہوگئے تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کے دربار سے منسلک تھے اور اس کے ہم رکاب رہتے تھے۔ رئیسانہ مزاج کے مالک تھے۔ حاشیہ قدیمہ پر حاشیہ تحریر کیا۔ بارھویں صدی ہجری کے ہندوستان کے مشہور عالم و مصنف ملا جیون امیٹھوی کے

[1] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۷۰ تا ۲۷۲ بحوالہ گنج ارشدی۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہم عصر تھے، اور ایک مناظرے میں ملا جیون کے مقابلے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ علاقہ دکن میں فوت ہوئے۔ رجب ۱۱۰۳ھ/ مارچ ۱۶۹۲ء میں جب ان کے والد مولانا قطب الدین ❶ کو کوسہالی میں شہید کیا گیا یہ وہاں موجود نہ تھے ❷۔

۸۔ سید محمد اشرف حسینی بلگرامی

سید محمد اشرف حسینی ترمذی بلگرامی کا تعلق سادات ترمذ سے تھا۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت حسین رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ والد کا اسم گرامی سید عبدالدائم تھا۔ اس خاندان کے پہلے بزرگ جو ترمذ سے ہندوستان آئے، سید احمد تختہ تھے۔ یہاں آنے کے بعد وہ لاہور میں سکونت پذیر ہوئے اور اسی شہر میں وفات پائی۔ سید احمد تختہ کے اخلاف میں سے ایک بزرگ سید محمد بن قاسم نے قنوج کا رخ کیا اور وہیں توطن اختیار کر لیا تھا۔ جب شیر شاہ سوری نے دائی پور کے قریب شیر گڑھ آباد کیا تو بخاری سادات اور شہر قنوج کے بعض دیگر بزرگوں نے قنوج سے نقل مکانی کر کے شیر گڑھ کو اپنا مسکن بنا لیا۔ سید محمد بن قاسم بھی قنوج سے اٹھ کر شیر گڑھ میں اقامت گزیں ہو گئے تھے۔ پھر جب سوری خاندان کی حکومت ختم ہو گئی اور ہندوستان پر مغلوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا تو قنوج کے ان لوگوں نے جو شیر گڑھ میں آ بسے تھے، پھر قنوج کا رخ کیا، لیکن سید محمد بن قاسم نے وہیں رہنے کو ترجیح دی اور فرمایا:

ما فقیریم ہمیں صحرا مناسب حال ماست ❸۔

(ہم فقیر لوگ ہیں یہی جنگل ہمارے لیے موزوں جگہ ہے۔)

سید محمد کی وفات شیر گڑھ ہی میں ہوئی، لیکن ان کی میت کو وہاں سے لا کر قنوج میں دفن کیا گیا۔

سید محمد کے بیٹے سید حسن تھے، جنھیں ''بندگی سید حسن'' کہا جاتا تھا، انھوں نے شیر گڑھ میں ایک نہایت شان دار مسجد تعمیر کی۔ وہ بڑے سخی اور مہمان نواز تھے۔ دائی پور میں فوت ہوئے۔

سید حسن کی اولاد میں ایک بزرگ سید فرید الدین پیدا ہوئے۔ وہ دائی پور کی سکونت ترک کر کے بلگرام میں متوطن ہو گئے تھے۔ یہی وہ سید فرید الدین ہیں جن کی اولاد میں سید محمد اشرف بلگرامی کا نام نامی شامل ہے۔ سید محمد اشرف بڑے نیک اور بلند مرتبے کے عالم دین تھے۔ بلگرام کے علما و فضلا میں انھیں نہایت قدر و منزلت حاصل تھی۔ وہاں کے مشہور علما میں سے سید عبدالجلیل بلگرامی (متوفی ۲۳ ربیع الثانی ۱۱۳۸ھ) اور استاذ المحققین میر سید طفیل محمد بلگرامی (متوفی ۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۸ء) ان سے خاص تعلق رکھتے تھے اور ان کے انتہائی مداح تھے۔ مرد صالح، فاضل اجل اور طریقۂ سلف صالحین کے پابند تھے۔ صوری و معنوی فضائل کے حامل اور ہر لحاظ

❶ مولانا قطب الدین کے حالات اور ان کی شہادت کی تفصیلات کے لیے دیکھیے فقہائے ہند جلد پنجم۔

❷ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۷۷۔ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۷۲۔

❸ مآثر الکرام ص ۲۷۹۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے اونچی شخصیت کے مالک تھے۔

سید محمد اشرف ۱۰۷۴ھ/۱۶۶۴ء کو بلگرام میں پیدا ہوئے۔ جوانی کی منزل میں داخل ہو چکے تھے اور شادی بھی ہو چکی تھی کہ تحصیل علم کا شوق پیدا ہوا۔ اس زمانے میں بلگرام کے متعدد اصحاب علم مصروف درس و افادہ تھے، جن میں میر سید عبدالجلیل بلگرامی کا اسم گرامی قابل ذکر ہے۔ ان کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے اور ان سے مروجہ علوم کی کئی کتابیں پڑھیں۔ پھر سید نور اللہ بلگرامی (متوفی ۱۳ شعبان ۱۱۱۳ھ/۲ جنوری ۱۷۰۲ء) کی خدمت میں گئے۔ ان سے فقہ اور معقولات وغیرہ کی بعض کتابوں کی تحصیل فرمائی۔ بعد ازاں سید سعد اللہ بلگرامی (متوفی ۱۷ شوال ۱۱۱۹ھ/ ۳۱ دسمبر ۱۷۰۷ء) کی طرف رجوع کیا، بعض کتابوں کی تکمیل ان سے کی۔ ان کے علاوہ مولانا شہاب الدین چوبے پوری سے بھی استفادہ کیا۔ مولانا ممدوح کا شمار فلسفہ و منطق کے مشہور علما میں ہوتا تھا اور قنوج کے نواح میں ایک مقام چوبے پور میں سکونت پذیر تھے، جو اس دور میں اچھا خاصا قریہ تھا اور علمی حلقوں میں مشہور تھا۔

علوم متداولہ اور فنون مروجہ سے فارغ ہونے کے بعد سید محمد اشرف بلگرامی نے حکومت وقت سے راہ و رسم پیدا کی اور اورنگ زیب عالم گیر کے بیٹے محمد اعظم کے دربار میں جا کر اس کے حلقۂ ملازمین میں شامل ہو گئے، اور اپنی انتظامی صلاحیتوں کی بنا پر بڑا نام پیدا کیا۔ بعد ازاں نواب مبارز الملک سربلند خاں تونی سے تقرب پیدا کیا اور جن خدمات پر مامور ہوئے انھیں نہایت حسن وخوبی سے سرانجام دیا۔ پھر نواب صفدر جنگ کی رفاقت اختیار کی، وہاں بھی جو فرائض ان کے سپرد کیے گئے، ان کی تکمیل میں ہر لحاظ سے کامیاب رہے۔ آخر میں احمد شاہ بن محمد شاہ بادشاہ (۱۱۶۱۔۱۱۶۷ھ/ ۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء) کی وزارت میں شامل ہو گئے اور امور مفوضہ کی انجام دہی میں بے حد محنت اور سرگرمی کا ثبوت دیا۔ جب کبرسنی کو پہنچ گئے تو اپنے وطن مالوف بلگرام واپس آ گئے۔

سید محمد اشرف بلگرامی کی عمر کا بیشتر حصہ ملوک و امرا کی مصاحبت میں گزرا اور حکومت کے بلند مناصب پر فائز رہے۔ شب و روز کی عبادت کے معمولات میں کبھی فرق نہیں آنے دیا۔ سفر و حضر میں نماز تہجد ہمیشہ پابندی سے ادا کرتے رہے۔ تلاوت قرآن انتہائی جذب وشوق اور عجز وانکسار سے کرتے، تفسیر، حدیث اور تصوف کا مطالعہ ان کا خاص موضوع تھا، وقت کا بڑا حصہ اسی میں صرف کرتے۔ نماز باجماعت کے پابند تھے۔ خط بہت عمدہ تھا۔ فقہ کی مشہور درسی کتاب شرح وقایہ پر حاشیہ سپرد قلم کیا اور خوب صورت خط میں شروع سے آخر تک اپنے قلم سے لکھا۔

سید غلام علی آزاد بلگرامی ان کے حالات کے چشم دید گواہ ہیں، انھوں نے ان کا تذکرہ بڑے عمدہ انداز میں کیا ہے اور اختصار کے ساتھ زندگی کی تمام سرگرمیوں کا بہترین اسلوب میں نقشہ کھینچا ہے۔ وہ ان کے آخری دور کے بارے میں لکھتے ہیں:

از کبرسن وضعف قویٰ طاقت قیام نماندہ بود، بزور عصا یا اعانت دیگرے برمی خاست۔ روز عیدین

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سوار شدہ در مسجد جامع، محلّہ میدان پورہ می آمد و با حاضران ملاقات می کرد و می گفت، ہر چند نماز عیدین بہ عذر شرعی از من ساقط است، اما دریں روز کہ بہ تصدیع تمام حاضر مسجد می شوم، نیت آنست کہ نماز جماعت میسر شود و ملاقات با احباب دست دہد خدا داند سال آئندہ دری یا بم یا نے ❶۔

(یعنی بڑھاپے اور شدید جسمانی کمزوری کی وجہ سے جب کھڑا ہونے کی بھی طاقت باقی نہ رہی تھی، لاٹھی کے سہارے یا کسی دوسرے شخص کی مدد سے کھڑے ہوتے تھے، عیدین کی نماز کے لیے محلّہ میدان پورہ کی جامع مسجد میں آتے اور لوگوں سے ملاقات کرتے اور کہتے کہ اگرچہ عذر شرعی کی بنا پر نماز عیدین میں حاضری مجھ سے ساقط ہے، تاہم اس دن بے حد تکلیف کے ساتھ مسجد میں حاضر ہوتا ہوں، نیت فقط یہ ہے کہ نماز با جماعت میسر آ جائے، اور دوستوں سے ملاقات کا موقع مل جائے۔ خدا جانے آئندہ سال یہ سعادت حاصل کر سکوں یا نہ کر سکوں۔)

برصغیر کے اس جلیل القدر عالم نے ۹ صفر ۱۱۶۵ھ/ ۱۷ دسمبر ۱۷۵۱ء کو ۹۱ سال عمر پا کر داعی اجل کو لبیک کہا۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے ان اشعار سے تاریخ وفات نکالی:

میر اشرف سر آمد فضلاء برو تشریف سوئے منزل قدس

ہاتفے گفت سال رحلت او اشرفِ واردان محفل قدس ۱۱۶۵ھ ❷

۹۔ شیخ محمد اشرف کشمیری

شیخ محمد اشرف بن محمد طیب کشمیری، ارض کشمیر کی منتو برادری سے تعلق رکھتے تھے اور دیار کشمیر کے نامور فقہا میں سے تھے۔ قاضی حیدر کشمیری (متوفی ۱۱۲۱ھ/ ۱۷۰۹ء) کے پوتے تھے۔ کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہاں کے اکابر علما سے اخذ علم کیا۔ پھر شیخ محمد محسن کشمیری (متوفی ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء) سے منسلک ہو گئے اور ان سے کتب درسیہ کی تکمیل کی۔

جودت طبع، دقت ذہن، استقامت مزاج اور علم و فضل میں یگانہ تھے۔ بحث و اشتغال میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ افتا و تدریس میں مرتبۂ بلند پر فائز تھے۔ قرآن مجید پر گہری نظر تھی۔ رد شیعیت میں بہت تیز تھے۔ قرآن مجید کے بعض اہم مقامات کی وضاحت، علم قرأت اور شیعہ کی مخالفت میں کچھ کتابیں تصنیف کیں۔ بعض اور مسائل کے بارے میں بھی کتابیں لکھیں۔ ان کی تصانیف میں جواہر الحکم مشہور کتاب ہے۔ مجادلہ اور بلاغت کلام میں اپنے اقران سے ممتاز تھے۔

شیخ محمد اشرف منتو کشمیری نے ۱۱۲۳ھ/ ۱۷۱۱ء میں وفات پائی ❸۔

❶ مآثر الکرام، ص ۲۸۰۔

❷ حالات کے لیے دیکھیے مآثر الکرام ص ۲۷۸ تا ۲۸۰۔ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۷۴، ۲۷۵۔

❸ تاریخ کشمیر اعظمی ص ۲۱۶۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۷۹۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۳۴، ۴۳۵۔ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۷۵۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۰۔مولانا محمد اعلیٰ تھانوی

برصغیر کی مردم آفرین سرزمین کے ان فحول علما اور اکابر فضلا میں جنھوں نے بارھویں صدی ہجری کا زمانہ پایا، مولانا محمد اعلیٰ تھانوی کا اسم گرامی علم و تحقیق کی رو سے ہمیشہ نمایاں رہے گا۔ افسوس ہے، اس جلیل القدر عالم کے تفصیلی حالات تذکرہ و تاریخ کی کتابوں نے محفوظ نہیں کیے۔ جو کچھ معلوم ہو سکا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ان کے والد کا نام علی، دادا کا محمد حامد اور پڑدادا کا نام محمد صابر تھا۔ نسباً فاروقی اور مسلکاً حنفی تھے۔ یوپی کے مشہور مقام تھانہ بھون میں پیدا ہوئے۔ آبا و اجداد کا شمار اپنے دور کے اکابر فضلا میں ہوتا تھا۔ ان کے والد شیخ علی ایک جلیل القدر عالم تھے۔ جد امجد کا علمی مقام بھی مسلم تھا۔ اس لحاظ سے کہنا چاہیے کہ شیخ محمد اعلیٰ نے علم و فضل کی گود میں پرورش پائی۔ علم نحو اور دیگر علوم مروجہ کی تحصیل والد مکرم سے کی۔ علم فقہ کی متداول کتابیں بھی انھی سے پڑھیں۔ بعض دیگر علمائے عصر سے بھی اخذ فیض کیا لیکن نہایت افسوس ہے ان اساتذہ کرام کے اسمائے گرامی کو اس دور کی کتب رجال نے اپنے صفحات میں جگہ نہیں دی۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا محمد اعلیٰ تھانوی نے اپنی تمام توجہ مطالعۂ کتب میں مبذول کر دی اور تیزی کے ساتھ ذخائر علمی کو سمیٹنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے تحقیق کے دروازے کھول دیے اور مروجہ علوم کی علمی و فنی اصطلاحات میں ماہر کامل کے درجے پر فائز ہوئے۔

۱۱۵۸ھ میں ایک کتاب تصنیف کی، جس کا نام ''کشاف اصطلاحات الفنون'' ہے۔ اس کتاب نے ان کو ہمیشہ کے لیے زندگی و تابندگی بخش دی ہے۔ اپنے موضوع کی یہ نہایت عمدہ کتاب ہے۔ لائق مصنف نے اس میں تمام مروجہ عقلی اور نقلی علوم کی اصطلاحات بیان کی ہیں اور بتایا ہے کہ کون سی اصطلاح کہاں استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً کلام، اصول، فقہ، صرف، نحو، منطق و حکمت، طب، ہندسہ، ریاضی وغیرہ علوم کی اصطلاحات کا بڑی وضاحت سے ذکر کیا ہے۔

اس کتاب کی افادیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مستشرقین نے بھی اس سے بے حد اعتنا کیا اور مشہور مستشرق اسپرنگر اور ولیم ناسولیس نے اس کی طباعت کو ضروری قرار دیا۔ چنانچہ انھوں نے محمد وجیہ مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ، عبدالحق اور غلام قادر ایسے جید اور ممتاز علما سے اس کی تصحیح کرائی اور پھر ۱۸۶۲ء میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی طرف سے بڑے اہتمام کے ساتھ اسے شائع کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۳۸۲ھ (۱۹۶۲ء) میں ڈاکٹر لطفی عبدالبدیع، ڈاکٹر عبدالنعیم اور استاذ امین الخولی کی تحقیق و تصحیح اور حواشی کے ساتھ یہ کتاب مصر سے شائع ہوئی۔

قیاس کہتا ہے کہ شیخ محمد اعلیٰ تھانوی نے اورنگ زیب عالم گیر کا عہد پایا ہوگا اور اس عصر کے علما سے ان کی صحبتیں بھی رہی ہوں گی، کیونکہ اورنگ زیب نے ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶ء میں وفات پائی اور شیخ محمد اعلیٰ نے ۱۱۵۸ھ/۱۷۴۵ء میں اپنی کتاب مکمل کی۔ لیکن اورنگ زیب سے ان کی ملاقات وغیرہ کا ذکر کسی کتاب میں

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ البتہ سید عبدالحیٰ حسنی نزہتہ الخواطر میں لکھتے ہیں کہ ان کو مولانا اشرف علی تھانوی (متوفی ۱۵ رجب ۱۳۶۲ھ/ ۱۸ جولائی ۱۹۴۳ء) نے بتایا کہ شیخ محمد اعلیٰ عہد عالم گیری میں تھانہ بھون کے عہدۂ قضا پر مامور تھے ❶۔

بہرحال اس سے زیادہ ان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے اور نہ تاریخ ولادت و وفات کا علم ہو سکا ہے۔

۱۱۔ میر محمد افضل دہلوی

میر محمد افضل دہلوی ثم الٰہ آبادی، ایک فاضل بزرگ تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں تحصیل علوم کی، یہاں تک کہ اکثر علوم میں مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ حدیث، فقہ، کلام اور دیگر علوم میں ماہر تھے۔ زہد و تقویٰ میں بھی ممتاز تھے۔ قانع اور مستغنی المزاج تھے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ ان کا ایک دیوان بھی ہے جو پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ شعر انہی کا ہے:

دیدیم بے تو جلوۂ باغ و بہار حیف گل خندہ زد بہ بیکسی ماہزار حیف

میر محمد افضل دہلوی نے ۱۲ ربیع الاول ۱۱۵۰ھ یا ۱۱۵۱ھ/ ۲۹ جون ۱۷۳۷ء یا ۱۷۳۸ء میں داعی اجل کو لبیک کہا ❷۔

۱۲۔ قاضی محمد اکرم سندھی

قاضی محمد اکرم نصر پوری سندھی، اپنے زمانے کے عالم کبیر اور محدث و فقیہ تھے۔ ان کے والد قاضی عبدالرحمن تھے، جو جید عالم اور ممتاز فاضل تھے اور شاہ جہان کے عہد سے لے کر اورنگ زیب عالم گیر تک کی تمام مدت حکومت میں حرمین شریفین کے نذرانوں کے متولی رہے تھے۔ اس خدمت کے صلے میں انھیں ایک بڑی جاگیر عطا ہوئی تھی۔ قاضی محمد اکرم ان کے فرزند کبیر تھے، جو اپنے وقت کے فاضل اور نامور عالم تھے۔ حدیث، فقہ اور علوم عربیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ اصول حدیث پر بالخصوص گہری نظر تھی۔ اس موضوع پر ایک کتاب بھی تصنیف کی۔ اس کتاب کا نام ''امعان النظر فی توضیح نخبۃ الفکر'' ہے۔ یہ بڑی ضخیم کتاب تھی، جو نخبۃ الفکر کی مفصل شرح تھی۔ سید عبدالحیی حسنی لکھنوی لکھتے ہیں کہ انھوں نے یہ کتاب مولانا عبدالحی بن عبدالحلیم انصاری لکھنوی کے کتب خانے میں دیکھی ہے۔

قاضی محمد اکرم کے ایک بیٹے ''میاں مدنی'' کے نام سے معروف تھے۔ انھوں میاں مدنی اس لیے کہا جاتا تھا کہ وہ مدینہ طیبہ میں پیدا ہوئے تھے۔ بڑے نیک اور متقی عالم تھے ❸۔

❶ نزہتہ الخواطر، ج ۶ ص ۲۷۸۔ مقدمہ کشاف اصطلاحات الفنون مطبوعہ مصر۔
❷ ریاض الشعراء (از علی قلی خان داغستانی) نزہتہ الخواطر، ج ۶ ص ۲۸۰۔
❸ تحفۃ الکرام ص ۵۳۹، ۵۴۰۔ نزہتہ الخواطر، ج ۶ ص ۲۸۲۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۳۔ قاضی محمد اکرم دہلوی

قاضی محمد اکرم دہلوی، عالم کبیر، شیخ وقت اور کبار فقہائے حنفیہ میں سے تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں دارالحکومت دہلی میں مفتی عسا کر تھے اور یہ عہدہ آبا واجداد سے ان کے خاندان میں چلا آ رہا تھا۔ طویل مدت تک اس منصب جلیلہ پر فائز رہے۔ ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر عالم گیر نے ۱۰۹۴ھ/۱۶۸۳ء میں ان کو اورنگ آباد کا قاضی مقرر کر دیا تھا۔ ۱۰۹۵ھ/۱۶۸۴ء میں عالم گیر نے قاضی اکبر کی مسند پر قاضی عبداللہ بن محمد شریف گجراتی کو متمکن کیا تھا۔ جو بعد میں صدارت کے عہدے پر مامور ہوئے۔ ۱۱۰۹ھ/ ۱۶۹۸ء میں مرض فالج سے ان کا انتقال ہوا تو قاضی اکبر کے منصب پر قاضی محمد اکرم دہلوی کو مامور کیا گیا۔ پھر عمر بھر یہ اس منصب پر فائز رہے۔ فقہ کے بے مثال عالم اور بہترین عادات و اطوار کے حامل تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کی وفات سے دو سال قبل ۱۱۱۶ھ/۱۷۰۴ء میں راہی ملک بقا ہوئے۔ بادشاہ ان کے فضل و کمال اور علم و دیانت سے بہت متاثر تھا۔ ان کی وفات کا اسے شدید افسوس تھا اور وہ ان کے نام کے ساتھ ہمیشہ ''مرحوم'' کا لفظ استعمال کرتا تھا❶۔

۱۴۔ مفتی محمد امان گوپاموی

مفتی محمد امان بن ابوسعید بن علیم اللہ بن عبیداللہ شہابی صدیقی گوپاموی کا شمار فقہائے عصر اور علمائے اعلام میں ہوتا تھا۔ گوپامئو میں پیدا ہوئے اور اپنے والد گرامی مفتی ابوسعید گوپاموی (۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۸ء) سے جو (نامور عالم، معروف فقیہ اور مفتی وقت تھے) تحصیل علم کی۔ دیگر علمائے کرام سے بھی استفادہ کیا، والد کی وفات کے بعد منصب افتا پر متعین ہوئے۔ ہمیشہ درس و افادہ میں مصروف رہتے۔ ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء میں اس جہان فانی سے رخصت ہوئے❷۔

۱۵۔ قاضی محمد امیر فاروقی گوپاموی

قاضی محمد امیر بن قاضی محمد مبارک فاروقی گوپاموی ہندوستان کے صوبہ یو پی کے قصبہ گوپامئو میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ علوم مرجہ کی تحصیل اپنے والد مکرم قاضی مبارک گوپاموی (متوفی ۵ شوال ۱۱۶۲ھ/ ۷ ستمبر ۱۷۴۹ء) سے کی اور فقہ و اصول اور دیگر علوم متداولہ میں مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ بارھویں صدی ہجری کے یہ ہندی عالم و فقیہ تھے اور فضل و صلاح سے بہرہ مند تھے۔ اپنے والد محترم کی طرح اخلاق فاضلہ کے حامل

❶ مآثر عالم گیری ص ۳۶۹ (اردو)۔ نزہۃ الخواطر ج ۶، صفحہ ۲۸۲، ۲۸۳۔

❷ نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۲۸۳۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور بہترین اوصاف سے متصف تھے۔ گوپامئو کے منصب قضا پر متمکن تھے اور ساتھ ہی تدریس وتصنیف کا سلسلہ بھی جاری رکھتے تھے۔ ان کی تاریخ ولادت ووفات اور تصانیف کا علم نہیں ہوسکا❶۔

۱۶۔ مولانا محمد امین کشمیری

خطۂ کشمیر کے جلیل القدر علما میں سے مولانا محمد امین کانی بلدیمری کشمیری بڑی شہرت کے مالک تھے۔ ان کا مولد ومنشا کشمیر ہے۔ ارض کشمیر کے نامور علما سے جن میں مولانا ابوالقاسم کشمیری اور ان کے والد مولانا جمال الدین کشمیری شامل ہیں، علم حاصل کیا اور وہاں کے علمائے مدققین اور فقہائے محققین میں گردانے گئے۔ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف ان کا اصل مشغلہ تھا۔ انھوں نے اکثر کتب متداولہ مثلاً شرح تہذیب وغیرہ پر شروح وحواشی لکھے اور علم فرائض سے متعلق نظم ونثر میں مفصل رسائل تصنیف کیے۔ متعدد علمائے کشمیر مثلاً مولانا عنایت اللہ شال اور ملا محمد محسن وغیرہ نے ان سے علم حاصل کیا۔ توکل وقناعت کی دولت سے مالا مال تھے۔ تدریس اور علمی مباحث میں مشغول رہتے تھے۔

مولانا محمد امین کشمیری کو عمر کے آخری دور میں ایک دردناک حادثہ پیش آیا۔ وہ یہ کہ ان کی دو بیٹیاں تھیں، عمر بلوغت کو پہنچیں تو ان کی شادی کی تیاری شروع کی اور جہیز وغیرہ بنانے کی غرض سے ہندوستان گئے۔ جب دہلی پہنچے تو دونوں لڑکیوں نے جو اپنے وطن کشمیر ہی میں تھیں، غلطی سے دوا کے بجائے زہر کھا لیا اور جاں بحق ہوگئیں۔ مولانا کو خواب میں معلوم ہوا کہ آپ کی مہم انجام کو پہنچ گئی ہے، اب آپ واپس کشمیر جا کر درس و تدریس اور اشاعت علوم میں مشغول ہو جایئے۔ چنانچہ آپ کشمیر آ گئے اور درس وافادۂ طلبا میں مشغول ہو گئے۔

مولانا محمد امین شاعر بھی تھے۔ انھوں نے کئی علمی مضامین کو اشعار کے قالب میں ڈھالا۔ حاضر جواب اور شگفتہ مزاج عالم تھے۔ کہتے ہیں ایک مرتبہ کشمیر کا ایک قاضی جس کا نام قاضی عبدالکریم تھا، ہندوستان کے سفر پر گیا۔ گھوم پھر کر خاصی مدت کے بعد واپس آیا تو مولانا محمد امین اس کی ملاقات کو گئے۔ وہ مولانا ممدوح کو جانتا تھا، مگر چوں کہ خاصی مدت کشمیر سے باہر رہا تھا، اس لیے آپ کو پہچان نہ سکا۔ نام پوچھنے کے بعد پہچانا تو بہت معذرت کی اور کہا کہ ملاقات طویل عرصے کے بعد ہوئی ہے اس لیے افسوس ہے جلدی سے پہچاننے میں دقت پیش آئی۔

مولانا نے قاضی عبدالکریم کو طنز کرتے ہوئے فوراً جواب دیا: بے شک آپ معذور ہیں۔ عربی کا یہ مقولہ بالکل صحیح ہے کہ: اذا جاء القضاء عمی البصر۔

(یعنی قاضی بننے کے بعد انسان آنکھوں سے اندھا ہو جاتا ہے۔)

مولانا محمد امین کانی کشمیری، ماہ رمضان المبارک لیلۃ القدر ۱۱۰۹ھ/ ۲۹ مارچ ۱۶۹۸ء کو سفر آخرت پر روانہ ہوئے❷۔

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۸۴ بحوالہ تذکرۃ الانساب۔

❷ تاریخ کشمیر اعظمی ص ۱۹۱، ۱۹۲۔ روضۃ الابرار۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸۲، ۱۸۳۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۳۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۲۸۵، ۲۸۶۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۷۔ سید محمد باقر بلگرامی

سید محمد باقر حسین واسطی بلگرامی، سید محمد صغریٰ (متوفی ۱۴ شعبان ۶۴۵ھ/ ۱۵ دسمبر ۱۲۴۷ء) کی اولاد سے تھے۔ والد کا اسم گرامی سید داور بخش تھا۔ اپنے عصر کے عالم وفقیہ تھے۔ بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ سید فرید الدین بلگرامی (متوفی تقریباً ۱۱۲۰ھ/ ۱۷۰۸ء) اور سید نور اللہ بلگرامی (متوفی ۱۳ شعبان ۱۱۱۳ھ/ ۲ جنوری ۱۷۰۲ء) سے علوم متداولہ کی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں سید عبدالجلیل بلگرامی (متوفی ۲۳ ربیع الثانی ۱۱۳۸ھ/ ۱۸ دسمبر ۱۷۲۵ء) سے منسلک ہو گئے۔ ان سے خوب استفادہ کیا اور تمام علوم سے بہرہ ور ہوئے۔ عربی ادب اور حسن خط میں بالخصوص مہارت رکھتے تھے۔ عمر بھر درس و تدریس میں سرگرم رہے اور بے شمار لوگوں کو مستفید فرمایا۔ ۱۱۳۱ھ/ ۱۷۱۹ء میں تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں اس دنیائے ناپائدار سے رخت سفر باندھا اور بلگرام میں مدفون ہوئے ❶۔

۱۸۔ شیخ محمد باقر سندھی

شیخ محمد باقر سندھی، اخوند عبدالواسع کے بیٹے اور دیار سندھ کے مشہور بزرگ شیخ حمزہ واعظ کی اولاد سے تھے۔ فقہ کے جید عالم تھے۔ گوشہ گیر قسم کے صاحب علم تھے اور شہرت و ناموری کو بالکل پسند نہ کرتے تھے۔ علم فقہ میں اس قدر دسترس حاصل تھی کہ اس میں کوئی ان کا ہم سر نہ تھا۔ حافظہ بے حد قوی پایا تھا اور ذہانت میں سب سے تیز تھے۔ چھوٹے بڑے سب ان کی تکریم میں پیش پیش رہتے۔ بے شمار لوگوں نے ان سے فیض حاصل کیا۔ کم وبیش اسّی (۸۰) برس کی عمر میں انتقال فرمایا ❷۔

۱۹۔ مولانا محمد جمیل جون پوری

بارھویں صدی ہجری کے جلیل القدر ہندی علما اور نامور فقہا میں سے ایک بزرگ مولانا محمد جمیل صدیقی بروتوی جون پوری تھے۔ ان کے والد کا اسم گرامی مفتی عبدالجلیل اور جد امجد کا نام نامی مفتی شمس الدین تھا۔ مفتی عبدالجلیل صدیقی جون پوری اپنے وقت کے وہ عالم اور فقیہ و زاہد تھے، جنھوں نے تمام عمر درس و تدریس میں صرف کر دی اور ۸ شوال ۱۰۷۶ھ/ ۳ اپریل ۱۶۶۶ء کو جون پور میں وفات پائی۔ جد امجد مفتی شمس الدین صدیقی جون پوری بھی عالم کبیر اور فاضل نبیل تھے۔ جون پور کی مسند افتا پر فائز تھے اور درس و افادہ میں مصروف رہتے تھے۔ ۱۰۴۷ھ/ ۱۶۳۷ء کو جون پور میں فوت ہوئے اور اپنے مدرسے ہی میں دفن کیے گئے۔ ان کے آبا واجداد

❶ مآثر الکرام ص ۲۳۶، ۲۳۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۲۸۹۔

❷ تحفۃ الکرام ص ۱۹۸، ۱۹۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۲۸۹۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا شمار بھی مشاہیر علمائے عصر میں ہوتا تھا۔

مولانا محمد جمیل صدیقی ماہ ذی قعدہ ۱۰۵۵ھ/ دسمبر ۱۶۴۵ء کو جون پور میں پیدا ہوئے اور علم و فضل کی فضا میں پرورش پائی۔ ان کی ولادت کے زمانے میں خود ان کے گھر میں علم کی شمع فروزاں تھی اور اس عہد کے جون پور کو اصحاب کمال اور ارباب فضیلت کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس سے خوب استفادہ کیا اور متعدد فضلا سے تحصیل علم کی۔ شرح وقایہ اور مختصر معانی تک درسی کتابیں صاحب رشیدیہ شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری (متوفی ۹ رمضان ۱۰۸۳ھ/ ۹ دسمبر ۱۶۷۳ء) سے پڑھیں اور باقی علوم متداولہ کی تکمیل شیخ نور الدین جعفر بن عزیز اللہ جون پوری سے کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود مسند تدریس سنبھالی اور درس و افادہ کا غلغلہ بلند کیا۔

مولانا محمد جمیل صدیقی جون پوری کا شمار بارھویں صدی ہجری کے برصغیر کے رفیع المنزلت فقہا میں ہوتا تھا اور وہ ایک ذی مرتبت خاندان کے لائق فرزند تھے۔ ذہن نہایت رسا پایا تھا، قوت ادراک بے حد تیز تھی، اور فراست میں بہ درجۂ غایت شہرت رکھتے تھے، جودتِ طبع کے مالک تھے، پاکیزہ فکر عالم اور کئی خالص فنی کتابوں کے مصنف تھے۔ معانی و بیان کی معروف درسی کتاب ''مطول'' اور علم نحو کی شرح جامی کے مبحث عطف پر حواشی تحریر کیے۔ علاوہ ازیں علم فقہ پر ایک رسالہ لکھا اور تصوف کے بارے میں ''تنبیہات جمیلی'' کے نام سے ایک کتاب سپرد قلم کی۔ فقہائے برصغیر کی اس خوش بخت جماعت میں شامل تھے جنھوں نے ''فتاویٰ عالم گیری'' کی تدوین کا عظیم اور یادگار فقہی کارنامہ انجام دیا۔

مولانا محمد جمیل جون پوری کے تلامذہ کا حلقہ بھی بڑا وسیع تھا۔ گنج ارشدی کے مؤلف شیخ غلام رشید عثمانی جون پوری (متوفی ۵ صفر ۱۱۶۷ھ) بھی ان کے حلقۂ درس میں شامل رہے۔ انھوں نے ان سے یہ کتابیں پڑھیں۔ مختصر المعانی اور مطول مع حاشیہ سید شریف ❶ علامہ سعد الدین تفتازانی کی شرح العقائد مع حاشیہ خیالی، شرح المطالع مع حاشیہ سید، حسامی، نور الانوار کے کچھ اجزا، شرح وقایہ، ہدایۃ الفقہ، شیخ محمود جون پوری کا رسالہ الجبر والاختیار اور شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری کی مشہور تصنیف رشیدیہ۔

بحر زخار کی روایت کے مطابق شیخ نظام الدین اورنگ آبادی (متوفی ۲ ذیقعدہ ۱۱۴۴ھ/ ۱۶ اپریل ۱۷۳۲ء) شیخ نور الہدیٰ امیٹھوی (متوفی ۱۳ رجب ۱۱۳۳ھ/ ۲۹ اپریل ۱۷۲۱ء) سید حسن رسول نما (متوفی ۲۲ شعبان ۱۱۰۳ھ/ ۲۹ اپریل ۱۶۹۲ء) اور بہت سے حضرات نے ان سے علم حاصل کیا۔ علاوہ ازیں مولانا نور الدین جعفر گنت پوری جون پوری (متوفی ۱۱۲۰ھ/ ۱۷۰۸ء) کا نام بھی تذکرہ نویسوں نے ان کے تلامذہ میں لکھا ہے، انھیں مولانا نور الدین جعفر غازی پوری بھی کہا جاتا ہے کیونکہ گنت پور اعمال غازی پور میں واقع تھا۔

مولانا محمد جمیل کی ذہانت اور جودتِ طبع کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جس زمانے میں وہ مولانا نور الدین جون پوری کے حلقۂ درس میں شریک تھے اور اصول فقہ کی کتاب ''نور الانوار'' پڑھ رہے تھے،

❶ سید شریف سے علی بن محمد بن علی جرجانی (متوفی ۶ ربیع الثانی ۸۱۶ھ/ ۱۳ جولائی ۱۵۱۰ء) مراد ہیں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کتاب ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ استاد نے دہلی کا قصد کیا اور لائق شاگرد نے سلسلۂ درس کے منقطع ہونے پر اظہار افسوس کیا تو استاد نے فرمایا اب تمھیں مزید درس کی ضرورت نہیں رہی، مطالعہ کافی ہے۔

ان کی ذہانت کا ایک اور واقعہ بھی بڑا ہی تعجب خیز ہے، وہ یہ کہ ایک مرتبہ علم معانی و بدیع کی کتاب ''مطول'' کی ایک دقیق عبارت کا مطالعہ کر کے اپنے نامور استاد مولانا نورالدین کی خدمت میں گئے اور دوران درس اس عبارت کا وضاحت سے مطلب بیان کیا۔ استاد نے بڑی توجہ سے سنا اور شاگرد کی تحسین کرتے ہوئے فرمایا، اس عبارت کا مطلب میں نے آج تمھاری تشریح سے سمجھا۔

لائق شاگرد کی بے پناہ ذہانت کی وجہ سے ان کے اساتذہ خوش ہو کر انھیں ملا جلال اور ملا شریف کہا کرتے تھے۔

مولانا محمد جمیل جون پوری جب دہلی گئے اور مختلف اہل علم سے ملے اور ان سے بعض علمی مباحث پر گفتگو ہوئی تو وہ حیران رہ گئے اور تمام علمائے دہلی پر ان کی علمی ہیبت طاری ہوگئی۔ اس ضمن میں مشاہیر جون پر کے الفاظ قابل ملاحظہ ہیں۔

> آں چناں جودت ذہن بود کہ اگر یک بار متن کسے کتاب بیند حاجت حاشیہ نہ افتد۔ ہر مطالب دقیق کہ پیش آید فوراً بہ قوت ذہن حل گردد، بارہا استادش فرمودے کہ ملا جمیل راممائل علامہ پر شریف و ملا جلال گفتن بے جا نیست۔ وقتیکہ ملا جمیل وارد دہلی شدہ شہرۂ فضیلتش چناں شائع گردیدہ وہیبتش طاری شد کہ بہر درس کہ رسیدے درس موقوف گشتے۔ روزے در مدرسۂ ملا لطف اللہ دہلوی رفت، در یک سطر ہفت یا ہشت شبہات پیش نمود۔ ملا لطف اللہ از جوابش عاجز آمدند ❶۔

> (یعنی قوت ذہن اس قدر تیز تھی کہ ایک مرتبہ کسی کتاب کا متن دیکھ لیتے تو حاشیے کی طرف مراجعت کی ضرورت نہ رہتی، جو بھی دقیق اور پیچیدہ مباحث سامنے آتے فوراً قوت ذہانت سے ان کی گرہیں کھل جاتیں۔ ان کے استاد اکثر فرماتے کہ ملا جمیل کو علامہ میر شریف ❷ اور ملا جلال ❸ کے مماثل قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ملا جمیل جب دہلی گئے تو

❶ مشاہیر جون پور، ص ۸۸۔

❷ علامہ میر سید شریف جرجانی کا نام علی بن محمد بن علی تھا۔ ۲۲ شعبان ۷۴۰ھ/۲۲ فروری ۱۳۴۰ء کو جرجان میں پیدا ہوئے۔ بہت بڑے عالم و فاضل اور جلیل القدر بزرگ تھے۔ بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ، ہیئت اور دیگر علوم پر عبور رکھتے تھے۔ متعدد کتابوں کے شروح اور حواشی لکھے۔ ان کی کئی تصانیف عربی علوم کے مدارس میں باقاعدہ پڑھائی جاتی ہیں۔ ۶ ربیع الثانی ۸۱۶ھ/۶ جولائی ۱۴۱۳ء کو شیراز میں فوت ہوئے۔

❸ ملا جلال الدین دوانی مراد ہیں، جو ۸۳۰ھ (۱۴۲۷ء) میں صوبہ شیراز کے ضلع گازرون میں ==

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کی فضیلت علمی کا شہرہ اس قدر پھیلا اور وہاں کے علما پر اتنا رعب طاری ہوا کہ جس حلقۂ درس میں چلے جاتے سلسلۂ درس موقوف ہو جاتا۔ ایک روز ملا لطف اللہ دہلوی❶ کے درس میں گئے تو (زیر درس کتاب کی) ایک سطر میں سات یا آٹھ شبہات وارد کیے اور ملا لطف اللہ ان کا جواب دینے سے عاجز آ گئے۔)

بہر حال مولانا محمد جمیل بہت بڑے عالم تھے اور درس و تدریس ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ جون پور کے محلّہ مفتی میں ایک وسیع اور پختہ خانقاہ اور ایک مدرسہ تعمیر کرایا، جس میں خود درس دیتے اور لوگوں کی باطنی اصلاح کرتے تھے۔ لیکن اب یہ گہوارۂ علم اور مرکز روحانیت دست برد زمانہ کی نذر ہو گیا ہے "مشاہیر جون پور" کے مصنف دردناک الفاظ میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔

چوں زمانہ دگرگوں شد، اکنوں آثارے ہم باقی نہ ماند، جزایں کہ برایں زمین کہ پیش دروازہ شاہ طفیل حسین است، کشت کاری می شود و چشم بصیرت مشاہدۂ نہجار دنیا می کند❷۔

(زمانہ انقلاب کی اس قدر تیز لہروں کی زد میں آ گیا ہے اور رنگ دہر اس طرح بدل گیا ہے کہ اب اس (درس گاہ اور خانقاہ) کے کوئی آثار باقی نہیں رہے، سوائے اس کے کہ دروازہ شاہ طفیل حسین کے سامنے کی زمین پر کاشت کاری ہوتی ہے، اور چشم بصیرت اس دنیائے ناہنجار کی عبرت ناکیوں کا مشاہدہ کرتی ہے۔)

یہ بھی صدیوں پہلے کی بات ہے اب معلوم نہیں کیا حال ہوگا۔

مولانا محمد جمیل جون پوری جہاں ایک رفیع القدر عالم دین اور بہترین مدرس تھے، وہاں ایک نامور صوفی اور صاحب طریقت بزرگ بھی تھے اور لوگوں کے قلب و باطن کی اصلاح کرتے تھے۔ دیوان عبدالرشید سے باقائدہ بیعت تھے۔ اس کا ذکر صاحب مشاہیر جون پور ان الفاظ میں کرتے ہیں:

علاوہ فضائل صوری صاحب کمالات باطنی ہم بود و بیعت و ارادت از دیوان عبدالرشید آوردہ❸

= "دوان" نام کی ایک چھوٹی سی بستی میں پیدا ہوئے۔ علم و فضل کے اس مرتبہ بلند کو پہنچے کہ "محقق دوانی" کہلائے۔ علوم و فنون کی کئی کتابوں کے مصنف اور محشی تھے۔ ان کی بعض تصنیفات درس نظامیہ میں داخل ہیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ وغیرہ تمام علوم متداولہ کے ماہر تھے۔ ۹ ربیع الثانی ۹۰۸ھ (۱۲ اکتوبر ۱۵۰۲ء) کو مرض اسہال سے انتقال کیا اور اپنے گاؤں دوّان میں سپرد خاک کیے گئے۔

❶ ملا لطف اللہ دہلوی مہندس تھے اور ریاضی و ہندسے کے بہت بڑے عالم اور مشہور فاضل تھے۔ حساب کے موضوع سے متعلق نظم میں ایک کتاب لکھی اور ۱۱۳۰ھ/ ۱۷۱۸ء میں علامہ عاملی کی خلاصۃ الحساب کی شرح سپرد قلم کی۔ فنون ریاضیہ پر تین رسالے تصنیف کیے۔ ۱۱۵۰ھ/ ۱۷۳۷ء کے لگ بھگ وفات پائی۔

❷ مشاہیر جون پور، ص ۸۹۔

❸ ایضاً، ص ۸۸۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(فضائل علم کے علاوہ باطنی کمالات سے بھی مالا مال تھے اور دیوان عبدالرشید کے حلقۂ بیعت وارادت میں شامل تھے۔)

مولانا محمد جمیل نے بہ درجہ غایت علمی خدمات انجام دیں، لیکن فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب میں ان کی شمولیت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کے لیے خود بادشاہ وقت اورنگ زیب عالم گیر نے ان کو منتخب کیا۔

چنانچہ مشاہیر جون پور کے مصنف لکھتے ہیں:

وقتیکہ عالم گیر بادشاہ دہلی جہت نمود فتاویٰ منسوب باسم خود، فضلائے ناموران دیار ہند طلبید، از جون پور ملا جمیل بر چیدایشاں را بخود خواستہ۔ شریک مجمع اجتماع نمود ❶۔

(جب بادشاہ دہلی اورنگ زیب نے ایک ایسا فتاویٰ مرتب کرنے کی طرف عنان توجہ مبذول کی جو اس کے نام سے منسوب ہو تو اس نے دیار ہند کے نامور فضلا کو طلب کیا۔ اس کے لیے جون پور سے ملا جمیل کو منتخب کیا اور ان سے ذاتی طور پر اس (مرتبین فتاویٰ کی) جماعت میں شریک ہونے کی درخواست کی۔)

اس ہمہ اوصاف موصوف عالم وفقیہ نے ۶ رجب ۱۱۲۳ھ/ ۹ اگست ۱۷۱۱ء کو ۶۸ سال کی عمر پا کر جون پور میں داعی اجل کو لبیک کہا اور مفتی محمد صادق کے قبرستان میں اپنے والد گرامی ملا عبدالجلیل صدیقی جون پوری کی قبر کے پہلو میں دفن کیے گئے۔

تاریخ مشاہیر جون پور میں ان کے پسماندگان میں تین بیٹوں کا ذکر کیا گیا ہے، جو غلام معین الدین عرف شاہ امیر علی، شاہ طفیل حسین اور شاہ یتیم الحسن کے ناموں سے موسوم ہیں ❷۔

۲۰۔ قاضی محمد حافظ بلگرامی

قاضی محمد حافظ بن محمد فضیل بن محمد یوسف عثمانی بلگرامی، بلگرام کے قاضی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ قاضی محمد سلیم عثمانی بلگرامی (متوفی ۲۸ محرم ۱۱۱۴ھ/ ۱۳ جون ۱۷۰۲ء) کے بھتیجے تھے۔ قاضی محمد سلیم بلگرام کے منصب قضا پر متعین تھے، لیکن انھوں نے یہ منصب ترک کر کے اپنے بھتیجے قاضی محمد حافظ عثمانی کو اس پر فائز کر دیا تھا۔

قاضی محمد حافظ عثمانی نے عمر کے ابتدائی دور میں قرآن مجید حفظ کیا، بعد میں جوانی کی منزل میں داخل

❶ مشاہیر جون پور، ص ۸۸۔

❷ مولانا محمد جمیل صدیقی جون پوری کے حالات کے لیے یہ کتابیں بھی ملاحظہ ہوں۔ نزہتہ الخواطر، ج ۶ ص ۲۹۴، ۲۹۵۔ تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۴۱، ۴۲، ۷۴۔ نیز دیکھیے برصغیر میں علم فقہ ص ۲۸۲ تا ۲۸۶۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوئے تو کسب علم کی طرف عنان توجہ ملتفت کی۔ اس کے لیے عازم مانک پور ہوئے اور ملا محمود سے مختصرات کی تحصیل کی۔ پھر جائس کا قصد کیا اور معقول و منقول کی کتابیں شیخ غلام مصطفیٰ بن محمد اشرفی جائسی سے پڑھیں۔ بعد ازاں بلگرام واپس آئے اور اپنے چچا قاضی محمد سلیم عثمانی بلگرامی کی جگہ قاضی مقرر کیے گئے۔

قاضی محمد حافظ بلگرامی اپنے دور کے معروف عالم اور جلیل القدر فقیہ تھے۔ معقولات و منقولات کے ماہر تھے۔ شگفتہ مزاج، عمدہ خصال، بلند اخلاق اور پیکر جود و سخا تھے۔ ہمیشہ درس و تدریس میں مصروف رہتے۔ بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ بلگرام میں انتہائی عزت و تکریم کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ چھوٹے بڑے سب ان کی تعظیم بجا لانے اور سلام کرنے میں سبقت کرتے۔ خط نسخ اور خط نستعلیق میں مہارت رکھتے تھے۔ فرائض قضا انجام دینے میں کمال درجے کے دیانت دار تھے۔

قاضی محمد حافظ عثمانی بلگرامی نے ۲۲ محرم ۱۱۲۳ھ/ یکم مارچ ۱۷۱۱ء کو موہان میں وفات پائی جو اعمال لکھنو میں ایک مشہور شہر ہے۔ وہاں سے ان کی میت بلگرام لائی گئی اور ۲۷ محرم ۱۱۲۳ھ/ ۶ مارچ ۱۷۱۱ء کو بلگرام میں دفن کیے گئے ❶۔

۲۱۔ مولانا محمد حسین شافعی گجراتی

مولانا محمد حسین بن محمد علی بن ناخدا حمزہ گجراتی، جید عالم اور اپنے دور کے عظیم فقیہ تھے۔ مسلکاً شافعی تھے۔ خط بہت عمدہ تھا۔ سید عبدالحی حسنی لکھنوی لکھتے ہیں کہ انھوں نے مولانا محمد حسین گجراتی کے ہاتھ کی نہایت خوب صورت خط میں لکھی ہوئی کتاب ''المنہاج'' دیکھی جو امام نووی کی تصنیف ہے اور علم فقہ میں ہے۔ اس کی کتابت سے وہ ۲۰ جمادی الاخریٰ ۱۰۵۸ھ/ ۲ جولائی ۱۶۴۸ء کو فارغ ہوئے۔ اس وقت وہ مدرسہ نواب محمد غیاث خاں شہر ''خجستہ بنیاد'' میں مقیم تھے۔ یہ محمد شاہ غازی کے اٹھائیسویں سال جلوس کا واقعہ ہے ❷۔

۲۲۔ سید محمد حکم بریلوی

سید محمد حکم بن سید محمد بن سید علم اللہ حسنی بریلوی، حضرت سید احمد بریلوی رحمہ اللہ کے اسلاف میں سے تھے۔ صوبہ یوپی کے شہر رائے بریلی میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ اپنے والد گرامی سید محمد بریلوی (متوفی ۲۴ ربیع الثانی ۱۱۵۶ھ/ ۶ جون ۱۷۴۳ء) سے جو ایک عارف باللہ بزرگ تھے، فیض حاصل کیا اور طویل مدت تک ان سے منسلک رہے۔ پھر مختلف مقامات کے متعدد بلند مرتبہ اہل علم سے استفاضہ کیا، جن میں مندرجہ

❶ مآثر الکرام ص ۱۱۹ تا ۱۲۱۔ تقصار جیود الاحرار، ص ۲۱۹، ۲۲۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۲۹۵، ۲۹۶۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۲۹۹۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ذیل حضرات شامل ہیں:

شیخ سعدی بخاری جو اپنے وقت کے اکابر رجال میں سے تھے۔

شیخ عبدالاحد سرہندی (متوفی ۲۷ ذی الحجہ ۱۱۲۷ھ/۱۳ دسمبر ۱۷۱۵ء) جو شیخ محمد سعید سرہندی کے بیٹے اور حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے اور اپنے عصر کے ممتاز عالم اور محدث تھے۔

شیخ عبدالنبی السیام جوراسی نقشبندی جو بارھویں صدی ہجری کے عالم کبیر اور مشہور صوفی تھے۔

شیخ محمد یحییٰ تکمیل علم کے بعد اپنے وطن رائے بریلی واپس آئے اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ علامہ وقت اور وسیع المطالعہ بزرگ تھے۔ کئی عمدہ کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی تصانیف میں یہ کتابیں شامل ہیں:

تفسیر حسنی: یہ قرآن مجید کی فارسی زبان میں تفسیر ہے۔

محکم التنزیل: یہ عربی زبان میں قران مجید کی تفسیر ہے

تلخیص الصراح: یہ لغت کی کتاب ہے۔

ملخص البلاغہ: یہ علم معانی سے متعلق ہے۔

فقہ: میراث اور حساب کے موضوع پر رسائل۔

لآلی النحو: یہ علم نحو سے متعلق ایک رسالہ ہے جو اپنے بھائی سید محمد عدل بریلوی کے لیے تصنیف کیا۔

وفات:

سید محمد حکم بریلوی نے ۲۲ شوال ۱۱۵۰ھ/ یکم فروری ۱۷۳۸ء کو صرف بیالیس (۴۲) برس کی عمر پا کر انتقال کیا[1]۔

۲۳۔ شیخ محمد حیات سندھی

برصغیر میں ارض سندھ کو ہمیشہ یہ فخر حاصل رہا ہے کہ اس میں بے شمار نامور اور جید علما پیدا ہوئے، جنھوں نے مختلف ملکوں اور علاقوں میں علم کی روشنی پھیلائی اور لاتعداد لوگوں کو معارف دینیہ اور علوم اسلامیہ سے روشناس کرایا۔ ان اولوالعزم اور خوش بخت حضرات کی وسیع فہرست میں علامہ محمد حیات سندھی کا اسم گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔

حضرت ممدوح بارھویں صدی ہجری کے عالم کبیر، محدث جلیل اور فقیہ ذی مرتبت تھے۔ علم و فضل کے میدان میں انھوں نے عالم گیر شہرت پائی اور حدیث وفقہ کی تدریس و اشاعت میں بلند درجے پر فائز ہوئے۔

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۹۹، ۳۰۰۔ بحوالہ اعلام الہدیٰ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

والد کا اسم گرامی:

شیخ محمد حیات سندھی کے والد کے اسم گرامی کے بارے میں تذکرہ نگاروں میں اختلاف ہے۔ علامہ المرادی اور سید عبدالحی حسنی لکھنوی نے ان کا نام ابراہیم لکھا ہے۔ ❶ لیکن شیخ کے شاگرد میر سید غلام علی آزاد بلگرامی نے ''فلاریہ'' تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

روزے از اصل ونسب شیخ استفسار کردم، بہ خط شریف برقطعہ کاغذے نوشتہ داد، والد الفقیر محمد حیات السندی المدنی اسمہ ملا فلاریہ ❷........

یعنی ایک روز میں نے شیخ کے وطن اور نسب کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے کاغذ کے ایک پرزے پر تحریر فرما کر مجھے بھیجا کہ اس فقیر محمد حیات سندھی مدنی کے والد کا نام ملا فلاریہ ہے........

حضرت نواب صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ محمد حیات سندھی مدنی کے حالات اپنی تین مشہور کتابوں میں رقم فرمائے ہیں، ان کا مآخذ ماثر الکرام ہے، لہٰذا انھوں نے بھی ان کے والد کا نام ملا فلاریہ رقم فرمایا ہے ❸۔ ممکن ہے والدین نے ان کا نام فلاریہ رکھا ہو، اور ابراہیم انھوں نے بعد میں خود رکھ لیا ہو۔

مولد ومسکن اور ابتدائی حالات:

مولانا محمد حیات سندھی، موضع عادل پور میں پیدا ہوئے جو سرزمین سندھ کے علاقہ بھکر کے اطراف میں ایک گاؤں تھا۔ اس وقت یہ گاؤں ضلع سکھر تعلقہ گھوٹکی سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر بہ جانب جنوب واقع ہے اور اس نواح کی ایک پرانی آبادی ہے۔ معلوم ہوتا ہے، اس گاؤں میں دینی مدرسہ بھی قائم تھا۔ اس کے آثار اب بھی وہاں موجود ہیں ❹۔

شیخ ممدوح سندھ کے ''چاچڑ'' قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ عادل پور کے اطراف وجوانب میں ''چاچڑ'' قبیلے کے لوگوں کی بستیاں اب بھی موجود ہیں۔ حضرت شیخ کی تاریخ پیدائش اور ابتدائی حالات کا پتا نہیں چلتا، اور کسی تذکرہ نگار نے اس سلسلے میں کوئی معلومات بہم نہیں پہنچائیں۔ بہت سے عظیم آدمیوں کے ابتدائی کوائف بعض دفعہ پردۂ اخفا میں رہتے ہیں۔ کسی کو کیا معلوم کہ کون شخص آگے چل کر آسمان علم وفضل کا کس قدر درخشندہ ستارہ بننے والا ہے اور کتنی کثیر تعداد میں اصحاب فضل وکمال اس سے کسب ضیا اور اخذ فیض کریں گے۔ شیخ محمد

---

❶ سلک الدرر، ج ۴، ص ۳۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۰۱۔

❷ مآثر الکرام، ص ۱۴۴۔

❸ ملاحظہ ہو۔ (۱) اتحاف النبلا، ص ۴۰۳، ۴۰۴۔ (۲) ابجد العلوم ص ۸۹۴، (۳) تقصار جیود الاحرار، ص ۲۲۴۔

❹ ماہنامہ ترجمان الحدیث (لاہور) بابت فروری ۱۹۷۹ء ص ۱۲۳ از مولانا ارشاد الحق اثری۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حیات سندھی کا اسم گرامی بھی انہی بلند مرتبت حضرات کی فہرست میں شامل ہے، جن کے حصول علم کی ابتدائی سرگرمیوں کا راز نہیں کھلتا اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ شروع شروع میں انھوں نے کن کن اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، کس کس بزرگ سے کون کون سی کتابیں پڑھیں، اور عالم طفولیت کی منزلیں کہاں طے کیں؟ صرف اتنا سراغ ملتا ہے کہ سن شعور کو پہنچے تو سندھ کے مردم خیز شہر ٹھٹھہ چلے گئے اور وہاں مولانا محمد معین سندھی (متوفی ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء) کے حلقۂ درس میں شریک ہو گئے۔ مولانا محمد معین سندھی اپنے دور کے جلیل القدر عالم اور نامور فاضل تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے شاگرد اور ''دراسات اللبیب'' کے مصنف شہیر تھے۔

ٹھٹھہ اس زمانے میں علما و فضلا کا مرکز تھا اور وہاں ممتاز اہل علم کے حلقہ ہائے درس جاری تھے۔ قیاس کہتا ہے کہ شیخ محمد حیات سندھی نے جو اپنے عہد کے مشہور شائق علم تھے، مولانا محمد معین سندھی کے علاوہ وہاں کے بعض دیگر حضرات علما سے بھی اخذ علم کیا ہوگا، مگر تذکرہ نویس اس سلسلے میں خاموش ہیں۔

اس کے بعد شیخ سندھی نے ارض حجاز کا رخ کیا۔ سب سے پہلے حج بیت اللہ سے بہرہ اندوز ہوئے۔ پھر مدینہ منورہ پہنچے اور وہاں شیخ عبداللہ بن سالم بصری مکی (متوفی ۱۱۳۴ھ/ ۱۷۲۲ء) شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی (متوفی ۱۱۴۵ھ/ ۱۷۳۲ء) شیخ حسن بن علی العجیمی اور دیگر ارباب فضل سے مستفید ہوئے اور سند و اجازہ حاصل کیا۔ اس زمانے میں مدینہ منورہ میں ان کے ہم وطن اور کشور سندھ کے ایک جید عالم شیخ ابوالحسن محمد بن عبدالہادی سندھی مدنی (متوفی ۱۱۳۸ھ) کی مسند درس آراستہ تھی، محمد حیات ان کی خدمت میں گئے اور حدیث کا زیادہ تر درس انہی سے لیا۔ انہی کے فیض صحبت سے علم حدیث اور اس کے متعلقات میں تبحر حاصل کیا۔ شیخ ابوالحسن موصوف یوں تو تمام علوم مروجہ میں درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے، لیکن حدیث نبوی میں بالخصوص مہارت رکھتے تھے اور اس میں نہایت شہرت کے مالک تھے۔

مدینہ منورہ میں سکونت اور استاد کی جانشینی:

شیخ محمد حیات سندھی کے شاگرد میر سید غلام علی آزاد بلگرامی (متوفی ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۰۰ھ/ ۱۸ ستمبر ۱۷۸۶ء) نے استاذ کا ذکر بڑی عقیدت اور محبت کے ساتھ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ممدوح آغاز جوانی ہی میں حجاز تشریف لے گئے تھے، اور مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

شیخ محمد حیات قدس سرہ در عنفوان شباب توفیق زیارت حرمین شریفین یافت و در مدینہ منورہ توطن و تاہل گزید و کمر بہ تحصیل علم بر بست، و باوجود فقدان وجہ معاش استقامت را کار فرمود و نزد علمائے حرمین معظمین، سیما شیخ ابوالحسن سندی نزیل مدینہ منورہ نور اللہ مضجعہ کسب کمالات نمود [1]۔

(شیخ محمد حیات قدہ سرہ کو اوائل شباب ہی میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت کا شرف حاصل ہو گیا

[1] مآثر الکرام، ص ۱۴۵۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھا۔ انھوں نے مدینہ شریف میں سکونت اختیار کر لی تھی، وہیں شادی کر لی تھی اور حصول علم کے لیے کمر بستہ ہو گئے تھے۔ معاش کا کوئی ذریعہ نہ ہونے کے باوجود، نہایت استقامت و استقلال سے رہے اور علمائے حجاز بالخصوص شیخ ابوالحسن سندھی رحمۃ اللہ علیہ مقیم مدینہ منورہ سے کسب کمال کیا۔)

تحصیل علم کے بعد مدینہ منورہ ہی کو اپنا مسکن قرار دے لیا اور استاذ محترم شیخ ابوالحسن سندھی کی وفات کے بعد ان کے جانشین مقرر ہوئے اور ان کی مسند تدریس کو رونق بخشی۔ پھر پورے چوبیس سال رسول ﷺ کی حدیث کا درس دیا اور تمام زندگی اسی بابرکت علم کی خدمت میں گزار دی۔

وجلس مجلسه بعد وفاته اربعا وعشرين سنته [1]۔

(شیخ ابوالحسن سندھی کی مسند درس پر چوبیس سال متمکن رہے۔)

علمی رفعت اور تذکرہ نگاروں کا اظہار عقیدت:

تمام تذکرہ نگار شیخ محمد حیات سندھی کی علمی رفعت، فقہی عظمت، ورع و تقویٰ اور فراوانی علم و فضل کا کھلے لفظوں میں اعتراف کرتے ہیں اور ان کی دقت نظر، وسعت مطالعہ اور بصیرت علمی کو مانتے ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ نے اتحاف النبلا میں علامہ محمد فاخر زائر الہ آبادی کی ایک فارسی نظم درج کی ہے جو انھوں نے شیخ محمد حیات سندھی کی تعریف میں کہی۔ جی چاہتا ہے، وہ نظم یہاں بھی نقل کر دی جائے، تاکہ شیخ کے اوصاف گوناگوں کا اندازہ ہو سکے۔

علامہ محمد فاخر زائر الہ آبادی کو شیخ محمد حیات سندھی کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔ وہ قابل احترام استاد کے بارے میں کہتے ہیں۔

باد بر روئے صفحۂ دوراں — محفل آرائے حلقۂ انساں
شیخ الاسلام عصر علامہ — درفنونِ حدیث فہامہ
موشگاف دقائق ایماں — رازدان حقائق ایماں
رُستہ از حبس ربقۂ تقلید — بستہ بر اجتہاد رائے مزید
درس فرمائے مسجد نبوی — بطریق رشیق مصطفوی
آں محمد حیات بخت بلند — بحدیث نبی قوی پیوند
متع اللہ زمرۃ الاعیان — بافاداتہ الی الازمان!
سرمن خاکپائی او بادا — جان من دررضائی او بادا [2]

[1] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۰۱۔

[2] اتحاف النبلا ص ۴۰۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شیخ سندھی موصوف کے ایک اور تلمیذ رشید سید غلام علی آزاد بلگرامی اپنی مشہور فارسی تصنیف مآثر الکرام میں استاذ مکرم کا تذکرہ ان پُرعظمت الفاظ سے شروع کرتے ہیں:

از علمائے ربانیین وعظمائے محدثین است ❶۔

(شیخ محمد حیات سندھی کا شمار علمائے ربانی اور عظیم القدر محدثین کی جماعت میں ہوتا ہے۔)

اپنی ایک عربی تصنیف سبحۃ المرجان میں آزاد بلگرامی ان کے بارے میں رقم فرماتے ہیں:

هو من العلماء الربانيين وعظماء المحدثين، هون العلم بالعمل وزان الحسن بالحلل ❷۔

(وہ عالم ربانی اور عظیم الشان محدث تھے، ان کا علم ہم آہنگ عمل تھا۔)

آزاد مزید لکھتے ہیں:

وشد حزامه على درس الحديث المحمدى وافنٰى عمره فى خدمة الكلام الاحمدى، وكان يعظ الناس قبل صلاة الصبح بالمسجد المعلى ويقتحم عليه جم غفير من اهل السعادة فى ذالك الوقت المصفٰى وانتفع به خلق كثير من العرب والعجم وارتوى بمنهله عطاش هيم من اصحاب الهمم واقبل عليه قطان الحرمين و مصر والشام والروم والهند بالاعتقاد والانقياد يلتمسون من بركاته ويستمدونه من فيوضاته وفتح الله عليه بمواهب سنية حتى عاش فى عيشة مرضية ❸۔

(شیخ محمد حیات سندھی) درس حدیث کے لیے کمربستہ ہو گئے اور ارشادات پیغمبر ﷺ کی خدمت میں عمر صرف کر دی۔ نماز فجر سے پہلے مسجد نبوی میں وعظ فرماتے اور اس بہترین وقت میں سعادت مند لوگ ایک ہجوم کی شکل میں ان کے ارشادات سننے کے لیے آتے اور عرب وعجم کے باشندے وسیع تعداد میں ان سے مستفید ہوتے۔ اس طرح ان کے چشمۂ صافی سے تشنگان فیض کی ایک بڑی جماعت سیراب ہوئی اور بلند ہمت حضرات نے ان سے استفادہ کیا۔ مکہ، مدینہ، مصر، شام، روم اور ہندوستان کے مختلف گوشوں سے انتہائی عقیدت و نیاز مندی کے جذبات کے ساتھ لوگ ان کی خدمت میں آتے، ان کی برکات علوم سے متمتع ہوتے اور فیوض گوناگوں سے اپنا دامن طلب بھرتے۔ اللہ تعالیٰ نے

❶ مآثر الکرام ص ۱۴۴۔

❷ سبحۃ المرجان ص ۹۵۔

❸ ایضاً ص ۹۵، ۹۶۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس جلیل القدر عالم دین پر اپنے انعامات بوقلموں کے دروازے کھول دیے اور اس عظیم شخصیت نے رضائے الٰہی کے سائے میں زندگی بسر کی۔)

میر شیر علی قانع (متوفی ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۹ء) نے تحفۃ الکرام میں شیخ محمد حیات سندھی کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے، ان کا ترجمہ یہ ہے۔

مخدوم محمد حیات سندھی کا مدینہ منورہ میں ایک مدرسہ تھا اور اس سرزمین میں وہ مقتدر عالم اور ممتاز فاضل شمار ہوتے تھے [1]۔

نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ نے اپنی تصانیف میں خاصی تفصیل سے ان کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کی مشہور تصنیف ''تقصار جیود الاحرار'' کے چند الفاظ ملاحظہ ہوں:

شیخ محمد حیات سندھی محدث، مجتہد مدنی از علمائے ربانیین وعظمائے محدثین است [2]۔

(یعنی شیخ محمد حیات سندھی محدث، مجتہد مدنی کا اسم گرامی علمائے ربانی اور عظیم اصحاب حدیث کی فہرست میں شامل ہے۔)

شیخ عبدالقادر کوکبانی، جنھیں عرصۂ دراز تک شیخ محمد حیات سندھی کی مجالس علمی اور حلقۂ درس میں بیٹھنے کا شرف حاصل رہا، لکھتے ہیں:

میں ایک طویل مدت تک ان کی خدمت میں رہا، لیکن کبھی نہیں دیکھا کہ انھوں نے کوئی مباح بات بھی منہ سے نکالی ہو [3]۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ شیخ عام گفتگو میں کتنے محتاط تھے، جو بات زبان سے نکالتے، اسے پہلے احتیاط کی ترازو میں اچھی طرح تول لیتے۔ واقعہ یہ ہے کہ اصحاب حدیث اور علمائے ربانیین کا ہمیشہ یہی شیوہ رہا ہے۔ وہ امور مباح سے بھی دامن کشاں رہتے ہیں، نہ زبان کو غیر شرعی بات سے ملوث کرتے ہیں، نہ نوک قلم کو۔!

مولوی رحمان علی تذکرہ علمائے ہند میں ان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

شیخ محمد حیات سندھی از علمائے ربانیین وعظمائے محدثین عالم باعمل بود، نام پدرش ملا فلاریہ از قبیلۂ چاچڑ ساکن اطراف عادل پور محروسہ ملک سندھ، شیخ محمد حیات از وطن خود بحرمین شریفین در عنفوان شباب رفتہ مناسک بیت حرام دریافت و بہ مدینہ طیبہ رخت اقامت انداخت، وسوائے توکل اسباب معیشت ذخیرہ نہ ساخت وہماں حالت موجودہ بہ تحصیل علوم پرداخت وبازشاگردی مولانا ابوالحسن سندھی مقیم مدینہ سکینہ برداشت وعلم علوم درسیہ بمیامن او برافراخت، واجازت حدیث از مولانا عبداللہ بن سالم بصری یافت وتمام سرمایۂ عمر خود

---

[1] تحفۃ الکرام، ص ۱۲۷۔

[2] تقصار جیود الاحرار، ص ۲۲۴۔

[3] ماہ نامہ ''الرحیم'' (حیدر آباد سندھ) بابت جولائی ۱۹۶۳ء ''سرزمین سندھ میں علم حدیث'' از مخدوم امیر احمد۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بہ درس حدیث نبوی در باخت ❶۔

(شیخ محمد حیات سندھی باعمل عالم دین تھے، ان کا شمار علمائے ربانی اور عظیم القدر محدثین میں ہوتا ہے۔ ان کے والد کا نام ملا فلاریہ تھا۔ چاچڑ قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ حج کی غرض سے عین عالم جوانی میں اپنے وطن سے حرمین شریفین گئے، مناسک حج ادا کیے اور پھر مدینہ منورہ میں اقامت گزین ہو گئے۔ توکل علی اللہ کے سوا کوئی ذریعہ معیشت اور ذخیرۂ مال نہ رکھتے تھے۔ اسی حالت غربت میں تحصیل علم میں مشغول ہو گئے۔ مولانا ابوالحسن سندھی مقیم مدینہ منورہ کی شاگردی اختیار کی اور علوم درسیہ ان سے پڑھے۔ اجازۂ حدیث مولانا عبداللہ بن سالم بصری سے لیا، پھر خود درس حدیث کی مسند آراستہ کی اور تمام عمر اس خدمت میں بسر کر دی۔)

سید عبدالحی حسنی لکھنوی ان کے حالات کا آغاز بڑے پُراحترام الفاظ سے کرتے ہیں۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

الشیخ الامام الکبیر المحدث محمد حیات بن ابراهیم السندی المدنی، احد العلماء المشهورین ❷۔

(شیخ، امام، عالم کبیر، محدث محمد حیات بن ابراہیم سندھی مدنی، شہرۂ آفاق علما میں سے تھے۔)

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی معروف تصنیف ''تذکرہ'' میں شیخ محمد حیات سندھی کا نام نامی بارھویں صدی ہجری کے ان اکابر و مشاہیر علما و فضلا کی فہرست میں درج فرمایا ہے، جو ''بلاد عربیہ و عثمانیہ'' میں خدمات دینیہ انجام دے رہے تھے۔ لکھتے ہیں:

اکثر مشاہیر علم و ارشاد، جیسے شیخ ابراہیم کورانی، محمد بن احمد سفارینی النجدی، سید عبدالقادر کوکبانی، شیخ عمر فاسی تیونسی، شیخ سالم بصری، امیر محمد بن اسماعیل یمانی، سید عبدالخالق زبیدی، علامی خانی صاحب ایقاظ، شیخ محمد حیات سندھی المدنی وغیرہم شاہراہِ عام سے اپنی راہ الگ رکھتے تھے اور حقیقت مستورہ کے شناسا و حق آگاہ تھے ❸۔

ڈاکٹر شیخ محمد اکرام مرحوم اپنی تصنیف ''رود کوثر'' میں شیخ محمد حیات سندھی کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم فرماتے ہیں:

جو علما تکمیل تعلیم کے بعد حجاز میں مقیم ہو گئے تھے، ان میں سندھ کے کئی فاضل تھے، جن میں مولانا محمد حیات سندھی مدنی سب سے ممتاز تھے۔ وہ عادل پور (سندھ) کے قریب پیدا ہوئے۔ عنفوان شباب ہی میں حج کے لیے گئے اور حج کے بعد مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے۔ مولانا ابوالحسن سندھی مدینہ منورہ اور مولانا عبداللہ سالم بصری سے تکمیل تعلیم کی اور اپنے آپ کو درس حدیث کے لیے وقف کر دیا۔ آپ کا شمار اپنے زمانے کے سب سے نامور محدثوں میں ہوتا تھا۔ آپ مسجد نبوی میں صبح کی نماز سے قبل وعظ کہتے اور ایک جم غفیر آپ کے ارشادات سننے کے لیے حاضر ہوتا ❹۔

---

❶ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۸۶۔
❷ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۰۱۔
❸ تذکرہ، ص ۳۹۷۔
❹ رود کوثر، ص ۶۱۵۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تصانیف:

شیخ محمد حیات سندھی جہاں بہت بڑے استاذ حدیث تھے، وہاں متعدد علمی اور تحقیقی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ ان کی تصانیف سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنے دور کے نامور محدث، جلیل القدر فقیہ، عظیم محقق اور عالی دماغ عالم تھے۔ ذیل میں ان کی تصانیف کا تعارف کرایا جاتا ہے:

۱۔ الایقاف علی سبب الاختلاف: یہ ایک رسالہ ہے جو ”تقلید اور عمل بالحدیث“ کے اہم موضوع پر مشتمل ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے یہ صراحت کی ہے کہ صحابہ کرام، تابعین عظام، ائمہ مجتہدین اور ان کے تلامذہ عالی مقام کے درمیان فقہی نوعیت کے اختلافات کیوں کر ابھرے، ان اختلافات کی اصل حقیقت کیا ہے اور کن وجوہ واسباب کی بنا پر بعض مسائل میں وہ مختلف الرائے ہوئے، نیز اس رسالے میں انھوں نے صحابہ کرام کے طریق استدلال، اسلوب استنباط اور تخریج مسائل کی بھی وضاحت کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ ہمیشہ کتاب وسنت ہی کو مدار عمل ٹھہراتے تھے۔ اگر انھیں اپنے قول وعمل کے خلاف کوئی حدیث پہنچ جاتی تو اسی وقت اس سے رجوع فرما لیتے۔

یہ رسالہ اپنے موضوع میں نہایت عمدہ علمی مباحث پر محیط ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ شیخ محمد حیات سندھی تقلید کے قائل نہ تھے، بلکہ براہ راست کتاب وسنت کو بنیاد عمل قرار دیتے تھے، اور اس کی روشنی میں اجتہاد کو صحیح سمجھتے تھے۔

اس مفید رسالے کی طباعت کی طرف سب سے پہلے برصغیر کے مشہور عالم ومحقق حضرت مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم (ولادت ۱۷ محرم ۱۲۵۶ھ وفات ۶ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۸ھ/ ۲۹ جنوری ۱۹۲۰ء) نے عنان توجہ منعطف کی۔ اس کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا اور ضروری حواشی لکھے۔ پھر اپنے ماہ نامہ ”اشاعت السنۃ“ کی جلد اول (بابت ماہ رجب ۱۲۹۸ھ۔ جنوری ۱۸۸۱ء) ضمیمہ نمبر ۴ص ۲۴ تا ۴۳) میں شائع کیا۔

اس کے بعد یہی ترجمہ زبان کی کچھ اصلاح اور صحت الفاظ کے ساتھ حضرت الاستاذ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کی سعی وکوشش سے ۱۳۷۹ھ (۱۹۵۹ء) میں مکتبہ سلفیہ لاہور کی طرف سے طبع ہوا۔ مکتبہ سلفیہ کی اشاعت میں یہ خوبی ہے کہ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف صاحب نے ابتدا میں شیخ محمد حیات سندھی اور مولانا محمد حسین بٹالوی کے مختصر مگر ضروری حالات بھی تحریر فرما دیے ہیں، جس سے اس کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔

تیسری مرتبہ یہ رسالہ ہندوستان کے ایک فاضل حضرت مولانا عبدالجلیل سامرودی مرحوم کی سعی جمیلہ سے دہلی میں شائع ہوا۔ اس پر سالِ طباعت مرقوم نہیں۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ”رفع الملام عن ائمۃ الاعلام“ کے نام سے ایک رسالہ سپرد قلم کیا تھا، جس میں امام نے تفصیل اور جامعیت سے اس موضوع پر بحث کی ہے۔ ان کے تلمیذ رشید امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی مشہور تصنیف ”اعلام الموقعین“ میں اس اہم موضوع کی عمدہ انداز سے وضاحت کی ہے۔ شیخ محمد حیات

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سندھی نے "الایقاف علی سبب الاختلاف" میں ان دونوں بزرگوں سے استفادہ کیا ہے۔

شیخ محمد حیات سندھی کے ہم عصر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب ''الانصاف فی بیان سبب الاختلاف'' میں اس موضوع پر گفتگو کی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ نہایت عمدگی سے اس کے متعلقہ پہلوؤں کو واضح کیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے المبحث السابع میں بھی اس پر مدلل اور مبرہن بحث فرمائی ہے۔ اہل علم کے لیے اس موضوع سے متعلق ان تمام کتابوں اور بحثوں کا مطالعہ دلچسپی اور اضافہ معلومات کا باعث ہوگا۔

۲۔ تحفة الانام فی العمل بحدیث النبی علیه الصلوٰة والسلام: حدیث وسنت کو مدار عمل ٹھہرانے کے موضوع سے متعلق یہ رسالہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اختصار کے باوجود اس میں نہایت بنیادی باتیں معرض بیان میں آگئی ہیں۔ اس کی عمدگی کا ثبوت اس بات سے مل سکتا ہے کہ علامہ صالح فلانی کی معروف کتاب "ایقاظ همم اولی الابصار" کے بہت سے مندرجات اسی کتاب سے ماخوذ ہیں۔ حضرت نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ نے بھی "الجنة فی الاسوة الحسنته بالسنة" میں اس رسالے سے استفادہ کیا ہے۔ اسی طرح صاحب سبل السلام علامہ امیر محمد بن اسماعیل یمانی کی تصنیف "ارشاد النقاد الی تیسیر الاجتهاد" کے بہت سے مشمولات اسی رسالے سے مقتبس ہیں۔ یہ رسالہ اس درجہ اہمیت کا حامل ہے کہ شیخ محمد حیات سندھی کے شاگرد رشید حضرت مرزا مظہر جان جاناں (متوفی ۱۰ محرم ۱۱۹۵ھ/ ۶ جنوری ۱۷۸۱ء) نے اپنے ایک فارسی مکتوب میں اس کی تلخیص کر دی ہے [1]۔

تحفۃ الانام میں شیخ محمد حیات سندھی نے یہ ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہر حال میں ضروری ہے۔ آنحضرت ﷺ کے علاوہ کسی کی اتباع کرنا اور اس کے قول وعمل کو صحیح قرار دینا گمراہی اور جہالت کی دلیل ہے۔ پھر اس میں اس اہم مسئلے پر بحث کی گئی ہے کہ بعض لوگ کسی ایک خاص امام کی تقلید کرتے ہیں اور اسی کے قول کو صحیح سمجھتے ہیں جو ان کے امام سے منقول ہو، وہ اپنے امام کے مقابلے میں بسا اوقات رسول اللہ ﷺ کی حدیث مبارکہ کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں، قول صحابہ کو بھی ترک کر دیتے ہیں اور دیگر ائمہ دین کے اقوال وارشادات کی بھی پروا نہیں کرتے۔ شیخ محمد حیات سندھی نے اس قسم کے حضرات کی شدید مخالفت کی ہے اور اس رسالے میں ان کے اس طرز عمل کو خلاف شرع قرار دیا ہے۔

یہ رسالہ اگرچہ مختصر ہے مگر اپنے موضوع میں بالکل واضح ہے۔ مکتبہ محمدیہ بمبئی میں یہ رسالہ موجود ہے۔ بمبئی کے ایک عالم دین حضرت مولانا عبدالجلیل سامرودی مرحوم کی کوشش سے چند سال قبل مکتبہ سلفیہ دہلی سے یہ رسالہ طبع ہو چکا ہے۔ سال طباعت مرقوم نہیں۔

۳۔ فتح الغفور فی وضع الایدی فی الصلوٰة علی الصدور: نماز میں ہاتھ کہاں

[1] ملاحظہ ہو کلمات طیبات ص ۲۸ تا ۳۰۔ نیز دیکھیے فقہائے ہند ص ۱۳۰ تا ۱۴۱۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باندھنے چاہئیں؟ فقہائے کرام اس مسئلے میں مختلف آرا رکھتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام سفیان ثوری رحمہم اللہ ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ امام احمد کا بھی ایک قول یہی ہے۔ لیکن امام شافعی (علیٰ قول المشہور) اور امام مالک سینے کے نیچے اور ناف کے اوپر ہاتھ باندھنے کو مستحب قرار دیتے ہیں۔ امام احمد کا بھی ایک قول یہی ہے۔ امام احمد سے ایک تیسرا قول یہ بھی منقول ہے کہ ناف کے نیچے یا اوپر سینے کے نیچے جہاں چاہے باندھ سکتا ہے۔ امام شافعی سے ایک قول سینے پر ہاتھ باندھنے کا بھی منقول ہے۔ مولانا محمد حیات سندھی بھی سینے پر ہاتھ باندھنے کے حق میں ہیں، اور ان کا یہ رسالہ اسی کی تائید میں ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے دعوے کو احادیث و آثار سے بادلیل ثابت کیا ہے۔ اور ''تحت السرۃ'' (ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے) والی حدیث کے بارے میں کھل کر بحث کی ہے۔ بحث ختم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وبما تقدم ان الوضع الایدی علی الصدور فی الصلوٰۃ اصلا اصیلا ودلیلا جلیلا فلا ینبغی لاھل الایمان الاستنکاف عنه❶۔

یعنی گزشتہ بحث کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنا بنیادی اور صحیح ترین دلائل سے ثابت ہے، پس اہل ایمان کو اس سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔

رسالہ فتح الغفور سب سے پہلے بہت عرصہ مع ترجمے کے طبع ہوا تھا۔ اس کے بعد مولانا عبدالتواب ملتانی رحمہ اللہ کی کوشش سے ۱۳۶۱ھ/۱۹۴۲ء میں ملتان سے شائع ہوا۔ لیکن اب نایاب ہے۔

۴۔ تحفة المحبين في شرح الاربعين النوويه : یہ اربعین نووی کی شرح ہے۔ ڈاکٹر زبید احمد لکھتے ہیں کہ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ بانکی پور (ہندوستان) کے کتب خانے میں موجود ہے❷۔

مولانا ارشاد الحق اثری (ادارہ علوم اثریہ فیصل آباد) ایک مضمون ''علامہ محمد حیات سندھی'' میں تحریر کرتے ہیں کہ سید محب اللہ شاہ پیر آف جھنڈا کے مکتبہ علمیہ عالیہ میں بھی شیخ محمد حیات سندھی کی اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے، جو ۳۵ ورق پر مشتمل ہے اور شعبان ۱۳۰۲ھ کا مکتوبہ ہے❸۔

شیخ محمد حیات سندھی شیدائی سنت تھے اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی سے انھیں بے پناہ قلبی محبت تھی۔ ''تحفة المحبين'' کا ہر مقام اس کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔ نبی ﷺ کی حدیث ہے: لا یؤمن احدکم حتی یکون ھواہ تبعاً لما جئت به❹۔

(تم میں کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا، جب تک اس کی خواہش ان امور کے تابع نہ ہو،

❶ فتح الغفور، ص ۸۔

❷ علم حدیث میں پاک و ہند کا حصہ ص ۲۸۶۔

❸ ماہ نامہ ترجمان الحدیث، لاہور، بابت ماہ مارچ ۱۹۷۹ء ص ۳۴۔

❹ مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، فصل ثانی۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جنھیں میں لایا ہوں)

اس حدیث کی شرح میں مولانا محمد حیات سندھی رقم طراز ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے تین درجے ہیں۔ ایک درجہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کے فرامین کو اس طرح حق سمجھے کہ اس کے بغیر صحت ایمان ممکن نہیں، اس قسم کے لوگ کثرت سے موجود ہیں، دوسرا درجہ یہ ہے کہ آپ کے ارشادات کو حق جانتے ہوئے ان کی مخالفت سے بچنے کی کوشش کرے، ایسے لوگوں کی تعداد کم ہے۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ کوئی حرج اور بوجھ محسوس کیے بغیر حضور ﷺ کی اطاعت کی جائے، یہاں تک کہ انسان اپنی تمام خواہشات کو آنحضرت ﷺ کے ارشادات کے تابع کر دے ___ ان اوصاف کے حامل افراد کی تعداد بہت قلیل ہے، اور یہی وہ خوش بخت لوگ ہیں جنھیں محمدی کہنا چاہیے۔

اس کے بعد انتہائی سوز قلب کے ساتھ جو الفاظ تحریر فرمائے ہیں وہ پڑھنے کے قابل ہیں۔ لکھتے ہیں:

هـذا هـوا المحمدى الذى اذا ثبت عنده قول حبيبه وفعله المحكمات انشـرح بهـما صدره واخذ بهما باعظم الرضاء والسرور واختلط ذلك بـقلبه وقالبه فلو اجتمع من بين اقطار الارض على ان يصدوه عن قول محبوبه وفعله لما تركهما ولم يبال بخلاف كائنا من كان۔ اه اين هٰو لآءِ الـمـحمديون فى زماننا هذا، اللّٰهم اجعل سنة حبيبه محمد ﷺ احب الينا من ارواحنا وانفسنا۔

(انھی اوصاف حمیدہ کا حامل وہ محمدی ہے کہ جب اس کے نزدیک اس کے محبوب حقیقی ﷺ کا قول و فعل پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے تو اس کا سینہ کھل جاتا ہے اور بہ درجۂ غایت رضا و رغبت اور کامل مسرت کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہوتا اور اس کی تمام کیفیات اپنے جسم و روح پر طاری کر لیتا ہے۔ اگر ساری دنیا کے لوگ بھی اس کو اس کے محبوب ﷺ کے قول و عمل سے روکنے کے لیے جمع ہو جائیں تو بھی وہ اسے نہیں چھوڑتا اور اس سلسلے میں کسی کی مخالفت کی پروا نہیں کرتا۔ آہ! یہ محمدی گروہ ہمارے اس زمانے میں کہاں ہے؟ اے اللہ! اپنے حبیب حضرت محمد ﷺ کی سنت مطہرہ کو ہمارے لیے، ہمارے انفس و ارواح سے عزیز تر کر دے۔)

یہ پورا رسالہ اسی طرح کے احوال و کوائف پر محیط ہے۔

۵۔ شرح الترغيب والترهيب لمنذرى: یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے اور اسماعیل پاشا نے اسے شیخ محمد حیات سندھی کی تصانیف میں شمار کیا ہے [1]۔

[1] دیکھیے ہدیۃ العارفین ج ۲، ص ۳۲۷۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۶۔ مختصر الزواجر عن اقتراف الکبائر: ''الزواجر'' علامہ ابن حجر مکی (متوفی ۹۷۳ھ) کی مشہور تصنیف ہے، جس میں کبیرہ گناہوں کا ذکر ہے۔ تذکیر و ترہیب کے متعلق یہ بہترین کتاب ہے۔ ''الزواجر'' عرصہ ہوا، مصر میں طبع ہوئی تھی، لیکن اب کم یاب ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ اسلامیہ کالج پشاور کی لائبریری میں محفوظ ہے، جو ۹۸۴ھ/۱۵۷۶ء کا مکتوبہ ہے۔ یعنی مصنف کی وفات سے صرف گیارہ سال بعد کا۔ اس پر نامور علمائے کرام کے دستخط ثبت ہیں۔ اسی ''الزواجر'' کا اختصار مذکورہ بالا نام سے شیخ محمد حیات سندھی نے کیا ہے۔ شیخ ممدوح کی اس کتاب کا ذکر اسماعیل پاشا نے بھی کیا ہے ❶۔

۷۔ شرح الحکم العطائیہ: ''الحکم'' شیخ تاج الدین ابوالفضل احمد بن محمد المعروف بہ ابن عطاء اللہ الاسکندرانی الشاذلی المالکی (متوفی ۷۰۹ھ/۱۳۰۹ء) کی مشہور تصنیف ہے۔ تزکیۂ نفس اور اصلاح احوال کے موضوع سے متعلق یہ بہترین کتاب ہے۔ اس کتاب کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں۔ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں اس کی سات شرحوں کا ذکر کیا ہے ❷، جن میں شیخ محمد بن ابراہیم بن عباد کی شرح ''غیث المواہب العلمیہ'' اور شیخ احمد بن محمد الحسنی کی "ایقاظ الھمم" چھپ چکی ہیں۔ ''شرح الحکم العطائیہ'' کے نام سے ''الحکم'' کی شرح شیخ محمد حیات سندھی نے لکھی ہے۔ اس شرح کا ذکر اسماعیل پاشا نے کیا ہے ❸۔

۸۔ مقدمہ فی العقائد: خیر الدین زرکلی نے جو شیخ محمد حیات سندھی کا ''عالم بالحدیث'' کے الفاظ سے تذکرہ کرتے ہیں، اپنی تصنیف ''الاعلام'' میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے ❹۔

۹۔ شرح اربعین للنووی: شرح الحکم العطائیہ کے ذیل میں شیخ محمد حیات سندھی کی شرح اربعین نووی کا ذکر ایضاح المکنون میں اسماعیل پاشا نے بھی کیا ہے اور لکھا ہے۔ ''محمد حیات السندی شارح الاربعین النوویہ" نیز ڈاکٹر محمد اسحاق نے بھی اس کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ ملا علی قاری کی اربعون حدیثا فی جوامع الکلم کی شرح ہے ❺۔

۱۰۔ ارشاد النقاد الی تیسیر الاجتھاد: عمر رضا کحالہ نے معجم المؤلفین میں اس کا تذکرہ کیا ہے اور شیخ محمد حیات سندھی کو محدث، فقیہ، اصولی، مفسر اور صوفی کے پر عظمت الفاظ سے یاد کیا ہے ❻۔ مگر مولانا ارشاد

---

❶ ہدیۃ العارفین ج ۲ ص ۳۲۷۔

❷ کشف الظنون ج ۱ ص ۶۷۵، ۶۷۶۔

❸ ایضاح المکنون ج ۱ ص ۴۱۳۔ ہدیۃ العارفین ج ۲ ص ۳۲۷۔

❹ الاعلام ج ۶ ص ۳۴۴۔

❺ ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون ج ۱ ص ۴۱۳۔ نیز ملاحظہ ہو علم حدیث میں پاک و ہند کا حصہ ۲۸۲ (اردو ترجمہ ''کنٹری بیوشن آف انڈیا ٹو دی اسٹڈیز آف حدیث لٹریچر'' از ڈاکٹر محمد اسحاق)

❻ معجم المؤلفین ج ۹ ص ۲۷۵

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الحق اثری اس کتاب کو شیخ محمد حیات سندھی کی تصنیف قرار نہیں دیتے۔ان کے نزدیک عمر رضا کحالہ کا اس کتاب کو شیخ محمد حیات سندھی کی تصنیف کہنا وہم معلوم ہوتا ہے۔یہ رسالہ درحقیقت امیر محمد بن اسماعیل یمانی کی تصنیف ہے جو الرسائل المنیریہ میں مطبوع ہے ❶ ___ لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس نام کی کتاب شیخ محمد حیات سندھی نے بھی لکھی ہو۔

۱۱۔ شرح الحکم الحدادیہ: ہدیۃ العارفین میں اسماعیل پاشا نے شیخ محمد حیات سندھی کی بعض تصانیف کا ذکر کیا ہے، جن میں یہ کتاب بھی شامل ہے ❷۔

۱۲۔ رسالہ فی رد بدعۃ التعزیہ: اس کا ذکر نواب صدیق حسن خاں نے بھی کیا ہے اور سید عبدالحی حسنی لکھنوی نے بھی ❸۔

۱۳۔ رسالہ فی النهی عن عشق المرد والنسوان: نواب صدیق حسن خاں نے اتحاف النبلا میں اور سید عبدالحی حسنی نے نزہۃ الخواطر میں شیخ محمد حیات سندھی کی اس تصنیف کا ذکر کیا ہے۔نواب صاحب کے کتب خانے میں اس کا قلمی نسخہ موجود تھا۔یہ اور شیخ کے بعض دیگر رسائل وہ مکہ معظّمہ سے لائے تھے۔چنانچہ اتحاف النبلا میں لکھتے ہیں۔''وبعض ایں رسائل را فقیر از مکہ معظّمہ آوردہ''۔

نواب صاحب نے اس کے چند اقتباسات بھی اتحاف النبلا میں درج کیے ہیں ❹۔

لفظ مرد، لفظ امرد کی جمع ہے۔لغت میں امرد کی تعریف یہ ہے: الشاب طرشاربه ولم تنبت لحيته۔
یعنی وہ جوان جس کی مونچھیں پھوٹ رہی ہوں اور داڑھی نہ آگی ہو۔

اس رسالے میں شیخ نے نوعمر لڑکوں اور غیر محرم عورتوں سے عشق و محبت قائم کرنے کی سخت مذمت کی ہے اور تفصیل سے لکھا ہے کہ یہ قطعی طور پر شریعت کے خلاف ہے۔جو صوفیا ''عشق'' کے نام سے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں، قرآن وحدیث کی روشنی میں شیخ سندھی نے ان کی سخت تردید کی ہے۔یہ رسالہ ان ''صوفیا'' کے رد میں ہے، جنھوں نے ''عشق'' کی اصطلاح قائم کر کے عوام کو غلط راہ پر لگا دیا ہے۔مندرجات اور دلائل کے اعتبار سے یہ رسالہ نہایت عمدہ ہے۔

۱۴۔ اعفاء اللحیۃ: یہ رسالہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، داڑھی بڑھانے کے مسئلے پر ہے۔اس کا خطی نسخہ حضرت پیر محب اللہ راشدی کے کتب خانے میں موجود ہے۔چھوٹے سائز کے دس صفحات پر مشتمل ہے ❺۔

---

❶ ماہنامہ ''ترجمان الحدیث'' (لاہور-بابت مارچ ۱۹۷۹ء ص ۳۷)

❷ ہدیۃ العارفین ج ۲ ص ۳۲۷۔

❸ اتحاف النبلا ص ۴۰۴ - نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۰۲۔

❹ اتحاف النبلا ص ۴۰۴۔

❺ ترجمان الحدیث، لاہور-بابت ماہ مارچ ۱۹۷۹ء ص ۳۸

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس رسالے کا سبب تالیف بیان کرتے ہوئے شیخ محمد حیات سندھی نے لکھا ہے کہ انھوں نے ایک رسالے میں پڑھا کہ داڑھی بڑھانا مستحب ہے، یہ مسئلہ سنت تعبدی کے ذیل میں نہیں آتا بلکہ اس کا تعلق سنت عادیہ سے ہے، جو شخص ایک ''قبضہ'' سے کم داڑھی رکھتا ہے وہ تارک مستحب ہے۔ چنانچہ بعض دوستوں نے رفع وہم کے لیے ان سے سوال کیا کہ اس مسئلے کے بارے میں قول فیصل کیا ہے؟ اس کے جواب میں انھوں نے یہ رسالہ تحریر کیا۔

ان الفاظ کے بعد شیخ نے احادیث و آثار کی روشنی میں اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ وہ اس بات کی سختی سے تردید کرتے ہیں کہ داڑھی بڑھانا سنت عادیہ سے ہے۔ ان کے نزدیک داڑھی بڑھانا وجوب کے درجے میں داخل ہے۔ چنانچہ اس مسئلے میں مفصل بحث کے بعد وہ جس نتیجے پر پہنچے ہیں رسالے کے آخر میں اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> وهذا كله تبين ان اصل الاعفاء واجب كما اوضحنا، وتاركه تارك واجب، يستحق مايستحقه تارك الواجب، ولو تنزل عن الوجوب فلا اقل من انه سنة مؤكدة، يستحق تاركه مايستحق تارك السنة المؤكدة، وليس بمندوب ولا من سنن كما زعم صاحب الرسالة بل هو امر تعبدي شرعه الله لانبيائه وحثهم عليه۔
>
> یعنی جیسا کہ ہم نے واضح کر دیا ہے، اس بحث سے ثابت ہو گیا کہ داڑھی بڑھانا واجب ہے، اور اس کا تارک اسی سزا کا مستحق ہے جو تارک وجوب کے لیے مقرر ہے، اور اگر اسے وجوب سے کم درجہ دیا جائے تو بھی بہر حال سنت مؤکدہ سے کم نہیں، اور اس کا تارک اسی سزا کا مستحق ہے جو سنت مؤکدہ کے تارک کے لیے مقرر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ نہ تو مستحب ہے اور نہ عادی سنت کے ذیل میں آتا ہے، جیسا کہ مصنف رسالہ کا خیال ہے بلکہ یہ تعبدی امر ہے، جس پر عمل کرنے کا اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام کو حکم دیا ہے۔

اخلاق و عادات اور تدین و تقویٰ:

شیخ محمد حیات سندھی کا شمار بارھویں صدی ہجری کے جلیل القدر فضلا اور رفیع المرتبت ہندی علما میں ہوتا ہے، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول اور دیگر علوم مروجہ پر انھیں کامل عبور حاصل تھا اور مسائل شرعیہ میں گہری اور عمیق نظر رکھتے تھے۔ درس و تدریس میں منفرد اور وعظ و تبلیغ میں اپنی مثال آپ تھے۔ ورع و تقویٰ کے اونچے مرتبے پر فائز تھے۔ زہد و عبادت میں اپنے عصر کے فقید المثال عالم تھے۔ پابندیٔ شریعت میں بے نظیر تھے۔ تنہائی پسند اور خلوت نشین تھے۔ مگر قلب کی دنیا بے حد آباد اور فکر کا جہاں پُر ہجوم تھا۔ ان کے نہاں خانۂ دل میں جو عالم بس رہا تھا، اسی کی رونق میں مگن رہتے۔ گفتگو میں نہایت محتاط اور اخلاق حسنہ کا دل آویز پیکر تھے۔ ان کا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معمول تھا کہ ہمیشہ پہلی صف میں شریک ہو کر باجماعت نماز ادا کرتے۔ فرائض تدریس باقاعدگی سے انجام دیتے اور طلبا سے بہ درجہ غایت شفقت سے پیش آتے۔ ہر چھوٹے بڑے معاملے میں احکام شرع کو پیش نگاہ رکھتے اور امور دین کے سلسلے میں کسی کی پروانہ کرتے۔ متحمل مزاج اور عمدہ خصائل کے حامل تھے۔ قول وعمل میں کتاب وسنت کے حسین سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ تبلیغ اسلام کا اس درجے اہتمام فرماتے کہ مسجد نبوی میں نماز فجر سے قبل وعظ کہتے۔ ان کی مجلس وعظ میں بے شمار لوگ شامل ہوتے اور وہ ان کے انداز کلام اور تفہیم مسائل کے اسلوب سے بے حد متاثر ہوتے۔ اس عظیم الشان عالم دین کو یہ شرف حاصل ہے کہ اپنے استاذ گرامی شیخ ابوالحسن سندھی کبیر کی وفات کے بعد ان کی مسند درس پر پورے چوبیس برس تک مدینہ منورہ میں تدریس حدیث کی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس طویل مدت میں کسی کے سامنے دست طلب دراز نہیں کیا۔ ہر حال میں اللہ پر توکل رکھا۔ ان کا ذریعۂ معاش، اور وسیلہ آمدنی صرف توکل علی اللہ تھا۔

شیخ محمد حیات سندھی اپنے بوقلموں اوصافِ فکری اور گوناگوں کمالات علمی کی بنا پر تمام معاصر علما اور عرب ممالک کے اصحاب فضل میں بے حد عزت وتکریم کے مالک تھے۔ دور دراز کی مسافت طے کر کے اور دشوار گزار منزلیں عبور کر کے ارباب کمال اور طلبائے علم ان کی خدمت میں آتے اور استفادہ کرتے۔ مستفدین و مسترشدین کے لیے ہر آن ان کے دروازے کھلے رہتے۔ حجاز کی ارض مقدس میں انھیں بے پناہ اثر و رسوخ حاصل تھا اور لوگ ان کی تحقیق وکاوش کی وسعتوں سے حد درجہ متاثر تھے۔

صحت عقیدہ کا بہ درجہ غایت اہتمام:

شیخ محمد حیات سندھی کے حالات میں یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ عقیدے کے بارے میں نہایت سخت تھے۔ یا نرم الفاظ میں یوں کہیے کہ بہت ہی محتاط تھے۔ وہ اس بات کا بہ درجہ غایت اہتمام فرماتے کہ کوئی امر خلافِ سنت نہ ہو، جس سے عقیدے کے مجروح ہونے کا خطرہ پیدا ہو جائے۔

اس سلسلے کا ایک واقعہ ان کے تلمیذ رشید میر سید غلام علی آزاد بلگرامی نے بیان کیا ہے، جو خود انہی کی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ اس واقعہ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ''غلام علی'' وغیرہ قسم کے ناموں کو بھی خلافِ شرع قرار دیتے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اس قسم کی اضافت صرف اللہ کی طرف ہونی چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے خود اپنے اس شاگرد کے نام ''غلام علی'' کو محل اعتراض ٹھہرایا۔

اس ضمن میں آزاد کو استاد نے جو خط لکھا اور پھر انھوں نے اس کی وضاحت میں جو جواب تحریر کیا، وہ خود آزاد نے اپنی دو کتابوں، مآثر الکرام (فارسی) اور سبحۃ المرجان (عربی) میں نقل کیا ہے۔ اسے انہی کے الفاظ میں پڑھنا چاہیے۔ آزاد لکھتے ہیں:

شیخ قدس سرہ مکتوبے بنام فقیر نمود و اسم فقیر غلام علی بے اضافت غلام تحریر فرمود، از جہت

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آں کہ در حدیث شریف آمدہ کہ ہمہ کس عباد اللہ اند، اطلاق عبودیت نسبت بہ مخلوق نباید کرد۔ فقیر در جواب نامہ نوشت بایں مضمون کہ مسلم روایت می کند۔ عن ابی هريرة رضی الله عنه ان رسول الله ﷺ قال لا يقولن احدكم عبدی وامتی، كلكم عبيدالله وكل نسائكم اماء الله، ولكن ليقل غلامی وجاريتی وفتای وفتاتی ❶۔

و بخاری روایت می کند لا يقل احدكم عبدی وامتی وليقل فتای وفتاتی وغلامی ❷۔ نیز قلمی ساختم کہ اگر واضع اسم غلام را بہ معنی عبد ارادہ کردہ باشد و دیگرے معنی فرزند ارادہ کردہ تلفظ نماید اور امی رسد کہ لکلی امرء ما نوی شیخ قدس سرہ بعد وصول خط داد انصاف داد و بعد ازیں اسم فقیر غلام علی تحریر فرمود ❸۔

یعنی ایک مکتوب میں شیخ محترم نے میرا نام ''غلام علی'' لکھنے کے بجائے صرف ''غلام'' تحریر فرمایا اور لکھا کہ حدیث شریف میں ہے کہ تم سب اللہ کے بندے ہو، لہٰذا عبدیت کی نسبت مخلوق کی طرف نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے جواب میں اس فقیر (غلام علی آزاد) نے لکھا کہ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کسی کو ''عبدی'' (میرا بندہ) اور ''امتی'' (میری لونڈی) نہ کہو، کیونکہ تم سب اللہ کے بندے ہو اور تمھاری سب عورتیں اللہ کی لونڈیاں ہیں۔ بلکہ ''غلامی وجاریتی'' یا ''فتای وفتاتی'' کہنا چاہیے۔ اسی طرح صحیح بخاری میں ہے کہ تم میں سے کوئی شخص کسی کو ''عبدی وامتی'' نہ کہے بلکہ ''فتای وفتاتی وغلامی'' کہے۔ میں نے یہ بھی لکھا کہ اگر نام رکھنے والے نے ''غلام'' کے معنی ''عبد'' کے مراد لیے ہیں تو یہ ممنوع ہے اور اگر فرزند کے معنی لیے ہیں تو اس حکم کا

---

❶ اس حدیث کے لیے دیکھیے صحیح مسلم جلد ۲ کتاب الالفاظ من الادب وغيرها باب حكم اطلاق لفظة العبد والامة والمولىٰ والسيد ص ۲۳۸۔

❷ صحیح بخاری کی یہ روایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جو وہ رسول اللہ ﷺ سے ان الفاظ میں روایت کرتے ہیں۔ انه قال لا يقل احدكم اطعم ربك، وضئ ربك، اسق ربك، وليقل سيدی ومولای ولا يقل احدكم عبدی وامتی وليقل فتای وفتاتی وغلامی (صحيح بخاری ج ۱ كتاب العتق باب كراهة التطاول على الرقيق وقوله عبدی وامتی ص ۳۴۶)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ اپنے مالک کو کھانا کھلاؤ، اپنے مالک کو وضو کراؤ، اپنے مالک کو پانی پلاؤ، بلکہ سیدی ومولائی کہے۔ میرا بندہ یا میری لونڈی بھی نہ کہے۔ بلکہ فتای، فتاتی اور غلامی کہے۔

❸ مآثر الکرام ص ۱۴۵، ۱۴۶۔ یہ واقعہ آزاد نے اپنی عربی تصنیف سبحۃ المرجان میں بھی بیان کیا ہے۔ دیکھیے صفحہ ۹۶۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اطلاق اس پر نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہر شخص کی بات کا دارو مدار اس کی نیت پر ہے۔ شیخ کو یہ خط ملا تو میری تحسین فرمائی اور اس کے بعد ہمیشہ میرا نام غلام علی لکھتے رہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ عقیدے کے بارے میں شیخ نہایت محتاط تھے اور اس کی صحت کا پورا خیال رکھتے تھے۔ لیکن کتاب وسنت کے دلائل سے اگر کوئی بات ان کے قائم کردہ خیال کے خلاف ثابت ہو جاتی تو اس سے فوراً رجوع فرما لیتے، جیسا کہ اس واقعہ سے ظاہر ہے۔

شیخ محمد حیات سندھی امور بدعت سے نفور اور شائبۂ شرک سے دامن کشاں رہتے تھے۔ اس ضمن کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے، اور وہ یہ ہے کہ جس زمانے میں شیخ محمد بن عبدالوہاب مدینہ منورہ میں شیخ محمد حیات کے حلقۂ درس میں شریک تھے، انھوں نے دیکھا کہ کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ کے حجرۂ مبارک پر کھڑے دعا واستغاثہ میں مشغول ہیں اور کئی قسم کی بدعات کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ادھر سے شیخ محمد حیات بھی تشریف لے آئے۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب انھیں دیکھ کر احترام بجا لائے، استاد کے خیر مقدم کے لیے آگے بڑھے اور سوال کیا کہ ان لوگوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ شیخ نے جواب میں یہ آیت پڑھی:

﴿إِنَّ هَٰؤُلَاءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيهِ وَبَٰطِلٌ مَّا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ﴾ (الاعراف: ۱۳۹)

یعنی یہ لوگ جس (شغل) میں (پھنسے ہوئے) ہیں، وہ برباد ہونے والا ہے اور جو کام یہ کرتے ہیں، سب بے سود ہے۔

شیخ کا مسلک:

نواب صدیق حسن خاں اور مولانا محمد فاخر زائر الٰہ آبادی نے شیخ محمد حیات سندھی کے فقہی مسلک کی بھی وضاحت کی ہے۔ مولانا محمد فاخر زائر الٰہ آبادی ان کے شاگرد تھے، استاد کی تعریف میں مولانا زائر نے جو نظم کہی، وہ گزشتہ سطور میں درج کی جا چکی ہے، اس میں انھوں نے صاف لفظوں میں کہا ہے کہ وہ مقلد نہ تھے۔

رُستہ از حبس ربقہ تقلید　　بستہ براجتہاد رائے مزید

یعنی شیخ محمد حیات تقلید شخصی سے آزاد تھے اور اجتہاد کے قائل تھے۔

اسی طرح نواب صدیق حسن خاں اتحاف النبلا میں لکھتے ہیں:

دروقت خود شیخ محمد حیات مرتبۂ اجتہاد داشت، تقلید ہیچکی نمے کرد ❶۔

(شیخ محمد حیات اپنے دور میں مرتبۂ اجتہاد پر فائز تھے۔ کسی کے مقلد نہ تھے۔)

نواب صاحب اپنی ایک اور تصنیف تقصار میں شیخ موصوف کے حالات بیان کرتے ہوئے رقم فرماتے ہیں:

❶ اتحاف النبلا ص ۴۰۴

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تمام عمر درخدمت حدیث شریف صرف ساخت، وتبحر عظیم دریں فن اشرف اندوخت و بمرتبۂ اجتہاد برآمدہ، وقلادۂ تقلید ازگلوفروافگند ❶۔

(شیخ محمد حیات نے تمام عمر حدیث شریف کے علم کی خدمت میں صرف کردی۔ اس پاکیزہ ترین فن میں بے حد تبحر حاصل کیا اور قلادۂ تقلید کو گلے سے اتار کر مرتبۂ اجتہاد کو پہنچے۔)

لیکن اس صراحت کے باوجود بعض علمائے احناف نے شیخ محمد حیات کو فقہی لحاظ سے حنفی مسلک کے اعیان واکابر میں شمار کیا ہے ❷۔ ممکن ہے ابتدا میں ان کا تعلق حنفیت سے رہا ہو، لیکن ان کی تصانیف اس کی تائید نہیں کرتیں۔ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف نے شیخ کی تصنیف "الایقاف علی سبب الاختلاف" کے شروع میں جو مقدمہ تحریر کیا ہے، اس میں وہ ان کے مسلک کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اس دور کے عام حالات کے مطابق ابتداً گو حنفی طریقے پر گامزن ہوں گے۔ لیکن محقق علمائے حدیث وفقہ کے فیض تربیت اور علوم حدیث میں براہ راست ممارست کی وجہ سے بالآخر تحقیق کی راہ پسند کر لی اور تقلید سے دست بردار ہوگئے، جیسا کہ آپ کی تصانیف سے اندازہ ہوسکتا ہے ❸۔"

مولانا عطاء اللہ حنیف کا یہ تجزیہ بالکل قرین صحت ہے۔ عین ممکن ہے ابتدائی دور میں وہ فروع فقہ میں حنفیت کو ترجیح دیتے ہوں، کیوں کہ ان کے عہد میں برصغیر میں زیادہ تر اہل علم فقہی لحاظ سے اسی مسلک کے حامل تھے۔ لیکن بعد میں وہ فکر وعمل کے اعتبار سے بالکل بدل گئے تھے۔ چنانچہ ان کی بعض تصانیف انھی مسائل پر مشتمل ہیں جو فقہ حنفی سے مطابقت نہیں رکھتے۔ مثلاً انھوں نے تقلید شخصی کی مضبوط دلائل سے شدید مخالفت کی ہے اور براہ راست کتاب وسنت کو مدار عمل ٹھہرانے پر زور دیا ہے۔ پھر نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنے کے مسئلے کو بہ دلائل ثابت کیا ہے۔ اسی طرح بعض دیگر مسائل پر بھی بحث کی ہے، جن میں اہل حدیث اور احناف الگ الگ آرا کے حامل ہیں۔ ان میں شیخ محمد حیات سندھی نے اسی نقطۂ نظر کی تائید فرمائی ہے جو اہل حدیث کا ہے۔ اور اسی کو احادیث صحیحہ سے ہم آہنگ قرار دیا ہے۔

مرزا مظہر جان جاناں نے بھی اپنی متعدد تحریروں میں ان مسائل کا ذکر فرمایا ہے اور شیخ محمد حیات کے نقطۂ نظر کو ان کا نام لے کر اپنے بعض فارسی مکتوبات میں بیان کیا ہے۔ مرزا صاحب ممدوح نے ان تمام مسائل یعنی تقلید شخصی، براہ راست کتاب وسنت، نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنے اور رفع سبابہ وغیرہ سے متعلق صاف الفاظ میں شیخ محمد حیات سندھی کے نقطۂ فکر کی تائید کی ہے اور ان کی بہت سی عربی عبارات کو جو ان مسائل سے متعلق ہیں، فارسی میں منتقل کر دیا ہے۔

❶ تقصار جیود الاحرار ص ۲۲۴۔

❷ دیکھیے مقدمہ نصب الرایہ، ص ۴۹۔

❸ مقدمہ بر "الایقاف علی سبب الاختلاف" ص ۵۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علاوہ ازیں شیخ محمد حیات کے مسلک کے بارے میں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ان کی مشہور تصنیف "الایقاف علی سبب الاختلاف" کا اردو ترجمہ بھی معروف اہل حدیث عالم مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم نے کیا اور مختلف اوقات میں ان کی تصانیف بھی اہل حدیث کے اشاعتی اداروں نے شائع کیں۔ کسی حنفی ادارے نے ان کی کوئی تصنیف شائع نہیں کی۔

تلامذہ:

شیخ محمد حیات سندھی رحمۃ اللہ علیہ کا پورے چوبیس سال مدینہ طیبہ میں غلغلۂ تدریس بلند رہا۔ اس طویل عرصے میں انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی احادیث مبارکہ کی انتہائی استقلال اور کامل اخلاص و محبت کے ساتھ اشاعت کی۔ حجاز، مصر، شام، نجد، یمن اور ہندوستان کے بے شمار حضرات نے ان سے حصول علم کیا۔ پھر جن لوگوں کو ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی، خود ان کو اللہ تعالیٰ نے فضل و کمال کے مختلف گوشوں میں بے پناہ اعزاز سے نوازا اور بے حد شہرت و ناموری عطا فرمائی۔ ان کے شاگردوں کو یہ سعادت حاصل ہے کہ وہ معرفت و ادراک کے لحاظ سے بوقلموں اوصاف سے متصف اور فضل و کمال کے اعتبار سے گوناگوں خصوصیات سے بہرہ مند ہیں۔

شیخ کے شاگردوں کی طویل فہرست سے چند حضرات کے اسمائے گرامی یہاں درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ میر سید غلام علی آزاد بلگرامی (متوفی ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۰۰ھ/ ۱۸/ ستمبر ۱۷۸۶ء) مختلف اقسام علم مثلاً حدیث و فقہ، تاریخ و رجال اور ادب و شعر میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے۔ اور تصنیف و تالیف میں بے حد شہرت کے مالک تھے ❶۔

۲۔ شیخ محمد صادق سندھی (متوفی ۱۱۸۷ھ/ ۱۷۷۳ء) اصول حدیث کے ماہر اور بہجۃ النظر شرح نخبۃ الفکر کے مصنف شہیر تھے۔

۳۔ شیخ محمد فاخر زائر الٰہ آبادی (متوفی ۱۱ ذوالحجہ ۱۱۶۴ھ) تحقیق و تدقیق میں اپنے دور کے ممتاز سلفی العقیدہ عالم، متبع سنت اور نامور محدث و فقیہ تھے۔ شاعر اور ادیب بھی تھے۔

۴۔ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب، مجاہد فی سبیل اللہ، مبلغ دین، مصلح وقت اور مجدد عصر تھے۔ انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں اور اپنے عصر اور علاقے میں توحید کی بے پناہ اشاعت کی۔ ۱۱۱۵ھ (۱۷۰۳ء) میں پیدا اور ۱۲۰۶ھ (۱۷۹۲ء) میں فوت ہوئے۔

۵۔ امیر محمد بن اسماعیل یمانی سبل السلام اور کئی کتابوں کے مصنف، مشہور شارح حدیث اور معروف محدث اور فقیہ تھے۔ ۱۰۷۶ھ/ ۱۶۶۶ء کے لگ بھگ کحلان میں پیدا ہوئے۔ بارھویں صدی ہجری

❶ میر سید غلام علی آزاد بلگرامی کے تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے فقہائے ہند

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں انھوں نے بے حد علمی خدمات انجام دیں۔

۶۔ سید حاجی فقیر اللہ علوی شکار پوری، ان کا شمار بارھویں صدی ہجری کے ارض سندھ کے ممتاز علما میں ہوتا ہے۔ ۱۱۰۰ھ/۱۶۸۹ء میں درۂ خیبر کے ایک پہاڑ ''روتاس'' کے حدود میں پیدا ہوئے، جو اس وقت پشاور سے بجانب مغرب تقریباً ۱۸ میل اور جمرود سے ۹ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

ان کا طالب علمی (۱۱۳۰ھ/۱۷۱۸ء) تک کا زمانہ موضع خرقئی (علاقہ پشاور) اور جلال آباد (افغانستان) کے نواح میں موضع ''حصارک'' کے مقام پر گزرا۔ اس کے بعد ۱۱۵۰ھ تک قندھار میں رہے۔ پھر آخر عمر ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء تک شکار پور (سندھ) میں اقامت گزیں رہے۔ ہندوستان، افغانستان، حجاز اور یمن کے علما و مشائخ سے استفادہ کیا اور مختلف علوم میں ان سے سند و اجازہ کی سعادت حاصل کی۔ علم حدیث کی متعدد کتابیں شیخ محمد حیات سندھی اور شیخ محمد ہاشم ٹھٹھوی سے پڑھیں۔ عارف باللہ اور عالم باعمل فقیہ تھے۔ تفسیر اور حدیث پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں قطب الارشاد، براہین النجاۃ، الفتوحات الغیبیہ، الازہار فی ثبوت الآثار زیادہ مشہور ہیں۔ ان کی علمی رفعت کا اصل اندازہ ان کے مکتوبات سے ہوتا ہے، جو ان کی اولاد میں سے ایک جید عالم سید میر علی نواز علوی کی کوشش سے لاہور میں چھپ چکے ہیں۔ یہ مجموعہ ۸۵ مکتوب کو محتوی ہے اور تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف اور سیاست وغیرہ کی معلومات کو دامن صفحات میں لیے ہوئے ہے۔

سید فقیر اللہ علوی کی ایک اہم تصنیف ''وثیقۃ الابرار'' ہے، جس میں انھوں نے اپنے سلاسل اسانید و اجازات کی تفصیل درج کی ہے۔ یہ ایک قلمی کتاب ہے جو ایک مقدمہ، آٹھ فصول اور خاتمے پر محیط ہے۔ کتاب کے ابتدا میں مصنف نے مولانا محمد صادق بن دین دار حصارکی جلال آبادی، شیخ محمد حیات سندھی، شیخ محمد ہاشم ٹھٹھوی، شیخ محمد مسعود پشاوری اور اس زمانے کے مفتی مکہ شیخ عبدالقادر اور بعض دیگر علما و محدثین کا ذکر کیا ہے۔ آگے چل کر ہر فصل میں ان تمام علوم کی تفصیل سے سند بیان کی ہے جو مصنف نے مختلف اساتذہ سے حاصل کیے۔ کتاب غیر مطبوعہ ہے۔

سید فقیر اللہ علوی عربی اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء میں شکار پور (سندھ) میں فوت ہوئے اور وہیں محلّہ ہزاری میں دفن کیے گئے ❶۔

۷۔ شیخ ابوالحسن ٹھٹھوی سندھی صغیر۔ یہ ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۳ء کو ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ بعدازاں حجاز چلے گئے اور مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کر لی۔ اس زمانے میں وہاں شیخ محمد حیات سندھی کا حلقۂ درس جاری تھا، اس میں داخل ہو گئے اور خوب استفادہ کیا۔ یہاں تک کہ علم حدیث

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے ماہ نامہ ''الحق'' (اکوڑہ خٹک) بابت جنوری ۱۹۷۸ء ''ایک نادر مخطوط۔ وثیقۃ الابرار۔ حضرت شیخ فقیر اللہ شکاری پوری کا سلسلہ اسانید'' از ڈاکٹر سید سعید اللہ، استاد شعبہ اسلامیات، پشاور یونیورسٹی۔ نیز دیکھیے ماہ نامہ ''الرحیم'' (حیدر آباد سندھ) بابت اگست ۱۹۶۳ء۔ ''سرزمین سندھ میں علم حدیث'' از مخدوم امیر احمد۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے شیخ ہوئے اور اجتہاد کے مرتبے کو پہنچے۔ حنفی المسلک تھے لیکن مذہبی تعصب سے بالکل پاک۔ اگر کوئی حق بات اپنے امام کے مذہب کے خلاف دیکھتے تو مذہب امام کو چھوڑ کر حق پر عمل پیرا ہوتے۔ شاگردوں کو بھی یہی ہدایت فرماتے کہ اگر کسی مسئلے میں فقہی روایات کو حدیث نبوی ﷺ کے خلاف پائیں تو فقہی روایات پر حدیث نبوی کو ہر حال میں ترجیح دی جائے۔

شیخ ابوالحسن نے نخبة الفکر کی شرح لکھی۔ انھوں نے ابن اثیر کی جامع الاصول کی شرح بھی لکھنی شروع کی تھی، لیکن صرف ایک ہی جلد کی شرح لکھ سکے۔

شیخ ممدوح نہایت خوش خط تھے۔ ان کا معمول تھا کہ صحیح بخاری کی انتہائی احتیاط سے اعراب ڈال کر کتابت کرتے۔ جب کتاب مکمل ہو جاتی تو اہل ذوق بڑے شوق سے ایک سو ریال میں اسے خرید لیتے۔ ان کے ہاتھ کا صحیح بخاری کا مکتوبہ نسخہ امام یمن کے کتب خانے میں موجود ہے [1]۔

شیخ ابوالحسن سندھی صغیر نے ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء میں مدینہ منورہ میں رحلت کی اور جنت البقیع کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔

شیخ محمد حیات سندھی مدنی کے ان جلیل القدر تلامذہ کرام کے علاوہ شیخ احمد بن عبدالرحمٰن سندھی، شیخ محمد سعید صفر، شیخ عبدالقادر خلیل کدک، شیخ عبدالقادر بن احمد، شیخ احمد، شیخ عبدالکریم بن عبدالرحیم داغستانی، شیخ علی بن ابراہیم عبسی، شیخ عبدالکریم بن احمد الشراباتی، شیخ علی بن عبدالرحمٰن الاسلامبولی، شیخ علی بن محمد الزہری، مفتی محمد بن عبداللہ مدنی، شیخ علیم اللہ بن عبدالرشید لاہوری المدفون بہ دمشق، شیخ خیرالدین بن محمد زاہد سورتی اور علما و مشائخ کی کثیر تعداد نے ان سے تحصیل علم کی۔

شیخ ممدوح کے تلامذہ بھی استاد کی طرح علم حدیث سے از حد تعلق خاطر رکھتے تھے اور ان کے دلوں میں اس علم کا اثر نہایت گہرا اور راسخ تھا۔ رحمہم اللہ تعالیٰ عنہم۔

وفات:

شیخ محمد حیات سندھی رحمہ اللہ نے دیار حبیب ﷺ میں عمر بھر حدیث نبوی کی مقدس شمع جلائے رکھی، اسی کی روشنی میں وہ زندگی کی منزلیں طے کرتے رہے اور پھر اسی کی خدمت کرتے ہوئے ۲۶ صفر ۱۱۶۳ھ/۲۴ جنوری ۱۷۵۰ء کو مدینہ منورہ میں ہمیشہ کے لیے اللہ کے حضور پہنچ گئے۔ انھیں جنت البقیع میں دفن کیا گیا، جہاں صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین، محدثین و فقہا اور علما و صلحا کی بہت بڑی تعداد مدفون ہے۔ ان کے شاگرد رشید میر غلام علی آزاد بلگرامی نے ''رحلة شیخی'' تاریخ وفات نکالی۔

[1] ماہ نامہ ''الرحیم'' (حیدر آباد سندھ) بابت اگست ۱۹۶۳ء۔ ''سرزمین سندھ میں علم حدیث'' از مخدوم امیر احمد۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شیخ کے استادِ گرامی ــــ شیخ ابوالحسن سندھی کبیر:

شیخ محمد حیات سندھی کے اساتذۂ کرام میں سے ایک بزرگ شیخ ابوالحسن سندھی تھے۔ ابوالحسن سندھی نام کے دو حضرات تھے۔ ایک ابوالحسن صغیر اور دوسرے ابوالحسن کبیر۔ جن کا تذکرہ ان سطور میں مقصود ہے، وہ ابوالحسن سندھی کبیر تھے۔ یہی شیخ محمد حیات سندھی کے استاد گرامی تھے، جن کا مدینہ منورہ میں ہنگامۂ تدریس گرم تھا اور جن کی وفات کے بعد، ان کی مسند تدریس پر شیخ محمد حیات سندھی متمکن ہوئے۔

شیخ ابوالحسن سندھی کبیر کا سالِ ولادت معلوم نہیں ہو سکا۔ یہ علاقۂ سندھ کے مرکز علم ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے اور بارھویں صدی ہجری کے اکابر علمائے ہند میں گردانے گئے۔ ان کا اصل نام محمد تھا، والد کا نام نامی عبدالہادی تھا۔ کنیت ابوالحسن تھی اور کنیت ہی سے مشہور ہوئے۔ شیخ ممدوح نے اپنے آبائی شہر ٹھٹھہ میں تربیت حاصل کی اور حصول علم کی منزلیں بھی اسی شہر کے اعاظم رجال اور اکابر علما کی نگرانی میں طے کیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد تھوڑے ہی عرصے میں ان کے علمی کمالات کی شہرت پھیل گئی اور طلبائے علم دور دراز کی مسافت طے کر کے شامل درس ہونے لگے۔ طلبا ان کے اندازِ تعلیم اور اسلوب تدریس سے نہایت متاثر ہوتے، کیونکہ وہ اس نہج سے مشکل اور دقیق مسائل کی عقدہ کشائی کرتے تھے کہ ہر بات آسانی سے مخاطب کے ذہن نشین ہو جاتی، لیکن خود استاد اس علم پر قانع نہ تھے۔ ان کے اندر مزید تحصیل کا جذبہ موجزن تھا۔ چنانچہ ٹھٹھے کی مسند درس کو خیر باد کہا اور اسلامی ملکوں کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ سب سے پہلے تستر گئے، وہاں کے علما سے استفادہ کیا۔ پھر حجاز مقدس کی راہ لی اور راستے کی بے پناہ دشواریوں سے گزرتے ہوئے حرم پاک پہنچے۔ کچھ عرصہ مکہ معظمہ میں قیام کیا، پھر مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے۔ وہاں سید محمد برزنجی اور شیخ ابراہیم کردی کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شریک ہو گئے اور ان حضرات گرامی سے تلمذ کا شرف حاصل کیا۔ شیخ عبداللہ بن سالم بصری سے بھی مستفید ہوئے۔ پھر اسی خطۂ مبارکہ کو وطن بنا لیا اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

واقعات کی ترتیب اور حالات کی رفتار سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ ابوالحسن سندھی کبیر گیارھویں صدی ہجری کے اواخر میں سندھ کی سکونت ترک کر کے حجاز پہنچے تھے۔ کیونکہ ان کے استاد شیخ ابراہیم کردی کا جو ولی اللہی سلسلۂ اسناد کی ایک کڑی ہیں، سال وفات ۱۱۰۲ھ/۱۶۹۱ء ہے۔ یعنی بارھویں صدی ہجری کا اوائل۔ اس سے لازم آتا ہے کہ شیخ ابوالحسن کا ان سے مستفید ہونے کا واقعہ اس سے پہلے کا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب کہ ہندوستان کے تخت حکومت پر اورنگ زیب عالم گیر متمکن تھا۔

شیخ ابوالحسن سندھی طبعاً تنہائی پسند تھے، اس لیے حرم نبوی ﷺ میں اقامت کے ابتدائی ایام گوشہ نشینی میں گزرے، لیکن مسجد نبوی ﷺ میں سلسلۂ درس شروع کیا تو لاکھوں دلوں کے مالک تھے اور تشنگان علم ہجوم در ہجوم ان کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ ان کا حلقۂ درس ہر ملک کے علما اور طلبا کا مرکز تھا۔ عرب ملکوں کے علاوہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہندوستان، افغانستان اور روم کے طالبان فیض بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اخذ علم کرتے۔ وہ دیار ہند کو چھوڑ چکے تھے، لیکن اس ملک کے حضرات بھی ان کے حلقۂ درس میں شریک تھے، جن میں شیخ محمد حیات سندھی کا اسم گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ وہ شیخ ابوالحسن کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ استاد کی وفات کے بعد وہی اس خزانۂ علم کے وارث ہوئے، اور ان کی مسند تدریس کا تاج زریں اسی تلمیذ رشید کے سر کی زینت بنا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس لائق شاگرد نے استاذ کی جانشینی کا پورا پورا حق ادا کیا اور اس درس گاہ عظیم کو جو مرجع خلائق بن گئی تھی، نہایت کامیابی سے چلایا۔ پھر آگے چل کر شیخ محمد حیات سندھی کی مساعی جمیلہ سے اس درس گاہ کے اثرات ہندوستان کے اہل علم پر بھی خوب نمایاں ہوئے اور شیخ محمد فاخر زائر الٰہ آبادی اور میر سید غلام علی آزاد بلگرامی جیسے جلیل القدر علما اور متنوع خوبیوں کے حامل حضرات اس سے فیض یاب ہوئے۔ ان بزرگوں نے اہل ہند کے ذہن کو نئی جلا بخشی اور ان کے فکر کو تحقیق و کاوش کی تابندہ راہوں سے آشنا کیا۔

شیخ ابوالحسن سندھی قرآن، حدیث اور فقہ پر عمیق نگاہ رکھتے تھے۔ ان بنیادی علوم کی متعدد اولیں اور اونچے درجے کی کتابوں پر انھوں نے حواشی تحریر کیے جن سے علما و طلبا بہت استفادہ کرتے ہیں اور حلقۂ اہل علم میں ان کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ ان حواشی سے ان کی دقت نظر، قرآن و حدیث میں عبور و مہارت اور فقہ میں وسعت معلومات کا پتا چلتا ہے۔

تفسیر قرآن مجید کے سلسلے میں ان کی قابل قدر خدمت یہ ہے کہ دو مشہور تفسیروں، تفسیر بیضاوی اور تفسیر جلالین پر شاندار حواشی تحریر فرمائے۔ قرآن کے ضمن میں ان کا ایک عظیم کارنامہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی ایک مستقل تفسیر لکھی۔

علم حدیث کے وہ ماہر تھے اور اس کے تمام پہلوؤں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ اس بنیادی علم کی انھوں نے بے پناہ خدمت کی۔ یہ خدمت تدریس کی صورت میں بھی کی اور تحریر کی صورت میں بھی۔ ان کا یہ بہت بڑا علمی کارنامہ ہے کہ صحاح ستہ پر حواشی لکھے۔ صحیح بخاری اور ابن ماجہ کا حاشیہ مصر میں طبع ہوا۔ نسائی کا حاشیہ ہندوستان میں چھپا۔ صحیح مسلم کا حاشیہ پاکستان کے نامور اہل حدیث عالم حضرت مولانا عبدالتواب ملتانی مرحوم نے علیحدہ کتابی شکل میں شائع کیا۔ ابوداؤد کا غیر مطبوعہ حاشیہ سید احسان اللہ شاہ مرحوم (المعروف پیر جھنڈا) کے کتب خانے میں موجود ہے۔ ترمذی کا حاشیہ غالباً مکمل نہیں ہو سکا تھا۔

احادیث کی ان بنیادی کتابوں کے حواشی کے علاوہ شیخ ابوالحسن سندھی نے مسند امام احمد پر بھی حاشیہ لکھا۔

شیخ ممدوح کو مسند امام ابوحنیفہ، ہدایہ اور فتح القدیر شرح ہدایہ پر بھی حواشی لکھنے کا شرف حاصل ہوا۔

ان کی بوقلموں خدمات علمیہ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ بہ یک وقت کئی خوبیوں کے مالک تھے۔ مفسر

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قرآن، شارح حدیث، فقیہ نام دار، مدرس، مبلغ، محشی، مصنف، سب کچھ تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو بے شمار کمالات سے نوازا تھا۔

شیخ ابوالحسن سندھی کی تصانیف وحواشی سے پتا چلتا ہے کہ وہ عامل بالحدیث تھے اور کتاب وسنت ہی کو مرکز التفات ٹھہراتے تھے ان کے شاگرد شیخ محمد حیات سندھی لکھتے ہیں۔

کان زاھداً متورعاً کثیر الاتباع لکتاب اللہ وسنۃ رسول اللہ ﷺ۔

یعنی شیخ ابوالحسن عابد وزاہد اور متبع کتاب وسنت تھے۔

مولانا محمد عابد سندھی رقم طراز ہیں:

کان الشیخ عاملاً بالحدیث لا یعدل عنہ الی مذھب۔

کہ شیخ ابوالحسن حدیث پر عمل پیرا تھے۔ حدیث کے علاوہ کسی مذہب کو قابل اعتنا نہیں قرار دیتے تھے۔

جس زمانے میں شیخ ابوالحسن سندھی مدینہ منورہ میں مقیم تھے، اس زمانے میں ان کے ایک ہم وطن شیخ ابوالطیب سندھی بھی وہاں اقامت گزیں تھے۔ وہ بھی جلیل القدر عالم اور وسیع المطالعہ فاضل تھے۔ جامع ترمذی کے شارح اور درمختار کے محشی تھے۔ مدینہ منورہ میں ان کا غلغلۂ درس بلند تھا۔ حکام وقت اور ارباب اختیار کے درباروں میں انھیں رسائی حاصل تھی۔ مذہباً حنفی اور طریقتاً نقشبندی تھے۔ اپنے مسلک میں نہایت متشدد تھے اور جزئیات فقہ میں عبور رکھتے تھے۔ اختلاف مسلک کی بنا پر شیخ ابوالحسن سندھی کبیر کے زبردست حریف تھے۔ ان کی وجہ سے شیخ ابوالحسن سندھی کو بارہا شدید آزمائشوں اور ابتلاؤں میں سے گزرنا پڑا۔ شیخ محمد عابد سندھی نے اس دور کے بعض واقعات بیان کیے ہیں، جن میں دونوں کے درمیان وجہ مخالفت کا اصل راز سامنے آجاتا ہے، اور شیخ ابوالحسن کو اپنے ہم وطن وہم عصر حریف کے باعث جو تکلیفیں اٹھانا پڑیں، ان کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے۔ شیخ محمد عابد سندھی فرماتے ہیں۔

شیخ ابوالحسن سندھی عامل بالحدیث تھے۔ حدیث سے صرف نظر کر کے کسی مذہب کی طرف عنان توجہ مبذول نہیں فرماتے تھے۔ رکوع سے پہلے اور رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے اور دو رکعتوں سے اٹھتے وقت رفع الیدین کرتے اور سینے پر ہاتھ باندھتے تھے، ان کے زمانے میں شیخ ابوالطیب سندھی جو حنفی المذہب تھے، اپنے مسلک فقہی سے ہرگز ادھر ادھر نہیں ہوتے تھے۔ اس قسم کے مسائل میں شیخ ابوالحسن سے شیخ ابوالطیب مناظروں کا سلسلہ جاری رکھتے تھے۔ شیخ ابوالحسن متنازعہ فیہ مسائل میں اپنے دلائل بیان کرتے تو شیخ ابوالطیب ان کے جواب میں عاجز آجاتے۔ یہی مخاصمت ان دونوں علما میں ہمیشہ قائم رہی۔ ایک مرتبہ روم کے قضاتِ احناف میں سے ایک شخص قاضی کی حیثیت سے مدینہ منورہ میں آئے تو شیخ ابوالطیب ان کے پاس تشریف لے گئے اور شکایت کی کہ شیخ ابوالحسن ان کے فقہی مذہب سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ بعض مسائل کا ذکر کر کے یہ بھی کہا کہ وہ ان مسائل میں ائمہ احناف کے مخالف ہیں۔ قاضی نے اپنے طور پر شیخ ابوالحسن کے حالات اور فقہی نظریات کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بارے میں معلومات فراہم کیں تو انھیں پتا چلا کہ شیخ ابوالحسن تمام علوم متداولہ میں درجۂ امامت پر فائز ہیں اور مختلف فنون میں ماہر کامل ہیں۔ ان پر یہ حقیقت بھی منکشف ہوئی کہ اہل مدینہ شیخ ابوالحسن کے شاگرد ہیں اور انھیں انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس کے بعد قاضی مذکور شیخ ابوالحسن سے نہایت احترام کے ساتھ پیش آئے، اپنے لیے دعا کی درخواست کی اور عزت کے ساتھ ان سے ہم کلام ہوئے۔

شیخ ابوالطیب سندھی نے یہ عادت بنالی تھی کہ جو قاضی بھی مدینہ منورہ میں آتا، اس کے پاس جاتے اور شیخ ابوالحسن کی شکایت کرتے لیکن کوئی قاضی بھی انھیں کچھ نہ کہتا، ہر قاضی انھیں اپنے ہاں بلاتا اور ان سے گفتگو کرتا تو ان کے علم اور نیکی سے اس قدر متاثر ہوتا کہ احترام کے ساتھ رخصت کرتا۔ ایک مرتبہ ایک متعصب قاضی وہاں آیا۔ شیخ ابوالطیب نے حسب معمول اس کے پاس شیخ ابوالحسن کی شکایت کی تو اس نے شیخ کو دربار میں طلب کیا اور نہایت سخت لہجے میں حکم دیا کہ نماز میں ناف کے نیچے ہاتھ باندھا کریں اور پہلی تکبیر کے سوا رفع الیدین نہ کیا کریں۔ شیخ نے جواب دیا، میں آپ کی یہ بات نہیں مانوں گا، وہی کچھ کروں گا، جو حدیث میں مذکور ہے اور اسی طرح نماز پڑھوں گا جس طرح خود رسول اللہ ﷺ نے پڑھی یا پڑھنے کا حکم دیا۔

قاضی سخت مزاج اور متعصب تھا، وہ شیخ ابوالحسن سے یہ صاف جواب سننے کو تیار نہ تھا، اس نے غصے میں آ کر شیخ کو جیل بھیج دیا اور ایسی تنگ کوٹھڑی میں محبوس کرنے کا حکم دیا جس میں ہر وقت تاریکی چھائی رہتی تھی، کوئی چیز نظر نہ آتی تھی، حوائج ضروریہ کے لیے بھی ان کو باہر نہیں نکالا جاتا تھا۔ شیخ چھ دن اس کال کوٹھڑی میں بند رہے۔ پھر اہل مدینہ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ وہ قاضی کی بات مان لیں اور جیل سے باہر آ جائیں شیخ نے ان کو جواب دیا کہ جو بات صحیح حدیث سے ثابت نہیں اور رسول اللہ ﷺ سے مروی نہیں، میں اسے ہرگز نہیں مانوں گا، اور جو عمل رسول اللہ ﷺ سے صحیح حدیث کی رو سے ثابت ہے، اسے کسی صورت نہیں چھوڑوں گا۔ یہ بات انھوں نے قسم کھا کر کہی۔

اس کے بعد اہل مدینہ پھر قاضی کے پاس گئے اور پُرزور الفاظ میں شیخ کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ قاضی نے قسم اٹھا کر کہا کہ اگر میں نے ان کو نماز میں سینے پر ہاتھ باندھے ہوئے دیکھ لیا تو دوبارہ جیل بھیج دوں گا۔ اہل مدینہ نے شیخ سے عرض کیا کہ ایک کپڑا لے کر پشت پر اوڑھ لیں اور اس کو دونوں طرف سے دونوں کندھوں پر ڈال لیں۔ اس کے نیچے سینے پر بھی ہاتھ باندھ لیا کریں اور رفع الیدین بھی کر لیا کریں۔ شیخ نے یہ تجویز منظور فرمالی۔ اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصے بعد قاضی وفات پا گیا اور شیخ نے دوبارہ پہلے کی طرح کھلے بندوں سینے پر ہاتھ باندھنا اور رفع الیدین کرنا شروع کر دیا۔ www.KitaboSunnat.com

بہر حال شیخ ابوالحسن سندھی کبیر بہت بڑے محدث اور عامل بالحدیث عالم تھے۔ ان کا سلسلۂ درس حدیث بہت وسیع تھا جو مسجد نبوی میں جاری تھا۔ بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے پیچھے کوئی نرینہ اولاد نہیں چھوڑی۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کے شاگرد رشید شیخ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محمد حیات سندھی رحمۃ اللہ علیہ ان کے جانشین ہوئے، جو تقلید شخصی کے مخالف اور متبع کتاب و سنت تھے۔

تذکرہ ورجال کی کتابوں میں ارض سندھ کے اس جلیل القدر محدث کو شیخ ابوالحسن سندھی کبیر لکھا جاتا ہے۔ اس لیے کہ شیخ ابوالحسن دو تھے اور دونوں سندھی تھے۔ دونوں نے مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ امتیاز کے لیے ایک کو شیخ ابوالحسن سندھی صغیر کہا جاتا ہے جو شیخ ابوالحسن بن محمد صادق سندھی صغیر تھے۔ ان کی تاریخ وفات ۲۵ رمضان ۱۱۸۷ھ/۱۰ دسمبر ۱۷۷۳ء ہے۔ مقام وفات مدینہ منورہ ہے۔

دوسرے شیخ ابوالحسن سندھی کبیر ہیں، ان کا پورا نام شیخ ابوالحسن محمد بن عبدالہادی تھا، لقب نورالدین تھا۔ یہی وہ شیخ ابوالحسن سندھی کبیر ہیں، جن کے حالات قارئین کرام کے زیر مطالعہ ہیں۔ ان کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ ایک روایت کے مطابق ۱۱۴۱ھ/ ۱۷۲۹ء میں وفات پائی۔ ایک روایت میں ۱۱۳۹ھ/ ۱۷۲۷ء اور ایک میں ۱۲ شوال ۱۱۳۸ھ/ ۲ جون ۱۷۲۶ء منقول ہے۔ ایک اور روایت ۱۱۳۶ھ کی بھی ہے۔

مدینہ منورہ میں اس جلیل القدر عالم اور رفیع المرتبت محدث کی وفات پر انتہائی حزن و ملال کا اظہار کیا گیا۔ نماز جنازہ میں بہت بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ ان کے تدین وتقویٰ اور بے پناہ خدمت حدیث سے ہر طبقہ وخیال کے لوگ انتہائی متاثر تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ان کے انتقال پر عورتوں نے بھی بے حد افسوس کیا اور جنازہ اٹھا تو ایک جھلک دیکھنے کے لیے گھروں کے دروازوں میں کھڑی ہو گئیں۔ دکان داروں نے فرط غم سے دکانیں بند کر دیں، حکومت کے اہل کاروں اور ولات و عمال نے میت کو کندھا دیا۔ میت کو مسجد نبوی میں لایا گیا اور وہیں نماز جنازہ پڑھی گئی۔ اور پھر اس عظیم سندھی الاصل محدث وفقیہ کو جنت البقیع کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ علما و طلبا اور عوام و خواص نے ان کی وفات کو ایک عظیم سانحہ قرار دیا اور اس پر نہایت غم واندوہ کا اظہار کیا۔

شیخ ابوالحسن کے حالات ❶ ماہ نامہ ''الرحیم'' (حیدر آباد) میں بھی مرقوم ہیں جو ''سرزمین سندھ میں علم حدیث'' کے عنوان کے تحت مخدوم امیر احمد مرحوم نے تحریر کیے ہیں۔ اس میں شیخ ممدوح کے حالات مندرجہ ذیل ہیں:

''نورالدین محمد بن عبدالہادی ٹھٹھوی ثم مدنی معروف بہ شیخ ابوالحسن کبیر۔ سندھ کے مشہور شہر ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے۔ وہاں کے علما سے علم حاصل کیا۔ پھر مدینہ شریف ہجرت کر گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔

''آپ نے مدینہ منورہ میں ''مدرسۃ الشفا'' کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا۔ یہ مدرسہ آج تک موجود ہے اور ترکی اوقاف میں شامل ہے۔ راقم الحروف کو جب اللہ تعالیٰ نے ۱۹۵۲ء میں حرم نبوی کی زیارت کی توفیق عطا کی تو اس مدرسے کو بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ اس مدرسے کو ''مدرسۃ الشفا'' کیوں کہا گیا؟ اس کے متعلق دو

❶ شیخ ابوالحسن سندھی کے حالات کے لیے دیکھیے ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور۔ مورخہ ۴ مارچ و ۱۱ مارچ ۱۹۵۵ء مضمون بہ عنوان ''علامہ ابوالحسن سندھی رحمۃ اللہ علیہ'' از مولانا ابوالفضل فیض الرحمٰن الثوری۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روائتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس مدرسے میں قاضی عیاض کی مشہور کتاب ''الشفا فی تعریف حقوق المصطفی'' کا درس لازمی طور پر اور خاص اہتمام سے دیا جاتا تھا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ شیخ کے زمانے میں ایک سالار فوج بیمار پڑ گیا تھا اور زندگی کی امید منقطع ہو چکی تھی۔ آخر اس نے شیخ ابوالحسن کی طرف رجوع کیا جو اس وقت مسجد نبوی میں حدیث کا درس دیتے تھے، اور نذر مانی کہ اگر اس کو اللہ تعالیٰ نے صحت عطا کی تو وہ حضرت شیخ کی تدریس کے لیے ایک مدرسہ تعمیر کرائیں گے۔ اللہ نے اسے صحت بخشی اور اس نے اپنی نذر پوری کی اور شیخ کے لیے ایک مدرسہ بنایا۔ اس مدرسے کا نام ''مدرستہ الشفا'' رکھا۔

ہمارے خیال میں ان دونوں روایتوں میں کوئی تعارض یا تضاد نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مدرسے کے نام میں دونوں مناسبتوں کا خیال رکھا گیا ہو۔

''اس مدرسے میں ایک اچھا خاصا کتب خانہ ہے، جس میں مخطوطات کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ کتابیں اکثر و بیشتر شیخ ابوالحسن کے شاگردوں کی لکھی ہوئی ہیں۔''

''مسند امام احمد بن حنبل کے ایک مخطوطہ نسخے پر میں نے دیکھا کہ آخر میں ایک طالب علم نے لکھا تھا کہ میں نے یہ کتاب شیخ ابوالحسن سندھی کی خدمت میں مسجد نبوی میں فلاں وقت پڑھ کر پوری کی اور حلقۂ درس میں اتنے طالب علم شامل تھے۔

''آپ کے اساتذہ میں شیخ شمس بن محمد برزنجی، برہان کورانی اور عبداللہ بصری جیسے شیوخ شامل تھے۔

''مخدوم ابوالحسن نے صحاح ستہ پر حواشی لکھے تھے، جن میں سے اکثر مصر اور ہندوستان میں چھپ چکے ہیں۔ ان کے علاوہ مسند امام احمد بن حنبل، اذکار نبویہ پر بھی حواشی تحریر کیے تھے۔ علامہ ابن حجر کی کتاب ''شرح نخبتہ الفکر'' پر بھی حاشیہ لکھا تھا۔ فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ کی شرح بھی لکھی تھی۔ خلاصہ یہ کہ آپ فن حدیث کے ایک محقق حافظ اور صاحب تدقیق فاضل تھے۔ تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ علامہ کتانی ۱۱۳۹ھ/۱۷۲۷ء اور علامہ عبدالرحمٰن الجبرتی ۱۱۳۶ھ/۱۷۲۴ء بتاتے ہیں۔ آپ کا انتقال مدینہ منورہ میں ہوا'' ❶۔

۲۴۔ قاضی محمد حیات برہان پوری

قاضی محمد حیات برہان پوری بارھویں صدی ہجری کے نامور فقیہ تھے اور ان کا شمار فقہائے حنفیہ میں ہوتا تھا۔ مغل حکمران محمد شاہ اور بعض دیگر بادشاہوں کے عہد میں برہان پور کے منصب قضا پر متمکن رہے۔ ایک مغل بادشاہ نے ان کی فقہی اور علمی قابلیت کی بنا پر ان کو قاضی شریعت خاں کے پر اعزاز لقب سے سرفراز کیا۔ ممدوح محکمۂ قضا کی اہم ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ درس و افادۂ طلبا میں بھی مصروف رہتے تھے۔ ان سے علما کی بہت بڑی تعداد نے اخذ علم کیا ❷۔

❶ ماہ نامہ ''الرحیم'' (حیدر آباد سندھ) مطابق جولائی ۱۹۶۳ء مضمون ''سرزمین سندھ میں علم حدیث'' از مخدوم امیر احمد۔

❷ نزہتہ الخواطر، ج ۶، ص ۳۰۲ بحوالہ تاریخ برہان پور۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۵۔ سید محمد مخدوم پھلواروی

سید محمد مخدوم بن امان اللہ بن محمد امین بن محمد جنید ہاشمی جعفری پھلواروی، صوبہ بہار کے مردم خیز شہر پھلواری میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ حصول علم کا آغاز اپنے والد گرامی سید امان اللہ پھلواروی سے کیا، جو اپنے دور کے صاحب علم بزرگ تھے۔ اس کے بعد مزید تحصیل کے لیے مختلف بلاد و امصار میں گئے اور متعدد اساتذہ سے اخذ علم کیا۔ شیخ محمد وارث حسینی بنارسی (متوفی ۱۰ ربیع الثانی ۱۱۶۶ھ/۱۴ جنوری ۱۷۵۳ء) کی خدمت میں بھی گئے، جن کا بنارس میں سلسلۂ درس جاری تھا، ان سے کتب درسیہ کی تکمیل کی۔ پھر اپنے عصر کے مشہور عالم وفقیہ اور شیخ مانے گئے۔ صالحیت اور تقویٰ کی نعمت سے بھی مالا مال تھے۔

سید محمد مخدوم پھلواروی فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے وطن پھلواری واپس آئے اور وہاں انھوں نے خود درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا اور تمام عمر یہ خدمت انجام دیتے رہے۔

پھلواری کے اس عالم وفقیہ نے ۲۶ ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ/۱۷ دسمبر ۱۷۵۹ء کو وفات پائی [1]۔

۲۶۔ قاضی محمد دولت فتح پوری

قاضی محمد دولت فتح پوری، اپنے عصر کے فاضل علمائے حنفیہ میں سے تھے۔ ان کا آبائی تعلق موضع سہالی سے تھا جو نواح لکھنؤ میں واقع ہے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

قاضی محمد دولت بن محمد یعقوب بن فرید بن سعد اللہ بن احمد بن حافظ الدین انصاری سہالوی، قاضی محمد دولت کے والد محمد یعقوب، شیخ محب اللہ عمری الہ آبادی کے بھانجے تھے جو اپنے دور کے بہت بڑے عالم اور فاضل بزرگ تھے۔

قاضی محمد دولت موضع سہالی میں پیدا ہوئے، وہیں نشو ونما پائی اور وہیں شیخ قطب الدین شہید سہالوی سے علم حاصل کیا۔ رسالہ قطبیہ کے بیان کے مطابق شیخ شہید نے ان کو متبنیٰ بنا لیا تھا۔ ان کی شہادت کے بعد ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۲ء میں یہ سہالی سے فتح پور منتقل ہو گئے اور وہاں اپنے سسر ابوالرافع حسامی کے گھر میں رہنے لگے۔ پھر فتح پور سے دہلی گئے۔ اس زمانے میں بادشاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر کے حکم سے شیخ نظام برہان پوری کی نگرانی میں علما کی ایک جماعت فتویٰ ہندیہ کی ترتیب پر مامور تھی۔ یہ وہی فتاویٰ ہے جو آگے چل کر فتاویٰ عالم گیری کے نام سے معروف ہوا۔ قاضی محمد دولت چونکہ علم فقہ اور اس کے متعلقات میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور حلقہ علما میں خاص شہرت کے مالک تھے، لہٰذا فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین کی جماعت میں شامل کیے گئے۔ بعد ازاں عالم گیر نے ان کو شہر سورت کا قاضی مقرر کر دیا تھا۔ منصب قضا کے لیے بادشاہ سے ان کی سفارش سید محمد حسینی

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ۳۰۳ بحوالہ حدیقۃ الازہار۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قنوجی نے کی تھی اور اس سفارش کی وجہ شیخ محب اللہ عمری الہ آبادی سے ان کا تعلق قرابت تھا۔

اغصان الانساب کی روایت کے مطابق یہ قاضی مقرر ہو کر سورت جا رہے تھے کہ اثنائے سفر میں راہزنوں کے چنگل میں پھنس گئے اور قتل کر دیے گئے ❶۔

۲۷۔ سید محمد راجے جون پوری

سید محمد راجے حسینی واسطی جون پوری مشہور عالم و صوفی سید محمد حفیظ حسینی واسطی جون پوری (متوفی ۲۰ شوال ۱۱۲۸ھ/ ۲۶ ستمبر ۱۵۱۶ء) کے پوتے تھے۔ عالم باعمل تھے۔ جون پور میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ بہت سی کتب درسیہ اپنے جد امجد سید محمد حفیظ جون پوری سے پڑھیں۔ ان کی وفات کے بعد اپنے شہر (جون پور) کے اساتذہ کرام سے استفادہ کیا، یہاں تک کہ فقہ و اصول میں مہارت پیدا کر لی اور جماعت علما میں ''افقہ الفقہاء'' کے طور پر شہرت پائی۔ قانع، متوکل علی اللہ اور پاک باز بزرگ تھے، شاعر بھی تھے۔ بڑے متین اور صاحب اعزاز و اکرام عالم دین تھے، ہمیشہ درس و تدریس میں مشغول رہتے۔ ۱۷ ربیع الاول ۱۱۸۳ھ/ ۲۱ جولائی ۱۷۶۹ء کو فیض آباد میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے ❷۔

۲۸۔ مولانا محمد رضا انصاری سہالوی

مولانا محمد رضا سہالوی، شیخ قطب الدین شہید انصاری سہالوی کے چوتھے بیٹے تھے جو باپ کی شہادت کے وقت سب سے چھوٹے تھے۔ سہالی میں پیدا ہوئے اور ابھی بارہ سال کی عمر کے تھے کہ ان کے والد گرامی شیخ قطب الدین سہالوی شہید کر دیے گئے۔ اس کے بعد یہ خاندان سہالی سے لکھنؤ منتقل ہو گیا اور بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر نے ان کو مستقل سکونت کے لیے فرنگی محل عطا کیا۔ لکھنؤ پہنچ کر اس خاندان کے اہل علم نے فرنگی محل میں درس و تدریس کا وہی قدیم سلسلہ شروع کر دیا جو سہالی میں جاری تھا۔ اس سے خلق کثیر نے فیض حاصل کیا۔

مولانا محمد رضا سہالوی نے لکھنؤ میں اپنے بڑے بھائی شیخ نظام الدین سہالوی سے کسب علم کیا، اور علوم مروجہ میں کامل دسترس حاصل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود بھی لکھنؤ میں مسند تدریس بچھائی اور طویل عرصے تک علما و طلبا کو مستفید فرماتے رہے۔ اس اثنا میں شیخ عبدالرزاق حسینی بانسوی سے اخذ طریقت بھی کیا۔ بعد ازاں ارض حجاز کا قصد فرمایا اور حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ اس کے بعد کوئی پتا نہیں چل سکا کہ کہاں گئے اور کب فوت ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق حج سے فارغ ہونے کے بعد مکہ مکرمہ سے بغداد چلے گئے

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۰۳۔ برصغیر میں علم فقہ ص ۳۱۷۔

❷ تجلی نور، ج ۲ ص ۶۹۔ تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۳۲۷۔ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۰۳، ۳۰۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھے، وہیں انتقال کیا۔ ایک خیال یہ ہے کہ شاید اپنے برادر کبیر شیخ نظام الدین سہالوی کی زندگی ہی میں وفات پا گئے تھے۔ شیخ نظام الدین سے عمر میں سات سال چھوٹے تھے۔

رسالہ قطبیہ کی روایت کے مطابق مولانا محمد رضا سہالوی نے قاضی محب اللہ بہاری کی مشہور درسی کتاب ''مسلم الثبوت'' کی شرح بھی سپرد قلم کی تھی۔ مسلم الثبوت اصول فقہ کی معروف کتاب ہے اور درس نظامیہ میں شامل ہے۔ اس قسم کی کتاب کی شرح وہی عالم لکھ سکتا ہے جو علم فقہ، اصول فقہ اور دیگر علوم متداولہ میں مہارت رکھتا ہو۔

بہرحال مولانا محمد رضا سہالوی کے حرمین شریفین جانے کے بعد ان کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ ان کے سال وفات اور مقام وفات کا بھی کسی کو علم نہیں ❶۔

۲۹۔ شیخ محمد رضا لاہوری

شیخ محمد رضا لاہوری، سرزمین پنجاب میں بارھویں صدی ہجری کے نامور فاضل اور مشہور عالم تھے، زیادہ تر درس و تدریس اور فتاویٰ نویسی میں مصروف رہتے۔ حسن قبول، کثرت تلامذہ اور مسترشدین کی تعداد میں اس دور کے پنجاب میں ان کا بڑا نام تھا۔ خطۂ پنجاب کے اس عالم و فقیہ نے ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۱۱۸ھ/ ۱۱ راگست ۱۷۰۶ء کو اپنے شہر لاہور میں وفات پائی ❷۔

۳۰۔ مولانا محمد سعید انصاری سہالوی

مولانا محمد سعید سہالوی، شیخ قطب الدین شہید انصاری سہالوی کے دوسرے بیٹے تھے۔ موضع سہالی میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اپنے والد گرامی شیخ قطب الدین شہید سے علم حاصل کیا اور عرصے تک ان کی خدمت میں رہے۔ والد کی شہادت کے بعد ۱۱۰۳ھ/ ۱۶۹۲ء میں مظلومی کا محضر لے کر بادشاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر کی بارگاہ میں دکن گئے اور بادشاہ سے لکھنؤ کی مشہور عمارت فرنگی محل کی معافی اور عطیے کا فرمان حاصل کیا۔ واپس آ کر اس عمارت پر قابض ہوئے۔ بعد ازاں اپنے تمام بھائیوں اور اعزہ و اقارب سمیت اس میں سکونت گزین ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد دوبارہ فرنگی محل کی معافی اور عطیے کے فرمان کی توثیق و استحکام وغیرہ کے لیے بادشاہ کی خدمت میں گئے اور اسناد قبضہ حاصل کر کے تمام کاغذات بھائیوں کے پاس بھیجے۔

مولانا محمد سعید انصاری سہالوی اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم و فقیہ، باعمل اور صاحب عفت و حیا بزرگ تھے۔ فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین کی جماعت میں شامل ہونے کا بھی انھیں اعزاز حاصل ہے۔ بارھویں

❶ احوال علمائے فرنگی محل ص ۳۲، ۳۳۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۵۹۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۸۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۰۴۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۰۵۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۳۱۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صدی ہجری کے اس عالم دین نے مغل حکمران شاہ عالم کے عہد حکومت میں عالم جوانی میں وفات پائی۔

ایک روایت کے مطابق بادشاہ سے دوسری مرتبہ فرنگی محل کی اسناد توثیق لے کر لکھنؤ میں بھائیوں کو بھجوا دیں تھیں اور خود مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے۔ پھر وہیں بیمار ہو کر راہیٔ ملک بقا ہوئے ❶۔

۳۱۔ شیخ محمد سعید انبالوی

شیخ محمد سعید بن محمد یوسف بن غلام محمد بن محمد افضل حسینی ترمذی انبالوی، کبار علما میں سے تھے۔ مشرقی پنجاب کے شہر انبالہ کے رہنے والے تھے اور وہاں کی مسند مشیخت پر فائز تھے۔ متبع سنت اور حدیث رسول اللہ ﷺ کے بہ درجہ غایت پابند تھے۔ اسلاف کرام کے ان آثار و روایات کو جو کتاب و سنت سے ہم آہنگ ہوں، ماننا ضروری قرار دیتے تھے۔ معاملات دنیا سے منقطع ہو کر زہد و عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ اور صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کو اپنا مشغلہ حیات قرار دے لیا تھا۔ دین کی تبلیغ و اشاعت ان کا مطمح نظر تھا۔ اسباب دنیا سے اس قدر بے نیاز تھے کہ کوئی شئی اپنے پاس نہ رکھتے اور کھانے پینے کی کسی چیز کا ذخیرہ نہ کرتے۔ جو کچھ کہیں سے ملتا، بے دریغ اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتے، کل کی بالکل پروانہ کرتے۔ ملوک و امرا ان کو لاکھوں روپے نقد اور کئی قسم کی چیزیں بھیجتے، ان میں سے کوئی چیز گھر میں نہ رکھتے، سب فقرا و مساکین اور مستحقین میں تقسیم کر دیتے۔ دنیا کے مال و متاع میں سے کوئی شے بھی رات کو اپنے پاس نہ رہنے دیتے، جس وقت کچھ ہاتھ آتا، اسی وقت اصحاب حاجت کو دے دیتے۔

شیخ محمد سعید انبالوی نے ۵ رمضان المبارک ۱۱۰۳ھ/ ۱۱ مئی ۱۶۹۲ء کو وفات پائی۔ ان کی قبر بکھرام میں ہے ❷۔

۳۲۔ مولانا محمد شجاع ہتگامی

مولانا محمد شجاع بن معز الدین ہتگامی، موضع ہتگام میں پیدا ہوئے جو اس زمانے میں اعمال الہ آباد (یوپی) میں ایک اچھا خاصا قریہ تھا۔ وہیں تربیت پائی۔ علامہ محمد برکت اللہ آبادی اور قاضی محمد پناہ جون پوری سے حصول علم کیا۔ اس کے بعد شیخ محمد معصوم کاکوروی سے اخذ طریقت کیا، طویل مدت تک ان سے منسلک رہے اور علم و معرفت کی بلند منزلوں تک پہنچے۔ پھر جب ان کے علاقے پر کفار کا غلبہ ہو گیا تو افغانستان چلے گئے۔ خاصا عرصہ وہاں سکونت اختیار کیے رکھی۔ بعد ازاں وطن واپس آئے تو "منہج الرشاد لنجاۃ العباد" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ صاحب نزہۃ الخواطر سید عبدالحی حسنی لکھنوی کے پاس خود

❶ تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۶۲، ۶۳۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۹۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۱۱۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۱۱، ۳۱۲ بحوالہ بحر زخار۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود تھا، اس کا سال کتابت ۱۱۸۱ھ/۶۷-۱۷۶۷ء ہے۔

کتاب تین مقالات اور خاتمے پر مشتمل ہے۔ دو مقالے اعتقادیات پر محیط ہیں۔ مقالۂ اول مبدا اور مقالۂ ثانی معاد کا احاطہ کیے ہوئے ہے، مقالۂ ثالث اور اوراد و وظائف سے متعلق ہے۔ خاتمۂ کتاب بعض اولیائے کرام اور عالم خواب میں رسول اللہ ﷺ کی رؤیت کے بارے میں ہے۔

اس کتاب کے چند اقتباسات سید عبدالحی حسنی لکھنوی نے نزہۃ الخواطر کی جلد ششم میں نقل کیے ہیں۔ ان میں ایک اقتباس تشہد میں رفع سبابہ کے متعلق ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

اختلف علماءنا فی رفعها وعدمه فی التشهد فاجازه قوم ونقاه اخرون فالمثبتون کثیرون والنافون شرذمة قلیلون والحق ان الرافع هو الموافق للاحادیث الصحاح والروایات الفقهیة۔

یعنی ہمارے علما کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ تشہد میں انگشت شہادت اٹھانی چاہیے یا نہیں۔ ایک جماعت نے اٹھانے کی اجازت دی ہے اور دوسروں نے اس سے روکا ہے، جو لوگ رفع سبابہ کے ثبوت کے قائل ہیں، ان کی تعداد زیادہ ہے اور روکنے والے بہت تھوڑے ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ رفع سبابہ احادیث صحاح اور روایات فقہیہ کے عین مطابق ہے۔

ایک زمانے میں طبقۂ علما میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا تھا کہ نماز جمعہ کے بعد احتیاطاً نماز ظہر پڑھنی چاہیے یا نہیں۔ بعض اس کے قائل تھے اور بعض مخالف۔ دونوں طرف کے علما اس سلسلے میں دلائل پیش کرتے ہیں۔ شیخ محمد شجاع ھنگامی نے بھی اس مسئلے پر بحث کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ نماز جمعہ کا وجوب کتاب و سنت اور اجماع سے ثابت ہے۔ فقہا میں اس کے وجوب سے متعلق کوئی اختلاف نہیں۔ البتہ اختلاف شرائط جمعہ میں ہے۔ مصنف نے اس ضمن میں دونوں نقطۂ ہائے نظر بیان کر دیے ہیں اور آخر میں یہ کہا ہے کہ روایات فقہی کی رو سے نماز جمعہ کے بعد بطور احتیاط نماز ظہر پڑھ لینی چاہیے۔ بالخصوص اس زمانے میں جب کہ مسلمانوں کی اپنی حکومت اور ان کا اپنا حکمران نہ ہو۔

شیخ محمد شجاع ھنگامی نے اس کتاب میں یزید بن معاویہ اور حجاج بن یوسف پر لعنت بھیجنے کی سخت الفاظ میں مخالفت کی ہے اور اس سلسلے میں مختلف دلائل دیتے ہوئے ایک دلیل یہ دی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل قبلہ اور نمازیوں پر لعنت بھیجنے سے منع فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

لا ینبغی اللعن علیه ولا علی الحجاج ومن کان من اهل القبلة لان النبی صلی الله علیه وسلم نهی عن لعن المصلین۔

یعنی نہ تو یزید کو ملعون کہنا چاہیے نہ حجاج بن یوسف کو، نہ کسی ایسے شخص کو جو اہل قبلہ میں سے ہے، اس لیے کہ رسول ﷺ نے نمازیوں کو ملعون قرار دینے سے منع فرمایا ہے۔

کتاب کے جو بعض اقتباسات سید عبدالحی حسنی لکھنوی نے نزہۃ الخواطر میں نقل کیے ہیں، وہ بڑے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دلچسپ اور مدلل ہیں۔ مصنف نے مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے بعض افکار سے بھی شدید اختلاف کیا ہے۔

بارھویں صدی ہجری کے یہ عالم قرآن، حدیث، فقہ اور دیگر علوم مروجہ پر گہری نظر رکھتے تھے ❶۔

نمازِ جمعہ کے بعد احتیاطاً نمازِ ظہر پڑھنے کے متعلق مولانا محمد سجاع ہتگامی کا نقطۂ نظر صحیح نہیں۔ جمعہ ہر زمانے اور ہر ملک میں پڑھنا ضروری ہے۔ اس کے بعد احتیاطاً نماز ظہر پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

۳۳۔ مولانا محمد شفیع بدایونی

صوبہ یوپی کے شہر بدایوں کو طویل عرصے تک علم و فضل کے مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ مولانا محمد شفیع بدایونی بھی اسی شہر سے تعلق رکھتے تھے، اور عہد اورنگ زیب کے معروف علما اور ممتاز فقہا میں سے تھے۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ ان کے آبا و اجداد میں سے ایک بزرگ قاضی دانیال تھے جو عراق سے آئے اور بدایوں کے قاضی مقرر کیے گئے۔ انھوں نے مستقل طور پر بدایوں ہی میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ ان کی اولاد میں سے ایک شخص شیخ مصطفی تھے، جو تصوف و معرفت میں یگانۂ روزگار تھے اور شیخ محی الدین ابن عربی کی تصنیفات کے دقیق مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے میں ماہر تھے۔ فقہ پر بھی نظر رکھتے تھے۔ یہ مولانا محمد شفیع بدایونی کے والد گرامی تھے۔ مولانا محمد شفیع بدایونی نے اپنے بلند مرتبت باپ سے علم حاصل کیا، اور فقہ، اصول اور تصوف کے اونچے درجے کو پہنچے۔ تمام عمر درس و تدریس میں صرف کر دی اور تشنگان علوم کو مستفید فرمایا۔ ۹۷ سال کی عمر پا کر ۲۲ شوال کو گیارھویں صدی ہجری کے آخر، یا بارھویں صدی ہجری کے اوائل میں فوت ہوئے۔ دو بیٹے اپنی یادگار چھوڑے، ایک کا نام مولانا محمد شریف تھا اور دوسرے کا خطیب عبداللطیف ❷۔

۳۴۔ قاضی محمد شفیع گجراتی

قاضی محمد شفیع گجراتی حنفی المسلک تھے۔ اپنے علاقے کے شیخ و فاضل بزرگ تھے اور فقہ و اصول میں یگانۂ روزگار شمار کیے جاتے تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں میرٹھ کے منصب قضا پر مامور کیے گئے، جو اعمال احمد آباد میں واقع ہے ❸۔

۳۵۔ مولانا محمد صادق ٹھٹھوی سندھی

مولانا محمد صادق ٹھٹھوی سندھی شیخ عنایت اللہ ٹھٹھوی سندھی کے فرزند ارجمند تھے، جو دیار سندھ کے

---

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۱۵ تا ۳۱۸۔

❷ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۹۳، ۱۹۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۱۸۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۱۹۔ بحوالہ مرأۃ احمدی۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بہت بڑے صوفی تھے۔ شیخ محمد صادق سندھی، ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ علم نحو اور علوم عربیہ یعنی فقہ و اصول اس دور کے جید عالم شیخ محمد معین سندھی سے حاصل کیے، اور علوم منقول و معقول کے فحول علما میں گردانے گئے۔ حصول علم کے بعد حج کے لیے روانہ ہوئے اور شہر سورت میں پہنچے تو وہاں شیخ عبدالولی بن شیخ سعد اللہ سلونی کا حلقۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور شیخ ممدوح سے علوم حکمیہ کی تکمیل کی۔ پھر اپنے وطن سندھ واپس آ گئے اور درس و تدریس کو اپنا مشغلہ بنا لیا۔ ان سے خلق کثیر نے استفادہ کیا۔ صرف تدریس سے تعلق رکھتے تھے ❶۔

۳۶۔ شیخ محمد صالح بنگالی

شیخ محمد صالح بنگالی، فقہ و اصول، فلسفہ و حکمت، منطق و کلام اور تمام فنون نقلیہ و عقلیہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ کتب درسیہ پہلے قاضی شہاب الدین گوپاموی (متوفی تقریباً ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء) سے پڑھیں۔ اس کے بعد سید محمد زاہد حسینی ہروی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے اور ان سے خوب استفادہ کیا۔ پھر خود درس و تدریس کی مسند بچھائی اور بہت سے طلبائے علم کو مستفید فرمایا ❷۔

۳۷۔ مولانا محمد صدیق لاہوری

مولانا محمد صدیق بن محمد حنیف بن محمد لطیف لاہوری۔ اپنے زمانے میں لاہور اور اس کے گرد و نواح کے جلیل القدر عالم تھے۔ ان کے والد محمد حنیف کابل سے لاہور آ کر مقیم ہوئے تھے، اور مسجد وزیر خاں میں امامت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ محمد صدیق اتوار کے روز ۲۹ محرم ۱۱۲۸ھ/۱۳ جنوری ۱۷۱۶ء کو پیدا ہوئے۔ پانچ سال کی عمر کو پہنچے تو صاحبِ تعلیقاتِ بیضاوی مولانا محمد عابد لاہوری سے قرآن پڑھنا شروع کیا۔ قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد مرزا احمد اللہ، ملا حفیظ اللہ، ملا عبداللہ، مولانا شہریار، مولانا محمد عابد لاہوری اور بعض دیگر علما کے حلقۂ شاگردی میں داخل ہوئے اور تحصیل علم کی۔ پھر بحث و اشتغال اور علم و فضل میں مرتبۂ بلند پر فائز ہوئے۔ جماعتِ علما میں صاحب فضل و کمال قرار پائے اور افتا و تدریس کی مسند جلیلہ کو رونق بخشی۔ طویل مدت تک درس و افادہ میں مصروف رہے۔ پھر ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۷ء میں ارض حجاز کا سفر کیا اور حج و زیارت کے شرف سے مشرف ہوئے۔ اس زمانے میں وہاں متعدد اصحاب حدیث تعلیم حدیث کے فرائض انجام دیتے تھے، مولانا محمد صدیق ان کی خدمت میں گئے اور شیخ یحییٰ بن صالح مکی مدرس مدرسہ مسجد الحرام اور نامور محدث شیخ ابوالحسن سندھی مدرس مدرسہ مدینہ منورہ سے حدیث کی سند لی۔

مولانا محمد صدیق متعدد کتابوں کے مصنف تھے، جن کے نام یہ ہیں۔

سلك الدرر: یہ رسول اللہ ﷺ کی غیر منقوط سیرت ہے۔

---

❶ تحفۃ الکرام (اردو ترجمہ) ص ۳۶۵، ۳۶۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۲۰۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۲۱ بحوالہ رسالہ قطبیہ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مدار الاسلام فی علم الکلام: القول الحق فی ترک الشعر والحلق، شروط الایمان، درء التعسف عن ساحة عصمة یوسف، ھدم الطاغوت فی قصة ھاروت وماروت، نور ھدم الثقلین فی تمثال النعلین، شرح النفحات الباھرہ فی جواز القول بالخمسة الطاھرہ المسمی بہ توضیح السنة فی تفضیح البدعہ، ازالة الفسادات فی شرح مناقب السادات۔ یہ کتاب شیخ شہاب الدین دولت آبادی کی مناقب السادات کی شرح ہے۔ تبییض الرق فی تبیین الحق فی ردماتساھل فیہ الشیخ عبدالحق، جامع الوظائف، لقطة الحطب، الدیوان مزیل الاحزان، زبدة الفرح، جامع طب احمدی، ترجمہ فقر محمدی، ھدیة انام، یہ کتاب خطیبوں کے لیے ہے۔ ان کے علاوہ ان کی بعض اور تصانیف بھی تھیں۔

مولانا محمد صدیق لاہوری، نامور فقیہ، کثیر التصانیف مصنف، بہترین ادیب اور انشا پرداز، مشہور مدرس اور صاحب تحقیق مفتی تھے۔ خطۂ لاہور کے اس ہمہ اوصاف عالم نے ۱۱۹۳ھ/ ۱۷۷۹ء میں اس دنیائے فانی سے سفر آخرت اختیار کیا[1]۔

گزشتہ سطور میں مولانا محمد صدیق لاہوری کے اساتذہ میں ایک عالم دین مولانا شہر یار کا نام آیا ہے۔ یہ بہت بڑے صاحب علم بزرگ تھے اور لاہور کی مسجد چیپانوالی میں امامت و خطابت اور تدریس و افتا کے منصب پر فائز تھے۔ ان کے تفصیلی حالات تو افسوس ہے، معلوم نہیں ہو سکے، البتہ ان کا ایک واقعہ پروفیسر مولانا علم الدین سالک مرحوم نے روزنامہ ''امروز'' (لاہور مورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۶۰ء) کے عید نمبر میں اپنے ایک مضمون میں بیان کیا تھا، جو ''لاہور کی تاریخی عید'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس واقعہ کا تعلق مولانا محمد صدیق سے بھی ہے۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا، جب لاہور میں احمد شاہ ابدالی اور میر منو کا مقابلہ ہوا، اور ابدالی نے میر منو کو شکست دے کر لاہور فتح کیا۔ اتفاقاً ان دنوں عید الفطر آئی تو احمد شاہ ابدالی نے مسجد وزیر خاں میں مولانا محمد صدیق کی اقتدا میں نماز ادا کی۔ اس واقعہ کو سمجھنے کے لیے اس کا پس منظر بیان کرنا ضروری ہے تاکہ اُس عہد کے پنجاب اور لاہور کے سیاسی حالات کا علم ہو سکے۔

نواب معین الملک عرف میر منو مغل حکمران محمد شاہ (۱۱۳۱ھ تا ۱۱۶۱ھ، ۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء) کے وزیر اعظم نواب قمر الدین خاں کا خلف الرشید تھا۔ اس نے سرہند کے میدان میں احمد شاہ ابدالی کے خلاف لڑتے ہوئے غیر معمولی شجاعت اور بے مثال استقلال کا مظاہرہ کیا تھا۔ جب اس کا باپ توپ کے گولے سے زخمی ہو کر دار و گیر جہاں سے آزاد ہو گیا تو محمد شاہ نے اسے لاہور کا ناظم مقرر کیا اور حکم دیا کہ جس قدر جلد ہو سکے حالات پر قابو پایا جائے اور پنجاب سے ان عناصر کو ختم کر دیا جائے جو فتنہ و فساد پھیلانے کا باعث ہیں۔ مرکز اس سلسلے

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۹۴۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۵۱، ۴۵۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۲۳، ۳۲۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں اس کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی کرے گا۔

میر منوان ہدایات کے مطابق لاہور پہنچا، ارد گرد کے حالات کا جائزہ لیا اور مقابلہ کرنے کے لیے منصوبہ بندی کی۔ ابھی وہ اپنے اس فرض سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ اطلاع ملی کہ احمد شاہ ابدالی سرہند کی جنگ کا انتقام لینے کے لیے بھاری لاؤ لشکر کے ساتھ لاہور کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ میر منو نے اپنی فوج کو جمع کیا اور مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔ دونوں جانب کی فوجیں عرصے تک ایک دوسرے کے سامنے پڑی رہیں۔ کبھی کبھار کوئی چھوٹی موٹی جھڑپ ہو جاتی، لیکن اس کے ساتھ ہی صلح کے لیے گفت و شنید بھی جاری رہی۔ آخر دونوں فریق (میر منو اور احمد شاہ ابدالی) اس بات پر متفق ہو گئے کہ لاہور کے چار محال یعنی سیالکوٹ، پسرور، گجرات اور اورنگ آباد کا مالیہ خراج کے طور پر سالانہ احمد شاہ کی خدمت میں پیش ہوتا رہے گا۔ یہ معاہدہ طے ہونے کے بعد ابدالی واپس چلا گیا۔

اس طرح ابدالی کے بیرونی خطرے کو دور کر کے میر منو داخلی فتنوں کی طرف متوجہ ہوا، اور ان کو ختم کرنے کے لیے اسے وقت مل گیا۔ اس نے اپنے علاقے میں نہایت مؤثر اقدامات کیے اور تھوڑے ہی عرصے میں پورے علاقے کو پہلے تو مرہٹوں سے نجات دلائی، پھر کامل حزم و احتیاط سے سکھوں کی طاقت کو ختم کیا اور ان کی دہشت گردی کی وجہ سے شہری اور دیہاتی زندگی میں جو تعطل پیدا ہو گیا تھا، اس کو رفع کیا۔ اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملتان اور لاہور کے صوبے امن و سلامتی کا گہوارہ بن گئے۔

ان معاملات سے فارغ ہو کر میر منو نے ابدالی کے متوقع حملوں کی روک تھام کے لیے عملی تدابیر اختیار کیں۔ سرحدوں پر مورچے بنائے اور وہاں تازہ دم فوج متعین کی۔ وسائل رسل و رسائل اور آمد و رفت کا پورا انتظام کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام علاقہ خطرات کی زد سے محفوظ ہو گیا اور ہر شخص امن و اطمینان کا سانس لینے لگا۔

۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) کے آخر میں محمد شاہ نے وفات پائی۔ احمد شاہ ابدالی کو اس کی وفات کا پتا چلا تو اسے میر منو سے صلح کرنے پر بہت افسوس ہوا، کیونکہ وہ اس حقیقت سے خوب واقف تھا کہ ایک بادشاہ کی موت اور دوسرے کی تخت نشینی سے کس قدر جھمیلے پیدا ہوتے ہیں۔ ہر چند وہ میر منو کے مقابلے میں اترنا چاہتا تھا، مگر معاہدے کی پابندیوں سے جکڑا ہوا تھا، تاہم وہ ہندوستان پر حملہ کرنے کے بہانے تلاش کرتا رہا، لیکن اس وقت اسے کوئی بہانہ نہ مل سکا۔ ادھر میر منو بھی اس کے عزائم سے غافل نہ تھا، اس نے چار محال کے خراج کا چکمہ دے کر اور ایک سال کی رقم ادا کر کے اگرچہ اسے وقتی طور پر شمالی ہند پر حملہ آور ہونے سے روک دیا تھا، لیکن خراج کی پوری رقم چونکہ ادا نہیں کی گئی تھی، اس لیے اس کو بہانہ بنا کر کسی وقت بھی وہ شمالی ہند کو پامال کرنے کے لیے خراج کی بقایا رقم کو وجہ نزاع قرار دے سکتا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، ابدالی نے بقایا رقم کا مطالبہ کیا اور میر منو نے حسب معمول اسے الفاظ کی شیرینی سے ٹالنا چاہا۔ ابدالی نے یہ سوچ کر کہ فوج کشی کے بغیر یہ رقم وصول نہ ہو گی، فوج کو تیاری کا حکم دیا۔ ایک لشکر جرار کے ساتھ دریائے سندھ عبور کیا، اور پوری تیزی سے چناب کے کنارے پہنچ کر دم لیا۔ وہاں سے اپنے دیوان راجہ سکھ جیون لال کو میر منو کے پاس بھیجا تا کہ وہ اس جھگڑے کو مصالحت

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ساتھ طے کر لے اور جنگ کی نوبت نہ آئے۔ راجہ سکھ جیون لال لاہور پہنچا تو میر منو نے بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور پوری خاطر مدارات کی، لیکن اسے خراج کی رقم وصول نہ ہو سکی اور وہ مایوس ہو کر واپس چلا گیا، جس سے احمد شاہ ابدالی کو سخت صدمہ پہنچا۔

دیوان راجہ سکھ جیون لال کو خالی ہاتھ واپس بھیجنے کے فوراً بعد میر منو نے اپنی فوج کو تیاری کا حکم دیا اور ایک زبردست فوج کے ساتھ چناب کی جانب روانہ ہوا۔ اس سے اس کا مقصد احمد شاہ ابدالی پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ اس کی دھمکیوں کی اسے پروا نہیں اور وہ لڑنے کو تیار ہے۔ لاہور سے روانہ ہونے سے پہلے اس نے والی ملتان دیوان کوڑا مل اور والیٔ دوآب (جالندھر) آدینہ بیگ کو لکھا کہ وہ اپنی اپنی فوجوں کو حرکت دیں اور دریائے چناب کے کنارے آکر اس سے ملیں۔ ساتھ ہی احتیاط کے پیش نظر اپنی والدہ اور اہل وعیال کو (جموں) کشمیر بھیج دیا تا کہ وہ حملہ آور کی دست برد سے محفوظ رہیں۔

احمد شاہ ابدالی نے میر منو کے عزم وثبات کو دیکھ کر اپنے مورچے وزیر آباد اور سوہدرہ کے درمیان قائم کیے۔ مگر یہ مقام بھی اسے پسند نہ آیا تو وہاں سے آہستہ آہستہ سرکتا ہوا شاہدرہ کے قریب پہنچ گیا۔ میر منو بھی سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ اس نے دریائے راوی عبور کیا اور خندقیں کھود کر جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ ابدالی کا لشکر اس کے سامنے اور لاہور شہر اس کی پشت پر تھا۔ اب خندقوں کی اوٹ میں اکا دکا جھڑپیں ہونے لگیں۔ کئی روز یہ سلسلہ جاری رہا، مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ البتہ فریقین کی فوجوں کی کثرت سے راوی اور چناب کا درمیانی علاقہ بالکل برباد ہو گیا اور قحط کے آثار نمودار ہونے لگے۔ ایک رات ابدالی نے نہایت خفیہ طریقے سے راوی کو عبور کیا اور محمود بوٹی، اور شالا مار باغ کے گردونواح میں اپنا کیمپ قائم کر لیا اور فیصلہ کن جنگ کی تیاری شروع کر دی۔

ادھر میر منو کو اس کا علم ہوا تو اس نے بھی شمشیر بند ہو کر غنیم سے معرکہ آرا ہونے کا عزم کر لیا، شہر پناہ، قلعہ اور دوسرے اہم ناکوں کو درست کیا اور خندقوں کا دوبارہ جائزہ لیا۔ اسے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ اس کے مورچے روز بروز کمزور ہو رہے ہیں، سامان رسد میں کمی واقع ہو گئی ہے اور جانوروں کے لیے چارہ کم یاب ہو گیا ہے۔ ابدالی کے فوجی دستے ہر چیز کی درآمد کو سختی کے ساتھ روک رہے ہیں۔ جھڑپیں بدستور جاری ہیں اور شکستہ دیواروں اور فصیلوں کی مرمت ہو رہی ہے۔ اس طرح چار مہینے گزر گئے۔ قحط نے باشندگان شہر کو اپنے آہنی پنجوں میں دبوچ لیا ہے، مگر فوج کے لوگ پوری دلیری سے ابدالی کی ہر تدبیر کو ناکامی سے بدل دینے میں مصروف ہیں اور اس کے ہر حملے کا دنداں شکن جواب دے رہے ہیں۔ اس کے آدمی آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو میر منو کے فوجی پوری طاقت کے ساتھ ان کو پیچھے مورچوں میں دھکیل دیتے ہیں۔

احمد شاہ ابدالی کو یقین ہو گیا تھا کہ میر منو آخر دم تک لڑے گا، وہ لاہور شہر کا دفاع کرتا ہوا مر جائے گا مگر شہر اس کے حوالے نہیں کرے گا۔ یہ سوچ کر اس نے محاصرے کو اور زیادہ سخت کر دیا، اور جن جن راستوں سے شہر میں کھانے پینے کا سامان آتا تھا، ان پر قبضہ کر لیا۔ اس سے شہر کے لوگ بہت زیادہ پریشانی میں مبتلا ہو

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گئے اور حالات اس درجے ابتر ہو گئے کہ لوگوں نے چھپر کاٹ کاٹ کر چارے کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیے۔ اس صورت حال کو دیکھ میر منو نے مجلس مشاورت منعقد کی، جس میں دیوان کوڑا مل، آدینہ بیگ اور متعدد چھوٹے بڑے امیر شریک ہوئے، انھوں نے تمام حالات کا جائزہ لیا اور افغانوں کے جبر و تشدد اور ظلم و ستم پر سخت نفرت کا اظہار کیا۔ معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد متفقہ طور سے فیصلہ کیا گیا کہ یا تو شہر سے باہر نکل کر دشمن پر حملہ کیا جائے اور پوری قوت سے کام لے کر اسے ختم کر دیا جائے یا پھر مصالحت کی کوشش کی جائے، مگر دیوان کوڑا مل نے اس کے خلاف رائے دی، اس نے کہا کہ جنگ کو طول دیا جائے کیونکہ دو ہفتے تک گرمی شروع ہو جائے گی، افغان اسے برداشت کرنے کے عادی نہیں ہیں، وہ اس سے گھبرا جائیں گے اور محاصرہ ختم کر کے واپس جانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ لیکن دیوان مذکور کے اس دور اندیشانہ مشورے پر کسی نے کان نہ دھرے، اور سب لوگ پہلی تجویز پر عمل کرنے اور حملے کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ چنانچہ ۱۲ اپریل ۱۷۵۲ء کو زوردار حملہ کیا گیا اور نتیجتاً پہلے ہی حملے میں محمود بوٹی کے کئی مورچوں پر قبضہ کر لیا گیا۔ احمد شاہ ابدالی نے اپنی فوجوں کی کمزوری دیکھی تو سواروں کو حکم دیا کہ وہ بھی توپ خانے کے ساتھ مل کر حملہ کریں۔

دوپہر تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا، توپیں آگ برسا رہی تھیں اور لڑائی پوری شدت سے جاری تھی۔ اتنے میں دیوان راجہ کوڑا مل کا ہاتھی ایک قبر میں دھنس گیا اور ایک افغان سپاہی نے پوری تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا سر کاٹ لیا اور بطور نذر ابدالی کی خدمت میں پیش کیا۔ میر منو کے لیے یہ بہت بڑا حادثہ تھا، اور اس کی فوج میں اس سے بددلی اور انتشار پھیل گیا۔ آدینہ بیگ میدان جنگ سے بھاگ گیا اور فوج تتر بتر ہو گئی۔ میر منو نے حالات پر قابو پانے کی بے حد کوشش کی مگر ناکام رہا۔ مجبوراً باقی ماندہ فوج کو ساتھ لے کر شہر پناہ کے اندر داخل ہوا۔ لیکن اس کی حالت بالکل قابل اعتماد نہ رہی تھی۔

میر منو کے لیے یہ سخت آزمائش اور شدید ابتلا کا وقت تھا، اس نے ہر طرف سے مایوس ہو کر صلح کے لیے سلسلۂ جنبانی شروع کیا، اور ابدالی کے پاس اپنے ایلچی بھیجے اور اس کے صدر اعظم شاہ ولی خاں کی وساطت سے گفتگوئے مصالحت کا آغاز ہوا۔ ابدالی بھی تنگ آ چکا تھا اور یہ سب اس کی منشا کے عین مطابق تھا۔ چنانچہ معمولی سی ابتدائی گفت و شنید کے بعد اس نے محاصرہ اٹھا لیا اور اپنے ایک معتمد امیر جان خاں کو میر منو کے پاس بھیجا کہ اس کو کامل اعزاز و اکرام کے ساتھ اس کے پاس لائے۔ ابدالی اس وقت شالامار باغ میں مقیم تھا۔ امیر جان خاں میر منو کو اپنے ساتھ لے کر دربار میں داخل ہوا تو بادشاہ نے نہایت اعزاز و احترام کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا، مزاج پرسی کی اور بہترین الفاظ میں خیر خیریت پوچھی۔ ادھر ادھر کی بات چیت کے بعد احمد شاہ ابدالی نے میر منو سے کہا۔

”تم نے ابھی تک اپنے آقا (یعنی میرے) حضور اپنی نیازمندی کا اظہار کیوں نہیں کیا اور خاص اسی مقصد کے لیے ہمارے دربار میں حاضری نہیں دی“؟

میر منو نے کہا: ”میرا تعلق دوسرے آقا سے ہے۔“

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

احمد شاہ ابدالی نے طنز کرتے ہوئے کہا: ''اس آڑے وقت میں تمھارا آقا تمھاری مدد کے لیے کیوں نہیں آیا؟''

میر منو نے جرأت مندانہ لہجے میں جواب دیا: ''اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ اس کے خادم اپنی مدد آپ کر سکتے ہیں، کسی کے محتاج نہیں ہیں۔''

اس کے بعد احمد شاہ ابدالی نے میر منو سے پوچھا: ''فرض کرو، میں اس جنگ میں تمھارے ہاتھوں گرفتار ہو جاتا تو تم میرے ساتھ کیا سلوک روا رکھتے؟''

میر منو نے نہایت متانت سے جواب دیا: ''میں اسی وقت اعلیٰ حضرت کا سر اقدس، جناب کے جسم مبارک سے علیحدہ کرتا اور اسے بطور نذر شہنشاہ دہلی کے حضور پیش کرتا۔''

احمد شاہ نے سوال کیا: ''اب تم مجھ سے اپنے ساتھ کس سلوک کی توقع رکھتے ہو؟''

میر منو نے پہلے سے زیادہ سنجیدہ شکل بنا کر جواب دیا: ''میں آپ کے رحم و کرم پر ہوں، اگر آپ قصاب ہیں تو میرا سر قلم کر دیں، اگر بردہ فروش ہیں تو میرا جسم فروخت کر دیں اور اگر بادشاہ ہیں تو مجھے شاہانہ سلوک کا مستحق قرار دیں۔''

میر منو کے اس جواب سے احمد شاہ ابدالی نہایت متاثر ہوا، اس کا چہرہ چمک اٹھا اور اپنی نشست سے اٹھ کر میر منو سے بغل گیر ہوا، اسے فرزند خاں بہادر رستم ہند کا خطاب عطا کیا اور بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کیا۔

ابھی احمد شاہ ابدالی کا قیام لاہور میں تھا کہ عید کا دن آ گیا۔ احمد شاہ کے حکم سے عید کی نماز کا انتظام مسجد وزیر خاں میں کیا گیا۔ اس کا با قاعدہ اعلان ہوا، اور امرا و وزرا کے علاوہ بہت بڑی تعداد میں لوگ مسجد میں جمع ہوئے۔ ان دنوں مسجد وزیر خاں کے خطیب یہی مولانا محمد صدیق لاہوری تھے، جن کا اوپر کی سطروں میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہ متبحر عالم دین اور ایک علمی خاندان کے فاضل جلیل تھے۔ ان کے والد بھی مسجد وزیر خاں کے منصب خطابت پر فائز رہ چکے تھے اور سب کے نزدیک قابل احترام تھے۔ نماز ختم ہوئی تو مولانا محمد صدیق خطبے کے لیے منبر پر تشریف لائے، خطبہ شروع ہوا، خطبے کے دوران انھوں نے احمد شاہ ابدالی کی طرف اشارہ کر کے اسے ''سلطان العادل'' کے لقب سے پکارا۔

اس وقت مولانا شہر یار بھی مسجد میں موجود اور نماز میں شریک تھے، وہ عالم گیر علمی شہرت کے مالک تھے، خطیب سے کچھ دور بیٹھے ہوئے تھے۔ اہل لاہور کے نزدیک وہ انتہائی قدر و منزلت کے حامل تھے۔ مسجد چینیاں والی میں گزشتہ بیس پچیس برس سے ان کا سلسلۂ درس جاری تھا۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، جو ہندوستان کے علاوہ، ایران، توران، افغانستان، بلخ، بدخشاں اور ترکستان تک پھیلا ہوا تھا اور ان تمام ممالک کے طلبائے علم با قاعدہ ان کی خدمت میں آتے اور شریک درس ہوتے تھے۔ خود مسجد وزیر خاں کے خطیب مولانا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محمد صدیق لاہوری بھی ان کے شاگرد تھے۔

جب خطبہ ختم ہوا اور مولانا شہر یار اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے بڑھے تو کسی نے انھیں بتایا کہ آپ کے شاگرد رشید نے محض خوشامد کی غرض سے احمد شاہ ابدالی کو "سلطان العادل" کہا ہے، حالانکہ افغانوں کے بے پناہ مظالم سے تمام ملک چیخ اٹھا ہے۔ مولانا شہر یار امام کے قریب پہنچے، احمد شاہ بھی وہاں کھڑا تھا۔ مولانا محمد صدیق نے احتراماً استاد کے ہاتھ چومے اور انتہائی تکریم بجالائے۔ احمد شاہ نے پوچھا، یہ کون بزرگ ہیں؟" مولانا محمد صدیق نے کہا، "میرے استاد مولانا شہر یار" وہ ان کی شہرت و قابلیت سے واقف تھا۔ چنانچہ وہ بھی آداب بجا لایا، اور سلام کیا۔ قدم بوسی کرنا چاہی تو مولانا نے منع کر دیا اور فرمایا "یہ شریعت کے خلاف ہے۔ اس قسم کی حرکت بالکل نہیں کرنی چاہیے"۔ پھر اپنے شاگرد سے مخاطب ہو کر کہا۔ "بیٹا! تم خوب جانتے ہو کہ افغانوں نے اہل شہر کو انتہائی پریشان کیا اور ہر قسم کے ظلم کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کے ظلم و تشدد کی فریاد کتنی مرتبہ بادشاہ کے حضور کی گئی مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی، کیا بادشاہ نے اس کا کوئی ازالہ کیا؟ اپنے ظالم سپاہیوں اور ستم گر سرداروں کو سزا دی؟ انھیں مظلوم شہریوں پر ظلم ڈھانے سے روکا؟ یاد رکھو، اسلام ایسے بادشاہ کو عادل کہنے کی اجازت نہیں دیتا۔"

تمام حاضرین مولانا شہر یار کی اس پُر تاثیر تقریر سے کانپ اٹھے۔ احمد شاہ ابدالی نے مولانا کو چپ کرانا چاہا مگر انھوں نے پروانہ کی، اور اپنی بات مکمل کر کے رہے۔ آخر بادشاہ نے کہا۔

"حضرت مولانا! آپ کس کے بارے میں اور کس کے سامنے یہ باتیں کر رہے ہیں؟"

مولانا شہر یار نے جواب دیا: "میں خوب جانتا ہوں کہ میرا مخاطب کون ہے اور میں کس کے سامنے کھڑا یہ باتیں کر رہا ہوں۔"

احمد شاہ نے کہا: "اس گفتگو کا انجام بھی آپ کو معلوم ہے؟"

مولانا شہر یار نے کہا: "ہاں! شہادت یا جلا وطنی، میں دونوں کے لیے تیار ہوں۔"

احمد شاہ ابدالی نے غصے میں آ کر مولانا کی جلا وطنی کا حکم دیا، اور پھر مولانا شہر یار موضع ٹانڈہ ضلع ہوشیار پور میں جا کر آباد ہو گئے اور وہیں وفات پائی۔

۳۸۔ مولانا محمد طاہر عباسی الٰہ آبادی

مولانا محمد طاہر عباسی الٰہ آبادی، علم و عمل میں یکتا، فضل و کمال میں منفرد اور درس و افادہ میں یگانۂ روزگار تھے۔ برصغیر کے معروف عالم دین شیخ محمد یحییٰ عباسی الٰہ آبادی المعروف شیخ خوب اللہ الٰہ آبادی کے فرزند گرامی قدر اور نامور فاضل مولانا محمد فاخر زائر الٰہ آبادی کے برادر محترم تھے۔ ۱۱۱۰ھ/ ۱۶۹۸ء کو الٰہ آباد میں پیدا ہوئے، جو ہندوستان کے صوبہ یوپی کا ایک مشہور شہر ہے۔ تفسیر بیضاوی کے محشی مفتی جار اللہ حسینی الٰہ آبادی سے علم حاصل کیا اور فقہ کی تعلیم بھی انہی سے پائی، یہاں تک کہ تمام علوم مروجہ میں ماہر کامل ہوئے اور سب سے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فوقیت لے گئے۔ تصنیف و تدریس اور افتا میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ نہایت ذہین، تیز حافظہ اور وسعت معلومات کے مالک تھے۔ معقولات و منقولات میں دسترس رکھتے اور مذاہب سلف و خلف سے پوری طرح آگاہ تھے۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ ان کے دو بھائی مولانا محمد ناصر الہ آبادی اور مولانا محمد فاخر زائر الہ آبادی جن کا شمار برصغیر کے فحول علما میں ہوتا ہے، ان کے شاگرد تھے، مولانا محمد یٰسین عثمانی جون پوری بھی ان کے حلقہ تلمذ میں شامل تھے۔ ان کے علاوہ خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔

سلسلۂ تدریس کے ساتھ ساتھ مولانا محمد طاہر الہ آبادی تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھتے تھے۔ ان کی تصنیفات میں ایک کتاب ''تحقیق الحق'' ہے جو انھوں نے قاضی نور اللہ شستری کی ''احقاق الحق'' کے جواب میں لکھی۔ قاضی شستری نے یہ کتاب شیخ روز بہان کی ''ابطال الباطل'' کے رد میں لکھی تھی، اور روز بہان نے اسے مطہر حلی کی ''نہج الحق'' کی تردید میں تصنیف کیا تھا۔ تحقیق الحق کے علاوہ مولانا محمد طاہر نے ابن العربی کی فصوص الحکم کی شرح سپرد قلم کی۔ بحث فدک کے بارے میں ایک رسالہ تالیف کیا۔ الشجرۃ القادریہ کی شرح قلم بند کی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ثبوت میں ایک رسالہ تحریر فرمایا۔ تفسیر بیضاوی پر تعلیقات لکھیں، قصیدہ طمطراقیہ کی شرح لکھی اور آیات تطہیر کی تفسیر رقم فرمائی۔ بہرحال مولانا محمد طاہر الہ آبادی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کے والد محترم مولانا محمد یحییٰ الہ آبادی بھی جلیل القدر عالم اور صوفی تھے۔ مولانا محمد طاہر نے پیر کے دن ۲ جمادی الاولیٰ ۱۱۴۳ھ/ ۲ نومبر ۱۷۳۰ء کو عین عالم شباب میں صرف تینتیس (۳۳) سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس وقت مولانا محمد یحییٰ زندہ تھے۔ وہ بیٹے سے ٹھیک ایک سال بعد ۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۱۴۴ھ/ ۳۱ اکتوبر ۱۷۳۱ء کو فوت ہوئے ❶۔

۳۹۔ مولانا محمد طاہر حسینی شاہ جہان پوری

مولانا محمد طاہر حسینی شاہ جہان پوری، فاضل اجل اور فقہ و اصول اور علوم عربیہ میں یگانہ روزگار تھے۔ شاہ جہان پور میں پیدا ہوئے اور حصول علم کے شوق میں مختلف اساتذہ کی خدمت میں حاضری دی، جن میں درس نظامیہ کے مرتب مولانا نظام الدین سہالوی لکھنوی (متوفی ۸ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ/ ۲۵ اپریل ۱۷۴۸ء) اور مولانا صفتہ اللہ خیر آبادی (متوفی ۱۸ ذی قعدہ ۱۱۵۷ھ/ ۱۲ دسمبر ۱۷۴۴ء) کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ سلسلۂ قادریہ کے مطابق مولانا نظام الدین سہالوی سے اخذ طریقت بھی کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے شہر شاہ جہان پور میں مسند درس بچھائی اور زندگی بھر درس و افادہ میں مصروف رہے۔ بارھویں صدی ہجری میں یہ اپنے علاقے اور شہر کے جید علما میں گردانے جاتے تھے ❷۔

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۲۵، ۳۲۶ بحوالہ ذیل الفیات۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۲۶۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴۰۔ مولانا محمد عابد سنامی لاہوری

مولانا محمد عابد سنامی لاہوری اپنے وقت اور علاقے کے شیخ، عالم کبیر اور مفسر و فقیہ تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نسل سے تھے۔ ولادت اور نشو ونما لاہور میں ہوئی۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو حضرت مجدد الف ثانی کے پوتے اور شیخ محمد سعید سرہندی کے بیٹے شیخ عبدالاحد سرہندی (متوفی ۲۷ ذی الحجہ ۱۱۲۷ھ/۱۳ دسمبر ۱۷۱۵ء) کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ طویل مدت تک ان سے استفادہ کرتے اور اخذ علم اور کسب معرفت میں مصروف رہے۔ بلند ہمت اور مستقل مزاج اتنے تھے کہ دل میں حج بیت اللہ کے شوق نے کروٹ لی تو لاہور سے پاپیادہ روانہ ہو گئے اور راستے کی تکلیفیں برداشت کرتے ہوئے مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ فریضہ حج ادا کیا، مدینہ طیبہ گئے اور پھر عازم وطن ہوئے۔

مولانا محمد عابد لاہوری عابد و زاہد بزرگ تھے۔ قرآن مجید کی بکثرت تلاوت کرتے اور شب و روز کا بیشتر وقت وظائف و اوراد اور ذکر الٰہی میں گزارتے۔ اس کے ساتھ ہی ہنگامۂ درس بھی جاری رکھتے اور بے شمار لوگ ان سے علمی استفادہ کرتے۔ ان کے حلقۂ درس میں تقریباً دو سو آدمی روزانہ آتے جو علم و معرفت سے بہرہ مند ہوتے۔ یہ عالم دین تصنیف و تالیف کا بھی گہرا ذوق رکھتے تھے اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں تفسیر بیضاوی کے حواشی و تعلیقات (لیکن نامکمل) خلاصۂ کیدانی کی بسیط و مفصل شرح، قصیدۂ بانت سعاد کی شرح، وجوہ اعجاز قرآن، رسالہ فی الاربعۃ الاحتیاطیۃ بعد صلوٰۃ الجمعہ، العشرۃ المبشرہ۔ فضائل الامۃ المرحومہ کتابیں ان کی تصنیفات میں شامل ہیں۔

مولانا محمد عابد سنامی لاہوری نے ۱۸ رمضان المبارک ۱۱۶۰ھ/۱۲ ستمبر ۱۷۴۷ء کو وفات پائی اور لاہور میں دفن کیے گئے [1]۔

۴۱۔ قاضی محمد عاشق کرانوی

قاضی محمد عاشق بن عبدالواحد بن محمد یعقوب انصاری سہالوی ثم کرانوی اپنے دور کے شیخ اور فقیہ تھے۔ شیخ قطب الدین شہید انصاری سہالوی کے خاندان سے تھے۔ مولد و منشا موضع سہالی ہے، جو لکھنو کے نواح میں واقع ہے۔ برصغیر کے نامور عالم اور درس نظامیہ کے مرتب شیخ نظام الدین انصاری سہالوی، (متوفی ۸ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ/۲۵ راپریل ۱۷۴۸ء) کے ہم درس تھے۔ شرح شمسیہ سے لے کر شرح مواقف تک درسی کتابوں میں دونوں ایک دوسرے کے شریک درس رہے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد عازم دہلی ہوئے اور مغل بادشاہ نے ان کی قابلیت سے متاثر ہو کر ۱۱۲۱ھ/۱۷۰۹ء میں ان کو اعمال مظفرنگر کے دو گاؤں کرانہ اور شاملی کے منصب

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۱، ۲۰۲۔ معمولات مظہریہ ص ۱۸، ۱۴۳۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۴۴، ۴۴۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۲، ۳۲۷

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قضا پر مامور کیا۔ ان کے علم و فضل کی بنا پر اورنگ زیب عالم گیر کے بیٹے شاہ عالم نے جو اس زمانے میں ہندوستان کا بادشاہ تھا، انھیں ''معین العلماء'' کا لقب عطا کیا۔ تمام عمر مسند قضا پر متمکن رہے۔ نہایت نیک، پابند شرع اور عبادت گزار تھے۔ فرائض قضا بڑی محنت اور مستعدی سے انجام دیتے، اس اہم خدمت کے ساتھ ساتھ درس و افادے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ دور دراز سے تشنگان علوم حاضر خدمت ہوتے اور اخذ علم کرتے۔ اس عالم و فقیہ نے ۱۱۳۸ھ/ ۱۷۲۶ء میں کرانہ میں وفات پائی❶۔

۴۲۔ سید محمد عدل بریلوی

سید محمد عدل بن سید محمد بن سید علم اللہ حسنی بریلوی کا شمار کبار مشائخ نقشبندیہ میں ہوتا ہے۔ اپنے عصر اور علاقے کے عارف کبیر اور فقیہ نام دار تھے۔ برصغیر کے جلیل القدر مجاہد حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اجداد میں سے تھے۔ زہد و تقویٰ، ورع و عبادت، ایثار و استغنا، علو ہمت، اخلاق فاضلہ، لوگوں کی مدد اور اپنے رفقا کی اعانت کے سلسلے میں ان کا مقام بہت بلند تھا اور اس ضمن میں انھیں خاص شہرت حاصل تھی۔

سید محمد عدل یوپی کے شہر رائے بریلی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ تحصیل علم اپنے بڑے بھائی سید محمد حکم بریلوی (متوفی ۲۲ شوال ۱۱۵۰ھ/ یکم فروری ۱۷۳۸ء) سے کی۔ سید محمد حکم نے علم صرف اور نحو کے موضوع سے متعلق ان کے لیے کچھ رسالے بھی تصنیف کیے۔ بھائی سے تحصیل علم کے بعد والد محترم سید محمد حسنی بریلوی (متوفی ۲۴ ربیع الثانی ۱۱۵۶ھ/ ۶ رجون ۱۷۴۳ء) سے وابستہ ہوگئے۔ ان سے اخذ طریقت کیا اور مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ والد کی وفات کے بعد علاقۂ اودھ کی مشیخت انہی کے حصے میں آئی اور بہت سے علما و مشائخ اور خلق کثیر کو مستفید فرمایا۔ سید محمد عدل حسنی بریلوی نے ۱۱ رمضان المبارک ۱۱۹۲ھ/ ۱۳ اکتوبر ۱۷۷۸ء کو بریلی میں وفات پائی اور وہیں اپنے جد مکرم سید علم اللہ حسنی کے زاویہ میں دفن کیے گئے❷۔

۴۳۔ شیخ محمد علی بدایونی

شیخ محمد علی بن محمد نظیف بن عبداللطیف بن محمد شفیع عثمانی بدایونی، اپنے زمانے کے نامور فقہا اور مشاہیر اصحاب صلاح میں سے تھے۔ ان کے دادا عبداللطیف بدایوں کی اس مسجد کے خطیب تھے، جسے سلطان شمس الدین التمش نے ۶۲۰ھ (۱۲۲۳ء) میں تعمیر کرایا تھا۔ محمد علی ۱۱۳۴ھ/ ۱۷۲۲ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ بڑے ہوئے تو حصول علم کی طرف توجہ کی، کچھ عرصہ تو اپنے شہر کے علما سے اخذ علم کرتے رہے، بعد ازاں دہلی کا عزم کیا، وہاں قاضی مبارک فاروقی گوپاموی (متوفی ۵ ربیع الاول ۱۱۴۲ھ/ ۱۸ ستمبر ۱۷۲۹ء) کا ہنگامۂ درس

❶ مناقب رزاقیہ اغصان الانساب — نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۳۲۸۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۳۰، ۳۳۱ — اعلام الہدیٰ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاری تھا، جو اپنے عہد کے بہت بڑے عالم، مدرس اور مصنف تھے، محمد علی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے خوب استفادہ کیا۔ اسی اثنا میں انھوں نے قاضی محمد پناہ جون پوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا جو بارھویں صدی ہجری کے جلیل القدر عالم اور معقول و منقول کے ماہر تھے۔ قاضی محمد پناہ جون پوری کے ذکر میں یہ بتانا ضروری ہے کہ محمد شاہ کے عہد میں نادر شاہ دہلی آیا تو بہت سے علما بھی اس کے ہم رکاب تھے۔ قاضی محمد پناہ نے اس کے سامنے ان علما سے مسئلہ قتال پر مناظرہ کیا اور وہ ایک اہم مناظرہ تھا جس میں قاضی ممدوح نے نادر شاہ کے علما کو اپنے علم و فضل کے زور سے لاجواب کر دیا تھا۔ اس موقعے پر ان کے کثرت مطالعہ اور وسعت معلومات سے متاثر ہو کر نادر شاہ نے انھیں مستعد خاں کا خطاب عطا کیا اور محمد شاہ نے ان کو جون پور کے منصب قضا پر مامور کیا، جس پر وہ عمر بھر متعین رہے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد شیخ محمد علی بدایونی شیخ عبداللہ حسینی دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے، جنھیں نیکی اور تقوے کی فروانی کی وجہ سے اپنے عصر کے ابدال میں شمار کیا جاتا تھا، ان سے انھوں نے اخذ طریقت کیا اور مستفیض ہوئے۔ بعد ازاں اپنے شہر بدایوں گئے اور تمام تر توجہ درس و افادۂ طلبا میں مبذول کر دی۔ اس اثنا میں بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا اور ان کے چشمۂ علم سے سیراب ہوئے۔ شیخ محمد علی بدایونی نے ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۳ء میں لکھنؤ میں داعی اجل کو لبیک کہا[1]۔

۴۴۔ شیخ محمد غوث کاکوروی

شیخ محمد غوث کاکوروی نہایت فاضل آدمی تھے۔ کاکوری کے مردم آفرین خطے سے تعلق رکھتے تھے۔ صاحب تذکرۃ الانساب نجم الدین خاں کاکوروی کی روایت کے مطابق بڑے بلند مرتبے کے مالک تھے، سلسلۂ نسب چھبیس واسطوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء میں بمقام کاکوری پیدا ہوئے اور علم و عمل کے ماحول اور فضل و کمال کی فضا میں پرورش پائی۔ مختلف علوم کی مختصر اور چھوٹی کتابیں شیخ محمد زمان کاکوروی[2] سے پڑھیں اور مطولات کے لیے شیخ ابوالواعظ ہرگامی[3] (یکے از مرتبین فتاویٰ عالم گیری) اور شیخ قطب الدین شہید انصاری سہالوی[4] کے باب عالی پر دستک دی۔ علم حدیث شیخ محمد یعقوب بنانی لاہوری[5] سے حاصل کیا۔

---

1. نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۳۷۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۳۔
2. شیخ محمد زمان کاکوروی کے حالات کے لیے دیکھیے راقم کی کتاب ''برصغیر میں علم فقہ'' ص ۳۲۳۔
3. شیخ ابوالواعظ ہرگامی کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو ''برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ'' ص ۳۰۵ تا ۳۰۸ اور فقہائے ہند جلد چہارم۔
4. شیخ قطب الدین شہید سہالوی کے لیے دیکھیے فقہائے ہند جلد پنجم۔
5. شیخ محمد یعقوب بنانی لاہوری کے حالات کے لیے دیکھیے ''برصغیر میں علم فقہ'' ص ۳۲۳۔ نیز ملاحظہ ہو فقہائے ہند جلد پنجم۔

نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۳۹۔ برصغیر میں علم فقہ ص ۳۲۲ تا ۳۲۴

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حصول علم کے بعد شیخ محمد غوث کاکوروی نے بادشاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر سے ملاقات کی۔ ان دنوں علمائے ہند کی ایک جماعت فتاویٰ عالم گیری مرتب کر رہی تھی۔ شیخ محمد غوث چونکہ علم فقہ پر عبور رکھتے تھے، اس لیے اورنگ زیب نے ان کو بھی علما کی اس جماعت میں شریک کر لیا اور وہ یہ اہم خدمت انجام دینے میں مصروف ہو گئے۔ فتاویٰ عالم گیری کی تدوین کا سلسلہ تکمیل کو پہنچا تو بادشاہ نے ان کو علاقۂ اودھ میں جزیہ وصول کرنے پر مامور کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ شیخ ممدوح نے درس و تدریس اور افادۂ طلبا کا کام بھی بہ دستور جاری رکھا، اس میں بھی وہ نہایت کامیاب تھے، بے شمار علما اور طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔

شیخ محمد غوث کاکوروی نے ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶ء میں اس دنیائے فانی سے رخت سفر باندھا❶۔

۴۵۔ شیخ محمد فاخر زائر عباسی الٰہ آبادی

شیخ محمد فاخر زائر عباسی الٰہ آبادی کے والد ماجد کا اسم گرامی شیخ محمد یحییٰ تھا جو برصغیر کے ممتاز عالم تھے اور شیخ خوب اللہ الٰہ آبادی کے عرف سے معروف تھے۔ ان کا تذکرہ آئندہ صفحات میں آ رہا ہے۔

شیخ محمد فاخر کی ولادت ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء میں ہوئی۔ مولد و منشا ہندوستان کے صوبہ یو پی کا شہر الٰہ آباد تھا۔ چشم شعور وا ہوئی تو دیکھا کہ گھر میں علم کی نہر جاری ہے اور پوری فضا تقویٰ و پرہیز گاری سے معمور!

علم و فضل:

میر سید غلام علی آزاد بلگرامی نے ''سروآزاد'' میں شیخ محمد فاخر زائر کا ذکر نہایت محبت اور عقیدت کے ساتھ کیا ہے۔ وہ زائر کے علم و فضل اور تدین و تقویٰ سے انتہائی متاثر تھے۔ ان کی علمی سرگرمیوں، ان کی تصنیفات، وسعت معلومات، ان کے جذبۂ اتباع سنت، ان کی مہمان نوازی، ان کی فراخی قلب، کشادہ دستی، ان کے ذوق شعری اور ملکۂ ادبیت کا خوب صورت الفاظ میں تذکرہ کرتے ہیں۔ اس باب میں ان کے فارسی الفاظ جذبات عقیدت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ترجمہ ملاحظہ ہو:

شیخ محمد فاخر جن کا تخلص زائر تھا اور شیخ محمد یحییٰ المعروف، شاہ خوب اللہ الٰہ آبادی عباسی کے فرزند رشید تھے، عمدہ ترین اوصاف سے متصف اور بلند ترین مناقب سے بہرہ مند تھے۔ ان کی اساس فکری بہ درجہ غایت محکم تھی اور وہ کمالات بوقلموں میں مدارج علیا پر فائز تھے۔ نیکی میں ولایت کبریٰ کے مرتبے کو پہنچے ہوئے، علوم نقلیہ میں میزان عدل اور فنون عقلیہ میں برہان اصل۔ کمال درجے کے پابند شرع، ہمیشہ ہر معاملے میں احکام شریعت کو مشعل راہ قرار دینے والے، انتہائی کشادہ دست اور شگفتہ مزاج۔ کسی چیز کو بچا کر اور ذخیرہ بنا کر نہ رکھتے، اپنے بیگانے سب پر بے دریغ احسان کرتے۔ ان کے شب و روز کا زیادہ تر حصہ سفر میں گزرتا اور دوران

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۳۹۔ برصغیر میں علم فقہ، ص ۳۲۲ تا ۳۲۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سفر مسافروں کی کثیر تعداد ان کے ہمراہ ہوتی۔ ہر شخص کو سامان اکل و شرب خود مہیا فرماتے اور اس کے لباس و پیرہن کی کفالت کرتے۔ جب تک تمام رفقا کے سامنے کھانا نہ آ جاتا، دستر خوان پر نہ بیٹھتے ❶۔

شیخ محمد فاخر آغاز عمر ہی میں اپنے والد مکرم شیخ محمد یحییٰ الہ آبادی اور برادر اکبر شیخ محمد طاہر الہ آبادی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہو گئے تھے۔ تمام کتب درسیہ خاص ترتیب اور محنت کے ساتھ پڑھیں اور پھر عین جوانی میں خود مسند تدریس کو زینت بخشی۔ ان کے نانا کا اسم گرامی شیخ محمد افضل تھا، جو اپنے زمانے کے جلیل القدر عالم اور صاحب کمال فاضل تھے۔ وہ ۲۵ ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ/۱۲ جنوری ۱۷۱۳ء کو فوت ہوئے۔ انھوں نے وقت ولادت ہی سے محمد فاخر کو اپنی آغوش تربیت و ارادت میں لے لیا تھا، لیکن نواسے کی پیدائش سے صرف چار سال بعد شیخ محمد افضل کا انتقال ہو گیا، اس لیے پھر وہ ان کے والد شیخ محمد یحییٰ کی تربیت میں دے دیے گئے تاکہ وہ اپنے سایۂ پدری میں بیٹے کی تربیت و تحصیل علم کا خاطر خواہ انتظام کریں اور ان کی ذہنی و فکری صلاحیتوں کے نشو و نما کے لیے بہترین اسباب مہیا فرمائیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا، اللہ تعالیٰ نے ان کو علم و عمل کی بے پناہ دولت سے مالا مال کیا اور اپنے والد گرامی شیخ محمد یحییٰ کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔ یہ ان کی عین جوانی کا زمانہ تھا۔

حج بیت اللہ کے لیے مختلف سفر:

شیخ محمد فاخر ۱۱۴۹ھ/۱۷۳۷ء میں عازم حرمین شریفین ہوئے اور ۱۱۵۰ھ/۱۷۳۹ء میں سعادت حج حاصل کی۔ اس سال شیخ محمد فاخر کے بعد سید غلام علی آزاد بلگرامی بھی حج بیت اللہ کے لیے گئے تھے۔ جب آزاد جہاز سے جدہ کی بندرگاہ سے اترے تو شیخ ممدوح وہاں موجود تھے، انھوں نے آزاد کا شاندار استقبال کیا اور دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ ان دونوں کے درمیان پہلے ہی سے بہت اچھے اور مخلصانہ تعلقات تھے اور ایک دوسرے کی انتہائی قدر کرتے تھے۔ دونوں اکٹھے مکہ مکرمہ گئے اور زیارت بیت اللہ کا شرف حاصل کیا۔ اس زمانے میں مدینہ منورہ میں شیخ محمد حیات سندھی کا ہنگامہ درس حدیث جاری تھا، جس سے عرب و عجم کے بے شمار علما و طلبا مستفید ہو رہے تھے، شیخ محمد فاخر نے اس موقعے کو غنیمت جانا اور طلب حدیث کے لیے اس میں شامل ہو گئے اور خوب استفادہ کیا۔ شیخ محمد حیات سے انھوں نے حدیث کی مروجہ کتابیں پڑھیں، صحیح بخاری مکمل کی اور صحیح مسلم کا کچھ حصہ پڑھا۔ شیخ محمد حیات نے یکم شعبان ۱۱۵۰ھ/۱۳ نومبر ۱۷۳۷ء کو انھیں سند و اجازہ سے سرفراز کیا۔ بعد ازاں اسی جہاز سے جس پر آزاد بلگرامی گئے تھے، شیخ محمد فاخر واپس ہندوستان تشریف لائے۔ ارض حجاز سے واپسی پر صحیح مسلم کا ایک نسخہ بھی اپنے ساتھ لائے، جس کی کچھ برس پیشتر ایک نقل کتب خانہ حبیب گنج (علی گڑھ) میں موجود تھی۔ طباعت و اشاعت کے اس دور میں شاید اس بات کو زیادہ اہمیت نہ دی جائے، لیکن یہ وہ زمانہ تھا، جب کہ اس برصغیر میں حدیث کی کسی کتاب کا قلمی نسخہ کسی کے پاس پایا جانا بہت بڑی بات تھی۔

---

❶ سرو آزاد ص ۲۱۸

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۱۵۴ھ/۱۷۴۱ء میں شیخ محمد فاخر کے دل میں دوسری مرتبہ داعیۂ حج پیدا ہوا، اور وہ الہ آباد سے حجاز کی مقدس سرزمین کو روانہ ہوئے۔ اس عہد کے سفر کی صعوبتوں اور راستوں کی طوالت کا اندازہ کیجیے کہ الہ آباد سے روانہ ہونے سے کئی ماہ بعد شیخ بندرگاہ سے جہاز میں سوار ہوئے۔ سیاسی لحاظ سے ہندوستان میں یہ دور بڑا ہی پر آشوب تھا اور بحر ہند کے ساحلی علاقوں کی بندرگاہوں میں مرہٹوں کے ظلم وستم کا انتہائی الم ناک سلسلہ جاری تھا، وہ لوگوں کو لوٹتے اور ان پر بے حد مظالم ڈھاتے تھے۔ جس جہاز میں شیخ محمد فاخر سوار تھے، سوئے اتفاق سے وہ بھی مرہٹوں کی گرفت میں آگیا۔ مرہٹے اس پر حملہ آور ہوئے اور بسی کی بندرگاہ میں لے گئے، جہاز میں جتنے لوگ سوار تھے ان کا سامان لوٹ لیا۔ شیخ محمد فاخر کے سامان کی طرف متوجہ ہوئے تو دیگر سامان کے علاوہ ان کے پاس کتابوں کا ایک صندوق بھی تھا، راہزن مرہٹوں نے شیخ کا سامان تو لوٹ لیا، البتہ کتابوں کا صندوق واپس کر دیا اور یہ مہربانی بھی کہ اپنی طرف سے سواری کا انتظام کر کے انھیں سورت کی بندرگاہ میں پہنچا دیا۔ اس کے بعد دوسرا جہاز روانہ ہونے تک شیخ ممدوح سورت ہی میں اقامت گزیں رہے۔ کئی مہینوں کے شدید انتظار کے بعد صفر ۱۱۵۶ھ/اپریل ۱۷۴۳ء میں جہاز روانہ ہوا۔ لیکن قدرت الٰہی کا فیصلہ دیکھیے کہ بندرگاہ مخا میں پہنچ کر یہ جہاز تباہ ہوگیا اور دوسرے جہاز کے انتظام تک مجبوراً کئی مہینے اس بندرگاہ میں ٹھہرنا پڑا۔ ان دنوں سمندر کے مدوجزر کا اندازہ کر کے کشتیاں چلتیں اور جہاز روانہ ہوتے تھے اور صاف موسم کی آمد تک لوگ بندرگاہوں میں پڑے رہتے تھے۔ خدا خدا کر کے کشتی چلنے کا موسم آیا تو شیخ اس میں سوار ہوئے اور مکہ معظمہ کا قصد فرمایا۔ وہاں سے روانہ ہو کر ۲۲ رمضان ۱۱۵۶ھ/ ۱۲۹ اکتوبر ۱۷۴۳ء کو حرم کعبہ میں داخل ہوئے اور حج بیت اللہ کیا۔ اس سال حج جمعتہ المبارک کو ہوا تھا، جسے عرف عام میں ''حج اکبر'' کہا جاتا ہے۔ تین سال بعد ۱۱۵۹ھ/ ۱۷۴۶ء میں ہندوستان کا قصد فرمایا اور بندرگاہ سورت میں اترے۔ جمادی الاولیٰ ۱۱۵۹ھ/مئی ۱۷۴۶ء میں سورت سے وطن روانہ ہوئے۔ اس عہد کی مشکلات سفر دیکھیے کہ رجب ۱۱۵۹ھ/ جولائی ۱۷۴۶ء کو شیخ دہلی پہنچے، یعنی سورت سے دہلی تک کا سفر تین مہینے میں طے ہوا۔ میرزا مظہر جان جاناں جن کا شمار بارھویں صدی ہجری میں برصغیر کے رفیع القدر علما میں ہوتا تھا ان دنوں دہلی میں فروکش تھے، وہ شیخ ممدوح سے ملے اور نہایت محظوظ ہوئے۔ شیخ کے قیام دہلی کے زمانے میں ان دونوں کی کئی صحبتیں ہوئیں اور مختلف قسم کے مسائل زیر بحث آئے۔

دہلی سے شیخ محمد فاخر اپنے وطن الہ آباد پہنچے اور صرف ایک سال وہاں ٹھہرے تھے کہ تیسری مرتبہ دل میں جذبۂ حج بیت اللہ نے پھر انگڑائی لی اور شوال ۱۱۶۰ھ/ اکتوبر ۱۷۴۷ء میں الہ آباد سے عازم بنگال ہوئے۔ اس مرتبہ وہ بنگال سے جہاز میں سوار ہونا چاہتے تھے۔ الہ آباد سے عظیم آباد، پٹنہ اور مرشد آباد وغیرہ بلاد وامصار کو روانہ ہوئے۔ اپنے اوصاف بوقلموں کی بنا پر وہ دیار ہند میں انتہائی اثر ورسوخ کے مالک تھے۔ راستے میں جن جن شہروں اور علاقوں کے حکام وامرا اور عوام وخواص کو ان کی تشریف آوری کا علم ہوجاتا وہ استقبال کے لیے آتے اور انتہائی عزت وتکریم کا ثبوت بہم پہنچاتے۔ اس طرح ہگلی کی بندرگاہ میں پہنچے اور وہاں سے جہاز پر

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سوار ہوئے، لیکن جہاز نے ابھی چند روز کا سفر کیا تھا کہ اس کے تختے ٹوٹ گئے اور جہاز بے کار ہو گیا۔ آخر چاٹ گام واپس آئے اور دوسرے جہاز کا انتظار کرنے لگے، چار مہینے چاٹ گام میں مقیم رہے، لیکن موسم کی خرابی کے باعث جہاز روانہ نہ ہو سکا۔ بالآخر واپس الٰہ آباد کو مراجعت فرما ہوئے۔ اثنائے راہ میں جس طرف سے گزر ہوتا لوگ بے حد عقیدت سے پیش آتے۔

اب کی مرتبہ شیخ محمد فاخر تقریباً دو مہینے الٰہ آباد مقیم رہے اور چوتھی مرتبہ قصد حج فرمایا۔ اس کے لیے انھوں نے دہلی کا عزم کیا اور ۲۵ رمضان ۱۱۶۲ھ/ ۲۸ اگست ۱۷۴۹ء کو وارد دہلی ہوئے۔ چند روز دہلی میں قیام رہا۔ ان دنوں سید غلام علی آزاد بلگرامی دکن میں قیام پذیر تھے اور شیخ محمد فاخر سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ شیخ نے محض ان سے ملاقات کے لیے دہلی سے دکن کا قصد کیا۔ وہ یکم شعبان ۱۱۶۴ھ/ ۱۴ جون ۱۷۵۱ء کو اس مقصد کے لیے دہلی سے روانہ ہوئے۔ اور ۵ ذی الحجہ ۱۱۶۴ھ/ ۱۴ اکتوبر ۱۷۵۱ء کو برہان پور پہنچے۔ یعنی دہلی سے برہان پور تک کا سفر چار مہینے میں طے ہوا۔ لیکن آزاد بلگرامی افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں کہ قسمت نے یاوری نہ کی اور وقت نے مہلت نہ دی کہ دو پرانے دوست ایک دوسرے سے ملاقات کر سکیں۔ شیخ دریائے نربدا عبور کر کے سرسام کی بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ اسی حالت میں برہان پور پہنچے تو مرض نے شدت اختیار کر لی اور ۱۱ ذی الحجہ ۱۱۶۴ھ/ ۲۰ اکتوبر ۱۷۵۱ء کو یک شنبہ کے روز اشراق کے وقت اس جہان فانی سے عالم جاودانی کو تشریف لے گئے۔ آزاد بلگرامی کے الفاظ میں ''جان عزیز را درراہ بیت اللہ فدا ساخت'' تاریخ ولادت جو ۱۱۲۰ھ ہے ''خورشید'' سے اور تاریخ وفات ''زوال خورشید'' سے نکلتی ہے۔

شیخ کے متعلق اکابر علما کی رائے:

شیخ محمد فاخر نے صرف چوالیس (۴۴) برس عمر پائی۔ آزاد بلگرامی جو ان کے جگری دوست تھے، بدرجہ غایت شان دار الفاظ میں ان کا ذکر کرتے ہیں۔ انھیں وہ متقی، پرہیز گار، عبادت گزار، بدرجۂ کمال پابند شرع، متبع سنت، خوش مزاج، وسیع القلب، شگفتہ بیان، علوم عقلیہ ونقلیہ کے ماہر، صاحب صفات رضیہ، ولی اللہ، حامل میزان عدل، پیکر جود وسخا، اور محسن انسانیت قرار دیتے ہیں۔ وہ ان کے علمی کمالات اور ذاتی محاسن کی وجہ سے ان کی موت پر نہایت حزن وملال کا اظہار کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

واحسرتا کہ ایں چنیں صاحب کمال درایام شباب ازیں عالم رحلت کرد وداغ مفارقت بر دل یاراں گزاشت، سپہر دوّار اگر عمرہا چرخ زند مشکل کہ چنیں ذات قدسی صفات بہم رساند ❶۔

(نہایت حسرت وملال کی بات ہے کہ ان اوصاف کے حامل اور صاحب کمال نے عالم جوانی میں اس دنیا سے کوچ کیا اور دوستوں کے دل پر داغ جدائی چھوڑا، آسمان اگر تمام عمر گھومتا رہے تو مشکل ہے کہ اس

❶ سرو آزاد، ص ۲۱۸

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قسم کا قدسی صفات شخص پیدا ہو۔)

مرزا مظہر جان جاناں بارھویں صدی ہجری کی عظیم شخصیت اور شیخ محمد فاخر کے معاصر تھے، وہ شیخ کی انتہائی تعظیم کرتے تھے۔ وسعت علم اور کشادگی فکر ونظر کے باوجود وہ ایک گوشہ گیر بزرگ تھے، کسی کے ہاں آمد ورفت نہ رکھتے تھے، لیکن شیخ محمد فاخر کے پاس ضرور جاتے، آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

مرزا خلاف وضع خود بملاقات شیخ محمد فاخر اکثری رسد ❶۔

(مرزا مظہر جان جاناں اپنی عادت کے خلاف اکثر شیخ محمد فاخر کی ملاقات کو جاتے۔)

وہ شیخ کے علم وفضل اور اتباع سنت کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

بسیارے از کبرائے دین را مشاہدہ نمودم، بعد از یازدہ صد سال یک شخص کہ عبارت از شیخ محمد فاخر باشد موافق کتاب وسنت دریافتم ❷۔

(بہت سے اکابر دین کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، مگر گیارہ سو سال کے بعد صرف ایک شخص کو جس کا نام شیخ محمد فاخر ہے، قرآن وحدیث کے موافق پایا۔)

وہ یہ بھی فرماتے ہیں:

بسا ارباب کمال را برخوردم، آں قدر کہ نزد شیخ محمد فاخر از اں شدم ہیچ جا اتفاق نیفتاد ❸۔

یعنی بہت سے اہل کمال کو آزما دیکھا، لیکن جو چیز شیخ محمد فاخر کے پاس وافر مقدار میں حاصل ہوئی وہ کسی دوسری جگہ نہ مل سکی۔

نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ ان کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

شیخ محمد فاخر اگرچہ در جمیع فنون وتمام علوم ید بیضا داشت وعلم سبقت بر سابقین می افراشت لیکن علم حدیث بروئے بحدے غالب آمدہ کہ گویا غیر آں را آشنا نہ بودہ است۔ غالب تصانیف او در انتصار سنت است ومختار اہل حدیث ورد بدعت واہل اوست ❹۔

(شیخ محمد فاخر یوں تو تمام علوم وفنون میں کامل دسترس رکھتے تھے اور اپنے سے پہلے اہل علم کے مقابلے میں ان کی معلومات کا جھنڈا سب سے اونچا تھا، لیکن خصوصیت کے ساتھ علم حدیث تو ان پر اس قدر غالب تھا کہ گویا اس کے علاوہ انھیں کسی چیز سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ ان کی زیادہ تر تصانیف سنت محمدیہ کی تائید اور مسائل اہل حدیث کی وضاحت اور اہل بدعت کی تردید میں ہیں۔)

---

❶ سرو آزاد ص ۲۱۸

❷ ایضاً

❸ ایضاً

❹ اتحاف النبلاء ص ۴۰۶۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسری جگہ نواب صاحب لکھتے ہیں:

وے رحمہ اللہ تعالیٰ امام ائمہ متبعین سنت سرزمین ہند و شیخ الشیوخ اکابر علما ارجمند، ظاہرش محدث بود و باطنش صوفی ❶۔

(یعنی شیخ محمد فاخر رحمۃ اللہ علیہ کو سرزمین ہند میں ائمہ متبعین سنت کے امام کی حیثیت حاصل تھی اور اکابر علمائے مشاہیر میں ان کا درجہ شیخ الشیوخ کا تھا، وہ ظاہر میں محدث اور باطن میں صوفی تھے۔)

شاہ غلام علی نے مقامات مظہریہ میں ان کو کبار علمائے حدیث میں شمار کیا ہے ❷۔

مولوی رحمان علی نے شان دار الفاظ میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

شاہ محمد فاخر الٰہ آبادی زائر تخلص بن شاہ خوب اللہ آبادی جامع علوم ظاہر و باطن بود۔ اکتساب علوم ظاہر بخدمت برادر کلاں خود شیخ محمد طاہر کردہ، حق سبحانہ تعالیٰ شانہ اور اشانے عظیم دادہ بود، بعمر بست و یک سالگی بجائے پدر بزرگ وار و سادہ آرائے خلافت شدہ ❸۔

(شاہ محمد فاخر الٰہ آبادی جن کا تخلص زائر تھا، شاہ خوب اللہ الٰہ آبادی کے بیٹے تھے، ظاہری و باطنی علوم میں پوری جامعیت کے مالک تھے۔ انھوں نے علوم ظاہری اپنے بڑے بھائی شیخ محمد طاہر سے حاصل کیے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو شان عظمت سے نوازا تھا، اکیس برس کی عمر میں اپنے جلیل القدر باپ کی جگہ مسند خلافت پر متمکن ہو گئے تھے۔)

سید عبدالحی حسنی لکھنوی نے ان کا ذکر کرتے ہوئے بڑے عمدہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ انھوں نے ''الشیخ العالم الکبیر المحدث محمد فاخر ـــــ'' کے الفاظ سے ان کے تذکرے کا آغاز کیا ہے۔ تحریر کرتے ہیں:

وكان فريد زمانه فى الاقبال على الله والا شتغال بالعبادة والمعاملة الربانية ، قد غشيه نور الايمان وسيماء الصالحين ، انتهى اليه الورع وحسن السمت والتواضع والاشتغال بخاصة النفس واتفق الناس على الثناء عليه والمدح لشمائله وصار مشارا اليه فى هذا الباب وكان لا يتقيد بمذهب ولا يقلد فى شئى من امور دينية بل كان يعمل بنصوص الكتاب والسنة ويجتهد برايه وهو اهل لذلك❹۔

(وہ (شیخ محمد فاخر) رجوع الی اللہ، اشتغال بالعبادۃ اور امور ربانی میں یکتائے دوراں

❶ تقصار، ص ۱۱۵۔

❷ ایضاً

❸ تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۰۶۔

❹ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۲۴۱۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھے۔ ان کو نور ایمانی اور عادات نیکو کاراں نے اپنی آغوش میں لے رکھا تھا، ورع و تقویٰ، حسن عادات، انکسار و تواضع اور خدمت خلق کا سلسلہ ان پر ختم ہو گیا۔ سب لوگ ان کے خصائل کے مداح اور ان کے حسن اطوار کے معترف تھے۔ اس باب میں ان کی شخصیت خاص اہمیت کی حامل تھی۔ وہ کسی ایک فقہی مذہب کے پابند نہ تھے، بلکہ کتاب و سنت کے نصوص کو مدار عمل ٹھہراتے اور اجتہاد کرتے تھے، اور حقیقت یہ ہے کہ اپنے علم و فضل اور کثرت معلومات کی بنا پر وہ اجتہاد کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔)

شاہ ولی اللہ دہلوی سے ملاقات:

شیخ محمد فاخر جب (غالباً) پہلی مرتبہ دہلی میں رونق افروز ہوئے تو انھیں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے دہلی کی جامع مسجد میں نماز پڑھی تو آمین بالجہر پکاری، ان لوگوں کے لیے یہ ایک نئی بات تھی اور وہ شیخ کے مرتبۂ علم و فضل سے بھی واقف نہ تھے۔ نماز میں آمین بالجہر کی آواز ان کے پردۂ سماع سے ٹکرائی تو سخت حیران ہوئے، نماز کے بعد شیخ کو گھیر لیا اور مختلف قسم کی باتیں کرنے لگے۔ شیخ نے ہر چند حدیث کا حوالہ دے کر انھیں اپنی بات سمجھانے اور مطابق سنت ثابت کرنے کی کوشش کی، مگر کسی نے ایک نہ مانی اور بہ دستور بحث کرتے رہے۔ آخر شیخ نے فرمایا کہ میری بات تم نہیں مانتے تو مجھے اپنے شہر کے کسی عالم کے پاس لے چلو، ان سے مسئلہ پوچھ لیتے ہیں۔ وہ لوگ آپ کو حضرت شاہ ولی اللہ کے پاس لے گئے اور ساری بات ان کے گوش گزار کی۔ شاہ صاحب نے لوگوں سے فرمایا، رسول اللہ ﷺ کی حدیث سے آمین بالجہر پکارنا ثابت ہے۔ شاہ صاحب کی زبان سے یہ الفاظ سن کر لوگ چلے گئے اور بھیڑ چھٹ گئی، شیخ محمد فاخر اور شاہ ولی اللہ دونوں رہ گئے۔ موقع پا کر شیخ محمد فاخر نے شاہ صاحب سے کہا۔ ''آپ کھلتے کیوں نہیں؟'' شاہ صاحب نے جواب دیا۔ ''اگر کھل جاتا تو آج آپ کو کیسے بچاتا؟ ❶''

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلوی اور شیخ محمد فاخر الہ آبادی کے درمیان یہ پہلی ملاقات تھی، اس سے قبل غائبانہ طور پر تو ایک دوسرے کو جانتے ہوں گے، لیکن ملاقات کا موقع میسر نہ آیا تھا۔ ملاقات ہوئی تو دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہوئے اور لوگوں کے جانے کے بعد قریب سے ایک دوسرے کے افکار و تصورات کو سمجھنے اور باہم کھل کر گفتگو کرنے کا موقع ملا۔

تصانیف:

شیخ محمد فاخر متعدد کتابوں کے مصنف تھے، ان کی تمام تصانیف سنت نبوی ﷺ کے انتصار و حمایت اور

❶ تراجم علمائے حدیث ہند، ص ۳۳۹۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بدعات واہل بدعت کے رد میں ہیں۔ بارھویں صدی ہجری میں ان کا شمار برصغیر کے ان علمائے عظام میں ہوتا ہے، جو مسلکاً اہل حدیث اور قول وعمل میں متبع کتاب وسنت اور اس کے زوردار مبلغ تھے۔ شیخ محمد فاخر ایک فارسی شعر میں اپنے مسلک کا اظہار صاف الفاظ میں کرتے ہیں:

ما اہل حدیثیم دغا را نہ شناسیم صد شکر کہ در مذہب ما حیلہ وفن نیست

ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

۱۔ مجموعۂ نور السنة وقرة العينين در اثبات سنيّت رفع اليدين: یہ حضرت شیخ کی دو کتابوں کا مجموعہ ہے اور فارسی نظم میں ہے۔ دونوں کتابوں کا یہ مجموعہ نماز اور اس کے متعلقہ مسائل پر مشتمل ہے۔ شعر کی زبان میں یہ مسائل نہایت واضح اور خوب صورت انداز میں بیان کیے گئے ہیں اور ان کا اصل ماخذ کتاب وسنت ہے۔

نور السنۃ در حقیقت شیخ مجد الدین فیروز آبادی کی مشہور کتاب ''سفر السعادۃ'' کا مختصر اور منظوم ترجمہ ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ سنت کے مطابق نماز ادا کرنے کا کیا طریقہ ہے۔ یہ کتاب ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء میں شائع ہوئی تھی، پھر نایاب ہوگئی۔ اس کے بعد ربیع الثانی ۱۳۷۹ھ (اکتوبر ۱۹۵۹ء) میں جمعیت اہل حدیث گوجراں والا نے شائع کی۔ ابتدا میں ''تذکارِ فاخر'' کے عنوان سے حضرت مولانا محمد اسماعیل مرحوم نے حضرت شیخ محمد فاخر کے مختصر حالات تحریر فرمائے ہیں۔ یہ کتاب چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے ساتھ ہی ''مثنوی قرۃ العین در اثبات سنیۃ رفع الیدین'' ہے۔ یہ بھی شیخ محمد فاخر کی منظوم تصنیف ہے۔ اس میں رفع الیدین کے مسئلے پر تحقیقی گفتگو کی گئی ہے اور حدیث کی رو سے یہ مسئلہ بہ دلائل ثابت کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ اکتیس ۳۱ صفحات پر محیط ہے۔ دونوں کتابوں کے مجموعے کے صفحات مسلسل درج کیے گئے ہیں۔ کل صفحات ۷۱ ہیں اور اسے گوجراں والا کی جمعیت اہل حدیث نے شائع کیا ہے۔

۲۔ رسالہ نجاتیہ: یہ رسالہ عقائد کے بارے میں ہے اور نواب سید صدیق حسن خاں (متوفی ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء) کے ضروری اضافوں کے ساتھ اشاعت پذیر ہوا۔ اصل رسالہ فارسی میں ہے۔ شیخ الحدیث مولانا حافظ محمد اسحاق حسینوی نے اس کا اردو ترجمہ کیا اور یہ جمعیت اہل حدیث لاہور کی طرف سے اپریل ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ ساتھ ہی فارسی متن دیا گیا ہے۔ شروع میں فاضل مترجم نے شیخ کے ضروری حالات بیان کیے ہیں۔ یہ رسالہ ۵۶ صفحات کو محتوی ہے۔

۳۔ مثنوی در تعریف علم حدیث: شیخ کی یہ مثنوی علم حدیث کی تعریف میں ہے۔

۴۔ دیوان فارسی: یہ شیخ محمد فاخر زائر کے فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔ اس دیوان میں حدیث کو رائے اور قیاس پر ترجیح دی گئی ہے۔ بدعات کے ترک اور سنت رسول اللہ ﷺ کو اختیار کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ عقاید میں متکلمین اور معقولیوں کی روش کو اپنانے سے منع فرمایا گیا ہے اور ان عقاید کے اخذ وقبول کی ترغیب دی گئی ہے جو

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کتاب دستت سے ماخوذ ہیں۔ان اشعار میں خالص دینی مسائل بیان کیے گئے ہیں۔شاعرانہ نقطہ نگاہ سے بھی ان اشعار کا معیار بڑا بلند ہے۔

شعر و شاعری:

شیخ محمد فاخر بوقلموں اوصاف کے حامل اور گوناگوں خوبیوں کے مالک تھے۔جیسا کہ ہمیں معلوم ہوا وہ اپنے زمانے کے بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ان کے جگری دوست سید غلام علی آزاد بلگرامی نے ان کے ذوق شعری کی بڑی تعریف کی ہے۔نواب صدیق حسن خاں نے بھی ان کے چند اشعار اپنی تصنیف ''اتحاف النبلا'' میں نقل کیے ہیں اور انھیں بہترین شاعر قرار دیا ہے۔چند شعر ملاحظہ ہوں:

بباغ عاشقی از میوہ و گل نیست سامانے   کنم بادام و نرگس رافدائے چشم گریانے

دارم دلے کہ بردم تیغ ست راہ او   مژگان چشم یاربود سیر گاہ او

برمیان برزدہ دامان زکجامی آئی   مرحبا گربشکار دل ما می آئی

حب دنیامی فریبد خاطر افسردہ را   گوشمالی می دہد روباہ شیر مردہ را

مرا از آمد و رفت نفس روشن شدایں معنی   کہ اقبال جہاں دردم زدن ادباری گردد

آئینہ باصفائے رخت روگرفتہ است   گل پیش آں دہن دہن بوگرفتہ است

کنند گور پرستاں زیارت زاہد   کہ زیر گنبد دستار زندہ در گورست

تاپیرو چار یار اخیار نہ   از چار اصول دیں خبر دار نہ

درطبع تو ایں چار عنصر باہم   تاہست باعتدال بیمار نہ

بقول زائر زرائیدگیراں ماندم   شہود یار مانع گردد از اغیار عاشق را

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زائرا رائے قوم مرانیست بہرۂ علم حدیث کردز خود بے خبر مرا

زائر از کشکول اہل رائے نتواں لقمہ خورد برسر خوان رسول اللہ مہمانیم ما

جز شرعۂ سنت نرود جانب جنت زائر کجا رائے برد اہل جہاں را

ازاحادیث رسول آوردہ ام اسرار دین نیست غیر از گوہر شہوار در دکان ما

زائر ہمہ علم و عمل اوزحدیث ست بیچارہ جزیں خانہ دگر ہیچ ندارد

بہرکیف شیخ محمد فاخر زائر جو بارھویں صدی ہجری کے جلیل القدر عالم، مفسر، محدث اور فقیہ تھے، بہت بڑے شاعر بھی تھے۔ ان کے اشعار توحید الٰہی، اتباع سنت اور عمل بالحدیث کے موضوع پر مشتمل ہیں۔ یہ ان کی شاعری کا کمال ہے کہ کاروان فکر وخیال برابر جادۂ مستقیم پر قائم رہا ہے، کسی مقام اور موقعے پر ذرہ بھی ادھر ادھر قدم نہیں رکھا۔

وصیت اور تدفین:

شیخ محمد فاخر کو ارضِ حجاز میمنت طراز سے انتہائی محبت اور بے حد تعلق خاطر تھا۔ وہ ایک حج سے واپس آنے کے فوراً بعد دوسرے کی تیاری شروع کر دیتے تھے۔ اس سفر میں ان کو بے شک کتنی تکلیف پہنچتی، اس کی کوئی پروانہ کرتے۔ ان کی موت بھی اسی سفر کے دوران ہوئی۔ وہ چوتھے حج کے لیے جا رہے تھے کہ برہان پور پہنچ کر سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ برہان پور میں بہت سے بزرگان دین اور مشائخ کرام مدفون ہیں، ان میں ایک نامور بزرگ شیخ عبداللطیف ہیں۔ شیخ محمد فاخر نے وفات کے وقت وصیت کی تھی کہ انھیں شیخ عبداللطیف کی قبر کے جوار میں دفن کیا جائے، کیونکہ وہ بے حد پابند شریعت بزرگ تھے اور ان کی قبر پر بدعات کا ارتکاب نہیں ہوتا۔ غلام علی آزاد بلگرامی ان کی اس وصیت کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

درحالت مرض وصیت کرد کہ از مشائخ برہان پور شیخ عبداللطیف قدس سرہ درکمال تشرع بودند و برمرقد مبارک ایشاں بدعت ہائے اہل زماں بعمل نمی آید، مرادر جوار ایشاں دفن سازند، موافق وصیت بعمل آوردند ❶۔

(حالت مرض میں انھوں (شیخ محمد فاخر) نے وصیت کی کہ مشائخ برہان پور میں شیخ عبداللطیف قدس سرہ حد درجہ پابند شریعت بزرگ تھے اور ان کا مرقد مبارک لوگوں کے ارتکاب بدعت سے محفوظ ہے، مجھے ان کی قبر کے نزدیک دفن کیا جائے، چنانچہ ان کی اس وصیت پر عمل کیا گیا۔)

---

❶ سرو آزاد ص ۲۲۸۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اولاد:

شیخ محمد فاخر زائر کے دو بیٹے تھے۔ایک شاہ قطب الدین تھے، جن کا انتقال مکہ معظمہ میں ۱۱۸۷ھ یا ۱۱۸۸ھ کو ہوا۔دوسرے شاہ محمد اجمل تھے، جو اپنے آبا و اجداد کے وسادۂ خلافت پر متمکن تھے اور الہ آباد میں ان کا دائرہ بہت مشہور تھا۔انھوں نے ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء میں وفات پائی۔

تلامذہ:

شیخ محمد فاخر زائر الہ آبادی کے تلامذہ اور ان سے فیض یافتہ حضرات کا بھی ایک خاص حلقہ تھا۔اپنے والد گرامی کی وفات کے بعد الہ آباد میں عین جوانی میں انھوں نے مسند درس و افادہ آراستہ کر لی تھی۔پھر ان کا سلسلۂ سفر بھی جاری رہتا تھا، جس میں عقیدت مندوں کی کثیر تعداد ان کے ہم عنان ہوتی تھی جنھیں وہ رشد و ہدایت اور دعوت و تبلیغ سے بہرہ مند کرتے تھے۔اس لیے یہ حقیقت ہے کہ ان کے تلامذہ اور ان سے فیض یافتہ حضرات کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ملک کے ہر حلقۂ فکر اور طبقۂ خیال کے لوگ ان کی انتہائی تعظیم کرتے تھے، جس طرف کو جاتے ہزاروں کی تعداد میں لوگ ان کے استقبال کو آتے اور ان سے استفادہ و استفاضہ کرتے۔ وفور علم اور تقویٰ و تدین میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔رحمہ اللہ تعالیٰ رحمتہ واسعتہ۔

۴۶۔ مولانا محمد فاضل سورتی

مولانا محمد فاضل کا سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد فاضل بن محمد حامد بن عبدالمجید بن احمد بن صالح عبیدی حجازی بدوی ثم ہندی سورتی۔ ان کے آبا و اجداد سرزمین حجاز کے رہنے والے تھے اور قبیلۂ بنی عبید سے تعلق رکھتے تھے۔ بعد ازاں ان میں سے کوئی بزرگ ہندوستان آئے اور گجرات کے علاقے میں سکونت اختیار کی۔
مولانا محمد فاضل کی ولادت اور نشو و نما گجرات ہی میں ہوئی۔ بڑے ہوئے تو اس زمانے کے جلیل القدر عالم شیخ زین العابدین احمد آبادی (متوفی ۱۱۱۳ھ/۱۷۰۱ء) سے اخذ علم کیا اور علوم مروجہ میں مہارت حاصل کی۔
مولانا محمد فاضل کا اصل پیشہ تجارت تھا۔اور اتنا وسیع تھا کہ لوگ انھیں ''ملک التجار'' کہتے تھے اور اللہ نے مال و دولت کثرت سے عطا فرمایا تھا۔
تجارت کے ساتھ ساتھ علم و تحقیق سے بھی تعلق رکھتے تھے اور تصنیف و تالیف کا بھی صاف ستھرا ذوق تھا۔کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں یہ کتابیں شامل ہیں:
نصیحۃ الصغار ، ہدایۃ المسلمین ، حزب المحزوب ، معین الفضائل فی شرح الشمائل ، شرح دلائل الخیرات ، حاشیہ الدرر۔ یہ کتاب فقہی مسائل پر مشتمل ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہایت عابد وزاہد اور عالم باعمل تھے۔ ارض حجاز میں گئے اور حج وزیارت کی سعادت حاصل کی۔ پھر جب ہندوستان واپس آئے تو پہلے کچھ عرصہ شہر سورت میں ٹھہرے، پھر وہاں سے احمد آباد کو روانہ ہو گئے۔ احمد آباد میں ان کے بیٹے مقیم تھے اور وہ بیٹوں کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن راستے ہی میں لوگوں نے ان کو قتل کر دیا۔ یہ حادثہ ۲۴ ذی الحجہ ۱۱۲۹ھ/ ۱۸ نومبر ۱۷۱۷ء کو پیش آیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف پینتالیس برس تھی ❶۔

۴۷۔ سید محمد فیض بلگرامی

سید محمد فیض حسینی واسطی بلگرامی کا مولد و منشا بلگرام ہے۔ سید اسماعیل بلگرامی سے اخذ علم کیا۔ کتب حدیث سید مبارک حسینی بلگرامی سے پڑھیں اور حدیث وفقہ میں مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ میر سید عبدالجلیل بلگرامی سے بھی فیض حاصل کیا۔ سید محمد فیض بلگرامی اور میر سید عبدالجلیل بلگرامی کے درمیان انتہائی مخلصانہ تعلقات قائم تھے۔ سید محمد فیض بلگرامی کے تصنیفی کارناموں میں شمائل ترمذی اور حصن حصین کا فارسی ترجمہ ہے۔ بلگرام کے اس جلیل القدر عالم دین نے ساٹھ سال کی عمر پا کر ۱۱۳۰ھ/ ۱۷۱۸ء میں سفر آخرت اختیار کیا ❷۔

۴۸۔ شیخ محمد محسن دہلوی

بارھویں صدی ہجری میں برصغیر میں محمد محسن نام کے تین بزرگ اپنے خداداد فضل و کمال کی وجہ سے بہت مشہور تھے جو معقولات میں مہارت اور حدیث وفقہ میں دسترس رکھتے تھے، ان میں سے ایک کا تعلق دہلی سے تھا اور دو کا سرزمین کشمیر سے۔ ذیل میں ان تینوں کا ترجمہ درج ہے۔

شیخ محمد محسن دہلوی کی جائے ولادت و تربیت دہلی ہے۔ ہندوستان کے ممتاز عالم حضرت شیخ عبدالحق دہلوی رحمہ اللہ کی اولاد سے تھے۔ طریقتاً مجددی نقشبندی اور مسلکاً حنفی تھے۔ اپنے دور کے نامور عالم وفقیہ اور جامع معقول ومنقول تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے جلیل القدر فرزند شیخ محمد معصوم سرہندی سے اخذ فیض کیا اور کافی عرصہ ان کی خدمت میں رہے۔

دہلی کے اس عالم وفقیہ سے خلق کثیر نے استفادہ کیا، جن میں شیخ نور محمد بدایونی (متوفی ۱۱ ذی قعدہ ۱۱۳۵ھ/ ۱۲ اگست ۱۷۲۳ء) کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ شیخ محمد محسن دہلوی ۱۱۴۷ھ/ ۱۷۳۴ء میں فوت ہوئے ❸۔

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۴۱، ۳۴۲، بحوالہ حدیقہ احمدیہ

❷ مآثر الکرام ص ۲۳۵، ۲۳۶۔ نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۲۴۴

❸ خزینۃ الاصفیاء ج ۱، ص ۶۶۴ تا ۶۶۶۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۱۲۔ حدائق الحنفیہ ۴۴۰۔ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۳۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۴۶

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴۹۔ مولانا محمد محسن کشو کشمیری

مولانا محمد محسن کشو کشمیری اپنے عہد اور علاقۂ کشمیر کے شیوخ و فضلا اور کبار علما میں سے تھے۔ معقولات ومنقولات پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ حنفی المسلک تھے۔ مولانا محمد امین حنفی کشمیری (متوفی ۲۷ رمضان ۱۱۰۹ھ ــــ ۲۹ مارچ ۱۶۹۸ء) کے شاگرد تھے۔ محقق اور دقیق النظر عالم تھے۔ دین داری اور فضل و کمال میں بڑی شہرت پائی۔ بہت سے علما وطلبا نے جو بعد میں خود تدریس کی مسند پر فائز ہوئے، ان سے کسب علم کیا۔ تصنیف و تالیف کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ کئی درسی کتابوں پر حواشی و تعلیقات سپرد قلم کیے، جن میں فقہ کی شہرۂ آفاق کتاب ہدایہ اور معانی و بیان کی مشہور کتاب مطول خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ نیز شرح عقائد عضدیہ پر حاشیہ لکھا۔ علاوہ ازیں المواہب العلیہ اور نجاۃ المومنین کے نام سے دو کتابیں تصنیف کیں۔

مولانا محمد محسن کشو کشمیری نے ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء میں رحلت فرمائی ❶۔

۵۰۔ مولانا محمد محسن کشمیری

بارھویں صدی ہجری کے دیار کشمیر میں محمد محسن نام کے دو عالم دین گزرے ہیں۔ ایک وہ جن کا اوپر کی سطور میں ذکر ہوا، اور وہ ہیں مولانا محمد محسن کشو کشمیری (متوفی ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء) دوسرے مولانا محمد محسن کشمیری وہ تھے، جن کا ترجمہ زیر نظر سطور میں دیا جا رہا ہے۔ یہ نامور بزرگ اور خطۂ کشمیر کے جید عالم مولانا امان اللہ شہید (شہادت ۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۸ء) کے شاگرد رشید تھے۔ علاقۂ کشمیر کے شیخ و فاضل اور مشہور فقیہ تھے۔ مسلک کے لحاظ سے حنفی اور فقہ و اصول کے ماہر تھے۔ ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ تحریر و کتابت میں بہت تیز اور خوشخط تھے۔ انھوں نے صحیح بخاری، تفسیر بیضاوی، مشکوۃ المصابیح، ہدایہ اور بہت سی دیگر کتابوں کی اپنے ہاتھ سے کتابت کی۔ اس زمانے میں طباعت و اشاعت کا فن تو معرض وجود میں نہیں آیا تھا، کتاب محفوظ کرنے کا بس یہی ایک طریقہ تھا، اور یہ بہت معزز کاروبار بھی تھا۔

مولانا محمد محسن کشمیری نے درس و تدریس میں بھی بڑا نام پایا، اور عمر بھر یہ سلسلہ جاری رکھا۔ ان سے علاقۂ کشمیر کے بے شمار علما وطلبا نے استفادہ کیا، جن میں شیخ رحمت اللہ کشمیری (متوفی ۱۱۶۳ھ/ ۱۷۵۰ء) قاضی مراد الدین کشمیری (متوفی ۱۱۶۰ھ/ ۱۷۴۷ء) اور ملا عبدالستار کشمیری کے نام خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں۔

مولانا محمد محسن کشمیری نے جمادی الاخریٰ ۱۱۸۱ھ/ نومبر ۱۷۶۷ء میں رحلت فرمائی ❷۔

---

❶ تاریخ کشمیر اعظمی ص ۲۱۶ - تذکرہ علمائے ہند ص ۲۱۲ - حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۲ - نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۴۷۔

❷ تاریخ کشمیر اعظمی ص ۱۷۱ - نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۴۷ - حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۹۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۵۱۔ مولانا محمد مراد لاہوری

مولانا محمد مراد لاہوری نواح لاہور کے جید عالم دین مفتی عبدالسلام لاہوری کے لائق فرزند تھے۔ بارھویں صدی ہجری کے ممتاز فاضل اور فقہ، اصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ ولادت وتربیت لاہور میں ہوئی اور اپنے والد مکرم مفتی عبدالسلام لاہوری سے کسب علم کیا۔ تصوف وطریقت کی طرف رجحان ہوا تو بحرزخار کی روایت کے مطابق شیخ شاہ محمد بدخشی کی خدمت میں حاضری دی۔ ان سے اخذ طریقت کیا اور مدت تک ان سے منسلک رہے۔

مولانا محمد مراد کے حالات میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا محمد معظم ۱۱۱۸ھ (۱۷۰۷ء) میں شاہ عالم بہادر شاہ (اول) کے لقب سے ہندوستان کا بادشاہ بنا تو اس کا رجحان شیعیت کی طرف تھا۔ اس نے ملک بھر کی مساجد کے خطیبوں کے نام حکم جاری کیا کہ خطبۂ جمعہ اور عیدین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذکر میں ان کے نام کے ساتھ ''علی ولی اللہ ووصی رسول اللہ'' کے الفاظ کا اضافہ کیا جائے۔ ملک میں بادشاہ کے اس فرمان کی شدید مخالفت ہوئی۔ لاہور میں بھی اس کے خلاف سخت ردعمل ہوا، اور علما اور عوام نے بادشاہ کا یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے مولانا محمد مراد لاہوری اور مولانا یار محمد لاہوری کو اس مسئلے پر بحث کے لیے تسبیح خانہ میں طلب کیا۔ ان حضرات نے شریعت کی روشنی میں اپنے موقف کی وضاحت کی۔ بادشاہ نے ان کے دلائل سن کر اور عوام کی برہمی اور علما کی مخالفت سے خوف زدہ ہو کر اپنا حکم واپس لے لیا، لیکن اس کے باوجود احتجاج کے لیے شاہی مسجد میں بہت بڑے ہجوم کی شکل میں لوگ جمع ہو گئے۔ بادشاہ کو اطلاع پہنچی تو اس نے نہایت خفگی کا اظہار کیا، اور لاہور کے تین جلیل القدر علما، مولانا محمد مراد، مولانا یار محمد اور مولانا جان محمد کو گرفتار کر کے قلعے میں محبوس کر دیا۔ ان پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ انھوں نے حکومت کے خلاف عوام کو فتنہ وفساد کے لیے برانگیختہ کیا ہے۔ خافی خاں نے منتخب اللباب میں یہ واقعہ ۱۱۲۱ھ/۱۷۰۹ء کے حوادث و واقعات کے ضمن میں ذکر کیا ہے۔

مولانا محمد مراد لاہوری بارھویں صدی ہجری کے جید عالم وفقیہ تھے، افسوس ہے، ان کی تاریخ ولادت و وفات اور دیگر حالات کا علم نہیں ہو سکا[1]۔

۵۲۔ مولانا محمد مراد کشمیری

مولانا محمد مراد کشمیری مسلکاً شیعہ تھے اور وادیٔ کشمیر کے نامور فضلا میں گردانے جاتے تھے۔ مشہور شیعی عالم حر عاملی کے شاگرد تھے۔ شیعی فقہ پر عبور رکھتے تھے۔ معروف محشی اور مصنف تھے۔ انھوں نے شیعہ

[1] منتخب اللباب، ج ۲، ص ۶۸۱، ۶۸۲۔ نیز دیکھیے نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۴۸، ۳۴۹۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مذہب کی ایک اہم کتاب "من لا یحضرہ الفقیہ" پر حاشیہ لکھا۔ اپنے استاد محترم حر عاملی کی تصنیف "بدایتہ الھدایہ" کی مبسوط شرح سپرد قلم کی۔ یہ شرح حر عاملی کے حکم سے لکھی اور اس کا نام "الدلیل الساطع" رکھا۔ "بداھیۃ الھدایہ" کی ایک مختصر شرح بھی لکھی، جس کو "النور الساطع" کے نام سے موسوم کیا❶۔

۵۳۔ مولانا محمد مراد سندھی

مولانا محمد مراد سندھی کبار علمائے سندھ میں سے تھے۔ وقت کے فاضل فقیہ ہونے کی وجہ سے انھیں اپنے شہر کے منصب قضا پر مامور کر دیا گیا تھا۔ ہمیشہ وعظ و تذکرہ اور درس و تدریس میں مصروف رہتے۔ آخر عمر میں ارض حجاز گئے اور جدہ میں اس زمانے کے ایک وزیر ریحان سے ملاقات ہوئی۔ وہ ان کے فضل و کمال سے اتنا متاثر ہوا کہ ان کے حلقۂ عقیدت میں داخل ہو گیا۔ ریحان نے ان کے لیے جدہ میں ایک رباط، ایک مسجد اور ایک مکان تعمیر کرایا۔

مولانا محمد مراد سندھی متورع و متقی اور صاحب عزیمت بزرگ تھے۔ قرآن، حدیث اور فقہ پر عبور کا یہ عالم تھا کہ اس موضوع پر ایک ضخیم کتاب تصنیف کی جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان کی یہ تصنیف کتاب و سنت اور فقہ کے نقطۂ نظر سے بہت سے مسائل پر محیط ہے۔ انھوں نے جدہ ہی میں وفات پائی۔ ان کے سال وفات کا پتا تو نہیں چل سکا البتہ شیخ رفیع الدین مراد آبادی نے اپنی کتاب ''الرحلہ'' میں ان کا ذکر کیا ہے۔

شیخ رفیع الدین مراد آبادی ۱۲۰۱ھ/ ۱۷۸۷ء میں حج و زیارت کے لیے حرمین شریفین گئے تھے اور مولانا محمد مراد سندھی ان کے وہاں جانے سے قبل انتقال کر چکے تھے❷۔

۵۴۔ شیخ محمد مراد رفیقی کشمیری

شیخ محمد مراد رفیقی بارھویں صدی ہجری میں وادیٔ کشمیر کے جید علما میں سے تھے۔ اپنے علاقے کے فضلائے وقت سے مستفید ہوئے اور علوم ظاہری و باطنی میں مرتبۂ کمال کو پہنچے۔ علوم منقولہ بالخصوص حدیث اور فقہ میں مہارت رکھتے تھے۔ کتابوں کے انتہائی شائق تھے اور بہت سی کتابیں ان کے کتب خانے میں موجود تھیں۔ مطالعۂ کتب اور صحبت اہل علم و کمال کے سوا انھیں کسی چیز سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ورع و تقویٰ میں بھی بڑی شہرت کے مالک تھے۔ مخلص اور پاک باز اہل علم تھے۔ عین جوانی میں وفات پائی اور کم عمر اولاد چھوڑ کر عالم آخرت کی راہ لی❸۔

❶ نجوم السماء۔ نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۳۴۹، ۳۵۰۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۵۰

❸ تاریخ کشمیر اعظمی ص ۲۱۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۵۵۔ مولانا محمد معصوم جائسی

مولانا محمد معصوم جائسی کے والد کا اسم گرامی نظام الدین تھا۔ بارھویں صدی ہجری کے نامور شیخ، بلند مرتبہ عالم، ممتاز فقیہ اور معروف اصولی تھے، علوم عربیہ میں یگانۂ روزگار تھے۔ فقہی لحاظ سے حنفی المسلک تھے۔ کئی مفید اور عمدہ کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات میں ایک تصنیف "الفصول المعصومیہ" ہے جو عربی زبان میں فقہی مسائل پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب انھوں نے اپنے تلمیذ رشید قاضی نعمت اللہ کے لیے تصنیف کی تھی۔ اس کے شروع میں یہ الفاظ درج ہیں:

لا احصی ثناء علیك انت كما اثنیت علی نفسك۔

الفصول المعصومیہ، ۳۷ فصول کو محتوی ہے۔ یہ فصول ابواب القضاء، دعویٰ، شہادت، اختلاف، اقرار، وکالہ، بیوع، اقالہ، صلح، ابراء، شفعہ، قسمہ، غصب، رہن، توکیل وغیرہ ابواب فقہیہ کو اپنے دامن صفحات میں سمیٹے ہوئے ہے۔ صاحب نزہۃ الخواطر سید عبدالحی حسنی لکھنوی لکھتے ہیں کہ یہ کتاب انھوں نے دیکھی ہے اور بڑی مفید ہے [1]۔

۵۶۔ شیخ محمد معین سندھی

سندھ کی سرزمین علم و فضل کے لحاظ سے ہمیشہ زرخیز رہی ہے اور اس نے مختلف ادوار میں بے شمار اصحاب فضل و کمال کو جنم دیا ہے۔ بارھویں صدی ہجری میں جن عظیم اور ممتاز شخصیتوں نے اس کی گود میں پرورش پائی ان میں شیخ محمد معین سندھی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کے والد کا اسم گرامی مولانا محمد امین اور دادا کا نام نامی شیخ طالب اللہ تھا۔ یہ خاندان اپنی گوناگوں خصوصیات کی بہ دولت سندھ میں تین پشتوں سے امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔

محمد معین، سندھ کے شہر ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے، جو اس وقت علم و علما کا مرکز اور محدثین و فقہا کا گہوارہ تھا۔ ان کی تاریخ پیدائش کا علم نہیں ہو سکا۔ شعور کی آنکھیں کھولیں تو گھر میں اسلامی علوم و فنون کا دریا بہہ رہا تھا، اور ان کے والد مولانا محمد امین کا سلسلۂ فیض جاری تھا۔ ہونہار بیٹے نے ابتدائی تعلیم جلیل القدر باپ سے حاصل کی۔ اس کے بعد اقلیم سندھ کے ایک رفیع المرتبت عالم اور معقولات و منقولات کے ماہر شیخ عنایت اللہ بن فضل اللہ ٹھٹھوی (متوفی ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۲ء) کے باب عالی پر دستک دی اور ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ جب اپنے علاقے اور گرد و پیش کے علما سے استفادہ کر چکے تو دہلی کا رخ کیا۔ دہلی میں اس زمانے میں علوم قرآن و حدیث کے چشمے ابل رہے تھے اور حضرت شاہ عبدالرحیم دہلوی رحمہ اللہ کے مدرسہ رحیمیہ کی مسند تدریس پر ان کے

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۵۰، ۳۵۱۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لائق فرزند حجۃ الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ متمکن تھے۔ محمد معین نے ان کی خدمت میں حاضری دی اور علوم معقول ومنقول سے بہرہ مند ہوئے۔

دہلی سے فارغ التحصیل ہونے اور شاہ ولی اللہ سے حصول علم کے بعد واپس اپنے وطن کا عزم کیا اور اس عہد کے عام رواج کے مطابق تصوف وطریقت کی طرف مائل ہوئے۔ پہلے شیخ ابوالقاسم نقشبندی کی طرف رجوع کیا جو فقہ واصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے، ان سے خوب مستفیض ہوئے۔ پھر شیخ عبداللطیف بھٹائی (متوفی ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء) کا در تصوف کھٹکھٹایا اور ان سے فیض یاب ہوئے، جس کے نتیجے میں علم ومعرفت کے بلند مرتبے کو پہنچے۔

شیخ محمد معین سندھی اپنے عصر اور علاقے میں قرآن وحدیث کے فہم میں یکتا، فقہ واصول پر عبور میں منفرد، تحقیق وکاوش میں ممتاز، ذکاوت وفطانت میں بے نظیر اور ادب وشعر میں بڑی شہرت کے مالک تھے۔ علوم مروجہ میں مہارت اور فنون متداولہ پر وسعت نظر میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ بے حد ذہین اور نکتہ رس عالم تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد سلسلۂ تدریس جاری کیا اور مسند درس آراستہ فرمائی، جس سے بے شمار طلبا وعلمانے استفادہ کیا اور کثیر التعداد حضرات نے ان کے چشمۂ فیض سے اپنی علمی تشنگی بجھائی۔

میر علی شیر قانع سرزمین سندھ کے مشہور مورخ تھے، وہاں کے علما وفضلا، صوفیا واتقیا اور امرا وحکام کی تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ وہ شیخ محمد معین کی علمی ہمہ گیری اور اوصاف بوقلموں کا تذکرہ مقالات الشعرا میں ان الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں:

جامع علوم معقول ومنقول، حاوی معالم فروغ واصول، کاشف حقائق علمی وعملی، شارح دقائق صدری ومعنوی، علامۂ عصر، نحریر وقت، مظہر حقائق ربانی❶۔

یعنی شیخ محمد معین ٹھٹھوی معقولات ومنقولات کے جامع، فروع واصول کے عالم، علمی وعملی گتھیوں کو سلجھانے والے، ذہنی وفکری الجھنوں کے شارح، علامہ عصر، اپنے عہد کے نہایت قابل بزرگ اور احکام خداوندی کی وضاحت میں ید طولیٰ رکھنے والے تھے۔

اپنے متنوع اوصاف وکمالات کی بدولت ہر حلقے میں انھیں عزت وتکریم کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ میر علی شیر قانع اپنی ایک اور تصنیف تحفۃ الکرام میں ان کے اسلاف کے بارے میں رقم طراز ہیں❷۔

شیخ محمد معین کے والد مخدوم محمد امین تعلقہ روپارہ اور میدان باراں کے گاؤں ''ڈائی'' یا (والی) کے رہنے والے تھے اور ''دل لاکھ'' قوم کے فرد مخدوم طالب اللہ کے فرزند تھے۔ اپنے آبائی وطن کی سکونت ترک کر کے ٹھٹھے میں اقامت پذیر ہوئے اور علمی اور عملی فضیلت میں بڑی شہرت پائی۔ مخدوم طالب اللہ کے حلقۂ ارادت

❶ مقالات الشعرا، ص ۱۲۱۔

❷ تحفۃ الکرام (اردو ترجمہ) ص ۶۹۳، ۶۹۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں ایک شخص فاضل خاں شامل تھا۔ جو عالم اور نیک شخص تھا۔ بادشاہ وقت شاہ جہان کے دربار میں رسائی حاصل کر کے اچھے منصب پر فائز ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی بیٹی کا عقد مخدوم طالب اللہ کے بیٹے مخدوم محمد امین سے کر دیا تھا۔ اس عقد کی وجہ سے مخدوم محمد امین بڑی شان و شوکت کو پہنچے اور عوام و خواص میں بے حد عزت و احترام کے مالک ہوئے۔

مخدوم محمد امین کے بیٹے مخدوم محمد معین تھے، اللہ نے ان کی ذات گرامی میں بہت سی صفات جمع کر دی تھیں، وہ اپنے وقت میں جملہ علوم و فنون اور کمالات کے جامع تھے۔ معقولات و منقولات میں اپنے عہد کے علامہ اور اپنے زمانے کی لاجواب شخصیت تھے۔ کمالات علمی کے باوجود راہ سلوک سے بھی آگاہ تھے، کتنے ہی بزرگان دین سے ان کی صحبتیں رہیں۔

مولوی رحمان علی ان کے فضل و کمال کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ ان کے اوصاف علمی کی بنا پر حکام وقت بھی ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور انتہائی تعظیم سے پیش آتے تھے۔

مخدوم محمد معین سندھی ____ شاگرد مخدوم عنایت اللہ جامع جمیع علوم، حاوی معقول و منقول، نحریر عصر، علامۂ دہر بود، باوجود کمالات علمی آشنا بحر معرفت شدہ، بصحبت بسیارے از بزرگان دین رسیدہ، حکام وقت بدیدنش بکمال تعظیم می رسیدند، دے بہ ایشاں ملاقات ہا نیکو کردی [1]۔

(شیخ محمد معین سندھی۔ حضرت مخدوم عنایت اللہ سندھی کے شاگرد تھے۔ تمام فنون کے جامع اور معقول و منقول پر دسترس رکھتے تھے۔ اپنے وقت کے فاضل اور اپنے عصر کے علامہ تھے۔ کمالات علمی کے ساتھ دریائے معرفت کے بھی غواص تھے۔ بہت سے بزرگان دین کی صحبت میں رہ چکے تھے ____ حکام وقت بھی انؑ سے ملاقات کے لیے حاضر ہوتے اور وہ بھی ان سے خلوص و محبت سے ملتے تھے۔)

مخدوم محمد ابراہیم خلیل ٹھٹھوی تکملہ مقالات الشعرا میں ان کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

عمدۃ العلما الربانیین وقدوۃ المفسرین والمحدثین۔ مخدوم محمد معین [2]۔

یعنی مخدوم محمد معین اپنے عہد میں علمائے ربانی میں بلند تر اوصاف کے حامل اور مفسرین و محدثین کے سرخیل تھے۔

نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ مخدوم محمد معین ٹھٹھوی کا ذکر اپنی دو کتابوں میں کرتے ہیں۔ ایک اتحاف النبلا میں، اور دوسری کتاب دلیل الطالب علی الرجع المطالب میں۔ اول الذکر کتاب میں وہ حضرت مخدوم کی تصنیف ''دراسات اللبیب'' کے مندرجات کا تعارف کراتے ہوئے اس کے مصنف شہیر کے بارے میں رقم

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۱۶، ۲۱۷

[2] تکملہ مقالات الشعرا ص ۱۸۵۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتے ہیں۔

للشیخ الفاضل المحقق محمد معین بن محمد امین سندی ❶۔

کہ دراسات اللبیب شیخ فاضل محقق محمد معین بن محمد امین سندھی کی تصنیف ہے۔

ثانی الذکر کتاب میں نواب صاحب حضرت مخدوم ممدوح کو ''الشیخ العلامۃ الادیب محمد معین'' ❷ کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔

اسی طرح صاحب نزہۃ الخواطر سید عبدالحی حسنی لکھنوی بھی ان کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

مخدوم محمد معین ٹھٹھوی اپنے زمانے میں اقلیم سندھ کے شیخ، فاضل اور علامہ تھے۔ حدیث، کلام اور علوم عربیہ کے جید عالم تھے۔ نہایت ذکی، عالی فکر، ماہر علم و عرفان، بہترین شاعر، صاحب طرز ادیب، معقول و منقول میں یکتا اور تصوف و طریقت میں ممتاز تھے ❸۔

شیخ محمد معین سندھی، علم حدیث میں خاص طور سے درک رکھتے تھے اور اس کے مختلف گوشوں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جہاں اقوال فقہا حدیث رسول اللہ ﷺ سے ہم آہنگ نہ ہوں، وہاں اقوال فقہا کو ترک کر دیا جائے گا اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث مبارکہ کو مدار عمل قرار دیا جائے گا۔ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اہل علم کے لیے اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے اور ہر زمانے کے علما کو جن میں اجتہاد کی شرائط پائی جائیں، حق اجتہاد حاصل ہے۔ وہ تقلید کے سخت مخالف تھے۔ ان مسائل میں ان کے اور ان کے معاصر مولانا محمد ہاشم سندھی ٹھٹھوی (متوفی ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۱ء) کے درمیان مباحث و مناظرات کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مولانا محمد ہاشم سندھی بھی اپنے عہد کے جلیل القدر عالم تھے اور حنفی المسلک تھے۔ وہ تقلید کے زبردست حامی اور اجتہاد کے مخالف تھے۔ لیکن اس کے برعکس شیخ محمد معین کا نقطۂ فکر دوسرا تھا، وہ حدیث کے مقابلے میں قول امام کو ماننے سے صاف لفظوں میں انکار کرتے تھے، اس لیے دونوں کے درمیان خوب بحثیں چلتی تھیں۔

شیخ محمد معین سندھی کو تصنیف و تالیف میں خاص شہرت حاصل تھی۔ انھوں نے عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں کتابیں تصنیف کیں اور بڑے بڑے اہم مسائل کو زیر بحث لائے۔ ان کا طرز بیان زوردار اور مدلل ہے۔ ان کی عربی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱۔ دراسات اللبیب فی الاسوۃ الحسنۃ بالحبیب: یہ کتاب بارہ دراسات کو محیط ہے اور رد تقلید میں ہے۔ اس میں اس امر کی تفصیل سے صراحت کی گئی ہے کہ مسائل شرعیہ میں بنیادی حیثیت صرف

---

❶ اتحاف النبلاء ص ۷۸۔

❷ دلیل الطالب علی ارجح المطالب ص ۱۶۷۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۵۱، ۳۵۲۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رسول اللہ ﷺ کی حدیث اور آپ کے ارشادات عالی قدر کو حاصل ہے۔ اگر کہیں حدیث پیغمبر اور قول امام میں تصادم ہو، تو حدیث کو ترجیح دی جائے گی اور قول امام کو ترک کر دیا جائے گا۔ اس باب میں حضرت مصنف نے محکم دلائل سے گفتگو کی ہے اور جن حضرات نے جہاں جہاں حدیث کے مقابلے میں قول امام کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ان کو انتہائی سختی سے ہدف تنقید ٹھہرایا ہے۔ یہ کتاب اپنے انداز کی بہترین کتاب ہے۔ شروع سے آخر تک زبان بڑی صاف اور اسلوب بیان محققانہ ہے۔ نواب صدیق حسن خاں نے ''اتحاف النبلا'' میں اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ فاضل محقق شیخ محمد معین بن محمد امین سندھی کی یہ تالیف عمل بالحدیث اور مخالف حدیث مذہب کے ترک کے بارے میں نہایت عمدہ ہے۔ اس کے مشمولات و مندرجات مبنی بر تحقیق ہیں، اس کی زبان و عبارت میں انتہائی متانت پائی جاتی ہے اور جو باتیں اس میں بیان کی گئی ہیں، وہ حقیقت کی آئینہ دار ہیں۔ حضرت مصنف نے اپنے دعوے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے بدرجۂ غایت دقت نظر سے کام لیا ہے ❶۔

دراسات اللبیب سب سے پہلے ۱۲۸۴ھ میں لاہور سے طبع ہوئی تھی، لیکن پھر بالکل نایاب ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۵۷ء میں لجنۃ احیاء الادب السندی (یعنی سندھی ادبی بورڈ کراچی) کی طرف سے شائع کی گئی کتاب اپنے موضوع میں لائق مطالعہ ہے۔ فقہی مسائل میں حضرت مصنف کا زیادہ تر نقطۂ نظر وہی ہے جو اہل حدیث حضرات کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض ہم عصر حنفی علما نے کتاب کے اس قسم کے مضامین کی تردید کی اور حضرت شیخ محمد معین سندھی کے نقطۂ نظر کی مخالفت میں کتابیں تصنیف کیں، لیکن جو زور اور وزن شیخ محمد معین سندھی کے دلائل اور اسلوب میں پایا جاتا ہے، وہ ان کے مخالفین کی کتابوں میں نہیں ہے۔

۲. الحجۃ الجلیله فی قضاء الحکم بالافضیله۔

۳. ایقاظ الوسنان۔

۴. رساله فی اثبات اسلام ابی طالب۔

۵. انوار الوجد من منع المجد۔

۶. غایت الایضاح فی المحاکمة بین الودرو ابن الصلاح۔

۷. رساله فی بحث حدیث المصراة۔

۸. رساله فی تحقیق معنی الحدیث لانورث ماترکنا صدقة۔

۹. مواهب سید البشر فی حدیث الائمة الاثنی عشر۔

۱۰. غایة الفسخ لمسئلة النسخ۔

۱۱. قرة العین فی ابکاء علی الامام الحسین۔

❶ اتحاف النبلا ص ۷۸۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۲۔ اثبات رفع الیدین فی الصلوۃ۔

۱۳۔ ابراز الضمیر المنصف الخبیر۔

۱۴۔ رسالہ فی انتقاد المومنین من فتح القدیر۔

۱۵۔ رسالہ فی بحث تناسخ۔

۱۶۔ رسالہ بالاجوبۃ الفاضلہ الامثلۃ العشرۃ الکاملۃ۔

۱۷۔ رسالہ فی تحقیق اھل البیت۔

یہ سترہ کتب ورسائل عربی زبان میں ہیں۔ فارسی میں بھی انھوں نے کتابیں تصنیف کیں، جن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ اثبات رفع الیدین فی الصلوۃ۔

۲۔ شرح رموز عقائد صوفیہ۔

۳۔ رسالہ اویسیہ۔

۴۔ طریقۃ العون فی حقیقۃ الکون۔

شیخ محمد معین سندھی نماز میں رفع یدین کے قائل تھے۔ اس کے اثبات میں انھوں نے دو رسالے تصنیف کیے۔ ایک عربی میں اور ایک فارسی میں۔ ان دونوں رسالوں میں رسول اللہ ﷺ کی احادیث اور صحابہ کرام کے اقوال وعمل کی روشنی میں رفع یدین کا ثبوت دیا گیا ہے۔

جیسا کہ ان کی تصنیفات کے ناموں سے ظاہر ہے، وہ بعض مسائل میں ایسے افکار ورجحانات کے حامل ہیں، جن کا عام اہل سنت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً

وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اصحاب ثلاثہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم پر فضیلت دیتے تھے۔

عمل اہل بیت کو عمل اہل مدینہ پر ترجیح دیتے تھے۔

حضرت حسین کی شہادت کے دن افسوس کے طور پر رونے کے قائل تھے۔

ابوطالب کے ایمان کے قائل تھے۔

وجد وسماع کو صحیح قرار دیتے تھے۔

شیخ محمد معین سندھی جہاں تصنیف وتالیف میں یکتا، تحقیق وتدقیق میں بے مثال اور بحث ومناظرہ میں عدیم النظیر تھے، وہاں بہت بڑے مدرس اور معلم بھی تھے۔ ان کا سلسلۂ تدریس بڑا وسیع تھا، بے شمار علما وطلبا نے ان سے استفادہ کیا اور پھر ان میں سے ہر ایک نے آگے چل کر عظیم الشان علمی اور تدریسی خدمات انجام دیں۔

شیخ محمد معین فارسی اور اردو کے ممتاز شاعر بھی تھے۔ فارسی میں تسلیم اور اردو میں بیراگی تخلص کرتے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھے۔ ان کا فارسی کلام موجود ہے اور میر علی شیر قانع نے اپنی تصنیف مقالات الشعرا میں ان کے اشعار نقل کیے ہیں، لیکن اردو کلام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ گم ہو گیا۔

شیخ ممدوح نے ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء کو ٹھٹھہ میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

۵۷۔ سید محمد ممتاز نصیر آبادی

سید محمد ممتاز حسنی نصیر آبادی، شاہ علم اللہ بریلوی کے پڑپوتے، شاہ ابوحنیفہ کے پوتے اور شاہ عبدالباقی کے بیٹے تھے۔ کئی پشتوں سے یہ خاندان دیار ہند میں علم و عمل کے اعتبار سے ممتاز شہرت کا حامل اور ورع و تقوی میں منفرد حیثیت کا مالک ہے۔ حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اسی خاندان کے لعل درخشاں تھے۔ اس خانوادے کو برصغیر میں اپنے فضل و صلاح کی بدولت اب تک خاص عز و شرف کا مقام حاصل ہے، اور اس کے بعض اہل علم تو اپنی گوناگوں قابلیت و استعداد کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت کے اونچے مرتبے پر فائز ہیں۔

سید محمد ممتاز حسنی نصیر آبادی جو اس خاندان کے اکابر میں سے تھے، معروف اصحاب فضل و کمال میں گردانے جاتے تھے۔ وہ نصیر آباد (یو پی) میں پیدا ہوئے، وہیں پرورش پائی اور اپنے والد گرامی سید عبدالباقی نصیر آبادی (متوفی ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء) سے علم فقہ کی تحصیل کی، اخذ طریقت بھی انہی سے کیا۔ قناعت و عفت اور توکل و اتقا میں اپنے آبا و اجداد کا صحیح نمونہ تھے۔ سب طرف سے منقطع ہو کر عبادت الٰہی میں مشغول رہتے اور معاملات دنیا سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے ❶۔

۵۸۔ شیخ محمد مومن الجزائری

شیخ محمد مومن الجزائری مسلکاً شیعہ تھے۔ ان کا مولد و منشا ایران کا شہر ''شیراز'' ہے۔ متعدد بلند مرتبہ اساتذہ سے اخذ علم کیا اور فنون متداولہ میں ماہر ہوئے۔ تفسیر و حدیث، فقہ و اصول، صرف و نحو، منطق و فلسفہ، فرائض و ریاضی، طب، جفر و رمل، حکمت و کلام، شعر و ادب، لغت، غرض معقولات و منقولات میں اپنے عہد میں یگانۂ روزگار تھے۔ تحصیل علم کے بعد ہندوستان کا رخ کیا اور علاقہ دکن کی سیر و سیاحت شروع کی۔ پھر (غالباً) دکن ہی کو اپنا مسکن قرار دے لیا تھا۔

شیخ محمد مومن الجزائری بے شک شیعہ تھے، لیکن وسیع القلب اور کھلے ظرف کے اہل علم تھے۔ علوم و فنون کے تمام گوشوں میں دسترس رکھتے تھے۔ ان کو اللہ نے تصنیف و تالیف کا بھی ذوق اور سلیقہ عطا کیا تھا، چنانچہ مختلف عنوانات و مسائل سے متعلق کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں چند کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ جامع المسائل النحویہ فی شرح الصمدیۃ البھامیہ: یہ اپنے موضوع کی ایک مبسوط کتاب ہے۔

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۵۵۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔ بیان الآداب۔
۳۔ مصباح المبتدین۔
۴۔ مشکوٰۃ العقول۔
۵۔ قرۃ العین۔
۶۔ سبکۃ اللجین: اس میں قرآن مجید کی آیات مشکلہ، احادیث غریبہ اور بعض اشعار وابیات کی عقدہ کشائی کی گئی ہے: اس کا سال تالیف ۱۱۰۱ھ/۱۶۹۰ء ہے۔
۷۔ وسیلۃ الغریب: اس کا انداز وہی ہے جو ان کی تصنیف قرۃ العین کا ہے۔
۸۔ تحفۃ الغریب۔
۹۔ نخبۃ الطبیب: یہ طب کی مشہور کتاب ''قانونچہ'' کی شرح ہے۔
۱۰۔ تمیمۃ الاطبا: یہ کتاب ''کشکول'' کے اسلوب کی ہے۔
۱۱۔ تمیۃ الفواد من الم العباد: اس میں بعض نادر اشعار کا لغوی حل پیش کیا گیا ہے۔ نیز ان کی تشریح کی گئی ہے۔
۱۲۔ جنات: یہ آٹھ فنون پر مشتمل ہے۔
۱۳۔ مشرق السعدین۔
۱۴۔ مجمع البحرین۔
۱۵۔ ثمرۃ الفواد و سمرہ البعاد۔
۱۶۔ محاسن الاخبار و مجالس الاخیار: یہ کتاب سات جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے۔
۱۷۔ ثمرۃ الحیات و ذخیرۃ الممات۔
۱۸۔ طیف الخیال فی مناظرۃ العلم والمال۔

شیخ محمد مومن بڑے زندہ دل اور خوش مزاج عالم تھے۔ مزاح اور ظرافت میں مشہور تھے۔

۵۹۔ شیخ محمد ناصر الہ آبادی

شیخ محمد ناصر عباسی الہ آبادی، خطۂ ہند کے نامور فاضل اور مشہور عالم تھے۔ شیخ محمد فاخر عباسی الہ ابادی کے چھوٹے بھائی اور شیخ محمد یحییٰ الہ آبادی، (معروف بہ شیخ خوب اللہ الہ آبادی) کے تین بیٹوں میں سے دوسرے بیٹے تھے۔ ۱۱۲۲ھ/۱۷۱۰ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ اپنے بڑے بھائی شیخ محمد طاہر (متوفی ۲ جمادی الاولیٰ ۱۱۴۳ھ/۲ نومبر ۱۷۳۰ء) اور ماموں شیخ کمال الدین الہ آبادی سے جو علوم حکمیہ کے ماہر اور فنون مرجہ کے فاضل تھے، علم حاصل کیا اور دیار ہند کے جید علما میں گردانے گئے۔ مختلف علوم وفنون میں درک و مہارت کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ساتھ ساتھ شعر و شاعری کا بھی عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ بہترین شاعر تھے اور ان کا کلام تین ضخیم دواوین پر محیط ہے۔ تصنیف و تالیف کا ملکہ بھی حاصل تھا۔ ان کی تصنیفات میں یہ کتابیں شامل ہیں۔

منتخب الاعمال، الجواھر النفیسہ، الافکار العشرہ، تذکرہ الخلفاء، تفسیر آیات الاحکام، انوارالحقائق، تنبیہ الاعزۃ بما کان لی عند الشیخ من العزۃ۔ ایک رسالہ اثبات مذہب حق کے بارے میں ہے۔

شیخ محمد ناصر عباسی الہ آبادی نے بدھ کے روز، مغرب کے وقت ۲۱ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۳ھ/ ۱۷ اپریل ۱۷۵۰ء کو صرف ۴۱ سال عمر پا کر جنت کی راہ لی، اپنے آبائی شہر الہ آباد (یوپی) میں وفات پائی اور وہیں آسودۂ خاک ہوئے [1]۔

۶۰۔ خواجہ محمد ناصر عندلیب دہلوی

خواجہ محمد ناصر حسینی دہلوی نجیب الطرفین سید تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب دس واسطوں سے حضرت خواجہ بہاالدین محمد نقشبندی بخاری سے اور چوبیس واسطوں سے حضرت حسن عسکری سے ملتا ہے۔

خواجہ بہاء الدین محمد نقشبند درحقیقت بخارا کے رہنے والے تھے۔ اور یہ وہی بزرگ ہیں جن کو سلسلۂ نقشبندیہ کے بانی اول ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کی وفات سے تقریباً تین سو سال بعد ان کے اخلاف میں سے ایک بزرگ خواجہ محمد طاہر نقشبند پیدا ہوئے۔ اس خاندان کے وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے بخارا کی سکونت ترک کر کے ہندوستان کا عزم کیا۔ یہ بزرگ خواجہ محمد ناصر عندلیب دہلوی کے مورث اعلیٰ تھے۔ اس زمانے میں ہندوستان کے تخت پر اورنگ زیب عالم گیر متمکن تھا۔ وہ ان سے انتہائی عقیدت سے پیش آیا، اور حکومت کے اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کی درخواست کی، مگر انھوں نے شہنشاہ ہند کی اس درخواست کو شرف قبولیت نہیں بخشا اور اپنے تین بیٹوں خواجہ محمد صالح، خواجہ محمد یعقوب اور خواجہ فتح اللہ کو دہلی میں عالم گیر کے دربار میں چھوڑا اور خود حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ ایک روایت کے مطابق واپس بخارا چلے گئے تھے [2]۔

خواجہ فتح اللہ کے بیٹے، نواب ظفر اللہ خاں اور نواب ظفر اللہ خاں کے بیٹے یہی خواجہ محمد ناصر ہوئے، جن کا تذکرہ ان سطور میں کیا جا رہا ہے۔

خواجہ محمد ناصر کی ولادت دہلی میں ہوئی، تربیت کی مختلف منزلیں بھی اسی شہر میں طے کیں۔ صغر سنی ہی میں حصول علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ اس عہد کے جن مشاہیر اصحاب فضل و کمال سے مستفید ہونے کا موقع ملا ان میں شیخ سعد اللہ دہلوی اور شیخ زبیر بن ابوالعلا سرہندی کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ کافی

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۱۷، ۲۱۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۵۷، ۳۵۸

[2] تفصیل کے لیے دیکھیے فقہائے ہند، ج پنجم

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عرصہ ان سے منسلک رہے یہاں تک کہ اللہ نے ان کے لیے علم و معرفت کے دروازے کھول دیے اور ان کا شمار فقہ و اصول اور دیگر علوم متعارفہ کے علمائے راسخین کی بلند مرتبت جماعت میں ہونے لگا۔

خواجہ ممدوح اپنے دور کے جید عالم اور ممتاز صاحب طریقت تھے اور ''محمدی'' نسبت رکھتے تھے۔ صوفیا و مشائخ کی متعارف رسوم اور اصطلاحات و اختراعات سے کبھی کوئی تعلق نہ رکھا۔ عملی و علمی کمالات کے ساتھ ساتھ ان میں ایک کمال یہ تھا کہ نامور شاعر تھے اور عندلیب تخلص کرتے تھے۔ علاوہ ازیں مصنف بھی تھے۔ مندرجہ ذیل کتابیں ان کی تصنیفات میں شامل ہیں۔

۱۔ نالۂ عندلیب: یہ کتاب نثر میں ہے اور فارسی زبان میں ہے، دو ضخیم جلدوں پر محیط ہے۔ اس میں معرفت و طریقت، فقہ و اصول اور متفرق مسائل سے متعلق بڑی اہم باتیں معرض کتابت میں لائی گئی ہیں۔ مصنف نے یہ کتاب ۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء میں مکمل کی اور نواب سید صدیق حسن خاں کے فرزند رشید نواب نور الحسن خاں مرحوم کی سعی جمیلہ سے شائع ہوئی۔ پوری کتاب اٹھارہ سو صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔

۲۔ رسالہ ہوش افزا: یہ بھی نثر میں ہے اور فارسی زبان میں ہے۔

۳۔ دیوان عندلیب: جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا، خواجہ محمد ناصر عندلیب بہت اچھے شاعر تھے۔ ''دیوان عندلیب'' ان کے فارسی کلام کا مختصر مجموعہ ہے۔

خواجہ محمد ناصر عندلیب دہلوی نے ۶۶ سال عمر پا کر ہفتے کے روز ۲ شعبان ۱۱۷۲ھ/۳۱ مارچ ۱۷۵۹ء کو دہلی میں عالم فنا سے عالم بقا کو رخت سفر باندھا۔

۶۱۔ شیخ محمد نصیر شیخ پوری

شیخ محمد نصیر شیخ پوری شیعہ تھے اور شیخ شمس الدین اودھی کی اولاد میں سے تھے۔ مولد و منشا شیخ پورہ ہے۔ ابتدائے جوانی ہی میں ملا شاہ محمد شیرازی کی خدمت میں گئے اور ان سے کتب درسیہ پڑھیں، مشائخ ایران سے فقہ کی تعلیم پائی، حدیث کی سند بھی انہی سے لی، یہاں تک کہ حدیث، فقہ، ہیئت، ہندسہ اور حساب وغیرہ میں اونچے مرتبے کو پہنچے۔ بعد ازاں واپس ہندوستان آئے اور صوبہ بہار کے شہر عظیم آباد (پٹنہ) میں سکونت اختیار کی۔ اس زمانے کے مغل بادشاہ نے صوبہ بہار میں ان کو کوئی گاؤں بطور جاگیر عطا کر دیے تھے ❶۔

۶۲۔ مولانا محمد نعیم جون پوری

شیخ محمد نعیم بن مفتی محمد فائض صدیقی اودھی ثم جون پوری۔ محمد بن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے۔

❶ سیر المتاخرین ج ۲، ص ۶۱۱ - نیز دیکھیے نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۵۹۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بارھویں صدی ہجری کے عالم کبیر اور شیخ فاضل تھے۔ ان کے جد امجد کا نام نامی شیخ پیر محمد تھا جو سید سالار مسعود غازی کے ساتھ وارد ہند ہوئے اور ہندوؤں سے معرکہ کارزار گرم کیا۔ بعد ازاں علاقۂ اودھ میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ شیخ محمد نعیم کے والد محترم مفتی محمد فائض تھے جو اودھ کے منصب افتا سے سرفراز ہوئے اور ایک گاؤں میں ٹھہرے جس کا نام ''بدیع السرا'' تھا، لیکن عوامی زبان میں اسے ''بدوسرائے'' کہا جاتا ہے۔

مفتی محمد فائض کے بیٹے محمد نعیم نے مصنف رشیدیہ شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری اور دیگر علمائے عصر سے کسب علم کیا۔ اس زمانے کے عام دستور کے مطابق تصوف و طریقت کا علم بھی حاصل کیا۔ پھر اللہ نے اس قدر عروج بخشا کہ معقول و منقول میں دسترس حاصل کی اور اپنے وقت اور علاقے کے علامہ قرار پائے۔ ابتدا میں چونکہ علاقہ اودھ کے رہنے والے تھے اس لیے اودھی کہلائے، اور بعد میں جون پور کو اپنا مسکن قرار دے لیا تو جون پوری کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ فقہ اور دیگر علوم میں ان کی ٹکر کا اس وقت کوئی دوسرا عالم نہ تھا۔ ہدایہ کی مفصل شرح سپرد قلم کی جو چودہ جلدوں میں ہے۔ حدیث کی درسی کتاب مشکوٰۃ کی شرح بھی لکھی اور کمال یہ ہے کہ یہ شرح ضعف بصارت کے بعد لکھی۔

مولانا محمد نعیم صدیقی جون پوری بلند ہمت عالم دین تھے۔ تصنیف و تالیف اور درس و تدریس ان کا شب و روز کا مشغلہ تھا۔ سو سال سے زائد عمر کو پہنچ گئے تھے، لیکن نہ تدریس میں کمی پیدا ہوئی اور نہ تصنیف میں کوئی حرج واقع ہوا۔

اس جلیل القدر عالم اور رفیع المرتبت فقیہ نے ۱۸ صفر ۱۱۲۰ھ/ ۸ اپریل ۱۷۰۹ء کو جمعۃ المبارک کی رات کو عالم آخرت کی طرف رحلت فرمائی۔ بعض حضرات نے قرآن مجید کے ان الفاظ سے تاریخ وفات نکالی۔

وعندہ جنات لھم فیھا نعیم مقیم ❶۔

۶۳۔ سید محمد نور نصیر آبادی

سید محمد نور نصیر آبادی برصغیر کے عظیم القدر خاندان کے رکن تھے۔ یعنی رائے بریلی کے شیخ اجل حضرت سید علم اللہ حسنی کے پوتے اور حضرت سید محمد ہدیٰ کے فرزند دلبند تھے۔ اپنے جلیل القدر دادا کے زمانے میں پیدا ہوئے اور انھی کی نگرانی میں کسب علم کیا، فقہ کی تعلیم بھی ان سے پائی اور اخذ طریقت بھی انھی سے کیا۔ سید علم اللہ کو اپنے اس پوتے سے بڑی محبت تھی اور سید محمد ہدیٰ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اس بچے کی تربیت میری مغفرت کا باعث ہوگی۔

سید محمد نور حصول علم سے فارغ ہوئے اور جوانی کو پہنچے تو شاہی ملازمت کے لیے دکن کا ارادہ کیا۔ سید علم اللہ کے ارادت مندوں میں سے ایک امیر نے سفارش کر کے شہزادہ اعظم جاہ کی سرکار میں ملازمت دلا دی

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۶۰۔ بحوالہ گنج ارشدی۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور بہت بڑا کام یہ کیا کہ خاص ان کے لیے دربار کے عام طریق تسلیم و بندگی کی جگہ صرف سلام مسنون کی اجازت حاصل کی۔ اس طرح چودہ برس ملازمت میں گزر گئے۔ ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ ایک وسیع میدان ہے اور اس میں نہایت خوب صورت مسجد بنی ہوئی ہے۔ اس میں ایک بزرگ بیٹھے ہیں جن کی شکل بڑی نورانی ہے۔ سامنے ایک دستار رکھی ہے۔ بزرگ نے دستار کو ہاتھ میں پکڑا اور پھاڑ دیا۔ سید محمد نور نے پوچھا: ''یہ کیا ہوا؟'' بزرگ نے جواب دیا: یہ ''اعظم جاہ کی سلطنت تھی، جس کی دستاویز پارہ پارہ کر دی گئی۔''

خواب سے بیدار ہوتے ہی طبیعت ملازمت سے بیزار ہو گئی اور دو برس کی رخصت لے کر گھر چلے گئے۔ پھر استعفا دے دیا۔

سید محمد نور عفت و قناعت، ورع و تقویٰ، جود و سخا اور ہمدردیٔ خلائق میں اپنے واجب الاحترام والد اور لائق تعظیم دادا کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ غیبت اور کذب بیانی سے اس درجے تنفر تھا کہ اسے سن بھی نہیں سکتے تھے۔ پابند سنت تھے۔ اہل بدعت کے تحائف و ہدایا، ہرگز قبول نہ کرتے۔ اکل حلال کا خاص طور پر اہتمام فرماتے۔ عزیزوں، ہمسائیوں اور غریبوں کی خدمت کو ذریعہ سعادت سمجھتے۔ اوقات شب و روز کا بیشتر حصہ انہی کی خدمت میں بسر ہوتا۔

سید علم اللہ کے خانوادۂ بلند بخت کے اس نامور عالم و فقیہ نے بدھ کے روز ۶ ربیع الاول ۱۱۴۸ھ/۱۲ جولائی ۱۷۳۵ء کو نصیر آباد میں داعی اجل کو لبیک کہا، اور اپنے نانا سید داؤد (برادر حقیقی سید علم اللہ شاہ) کے قریب دفن ہوئے ❶۔

۶۴۔ سید محمد وارث حسینی بنارسی

سید محمد وارث حسینی کا قدیم وطن ایک قریہ ''نونہرہ'' تھا جو اعمال غازی پور میں واقع تھا۔ ان کے والد سید عنایت اللہ حسینی عہد عالم گیری میں بنارس کے منصب قضا پر مامور تھے، اس لیے بنارس ہی میں سکونت رکھتے تھے۔ ان کی ولادت ۱۰۸۷ھ/۱۷۷۳ء میں بنارس میں ہوئی۔ عالم طفولیت ہی میں تحصیل علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ مختلف اساتذہ سے اخذ علم اور کسب فیض کیا اور فقہ، اصول، کلام اور علوم عربیہ کے اکابر علما میں ان کا شمار ہونے لگا۔ منطق و حکمت اور دیگر فنون میں بھی بلند مرتبے کو پہنچے۔

سید محمد وارث بنارسی نے کئی کتب درسیہ پر حواشی و تعلیقات سپرد قلم کیے۔ علم فقہ کی مشہور کتاب شرح وقایہ پر حاشیہ لکھا، میر زاہد پر بھی حاشیہ تحریر کیا۔ کہتے ہیں، قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھی تھی۔

سید محمد وارث حسینی بنارسی نے جو اپنے علاقے اور عہد کے ممتاز فقیہ اور بہت بڑے عالم و مصنف تھے، ۱۰ ربیع الثانی ۱۱۶۶ھ/۱۴ فروری ۱۷۵۳ء کو بنارس میں وفات پائی اور وہیں آسودۂ لحد ہوئے ❷۔

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۶۱ - سید احمد شہید ص ۵۱ - نیز دیکھیے اعلام الہدیٰ۔

❷ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۱۸، ۲۱۹ - تذکرہ مشائخ بنارس ص ۳۲ تا ۳۹ - برکات اولیائے ص ۱۵۴ - نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۶۱

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۶۵۔ مولانا محمد ہاشم ٹھٹھوی سندھی

کشور سندھ کے مردم آفرین خطے میں جن اصحاب فضل وفیض اور ارباب علم وکمال نے درس وتدریس کے ہنگامے برپا کیے اور تصنیف وتالیف کے جھنڈے گاڑے، ان میں مولانا محمد ہاشم سندھی کا نام نامی تاریخ برصغیر کے صفحات میں ہمیشہ نقش رہے گا۔ ان کے والد کا نام عبدالغفور اور جد امجد کا عبدالرحمٰن تھا۔ سندھ کے مرکز علم ٹھٹھہ کے رہنے والے تھے۔ ہوش سنبھالا تو حصول علم میں مشغول ہو گئے۔ اس زمانے میں عالم کبیر مولانا ضیاء الدین ٹھٹھوی سندھی (متوفی ۱۱۷۱ھ/ ۱۷۵۸ء) سرگرم درس وافادہ تھے، ان کی خدمت میں حاضری دی اور درسی کتابوں کی تکمیل فرمائی۔ اس کے بعد سفر حجاز پر روانہ ہوئے، اور حج وزیارت کا شرف حاصل کیا۔ وہاں اہل علم کے کئی حلقے قائم تھے، جن میں ایک حلقہ شیخ عبدالحق صدیقی مکی کا تھا۔ شیخ ممدوح مکہ مکرمہ میں احناف کی مسند افتا پر فائز تھے، مولانا محمد ہاشم اس میں شریک ہو گئے اور شیخ ممدوح سے حدیث اور فقہ کی کتابیں پڑھنا شروع کیں، ان علوم میں اس قدر مہارت پیدا کی کہ تمام ساتھیوں سے سبقت لے گئے۔ واپس وطن پہنچے تو ٹھٹھے میں خود مسند تدریس آراستہ کی اور حدیث، فقہ اور علوم عربیہ کی تدریس کا غلغلہ بلند کرنے لگے۔ حضرت ممدوح فقہی مسلک کے لحاظ سے حنفی تھے اور اپنے اسلوب خاص سے اس کی نشر واشاعت کو ضروری قرار دیتے تھے۔

اس زمانے میں ٹھٹھہ اصحاب فضل کا عظیم مرکز تھا، شیخ محمد معین سندھی بھی اسی شہر میں فروکش تھے جو تقلید کے سخت مخالف اور مسائل شرعیہ میں مسلک اصحاب الحدیث کے مطابق براہ راست کتاب وسنت سے استدلال کے زبردست حامی تھے۔ ان کی مشہور تصنیف ''دراسات اللبیب'' کا بیشتر حصہ اسی موضوع پر مشتمل ہے۔ مولانا محمد ہاشم اور شیخ محمد معین کے درمیان اس سلسلے میں علمی مباحث کا سلسلہ شروع ہو گیا اور تحقیقی انداز میں ایک دوسرے کے درمیان خوب بحثیں چلیں۔

مولانا محمد ہاشم ٹھٹھوی منجھے ہوئے مصنف بھی تھے۔ متعدد کتابیں ان کے زور قلم کے نتیجے میں معرض تصنیف میں آئیں جن میں درج ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱۔ بذل القوۃ فی سنی النبوۃ۔

۲۔ جنۃ النعیم فی فضائل القرآن الکریم: یہ کتاب انھوں نے ۱۱۳۴ھ/۱۷۲۲ء میں تصنیف کی۔

۳۔ فاکھۃ البستان فی تنقیح الحال والحرام: یہ کتاب ۱۱۳۲ھ/۱۷۲۰ء میں تالیف فرمائی۔

۴۔ حیاۃ القلوب فی زیارۃ المحبوب: یہ کتاب ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۳ء میں تصنیف کی۔

۵۔ کشف الرین فی مسئلۃ رفع الیدین: شیخ محمد معین سندھی نے ''اثبات رفع الیدین فی الصلوٰۃ'' کے نام سے دو کتابیں لکھی ہیں، ایک عربی میں اور ایک فارسی میں، ان کتابوں میں انھوں نے احادیث کی رو سے نماز میں رفع یدین کرنے کا ثبوت دیا ہے۔ مولانا محمد ہاشم سندھی نے اس

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رسالے میں ان کا جواب تحریر فرمایا ہے۔ یہ رسالہ انھوں نے ۱۱۴۹ھ/ ۱۷۳۶ء میں تصنیف فرمایا۔

۶۔ ایک ضخیم کتاب فرائض الاسلام کے موضوع پر ۱۱۷۱ھ میں تصنیف کی۔ اس کتاب میں فرائض ایمان کی وضاحت کی گئی ہے، اور اس باب میں مسلمان پر جو علمی اور عملی ذمہ داریاں ہوتی ہیں، ان کی صراحت فرمائی گئی ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی ان کی تصنیفات میں شامل ہیں۔

مولانا محمد ہاشم ٹھٹھوی سندھی اپنے دور کے جلیل القدر عالم تھے اور ان کے معلومات و مطالعہ کا دامن بہت وسیع تھا۔ فقہ حنفی میں انھیں عبور حاصل تھا۔ ان کی تبلیغی مساعی سے بہت سے غیر مسلم دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ اس فاضل اجل نے ۱۱۷۴ھ/ ۱۷۶۱ء میں اس جہان فانی سے منہ موڑا اور جنت کی راہ لی ❶۔

۶۶۔ سید محمد ہدیٰ نصیر آبادی

سید محمد ہدیٰ حسنی نصیر آبادی سید علم اللہ حسنی بریلوی (متوفی ۸ ذی الحجہ ۱۰۹۶ھ/ ۲۵ نومبر ۱۶۸۵ء) کے فرزند ارجمند تھے۔ انھوں نے علم و فضل کی فضا میں شعور کی آنکھیں کھولیں اور تقویٰ و تدین کے ماحول میں پرورش پائی۔ اپنے والد گرامی سید علم اللہ بریلوی سے فقہ اور دیگر علوم مروجہ کی تحصیل کی۔ بلند مرتبت باپ کی صحبت کیمیا اثر سے نیکی کے ہر گوشے میں اونچے درجے پر رسائی حاصل کی۔ عالی ہمت عالم کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔ سخاوت و جودت کا یہ عالم کہ کبھی کسی کا سوال رد نہ کیا۔ ایک مرتبہ ایسی حالت میں سائل نے دروازے پر دستک دی، جب کہ ایک کوئی چیز بھی پاس نہ تھی، فوراً بیوی کا زیور اتروا کر اس کے حوالے کر دیا۔

سید محمد ہدیٰ کئی جاگیروں کے مالک تھے، مگر سخاوت کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ صرف نصیر آباد کی جاگیر سے گھر کے مصارف پورے کرتے، باقی تمام تر آمدنی مستحقین کو دے دیتے۔ دو یا تین گاؤں کی آمدنی برادری کے لوگوں کے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔ ایک روز بارہ ہزار عالم گیری دینار کہیں سے آئے، اس مرد خدا نے سب کے سب اسی وقت بانٹ دیے، خود فاقے سے رات گزاری۔

اس جاگیر اور آمدنی کے باوجود اپنے لیے کوئی پختہ مکان تعمیر نہ کرایا، اگر اس طرف توجہ دلائی جاتی تو جواب دیتے کہ چند سانس گزارنے کے لیے چھپر اور بلند و بالا عمارت میں کوئی فرق نہیں، سب کی حیثیت یکساں ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ چھپروں میں بھی کبھی اچھی لکڑی استعمال نہ کی۔

ان کی موت اس طرح واقع ہوئی کہ مغل حکمران شاہ عالم اول سے ملاقات کے لیے نکلے، وہ دکن کی طرف جا رہا تھا، برہان پور پہنچے تو وہاں ۱۹ ربیع الاول ۱۱۱۹ھ/ ۹ جون ۱۷۰۷ء کو وفات پا گئے۔ اقربا نے میت کو بہ طور امانت برہان پور کی خانقاہ نقشبندیہ میں دفن کیا۔ ایک برس کے بعد اسے تابوت میں رکھ کر رائے بریلی لائے اور زاویہ سید علم اللہ شاہ میں دفن کیا ❷۔

---

❶ تحفۃ الکرام ص ۶۹۶ (اردو ترجمہ) تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵۳، ۲۵۴- نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۶۳-

❷ سید احمد شہید، ص ۵۱- نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۶۵، ۳۶۶-

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

٦٧۔ شیخ محمد یحییٰ عباسی الٰہ آبادی

اقلیم ہند کی جن جلیل القدر شخصیتوں نے آسمان علم وشہرت کی آخری بلندیوں تک پرواز کی، ان میں شیخ محمد یحییٰ عباسی الٰہ آبادی کا نام قابل ذکر ہے۔ شیخ خوب اللہ الٰہ آبادی کے لقب سے معروف تھے۔ والد کا اسم گرامی محمد امین تھا۔ چچا اور سسر شیخ محمد افضل عباسی الٰہ آبادی تھے جو بارھویں صدی ہجری کے عظیم المرتبت ہندی عالم تھے اور جن کی تاریخ ولادت ۱۰ ربیع الاول ۱۰۳۸ھ/ ۲۷ نومبر ۱۶۲۸ء اور تاریخ وفات ۲۵ ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ/ ۱۲ جنوری ۱۷۱۳ء ہے۔

شیخ محمد یحییٰ ۷ محرم ۱۰۸۰ھ/ ۷ جون ۱۶۶۹ء کو پیدا ہوئے اور علم وفضل کی فضا میں پرورش پائی، ہوش سنبھالا تو گھر میں شیخ محمد افضل عباسی کا سلسلۂ فیض وافادہ جاری تھا، ان سے درسی کتابوں کی تکمیل فرمائی اور طویل مدت تک ان کے دامن تربیت سے وابستہ رہے۔ اخذ طریقت بھی انھی سے کیا۔ ذہانت کا یہ عالم تھا کہ تیرہ سال کی عمر میں علوم متعارفہ سے فارغ ہو گئے تھے۔ یہ وہ عمر ہے جب کہ عام طور پر بچے کھیل کود میں مشغول ہوتے ہیں۔

شیخ محمد یحییٰ الٰہ آبادی اس برصغیر کے وہ عالی دماغ شخص تھے کہ جن کا اس علاقے میں وسعت علم، کثرت مطالعہ، معرفت حدیث اور ادراک فقہ میں کوئی مثیل نہ تھا۔ علوم میں امامت اور فنون میں اجتہاد کے درجے پر فائز تھے۔ جو علمی وتدریسی خدمات انھوں نے انجام دیں، ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں وہ زریں حروف سے لکھنے کے لائق ہیں۔ درس وتدریس، موعظت وخطابت، تبلیغ واشاعت دین، زہد واتقا، عبادت الٰہی ، تصنیف وتالیف غرض ہر میدان میں ان کی تگ وتاز کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔ بے شمار لوگوں نے ان سے استفادہ کیا اور ہر علمی ودینی معاملے میں مخلوق خدا نے ان کی رہنمائی کی ضرورت محسوس کی۔ تمام عمر حق وصداقت کا علم بلند کیے رکھا۔ ان کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

القول الصحیح فی صلوٰۃ التسبیح ، الکلام المفید فیما یتعلق بالشیخ والمرید ، الکلمات المؤتلفه فی المقاصد المختلفه ، البضاعة المزجاة ، ماخذ الاعتقاد فی شان الصحابة واهل البیت الامجاد ، تزیین الاوراق فی مخرق الطباق ، خلاصة الاعمال ، بسط الکلام فی وفیات اللاعلام ، توفیر المنضعه فی باب الجمعه ، المناقب الغوثیه ، الاربعین ، اعلام الهدیٰ ، اقامة الحجه فی الجمع بین الظهر والجمعه ، رساله فی الاذکار و ثمراتها ، شرح رسالة المکیه ، حاشیه دستور المبتدی ، شرح دعاء الصباح ، اغاثة القاری فی شرح ثلاثیات البخاری ، اخراج الخبایا فی شرح الوصایا ، تذکرة الاصحاب وغیرہ۔ عربی اور فارسی کی یہ کتابیں حضرت مصنف کی بے پناہ علمی اور تحقیقی قابلیت کی غماز ہیں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کے علاوہ چار ضخیم جلدوں میں ان کے مکاتیب ہیں جو انھوں نے مختلف حضرات کے نام بہت سے اہم علمی اور فقہی مسائل کے بارے میں تحریر فرمائے۔ یہ مکاتیب ان کے علوفکر، غزارت علم، دقت نظر اور ہمہ گیر معلومات کی نشان دہی کرتے ہیں۔

شیخ محمد یحییٰ کے تین بیٹے تھے، شیخ محمد فاخر، شیخ محمد ناصر اور شیخ محمد طاہر۔ یہ تینوں فضل وعرفان میں یگانہ اور فیض وکمال میں منفرد تھے۔ ان کے حالات گزشتہ صفحات میں بیان کیے جاچکے ہیں۔

شیخ محمد یحییٰ عباسی الہ آبادی نے ۶۴ برس کی عمر میں ۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۱۴۴ھ/ ۳۱/ اکتوبر ۱۷۳۱ء کو اس دنیائے فانی سے کوچ کیا اور جنت الفردوس کی راہ لی❶۔

۶۸۔ مولانا محمود نائطی

مولانا شہاب الدین محمود بن ابوالمحمود نائطی مدراسی، نواح مدراس کے شیخ، عالم وفقیہ اور صاحب فضل و کمال تھے۔ اس علاقے کے ارباب علم اور ثقہ لوگوں نے ان کے کئی قسم کے علمی اوصاف وکمالات بیان کیے ہیں اور انھیں بارھویں صدی ہجری کے ہندی علما میں بڑی اہمیت دی ہے❷۔

۶۹۔ سید محی الدین حسینی نیوتنی

سید محی الدین حسینی نیوتنی، غلام محی الدین کے نام سے معروف تھے۔ اپنے عہد کے فاضل اور شیخ تھے۔ فقہ واصول، علوم عربیہ اور تصوف میں یگانہ تھے۔ مولد ومنشا ''نیوتنی'' ہے، جو اس زمانے میں علاقہ اودھ میں ایک بڑا قریہ تھا۔ کچھ بڑے ہوئے تو دل میں حصول علم کا شوق کروٹ لینے لگا اور اس عظیم مقصد کے لیے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اپنے عصر کے نامور اساتذہ کی خدمت میں گئے اور استفادہ کیا۔ شیخ لطف اللہ کوروی کے حلقۂ درس میں بھی شامل ہوئے اور ان سے منسلک رہے۔ شیخ پیر محمد لکھنوی اپنے دور کے علمائے نامدار اور صوفیائے عالی مقام میں سے تھے، ان سے بھی استفاضہ کیا۔ مختلف اصحاب سے کسب علم اور اخذ فیض کے بعد ''بانگر'' کے علاقے میں گئے اور وہاں سکونت اختیار کر لی۔ لوگوں سے بالکل الگ ہو کر یاد الٰہی کو اپنا دن رات کا مشغلہ قرار دے لیا تھا۔ بانگر کے علاقے ہی میں وفات پائی❸۔

---

❶ انوارالعالمین ص ۴۶۴، ۴۶۵ - مفتاح التواریخ ص ۳۱۴ - تذکرہ علمائے ہند ص ۵۸، ۵۹ - نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۴۲۰، ۴۲۱۔

❷ تاریخ النوائط ص ۳۱۷ - نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۶۶۔

❸ تاریخ فرخ آباد - نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۶۷

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۷۰۔ شیخ محی الدین الہ آبادی

شیخ محی الدین بن قاضی داؤد الہ آبادی بارھویں صدی ہجری کے فضلائے الہ آباد اور فقہائے ہند میں بڑی شہرت کے حامل تھے۔ ان کے والد گرامی قاضی داؤد الہ آبادی بھی تقویٰ شعاری اور معرفت وادراک میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ شیخ محی الدین اپنے باپ کے صحیح جانشین ہوئے، علوم ومعارف اور درس وافادہ میں وہی راستہ اختیار کیا، جو عمر بھر جلیل القدر باپ نے اختیار کیے رکھا تھا۔ ان سے بہت سے لوگوں نے استفادہ کیا اور وہ اللہ کے دین کی تبلیغ واشاعت کا موثر ذریعہ بنے ❶۔

۷۱۔ قاضی مراد الدین کشمیری

قاضی مراد الدین کشمیری کا مولد ومنشا کشمیر ہے۔ مولانا عنایت اللہ کشمیر (متوفی رمضان المبارک ۱۱۲۵ھ/ ستمبر ۱۷۱۳ء) اور بعض دیگر علمائے وقت کے شاگرد تھے۔ حصول علم کے بعد عازم دہلی ہوئے اور مغل حکمران شاہ عالم سے تقرب پیدا کیا۔ بادشاہ نے ان کی قابلیت سے متاثر ہو کر انھیں منصب قضا سے سرفراز فرمایا۔ خاصا عرصہ اس منصب پر فائز رہے۔ بعد ازاں دہلی میں مفتی عساکر مقرر ہو گئے۔ پھر ۱۱۵۵ھ/ ۱۷۴۲ء میں محمد شاہ کے عہد میں ہندوستان کے قاضی القضاۃ بنا دیے گئے۔ وادیٔ کشمیر کے اس عالم وفقیہ نے بڑی ترقی کی اور اللہ نے ان کے علم وفضل کی بدولت انھیں ملک میں متعدد اعزازات سے نوازا۔ ۱۱۶۰ھ/ ۱۷۴۷ء میں رحلت فرمائی ❷۔

۷۲۔ سید مربی بلگرامی

سید مربی بن عبدالنبی بن سید طیب بن عبدالواحد حسینی واسطی بلگرامی۔ بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ گھر میں علم وفیض کا چرچا تھا، پہلے قرآن مجید حفظ کیا۔ اس کے بعد سید اسماعیل حسینی بلگرامی سے تحصیل علم کی۔ پھر قنوج گئے اور شیخ یٰسین قنوجی سے اخذ فیض کیا۔ بعد ازاں موضع ''ہر کام'' کا عزم کیا اور کتب درسیہ کی تکمیل شیخ ابوالواعظ ہر کامی سے کی۔ حصول علم کے بعد اپنے وطن بلگرام واپس آئے اور درس وافادۂ طلبا میں مشغول ہو گئے۔ وہاں خلق کثیر نے اس عالم وفقیہ سے استفادہ کیا۔

سید مربی کو معرفت وادراک اور فضل وکمال کے پیکر کی حیثیت حاصل تھی۔ سید غلام علی آزاد بلگرامی نے ان کی ہمہ گیر عزت وتعظیم کے بارے میں مآثر الکرام میں یہ عجیب واقعہ نقل کیا ہے کہ سید مربی ایک مرتبہ کسی تقریب کے سلسلے میں قصبہ مارہرہ گئے، وہاں سے موضع اترولی تشریف لے گئے۔ شیخ محمد عاقل اترولوی جو

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۶۷ بحوالہ بحر زخار۔

❷ مختصر تاریخ کشمیر (فارسی) ص ۱۳- از مفتی علاء الدین محمد- مطبع رشیدی لاہور، ۱۳۰۱ھ- نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۶۷

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تصوف وطریقت میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے، وہیں کے رہنے والے تھے، انھیں معلوم ہوا تو وہ حضرت سید ممدوح کے خیر مقدم کے لیے آئے اور شان دار استقبال کیا۔ کمال ادب و نیاز کے ساتھ انھیں اپنے گھر لے گئے اور سر سے دستار مبارک اتار کر صحن خانہ میں بچھائی۔ عرض کیا کہ حضرت اپنے قدم مبارک اس دستار پر رکھتے ہوئے صحن میں سے گزریں۔ سید مربی اس پر آمادہ نہ ہوئے تو ان کا اصرار بڑھا، بالآخر جب انھوں نے بہت زیادہ اصرار کیا تو مجبور ہو گئے اور ان کے التماس کے مطابق دستار پر قدم رکھتے ہوئے صحن سے گزرے۔

سید مربی کئی روز شیخ محمد عاقل کے مکان پر اترولی میں مقیم رہے اور اس اثنا میں تصوف وطریقت کے مختلف مسائل پر گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ جن حضرات نے سید مربی سے اخذ فیض کیا ان کی طویل فہرست میں سید طفیل محمد اترولوی بلگرامی اور شیخ محمد عاقل اترولوی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

سید مربی حسینی بلگرامی دوشنبہ کے دن ۱۴ شعبان ۱۱۱۷ھ/ ۲۰ نومبر ۱۷۰۵ء کو اس جہان فانی سے سفر آخرت پر روانہ ہوئے [1]۔

۷۳۔ قاضی مربی پھانوی

قاضی مربی حسینی ترمذی پھانوی بارھویں صدی ہجری کے مشہور ہندی شیخ اور فقیہ تھے۔ رجال علم وصلاح میں ان کو بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مولد ومنشا ''پھانی'' ہے جو اس زمانے میں ایک گاؤں تھا۔ مختلف بلاد وقصبات میں جا کر فاضل اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، پھر سید قطب الدین شمس آبادی (متوفی ۱۱۲۱ھ/ ۱۷۰۹ء) کی خدمت میں آئے اور ان سے مروجہ درسیات کی آخری کتابیں پڑھیں اور فقہ واصول کے اونچے مرتبے پر فائز ہوئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد فرخ آباد کی مسند قضا پر متمکن کیے گئے۔

قاضی مربی کتب درسیہ پر اس درجے عبور رکھتے تھے کہ منطق کی مشہور کتاب سلم العلوم کی شرح لکھی اور میر زاہد پر حاشیہ تحریر کیا [2]۔

۷۴۔ سید مرتضیٰ ملتانی

سید مرتضیٰ حسینی ملتانی کا تذکرہ خافی خاں نے منتخب اللباب (جلد دوم) میں اورنگ زیب کے آخری عہد یعنی ۱۱۱۸ھ/ ۱۷۰۶ء کے واقعات میں کیا ہے اور انھیں مرتضیٰ واعظ لکھا ہے۔ یہ دیار ہند کے معروف علما اور مشہور مشائخ میں سے تھے۔ صالح اور متدین عالم تھے۔ اصلاً ملتان کے باشندے تھے۔ عابد و زاہد، تہجد گزار،

[1] مآثر الکرام ص ۹۴ تا ۹۸ - نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۶۸ - تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۷۶ - تقصار جیود الاحرار، ص ۲۰۹، ۲۱۰

[2] نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۶۸، بحوالہ تاریخ فرخ آباد۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جرأت مند، کثرت سے روزہ رکھنے والے، امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں انتہائی تیز، احکام الٰہی کی تبلیغ و اشاعت میں نہ کسی سے ڈرتے اور نہ کسی نوع کا خوف دل میں لاتے، اہل بدعت کے خلاف شمشیر برہنہ۔ نہ خود اہل دنیا سے اختلاط و ارتباط رکھتے اور نہ اسے جائز سمجھتے۔ ملوک و سلاطین سے کوئی چیز قبول نہ کرتے، نہ خراجی زمینوں سے کوئی چیز لیتے اور نہ ماہانہ یا سالانہ نقدی یا جنس کی صورت میں کوئی شے وصول کرتے۔ عالی ہمت، خود دار اور دین کے معاملے میں انتہائی غیور۔ بعض اہل علم سماع کو جائز سمجھتے ہیں لیکن سید مرتضیٰ ملتانی اس کے قریب تک نہ جاتے اور قائلین سماع سے سختی کا برتاؤ کرتے۔ شب برأت اور عاشورہ کے موقعے پر بعض حلقوں میں جو رسوم و رواج پائی جاتی ہیں اس سے شدت کے ساتھ منع فرماتے، عیدین کا چاند دیکھنے کے بعد بھی کچھ لوگوں میں غیر شرعی امور کے ارتکاب کی عادت پڑ گئی ہے، اس سے پوری قوت سے روکتے۔ میت کے تیجے، ساتویں، دسویں اور چالیسویں کی شدید مخالفت کرتے اور ختم وغیرہ کے نام پر جو کچھ پکایا اور کھلایا جاتا ہے، اسے قطعی ناجائز ٹھہراتے۔ فرمایا کرتے کہ کچھ لوگ اللہ کے نام پر کھانا پکاتے ہیں لیکن غریبوں، مسکینوں اور مستحق لوگوں کو دینے کے بجائے یا تو خود کھا جاتے ہیں یا اپنے اعزہ واقربا اور امیر طبقے میں تقسیم کر دیتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بری بات ہے۔

سید مرتضیٰ ملتانی بدعات و محدثات کو کسی شکل میں بھی برداشت نہ کرتے تھے۔ پکے ہوئے کھانے یا پھل وغیرہ پر ختم پڑھنے اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کی جو رسم چل نکلی ہے، اس کی سختی سے تردید کرتے، اسے خلاف شریعت قرار دیتے اور لوگوں کو اس کے ارتکاب سے منع فرماتے۔ تمباکو نوشی کو حرام قرار دیتے، اور اس میں سختی کرتے۔ علمائے سو کو سخت الفاظ میں مطعون ٹھہراتے اور امرائے مملکت اور عمال حکومت سے ان کی مصاحبت کو ہدف تنقید بناتے۔ جو اصحاب علم اغنیا سے ربط و تعلق کی بنا پر امور شرع میں مداہنت کا ثبوت دیتے اور معاملات دین میں نرمی برتتے ہیں ان کو ہرگز قابل معافی نہ سمجھتے۔ ان لوگوں کے بارے میں ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ یہ حصول مال کی غرض سے امرا کی مجلسوں میں جاتے اور فسق و فجور کے ارتکاب میں عملاً ان کی حوصلہ افزائی کا باعث بنتے ہیں۔

مشائخ کی قبروں پر عرس منعقد کرنے، وہاں رقص و سرود کی محفلیں جمانے اور سماع و غنا کا اہتمام کرنے پر شدید تنفر کا اظہار فرماتے، اور اس قبیل کے تمام افعال کو مکروہات و منکرات میں گردانتے۔ برسر منبر اس کی نکیر کرتے اور اپنے قول و عمل سے جہاں تک ممکن ہوتا اس نوع کی حرکات سے لوگوں کو منع فرماتے۔

سید مرتضیٰ ملتانی کا شمار بارھویں صدی ہجری کے فحول علما، جلیل القدر مشائخ اور زوردار واعظین میں ہوتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ کسی کو اپنے حلقہ بیعت میں داخل ہونے کی دعوت نہ دیتے۔ اگر کوئی ان سے بیعت ہونا چاہتا تو صاف لفظوں میں فرماتے کہ میں تمھیں برائی سے رکنے اور منکرات سے دامن کشاں رہنے کی تاکید کرتا ہوں اور پوری قوت سے تلقین کرتا ہوں کہ جہاں تک ہو سکے ہر قسم کی برائی کا دروازہ بند کر دینے کے لیے جدوجہد کرو۔ وہ لوگوں سے اس بات کا اقرار لیتے کہ وہ اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں، جن برائیوں کا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ارتکاب ان سے ہو چکا ہے، اس سے اللہ کے حضور نہایت عجز وانکسار سے عفو ودرگزر کی درخواست کرتے ہیں اوراس کے سامنے مغفرت کے لیے اپنا دامن پھیلاتے ہیں۔ ہم اللہ سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ ہمیں معصیت سے کنارہ کش رہنے اور خلاف شرع امور سے بچنے کی توفیق مرحمت فرمائے گا۔

سید مرتضیٰ ملتانی اس زمانے کے عالم تھے جب آبادیوں کا یہ پھیلاؤ نہ تھا، جو موجودہ دور میں ہمارے سامنے ہے۔ نہ شہروں اور قصبوں میں یہ بھیڑ تھی، جس سے آج کل ہم دوچار ہیں۔ آبادیوں کا سلسلہ محدود تھا، بالخصوص مسلمانوں کی تعداد بڑی کم تھی، لیکن اس کے باوصف ان الفاظ کے ساتھ جو وہ بیعت لیتے تھے، اس سے متاثر ہو کر ملتان اور لاہور وغیرہ کے تین یا چار ہزار افراد ان کے حلقہ بیعت میں داخل ہو گئے تھے اور یہ سلسلہ بلاد دکن تک وسعت اختیار کر گیا تھا۔

ان کی پاک بازی اور احتیاط کا یہ حال تھا کہ امرائے مملکت کے گھروں سے کھانا نہ کھاتے۔ اگر روپے وغیرہ کی شکل میں کوئی نذر پیش کرتا تو اس وقت تک قبول نہ فرماتے، جب تک یہ تحقیق نہ کر لیتے کہ اس کے ذرائع آمدنی کیا ہیں، اس کا کاروبار کیا ہے، وہ جو مال لے کر آیا ہے، یا جس سے کھانا کھلانا چاہتا ہے وہ حلال اور طیب ہے، مشکوک تو نہیں یا اس میں حرمت کا کوئی شائبہ تو نہیں پایا جاتا، وہ اپنے اہل وعیال کے حقوق ادا کرتا ہے، اللہ نے اپنے بندوں کے جو فرائض اس پر عائد کیے ہیں انھیں پورا کرتا ہے، اپنے مال سے عشر یا زکوۃ وغیرہ دیتا ہے۔ اگر تحقیق کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ جاتے کہ اس کی آمدنی حلال ذرائع کی ہے تو دعوت قبول فرما لیتے، ورنہ بلا جھجک رد کر دیتے۔ اس بات کی قطعاً پروا نہ کرتے کہ لوگوں پر ان کے قول وفعل کا کیا اثر پڑے گا اور اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ نہ یہ دیکھتے کہ دعوت کرنے والا کتنا بڑا آدمی ہے۔

امور شرع کی اس زبردست حمایت اور بدعات ومنکرات کی سخت مخالفت کی پاداش میں انھیں مخالفین کی طرف سے مبتلائے اذیت کیا گیا اور کئی قسم کی تکلیفیں پہنچائی گئیں مگر اس مرد باہمت نے کوئی پروا نہیں کی۔ ایک مرتبہ وہ دکن کے شہر اورنگ آباد پہنچے اور معمول کے مطابق وعظ کہا، جس میں اہل بدعت پر شدید نکیر کی اور علما و مشائخ کو اللہ کے دین میں ان کی مداہنت کی وجہ سے مطعون ٹھہرایا۔ بات حکومت کے ایوانوں تک پہنچی تو اورنگ آباد کے قاضی نے جس کا نام محمد اکرم تھا، سید مرتضیٰ کو اپنی عدالت میں طلب کیا۔ وہ قاضی کی عدالت میں گئے تو وہاں کے لوگ بھی ایک ہجوم کی شکل میں قاضی کے پاس پہنچ گئے۔ یہ لوگ اس طریقے سے قاضی کی مخالفت اور سید مرتضیٰ کی حمایت کر رہے تھے کہ سید مرتضیٰ کو خطرہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں قاضی کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ چنانچہ وہ خود ہجوم میں آئے اور لوگوں کو آگے بڑھنے اور قاضی کی مخالفت کرنے سے روکا۔ اس کے بعد وہ قاضی کے سامنے پیش ہوئے تو قاضی نے ان سے تمباکو کی حرمت اور حلت کے مسئلے پر بحث شروع کر دی۔ آخر کار قاضی نے ان سے کہا کہ جس مسجد میں وہ وعظ کہہ رہے ہیں، وہ اتنی تنگ ہے کہ لوگ اس میں سما نہیں سکتے۔ قاضی کی گفتگو کے سیاق وسباق سے پتا چلتا تھا کہ اس کا اصل مقصد ان کے وعظ وتبلیغ میں رکاوٹ پیدا کرنا تھا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس زمانے میں ہندوستان کا بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر تھا اور وہ بعض قلعوں کی تسخیر کے سلسلے میں پونہ میں مقیم تھا۔ سید مرتضیٰ ملتانی بادشاہ کے پاس پہنچے اور اسے اپنا تصنیف کردہ ایک رسالہ پیش کیا، جس کا نام ''حق گو'' تھا۔ اورنگ زیب نے ابھی اس کے تین ہی صفحے پڑھے تھے کہ فرط ادب و تاثر سے رسالہ زانو پر رکھ لیا اور کہا الحمدللہ ثم الحمدللہ! میری مملکت میں ایسے لوگ موجود ہیں جو بلا کسی خوف و خطر کے مسائل شریعت مطہرہ کی وضاحت اور کلمہ حق کی تبلیغ میں ہر آن کوشاں رہتے ہیں۔

اورنگ زیب جو خود بھی شریعت کا عالم اور نیک بادشاہ تھا، سید مرتضیٰ کے علم واخلاص سے نہایت متاثر ہوا اور اپنے بیٹے کام بخش کو حکم دیا کہ انھیں شاہی محل میں لے جائے اور جو یہ ارشاد فرمائیں اس پر پورا عمل کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی بادشاہ نے سید مرتضیٰ سے تحائف بادشاہی قبول فرمانے کی درخواست کی۔ لیکن سید صاحب نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ بادشاہوں اور حکمرانوں سے تحائف و ہدایا قبول کرنا ان کے معمول کے خلاف ہے۔ بادشاہ پر ان کے انکار کا بہت ہی خوش گوار اثر پڑا۔

کچھ عرصے کے بعد اورنگ زیب بادشاہ نے جب یہ دیکھا کہ سید مرتضیٰ بہت دیانت دار عالم دین ہیں تو ان سے عہدۂ احتساب پر متعین ہونے کی درخواست کی اور کہا کہ جس شہر کی آب و ہوا ان کی طبیعت کے موافق ہو، اس میں سکونت اختیار کر لیں، وہ فرمائیں کہ کس شہر کی فضا ان کے قیام کے لیے مناسب رہے گی، میں اس کے لیے تحریری حکم جاری کر دیتا ہوں۔ سید مرتضیٰ نے جواب دیا کہ میں خواص کی اصلاح کرنا چاہتا ہوں، عوام تو پہلے ہی سے میری بات مانتے ہیں، اگر اس کے لیے حکم جاری کیا جائے تو حاضر ہوں۔ بادشاہ نے کہا کہ ''خواص'' سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ میں یہ بات سمجھ نہیں سکا۔

اورنگ آباد کا قاضی محمد اکرم بھی اس وقت موجود تھا، وہ سید مرتضیٰ کا مخالف تھا، ان کے افکار و تصورات سے شدید اختلاف کرتا اور ان کی ذات سے عناد رکھتا تھا۔ اس نے موقع غنیمت جان کر بادشاہ کو جواب دیا کہ ''خواص'' سے سید کی مراد اولیائے کرام کی قبریں ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ انھیں اولیا کی قبروں پر مامور کر دیا جائے اور یہ برسر منبر کہا کرتے ہیں کہ جن قبروں پر غنا کی محفلیں اور سماع کی مجلسیں منعقد کی جاتی ہیں، ان میں سے بزرگوں کی ہڈیوں کو نکال کر جلا دیا جائے۔

اورنگ زیب نے کہا، میرے خیال میں سید مرتضیٰ کا یہ مطلب نہیں ہے۔ وہ صرف ان بدعات کے مخالف ہیں جن کا قبروں پر ارتکاب کیا جاتا ہے۔

سید مرتضیٰ نے اپنے متعلق قاضی محمد اکرم کی اس توجیہ کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ یہ مجھ پر افترا باندھ رہے ہیں۔ میں اولیائے کرام کا پورا احترام کرتا ہوں اور ان کی تعظیم کو ضروری قرار دیتا ہوں۔ لیکن ان کے نام پر جو بدعات و محدثات کا سلسلہ جاری ہے، اس کی کسی صورت میں تائید نہیں کر سکتا۔ اصل دین وہی ہے جو اللہ نے رسول اللہ ﷺ پر نازل کیا، وہ ہر قسم کے شرک سے بالکل پاک ہے۔ میں اسی دین کا حامی اور مبلغ ہوں، جس کی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترویج و اشاعت آنحضرت ﷺ نے فرمائی۔ باقی سب غلط ہے۔ قاضی محمد اکرم میرے بارے میں سراسر افترا اور کذب بیانی سے کام لے رہے ہیں۔

یہ کہہ کر وہ مجلس سے اٹھ کھڑے ہوئے اور برہان پور کو روانہ ہو گئے۔ اس زمانے کے بعد مشائخ و علما نے ان کو سخت پریشانی میں مبتلا کیا اور ان کے ساتھ توہین آمیز رویہ اختیار کیا۔ وہ وعظ و تبلیغ کے لیے مسجد میں منبر پر کھڑے ہوئے تو ان کی اہانت کی، جس کی بنا پر وہ لوگوں سے علیحدہ ہو گئے اور بالکل گوشہ گیر ہو کر گھر میں بیٹھ گئے اور اسی حالت میں اس دنیائے فانی سے کوچ کر کے سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

بعض لوگوں کا کہنا کہ انھیں زہر دے کر قتل کر دیا گیا تھا❶۔

۷۵۔ شیخ مرتضیٰ عباسی چریاکوٹی

شیخ مرتضیٰ عباسی چریاکوٹی ۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء میں چریاکوٹ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ یحییٰ اور جد امجد کا اسم گرامی شیخ عبدالحق تھا۔ آبا و اجداد سب اصحاب علم تھے۔ ان کے نانا شیخ عبدالفتاح بن مبارک عباسی چریاکوٹی بھی ذی علم بزرگ تھے۔ بہت سی درسی کتابوں کی تکمیل نانا ہی سے کی۔ پھر والد محترم شیخ یحییٰ سے اخذ علم کیا اور طویل عرصے تک ان سے فیض حاصل کرتے رہے۔ اور اکابر فقہائے حنفیہ میں شمار کیے گئے۔ اپنے گرامی قدر نانا شیخ عبدالفتاح کی تصنیف ''میراث نامہ'' کی شرح سپرد قلم کی۔ خود اپنی ایک تصنیف ''کتاب الرضوانی'' اپنی یادگار چھوڑی۔

شیخ مرتضیٰ عباسی نے ۱۱۰۹ھ/ ۱۶۹۸ء کو چڑیاکوٹ میں انتقال کیا❷۔

۷۶۔ مرزا خان جالندھری

مرزا خان کا لقب اوحد الدین تھا۔ مشرقی پنجاب کے شہر جالندھر کے عالم و صوفی بہلول برکی کے والد تھے۔ عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ انھوں نے ''نظم الدرر والمرجان فی تلخیص سیر سید الانس والجان'' کے نام سے رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارک میں ایک کتاب تصنیف کی۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (لاہور) میں موجود ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔ سید علیم اللہ حسینی جالندھری نے جو اپنے دور کے جلیل القدر عالم اور صاحب طریقت بزرگ تھے، اس کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اس ترجمے کو انھوں نے ''نثر الجواہر فی تلخیص سیر ابی الطیب والطاہر'' کے نام سے موسوم کیا۔ یہ فارسی ترجمہ ۱۹۰۲ میں ''پیسہ اخبار'' (لاہور) سے شائع ہوا۔ فاضل مترجم نے دیباچے میں لکھا ہے:

❶ منتخب اللباب ج ۲، ص ۵۶۱ تا ۵۶۵۔ نیز دیکھیے نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۷۰۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۷۱ بحوالہ تاریخ مکرم۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''میں نے محسوس کیا کہ اوحدالدین مرزا خان برکی جالندھری کی عربی کتاب ''نظم الدرر والمرجان فی تلخیص سیر سید الانس والجان'' اگرچہ مبسوط ومفصل نہیں، تاہم نادر معلومات کو محیط ہے اور ہر چند کہ خواص ہی اس سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں اور عوام اس کے اشارات ومندرجات سے محروم رہتے ہیں، اس لیے میں نے خیال کیا کہ عوام کو سمجھانے کے لیے اختصار کو بہ صورت تفصیل پیش کر کے اس کا ترجمہ ''نثر الجواہر فی تلخیص سیر ابی الطیب والطاہر'' کے نام سے فارسی میں کردوں۔ چنانچہ میں نے کتاب کا ترجمہ شروع کر دیا❶۔

سٹوری نے ''نظم الدرر'' اور ''نثر الجواہر'' دونوں کا ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے، لیکن تفصیل بتاتے ہوئے اس سے سہو ہو گیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ کتاب نظم الدرر سید علیم اللہ حسینی کی تصنیف ہے اور مرزا خاں نے ''نثر الجواہر'' کے نام سے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے❷، لیکن جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا، حقیقت اس کے برعکس ہے۔

مرزا خاں نے نظم الدرر کے علاوہ مندرجہ ذیل رسائل بھی تصنیف کیے، جن کے خطی نسخے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرۂ مخطوطات شیرانی میں موجود ہیں۔

۱۔ کتمان الاسرار: نمبر ۲۱۵۸ اوراق ۵۶، ورق ۱ تا ۱۶ موجود نہیں۔ یعنی کتاب ناقص ہے۔

۲۔ تنبیہ الاغبیا: ۲۱۵۸۔

۳۔ شرح اقوال جنید بغدادی: نمبر ۲۱۵۸۔

سماع کے بارے میں بھی انھوں نے ایک رسالہ تصنیف کیا، جس کا حوالہ ان کے فرزند بہلول برکی نے (جو اپنا نام) گول برکی بتاتے ہیں، اپنے ایک رسالے سیف المسلول کے دیباچے میں دیا ہے❸۔

۷۷۔ سید معظم شاہ سورتی

سید معظم شاہ حسینی سورتی ہندوستان کے شہر ''سورت'' میں پیدا ہوئے، نشوونما بھی وہیں ہوئی اور اساتذۂ عصر سے تعلیم پائی، اور فقہ واصول اور علوم عربیہ کے ماہرین میں گردانے گئے۔ ان کے والد سید شاہ بھی اپنے دور کے نامور عالم تھے اور سورت کی مسند مشیخت پر فائز تھے۔ لائق بیٹے نے باپ کی وفات کے بعد ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۳ء میں ان کی جگہ سنبھالی❹۔

❶ نثر الجواہر تلخیص سیر ابی الطیب والطاہر، ص ۲۔

❷ پرشین لٹریچر، ص ۲۰۶۔

❸ اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۴ ذیل لفظ ''برکی''

❹ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۷۴، بحوالہ حقیقۃ السورۃ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۷۸۔ مولانا معین الدین عثمانی منیری

مولانا معین الدین عثمانی منیری متقی عالم دین اور بہت بڑے صوفی فقیہ تھے۔ اصلاً اعمال بہار کے ایک گاؤں ''مدھور'' کے باشندے تھے۔ وہاں سے موضع ''منیر'' میں منتقل ہو گئے تھے، جو ان کے ننھیال کا مسکن تھا۔ بڑے ہوئے تو حصول علم کے لیے جون پور چلے گئے۔ وہاں کے علما و اساتذہ سے درسی کتابیں پڑھیں اور صاحب رشیدیہ شیخ محمد رشید جون پوری اور ان کے لائق فرزند شیخ محمد ارشد جون پوری سے اخذ طریقت کیا۔ کافی عرصہ ان دونوں سے مستفیض ہوتے رہے۔ بعد ازاں منیر واپس آ گئے اور درس و تدریس میں منہمک ہو گئے۔ بہت سے علما و فضلا نے ان سے استفادہ کیا۔

شیخ معین الدین عثمانی منیری نے ۵ شعبان ۱۱۳۱ھ/۱۲ جون ۱۷۱۹ء کو منیر میں وفات پائی اور شیخ یحییٰ منیری کے قبرستان میں دفن کیے گئے ❶۔

۷۹۔ شیخ موسیٰ امیٹھوی

شیخ موسیٰ بن عبدالرقیب بن جعفر بن نظام الدین عثمانی امیٹھوی شیخ صالح تھے اور فضل و صلاح میں ممتاز۔ ۱۰۳۳ھ/۱۶۲۴ء کو موضع امیٹھی میں پیدا ہوئے اور اپنے والد گرامی شیخ عبدالرقیب سے جو علم و عمل میں بڑی شہرت رکھتے تھے، علم فقہ کی تعلیم پائی، طریقت و سلوک کی منزلیں بھی انہی کی نگرانی میں طے کیں اور والد کی وفات کے بعد دعوت وارشاد میں کمر بستہ ہو گئے۔

شیخ موسیٰ نے ۸۷ برس کی عمر پا کر ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء کو امیٹھی میں انتقال کیا ❷۔

۸۰۔ مفتی میراں بیجاپوری

شیخ میراں بیجاپوری کا مولد و منشا بیجاپور ہے۔ شیخ محمد بن عبدالرحمٰن بیجاپوری اور دیگر علمائے کرام سے علم حاصل کیا، اور فقہ و اصول اور دیگر علوم میں ممتاز قرار پائے۔ اپنے علم و فضل کی بدولت عہد عالم گیری میں حیدر آباد کے منصب افتا پر مامور ہوئے اور درس و تدریس کی مسند کو زینت بخشی۔ کبرسنی کو پہنچے تو حیدر آباد کے محکمۂ افتا سے الگ ہو کر بیجاپور تشریف لے گئے اور وہاں اقامت اختیار کر لی۔ لیکن کچھ عرصے بعد پھر حیدر آباد چلے گئے تھے۔ ۱۱۲۵ھ/۱۷۱۳ء میں وہیں وفات پائی ❸۔

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۷۴، بحوالہ گنج ارشدی۔

❷ ایضاً، ص ۳۷۷

❸ محبوب ذی المنن ج ۲، ص ۷۹۸، ۷۹۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۲۷۹۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ن

۸۱۔ قاضی نجم الدین برہان پوری

قاضی نجم الدین برہان پوری کے والد کا نام حبیب احمد تھا، فقہائے حنفیہ میں بلند مرتبے کے حامل تھے۔ عہد عالم گیری میں عادل آباد کے منصب قضا پر متعین ہوئے اور عالم گیر کی موت کے بعد عرصے تک اس عہدے پر فائز رہے۔ اپنے دور کے مشہور عالم مولانا عباس برہان پوری کے داماد تھے ❶۔

۸۲۔ مولانا نجم الدین برہان پوری

اسی نام کے برہان پور میں ایک اور عالم دین مولانا نجم الدین عباس تھے، یہ بھی حنفی المسلک تھے۔ ان کا شمار اپنے زمانے کے مشاہیر علما وفقہا اور اکابر اصحاب تصوف میں ہوتا تھا۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں زیادہ مشہور کتابیں یہ ہیں۔

نجم العلم۔ یہ عین العلم کی شرح ہے اور عربی زبان میں ہے۔

الصحف المطهره۔ علم اليقين ترجمه العقائد السنيه۔ بزبان فارسی ❷۔

۸۳۔ سید نصیر الدین ہروی برہان پوری

سید نصیر الدین ہروی برہان پوری، برہان پور کے نامور عالم اور مشہور فقیہ تھے۔ پرہیز گار اور متقی بزرگ تھے۔ اکل وشرب اور لباس وغیرہ کے معاملے میں انتہائی محتاط تھے۔ ہمیشہ ذکر الٰہی اور عبادت میں مشغول رہتے، کثرت سے روزے رکھتے اور شب کو قیام کرتے، ہر کام میں اللہ پر توکل رکھتے، ان کا معمول تھا کہ عشا کے بعد دو گھڑی آرام فرماتے اور پھر اٹھ کھڑے ہوتے۔ تہجد کی نماز پڑھتے اور تلاوت قرآن کرتے۔ قرآن مجید کی تلاوت میں اس درجے رقت طاری ہو جاتی کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور قمیص بھیگ جاتی۔

سید نصیر الدین ابتدائے جوانی ہی میں دونوں پاؤں اور بائیں ہاتھ سے معذور ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود کسی کے محتاج نہ تھے۔ قرآن مجید، کتب تفسیر اور تصوف وسلوک کی مختلف کتابوں کی کتابت کرتے تھے اور اس سے جو آمدنی ہوتی اس سے گزر اوقات کرتے۔

اہل دنیا اور ارباب حکومت سے نہ خود کوئی اختلاط رکھتے اور نہ انھیں موقع دیتے کہ وہ ان سے ارتباط

❶ نزهة الخواطر، ج ٦، ص ٣٨٠، بحوالہ تاریخ برہان پور۔

❷ ایضاً۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رکھ سکیں۔ نہ کسی سے کوئی نذر قبول کرتے اور نہ کسی بہانے کوئی چیز لیتے۔ اگر کسی طرف سے کوئی ہدیہ قبول فرمانے پر مجبور بھی ہو جاتے تو اس سے بہتر صورت میں اس کا بدلہ دیتے۔

امرائے سلطنت اور والیان ملک سے نہ صرف ربط و تعلق سے گریز کرتے بلکہ ان سے سخت نفرت کرتے اور نہایت تلخ کلامی سے پیش آتے، کوئی ان میں سے ملاقات کو حاضر ہوتا تو چہرے پر کبیدگی کے آثار نمایاں ہو جاتے۔ وہ لوگ نذر و نیاز کی شکل میں کوئی چیز پیش کرتے تو صاف لفظوں میں لینے سے انکار کر دیتے۔ ان کو نصیحت بھی کرتے تو تلخ کلامی سے کرتے تاکہ وہ ان سے نفرت کرنے لگیں اور آنا جانا بند کر دیں۔

خافی خاں نے سید نصیر الدین کا تذکرہ ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶ء کے واقعات و حوادث کے ضمن میں کیا ہے۔ اس کے نقل کردہ مندرجہ ذیل دو واقعے قابل مطالعہ ہیں:

۱۔ ایک مرتبہ علاقہ برہان پور کا والی منور خاں سید نصیر الدین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق خاصا لاؤ لشکر اس کے ہم عناں تھا اور یہ لوگ ہاتھی گھوڑوں پر سوار تھے۔ سید نصیر الدین نے اس علاقے کے والی سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ تمھارے ہاتھیوں اور لشکریوں کی وجہ سے راستے بند ہو جاتے ہیں اور لوگوں کو آمد و رفت میں سخت دشواری پیش آتی ہے۔ تمھارا یہاں آنا رعایا کے لیے تکلیف اور زحمت کا باعث بنتا ہے، اس میں عوام کو جو پریشانی لاحق ہوتی ہے، وہ ان پر تمھارا بہت بڑا ظلم ہے۔ چونکہ تم میرے پاس آتے ہو، اس لیے اس ظلم میں خود یہ فقیر بھی شریک ہوتا ہے۔

منور خاں نے جوب میں عرض کیا: ”ہم محض اس لیے حاضر ہوتے ہیں کہ آپ اپنی باطنی توجہ ہم پر مبذول فرمائیں اور ہمیں اپنی طرف کھینچیں۔“

فرمایا: بارگاہ الٰہی میں میرے جیسا گناہ گار کون ہوگا کہ مجھے اس نے دونوں پاؤں اور ایک ہاتھ سے محروم کر دیا ہے۔ یہ میری معصیت کا نتیجہ ہے۔ تم اپنی رعایا کو پریشانی میں نہ ڈالو، اور معاملات حکومت میں اللہ کی مخلوق پر رحم کرو، ایسا نہ ہو کہ تم پر بھی کوئی عذاب نازل ہو جائے۔

۲۔ سید نصیر الدین کے استغنا اور اللہ پر توکل کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ عنایت اللہ خاں نے جو سید نصیر الدین کے عقیدت مندوں میں سے تھا، بادشاہ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ بیت المال سے سید ممدوح کے لیے کچھ رقم عطا کر دے۔

عنایت اللہ خاں نے مندرجہ ذیل چار اوصاف کی وجہ سے ان کو قابل امداد قرار دیا:

۱۔ سید نصیر الدین سادات سے تعلق رکھتے ہیں۔

۲۔ صاحب علم و فضل ہیں۔

۳۔ صاحب صلاح و تقویٰ ہیں۔

۴۔ معذور ہونے کی وجہ سے مستحق امداد ہیں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس زمانے میں برہان پور کا صدر خواجہ ادہم تھا۔ بادشاہ نے اسے خط لکھا کہ وہ اس کو سید موصوف کی مالی حیثیت کے بارے میں آگاہ کرے تا کہ یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ ان کی کس طریقے سے مالی مدد کی جائے، ماہانہ یا سالانہ!

چنانچہ خواجہ ادہم خود سید موصوف کے پاس گیا اور بادشاہ کا خط پڑھ کر سنایا۔ سید نصیر الدین نے ان کو جواب دیا کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ بے شک میرا نام نصیر الدین ہے لیکن میں مستحق اعانت یا قابل امداد نہیں ہوں۔ خواجہ ادہم کو انھوں نے جن الفاظ میں جواب دیا وہ یہ ہیں:

بایں غلطی وگمان ہم اسمی دیگرے شاید نزد من آوردید۔ امادریں حکم چہار صفت نوشتہ اند، ازاں جملہ سیادت را انکار نمی تواں نمود و دعویٰ ہم ندارم اما از صلاح و استحقاق و فضیلت کہ نوشتہ اند، تحقیق من است کہ ہیچ کدام در من نیست ❶۔

یعنی شاید آپ اس غلط فہمی کی بنا پر میرے پاس تشریف لائے ہیں کہ اتفاق سے میرے نام کے ساتھ اس شخص کا نام ملتا ہے اور ہم دونوں ہم نام ہیں۔ بادشاہ کے اس خط میں اس شخص کی امداد کے لیے حکم جاری کیا گیا ہے جو چار صفات کا حامل ہے، ان میں سے ایک صفت یہ ہے کہ وہ سید ہے۔ سید ہونے سے نہ میں انکار کرتا ہوں اور نہ اس کا دعوے دار ہوں۔ دوسری صفت صلاح وتقویٰ ہے۔ تیسری استحقاق، اور چوتھی فضیلت علمی ہے۔ میں اپنے طور پر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان صفات میں سے کوئی صفت بھی مجھ میں نہیں پائی جاتی۔

خواجہ ادہم جو علاقہ برہان پور کا صدر تھا، سید نصیر الدین کے اس جواب سے نہایت متعجب ہوا۔ اس نے کہا کہ "شاید آپ کے پاس اللہ پر توکل کا سرمایہ موجود ہے۔" فرمایا: "کیوں نہیں، یقیناً میرے رزق کی کنجی اس ذات اعلیٰ کے ہاتھ میں ہے، جس کے تیرے آقا و بادشاہ جیسے لاکھوں کروڑوں لوگ محتاج ہیں۔"

سید نصیر الدین برہان پوری نے اس سال وفات پائی جس سال کہ شاہ عالم نے اپنے بھائی کام بخش کو قتل کیا تھا۔ ان کی وفات ان دونوں بھائیوں کی لڑائی کے چھ مہینے بعد ہوئی، اور یہ حادثہ ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء میں پیش آیا تھا۔

۸۴۔ شیخ نظام الدین انصاری سہالوی

شیخ نظام الدین انصاری سہالوی کا شمار برصغیر کے علمائے اجلا اور اعاظم رجال میں ہوتا ہے۔ وہ اقلیم ہند کے علامہ شہیر اور صاحب علوم وفنون تھے۔ ان کے والد کا اسم گرامی شیخ قطب الدین سہالوی تھا، جو لکھنؤ سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر واقع ایک مقام "سہالی" کے رہنے والے تھے۔

بنیادی طور پر یہ خاندان خالص عرب تھا اور اس کا نسبی تعلق رسول اللہ ﷺ کے مشہور صحابی حضرت

❶ منتخب اللباب ج ۲، ص ۵۵۸- نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۸۶، ۳۸۲-

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے تھا۔ جب اسلام کی نشرواشاعت کے دائروں نے وسعت اختیار کی، اور اس کی پاکیزہ قدریں حدودِ عرب سے نکل کر دیگر ممالک کو متاثر ومنور کرنے لگیں تو اس دودمان عالی شان کے ایک صوفی منش بزرگ خواجہ ابواسماعیل عبداللہ بن محمد انصاری نے ہرات کو اپنا مسکن ٹھہرایا اور وہیں ۴۸۱ھ/ ۱۰۸۸ء میں وفات پائی۔ خواجہ ممدوح کی اولاد میں سے ایک ذی علم شخص جو جلال الدین انصاری کے نام سے موسوم تھے ہرات سے ہندوستان آئے اور دہلی میں قیام پذیر ہوئے۔ دہلی میں انھوں نے ایک مدرسہ قائم کیا، جس میں تدریس کے ہنگامے بپا کیے۔ بعد میں ان کے اخلاف نے دہلی کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ کے قریب موضع ''سہالی'' میں اقامت اختیار کر لی اور درس وتدریس کے سلسلوں میں مشغول ہو گئے۔ قیام سہالی کی وجہ سے یہاں کے علمانے سہالوی کی نسبت سے شہرت پائی۔

شیخ نظام الدین کے والد گرامی شیخ قطب الدین تھے، جو برصغیر کے علما میں ممتاز مرتبے کے حامل تھے۔ وہ تقریباً ۱۰۴۰ھ/ ۱۶۳۱ء کو سہالی میں پیدا ہوئے اور ہندوستان کے جلیل القدر علما سے مختلف علوم کی تحصیل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کا مشغلہ اختیار فرمایا، اور پوری زندگی اس مقصد عظیم کے لیے وقف کر دی۔ تفسیر وحدیث، فقہ واصول منطق وفلسفہ، معانی وبیان، صرف ونحو، ادب وکلام وغیرہ تمام علوم مروجہ کی بھرپور اشاعت کی اور ملک کے بہت سے علما وطلبا کو مستفید فرمایا۔ شیخ قطب الدین نے ہر طرف سے منقطع ہو کر افادۂ طلبا کو مرکز توجہ ٹھہرالیا تھا، اور امرا ووزرا کی مجالس سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں ان کا شہرۂ علم وفضل دور دور تک پھیل گیا تھا اور خود بادشاہ ان کی کاوش وتحقیق کی ہمہ گیری سے متاثر تھا۔ اس نے کئی دفعہ ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور دربار میں آنے کے لیے کہا، مگر انھوں نے بادشاہ کے دربار سے دور رہنے کو ترجیح دی اور درس وافادہ کو ہر چیز سے مقدم گردانا۔

تین سو سال پیشتر کے حالات کے مطابق سہالی میں شیخ قطب الدین کا بہت بڑا مدرسہ تھا، مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے طلبا کثیر تعداد میں ان سے استفادہ کرتے تھے۔ تدریس میں ان کو بڑی شہرت حاصل تھی۔ علاوہ ازیں تصنیف وتالیف اور تدین وتقویٰ میں بھی ان کو اللہ تعالیٰ نے بلند مرتبہ عطا فرمایا تھا۔

انصاری اور عثمانی خاندانوں کی کش مکش:

سہالی میں اس زمانے میں دو مشہور خاندان آباد تھے۔ ایک عثمانی خاندان اور دوسرا انصاری خاندان۔ مولانا قطب الدین کا تعلق انصاری خاندان سے تھا۔ سہالی کے گردونواح میں خان زادے مقیم تھے، ان کا سہالی کے ایک شخص چودھری محمد آصف سے جو انصاری خاندان سے تھا، زمین کی سرحدوں کے سلسلے میں ہمیشہ جھگڑا رہتا تھا۔

محمد آصف سہالی کا بڑا زمیندار اور مولانا قطب الدین کا سسر تھا۔ اس تعلق کی بنا پر خان زادوں کو مولانا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ممدوح سے بھی عداوت ہوگئی تھی، لیکن مولانا کو چونکہ بادشاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر کے دربار میں عزت وتکریم کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، لہٰذا یہ لوگ انھیں کچھ کہنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ سوئے اتفاق سے سہالی میں عثمانی خاندان کے جو لوگ آباد تھے، ان کے اور محمد آصف انصاری کے درمیان آب پاشی کے بارے میں نزاع پیدا ہو گیا۔ بات آگے بڑھی اور فریقین مقابلے پر اتر آئے تو مولانا قطب الدین بیچ میں پڑے اور دونوں طرف کے لوگ جو لڑائی کے لیے مسلح ہو کر آئے تھے، واپس چلے گئے۔

مولانا قطب الدین کی شہادت:

لیکن بعد میں حالات نے ایسا خطرناک رخ اختیار کیا کہ سہالی کے نواح میں رہنے والے ان خان زادوں نے سہالی پر حملہ کر دیا اور کئی سو آدمی گاؤں کے اندر گھس آئے۔ انھوں نے عثمانی خاندان کے لوگوں کو انصاری خاندان کے خلاف خوب بھڑکایا اور انھیں اپنی امداد کا یقین دلایا، نتیجہ یہ ہوا کہ سب نے مل کر محمد آصف کے مکان پر ہلہ بول دیا۔ سنگ دل حملہ آوروں نے مولانا قطب الدین کے مکان کا بھی محاصرہ کر لیا اور اچانک اندر گھس کر نیزوں، بندوقوں اور تلواروں سے بہت سے لوگوں کو قتل کر دیا۔ مولانا موصوف بھی جام شہادت نوش کر گئے۔
یہ حادثہ ۱۹ رجب ۱۱۰۳ھ (۲۷ مارچ ۱۶۹۲ء) کو پیش آیا۔ مولانا کی موت چونکہ مظلومانہ موت تھی، لہٰذا موت کے بعد ''شہید'' کا لفظ مولانا قطب الدین کے نام کا جز ہو گیا اور وہ مولانا قطب الدین شہید کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی شہادت پر کسی نے ایک مصرع کہا تھا، آزاد بلگرامی نے پہلے تین مصرعے لگا کر رباعی بنا دی:

علامہ بحر زاخر فضل و ہنر درد امن ارباب طلب ریخت گہر
دل خون شد و تاریخ وفاتش فرمود قطب عالم شدہ شہید اکبر
۱۱۰۳ھ

فرنگی محل لکھنؤ میں سکونت:

مولانا قطب الدین انصاری سہالوی کی شہادت کے وقت ان کے چار بیٹے تھے۔ محمد اسعد، محمد سعید، نظام الدین اور محمد رضا۔ ان سب حضرات کا شمار اپنے زمانے کے شیوخ اور جید علما میں ہوتا تھا۔ والد گرامی کی شہادت کے بعد یہ حضرات سہالی کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ منتقل ہو گئے تھے اور شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر نے ان کو رہائش کے لیے ''فرنگی محل'' کی عمارت عطا کر دی تھی، اسی لیے بعد میں ''فرنگی محلی'' کی نسبت ان کے نام کا ضروری حصہ ہو گئی۔ مولانا قطب الدین اور ان کی شہادت کا مفصل ذکر ''فقہائے ہند'' کے گزشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ ان کے بیٹوں میں سے شیخ محمد اسعد، شیخ محمد رضا اور شیخ محمد سعید کا ترجمہ اس کتاب کی گزشتہ سطور میں بسلسلۂ ردیف م تحریر ہوا ہے۔ اب ذیل میں شیخ نظام الدین انصاری سہالوی کے حالات بیان کیے جا رہے ہیں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شیخ نظام الدین کی تحصیل علم:

شیخ نظام الدین، شیخ قطب الدین سہالوی کے تیسرے فرزند تھے۔ والد کی شہادت کے وقت ان کی عمر چودہ پندرہ برس کی تھی اور طالب علمی کا زمانہ تھا۔ شیخ قطب الدین نے ۱۹ رجب ۱۱۰۳ھ (مطابق ۲۷ مارچ ۱۶۹۲ء) کو جام شہادت نوش کیا۔ اس حساب سے ان کا سال ولادت تقریباً (۱۰۸۸ھ۔ ۱۶۷۷ء) بنتا ہے۔ شعور کی آنکھیں کھولیں تو گھر میں علم کی نہر جاری تھی اور مسند درس پر خود ان کے والد گرامی قدر شیخ قطب الدین متمکن تھے۔ ابتدائی درسی کتابیں انہی سے پڑھیں۔ والد کی شہادت کے بعد پورا خاندان لکھنؤ کے علاقہ فرنگی محل میں اقامت گزیں ہو گیا تو تکمیل علم کے لیے کوشاں ہوئے چنانچہ اس سلسلے میں مختلف بلاد وقصبات میں گئے اور جلیل القدر علما سے استفادہ کیا، جن میں شیخ امان اللہ بنارسی (متوفی ۱۱۳۳ھ/ ۱۷۲۱ء) شیخ غلام نقشبندی لکھنوی (متوفی رجب ۱۱۲۶ھ/ جولائی ۱۷۱۴ء) اور بعض دیگر علمائے عصر شامل ہیں۔

مسند تدریس:

تحصیل علم سے فارغ ہوتے ہی شیخ نظام الدین اپنے والد بزرگ وار کی مسند درس پر فائز ہوئے اور چند ہی دنوں میں ان کا آستانۂ علم معمورۂ ہند کے بہت سے علاقوں کے علما وطلبا کا مرجع بن گیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ علوم ظاہری کی تکمیل سے فراغت کے کئی سال بعد شیخ نظام الدین نے علوم باطنی کی طرف عنان توجہ مبذول فرمائی۔ اس وقت ان کی عمر چالیس برس کی تھی اور اس نواح کے نامور بزرگ شاہ عبدالرزاق بانسوی کے تصوف وطریقت کا تمام ہندوستان میں شہرہ تھا۔ شیخ نظام الدین ان کی خدمت میں گئے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ شاہ عبدالرزاق علوم درسیہ سے بہرہ مند نہ تھے، لہٰذا سب لوگوں کو اس بیعت سے تعجب ہوا۔ علمائے فرنگی محل نے تو برملا شیخ نظام الدین کے اس اقدام کی مخالفت کی۔ شیخ کے تلامذہ میں سے ایک صاحب مولانا کمال الدین تھے جو علوم عقلیہ میں بالخصوص دست گاہ رکھتے تھے اور نہایت ذہین اور طباع تھے، اپنے مقابلے میں کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ انھوں نے شیخ نظام الدین کی بیعت پر بڑی خفگی کا اظہار کیا اور صاف لفظوں میں شیخ سے کہا کہ آپ نے ایک جاہل کے ہاتھ پر کیوں بیعت کی اور اپنے فضل وکمال کو ایک ناآشنائے علم صوفی کے سامنے کیوں جھکایا؟ انھوں نے اسی پر بس نہیں کی، وہ شاہ عبدالرزاق کی خانقاہ میں پہنچے اور ذہن میں فلسفے کے چند مسائل سوچے کہ شاہ صاحب سے ان کے بارے میں دریافت کریں گے۔ روایت مشہور ہے کہ وہ شاہ عبدالرزاق کے پاس گئے تو شاہ صاحب نے خود ان مسائل کا ذکر چھیڑا، اور اس انداز سے ان پر اظہار خیال فرمایا کہ مولانا کمال الدین بالکل خاموش ہو گئے اور اسی وقت خود مولانا کمال الدین اور ان کے ساتھیوں نے شاہ صاحب کی بیعت کر لی۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شاہ عبدالرزاق بانسوی نے ۱۱۳۶ھ/۱۷۲۴ء میں رحلت فرمائی۔ان کی وفات کے بعد شیخ نظام الدین سہالوی نے ان کے خلیفہ سید اسماعیل بلگرامی (متوفی ۱۴ ذی الحجہ ۱۱۶۴ھ/۲۳ اکتوبر ۱۷۵۱ء) سے فیوض باطنی حاصل کیے۔

اخلاق و عادات:

شیخ نظام الدین انصاری سہالوی ابتدا ہی حسنِ اخلاق کے حامل، متوکل علی اللہ اور مستغنی المزاج تھے۔ ان کا وہی طریق عمل تھا جو سلف صالحین کا تھا، بے حد نیک اور پرہیزگار تھے۔سید غلام علی آزاد بلگرامی ''مآثر الکرام'' میں ان سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

فقیر بہ تاریخ نوزدھم ذی الحجہ سنتہ ثمان واربعین ومائتہ والف در بلدۂ لکھنؤ صحبت مولوی را دیدم طریقۂ سلف صالحین داشت وشعشۂ تقدس از ناصیۂ ہمایوں می تافت ❶۔

(میں ۱۹ ذی الحجہ ۱۱۴۸ھ/۲۰ اپریل ۱۷۳۶ء کو لکھنؤ گیا تو شیخ نظام الدین سے ملا، میں نے دیکھا کہ وہ سلف صالحین کے طریقے پر گامزن ہیں اور ان کی پیشانی پر تقدس کی شعاعیں چمک رہی ہیں۔)

یہی بات آزاد بلگرامی نے ان کے متعلق اپنی عربی تصنیف سبحۃ المرجان میں لکھی ہے۔

الفاظ یہ ہیں:

انا دخلت لكنئو في التاسع عشر من ذي الحجة الحرام سنة ثمان واربعين ومائة والف واجتمعت بالملا نظام الدين فوجدته على طريقة السلف الصالحين وكان يلمع على جبينه نور التقديس ❷۔

یعنی میں ۱۹ ذی الحجہ ۱۱۴۸ھ/۲۰ اپریل ۱۷۳۶ء کو لکھنؤ گیا تو ملا نظام الدین سے شرف نیاز حاصل ہوا، میں نے ان کو سلف صالحین کے نقش قدم پر پایا۔ان کی پیشانی پر تقدیس کا نور چمک رہا تھا۔

شیخ نظام الدین کی علمی شہرت چھوٹی عمر ہی میں علما و طلبا کے حلقوں میں پھیل گئی اور امرا و حکام کے درباروں میں پہنچ گئی تھی۔ اگر وہ چاہتے تو ہر قسم کا جاہ و منصب آسانی سے حاصل کر سکتے تھے۔لیکن اس طرف کبھی توجہ نہ کی اور دامن نفس کو دنیوی آلائشوں سے ہمیشہ محفوظ رکھا۔متواتر دو دو تین تین دن کے فاقے ہوتے تھے اور وہ عالی مرتبت عالم، انتہائی مستقل مزاجی سے برداشت کرتے تھے۔امرائے مملکت اور ارباب دولت

❶ مآثر الکرام ص ۲۱۲

❷ دیکھیے سبحۃ المرجان ۹۵

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے قطعاً میل جول نہ رکھتے تھے۔ ذہنی لحاظ سے اس قدر اونچے مرتبے کے حامل تھے کہ اغنیا و امرا میں سے کوئی حاضر خدمت ہوتا تو بے اعتنائی سے پیش آتے۔ اس کا اندازہ شیخ غلام مخدوم کے اس بیان سے ہو سکتا ہے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ:

ایک دن میں شیخ نظام الدین کی خدمت میں حاضر تھا اور بیماری کی وجہ سے چارپائی پر لیٹا ہوا تھا، اس اثنا میں امرائے مملکت میں سے ایک صاحب ملاقات کے لیے آئے، ان کے پاس ادب سے میں نے چارپائی پر سے اترنا چاہا تو شیخ نے فرمایا، ''اصحاب دولت کو دیکھ کر بدحواس کیوں ہوتے ہو، آرام سے لیٹے رہو۔''

ارباب حکومت سے بے التفاتی کے بارے میں ان کا ایک اور واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ امرائے شاہی میں سے ایک امیر ہفت ہزاری کا منصب رکھتا تھا اور شیخ کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتا تھا، اس نے ایک مرتبہ جمعے کے دن عین نماز کے وقت کہلا بھیجا کہ اگر آپ تھوڑی دیر انتظار فرمائیں تو میں بھی حاضر ہو کر آپ کی اقتدا میں نماز پڑھنے کا شرف حاصل کر سکوں۔ شیخ نے ذرا انتظار کیا، پھر یہ کہہ کر کہ ''نماز اللہ کی رضا کے لیے ہے، اہل دنیا کے لیے نہیں ہے۔'' نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔

انکسار و تواضع:

بلاشبہ شیخ بے نیاز طبیعت کے مالک تھے، لیکن یہ بے نیازی ہر ایک کے لیے نہ تھی، صرف جاہ پسند ارباب دولت اور امرائے مملکت کے لیے تھی، ورنہ مزاج میں انکسار، تواضع اور مسکنت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اس سلسلے کے چند واقعات لائق مطالعہ ہیں:

ایک مرتبہ ایک ایرانی جس کا نام ابوالمعالی تھا، شیخ نظام الدین کا شہرۂ علمی سن کر ملاقات کے لیے آیا۔ شیخ اپنے معمول کے مطابق نہایت سادگی سے درس گاہ میں چٹائی پر بیٹھے درس دے رہے تھے۔ نووارد مہمان کی نظروں کے سامنے ایرانی علما کا جاہ و جلال گھوم رہا تھا، اس کی نگاہِ التفات شیخ نظام الدین کی طرف نہ جا سکی۔ پوچھا مولانا نظام الدین کہاں تشریف رکھتے ہیں؟ فرمایا مولانا کے بارے میں تو میں نہیں جانتا، البتہ نظام الدین میرا ہی نام ہے۔ ایرانی وہیں بیٹھ گیا اور چند فقہی مسائل ان کے سامنے پیش کیے اور کہا کہ اہل حق (یعنی شیعہ مذہب کے ماننے والوں) کے نزدیک اس کا کیا جواب ہے؟ شیخ نے اس کا نقطۂ نگاہ سمجھ کر شیعہ حضرات کی فقہی روایت کے مطابق جواب دیا، وہ نہایت خوش ہوا۔ پھر کہا کہ انہی مسائل کی اہل ضلالت (یعنی اہل سنت) کے مذہب کی روشنی میں وضاحت فرمایئے۔ شیخ نے اس کے سوال کے جواب میں مسائل متعلقہ کے بارے میں اہل سنت کی روایات بیان کیں۔ وہ شیخ کے اسلوب کلام اور وسعت علم سے نہایت متاثر ہوا، اور کہا کہ ان کے متعلق جو سنا تھا، اس سے کہیں زیادہ پایا۔

علما کی نسبت عام طور پر مشہور ہے کہ وہ علمی مباحث کے میدان میں اترتے ہیں تو اس سے اپنے علم کا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اظہار اور دوسروں سے امتیازی درجہ حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے، اس لیے وہ حریف کے مقابلے میں عام طور پر خاموشی اختیار نہیں کرتے، بلکہ بہ دستور بحث و مجادلے میں مصروف رہتے ہیں، لیکن شیخ نظام الدین اس نقص سے بالکل مبرا تھے۔ منقول ہے کہ ایک مرتبہ ایک صاحب ان سے کسی مسئلے میں بحث کرنے کے لیے تشریف لائے اور آتے ہی مسئلہ دریافت کیا۔ شیخ نے اپنی تحقیق کے مطابق جواب دیا۔ معترض نے اعتراض کیا، اور بربنائے بحث شیخ کی تغلیط کی۔ شیخ چپ ہو گئے۔ انھوں نے مشہور کر دیا کہ میں نے نظام الدین سے علمی مباحث میں گفتگو کی، وہ میرے مقابلے میں چل نہیں سکے اور میں نے ان کو خاموش کرا دیا۔ شیخ کے تلامذہ کو یہ بات سخت ناگوار گزری اور اسے اپنے استاد کی توہین قرار دیا۔ چنانچہ ایک شاگرد ان صاحب کے پاس گئے اور اپنے زور بیان اور اسلوب استدلال سے ان کو بالکل ساکت کر دیا۔ یہ واقعہ شیخ کے علم میں آیا تو اس درجے برہم ہوئے کہ اس شاگرد کو حلقۂ درس سے نکال دیا اور فرمایا کہ میں ہرگز یہ پسند نہیں کرتا کہ میری وجہ سے کسی شخص کی شہرت اور عزت میں فرق آئے۔

شیخ نظام الدین طبعی طور پر نرم مزاج تھے، کسی کو پریشان کرنا اور اس سے بدلہ لینا ان کی فطرت میں داخل نہ تھا۔ ہر معاملے میں عفو و درگزر سے کام لینے کے عادی تھے۔ اس کا ثبوت اس واقعہ سے مل سکتا ہے کہ ان کے والد شیخ قطب الدین کی مظلومانہ شہادت کے واقعات بادشاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر کے علم میں لائے گئے تو اس نے عمال حکومت کے نام فرمان بھیجا کہ شیخ قطب الدین کے قاتلوں سے قصاص لیا جائے اور ان کا گھر بار برباد کر دیا جائے۔ چنانچہ لکھنؤ کے صوبے دار نے سرکاری سپاہ بھیج کر ان کا گھر غارت کر دیا، مخالفین وطن چھوڑ کر بھاگ گئے اور کچھ عرصے کے بعد قاتلوں کے اہل خاندان نے جعلی وفات نامہ لکھ کر عالم گیر کے دربار میں پیش کیا کہ قاتل مر گئے ہیں۔ شیخ کے اصل قاتل کا نام اسد اللہ تھا، جو سہالی کے نواح میں موضع پینتی پور کا رہنے والا تھا، وہ روپوش ہو گیا اور مدت تک زندہ رہا۔ شیخ نظام الدین جب سہالی کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ منتقل ہو گئے اور فرنگی محل میں درس کا سلسلہ شروع کیا تو وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ اس نے شیخ سے خون بہا پیش کرنے کی بھی درخواست کی، لیکن انھوں نے قبول نہیں فرمایا، بلکہ اپنا حصہ معاف کر دیا، تاہم ان پر عظیم باپ کی شہادت کا یہ اثر تھا کہ جب قاتل اسد اللہ ان کے سامنے آتا تو اس کی طرف سے منہ پھیر لیتے۔ شیخ نظام الدین کی متحمل مزاجی اور بردباری ملاحظہ ہو کہ باپ کے قاتل کو دیکھتے، اور پہچانتے ہیں، وہ ان کے پاس آتا بھی ہے لیکن نہ اس سے قصاص لیتے ہیں (بلکہ اپنا حصہ معاف کر دیتے ہیں) اور نہ سرکار میں شکایت کر کے اسے گرفتار کراتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر علو اخلاق کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔

تصانیف:

شیخ نظام الدین انصاری سہالوی بہت سی درسی کتابوں کے مصنف، محشی اور شارح تھے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا فضل امام خیر آبادی لکھتے ہیں:

تصانیف بسیار در علوم حکمیہ و اصول دارد ❶۔

یعنی اس عالم اجل نے علوم حکمیہ اور اصول میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔

شیخ کی تصانیف کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے مسائل حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم کلام، منطق و فلسفہ اور تذکرۂ رجال، ہر موضوع پر کتابیں تصنیف کیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ رسالہ فی وضوء الرسول: اس میں وضو کے بارے میں حدیث کی روشنی میں مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

۲۔ شرح التحریر فی اصول الدین: یہ کتاب اصول فقہ کے بارے میں ہے۔ اس شرح کو وہ مکمل نہ کر سکے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے لائق بیٹے مولانا عبدالعلی فرنگی محلی نے جو اپنے علم و فضل کی فراوانی کی وجہ سے ''بحر العلوم'' کے لقب سے معروف تھے، اس شرح کی تکمیل فرمائی۔

۳۔ شرح مسلم الثبوت: یہ بھی اصول فقہ کے موضوع پر ہے اور بہترین شرح ہے۔

۴۔ الصبح الصادق شرح منارا لانوار: اس کا تعلق بھی اصول فقہ سے ہے۔

۵۔ حاشیہ شرح عقائد دوانی: یہ علم کلام سے متعلق ہے۔

۶۔ شرح رسائل مبارزیہ: یہ بھی علم کلام سے متعلق ہے۔

۷۔ حاشیہ علیٰ حاشیہ قدیمہ علیٰ شرح تجرید دوانی: اس کا تعلق بھی علم کلام سے ہے۔

۸۔ حاشیہ شمس البازغہ: علم فلسفہ سے متعلق ہے۔

۹۔ حاشیہ شرح ہدایت الحکمت: اس کا موضوع بھی فلسفہ ہے۔

۱۰۔ مناقب رزاقیہ: یعنی ملفوظات شاہ عبدالرزاق بانسوی۔

شیخ نظام الدین سہالوی کی یہ تصانیف، حواشی اور شروح عالمانہ اور محققانہ ہیں۔

درس نظامی کی ترتیب:

شیخ نظام الدین کا سب سے بڑا کارنامہ درس نظامیہ کی ترتیب اور معمورۂ ہند کے مدارس عربیہ میں ایک خاص طریق تعلیم کا تعین ہے۔ ان سے پہلے بھی کئی سو سال سے مدارس ہند میں تعلیم کا سلسلہ جاری تھا اور ملک کے ہر حصے میں علمائے کرام پوری مستعدی سے یہ بنیادی خدمت انجام دے رہے تھے۔ پنجاب میں عرصۂ دراز سے لاہور کو مرکز علم کی حیثیت حاصل تھی اور قابل ترین اصحاب کمال درس و افادہ میں مصروف تھے۔ علاوہ ازیں سیالکوٹ اور سرہند وغیرہ علاقوں میں بھی درس کے حلقے قائم تھے۔ ارض کشمیر میں بھی بے شمار اصحاب فضل

❶ تراجم الفضلا، ص ۴

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی مسانید تدریس آراستہ تھیں۔

لیکن اس باب میں صوبۂ یوپی کے بلاد وقصبات مثلاً لکھنؤ، سہالی، بلگرام، دیوہ، بنارس، گوپامئو، الہٰ آباد اور اس کے گردونواح کے علاقے بالخصوص ممتاز اور ہندوستان کے تمام صوبوں میں منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ صوبہ یوپی میں دس دس پانچ پانچ میل کے فاصلے پر شریف خاندانوں اور عمدہ اوصاف سے متصف لوگوں کے دیہات آباد تھے، جن میں مدارس دینیہ کے سلسلے جاری تھے اور نامور فضلا ان میں باقاعدہ درس دیتے تھے۔ ان مدارس کو سلاطین وامرا کی سرپرستی حاصل تھی اور وسیع تعداد میں طلبا ان میں حصول علم کے لیے آتے تھے۔ علم وفضل کی فراوانی کی بنا پر شاہ جہان بادشاہ پورب کے اس علاقے کو اپنی مملکت کا شیراز قرار دیتا تھا۔ سید غلام علی بلگرامی اس دور کے اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

اگرچہ جمیع صوبہ جات ہند بوجود حاملان علوم تفاخر دارند...... اما صوبہ اودھ والہ آباد خصوصیتے دارد کہ در ہیچ صوبہ نتواں یافت، چہ در تمام صوبۂ اودھ واکثر صوبہ الہٰ آباد بفاصلہ پنج کردہ نہایت دہ کروہ تخمیناً آبادی شرفا ونجبا است کہ از سلاطین و حکام وظائف و زمین و مدد معاش داشتہ اند و مساجد و مدارس و خانقاہات بنا نہادہ، ومدرسان عصر در ہرجا ابواب علم برروئے دانش پژوہان کشادہ وصلائے اطلبو العلم دردادہ، وطلبہ علم خیل خیل از شہرے بہ شہرے می روند، وہرجا موافقت دست بہم داد، بہ تحصیل مشغول می شوند وصاحب توفیقان ہر معمورہ طلبہ علم را نگاہ می دارند، وخدمت ایں جماعہ را سعادت عظمیٰ می دانند۔ صاحب قران ثانی شاہ جہاں انار اللہ برہانہ، می گفت "پورب شیراز مملکت ما است ❶۔"

یعنی اگرچہ ہندوستان کے تمام صوبوں کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان میں اہل علم اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں، لیکن صوبہ اودھ اور الہٰ آباد کا اس خصوصیت میں کوئی دوسرا صوبہ مقابلہ نہیں کرسکتا۔ صوبۂ اودھ اور الہٰ آباد میں پانچ پانچ دس دس کوس کے فاصلے پر شرفا اور نجبا کے دیہات آباد ہیں، جن میں نامور فضلا کے سلسلہ ہائے درس جاری ہیں۔ سلاطین و حکام انھیں باقاعدہ وظائف عطا کرتے اور مدد معاش کے لیے زمینیں دیتے ہیں۔ انھوں نے مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں تعمیر کرائیں اور ان میں جو مدرسین درس وتدریس کا فریضہ انجام دیتے ہیں، ان کی مالی امداد کی جاتی ہے۔ ہر گاؤں میں علما وفقہا نے علم کے دروازے وا کر رکھے ہیں، جن میں دور ونزدیک سے کثیر تعداد میں طلبا آکر تعلیم حاصل کرتے اور اپنی استعداد کے مطابق مستفید ہوتے ہیں۔ ہر علاقے کے طلبا کی ارباب دولت پوری دیکھ بھال اور ان کے مصارف کی کفالت کرتے ہیں۔ وہ لوگ علما وطلباء کی خدمت کو اپنے لیے بہت بڑی سعادت سمجھتے ہیں۔ اسی بنا پر صاحب قران ثانی شاہ جہان بادشاہ مرحوم کہا کرتا تھا کہ پورب کا علاقہ ہماری مملکت کا شیراز ہے۔

سید غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں کہ قیام مدارس اور خدمت علما وطلباء کا یہ نظام ۱۱۳۰ھ/ ۱۷۱۸ء تک

❶ مآثر الکرام ص ۲۱۳، ۲۱۴

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قائم رہا۔ جب برہان الملک سعادت خاں نیشا پوری صوبہ اودھ کا صوبے دار مقرر ہوا تو اس نے تمام معافیاں ضبط کر لیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علما و فضلا کی اولاد نے کسب معاش سے مجبور ہو کر پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ ترک کر کے سپاہ گری کو اپنا پیشہ بنا لیا، مدرسے ویران ہو گئے، علمی صحبتیں درہم برہم اور تحقیقی محفلیں ختم ہو گئیں۔ ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء میں الٰہ آباد کا صوبے دار صفدر جنگ مقرر ہوا تو اس نے رہی سہی معافیاں بھی ضبط کر لیں۔ احمد شاہ کے زمانے میں صفدر جنگ کو وزارت اعلیٰ کا منصب ملا تو اس کے نائب نے وظیفہ داروں کو مزید تنگ کرنا شروع کیا اور اس طرح علم کی پُر بہار بستیوں پر خزاں چھا گئی اور مدرسے اجڑ گئے [1]۔

غرض ارض ہند کے ان عظیم و مشہور مدارس میں سے ایک مدرسہ سہالی کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں بھی تھا جو عرصہ دراز سے جاری تھا اور جس سے بے شمار طلباء نے دستار فضیلت حاصل کی۔ یہی وہ مدرسہ ہے جو آگے چل کر لکھنؤ کے فرنگی محل کے قالب میں ڈھلا اور درس نظامیہ کے سنگ بنیاد کا باعث بنا۔ ''درس نظامیہ'' جو ہمارے برصغیر کی علمی تاریخ اور تدریسی زبان کا سب سے نمایاں لفظ ہے، اس کے بانی اول یہی شیخ نظام الدین سہالوی تھے، جن کا اسم گرامی ہماری ان گزارشات کا سر عنوان ہے۔ اس کی ترتیب کا اولیں مقام لکھنؤ کے فرنگی محل کی چار دیواری ہے۔ اسے ایک بلند بخت عالم دین نے ایسی ساعت سعید میں مرتب فرمایا کہ پشاور کے آخری سرے کے پہاڑوں سے لے کر کلکتے کے ساحل تک پورے معمورۂ ہند کے مدارس دینیہ میں تیزی کے ساتھ پھیل گیا۔ علمانے خندہ پیشانی سے اس کو قبولیت کا شرف بخشا اور طلباء نے اس کے تمام پہلوؤں کا کامل توجہ سے تتبع کیا۔ اس کی مقبولیت یہاں تک پہنچی کہ اب تک یہ حال ہے کہ کسی کو عالم نہیں تسلیم کیا جاتا جب تک ثابت نہ ہو جائے کہ اس نے اسی طریقۂ درس کے مطابق تعلیم حاصل کی ہے۔

لیکن سخت حیرت انگیز تعجب کی بات ہے کہ اکثر مدارس دینیہ کے ارباب اہتمام اور مدرسین تک کو معلوم نہیں کہ درس نظامیہ کب بنا؟ اس کا بانی کون تھا اور وہ کس علاقے اور ملک کا رہنے والا تھا؟ بعض مدارس کے عہدے دار اور ناظم بھی اس سلسلے میں کوئی علم نہیں رکھتے۔ ان سے یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ اس کا بانی دولت سلجوقیہ کا وزیر نظام الملک تھا، جس نے بغداد میں مدرسہ نظامیہ قائم کیا تھا۔ انھیں بالکل معلوم نہیں کہ اپنے مدارس میں جس درس نظامیہ کے مطابق وہ تین سو سال سے تعلیم دے رہے ہیں، وہ خود انہی کے ملک برصغیر کے ایک عالم دین شیخ نظام الدین انصاری سہالوی فرنگی محلی کے ذہن رسا کا کارنامۂ فخر ہے جو اپنے بانی کے نام کی مناسبت سے درس نظامیہ کے نام سے مشہور ہوا۔

مدرسہ نظامیہ اور درس نظامیہ:

موقع کی مناسبت سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ نظامیہ اور درس نظامیہ میں جو فرق ہے، یہاں

[1] مآثر الکرام ص ۲۱۴

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کی وضاحت کر دی جائے۔

مدرسۂ نظامیہ خواجہ نظام الملک نے قائم کیا تھا جو دو سلجوقی حکمرانوں (الپ ارسلان اور اس کے بیٹے ملک شاہ کا) وزیر رہ چکا تھا۔ یہ ایک عظیم الشان درس گاہ تھی جو نظام الملک نے بغداد کے مشرقی حصے میں دریائے دجلہ کے کنارے ایک وسیع و عریض قطعہ زمین میں قائم کی تھی۔ اس کی تعمیر کا آغاز شنبہ کے روز کیم ذی قعدہ ۴۵۷ھ (۱۵ اکتوبر ۱۰۶۵ء) کو ہوا۔ تعمیر کے نگران شیخ الشیوخ ابوسعد نیشاپوری تھے۔ پورے دو سال تک تعمیر کا سلسلہ جاری رہا اور کیم ذی قعدہ ۴۵۹ھ (۱۳ ستمبر ۱۰۶۷ء) کو عمارت مکمل ہوئی۔ اس کے صدر دروازے پر نظام الملک کا نام کندہ کیا گیا اور چاروں طرف بازار اور حمام بنوائے گئے۔ عمارت اس قدر وسیع تھی کہ اس میں کئی لاکھ آدمی سما سکتے تھے۔

منقول ہے کہ مدرسہ نظامیہ کی تعمیر کے دوران میں ایک دفعہ خواجہ نظام الملک کو یہ اطلاع پہنچی کہ اس کے ایک کارندے نے بہت سی رقم خورد برد کر لی ہے۔ جب اس کارندے کو پتا چلا کہ خواجہ نظام الملک کو اس کی خیانت کا علم ہو گیا ہے تو وہ باز پرس سے بچنے کے لیے بصرے بھاگ گیا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد ضمیر نے ملامت کی تو مجبور ہو کر نظام الملک کی خدمت میں حاضر ہوا، اور ان الفاظ کے ساتھ عفو تقصیر کی التجا کی۔

''اے خواجہ! آپ نے یہ مدرسہ اللہ کی رضا کے لیے تعمیر کرایا ہے۔ پس خیانت کرنے والے کا معاملہ بھی اللہ کے سپرد کر دیجیے۔ آپ کو ثواب ملے گا اور خائن اپنے کیے کی سزا پائے گا۔''

نظام الملک نے جواب میں کہا: مجھے اس مال کا غم نہیں جو تم نے یا کسی اور نے اس مدرسے کی تعمیر میں کھایا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اس مدرسے کی عمارت اتنی مضبوط ہوتی جتنی مسجد منصوری اور شفاخانہ عضدی کی ہے، مجھے تو یہ غم ہے کہ تم لوگوں نے مسالے میں خیانت کی ہے جس کی وجہ سے عمارت مستحکم نہیں ہوگی اور جلد خراب ہو جائے گی۔

اکثر مورخین کا بیان ہے کہ مدرسہ نظامیہ کی تعمیر پر ساٹھ ہزار دینار خرچ ہوئے تھے۔ یہ رقم آج کل کے کم و بیش ساٹھ لاکھ روپے کے لگ بھگ ہوگی۔ پھر جس زمانے میں یہ مدرسہ تیار ہوا، اس وقت تعمیر کے سامان کی قیمت اور مزدوروں اور معماروں کی اجرت موجودہ زمانے کی نسبت بہت ہی کم تھی۔ اس سے اس مدرسے کی عظمت اور شان و شکوہ کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

شنبہ کے روز ۱۰ ذی قعدہ ۴۵۹ھ (۲۳ ستمبر ۱۰۶۷ء) کو مدرسہ نظامیہ کی رسم افتتاح ہوئی۔ اس موقع پر بغداد کی تقریباً تمام آبادی نئی عمارت میں امنڈ آئی تھی۔ یہاں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ خواجہ نظام الملک نے علامہ شیخ ابواسحاق شیرازی کو مدرسے کا مدرس اعلیٰ نامزد کیا تھا اور افتتاح بھی انہی کو کرنا تھا۔ لیکن جب وہ اس مقصد کے لیے مدرسے کی طرف جا رہے تھے تو راستے میں ایک کم سن لڑکے نے ان سے مخاطب ہو کر کہا:

یا شیخ کیف تدرس فی مکان مغصوب۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یعنی اے شیخ! آپ اس جگہ کیسے درس دیں گے جو زبردستی حاصل کی گئی ہے۔

شیخ ابواسحاق لڑکے کی زبان سے یہ بات سنتے ہی شہر سے باہر نکل گئے اور ایک غار میں جا کر بیٹھ گئے۔ ادھر جب حاضرین انتظار کرتے کرتے مایوس ہو گئے تو بغداد کے ایک بااثر رئیس شیخ عبدالملک ابوالمنصور کے ایما پر امام ابونصر بن صباغ (مصنف ''الشامل والکامل'') سے درخواست کی گئی کہ وہ رسم افتتاح ادا فرمائیں۔ امام موصوف نے لوگوں کے اصرار پر مسند درس کو رونق بخشی اور اس طرح بغداد کے ''مدرسہ نظامیہ'' میں تدریس کا آغاز ہوا۔

امام ابونصر رحمہ اللہ بیس دن تک مدرسہ نظامیہ میں درس دیتے رہے۔ اس اثنا میں خواجہ نظام الملک کی خواہش کے مطابق شیخ ابواسحاق شیرازی سے رابطہ قائم کر کے ان کا شک رفع کیا گیا اور شدید اصرار سے ان کو مدرسے میں درس دینے پر رضامند کیا گیا۔ چنانچہ مدرسے کے افتتاح کے بیس دن بعد انھوں نے امام ابونصر کی جگہ شیخ الجامعہ کے فرائض سنبھالے۔

غرض مدرسہ نظامیہ کے بانی اور مؤسس نظام الملک مملکت سلجوقیہ کے وزیر اور دنیوی لحاظ سے اپنے وقت کی بہت بڑی شخصیت تھے۔ علمی اعتبار سے بھی ان کا مرتبہ بلند تھا۔

اس کے برعکس درس نظامیہ کے بانی شیخ نظام الدین انصاری سہالوی تھے، جن کا حکومت کے ایوانوں اور سرکاری درباروں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ ایک درویش منش اور فقیر طبع عالم تھے۔ مالی لحاظ سے غربت کا شکار تھے۔ ان کے آبا و اجداد کا سلسلۂ درس مدت مدید سے جاری تھا۔ انھوں نے کوئی نیا مدرسہ جاری نہیں کیا بلکہ نصاب درس میں نئی اصلاحات نافذ فرمائیں اور ان کا مرتب کردہ نصاب ان کے نام کی مناسبت سے ''درس نظامیہ'' کہلایا۔ مدرسہ نظامیہ کے مؤسس اور درس نظامیہ کے بانی کے درمیان کم و بیش سات سو سال کا طویل عرصہ حائل ہے۔

شیخ نظام الدین کا نصاب تعلیم اور اس کی خصوصیات:

شیخ نظام الدین کا مرتب کردہ نصاب تعلیم جو درس نظامیہ کہلاتا ہے، مختلف گیارہ علوم و فنون پر مشتمل ہے، جس کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ تفسیر: جلالین، بیضاوی۔

۲۔ حدیث: مشکوٰۃ المصابیح۔

۳۔ فقہ: شرح وقایہ، ہدایہ اولین، ہدایہ آخرین۔

۴۔ اصول فقہ: نورالانوار، توضیح تلویح، مسلم الثبوت۔

۵۔ کلام: شرح عقائد نسفی، شرح عقائد جلالی، میرزاہد، شرح مواقف۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۶۔ بلاغت: مختصر معانی، مطول تا بحث ما انا قلت۔

۷۔ فلسفہ: میبذی، صدرا، شمس البازغہ۔

۸۔ منطق: صغریٰ، کبریٰ، ایساغوجی، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، مع میر قطبی، مسلم الثبوت۔

۹۔ صرف: میزان الصرف، صرف میر، پنج گنج، زبدہ، فصول اکبری، شافیہ۔

۱۰۔ نحو: نحو میر، شرح مائۃ عامل، ہدایۃ النحو، کافیہ، شرح جامی۔

۱۱۔ ریاضی: خلاصۃ الحساب، تحریر اقلیدس مقالۂ اول، تشریح الافلاک، رسالہ قوشجیہ، شرح چغمینی باب اول۔

شیخ نظام الدین کا مرتبہ نصاب تعلیم (یعنی درس نظامیہ) بہت سی خصوصیات کا حامل ہے، جو مختصر طور پر درج ذیل ہیں۔

۱۔ اس میں ارض ہند کے متعدد علما کی کتابیں شامل ہیں جن میں بعض وہ حضرات ہیں جو شیخ کے ہم عصر ہیں، مثلاً ملا جیون (متوفی ۹ ذی قعدہ ۱۱۳۰ھ/۲۳ ستمبر ۱۷۱۸ء) کی نور الانوار، شیخ محب اللہ بہاری (متوفی ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء) کی مسلم الثبوت اور سلم العلوم وغیرہ۔ ان کے زمانے سے قبل کے ہندی علما کی کتابیں بھی داخل نصاب ہیں۔ مثلاً سید علی اکبر الٰہ آبادی (متوفی ۱۰۹۰ھ/۱۶۷۹ء) کی فصول اکبری، ملا محمود جون پوری (متوفی ۹ ربیع الاول ۱۰۶۲ھ/۹ فروری ۱۶۵۲ء) کی شمس البازغہ وغیرہ۔

یہ وہ حضرات علما ہیں جن کی کتابوں نے درس نظامیہ کے بہت سے حصے پر تسلط جما لیا ہے۔ شیخ نظام الدین نے اس نصاب کے ذریعے پوری علمی دنیا سے ان کو متعارف کرایا۔ یہ پہلے عالم ہیں جنھوں نے ہندی فضلا کی تصنیفات کو یہ اعزاز بخشا اور داخل نصاب کیا، ورنہ ان سے قبل کسی ہندی عالم کی کوئی کتاب مروجہ نصاب تعلیم میں داخل نہیں کی گئی تھی۔ اس سے واضح ہوا کہ شیخ نظام الدین صحیح معنوں میں علما کے قدردان تھے، وہ نہایت صاف دل عالم تھے اور ان کا ذہن معاصرانہ کشاکش سے پاک تھا۔

۲۔ انھوں نے ہر فن کی مشکل کتابیں نصاب میں داخل کیں تا کہ طلباء کی ذہنی اور فکری کاوشوں میں تیزی آئے اور ان کے غور و خوض کے پیمانوں میں وسعت پیدا ہو۔

۳۔ دیگر علوم کی نسبت منطق اور فلسفے کی کتابیں زیادہ رکھیں، کیونکہ ان کے دور کی علمی فضا کا تقاضا یہی تھا۔ اس زمانے کا عام رجحان یہ تھا کہ طلباء فنون میں خام نہ رہیں ان کی فنی قوت میں اضافہ ہو۔

۴۔ علم حدیث کی صرف ایک کتاب رکھی، یعنی مشکوٰۃ، اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر مشکوٰۃ کو اچھے طریقے سے پڑھ لیا جائے تو باقی کتب احادیث کو مطالعہ کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ خیال قرین صحت نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ احادیث کی امہات الکتب کو استاد سے باقاعدہ پڑھے بغیر سمجھنا ممکن نہیں۔ ہمارے خیال میں صرف مشکوٰۃ کو داخل نصاب کرنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس زمانے کے ہندوستان میں کتب احادیث کی زیادہ اشاعت نہیں ہوئی تھی۔ صرف وہی حضرات ان سے متعارف

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھے جو حصول علم کے لیے حجاز کا سفر اختیار کرتے تھے۔

۵۔ اس نصاب میں ادب کا حصہ ناپید ہے، جو اس کا ایک کمزور پہلو ہے۔

۶۔ اس نصاب تعلیم میں شیخ نظام الدین انصاری نے جس چیز کو خصوصیت کے ساتھ پیش نظر رکھا وہ یہ تھی کہ طالب علم کی استعداد مطالعہ اس قدر مضبوط ہو جائے کہ فارغ التحصیل ہو جانے کے بعد وہ ہر مروجہ فن کی کتابوں کو آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اگر اس نصاب کی تمام کتابوں کو پورے غور کے ساتھ پڑھ لیا جائے تو علوم عربیہ کو فہم کی گرفت میں لانے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔

۷۔ علاوہ ازیں یہ نصاب اس قدر مختصر ہے کہ طالب علم کو اس پر سالہا سال صرف کرنا نہیں پڑتے، بلکہ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ درسی کتابوں سے فارغ ہو جاتا ہے، چنانچہ اس بات کی شہادتیں موجود ہیں کہ کتنے ہی طلبا کم سنی میں فارغ التحصیل ہو کر تدریس کی مسندوں پر فائز ہو گئے۔

۸۔ اس نصاب کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فقہی تعصب قطعاً نہیں ہے، اس لیے کہ تعصب دراصل کتب فقہیہ کی بھرمار سے پیدا ہوتا ہے، اور یہ نصاب اس سے مبرا ہے۔

۹۔ پھر اس کی ترتیب میں اس بات کا خاص طور سے خیال رکھا گیا ہے کہ معاصر علما کی تصانیف کو زیادہ سے زیادہ جگہ دی جائے، تاکہ معاصرت کا مرض ختم ہونے میں مدد مل سکے۔

۱۰۔ اس ضمن میں شیخ نظام الدین کی کسر نفسی اور تواضع ملاحظہ ہو کہ انھوں نے اس میں اپنی کوئی تصنیف نہیں رکھی، حالانکہ وہ اپنے عصر کے جلیل القدر عالم اور رفیع المرتبت فاضل اور مصنف تھے۔

شیخ کی وفات کے بعد حالات کے مطابق درس نظامیہ میں تبدیلی اور اضافے کا عمل جاری رہا۔ لیکن بنیادی طور پر اس میں روح وہی کارفرما رہی اور وہ کتابیں اس میں داخل رہیں جو شیخ نظام الدین نے تجویز کی تھیں۔

تلامذہ:

اس زمانے کے حالات کے مطابق شیخ نظام الدین سہالوی کا سلسلۂ درس نہایت وسیع تھا، ان سے بے شمار علما و طلباء نے استفادہ کیا اور پھر آگے چل کر ان میں سے ہر شخص فضل و کمال میں ممتاز مرتبے پر فائز ہوا۔ ان کے تلامذہ کی وسعت پذیر فہرست میں چند نامور اور فحول علما کے اسمائے گرامی ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ سید کمال الدین حسینی عظیم آبادی: علوم حکمیہ میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ عرصے تک فتح پور کی مسند تدریس پر متمکن رہے۔ اس کے بعد نواب سیف خاں نے عظیم آباد (پٹنہ) میں ایک مدرسے کی تاسیس کی تو اس کی درخواست پر وہاں تشریف لے گئے۔ خلق کثیر نے ان سے اخذ علم کیا۔ ان کی موت کا واقعہ بڑا عجیب ہے۔ اپنے استاذ شیخ نظام الدین سے انھیں انتہائی عقیدت اور محبت تھی، اطلاع پہنچی کہ شیخ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وفات پا گئے ہیں، اسی صدمے میں انتقال کر گئے، حالانکہ شیخ زندہ تھے اور ان کی وفات کی خبر غلط تھی۔

۲۔ سید ظریف حسینی عظیم آبادی: فقہ و اصول اور علم کلام میں عبور رکھتے تھے۔ نواب سیف خاں کے مدرسے میں جو عظیم آباد (پٹنہ) میں قائم کیا گیا تھا، خدمت درس انجام دیتے تھے۔ استاذ گرامی شیخ نظام الدین سے بہ درجہ غایت مودت رکھتے تھے، ان کی وفات کی غلط خبر مشہور ہوئی تو فرط غم سے نڈھال ہو گئے اور اس قدر روئے کہ آنکھوں کی بصارت ضائع ہو گئی۔ کئی کتابوں کے مصنف اور بے شمار علما کے استاد تھے۔

۳۔ شیخ کمال الدین انصاری سہالوی: اپنے وقت کے عالم کبیر اور علامۂ عصر تھے، علوم پر مجتہدانہ نظر رکھتے اور ہر فن میں امامت کے مرتبے پر فائز تھے۔ شیخ نظام الدین کے قریبی رشتے دار اور لائق شاگرد تھے۔ متعدد کتابوں کے محشی اور مصنف تھے۔ لاتعداد لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ ۱۴ محرم ۱۱۷۵ھ/ ۱۵ راگست ۱۷۶۱ء کو فوت ہوئے۔

۴۔ شیخ غلام محمد گجراتی برہان پوری: عالم اجل اور نامور استاد تھے۔ عمر بھر علوم کی نشر و فروغ میں مصروف رہے۔ بوہرہ برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۱۴۹ھ/ ۱۷۳۶ء میں برہان میں انتقال کیا۔

۵۔ مولانا حقانی امیٹھوی ٹانڈوی: کبار علما میں سے تھے۔ علوم وفنون میں پوری دسترس رکھتے تھے۔ بہت سے علما نے ان سے کسب علم کیا۔ ۱۷ جمادی الاولیٰ ۱۱۹۰ھ/ ۴ رجولائی ۱۷۷۶ء کو ٹانڈہ شہر میں فوت ہوئے۔

۶۔ مولانا عبداللہ امیٹھوی: فقہ، اصول، اور علم کلام پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اپنے زمانے کے جلیل القدر عالم تھے۔ درس و افادہ میں اپنی مثال آپ تھے۔

۷۔ شیخ احمد بن غلام نقشبند لکھنوی: شیخ و فاضل اور علوم عربیہ میں یگانہ تھے۔ فقہ، اصول اور دیگر فنون میں ممتاز تھے۔ تدریس کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ بے شمار حضرات نے ان سے اکتساب علم کیا۔

۸۔ شیخ حمد اللہ صدیقی سندیلوی: مذہباً شیعہ تھے، علوم حکمیہ میں مرتبۂ امامت پر فائز تھے۔ بہت بڑے مدرس اور مصنف تھے۔ ارض ہند کے مشاہیر اساتذہ فن میں شمار کیے جاتے تھے۔ منطق و فلسفہ کی متعدد انتہائی کتابوں کے حواشی و تعلیقات سپرد قلم کیے۔ حلقہ علما میں ان کی کتابیں اس قدر مقبول ہوئیں کہ ان کے استاد شیخ نظام الدین کی وفات کے بعد ان میں سے بعض درس نظامیہ میں داخل کی گئیں۔ ۱۱۶۰ھ/ ۱۷۴۷ء کو دہلی میں انتقال کیا۔

۹۔ مولانا عبدالرشید جون پوری: منطق و فلسفہ اور اصول کے جید عالم تھے۔ ذہانت و فطانت میں منفرد اور زہد و عبادت میں ممتاز تھے۔ متوکل علی اللہ، متورع اور کثیر الدرس و افادہ تھے۔ علما کی کثیر تعداد نے ان سے استفادہ کیا۔ لکھنؤ میں وفات پائی۔

۱۰۔ سید غلام محمد عمر حسینی شمس آبادی: علم و معرفت میں یگانہ روزگار تھے۔ بہت سے علما نے ان سے استفادہ کیا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۱۔ مولانا غلام فرید محمد آبادی: اپنے عہد اور علاقے کے فحول علما اور مشہور مشائخ میں سے تھے۔ اعمال اعظم گڑھ کے ایک مقام ''محمد آباد'' میں پیدا ہوئے۔ قناعت اور توکل کی زندگی بسر کرتے تھے۔ صالح، متقی اور پرہیز گار عالم دین تھے۔

۱۲۔ مولانا محمد حسن لکھنوی: عالم اجل اور شیخ کامل تھے۔ ذکاوت و ذہانت میں ممتاز درجے کے مالک تھے۔ مختلف علوم و فنون کی اہم کتابوں کے شروح و حواشی سپرد قلم کیے۔

غرض شیخ نظام الدین سہالوی کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع ہے اور آج برصغیر میں مدارس دینیہ کی جو رونق دکھائی دیتی ہے، وہ کسی نہ کسی طرح انہی کے پرتو فیض کا نتیجہ ہے۔ ان کی عظمت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ برصغیر (جس میں موجود نقشے کے مطابق پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش تین ملک شامل ہیں) کا تمام تر سلسلۂ درس انہی کے نام نامی سے منسوب ہے۔ ان کے زمانے میں خطۂ ہند کے بیشتر علما کی نسبت تلمذ انہی کی طرف جاتی تھی۔ سید غلام علی آزاد بلگرامی اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

امروز علمائے اکثر قطر ہندوستان نسبت تلمذ بہ مولوی دارند و کلاہ گوشہ تفاخرمی شکنند کسے کہ سلسلہ تلمذ بہ ادمی رساند بین الفضلائے علم امتیازمی افرازد ❶۔

یعنی اس دور کی سرزمین ہند کے زیادہ تر علما اپنی نسبت شاگردی مولانا نظام الدین سہالوی سے رکھتے ہیں اور انہی کے کلاہِ پُرفخر سے وابستہ ہیں۔ حالت یہ ہے کہ جو شخص ان کے دامن شاگردی سے منسلک ہو جاتا ہے، وہ اہل علم اور ارباب فضل میں ممتاز مقام حاصل کر لیتا ہے۔

آج مدارس دینیہ کے حلقوں میں جس طرح شیخ نظام الدین کا نام روشن ہے، اسی طرح ان کے تلامذہ کا ذکر بھی پوری آب و تاب کا حامل ہے اور اپنی تدریسی و تصنیفی خدمات کی بنا پر نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

اولاد:

شیخ نظام الدین کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ تھی، لوگ دوسری شادی پر مجبور کرتے تھے، لیکن وہ اس پر رضامند نہ تھے، جب لوگوں کا اصرار بڑھا تو فرمایا، میں اس مخمصے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ البتہ کسی بزرگ کا ارشاد ہوگا تو مجبوراً یہ قدم اٹھانا پڑے گا۔ آپ نے شیخ اسماعیل بلگرامی (متوفی ۱۴ ذی الحجہ ۱۱۶۴ھ/۲۳ اکتوبر ۱۷۵۱ء) سے فیض باطنی حاصل کیا تھا۔ انھوں نے کہلا بھیجا کہ مجھے القا کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ دوسری شادی سے آپ کی اولاد ہوگی۔ چنانچہ خاصی عمر ہو چکی تھی کہ قصبہ سترکھ میں دوسری شادی کی، جس سے وہ گوہر شہوار پیدا ہوا، جس نے اپنی خداداد صلاحیتوں، اور بے پناہ علمی فضیلت کی بنا پر اہل علم کے حلقوں میں

❶ مآثر الکرام ص ۲۱۲

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''بحر العلوم'' کے پرشکوہ لقب سے شہرت پائی۔

بحر العلوم کا اصل نام عبدالعلی ہے، علم و فضل میں ان کو جو عظیم الشان مرتبہ حاصل تھا، وہ کسی اہل علم سے مخفی نہیں۔ بحر العلوم اپنی رفعت علمی کی بنا پر انتہائی شہرت کے حامل ہیں۔ اس جلیل القدر عالم نے ۱۲ رجب ۱۲۲۵ھ/۱۳/اگست ۱۸۱۰ء کو مدراس میں وفات پائی۔ ان کا تذکرہ تیرھویں صدی ہجری کے فقہائے کرام کے ضمن میں کیا جائے گا، ان شاء اللہ العزیز۔

مرض اور وفات:

شیخ نظام الدین کو کئی سال سے مثانے کی پتھری کا مرض لاحق تھا، لیکن ہمیشہ تدریس و تصنیف میں مصروف رہے، کبھی علاج کی ضرورت محسوس نہ کی۔ جب عمر کا آخری دور آیا اور ستر برس سے آگے نکل گئے تو کمزوری اور ضعف نے ایسا گھیرا ڈالا کہ چارپائی پر لیٹ گئے اور زنان خانے میں رہنے لگے۔ لیکن بیمار پرسی کو لوگ کثرت سے آتے تھے اور بار بار پردہ کرانے میں اہل خانہ کو تکلیف ہوتی تھی، لہٰذا شیخ عبدالحق نے عرض کیا کہ اگر آپ دیوان خانے میں تشریف فرما رہیں تو زیادہ اچھا ہے۔ شیخ نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوسرے دن ایک بزرگ شاہ عبدالغنی عیادت کو آئے تو شیخ نے یہ مصرعہ پڑھا:

ہر روز بینم تنگ تر سوراخ ایں غربا لہا

اور پھر فرمایا کہ عبدالحق ہی کی مرضی پر عمل کرو، چنانچہ زنان خانے سے اٹھے اور دیوان خانے میں تشریف لے آئے اور وہیں وفات پائی۔

شیخ نظام الدین کی دو بیویاں تھیں۔ منقول ہے کہ دوسری شادی کرنے کی وجہ یہ تھی کہ پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ تھی۔ مرض میں جب شدت آئی تو پہلی بیوی حاضر خدمت ہوئیں اور کہا کہ مجھ سے جو قصور ہوا معاف فرما دیجیے۔ فرمایا تم نے کوئی قصور نہیں کیا۔ البتہ مجھ سے یہ غلطی سرزد ہوئی کہ تمھاری موجودگی میں دوسری شادی کی۔ میری خطا معاف کردو۔ تھوڑی دیر بعد دوسری بیوی آئیں اور کہا، آپ تو تشریف لے جا رہے ہیں، اولاد کو کس کے سپرد کیا ہے۔ شیخ کو اس سے سخت ذہنی کوفت ہوئی، حاضرین سے کہا کہ مجھے اٹھا کر بٹھا دو۔ پھر فرمایا ''نظام الدین تو جا رہا ہے لیکن خدا ہمیشہ رہے گا'' آپ نے پچھتر سال عمر پا کر چہار شنبہ کے روز ۹ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ/۲۶/اپریل ۱۷۴۸ء کو دوپہر کے وقت داعی اجل کو لبیک کہا[1]۔

[1] شیخ نظام الدین کے حالات کے لیے یہ کتابیں دیکھیے: سبحۃ المرجان ص ۹۴، ۹۵۔ ابجد العلوم ص ۹۱۱ - مآثر الکرام ص ۲۱۲ تا ۲۱۶ - تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۱۸۱ - احوال علمائے فرنگی محلی ص ۹، ۱۰، ۷۷ - تراجم الفضلاء ______ مقالات شبلی ج ۳ ص ۹۱ تا ۱۰۱ - حدائق الحنفیہ ص ۱۱۵ - تذکرہ علمائے ہند ص ۲۴۱ - نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۸۱، ۳۸۲ - قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب ص ۲۱۰ - الثقافۃ الاسلامیہ فی الھند ص ۱۶، ۱۷

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۸۵۔ قاضی نظام الدین احمد آبادی

قاضی نظام الدین بن شیخ نور الدین بن محمد صالح احمد آبادی گجراتی بارھویں صدی ہجری کے عالم و فقیہ اور عبادت گزار بزرگ تھے۔ علم و فضل کی فضا میں پیدا ہوئے اور تقویٰ و صالحیت کے ماحول میں پرورش پائی۔ اس درجے مرتبۂ کمال کو پہنچے کہ عمق نظر اور فنون گوناگوں میں وسعت فکر میں اپنے اقران و معاصرین سے بازی لے گئے۔ سلاطین و امرائے مملکت سے گہرا ربط و تعلق رکھتے تھے اور وہ انھیں انعام و اکرام اور خلعت فاخرہ سے سرفراز کرتے تھے۔ یہاں تک کہ احمد شاہ نے ہاتھی بھی عطا کیا۔ مغل حکمران احمد شاہ نے ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر انھیں احمد آباد کے منصب قضا پر مامور کیا اور عمر بھر اس عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے۔ بے حد عزیمت و استقامت کے مالک تھے، اسلام کے بارے ان کے جذبات نہایت نازک تھے اور اس ضمن میں بہ درجۂ غایت سخت اور متصلب تھے، اعلائے کلمۃ اللہ میں انتہائی جدوجہد سے کام لیتے تھے۔ دینی معاملات میں کسی قسم کی مداہنت کے قائل نہ تھے۔ اگر کوئی دین سے متعلق معاملہ پیش آ جاتا تو کسی کی پروا نہ کرتے اور مصلحت دنیوی سے بالا ہو کر وہی قدم اٹھاتے جو ان کے نزدیک موافق شریعت ہوتا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ۱۱۶۳ھ/ ۱۷۵۰ء کو شاہ پور میں ہندوؤں نے مسجد کے قریب مندر تعمیر کیا اور نماز کے اوقات میں سنکھ بجانے لگے۔ ظاہر ہے اس سے نماز میں خلل پیدا ہوتا تھا اور مسلمان اس صورت حال سے بڑے پریشان تھے۔ قاضی نظام الدین کو اطلاع پہنچی تو انھوں نے بادشاہ کو بتائے بغیر مندر منہدم کرا دیا۔ بادشاہ دہلی احمد شاہ کو اس کا علم ہوا تو اس نے قاضی موصوف کی غیرت دینی اور پرجوش جذبہ اسلامی پر مسرت کا اظہار کیا اور انھیں خلعت فاخرہ اور ہاتھی عطا فرمایا۔

قاضی نظام الدین احمد آبادی گجراتی، کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں میزان الساعۃ، تفصیل الفصول، قہوہ کے متعلق ایک رسالہ، فضائل علما کے بارے میں ایک رسالہ اور دیگر رسائل شامل ہیں۔ اس عالم و فقیہ نے ۱۲ ذی قعدہ ۱۱۶۵ھ/ ۲۱ ستمبر ۱۷۵۲ء کو احمد آباد میں وفات پائی اور اپنے والد گرامی شیخ نور الدین کی قبر کے قریب مدفون ہوئے [1]۔

۸۶۔ شیخ نعمت اللہ سندھی

شیخ نعمت اللہ بن عبدالجلیل بن رحمت اللہ ٹھٹھوی سندھی کا شمار علاقہ سندھ کے معروف ارباب فضل و صلاح میں ہوتا تھا۔ علوم عربیہ، نحو و فقہ اور اصول وغیرہ کی تعلیم اپنے نانا شیخ ضیاء الدین ٹھٹھوی سے حاصل کی، اور علوم حکمیہ شیخ محمد صادق ٹھٹھوی سے پڑھے۔ عالم شباب ہی میں یعنی بیس سال کی عمر میں بہت سے فضائل علمی سے

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۴۲ - نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۸۵، ۳۸۶۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

متصوف ہو گئے تھے اور درس و افادہ کو اپنا مشغلہ قرار دے لیا تھا۔ تقویٰ، صلاحیت حکمی اور جامعیت علمی میں بہت سے معاصرین سے فوقیت لے گئے تھے۔ حج و زیارت کے لیے حرمین شریفین کے سفر پر روانہ ہوئے اور بندر ''کلفہ'' میں وفات پائی۔ یہ واقعہ ۱۸ ذی قعدہ ۱۱۷۹ھ/ ۲۸ اپریل ۱۷۶۶ء کو پیش آیا۔ تحفۃ الکرام کے مصنف شہیر شیر علی قانع کے استاد تھے ❶۔

۸۷۔ حاجی نعمت اللہ نوشہروی

حاجی نعمت اللہ نوشہروی، پنجاب کے موضع نوشہرہ کے رہنے والے تھے، مسلکاً حنفی تھے۔ اپنے علاقے اور عصر کے فاضل آدمی تھے۔ مولد و منشا کشمیر ہے۔ شیخ امان اللہ شہید کشمیری (شہادت ۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۸ء) کے شاگرد تھے۔ ان سے فقہ اور دیگر علوم مروجہ کی تحصیل کی۔ حدیث و قرأت وغیرہ کی سند بھی انہی سے حاصل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد توکل و عفت اور قناعت کے ساتھ درس و افادہ میں مصروف رہے۔ زہد و عبادت میں یگانہ تھے۔ ۱۱۸۲ھ/ ۱۷۶۸ء میں رحلت فرمائی ❷۔

۸۸۔ قاضی نور الحق گجراتی

قاضی نور الحق بن قاضی عبدالوہاب گجراتی اپنے دور کے مشاہیر فقہا اور نامور علما میں سے تھے۔ بادشاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر نے ۱۰۹۰ھ/ ۱۶۷۹ء میں ان کو منصب قضا پر معمور کیا۔ ۱۱۰۸ھ/ ۱۶۹۷ء میں ان کو اعمال گجرات کے شہر مانڈو کے عہدۂ احتساب پر متعین کیا گیا ❸۔

۸۹۔ مفتی نور الحق دہلوی

مفتی نور الحق بن محب اللہ بن مفتی نور اللہ بن شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ، دیار ہند کے مشہور فقیہ اور ممتاز عالم تھے۔ خاندانی اعتبار سے اونچے مرتبے کے حامل تھے، ذاتی طور پر بھی اپنے وقت کی اہم شخصیت تھے۔ ان کے والد گرامی شیخ محب اللہ دہلوی اپنے آباواجداد کی طرح نامور عالم تھے۔ لائق بیٹے نے انہی سے حصول علم کیا۔ اپنے جد امجد شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ کی فارسی تصنیف ''ماثبت بالسنہ'' کی شرح لکھی ❹۔

---

❶ تحفۃ الکرام ص ۶۸۳، ۶۸۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۸۷۔

❷ حدائق الحنفیہ ص ۴۴۹، ۴۵۰۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۴۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۸۸

❸ مآثر عالم گیری

❹ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۸۹

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۹۰۔ قاضی نورالحق انصاری کرانوی

ہندوستان کے صوبہ یوپی میں ایک جگہ "کرانہ" ہے، جس میں مختلف اوقات میں متعدد علمائے کرام پیدا ہوئے۔ قاضی نورالحق انصاری بھی اسی کرانہ کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کا نام قاضی محمد عاشق انصاری تھا۔ قاضی نورالحق انصاری جلیل القدر عالم تھے۔ فقہائے حنفیہ میں ان کو خاص شہرت حاصل تھی۔ شیخ کمال الدین فتح پوری (جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے) کے والد قاضی محمد عاشق انصاری کے چچازاد بھائی تھے۔ قاضی نورالحق نے انھی سے علم حاصل کی اور نامور علما میں گردانے گئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد بریلی میں نواب سعد اللہ خاں کے مدرسے میں تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ اس زمانے میں نواب سعد اللہ خاں انھیں دوسو روپے ماہانہ دیتا تھا۔ پھر جب ان کے والد قاضی محمد عاشق وفات پا گئے تو واپس "کرانہ" تشریف لے گئے اور وہاں کے عہدۂ قضا پر مامور کیے گئے۔ طویل عرصے تک اس منصب پر فائز رہے۔ بعد ازاں انھیں موضع دیوبند کا قاضی مقرر کیا گیا، دیوبند میں انھوں نے اپنا مکان تعمیر کیا۔ اس کے بعد اپنے آبائی قصبے کرانہ میں بھی مکان بنایا اور لوگوں سے منقطع ہو کہ گوشہ گیری کی زندگی بسر کرنے لگے۔ کئی درسی کتابوں پر تعلیقات لکھیں اور وراثت کے موضوع پر ایک رسالہ تحریر کیا۔ ستر سال سے زائد عمر پا کر ۱۱۸۰ھ/۱۷۶۶ء میں فوت ہوئے ❶۔

۹۱۔ شیخ نورالدین گجراتی

سرزمین ہند کے مشاہیر اساتذہ اور جید علما میں شیخ نورالدین بن شیخ محمد صالح احمد آبادی گجراتی کا اسم گرامی لائق تذکرہ ہے، وہ علم و فضل میں امامت کے درجے پر فائز تھے اور فنون متداولہ میں عمیق نظر رکھتے تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ کے عالم تھے۔ جامع معقول و منقول اور حاوی فروع و اصول تھے۔ ۱۰ جمادی الاولیٰ ۱۰۶۳ھ/ ۲۹ مارچ ۱۶۵۳ء کو احمد آباد میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں حصول علم میں مشغول ہو گئے۔ ان کی والدہ ماجدہ بھی عالمہ و فاضلہ تھیں، اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ لائق بیٹے نے شیخ سعدی کی مشہور فارسی کتاب "گلستان" انھی سے پڑھی اور قابلیت کا یہ عالم تھا کہ سات دن میں پوری کتاب مکمل کر لی۔ اس کے بعد کتب درسیہ کی تحصیل کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ کتابیں مولانا احمد بن سلیمان گجراتی اور مولانا فریدالدین احمد آبادی کے حلقۂ درس میں پڑھیں، حدیث کی تکمیل شیخ محمد بن جعفر حسینی بخاری سے کی، اخذ طریقت بھی انھی سے کیا، فضائل علمیہ میں اس مرتبۂ کمال کو پہنچے کہ کثرت درس و افادہ میں ان کے عہد اور شہر میں کوئی ان کا ہم سر نہ تھا۔ ان کی بے پناہ قابلیت سے متاثر ہو کر گجرات کے صدر محمد اکرم الدین نے (جنھیں شیخ الاسلام خاں کا خطاب ملا تھا، اور جو شیخ ممدوح کے شاگرد اور مرید تھے) احمد آباد میں مدرسہ ہدایت بخش کے نام سے ایک عظیم الشان مدرسہ تعمیر کرایا۔

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۸۹، ۳۹۰ بحوالہ اغصان الانساب۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس مدرسے پر ایک لاکھ چوبیس ہزار روپے صرف ہوئے تھے۔ اس کی تعمیر ۱۱۰۹ھ میں شروع ہوئی اور ۱۱۱۱ھ میں اس کی تکمیل ہوئی۔ طلباء کے مصارف کے لیے خراجی زمین کے کئی دیہات وقف تھے۔

شیخ نورالدین احمد آبادی نہایت عبادت گزار تھے۔ تہجد کے سخت پابند تھے۔ ملوک وسلاطین کی مجلسوں میں بالکل نہیں جاتے تھے اور نہ ان کے تحفے اور ہدیے قبول کرتے۔ ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۱ء میں حرمین شریفین کا قصد فرمایا اور حج وزیارت کا شرف حاصل کیا۔ مراجعت ہند کے بعد پھر خدمت علم میں مصروف ہو گئے۔ باوجود اس کے کہ بڑھاپا چھا گیا تھا اور ضعف وکمزوری نے قبضہ جما لیا تھا، بہ دستور درس وافادہ اور تصنیف وتالیف کا عظیم کام کرتے رہے۔ بہت سی رفیع المرتبت علمی اور تحقیقی کتابوں کے مصنف اور شارح تھے او جوان کی غزارت علم اور وسعت نظر پر دلالت کرتی ہیں۔ ان میں سے چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

تفسیر مختصر علی القرآن المجید۔ التفسیر النورانی للسبع المثانی، التفسیر الربانی: یہ سورہ بقرہ کی تفسیر ہے. حاشیۃ علی اوائل تفسیر بیضاوی، نورالقاری شرح صحیح البخاری، حاشیہ علی الحاشیۃ القدیمہ، حاشیتہ علیٰ شرح المواقف، حل المعاقد لحاشیۃ شرح المقاصد، حاشیۃ علی الشرح المطالع، حاشیۃ تلویح، حاشیہ عضدی، حاشیہ علی المطول، حاشیہ شرح وقایہ، حاشیہ شرح جامی، حاشیۃ المنهل، حاشیہ شمسیہ، حاشیہ تهذیب المنطق۔

اس کے علاوہ الطریق الامم کے نام سے ابن عربی کی فصوص الحکم کی شرح لکھی۔ انھوں نے چھوٹی بڑی ڈیڑھ سو سے زائد کتابیں تصنیف کیں جو دقیق اور اہم مسائل پر مشتمل ہیں۔

شیخ نورالدین احمد آبادی نے منگل کے روز ۹ شعبان ۱۱۵۵ھ/ ۲۸ ستمبر ۱۷۴۲ء کو احمد آباد میں وفات پائی❶۔

۹۲۔ مولانا نورالدین گنت پوری

مولانا نورالدین جعفر گنت پوری ضلع غازی پور کے ایک مقام گنت پور میں پیدا ہوئے، وہیں نشو ونما پائی، اور گنت پوری کہلائے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو جون پور چلے گئے، اس لیے ان کے نام کے ساتھ جون پوری کی نسبت وابستہ ہوگئی۔ وہاں شیخ محمد جمیل جون پوری (متوفی ۶ رجب ۱۱۲۳ھ/ ۹ اگست ۱۷۱۱ء) کا سلسلہ درس جاری تھا، اکثر کتب درسیہ انھی سے پڑھیں، بعض کتابوں کی تکمیل شیخ محمد افضل عباسی الہ آبادی (متوفی ۲۵ ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ/ ۱۲ جنوری ۱۷۱۴ء) سے کی، یہاں تک کہ بحث واشتغال میں درجہ کمال کو پہنچے اور علم و

❶ سبحۃ المرجان ص ۹۴ – تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۴۷، ۲۴۸ – نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۹۰، ۳۹۱ – قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب ص ۲۰۹، ۲۱۰ – حدائق الحنفیہ ص ۴۴۴ – اتحاف النبلاء، ص ۴۲۷، ۴۲۸ – مآثر الکرام ص ۲۱۰ تا ۲۱۲ – ابجد العلوم – ص ۹۱۱ –

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فضل میں خوب ناموری حاصل کی، افتاوتدریس میں ماہر ہوئے، فروع واصول میں ممتاز علما میں شمار کیے گئے۔

مولانا نورالدین گنت پوری جون پوری صالح عالم دین، عابد وزاہد اور کثرت سے تلاوت قرآن کرنے والے اور نوافل کا اہتمام کرنے والے تھے۔۱۱۲۰ھ کو جون پور میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے ❶۔

۹۳۔ شیخ نوراللہ بنارسی

شیخ نوراللہ بن حسین مفتی محمد آبادی بنارسی کا شمار نامور فقہا میں ہوتا تھا، صوفی مزاج فقیہ اور عمدہ اوصاف کے حامل تھے۔ ان کے فرزند شیخ امان اللہ بنارسی (متوفی ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۱ء) جلیل القدر فقیہ اور ممتاز فاضل تھے۔

شیخ نوراللہ نے بنارس میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے ❷۔

۹۴۔ سید نوراللہ بلگرامی

سید نوراللہ بن کرم اللہ حسینی واسطی بلگرامی کا مولد ومنشا بلگرام ہے، ہوش سنبھالا تو حصول علم میں مشغول ہوگئے۔ بعض درسی کتابیں اپنے شہر (جون پور) کے اساتذہ سے پڑھیں، بعد میں دیگر شہروں کا عزم فرمایا۔ اپنے دور کے فقیہ اور عالم گردانے گئے۔ پرہیزگار عالم دین تھے۔ بڑی عمر کو پہنچ کر قرآن مجید حفظ کیا۔ ہمیشہ درس و افادہ میں مصروف رہے۔ ۱۳ شعبان ۱۱۱۳ھ/۲ جنوری ۱۷۰۲ء کو انتقال کیا ❸۔

۹۵۔ مولانا نوراللہ کشمیری

مولانا نوراللہ کشمیری، نور بابا پتلو کے عرف سے معروف تھے۔ وادی کشمیر کے ممتاز فاضل اور شیخ تھے۔ بعض درسی کتابیں ایک کشمیری عالم شیخ عبدالستار سے پڑھیں۔ پھر عازم دہلی ہوئے۔ وہاں شیخ حسام الدین محمد، قاضی مستعد خاں اور قاضی مبارک کے حلقہ ہائے درس جاری تھے، ان میں داخل ہوئے۔ اور مدت تک ان سے کسب علم میں مشغول رہے، یہاں تک علوم میں خوب بہرہ ور ہوئے اور فتویٰ وتدریس کی کامل صلاحیت پیدا ہوگئی۔ مرزا مظہر جان جاناں کی خدمت میں بھی حاضری دی۔ ان سے طریقۂ نقشبندیہ کے مطابق اخذ طریقت کیا۔ بعد ازاں کشمیر کو مراجعت فرمائی اور درس وتدریس کی مسند آراستہ کی۔ فنون متداولہ پر اس قدر عمیق نظر رکھتے تھے کہ خیالی اور مطول پر حواشی تحریر کیے۔ یہ دونوں کتابیں درس میں شامل ہیں اور دقیق مسائل پر محیط ہیں۔ مولانا نوراللہ کشمیری نے ۴ ربیع الاول ۱۱۹۵ھ/ ۲۸ فروری ۱۷۸۱ء کو سفر آخرت اختیار کیا اور کشمیر میں دفن کیے گئے ❹۔

❶ تجلی نور ج ۲ ص ۸۹، ۹۰ - تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۷۴۴ - نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۹۳۔

❷ نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۳۹۳ بحوالہ گنج ارشدی۔

❸ مآثر الکرام ص ۱۰۸ تا ۱۱۰ - تقصار جیود الاحرار ص ۲۱۵، ۲۱۶ - نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۹۳۔

❹ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۴۸ - حدائق الحنفیہ ص ۴۵۳ - نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۹۳، ۳۹۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولوی رحمان علی نے تذکرہ علمائے ہند میں ان کا نام "نور محمد" لکھا ہے جو صحیح نہیں۔ صحیح نام "نور اللہ" ہے۔

۹۶۔ شیخ نور اللہ برہانوی

شیخ نور اللہ صدیقی برہانوی کا مولد و منشا برہانہ ہے جو اس زمانے میں ایک قریہ تھا۔ چھوٹی عمر ہی میں حصول علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ پھر دہلی کا رخ کیا، وہاں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کا ہنگامۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور عرصۂ دراز تک ان سے منسلک رہے، یہاں تک کہ اپنے استاذ گرامی کی زندگی ہی میں کبار علمائے ہند میں شمار ہونے لگے اور حدیث، فقہ اور دیگر علوم میں ماہر تسلیم کیے گئے۔ سلسلۂ درس بھی جاری فرمایا، جس سے متعدد نامور ہندی علما نے استفادہ کیا، ان علما میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے فرزند گرامی قدر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے ان سے کتب فقہ کی تکمیل کی۔ شیخ نور اللہ برہانوی نے اپنی ایک بیٹی بھی شاہ عبدالعزیز صاحب کے عقد میں دے دی تھی۔ شیخ نور اللہ نے ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء کے لگ بھگ رحلت فرمائی ❶۔

۹۷۔ شیخ نور محمد بدایونی

شیخ نور محمد حسینی بدایونی دیار ہند کے علمائے ربانی میں سے تھے اور جلیل القدر فقیہ تھے۔ نقشبندی تھے۔ شیخ محمد حسن دہلوی (متوفی ۱۱۴۷ھ/۱۷۳۵ء) اور شیخ سیف الدین سرہندی (متوفی ۱۰۹۸ھ/۱۶۸۷ء) کی خدمت میں گئے اور ان سے حصول علم کیا۔ طویل عرصے تک ان دونوں علما سے انسلاک اختیار کیے رکھا، اس کے بعد ان پر جذب و استغراق کا غلبہ ہو گیا۔ یہ صورت حال پندرہ سال رہی۔ زہد و ورع میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتے تھے، کسی کے محتاج نہ تھے۔ ان کی عادت تھی کہ کئی دنوں کا کھانا اکٹھا پکا لیتے، پھر جب بھوک بہت غالب آتی تو اس میں سے کھا لیتے۔ اغنیا اور امرا کی دعوت قبول نہ کرتے، نہ ان کے ہاں جاتے۔ قناعت کا یہ عالم تھا کہ دسترخوان پر کبھی دو کھانے جمع نہ کرتے۔ ایک پر اکتفا کرتے، بہت کم اور سادہ کھاتے۔

شیخ نور محمد بدایونی سے مرزا مظہر جان جاناں نے کسب فیض کیا تھا۔ مرزا موصوف فرماتے ہیں کہ شیخ نور محمد قدسی صفات عالم تھے۔ لوگوں کی مدح اور ذم سے ان کا ذہن بالکل خالی تھا، اللہ کی رضا پر راضی رہتے اور اسی کے فیصلے کو آخری اور صحیح فیصلہ قرار دیتے۔

شیخ نور محمد حسینی بدایونی نے ۱۱ ذیقعدہ ۱۱۳۵ھ/۱۲ اگست ۱۷۲۳ء کو دہلی میں وفات پائی ❷۔

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۹۴۔

❷ معمولات مظہریہ ص ۱۸ و ۱۴۱ - نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۹۵۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

و

۹۸۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

برصغیر کی سرزمین فضل و کمال کے لحاظ سے ہمیشہ سرسبز و شاداب رہی ہے۔ اس کی خاک سے بے شمار علما و فضلا پیدا ہوئے، جنھوں نے ہر حال اور ہر دور میں علم کی شمع روشن رکھی اور درس و تدریس کی گہما گہمی میں زندگی بسر کی۔ ان میں متعدد حضرات وہ ہیں جو انفرادی حیثیت سے میدان عمل میں اترے اور لاتعداد لوگوں کو مستفید فرمایا۔ ان کی علمی سرگرمیوں اور روحانی فیض رسانیوں کی تفصیلات تذکرہ و رجال کی کتابوں اور بزرگان دین کے ملفوظات میں موجود ہیں۔

برصغیر کے چند مشہور علمی خاندان:

پھر ایسے کئی خاندان ارض ہند میں نمودار ہوئے جن کے اسلاف و اخلاف کی بھرپور کوششوں سے نہ صرف باشندگان برصغیر نے استفادہ کیا بلکہ پوری علمی دنیا میں ان کی شہرت پھیلی اور تمام عالم اسلام ان سے فیض یاب ہوا۔ ان خاندانوں میں صدیوں تک علم کے چشمے ابلتے رہے اور ہر دور میں وسیع پیمانے پر تشنگان علوم ان کے دروازوں پر حاضری دیتے اور اپنی صلاحیتوں اور فکری استعداد کے مطابق ان سے استفادہ کرتے رہے۔ ان خاندانوں میں برصغیر کے جو خاندان اپنے اوصاف بوقلموں کی بنا پر سب سے نمایاں ہو کر ابھرے، ان میں مندرجہ ذیل چند خاندان بالخصوص قابل ذکر ہیں اور بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر تمام برصغیر کے اہل علم انہی کے حلقۂ تلمذ اور دائرۂ فیض میں شامل ہیں۔

۱۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ (ولادت ۱۴ شوال ۹۷۱ھ۔ وفات ۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ/ ۲۶ مئی ۱۵۶۴ء تا ۳۰ نومبر ۱۶۲۴ء) کا خاندان، جن کا سلسلۂ فیض صدیوں تک جاری رہا اور اس دودمان عالی مقام کے ہر فرد نے خدمت دین میں پشت ہا پشت تک ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس خاندان نے مشرقی پنجاب کے ایک قصبے سرہند میں جنم لیا اور پھر بہت جلد پورے ہندوستان کے فیض یافتگان کے قبلہ گاہ کی حیثیت اختیار کر لی۔ چار سو سال سے مختلف صورتوں میں ان کا سلسلۂ رشد و ہدایت جاری ہے[1]۔

۲۔ رائے بریلی کے حضرت سید علم اللہ کا خاندان، جس کے بہت سے افراد نے فضل و کمال کے مختلف گوشوں میں ناموری حاصل کی۔ اس کے فیض کی وسعتوں نے پورے برصغیر کو گھیر لیا ہے۔ تین سو

[1] مجدد الف ثانی کے حالات کے لیے دیکھیے فقہائے ہند جلد چہارم۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سال سے زائد مدت گزری کہ اس خاندان کے مرد جلیل سید علم اللہ شاہ ❶ (ولادت ۱۲ ربیع الاول ۱۰۳۳ھ۔ وفات ۸ ذی الحجہ ۱۰۹۶ھ/۲۴ دسمبر ۱۶۲۳ء تا ۲۶ اکتوبر ۱۶۸۵ء) نے تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کا علم ایسی ساعت سعید میں اٹھایا اور رائے بریلی سے اپنی پاکیزہ مساعی کا آغاز کیا کہ اب تک یہ سلسلہ جاری ہے اور حضرت سید ممدوح کے اخلاف نے پوری آب و تاب کے ساتھ اس بنیادی اور اہم کام کو جاری رکھا۔ ان سے برصغیر سے باہر کے اہل علم بھی مستفیض ہوئے۔

۳۔ سہالی کے مولانا قطب الدین انصاری سہالوی شہید (ولادت تخمیناً ۱۰۴۰ھ۔ شہادت ۱۹ رجب ۱۱۰۳ھ/۱۶۳۱ء تا ۲۷ مارچ ۱۶۹۲ء) ❷ کا خاندان، جس نے بعد میں فرنگی محل کا قالب اختیار کیا اور پورے برصغیر کو فیض یاب فرمایا۔ اس خاندان کے علمائے مشاہیر فقہائے نام دار نے علم و عمل کے میدان میں جو شان دار خدمات انجام دیں، خطۂ ہند کے اصحاب علم اسے ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ اسی خاندان کے بلند مرتبت عالم مولانا نظام الدین انصاری سہالوی (فرنگی محلی) نے درس نظامیہ کے نام سے ایک نصاب تعلیم مرتب کیا، جو تین سو سال سے پشاور سے لے کر کلکتے تک تمام مدارس عربیہ میں مروج ہے۔ اس خاندان کے علمائے کرام نے خطۂ ہند کے اہل علم پر جو احسان عظیم کیا، اسے علمی تاریخ کے زریں باب کی حیثیت حاصل ہے۔ مولانا نظام الدین انصاری سہالوی کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے۔

۴۔ مولانا محمد یحییٰ عباسی الہ آبادی کا خاندان بھی خدمت علم میں بہت سی خصوصیات کا حامل ہے۔ اس خاندان کے بلند پایہ علما میں سے مولانا محمد فاخر زائر الہ آبادی اور ان کے لائق احترام بھائیوں کے اسمائے گرامی بالخصوص لائق تذکرہ ہیں۔ ان کے حالات و سوانح گزشتہ صفحات سابقہ میں بیان کیے جا چکے ہیں۔

۵۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا خاندان۔ شیخ ممدوح محرم ۹۵۸ھ/فروری ۱۵۵۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے اور ۹۴ سال عمر پا کر ۲۱ ربیع الاول ۱۰۵۲ھ/۹ جون ۱۶۴۲ء کو دہلی ہی میں وفات پائی۔

۶۔ چھٹا خاندان حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کا ہے۔ اس خاندان کے معزز ارکان نے بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری میں جو علمی اور عملی کارنامے انجام دیے، اس میں کوئی ان سے ہم سری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے والد گرامی حضرت شاہ عبدالرحیم دہلوی کے حالات کے ضمن میں ان کے خاندان کے اسلاف کے کوائف ضروری تفصیل سے بیان کیے جا چکے ہیں ❸۔ لیکن آئندہ سطور میں چونکہ اس خاندان ذی مرتبت کے رکن اعظم حضرت شاہ ولی اللہ محدث

❶ سید علم اللہ شاہ بریلوی کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو فقہائے ہند جلد چہارم۔

❷ مولانا قطب الدین انصاری سہالوی کے حالات و سوانح کے لیے دیکھیے فقہائے ہند جلد ششم۔

❸ ملاحظہ ہو فقہائے ہند جلد پنجم۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ مقصود ہے، اس لیے موضوع میں ربط قائم رکھنے کے لیے یہاں بھی اختصار کے ساتھ ان کے اسلاف کا ذکر کیا جاتا ہے۔

شاہ ولی اللہ کے اسلاف:

اس خاندان کے سب سے پہلے بزرگ جو وارد ہند ہوئے، شیخ شمس الدین مفتی تھے۔ اغلب یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے دور آغاز ہی میں وہ یہاں آگئے تھے۔ انھوں نے رہتک کو اپنا مسکن ٹھہرایا جو آزادی سے قبل پنجاب میں واقعہ تھا اور اب ہریانہ میں ہے۔ اس زمانے میں بھی یہ ایک بارونق شہر تھا۔ شیخ ممدوح علوم ظاہری و باطنی کے حامل اور صاحب کشف بزرگ تھے۔ شاہ ولی اللہ ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

وایں بزرگ مردے عالم و عابد بودہ است واول کسے کہ از نژار قریش دراں بلدہ درآمد و بسبب وے شعائر اسلام ظہور نمود وطغیان کفر منطفی شد [1]۔

یعنی شیخ شمس الدین ایک عالم و عابد بزرگ تھے، اور یہ خاندان قریش کے پہلے شخص ہیں جو اس شہر میں آئے اور جن کی وجہ سے اس نواح میں شعائر اسلام کی ترویج ہوئی اور کفر کی طغانیوں کا سلسلہ بند ہوا۔

شیخ شمس الدین نے رہتک میں ایک مدرسہ قائم کیا اور اپنے علم وفضل اور علو مرتبت کی بنا پر اس شہر کے دستور کے مطابق شہر کے مفتی مقرر ہوئے۔ پھر افتا کا یہ سلسلہ ان کے خاندان میں باقاعدہ جاری ہو گیا۔

چنانچہ ان کے بعد ان کے بڑے بیٹے شیخ کمال الدین کو مفتی مقرر کیا گیا، ان کے بعد شیخ عبدالملک، پھر قاضی کبیر الدین، پھر قاضی قاسم اور سب سے آخر میں قاضی قوام الدین عرف قاضی قادن اس عہدۂ بلند پر فائز ہوئے، لیکن جب قاضی قادن کے بیٹے محمود کی باری آئی تو انھوں نے یہ منصب قبول کرنے سے انکار کر دیا، اس لیے کہ انھوں نے سپاہیانہ زندگی اختیار کر لی تھی، مگر اس کے باوجود اس خاندان کے شرف ومجد میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

شیخ محمود کی شادی سونی پت کے سادات میں ہوئی تھی جس سے ان کے بیٹے احمد پیدا ہوئے۔ احمد کو شیخ عبدالغنی بن عبدالحکیم سونی پتی نے اپنی آغوشِ تربیت میں لے لیا تھا، انھوں نے بہترین طریقے سے ان کی تربیت کی۔ بڑے ہو کر شیخ احمد نے رہتک میں قلعے کے باہر ایک وسیع عمارت تعمیر کرائی جس میں اپنے خاندان کے تمام لوگوں کو سکونت کے لیے الگ الگ مکان عطا کیے۔

شیخ احمد کے بیٹے منصور اور پوتے محمد معظم تھے، یہ بھی علم وفضل میں عالی مرتبہ رکھتے تھے لیکن طرز حیات سپاہیانہ تھی، اس لیے عمر بھر جنگ وجدل میں مصروف رہے۔ ان دونوں کی شجاعت ومردانگی کے واقعات شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب ''امداد فی مآثر الاجداد'' میں بیان کیے ہیں۔

شیخ محمد معظم کے فرزند رشید شیخ وجیہ الدین تھے، جو شاہ ولی اللہ کے جد امجد تھے۔ یہ عالم دین اور صاحب

---

[1] امداد فی مآثر الاجداد، ص ۲۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حال بزرگ تھے، اس کے ساتھ ہی ایک بہادر سپاہی بھی تھے۔ ان کی بہادری کے متعدد اہم واقعات کتابوں میں مرقوم ہیں۔ ان میں ایک واقعہ یہ ہے کہ جب کھجوہ کے مقام پر اورنگ زیب عالم گیر اور شجاع کے درمیان معرکہ کارزار گرم ہوا تو شیخ وجیہ الدین اس زمانے میں اورنگ زیب عالم گیر کی کمان میں شجاع کی فوجوں سے برسر پیکار تھے۔ شجاع کی فوج میں کئی مست ہاتھی تھے، جن کے مسلسل اور تیز حملوں سے عالم گیر کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی اور نہایت پریشانی کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس وقت شیخ وجیہ الدین نے بے حد جرأت کا ثبوت دیا۔ وہ بے دھڑک ہو کر سب سے زیادہ شریر اور مست ہاتھی پر ٹوٹ پڑے۔ ہاتھی ان کی طرف تیزی سے لپکا اور انھیں گھوڑے سمیت سونڈ میں لپیٹنا چاہا، لیکن شیخ نے آگے بڑھ کر اتنا زوردار حملہ کیا کہ تلوار سے ہاتھی کی سونڈ کے دو ٹکڑے کر دیے۔ زخمی ہاتھی شدت کرب سے اس قدر بدحواس ہوا کہ بلبلاتا ہوا اپنی فوج پر پلٹ پڑا اور شجاع کی فوج میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ابتری پھیل گئی۔ عالم گیر یہ تماشا خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ شیخ کی اس بے انتہا بہادری پر نہایت خوش ہوا۔ ان کی کمر میں اپنے ہاتھ سے تلوار باندھی جوان کی شجاعت کا بہت بڑا اعتراف تھا۔ اس کے ساتھ ہی منصب میں اضافہ کرنا چاہا، لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور اپنے اسی اعزاز و منصب کو کافی سمجھا جو پہلے سے حاصل تھا۔

پھر جب دکن میں سیواجی مرہٹے کی چیرہ دستیاں حد سے متجاوز ہونے لگیں تو شہنشاہ اورنگ زیب نے شیخ وجیہ الدین ہی کو ایک فوج دے کر اس مہم پر روانہ کیا۔ لیکن برہان پور کے قریب پہنچے تو انھیں بہت سے ڈاکوؤں نے آگھیرا۔ ان سے اتنا شدید تصادم ہوا کہ جام شہادت نوش فرما کر ہمیشہ کی نیند سو گئے۔

شیخ وجیہ الدین کے بیٹے شاہ عبدالرحیم تھے، جو ۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء میں پیدا اور ۷۷ برس کی عمر پا کر ۱۱۳۱ھ میں فوت ہوئے۔ شاہ عبدالرحیم اپنے عہد میں دیار ہند کے بہت بڑے عالم، مفسر، محدث اور فقیہ تھے۔

شاہ ولی اللہ کی ولادت:

شاہ عبدالرحیم کے فرزند رشید حضرت شاہ ولی اللہ تھے۔ شاہ عبدالرحیم عمر کی ساٹھ منزلیں طے کر چکے تھے کہ دوسری شادی کی۔ شاہ ولی اللہ کے سوانح نگاروں اور خود شاہ صاحب نے بھی انفاس العارفین میں لکھا ہے کہ شاہ عبدالرحیم نے دوسری شادی کسی غیبی اشارے کی وجہ سے کی تھی۔ بعض لوگوں نے اس پر اعتراض بھی کیا اور کہا:

دریں عمر کدخدائی مناسب نہ بود ❶۔

(اس عمر میں شادی مناسب نہ تھی۔)

لیکن شاہ عبدالرحیم نے لوگوں کی یہ باتیں سنیں تو فرمایا:

مدتے دراز از عمر من باقیست و فرزندان بوجود خواہند آمد ❷۔

(میری عمر کا طویل حصہ ابھی باقی ہے اور چند لڑکے ابھی اور پیدا ہوں گے۔)

❶ انفاس العارفین ص ۶۳۔

❷ ایضاً ص ۶۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چنانچہ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں کہ اس شادی کے بعد میرے والد (شاہ عبدالرحیم) سترہ ۱۷ سال زندہ رہے اور ان کے دولڑکے تولد ہوئے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی بروز چہار شنبہ، بوقت طلوع شمس، ۴ شوال ۱۱۱۴ھ (۲۱ فروری ۱۷۰۳ء) کو بہ عہد اورنگ زیب عالم گیر پیدا ہوئے۔ شاہ صاحب کی پیدائش سے چار سال بعد عالم گیر نے وفات پائی اور اس کے ساتھ ہی مغل حکومت کے زوال کا آغاز ہو گیا۔ شاہ ولی اللہ کا مولد موضع پھلت ہے، جو ضلع مظفر نگر (یوپی) میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ علمی اعتبار سے اس گاؤں کو بڑی شہرت اور اہمیت حاصل ہے۔

شاہ ولی اللہ نے جس زمانے میں شعور کی دہلیز پر قدم رکھا، اس زمانے کو سیاسی لحاظ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کے عہد زوال سے تعبیر کرنا چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ مذہبی اور علمی اعتبار سے مسلمانوں نے اس عہد میں بے حد ترقی کی منزلیں طے کیں اور اصلاح وتجدید کے رفیع الشان کارنامے انجام دیے۔ چنانچہ جس زمانے میں ہندوستان میں شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے، اسی زمانے میں (۱۱۱۵ھ۔ ۱۷۰۳ء) میں اسلام کے دور جدید کا دوسرا عظیم مصلح اور مجدد ملت شیخ محمد بن عبدالوہاب سرزمین نجد میں ظہور پذیر ہوا۔

شاہ صاحب کا سلسلۂ نسب والد کی طرف سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور والدہ کی جانب سے حضرت موسیٰ کاظم تک پہنچتا ہے۔

تعلیم وتربیت:

شاہ صاحب نے علم وفضل کی گود اور تقویٰ وتصوف کی فضا میں پرورش پائی۔ پانچ سال کی عمر میں پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ ساتویں سال میں قرآن پاک ختم کیا۔ اسی سال میں نماز اور روزے کی پابندی شروع کر دی۔ اسی سال میں فارسی کی کتابیں پڑھنے لگے۔ سال بھر میں یہ سلسلہ بھی ختم کر دیا۔ اس کے بعد صرف ونحو کی کتابوں کا آغاز کیا۔ دس برس کی عمر میں شرح جامی پڑھ ڈالی اور پھر منقولات میں جا پہنچے۔ بعد ازاں اپنے والد بزرگ وار حضرت شاہ عبدالرحیم سے مندرجہ ذیل کتابیں پڑھیں۔

علم حدیث میں مشکوٰۃ پڑھی، لیکن کتاب البیوع سے کتاب الادب تک کا حصہ چھوڑ دیا۔ اجازہ پوری کتاب کا حاصل ہو گیا۔ صحیح بخاری کتاب الطہارت تک، شمائل النبی پوری کا سماع کیا، قرأت بعض ساتھیوں نے کی، علم تفسیر میں کچھ حصہ بیضاوی کا اور کچھ حصہ تفسیر مدارک کا پڑھا۔ قرآن مجید، اس کے معانی اور شان نزول کو اچھی طرح سمجھ کر پڑھا۔ اس اثنا میں کتب تفسیر کی طرف رجوع کیا، جس سے بہت سے تفسیری فوائد حاصل ہوئے۔

علم فقہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ (تھوڑے سے حصے کے سوا) دونوں کتابیں پڑھیں۔ اصول فقہ میں

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حسامی اور توضیح تلویح کا کچھ حصہ پڑھا۔ منطق میں شرح شمسیہ مکمل کی اور شرح مطالع کا کچھ حصہ پڑھا۔ کلام میں شرح عقائد، خیالی کا کچھ حصہ اور شرح مواقف کا کچھ حصہ۔ سلوک میں عوارف کا کچھ حصہ اور کچھ رسائل نقشبندیہ وغیرہ۔ حقائق میں شرح رباعیات مولانا جامی اور لوائح، مقدمہ شرح لمعات۔ مقدمہ نقد النصوص۔ خواص اسماو آیات میں اپنے والد گرامی شاہ عبدالرحیم کا خاص مجموعہ، جس کی انھوں نے چند مرتبہ اجازت دی۔ طب میں موجز القانون، حکمت میں شرح ہدایت الحکمت وغیرہ۔ نحو میں کافیہ وشرح جامی، معانی میں مطول اور مختصر معانی پڑھیں۔ ہندسہ وحساب میں بعض مختصر رسالے مکمل کیے۔

حصول علم کی اس مدت میں ہر فن کے بارے میں بہت سی اونچی باتیں شاہ ولی اللہ کے ذہن میں گردش کرتی تھیں، جنھیں وہ ''سخنان بلند'' سے تعبیر کرتے ہیں، اور جتنی کوشش کرتے تھے، اس سے زیادہ مقصد حاصل ہوتا تھا۔

شادی:

شاہ صاحب چودھویں سال کی عمر کو پہنچے تو شادی ہوگئی، شادی کے لیے شاہ عبدالرحیم بہت عجلت فرما رہے تھے۔ سسرال والوں نے شادی کے ضروری اسباب مہیا ہونے کا عذر کیا تو شاہ عبدالرحیم نے ان کو لکھا کہ اس کی پروا نہیں۔ شادی جلد ہونی چاہیے اور اس ''جلدی'' میں ایک راز پنہاں ہے۔ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں کہ ''یہ راز شادی کے بہت جلد بعد ظاہر ہوگیا۔ شادی پر ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ میری بیوی کی والدہ وفات پاگئیں، اس کے جلد ہی بعد میری بیوی کے نانا اور اس کے چند ہی دن بعد شیخ فخر العالم، فقیر کے عم محترم شیخ ابوالرضا کے بیٹے فوت ہوگئے۔ بعدازاں اس فقیر کے بڑے بھائی شیخ صلاح الدین کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔''

شاہ ولی اللہ اس سے آگے افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں:

''اس کے فوراً بعد میرے والد بزرگ وار پر بہت ہی ضعف اور نقاہت کا غلبہ ہوگیا اور مختلف عوارض نے ان کو آ گھیرا۔ اس کے بعد ان کی وفات کا حادثہ پیش آگیا۔ غرض بزرگوں کی یہ جماعت منتشر ہوگئی اور سب کو معلوم ہوگیا کہ اگر اس زمانے میں شادی نہ ہوتی تو پھر کئی سال تک اس کا امکان نہ تھا۔''

بیعت وخلافت:

شاہ ولی اللہ پندرہ سال کے ہوئے تو والد بزرگ وار نے ان کی تربیت روحانی کی طرف توجہ مبذول فرمائی اور اپنے حلقۂ بیعت میں داخل کیا۔ سترہ سال کے ہوئے تو اپنا خلیفہ مقرر فرما لیا اور بیعت وارشاد کی اجازت مرحمت کی۔ بیعت وارشاد کی اجازت دیتے ہوئے انھوں نے ''یـده كيدي'' کہا، یعنی ولی اللہ کا ہاتھ میرے ہاتھ کی طرح ہے۔ اسی سال انھوں نے انتقال کیا۔ والد کی رحلت کے بعد شاہ صاحب نے مسند علم و

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ارشاد کو زینت بخشی اور ان کی جگہ درس و تدریس اور وعظ و ارشاد میں مشغول ہو گئے۔ کم و بیش بارہ برس کتب دینیہ وعقلیہ کا درس دیتے رہے۔ اس اثنا میں شاہ صاحب نے ہر علم میں مہارت حاصل کی اور ہر فن میں درجۂ کمال کو پہنچے۔ ان پر توحید الٰہی کے راز کھلے، جذب کی راہیں کشادہ ہوئیں، معرفت و سلوک کی بہت بڑی دولت میسر آئی اور علوم وجدانیہ کی نعمت سے مالا مال ہوئے۔

فرماتے ہیں، میں نے مذاہب اربعہ کی کتابیں پڑھیں، ان کے اصول فقہ کو مرکز التفات ٹھہرایا اور جن احادیث سے وہ تمسک کرتے ہیں ان پر غور کیا۔ ان کے گہرے مطالعہ و ملاحظہ کے بعد، وہی اسلوب و انداز میرے لیے قابل عمل اور لائق پذیرائی قرار پایا جو فقہائے محدثین کا تھا۔

قصد حجاز:

شاہ ولی اللہ صاحب بارہ سال اپنے والد محترم شاہ عبدالرحیم کی مسند دعوت و ارشاد پر فائز رہے۔ اس کے بعد دل میں سفر حجاز کا داعیہ ابھرا، اور ۱۱۴۳ھ/ ۱۷۳۱ء کے آخر میں حج بیت اللہ کی نعمت سے مشرف ہوئے۔ ۱۱۴۴ھ/ ۱۷۳۲ء میں مکہ معظمہ میں مقیم رہے۔ اس کے بعد مدینہ منورہ گئے اور شیخ ابوطاہر اور مشائخ حرمین سے روایت حدیث کی سعادت حاصل کی۔ شیخ ابوطاہر سے علم حدیث لی، اس سے قبل ہندوستان میں علم حدیث کی تعلیم مولانا محمد افضل سیالکوٹی سے حاصل کی تھی۔ مشائخ حرمین سے دلچسپ صحبتیں رہیں اور خوب استفادہ کیا۔ ۱۱۴۴ھ/ ۱۷۳۲ء میں بھی شرف حج سے مشرف ہوئے۔ یعنی دو حج کیے۔

شاہ صاحب کے قلب صافی میں علم حدیث سے جو زیادہ رغبت پیدا ہوئی، اس کی بنیادی وجہ علمائے حجاز سے شرف تلمذ ہے۔ ان کی صحبت و تلمذ سے ذہن کی صلاحیتیں اجاگر ہوئیں اور فکر و عمل کی دنیا بالکل بدل گئی۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ خاندان ولی اللہی کے اکابر کے ذہن پر وحدت الوجود کا تصور نمایاں تھا۔ خود شاہ صاحب پر بھی اس کا اثر تھا، لیکن مشائخ حجاز کی صحبت و رفاقت سے اس کے اثرات زائل ہو گئے۔ بالخصوص شیخ ابوطاہر سے جو مسلکاً شافعی تھے، شاہ صاحب بہت متاثر ہوئے۔

جس زمانے میں ارض ہند کے شاہ ولی اللہ مدینہ منورہ میں طلب علم میں مشغول تھے، اسی زمانے میں سرزمین نجد کے شیخ محمد بن عبدالوہاب مدینہ طیبہ کے مختلف جید اساتذہ سے تحصیل علم میں مصروف تھے۔ یعنی مستقبل کے یہ دونوں مجدد اور عظیم مصلح ایک ہی عہد میں دیار حبیب (ﷺ) میں علمی اور روحانی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ان دونوں مجددین ملت کو ایک ہی قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ نجد اور ہندوستان کی علمی، عملی، دینی اور سیاسی فضا بہت حد تک ایک سی تھی۔ اس لیے دونوں نے اپنے اپنے حالات کے مطابق ایک ہی انداز سے اپنی تجدیدی مساعی کا آغاز کیا اور ایک ہی اسلوب سے اپنے کام کی رفتار کو آگے بڑھایا۔ پھر دونوں کو اپنی تبلیغی تگ و تاز کے سلسلے میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، وہ بھی ایک ہی قسم کی تھیں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مراجعت وطن:

جس زمانے میں شاہ صاحب حجاز مقدس کو روانہ ہوئے تھے، اس زمانے میں ہندوستان کی سیاسی حالت نہایت ابتر تھی اور مرہٹوں کی طاقت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ اسی وجہ سے ہندوستان کے بعض حضرات نے شاہ صاحب کو یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ عرب ہی میں اقامت گزین ہو جائیں۔ لیکن آپ نے مشائخ حجاز سے مستفید ہونے کے بعد واپس ہندوستان آنے کو ترجیح دی اور تبلیغ و اشاعت دین کے لیے اپنے آبائی وطن کو منتخب کیا۔

شاہ صاحب نے جب مراجعت وطن کی تیاری فرمائی تو اپنے ایک نامور استاد شیخ ابوطاہر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور الوداعی سلام عرض کیا۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ میں اس وقت کو کبھی نہیں بھول سکتا، جب میری روانگی کا زمانہ قریب آیا اور جدائی کی گھڑی سر پر آ کھڑی ہوئی اور میں نے الوداعی ملاقات اور رخصتی سلام کے دوران یہ شعر پڑھا تو عجیب سماں پیدا ہو گیا:

نسيت كل طريق كنت اعرفه الا طريقا يؤدينى الىٰ ربعكم

یعنی میں سوائے اس راستے کے جو مجھے تیرے گھر تک پہنچا دے، ان تمام راستوں کو بھول گیا ہوں، جن سے میں اس سے پہلے آشنا تھا۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں، یہ شعر سنتے ہی شیخ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور شدت تاثر سے دونوں رخسار سرخ ہو گئے۔ یہاں تک کہ وفور گریہ سے ان کا گلا رندھ گیا۔ اس کے بعد انھوں نے انتہائی خلوص کے ساتھ اس عاجز کے لیے دعائے خیر کی۔

شیخ ابوطاہر اپنے تلمیذ رشید شاہ ولی اللہ کے فہم و ادراک کے انتہائی مداح تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ولی اللہ مجھ سے الفاظ کی سند لیتے ہیں اور میں ان سے معانی کی سند لیتا ہوں۔

شاہ صاحب بروز جمعہ ۱۴ رجب ۱۱۴۵ھ (۹ جولائی ۱۷۳۲ء) کو اپنے وطن دہلی واپس پہنچے۔

شاہ صاحب کا زمانہ:

شاہ ولی اللہ کی ولادت ایسے وقت میں ہوئی تھی، جب سلطنت مغلیہ اپنے عروج کی آخری منزل میں پہنچ گئی تھی اور صرف چار سال بعد یعنی اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے ساتھ ہی اس کا آفتاب اقبال زوال پذیر ہونے لگا تھا۔

شاہ ولی اللہ ۴ شوال ۱۱۱۴ھ (۲۱ فروری ۱۷۰۳ء) کو پیدا ہوئے اور عالم گیر نے ۲۸ ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ (۲۱ فروری ۱۷۰۷ء) کو وفات پائی۔ اس حساب سے شاہ صاحب کی ولادت عہد عالم گیری کے آخری زمانے میں ہوئی، یعنی اورنگ زیب عالم گیر کی وفات سے چار سال پہلے شاہ صاحب نے اس عالم ناسوت میں قدم رکھا اور

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کا کاروانِ حیات دس بادشاہوں کے عہد سے گزرا۔ وہ بادشاہ بہ ترتیب حکمرانی حسب ذیل ہیں:

۱۔ اورنگ زیب عالم گیر۔ (۲) محمد معظم شاہ عالم بہادر شاہ اول۔ (۳) معزالدین جہاں دار شاہ۔ (۴) فرخ سیر۔ (۵) رفیع الدرجات (۶) رفیع الدولہ (۷) محمد شاہ المعروف رنگیلا۔ (۸) ابراہیم شاہ صرف ایک ماہ آٹھ دن حکومت کی۔ (۹) ابوالنصر احمد شاہ عالم گیر ثانی۔ اور (۱۰) شاہ عالم۔

اس طویل عہد میں ہندوستان میں جو ہیبت ناک واقعات اور خون ریز حوادث رونما ہوئے، وہ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے انتہائی ذہنی اذیت اور قلبی کوفت کا باعث ہیں۔ اس مدت میں پورا ملک مختلف فتنوں اور مسلسل صدموں کی خوف ناک لہروں کی زد میں رہا۔ مرہٹوں کی بے پناہ سرکشی، سکھوں کے خون ریز مظالم، نادر شاہ کے قتل عام، سادات بارہ کے تسلط، ان کے ہاتھوں فرخ سیر کی گرفتاری اور پھر انتہائی بے کسی کی موت، ہندوستان کی سیاست میں روہیلوں کی شرکت، دربار شاہی کے ایرانی اور تورانی امرا کی باہمی کش مکش، ارض ہند پر احمد شاہ ابدالی کے مسلسل حملے، مغربی طاقتوں کی بتدریج ملکی سیاسیات میں مداخلت، بنگال میں انگریزوں کا اقتدار اور مدراس کے بعض علاقوں پر اس کی حکومت کا قیام۔ یہ ایسے واقعات تھے جو تقریباً سب کے سب شاہ ولی اللہ کی نظروں کے سامنے ظہور میں آئے۔ شاہ صاحب ان سے بہ درجۂ غایت متاثر اور بے حد مغموم ہوئے۔ اس تاثر اور غم واندوہ کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ شاہ صاحب جس خاندان سے تعلق رکھتے تھے، وہ ابتدا ہی سے انتہائی حساس تھا اور اس کے تمام افراد مسلمانوں کی مشکلات سے بے حد اذیت محسوس کرتے تھے۔ شاہ صاحب کے والد گرامی شاہ عبدالرحیم بھی ان حوادث سے سخت ملول تھے۔ چنانچہ جب انھوں نے دیکھا کہ ملک کو مختلف مصائب کے ہجوم نے ہر طرف سے گھیر لیا ہے تو سلطنت آصفیہ کے بانی نظام الملک آصف جاہ کو ایک دردناک خط لکھا اور حکومت اسلامی کے تحفظ کے لیے میدان جہاد میں اترنے کی تلقین، فرمائی۔ تلقین جہاد کے سلسلے میں تاریخی نوعیت کا یہ خط شاہ عبدالرحیم نے اورنگ زیب عالم گیر کی وفات سے دس بارہ سال بعد تحریر کیا تھا۔ غالباً وہ محمد شاہ کا ابتدائی عہد حکومت تھا۔ اصل خط فارسی میں ہے، اس کا اردو ترجمہ یہ ہے:

بہ جانب وزیر الممالک آصف جاہ در تحریص جہاد تحریر یافت:

یعنی وزیر الممالک آصف جاہ کی طرف جہاد کا شوق دلانے کے لیے تحریر کیا گیا۔

”اس فقیر کے دل پر یہ بات منکشف ہوئی ہے کہ عالم ملکوت میں اس امر کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ کفار ذلت وخواری سے دوچار ہوں اور اس سے کچھ عرصہ بعد باغیوں کا گروہ رسوائی اور خرابی میں مبتلا ہو۔ اگر شوکت مآب اور صاحب شہامت (آصف جاہ) ان گمراہ لوگوں کی مخالفت میں کمر ہمت باندھ لیں تو یہ تمام کارنامے آپ کی طرف منسوب ہوں گے، تمام عالم آپ کا مطیع ہوگا اور یہ کوشش اللہ کے دین کی ترویج اور آپ کی حکومت کے استحکام کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

اس سلسلے میں تھوڑی سی جہد وجہد بھی بہت بڑے فائدے کا باعث ہوگی۔ یاد رہے، اگر آپ (کفار

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو زیر کرنے کے لیے) کوشاں نہ ہوں، تب بھی وہ حوادث سماوی سے ہلاک اور کمزور ہو جائیں گے، لیکن اس صورت میں اسے آپ کے کارنامے میں شمار نہ کیا جائے گا:

کار زلف تست مشک افشانی و اما عاشقاں
مصلحت راتہمتے برآہوئے چنیں بستہ اند

چونکہ یہ بات یقینی طور پر معلوم تھی، اس لیے بے اختیار آں عزیز کو خط لکھا گیا۔ وقت کو غنیمت جانیں اور جہاد کے معاملے میں ہرگز سستی یا دیر نہ کریں۔ عنقریب سب چیزیں واضح ہو جائیں گی۔ چونکہ مجھے ایک ضروری چیز کا اظہار مقصود تھا اور دوستی اور خیر خواہی کا جذبہ دامن گیر ہو کر اس کے لیے مجبور کرتا تھا، لہٰذا مبالغے سے احتراز کیا گیا ہے، اس سے زیادہ وضاحت سے لکھنا ممکن نہ تھا۔

گوئے توفیق و کرامت درمیاں افگندہ اند
کس بمیداں درنمے آید سواراں راچہ شد

اس کے بعد یعنی خط کے بالکل آخر میں شاہ عبدالرحیم تحریر فرماتے ہیں:

سخنے کہ بامحرمان خود در پردہ ادامی کردیم ایں جا بے پردہ نوشتہ شد، تاعذر نماند۔ والسلام والاکرام۔

''یعنی وہ باتیں جو محرموں سے بھی راز میں کہی جاتی ہیں، یہاں بے حجاب نوک قلم پر آئی ہیں تاکہ کوئی عذر باقی نہ رہے۔''

شاہ ولی اللہ نے بھی اپنے والد گرامی کے اس نہج تبلیغ کو جاری رکھا کہ جن امرا و حکام نے تنفیذ اسلام کے لیے کوششیں کیں، ان کی حوصلہ افزائی کی اور جو لوگ اسلامی حکومت کو مستحکم بنانے کے لیے میدان عمل میں نمودار ہوئے، ان کی پوری مدد کی۔ ان میں ایک پائندہ خاں روہیلہ ہے، جو مشرقی ہند کے پہاڑی علاقے میں کفار سے برسر پیکار اور نصرت اسلام کے لیے مصروف تگ و تاز تھا۔ شاہ صاحب اس کو ''عزیز القدر، رفعت مآب، المجاہد فی سبیل اللہ، الرافع لکلمۃ اللہ پائندہ خاں سلمہ اللہ تعالیٰ'' کے پروقار الفاظ سے خطاب کرتے ہیں۔ خود اپنا اسم گرامی انکسار کے ساتھ ''از فقیر ولی اللہ عفی عنہ'' تحریر کرتے ہیں۔ ان کے لیے پائندہ خاں روہیلہ کا ''جہاد کوہستان موجب فرح وخوشی وسبب دعا بہ مظہر الغیب'' ہوا۔ اس کی اس ''سعی'' سے وہ نہایت خوش ہیں اور ان الفاظ کے ساتھ دعا کرتے ہیں:

اللھم انصر من نصر دین محمد ﷺ

دوسرا خط شاہ صاحب کی طرف سے (از فقیر ولی اللہ عفی عنہ) سہارن پور کے فوجدار خاں زمان خاں کے نام رقم فرمایا گیا۔ یہ امیر بھی کفار سے برسر پیکار ہے۔ اور حمایت اسلام کے لیے میدان جنگ میں نکلا ہے۔ لہٰذا شاہ صاحب دعا کرتے ہیں کہ:

الله تبارك و تعالىٰ مجدد قانون شجاعت ودلاوری ، خاں عوالی ـــــــ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مرتبت خاں زمان خاں جیو را مدت مدید در ردِّ مکاید طاغیان کفر از بیضۂ اہل اسلام منصور و مظفر دارد۔

یعنی خدا تبارک وتعالیٰ مجدد قانون شجاعت و دلاوری خان عالی مرتبت خاں زمان خاں جیو کو مدت مدید تک اہل کفر کی مخالفت میں کامیاب و کامران رکھے۔

اوصاف گوناگوں:

شاہ ولی اللہ، اوصاف گوناگوں کے حامل اور خصوصیات بوقلموں کے مالک تھے۔ انھوں نے اس وقت شعور کی آنکھیں کھولیں جب ہندوستان کی سلطنت مغلیہ کا آفتاب لب بام آ چکا تھا، قدیم مسلم معاشرہ ختم ہو رہا تھا، اور پرانا سیاسی نظام جو کم و بیش دو سو سال سے مغل حکمرانوں کے لیے مضبوط بنیاد کی حیثیت رکھتا تھا، انہدام پذیر ہو چکا تھا، ہر شعبۂ حیات میں زوال اور ہر گوشۂ زندگی میں انحطاط کے اثرات نہایت تیزی کے ساتھ پھیل رہے تھے۔ دینی حالت اور اخلاقی اقدار میں کوئی استحکام نہ رہا تھا۔ ہر طرف طوائف الملوکی، ابتری اور بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ دہلی کی وہ عظمت جو شاہ جہان اور عالم گیر کے دور حکومت کا طرۂ امتیاز تھی، خاک میں مل چکی تھی۔ ایسے وقت میں شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے اور اور تنہا ایک شخص نے وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیے کہ پوری ایک جماعت بھی نہیں دے سکتی[1]۔

شاہ ولی اللہ صاحب کو اللہ نے بے شمار کمالات سے نوازا تھا۔ تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، کلام، منطق، فلسفہ، تاریخ، سیاست، اقتصادیات، معاشیات، ہر موضوع پر ان کی گہری نظر تھی۔ انھوں نے اسلام اور فلسفہ اسلام کو جس مربوط شکل میں پیش کیا اور جس اسلوب میں اس کے تمام گوشوں کو نکھارا اور واضح فرمایا ہے، اس میں کوئی ان کا حریف نہیں، انھوں نے جس نہج سے مختلف پیش آمدہ مسائل پر بحث کی ہے، وہ انہی کا حصہ ہے۔ موضوع کی وضاحت میں وہ جو دلائل پیش کرتے ہیں اور جس زور بیان اور منطقی تسلسل سے بات کو آگے بڑھاتے ہیں، اس میں کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

تصانیف:

مصنف کی حیثیت سے شاہ ولی اللہ صاحب کا درجہ بہت بلند ہے اور ان کا شمار معمورۂ ارض کے جلیل

[1] ان تینوں خطوط (یعنی شاہ عبدالرحیم کے خط آصفیہ خاندان کے بانی نظام الملک آصف جاہ کے نام اور شاہ ولی اللہ کے دونوں خطوط، بنام پائندہ خان روہیلہ اور فوجدار خان زمان خاں) کا ذکر شیخ محمد اکرام نے کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ خط ابھی تک شائع نہیں ہوئے، اور کتب خانہ جامعہ عثمانیہ (حیدر آباد دکن) کے ایک قلمی مجموعے میں درج ہیں۔ دیکھیے رود کوثر ص ۵۴۵ تا ۵۴۷۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

القدر مصنفین میں ہوتا ہے۔ انھوں نے جو بیش قیمت علمی ترکہ تصانیف کی صورت میں اپنے پیچھے چھوڑا ہے، وہ ایک قوم یا ایک اقلیم کی میراث نہیں، بلکہ بجا طور پر پوری ملت اسلامیہ اور پورے عالم اسلام کا سرمایۂ افتخار ہے۔ ان کی تصانیف کی عظمت کا راز، صرف کثرت ہی میں پوشیدہ نہیں، بلکہ موضوع کا تنوع، کتابوں کی مقبولیت و ترویج، مضامین کے اشکال اور پیچیدگی کی عقدہ کشائی، دقیق سے دقیق مسائل کا حکیمانہ پیرائیہ بیان میں اظہار، کتابوں کی ضخامت، خیالات کا عمق، افکار کی گہرائی، الفاظ میں اختصار اور مطالب میں وسعت، یہ وہ اوصاف ہیں، جو ان کی تصانیف کو دیگر مصنفین کی تصانیف سے امتیاز بخشتے ہیں۔

ایسے مصنفین کی تعداد بہت کم ہوگی جن کی تصانیف میں کسی نہ کسی نہج سے ان کے دور کی عکاسی نہ ہوتی ہو اور ان کے حالات وظروف کی جھلک نہ پائی جاتی ہو، یا کسی حد تک اس زمان ومکان کی نشان دہی نہ ہوتی ہو، جس میں وہ زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ لیکن شاہ ولی اللہ کی تصانیف بالعموم زمان ومکان کی قید سے مبرا اور اپنے وقت ودور کے شکوہ وشکایت سے پاک ہیں۔ ان کی بعض تصانیف کے چند مقامات کو چھوڑ کر یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ کتابیں اس دور میں معرض تحریر میں لائی گئی ہیں، جب اس ملک کا امن وسکون غارت ہو گیا تھا اور ارض ہند میں خانہ جنگی، سیاسی بدامنی اور شوروشر کا دور دورہ تھا۔ دہلی کی سیاسی مرکزیت ختم ہو چکی تھی اور اس کا احترام خاک میں مل گیا تھا۔ ایک طرف سکھ اودھم مچا رہے تھے، دوسری طرف مرہٹوں نے ہنگامۂ بغاوت بپا کر رکھا تھا۔ تیسری طرف جاٹ یلغار کر رہے تھے اور چوتھی طرف روہیلے خودسری پر اتر آئے تھے۔ ان اندرونی سرکش عناصر کے علاوہ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی جن کا شمار اس دور کے مشہور سپاہ سالاروں میں ہوتا تھا، خیبر کے دروازے پر مسلح ہو کر کھڑے تھے، جب جی چاہتا ہندوستان کی سرزمین میں گھس آتے اور پھر اپنی مرضی سے واپس جاتے، کسی کو ان کے سامنے نظر اٹھانے کی جرأت اور ان سے مقابلے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔ اس اثنا میں دہلی کو بار بار لوٹ مار کا نشانہ بنایا گیا اور اس کے سیاسی ومرکزی وقار کو پامال کیا گیا۔ لیکن قربان جایئے دہلی کے اس تاج دار علم اور علم بردارِ تحقیق کے کہ یہ سب تماشہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتا رہا، اور وہ کامل امن واطمینان کا پیکر بنا رہا۔ نہ دل میں اضطراب، نہ روح میں اضمحلال، نہ افکار میں انتشار، نہ قلم میں اضطرار، نہ زبان پر زمانے کی ستم رانیوں کا شکوہ، نہ لبوں سے حرف شکایت کا اظہار۔ ان کی تصانیف بوقلموں مضامین کا احاطہ کیے ہوئے ہیں، مگر یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ بارھویں صدی ہجری کے پرفتن اور پُرآشوب زمانے میں لکھی گئی ہیں۔ ہر موضوع پر پورے اطمینان سے اظہار خیال کیا گیا ہے اور ہر مسئلے کو کامل دلجمعی سے بیان کیا گیا ہے۔ نہ آسمان کی ہیبت ناک بجلیاں ان کے افکار کی روانی کو روک سکیں اور نہ زمین کی خوف ناک آندھیاں ان کے خیالات کے تسلسل میں خلل انداز ہو سکیں۔ فہم وفراست کی جو دولت اللہ نے ان کو بخشی تھی، مصائب و مشکلات کا سخت سے سخت ریلا بھی اس میں کسی نوع کی کمی نہ کر سکا۔ انھوں نے زمان ومکان کی گردشوں کی کبھی پروا نہیں کی اور اپنے قول وعمل سے ثابت کر دکھایا کہ اصحاب تسلیم ورضا کا منصب کتنا بلند اور اربابِ علم واہل حق

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی شان کتنی اونچی ہے۔

شاہ صاحب کی تصانیف کیفیت وکمیت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کی وفات کے وقت رائے بریلی کے ایک بزرگ سید محمد نعمان حسنی دہلی میں موجود تھے اور شاہ صاحب کے پاس تھے۔ انھوں نے رائے بریلی ہی کے ایک دوسرے بزرگ سید ابوسعید حسنی (متوفی ۹ رمضان المبارک ۱۱۹۳ھ/ ۹ ستمبر ۱۷۸۱ء) کے نام ایک مکتوب ارسال کیا تھا، جس میں شاہ صاحب کے اوصاف وکمالات، علم وفضل، تدین وتقویٰ، آخری علالت اور وفات کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ یہ مکتوب فارسی زبان میں ہے اور غیر مطبوعہ شکل میں ندوۃ العلما (لکھنؤ) کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس مکتوب میں انھوں نے شاہ صاحب کی تصانیف کی تعداد نوے (۹۰) بلکہ اس سے بھی زیادہ بتائی ہے۔ اس ضمن میں مکتوب نگار سید محمد نعمان حسینی کے الفاظ لائق ملاحظہ ہیں:

> صاحب من! ظاہر صحبت ایشاں روباستتار کشیدہ، تصانیف آنحضرت نود بل زیادہ، در علوم دین، از تفسیر واصول وفقہ وکلام وحدیث مثل حجۃ اللہ البالغہ واسرار فقہ ومنصور وازالۃ الخفاء عن الخلفاء، وترجمہ قرآن کہ ہر واحد قریب بہ ہشتاد ونود جز کلاں بہ حجم خواہد بود، ودیگر رسائل در حقائق ومعارف مثل الطاف القدس وہمعات وفیوض الحرمین وانفاس العارفین وغیرہم کہ نشان از صحبت وبرکت خدمت می دہند، می باید کہ عزیمت برایں آرند کہ ہمہ را نویسانیدہ رائج نمایند، باندک توجہات سرانجام خواہد یافت، ومثل ایں تصانیف واللہ اعلم دراسلام تصنیف شدہ باشد یانہ۔
>
> (صاحب من! حضرت (شاہ صاحب رحمۃ اللہ) کی ظاہری صحبت تو اب میسر نہیں آ سکتی۔ البتہ علوم دینیہ میں ان کی تصانیف نوے (۹۰) کے قریب بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں، جو تفسیر، اصول، فقہ، کلام اور حدیث سے متعلق ہیں۔ جیسے حجۃ اللہ البالغہ، اسرار فقہ، منصور، ازالۃ الخفاء عن الخلفاء اور ترجمۂ قرآن۔ ان میں سے ہر کتاب کافی بڑی ضخامت پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں دیگر رسائل ہیں، جو حقائق ومعارف پر محیط ہیں، جیسے الطاف القدس، ہمعات، فیوض الحرمین اور انفاس العارفین وغیرہ۔ یہ کتابیں حضرت شاہ صاحب کے فیوض وبرکات کی نشان دہی کرتی ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ ان تمام کتابوں کو لکھوا کر رائج کرنے کا عزم فرمائیں۔ یہ کام تھوڑی سی توجہ سے انجام پا سکتا ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اسلام کے گزشتہ دور میں اس قسم کی کتابیں معرض تصنیف میں آئی ہیں یا نہیں۔)

شاہ صاحب کی ان رفیع الشان تصانیف کا مختصر سا تعارف مندرجہ ذیل سطور میں کرایا جاتا ہے:

۱۔ فتح الرحمٰن: برصغیر پاک وہند میں قرآن مجید کا ترجمہ سب سے پہلے کس زبان میں ہوا، اور کس عالم دین نے کس زمانے میں کیا، یہ ایک نہایت اہم سوال اور تحقیق طلب موضوع ہے۔ واقعات کی ترتیب سے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا سب سے پہلا ترجمہ سندھی زبان میں ہوا❶۔ مغل حکمران جہاں گیر نے بھی (جس کا انتقال ۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ) ۲۹ راکتوبر ۱۶۲۷ء کو ہوا، گجرات (کاٹھیاواڑ) کے ایک عالم دین شیخ محمد بن جلال حسینی گجراتی کو قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کرنے پر مامور کیا تھا، اور کہا تھا کہ ترجمہ لفظی ہو، اور الفاظ قرآن سے ایک حرف بھی زائد نہ ہو۔ نیز تاکید کی تھی کہ ترجمہ آسان اور عام فہم ہونا چاہیے۔ الفاظ اور زبان میں کسی قسم کا تکلف اور تصنع ہرگز نہ ہو❷۔

معلوم نہیں یہ ترجمہ مکمل ہوا یا نہیں ہوا، یا اب کہیں موجود ہے یا نہیں ہے۔ اگر یہ ترجمہ تکمیل کے مراحل سے گزر گیا، یا کسی حد تک بھی ہو چکا تو غالباً قرآن مجید کا یہ پہلا ترجمہ ہے جو برصغیر کے ایک عالم نے فارسی زبان میں کیا، یا اس ملک کے ایک حکمران نے ایک عالم دین کو اس اہم خدمت پر مامور کیا۔ ایک روایت کے مطابق یہ ترجمہ مکمل ہو گیا تھا اور جے پور (ہندوستان) کے ایک بزرگ عبدالرزاق کے کتب خانے میں اس کا قلمی نسخہ محفوظ ہے۔

لیکن اس وقت برصغیر میں فارسی زبان میں قرآن مجید کا جو ترجمہ دست یاب ہے، یا اولین ترجمے کی حیثیت سے معروف ہے، وہ مخدوم نوح بن سلامۃ اللہ کہندی (متوفی ۹۹۸ھ) کا ہے جو ۱۴۰۱ھ کو حیدر آباد (سندھ) سے شائع ہوا اور دوسرا ترجمہ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کا ہے، جو نہایت مستند اور عمدہ ترین ترجمہ ہے اور فتح الرحمٰن کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے مقدمے میں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ''صبیان اہل حرفہ و سپاہیان'' جو عربی کی پوری تعلیم حاصل نہیں کر پاتے، اس ترجمے سے استفادہ کریں گے، اور ''جمہور مسلمانان'' کو اس کا فائدہ پہنچے گا۔ یہ مختصر مگر بہت جامع ترجمہ ہے، اور عمدہ ترین ''فوائد'' بھی اس کے ساتھ تحریر فرمائے گئے ہیں۔ اس کی تکمیل ماہ رمضان ۱۱۵۱ھ/ دسمبر ۱۷۳۸ء میں ہوئی۔

شاہ صاحب کی یہ ایک عظیم الشان خدمت ہے۔ اس برصغیر میں فہم قرآن کا دروازہ اسی ترجمے کی بدولت کھلا۔ اس کے بعد جو ترجمے ہوئے وہ سب اسی سے مستفاد ہیں۔

۲. الفوز الکبیر: یہ بھی فارسی زبان میں ہے اور اصول تفسیر سے متعلق نہایت مفید اور بصیرت افروز کتاب ہے۔ چار ابواب پر مشتمل ہے، ان ابواب میں علم احکام، علم مخاصمہ، علم تذکیر بآلاء اللہ، تذکیر بایام اللہ، تذکیر بالموت و مابعد الموت اور ترتیب نزول وغیرہ اہم امور سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے سبب تالیف کا ذکر شاہ صاحب ان الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں:

چوں بریں فقیر درے از فہم کتاب اللہ کشادند، خواست کہ بعضے نکات نافعہ کہ در تدبر کلام اللہ یاراں رابکار آید، دررسالہ مختصر مضبوط نماید۔

یعنی جب اس فقیر (ولی اللہ) پر اللہ نے قرآن مجید کے فہم کے دروازے وا کر دیے تو دل میں یہ

❶ دیکھیے عجائب الہند ص ۲ تا ۴۔ نیز تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، فقہائے ہند جلد اول۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۲۱۔ نیز دیکھیے فقہائے ہند جلد ۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خواہش پیدا ہوئی کہ چند ایسے مفید نکات بیان کر دیے جائیں جو قرآن سے متعلق تدبر و غور کے سلسلے میں لوگوں کے لیے افادے کا باعث ہوسکیں، چنانچہ اس مختصر رسالے میں وہ نکات معرض تحریر میں لائے گئے ہیں۔

الفوز الکبیر، ۱۸۹۸ء میں مطبع مجتبائی دہلی نے شائع کی تھی۔ ۱۹۱۴ء میں مولانا رشید احمد انصاری نے مطبع احمدی علی گڑھ سے اس کا اردو ترجمہ شائع کیا۔

۳۔ فتح الخبیر : عربی زبان میں قرآن مجید کے مشکل الفاظ کی تشریح اور غرائب کی شرح پر مشتمل ہے۔ کہنا چاہیے کہ قرآن کی تفسیر کا یہ نہایت مختصر مگر جامع نمونہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام سے تفسیر کے بارے میں صحیح طریقے سے جو کچھ منقول ہے، تقریباً وہ سارا مواد اس میں سمیٹ لیا گیا ہے۔

۴۔ مصفّٰی : حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی شہرہ آفاق کتاب ''موطا'' کی فارسی شرح ہے۔ جلد اول مطبع فاروق دہلی سے اور جلد دوم مطبع مرتضوی دہلی سے ۱۲۹۳ھ/ ۱۸۷۶ء میں طبع ہوئی تھی۔

۵۔ مسوّٰی : موطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی عربی شرح ہے۔ ۱۲۹۳ھ اور ۱۳۴۷ھ/ ۱۸۷۶ء۔ ۱۹۲۹ء میں دو دفعہ دہلی سے شائع ہوئی۔ شاہ صاحب درس حدیث کا جو طریقہ رائج کرنا چاہتے تھے۔ موطا کی یہ دونوں فارسی اور عربی شرحین یعنی مصفّٰی اور مسوّٰی اس کا ایک نمونہ ہیں۔

۶۔ حجتہ اللہ البالغتہ: اسرار دین اور فلسفۂ اسلام سے متعلق یہ معرکۃ آرا کتاب ہے۔ اس کو فلسفیانہ اسلوب میں پورے اسلام کی شرح سے تعبیر کرنا چاہیے۔ ارکان دین اور اجزائے اسلام کو اس میں نہایت حکیمانہ انداز سے بیان کیا گیا ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ اسلام ایک مکمل اور مربوط نظام حیات کا نام ہے، جس میں انسان کی دینی زندگی اور حیات اجتماعیہ کے تمام سلسلے بہ درجہ اتم موجود ہیں۔ اس میں انسان کی تمدنی ترقی کے مختلف مراحل اور سیاست ملی کے مدارج کی تفصیلات سے بھی بحث کی گئی ہے اور اس کو جن اقتصادی، معاشی اور سیاسی منازل سے گزرنا پڑتا ہے، اس کی تشریح بھی دل نشین طریقے سے کی گئی ہے۔ شاہ صاحب کے فکری رجحانات کو سمجھنے اور احکام اسلام کے فلسفیانہ مزاج کو ذہن کی گرفت میں لانے کے لیے یہ کتاب بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب عربی زبان میں ہے اور کئی دفعہ شائع ہو چکی ہے۔ اس کے مشمولات و مضامین کی اہمیت کے پیش نظر متعدد اہل علم نے اس کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔

۷۔ البدور البازغہ: اس کتاب کو حجۃ البالغہ کے بعض خاص ابواب کی تلخیص کہنا چاہیے۔ سب سے پہلے اسے مجلس علمی ڈابھیل نے شائع کیا تھا۔

۸۔ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء: اس کتاب میں ''خلافت راشدہ'' کو شاہ صاحب نے ''اصل دین'' قرار دیا ہے، اور اسلامی فکر کے ارتقا اور اس کے سیاسی تصورات کی تدوین میں اسے بنیاد اور اساس ٹھہرایا ہے۔ اسلام کے ''اصول عمران'' اور ''نظریۂ سیاست'' کی پوری تشریح اس میں بیان کر دی گئی ہے۔ نیز بہت سے تاریخی حقائق کی نقاب کشائی کی گئی ہے اور متعدد مسائل کی زلف گرہ گیر کو سلجھایا گیا ہے۔ کتاب فارسی زبان

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں ہے۔سب سے پہلے ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۹ء میں مطبع صدیقی بریلی میں اشاعت پذیر ہوئی تھی۔

۹۔ قرة العينين في تفضيل الشيخين: فارسی زبان میں یہ ایک ضخیم کتاب ہے، جس میں شاہ صاحب نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی افضلیت بیان فرمائی ہے۔

۱۰۔ الانصاف في سبب الاختلاف: اس کتاب میں کتب احادیث کی تالیف وترتیب اور مختلف مذاہب فقہ کے نشو وارتقا کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔نیز مسائل دینی میں فقہی نہج کے جو اختلافات پیدا ہوئے، ان کے اسباب اور پس منظر کی وضاحت کی گئی ہے۔کتاب عربی زبان میں ہے اور صحابہ، تابعین، اور بعد کے ائمہ مجتہدین کے درمیان جن مسائل کے بارے میں مختلف آرا نے جنم لیا، اس کی پوری تفصیل اس میں موجود ہے۔اصل عربی میں کتاب مع اردو ترجمے کے مولوی محمد احسن صدیقی نانوتوی نے ۱۳۰۸ھ/ ۱۸۹۱ء میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع کی تھی۔

۱۱۔ عقد الجيد: تقلید اور اجتہاد سے متعلق محققانہ مباحث پر محیط ہے۔

۱۲۔ تحفة الموحدين: دعوت توحید اور رد شرک میں شاہ صاحب کی یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ اگرچہ مختصر ہے مگر مطالب ومعانی کے لحاظ سے نہایت جامع کتاب ہے۔توحید خالص کی تعریف وتصریح اور اس موضوع کے طریق بیان کے لحاظ سے شاہ ولی اللہ صاحب کی ''تحفۃ الموحدین'' کو حضرت شاہ اسماعیل شہید کی ''تقویۃ الایمان'' کے متن یا اساس و بنیاد سے تعبیر کرنا چاہیے۔ بہت عرصہ پیشتر حکیم اجمل خاں دہلوی مرحوم کے بڑے بھائی حکیم حافظ عبدالمجید خاں مرحوم (بانی طبیہ کالج دہلی) کے پریس اکمل المطابع دہلی میں یہ کتاب اردو ترجمے کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔اپنے موضوع اور صاف ستھرے اسلوب بیان کی وجہ سے اس کتاب نے بڑی شہرت حاصل کی۔

۱۳۔ شرح تراجم ابواب صحيح البخاري: صحیح بخاری کے تراجم ابواب کی تشریح وتوضیح کے سلسلے میں یہ کتاب اپنی جگہ بڑی اہمیت کی حامل ہے۔عربی زبان میں ہے۔۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء میں دائرۃ المعارف حیدر آباد (دکن) سے شائع ہوئی تھی۔پھر اصح المطابع دہلی کی طرف سے جو صحیح بخاری شائع ہوئی تھی، اس کے شروع میں اس کتاب کو بطور مقدمے کے چھاپ دیا گیا۔

۱۴۔ مجموعه رسائل اربعه: یہ بہت چھوٹے چھوٹے چار رسائل کا مجموعہ ہے۔ہر رسالہ فن حدیث سے متعلق ہے۔ایک کا نام ''الارشاد الیٰ مھمات علم الاسناد'' ہے۔اس میں ارض حجاز کے شیوخ واساتذہ کا ذکر ہے۔دوسرے کا نام رسالہ اوائل ہے۔تیسرا تراجم البخاری ہے۔یہ رسالہ ''شرح تراجم ابواب صحیح البخاری'' کے علاوہ ہے اور صرف ایک ورق کا ہے۔چوتھے رسالے کا نام ما یجب حفظ للناظر ہے۔

۱۵۔ تفهيمات الهيه: (دو جلد) اس میں عربی اور فارسی میں تصوف وسلوک اور علم شریعت سے متعلق مختلف باتیں بیان کی گئی ہیں۔بعض ذاتی کیفیات ومشاہدات بھی ذکر کیے گئے ہیں۔بعض تفہیمات عربی میں ہیں

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور بعض فارسی میں۔

۱۶۔ الخیر الکثیر: یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔ علم اسرار و حقائق اور تصوف کے بارے میں بلند پایہ کتاب ہے۔

۱۷۔ فیوض الحرمین: قیام حرمین کے زمانے میں جو روحانی افاضات و مشاہدات روح و قلب پر وارد ہوئے، انھیں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

۱۸۔ الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین: اس میں ''ان مبشرات'' کا ذکر ہے، جو رسول اللہ ﷺ سے خود شاہ صاحب کو یا ان کے بعض نسبی یا روحانی بزرگوں کو حاصل ہوئے۔

۱۹۔ انفاس العارفین: اس میں شاہ صاحب نے اپنے بزرگوں کے احوال و سوانح کا تذکرہ تحریر فرمایا ہے۔ کتاب بعض بیش قیمت معلومات کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور بعض ہماری سمجھ سے بالا ہیں۔

۲۰۔ انسان العین فی مشائخ الحرمین: اس میں اپنے مشائخ و اساتذہ حرمین مثلاً شیخ احمد شناوی، شیخ احمد قشاشی، سید محمد علوی، سید عبدالرحمٰن الادریسی، الشہیر بالمحجوب اور شمس الدین محمد وغیرہ کا تذکرہ ہے۔

۲۱۔ القول الجمیل فی بیان سواء السبیل: اس میں برصغیر پاک و ہند میں صوفیا کے جو سلسلے رائج ہیں، ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء میں یہ کتاب مولوی خرم علی نے مطبع نظامی کانپور سے شاہ عبدالعزیز دہلوی کے اردو ترجمے اور حاشیے کے ساتھ ''شفاء العلیل'' کے نام سے شائع کی تھی۔

۲۲۔ الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ: یہ کتاب صوفیا کے مختلف سلسلوں کی تاریخ اور ان کی بعض تعلیمات کے مختصر تذکرے پر مشتمل ہے۔ ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۴ء میں سید ظہیر الدین عرف سید احمد نے جو حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی کے نواسے تھے، اسے مع اردو ترجمے کے مطبع احمدی سے شائع کیا تھا۔

۲۳۔ الطاف القدس: اس میں تصوف کے بنیادی تصورات کو موضوع بحث ٹھہرایا ہے۔

۲۴۔ سطعات: مسائل تصوف سے متعلق ہے۔ یہ کتاب سید ظہیر الدین عرف سید احمد نے مطبع احمدی سے شائع کی تھی اور اس کی وجہ اشاعت ان الفاظ میں بیان کی تھی ''منشا دلی اس کم ترین کا یہ ہے کہ اس کے نفع سے اعانت مدرسہ کہنہ مولانا شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کی جاوے اور جو عرصہ چالیس سال سے چراغ علم گل ہو گیا ہے، جس میں اولاد مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رہتی ہے از سر نو روشن کیا جاوے۔''

۲۵۔ لمعات: اس میں علم تصوف کے بعض اہم مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

۲۶۔ مکتوبات فی مناقب امام بخاری و ابن تیمیہ: یہ شاہ صاحب کے چند اہم مکاتیب کا مجموعہ ہے، جن میں امام بخاری رحمہ اللہ کے مناقب و فضائل بیان کیے گئے ہیں۔ یہ مکاتیب نذیریہ لائبریری دہلی کے مہتمم مولانا سید عبدالرؤف مرحوم نے مع اردو ترجمے کے شائع کیے تھے۔

۲۷۔ مکتوب المعارف مع مکاتیب ثلثہ: یہ شاہ صاحب کے بعض اہم مکاتیب کا ایک مختصر سا مجموعہ ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۸۔ سرور المحزون: رسول اللہ ﷺ کی سیرت پاک کے بارے میں ابن سید الناس کا ایک مختصر سا رسالہ نور العین ہے۔ شاہ صاحب کی یہ کتاب اس کا فارسی ترجمہ ہے، جو بعض احباب کی درخواست پر انھوں نے کیا تھا۔ یہ رسالہ اختصار کے باوجود اپنے اندر بڑی جامعیت رکھتا ہے۔ اور اسی بنا پر کئی مرتبہ چھپ چکا ہے۔ متعدد حضرات نے اس کے اردو ترجمے بھی کیے۔ ان ترجموں میں ایک ترجمہ مولا بخش چشتی نے کنز المکنون کے نام سے کیا جو مطبع ستارہ ہند دہلی میں ۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۸ء میں چھپا۔ ایک ترجمہ مولانا عاشق الٰہی نے کیا، جس کا نام الذکر المکنون رکھا۔ یہ ترجمہ فتح پرنٹنگ ورکس دہلی میں شائع ہوا۔ ایک ترجمہ قرۃ العیون کے عنوان سے نواب محمد وزیر خاں کے حکم سے ۱۲۷۱ھ/ ۱۸۵۵ء میں کیا گیا اور مطبع محمدی ٹونک سے شائع ہوا۔

۲۹۔ الجزء اللطیف: شاہ صاحب کی خودنوشت مختصر سوانح عمری۔

۳۰۔ المقالۃ الوضیہ فی النصیحۃ والوصیہ: شاہ صاحب کا یہ وصیت نامہ ہے اور ''وصیت نامہ'' کے نام سے کئی دفعہ چھپ چکا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اس کی شرح لکھی تھی جو مطبع مطبع الرحمٰن شاہ جہان آبادی سے ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء میں شائع ہوئی۔

۳۱۔ تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء: اس میں آدم علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک تمام انبیا علیہم السلام کے واقعات وقصص اس نہج سے بیان کیے ہیں کہ مختلف زمانوں میں جو شریعتیں رائج تھیں ان کے بنیادی اصول واضح ہوجاتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ اکیڈیمی حیدر آباد (سندھ) نے اسے شائع کیا۔

۳۲۔ ہوامع شرح حزب البحر: یہ حزب البحر کی شرح ہے۔

۳۳۔ العقیدۃ الحسنہ: اسلام کے بنیادی عقائد اس میں صراحت سے بیان کیے ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

۳۴۔ چھل حدیث: چالیس احادیث جمع کرنے کی روایت بہت پرانی ہے۔ سب سے پہلے عبداللہ بن مبارک (متوفی ۱۸۵ھ) نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس کے بعد بہت سے اہل علم نے مختلف مضامین کی چالیس احادیث جمع کیں، اور لوگوں نے اس سے استفادہ کیا۔ شاہ صاحب نے بھی یہ خدمت انجام دی۔ ان کی جمع کی ہوئیں چہل احادیث کئی مرتبہ چھپ چکی ہیں۔

۳۵۔ شرح رباعتین: خواجہ باقی باللہ (متوفی ۲۵ جمادی الاخریٰ ۱۰۱۲ھ/ ۲۶ نومبر ۱۷۰۰ء) کی دو رباعیوں کی شرح، جس میں تصوف کے بعض اہم نکات بیان کیے گئے ہیں۔

۳۶۔ امداد فی مآثر الاجداد: یہ ایک مختصر رسالہ ہے۔ جس میں شاہ صاحب نے اپنے بعض بزرگوں کے حالات تحریر کیے ہیں۔

۳۷۔ العطیۃ الصمدیہ فی الانفاس المحمدیہ: یہ مختصر سا رسالہ شیخ محمد پھلتی کے حالات میں ہے جو شاہ صاحب کے نانا تھے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳۸۔ مسلسلات : عربی میں ہے اور فن حدیث سے متعلق ہے۔

۳۹۔ رسالہ دانش مندی: فن دانش مندی کے متعلق فارسی میں ایک چھوٹا سا رسالہ۔

۴۰۔ اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم : یہ قصائد ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ کی مدح وتوصیف فرمائی گئی ہے، آپ کی نبوت ورسالت کے بارے میں دلائل بیان کیے گئے ہیں اور آپ ﷺ کی اطاعت کو ضروری اور فرض قرار دیا گیا ہے۔

۴۱۔ نبذة الابریزیه فی الطبقة العزیزیه :اس میں اپنے ایک بزرگ شیخ عبدالعزیز دہلوی کا ترجمہ درج ہے۔سات صفحے کا یہ رسالہ مطبع احمدی سے مجموعہ رسائل خمسہ میں شائع ہوا تھا۔

۴۲۔ بوارق الولایة: یہ رسالہ انفاس العارفین میں شامل ہے۔

۴۳۔ شفاء القلوب۔

۴۴۔ زهراوین۔

۴۵۔ المقدمة السنیه۔

۴۶۔ فتح الودود فی معرفة الجنود۔

ان کے علاوہ شاہ صاحب کی اور بھی بہت سی تصانیف تھیں جو دست برد زمانہ کی نذر ہوگئیں ہیں اور آج ان کے نام معلوم کرنا بھی ممکن نہیں۔

یوں تو یہ تمام تصانیف بہترین عنوانات پر مشتمل اور اپنے اپنے موضوع میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں، لیکن ان میں حجۃ اللہ البالغہ بالخصوص انتہائی اہم کتاب ہے۔نواب صدیق حسن خاں اس کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ایں کتاب اگر چہ در علم حدیث نیست، اما شرح احادیث بسیار دراں کردہ، وحکم واسرار آں بیان نمودہ تا آں کہ درفن خود غیر مسبوق الیہ واقع شدہ ومثل آں دریں درازدہ صد سال ہجرت از ہیچ یکے از علمائے عرب وعجم تصنیفے بوجود نیامدہ، ومن جملہ تصانیف مؤلفش مرضی بودہ است، وفی الواقع بیش ازاں است کہ وصفش تواں نوشت ❶۔

یعنی یہ کتاب اگرچہ علم حدیث سے متعلق نہیں ہے، تاہم اس میں بہت سی احادیث کی شرح کردی گئی ہے، اور ان کے فلسفے، حکمت اور اسرار کو اس انداز سے معرض بیان میں لایا گیا ہے کہ اپنے موضوع میں یہ منفرد حیثیت اختیار کرگئی ہے، اور اس سے قبل کوئی کتاب اس اسلوب سے نہیں لکھی گئی، یہاں تک کہ اسلام کے گزشتہ بارہ سو سال کے عرصے میں علمائے عرب وعجم میں سے کوئی شخص اس قسم کی کتاب تصنیف نہیں کرسکا۔اس کے مؤلف شہیر (شاہ ولی اللہ) کی تصانیف میں یہ عمدہ ترین تصنیف

❶ اتحاف النبلاء ص ۱۷

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے اور حقیقت یہ ہے کہ کتاب کے بے بہا معلومات کی وجہ سے اس کی تعریف وتوصیف کو حیطۂ تحریر میں لانا مشکل ہے۔

حجتہ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہ صاحب کی مہتم بالشان کتاب ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ آغاز میں حضرت مؤلف نے ایک مقدمہ تحریر فرمایا ہے، جس میں تالیف کتاب کی اصل وجہ بیان کی ہے۔ نیز طبقات محدثین اور علم حدیث کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی ہے۔ مقدمہ بہترین معلومات پر محیط ہے۔

اس کتاب میں شاہ صاحب نے اسرار دین اور فلسفۂ دین کی خوب صورت انداز میں وضاحت کی ہے۔ نیز بتایا ہے کہ احکام اسلام میں کیا مصلحتیں اور حکمتیں کارفرما ہیں۔ ارکان اسلام نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کو الگ الگ ابواب میں تفصیل سے بیان کیا ہے اور اس سلسلے کی احادیث نقل کر کے بتایا ہے کہ عقلی نقطۂ نظر سے اس میں کیا مصالح پنہاں ہیں۔ سیاست مدن، معیشت، اقتصادیات، معاملات، احسان، آداب مجلس، مکارم اخلاق، تربیت منزل، خطابت، قضا وغیرہ امور کو مناسب تفصیل کے ساتھ عمدگی سے بیان فرمایا ہے۔ غرض یہ کتاب اپنے مشمولات ومندرجات کے اعتبار سے شاہ صاحب کی تصانیف میں بہ درجہ غایت اہمیت کی حامل ہے۔ اہل حدیث، فقہائے کرام اور فقہائے حدیث کے متعلق اس کے مباحث، نہایت معلومات افزا اور لائق مطالعہ ہیں۔

حجتہ اللہ البالغہ کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شریعت اسلامی کے اسرار وحقائق کچھ اس نہج سے معرض تحریر میں لائے گئے ہیں کہ اس کتاب کا شمار علم کلام کی عظیم کتابوں میں ہونے لگا ہے۔ علم کلام کا مطلب اسلام کے بارے میں یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتارا گیا ہے اور بالکل صحیح اور سچا مذہب ہے۔

کتاب کی بے پناہ افادیت کی وجہ سے اس کو حضرت نواب صدیق خاں رحمۃ اللہ علیہ کے سسر مدار المہام محمد جمال الدین خاں بہادر نائب ریاست بھوپال نے شاہ صاحب کی ایک عمدہ تصنیف ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفا کے ساتھ اپنے خرچ سے ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء میں مطبع صدیقی بریلی سے شائع کیا تھا۔ اس کے بعد حجتہ اللہ البالغہ کئی دفعہ مختلف مطابع سے شائع ہوئی۔ ۱۳۹۵ھ (۱۹۷۵ء) میں اسے مکتبہ سلفیہ، لاہور نے خوب صورت کاغذ و طباعت کے ساتھ شائع کیا۔

شاہ صاحب کی تصانیف کا یہ مجمل سا تعارف تھا۔ اب ان کی چیدہ چیدہ خدمات علمی کا ذکر کیا جاتا ہے۔

خدمت قرآن مجید:

شاہ صاحب کی عظیم الشان خدمات دینیہ میں سب سے نمایاں اور رفیع المرتبت خدمت قران مجید کا فارسی ترجمہ ہے۔ شاہ صاحب کے زمانے میں برصغیر کی دفتری زبان فارسی تھی اور مدارس میں زیادہ تر اسی زبان

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن قرآن مجید کا فارسی زبان میں کوئی ترجمہ متداول نہ تھا۔ اس سے قبل بلاشبہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے سلاطین جون پور کے ابتدائی عہد میں ''بحر مواج'' کے نام سے قرآن مجید کی ایک تفسیر سپرد قلم کی تھی، اس تفسیر میں ہر آیت کی تفسیر سے پہلے اس کا ترجمہ بھی درج تھا، لیکن یہ پورے قرآن کا ترجمہ نہ تھا، قرآن کے بعض حصوں کا ترجمہ تھا، اسی لیے اسے شہرت وقبولیت حاصل نہ ہوسکی۔ شیخ سعدی کی طرف بھی ایک فارسی ترجمہ منسوب کیا جاتا ہے اور وہ دست یاب بھی ہے لیکن شیخ ممدوح کی طرف اس کی نسبت بہرحال مشکوک ہے۔ ویسے بھی یہ ترجمہ اہل علم میں کبھی مروّج نہیں ہوا۔

شاہ ولی اللہ اس برصغیر کے پہلے عالم ہیں، جنھوں نے قرآن مجید کے فارسی ترجمے کی سنجیدگی سے ضرورت محسوس کی اور پھر شروع سے آخر تک پورے قرآن پاک کا ترجمہ کر ڈالا۔ اس سے قبل قرآن مجید کو حفظ کرنے کا رواج تو ضرور تھا اور اس کی تفسیریں بھی موجود تھیں لیکن اس کے الفاظ کے معانی ومفہوم کو سمجھنے کے لیے سرزمین ہند کے کسی عالم کے پاس کوئی باقاعدہ ترجمہ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے علما اس کی پاکیزہ تعلیمات سے یکسر محروم تھے۔ قرآن کے کسی حصے پر کوئی غیر مسلم اعتراض کرتا تو ترجمے سے ناواقفیت کی بنا پر اس کا جواب دینا اور اسے مطمئن کرنا مشکل تھا۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ بادشاہ ہند جلال الدین اکبر کے دربار میں جب مسلمان علمائے دین اور پرتگیزی پادریوں کے درمیان اسلام اور قرآن سے متعلق مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ شروع ہوا تو ان پادریوں نے جو قرآن کے لاطینی ترجمے کی وجہ سے اس کے مضامین ومحتویات سے اچھی طرح واقف تھے، اس کے بعض مقامات کو اعتراض وتنقید کا ہدف ٹھہرایا۔ اس وقت اس راز سے پردہ اٹھا کہ جن مسلمانوں نے عربی میں قرآن پڑھا بھی تھا، وہ بھی اس کے مضامین ومشمولات کے بہت سے پہلوؤں سے پوری طرح واقفیت نہ رکھتے تھے۔ دوران بحث بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ پادری قرآن مجید کے کسی واقعہ یا مضمون پر معترض ہوتے، اور مسلمان کم علمی کی بنا پر اس کا جواب نہ دے پاتے تو فوراً کہہ دیتے کہ یہ بات تو قرآن میں سرے سے موجود ہی نہیں، لیکن جب قرآن مجید کی طرف رجوع کیا جاتا تو وہ واقعہ قرآن میں موجود ہوتا۔

بہرکیف شاہ صاحب نے قرآن مجید کے ترجمے کی ضرورت کو بے حد شدت سے محسوس کیا، اور واقعات کے تسلسل سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا احساس انھیں حجاز مقدس کے زمانۂ قیام میں ہوا۔ وہاں کے علمائے تفسیر وحدیث کے اثر صحبت سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ اس ملک کے مسلمانوں کی بنیادی ضرورت ہے۔ چنانچہ حجاز سے واپس دہلی تشریف لانے کے بعد رمضان المبارک ۱۱۵۱ھ (۱۷۳۷ یا ۱۷۳۸ء) میں اس کی تکمیل فرمائی۔

تکمیل ترجمے کے بعد شاہ صاحب کو ایک نئی مشکل کا سامنا کرنا پڑا، وہ تھی علمائے وقت کی مخالفت۔ علما کو جب پتا چلا کہ شاہ صاحب نے قرآن کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا ہے تو شدید مخالفت شروع کردی، بلکہ دشمنی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر اتر آئے اور کلام الٰہی کے معانی کو کسی دوسری زبان میں بیان کرنا ان کے نزدیک قرآن کی توہین اور بے ادبی قرار پایا۔ یہ ہنگامہ یہاں تک بڑھا کہ شاہ صاحب کی زندگی خطرے میں پڑگئی اور انھیں کچھ عرصے کے لیے دہلی کی سکونت ترک کر کے کسی دوسری جگہ جانے پر مجبور ہونا پڑا۔ بالآخر شاہ صاحب نے جرأت سے کام لے کر یہ بات لوگوں کے ذہن نشین کرادی کہ قرآن مجید کا مقصد محض یہی نہیں کہ حصول برکت کے لیے ریشمی غلافوں میں لپیٹ کرا سے گھروں میں رکھ لیا جائے، یا اس کی آیات سے بیماروں پر دم کر دیا جائے۔ یہ تو انسانی زندگی کے لیے ایک لائحہ عمل مہیا کرتا اور لوگوں کو عظیم الشان دستور حیات سے نوازتا ہے۔ دینی اور دنیوی زندگی میں کامیابی کے تمام راز اس میں مضمر ہیں۔ اگر اس کے معانی و مطالب کو اچھی طرح سمجھ کر اس کی تلاوت کی جائے تو انسانی فلاح و بہبود کے دروازے ایک ایک کر کے وا ہو جاتے ہیں، لیکن اس کی صورت یہی ہے کہ جو زبانیں ملک میں رائج ہوں، ان زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا جائے۔ چنانچہ شاہ صاحب کے اس انداز تفہیم سے مخالفت کا زور کم ہوا، اور پھر ان کے فارسی ترجمے کی بھی خوب اشاعت ہوئی اور اردو اور دوسری زبانوں کے تراجم کے لیے بھی راہ ہموار ہوگئی۔

شاہ صاحب کے ترجمے پر تین سو سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ اس اثنا میں بے شمار اہل علم نے قرآن کے ترجمے کیے، یہاں تک کہ بعض حضرات نے علاقائی زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ کیا، لیکن اس کی اولیت کا سہرا شاہ ولی اللہ کے سر ہی بندھے گا۔ وہ پہلے عالم ہیں، جن کے ترجمے نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی اور لوگوں کی وسیع تعداد نے اس سے استفادہ کیا۔ اب بھی حوالے کے لیے اسی ترجمے کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاہ صاحب ان تمام اوصاف سے متصف اور ان تمام خصوصیات سے مالا مال تھے، جن سے قرآن کے مترجم کو ہونا چاہیے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ شاہ صاحب سے بڑھ کر آج تک کسی مترجم میں وہ اوصاف و خصائص جمع نہیں ہوئے۔ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام ڈپٹی نذیر احمد کے حوالے سے لکھتے ہیں:

فی الحقیقت قرآن کے مترجم ہونے کے لیے جتنی باتیں درکار تھیں، ترجمے سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ سب مولانا شاہ ولی اللہ میں علی وجہ الکمال پائی جاتی تھیں، اور سب سے بڑی بات یہ کہ مولانا صاحب کی نظر تفاسیر، احادیث اور دین کی کتابوں پر ایسی وسیع ہے کہ بس انہی کا حصہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک آیت بلکہ ہر ایک لفظ کی نسبت مفسرین کے جتنے اقوال ہیں۔ وہ سب ان کے پیش نظر ہیں، اور وہ ان میں جس کو واضح پاتے ہیں، اسے اختیار کرتے ہیں [1]۔

شاہ صاحب نے قرآن مجید کا ترجمہ بھی کیا اور اس سلسلے میں ایک رسالہ بھی تحریر فرمایا، جس میں اس اہم موضوع کے بعض بنیادی گوشوں کی وضاحت کی اور بعد میں آنے والے مترجمین قرآن کے لیے رہنما اصول متعین کیے۔ علاوہ ازیں علم تفسیر کے متعلق انھوں نے ''الفوز الکبیر فی اصول التفسیر'' کے نام سے

[1] رود کوثر ص ۵۵۳، ۵۵۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عظیم الشان کتاب تصنیف کی۔علوم قرآن اور فہم قرآن کے لیے یہ کتاب اولین اہمیت کی حامل ہے اور اہل علم کے لیے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

شاہ صاحب نے ''وصیت نامہ'' میں بھی قرآن مجید کے بارے میں بعض باتیں بیان کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ پہلے قران کا لفظی ترجمہ پڑھنا چاہیے، تفسیر پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ ترجمہ مکمل کرنے کے بعد تفسیر پڑھی جائے۔ استاد کو چاہیے کہ طویل مباحث والی تفسیروں کے بجائے تفسیر جلالین پڑھائے اور اسی قدر پڑھائے، جتنی کہ درس میں داخل ہے۔ آیات کی شان نزول اور نحو کے مشکل مسائل کو بھی موضوع بحث بنایا جائے، تاکہ طالب علم بات کی تہہ تک پہنچ جائے اور قرآن اور اس کے ضروری مطالب کو سمجھنے میں دقت پیدا نہ ہو۔

حدیث کی خدمت:

شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے زمانے میں حدیث رسول اکرم ﷺ کی بھی بے حد خدمت کی۔ انھوں نے حجاز مقدس میں جید اور مشہور اساتذہ سے پہلے خود حدیث پڑھی اور اس کے متعلقہ علوم پر عبور حاصل کیا۔ اس کے بعد واپس ہندوستان تشریف لائے تو اس بنیادی علم کو مزید مرکز التفات ٹھہرایا۔ شاہ صاحب سے قبل برصغیر کے مدارس دینیہ میں حدیث کی زیادہ ترویج نہ ہوئی تھی۔ اگرچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور بعض دیگر علمائے کرام نے حدیث کی طرف عنان توجہ مبذول فرمائی اور بعض اہم کتابوں کی شرحیں سپرد قلم کیں، تاہم اس علم کی مزید خدمت کی سخت ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ نے حدیث کے فروغ و اشاعت کو اپنا مطمح نظر ٹھہرایا اور ان علما و طلبا کو جو منطق و فلسفہ، صرف و نحو اور فقہ کی کتابوں پر زیادہ زور دیتے تھے، علم حدیث کے حصول کی ترغیب دی۔ باشندگان ہند کے ذہن میں انھوں نے اس حقیقت کو راسخ کرنے کی کوشش کی کہ علم حدیث کی تعلیم ہمارے فرائض میں داخل ہے، جب تک اس علم کی تحصیل نہیں کی جائے گی، معرفت و ادراک میں درجہ کمال تک رسائی نہیں ہو سکے گی۔

حدیث کی نشر و اشاعت کے لیے شاہ صاحب نے تحریری خدمت بھی انجام دی اور تدریسی بھی۔ تحریری خدمت یہ ہے کہ موطا امام مالک کی دو شرحیں لکھیں۔ موطا امام مالک حدیث کی سب سے قدیم کتاب ہے۔ اس کی ترتیب اور اسلوب سے شاہ صاحب بے حد متاثر تھے اور اس کی بہت تعریف فرماتے تھے۔ ''وصیت نامہ'' میں لکھتے ہیں کہ طالب علم میں جب عربی زبان پر قدرت حاصل ہو جائے تو اسے موطا امام مالک بروایت یحییٰ بن یحییٰ صمهودی پڑھنا چاہیے۔ موطا کو ہرگز ترک نہ کیا جائے، کیونکہ یہ علم حدیث کی اساس اور اصل ہے۔ اس کے پڑھنے سے بے شمار علمی فیوض حاصل ہوتے ہیں۔ بعض حیثیتوں سے شاہ صاحب موطا کو صحیح بخاری پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس اہم کتاب کی دو شرحیں لکھیں۔ ایک فارسی میں اور دوسری عربی میں۔ فارسی شرح کو "المسوّیٰ" کے نام سے موسوم کیا اور عربی شرح کا نام "المصفّی" رکھا۔ یعنی شاہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صاحب نے ان دونوں زبانوں میں جو ان کے عہد میں اظہار خیال کا ذریعہ تھیں، موطا کی شرحیں قلم بند کیں۔ اس سے ان کا مقصد ہر قسم کے اہل علم میں موطا کو متعارف کرانا اور اس کے مطالب کو عام کرنا تھا۔

مسوّیٰ اور مصفّٰی کے علاوہ انھوں نے شرح تراجم ابواب صحیح البخاری کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی، جو صحیح بخاری کے تراجم ابواب کی تشریح پر مشتمل ہے۔ پھر حجۃ اللہ البالغہ تحریر فرمائی، جو اسرار شریعت اور فلسفہ احکام سے متعلق ایک ضخیم اور مشہور ترین کتاب ہے۔ اس کے مضامین ومحتویات کا زیادہ تر حصہ احادیث پر مبنی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب علم حدیث میں بے حد عمق اور درک رکھتے تھے۔

عوام میں اشاعت حدیث کے لیے بھی انھوں نے مختصر مگر بعض اہم کتابیں لکھیں، جن میں چہل حدیث، النوادر من الحدیث اور الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

بہر حال شاہ صاحب نے حدیث اور اس کے متعلقات کے بارے میں بہترین خدمت انجام دی اور اس کی ترویج واشاعت کے لیے بے حد کوششیں کیں چنانچہ برصغیر میں حدیث اور علوم حدیث کا آج جو چرچا ہے، اس میں شاہ صاحب اور ان کے اخلاف کا بہت بڑا حصہ ہے۔

علم فقہ:

شاہ ولی اللہ، یوں تو علم فقہ اور مسائل فقہ میں کامل مہارت رکھتے تھے اور اس کی تفصیلات اور جزئیات سے پوری طرح آگاہ تھے، لیکن ان کی تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ علم فقہ سے انھیں زیادہ دلچسپی یا اور لگاؤ نہ تھا۔ اس موضوع سے متعلق نہ انھوں نے کوئی خاص اور قابل ذکر کتابیں لکھیں اور نہ بہت زیادہ فتوے تحریر کیے۔ البتہ اس علم کے صحت مندانہ اصولوں سے علما کو متعارف ضرور کرایا اور جن حالات میں اس علم کی تدوین عمل میں آئی اور عہد بہ عہد اس نے ارتقا کی جو منزلیں طے کیں اسے واضح کیا۔ اس سلسلے میں ان کی تصنیف ''الانصاف فی بیان سبب الاختلاف'' بڑی اہم کتاب ہے۔ یہ کتاب اگرچہ مختصر ہے اور ایک رسالے کی حیثیت رکھتی ہے تاہم تاریخ فقہ اور تاریخ علم حدیث میں نہایت معلومات افزا ہے۔ اسلام کے عہد آغاز سے لے کر پانچویں صدی ہجری تک تدوین فقہ، کتب احادیث کی تیاری اور مختلف مذاہب فقہ کے آغاز اور ان کے ضروری کوائف کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں حضرت مصنف نے وہ تمام بنیادی مسائل وضاحت اور پورے اعتدال کے ساتھ بیان کیے ہیں، جو علما کے نزدیک مختلف فیہ ہیں۔ پھر اختلاف کے وجوہ واسباب پر محققانہ اسلوب میں روشنی ڈالی ہے۔ علاوہ ازیں اہل سنت کے مذاہب اربعہ یعنی حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی مسالک فقہی کی خصوصیات اور ان کی تدوین وتشکیل کا پس منظر بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی شاہ صاحب نے احادیث کی جمع وتدوین اور اصحاب حدیث کی مختلف کتابوں مثلاً صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد کی خصوصیات وامتیازات کی بھی نشان دہی کی ہے۔ اجتہاد اور تقلید کے اہم مسئلے کو بھی موضوع بحث ٹھہرایا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے اوران وجوہ کی صراحت کی ہے جو تقلید کی ترویج کا باعث بنے۔ تقلید کے متعلق متاخرین کے گروہ نے جس غلو سے کام لیا ہے، شاہ صاحب نے اس کا بھی ذکر فرمایا ہے اور لکھا ہے کہ بعد کے لوگوں نے محض تقلید کو کافی سمجھ لیا اور اسی پر جم کر بیٹھ گئے۔ اجتہاد کے دروازے بند کر لیے اور تحقیق سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ نہ حق کو باطل سے الگ کرنے کی زحمت گوارا کی اور نہ جدل کو استنباط سے ممتاز کرنے پر توجہ مبذول کی۔ ان کے نزدیک فقیہ وہی کہلاتا تھا جو بہت زیادہ باتیں کرنے کا عادی ہو، اور جس نے فقہائے متقدمین کے قوی و ضعیف اقوال میں امتیاز کیے بغیر بیان و اظہار کو اپنا شیوہ بنا لیا ہو۔ ان کے نقطہ نظر سے محدث وہ تھا جو صحیح و ضعیف حدیثوں کو شمار کرتا اور انھیں بلا سوچے سمجھے بیان کرتا پھرے۔ اس کے بعد ایسا دور آیا کہ لوگ مزید فتنے میں مبتلا ہو گئے اور تقلید میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ دلوں سے دیانت داری کا بالکل خاتمہ ہو گیا اور دین کے معاملے میں غور و فکر سے منہ موڑ لیا۔ انھوں نے اس قسم کی باتیں کرنا شروع کر دیں کہ ہم اسی روش پر چلیں گے جو ہمارے آبا و اجداد کی تھی اور اسی دین پر کاربند رہیں گے جو ہمارے بڑوں کا تھا۔ ہمارا کام فقط ان کے نقوش قدم کی پیروی کرنا ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں علم فقہ باقاعدہ مدوّن اور مرتب شکل میں نہ تھا، نہ اس کی یہ تعریف کی جاتی تھی جو بعد میں کی جانے لگی۔ نہ اس زمانے میں احکام فقہ پر اس اسلوب سے بحث کی جاتی تھی جس طرح ہمارے زمانے کے فقہا میں کی جاتی ہے۔ اب یہ حالت ہے کہ فقہا، احکام دین میں سے ہر حکم کے الگ الگ ارکان، شرائط اور آداب کو دلائل سے ثابت کرتے اور معرض بیان میں لاتے ہیں۔ وہ مسائل شرعیہ کی مختلف صورتیں متعین اور فرض کر لیتے ہیں۔ پھر ان بیرونی فرضی صورتوں کو باقاعدہ موضوع بحث ٹھہراتے ہیں۔ اس سلسلے کو بعض اوقات وہ بہت دور تک پھیلا دیتے ہیں۔ عہد رسالت میں ایسا قطعاً نہ ہوتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ آپ وضو فرماتے اور صحابہ کرام آپ کو وضو کرتے ہوئے دیکھتے رہتے۔ چنانچہ وہ اسی طرح وضو کرتے، جس طرح آنحضرت ﷺ کو دیکھتے۔ ایسا نہ ہوتا کہ آنحضرت ﷺ، یہ بتاتے کہ یہ چیز وضو کا رکن ہے، یہ آداب وضو میں سے ایک ادب ہے اور یہ شرائط وضو ہیں۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ نماز پڑھتے اور صحابہ آپ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے، چنانچہ اسی طرح نماز پڑھتے، جس طرح آپ نے نماز پڑھی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے حج کیا، اور صحابہ نے آپ کو مناسک حج ادا کرتے ہوئے دیکھا، چنانچہ انھوں نے بھی اسی طرح حج کیا جس طرح آنحضرت ﷺ نے کیا تھا۔

غرض عام طور پر آنحضرت ﷺ کا یہی معمول تھا۔ آپ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ وضو کے فرض چھ ہیں یا چار۔ نہ کبھی یہ فرض کیا کہ ہو سکتا ہے کوئی شخص اس طرح وضو کرے کہ اعضائے وضو پر برابر پانی نہ ڈالے، جس کی وجہ سے وضو کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کا حکم لگایا جا سکے۔ ان امور کے بارے میں صحابہ کرام آپ ﷺ سے بہت ہی کم سوال کرتے تھے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس موقع پر شاہ صاحب نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کی ہے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ سے بہتر کوئی قوم نہیں دیکھی۔ وہ آنحضرت ﷺ سے زیادہ سوال کرنے اور مسائل دریافت کرنے میں بہت احتیاط کرتے تھے۔ انھوں نے آپ کی رحلت تک آپ سے صرف تیرہ سوال پوچھے، جن کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے۔ ان تیرہ سوالوں میں سے ایک یہ ہے۔

یسئلونك عن الشهر الحرام قتال فيه۔ (البقرہ: ۲۱۷)

(یہ لوگ آپ سے، اے نبی! حرمت کے مہینوں میں لڑائی کی بابت پوچھتے ہیں۔)

دوسرا سوال ہے۔ یسئلونك عن المحيض۔ (البقرہ: ۲۲۲)

(اے پیغمبر!) آپ سے یہ لوگ حیض کے متعلق احکام کے سلسلے میں دریافت کرتے ہیں۔)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، صحابہ کرام، آنحضرت ﷺ سے وہی بات پوچھتے تھے، جو ان کے لیے دینی لحاظ سے مفید ہوتی تھی۔

اس کے بعد صحابہ کرام مختلف شہروں اور ملکوں میں پھیل گئے، اور حالات بدلے تو بہ کثرت واقعات رونما ہوئے، جن کی وجہ سے نئے نئے مسائل سامنے آئے۔ اس کے بعد تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں مسائل میں مزید اضافہ ہوا، اور پہلے سے زیادہ باتیں معرض ظہور میں آئیں۔ اس طرح مسائل کے حل وکشود کے لیے فقہی مذاہب وجود میں آئے اور پیش آئند معاملات سے نمٹنے کے لیے نئی نئی شکلوں نے جنم لیا۔

شاہ ولی اللہ نے اس طرح فقہ کی نشو ونما اور فقہی مسائل کے عالم وجود میں آنے کے بارے میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ حقیقت یہ ہے یہ کہ تمام بحث نہایت دلچسپ اور پراز معلومات ہے۔

اجتہاد اور تقلید:

شاہ صاحب نے اجتہاد اور تقلید کو بھی ہدف بحث بنایا ہے اور اس موضوع سے متعلق ان کی تصانیف میں سے "عقد الجيد في احكام الاجتهاد و التقليد" لائق مطالعہ تصنیف ہے۔ شاہ صاحب اپنی اس کتاب میں اجتہاد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ علما کے مباحث اور نقطہ نظر سے اجتہاد کی جو تعریف فہم کی گرفت میں آتی ہے، وہ ہے، شریعت کے فروعی احکام کو ان کے تفصیلی دلائل سے دریافت کرنے اور سمجھنے کی پوری کوشش کرنا۔ ان تفصیلی دلائل کا تمام تر مرجع چار چیزیں ہیں۔

(۱) قرآن مجید۔ (۲) سنت نبوی۔ (۳) اجماع اور (۴) قیاس۔

شاہ صاحب نے اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ اجتہاد کے لیے کیا شرائط ہیں اور مجتہد کون ہوسکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اجتہاد کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن وسنت کے ان مسائل سے معرفت و ادراک رکھتا ہو، جن کا تعلق احکام سے ہے۔ پھر وہ مواقع اجماع، شرائط، قیاس، کیفیت نظر [1] عربی زبان، ناسخ

[1] مقدمات قیاس کو اس طرح مرتب کرنا کہ ان سے صحیح نتیجہ حاصل ہو سکے، نظر کہلاتا ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ومنسوخ اور راویوں کے حالات کا عالم ہو۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں، اجتہاد کے لیے علم کلام اور فقہ کی ضرورت نہیں، لیکن امام غزالی کہتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں فقہ کی مشق وممارست سے اجتہاد کی استعداد حاصل ہوتی ہے، اور اس دور میں مسائل کو صحیح طور سے سمجھنے کا یہی طریقہ ہے، البتہ صحابہ کے زمانے میں اس کی ضرورت نہ تھی۔

امام بغوی کے نزدیک مجتہد وہ ہوسکتا ہے، جو ان پانچ اقسام علم پر حاوی ہو۔

(۱) قرآن مجید کا علم۔

(۲) سنت رسول اللہ ﷺ کا علم۔

(۳) علمائے سلف کے اقوال کا علم، ان اقوال کا علم جن پر ان کا اجماع تھا، اور ان کا بھی جن میں وہ اختلاف رائے رکھتے تھے۔

(۴) لغت عربی کا علم اور

(۵) قیاس کا علم۔! ''قیاس'' کہتے ہیں، کتاب وسنت سے استنباط حکم کو، جب کہ پیش نظر مسئلے کا حکم نہ تو صراحتاً کتاب وسنت میں ہو، اور نہ اجماع میں۔!!

شاہ صاحب بلاشبہ اجتہاد کے قائل ہیں، لیکن ہر شخص کو اجتہاد کی اجازت نہیں دیتے۔ جس عالم میں وہ شرائط پائی جائیں جو مذکورہ بالا سطور میں بیان کی گئی ہیں اور ہمارے اسلاف سے ثابت ہیں، اس کو وہ یقیناً اجتہاد کی اجازت دیتے ہیں۔

اسی طرح تقلید کے بارے میں بھی ان کا نقطہ نظر اعتدال پر مبنی ہے۔ اس ضمن میں ان کا مسلک یہ ہے کہ جو شخص کتاب وسنت کے احکام پر نظر رکھتا ہو، مسائل کی تحقیق کر سکتا ہو، اور صحیح وغیر صحیح میں امتیاز پر قادر ہو، اسے تقلید نہیں کرنی چاہیے۔ اس کا فرض ہے کہ براہ راست قرآن وحدیث کی طرف رجوع کرے اور اپنے علم و تحقیق کی روشنی میں نصوص شرعیہ پر نگاہ ڈالے۔ پھر انہی امور پر عمل پیرا ہو، جو کتاب وسنت سے ثابت ہیں۔ لیکن جو شخص علم وفضل سے آراستہ نہیں، عام لوگوں کی صف میں شامل ہے، اس کے لیے ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام کی تقلید کیے بغیر چارہ نہیں۔ اس کے ثبوت میں وہ ''عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید'' کے آخر میں قرآن مجید کے یہ الفاظ نقل کرتے ہیں۔

﴿فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾

(اگر تم خود علم نہیں رکھتے تو اصحاب علم سے پوچھ لو۔)

شاہ صاحب نے اجتہاد وتقلید اور اس کے حدود پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ وہ شیخ عبدالوہاب شعرانی کی تصنیف الیواقیت والجواہر کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہا کرتے تھے کہ جو شخص کسی مسئلے میں میری پیش کردہ دلیل سے آگاہ نہیں، اسے محض میرے کلام کی بنیاد پر فتویٰ نہیں دینا چاہیے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہ معمول تھا کہ جب وہ فتویٰ دیتے تو اس پر تحریر فرماتے کہ یہ نعمان بن ثابت کی رائے ہے، اور

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جتنی میں استطاعت رکھتا تھا، اس کے مطابق یہ بہترین رائے ہے، جو شخص اس سے بہتر رائے پیش کرے، وہ صواب کی راہ ہے۔ امام مالک کہا کرتے تھے کہ کوئی شخص ایسا نہیں جو اپنی بات میں قابل گرفت نہ ہو، اور اس کی بات اسی کی طرف لوٹائی نہ جائے، سوائے رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کے۔

شاہ صاحب مزید لکھتے ہیں کہ امام حاکم اور امام بیہقی نقل کرتے ہیں کہ امام شافعی کہا کرتے تھے کہ جب کوئی مسئلہ آنحضرت ﷺ کی حدیث سے ثابت ہو جائے تو وہی میرا مذہب ہے۔ ان کا یہ بھی قول ہے کہ اگر تم میری بات کو حدیث کے خلاف پاؤ تو حدیث پر عمل کرو اور میری بات کو دیوار پر دے مارو۔

امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کے ارشاد پر کسی کو کلام کرنے کا حق نہیں۔ انھوں نے ایک شخص سے یہ بھی فرمایا کہ نہ تم میری تقلید کرو، نہ مالک کی، نہ اوزاعی کی، نہ نخعی کی، اور نہ کسی اور کی۔ تم وہیں سے احکام اخذ کرو، جہاں سے ان لوگوں نے اخذ کیے تھے۔ یعنی کتاب وسنت سے۔!

شاہ ولی اللہ اس مجتہد کے اجتہاد کے قائل تھے جو ان اوصاف سے متصف ہو، جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ جو لوگ مسائل شرعیہ میں خود تحقیق کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں، انھیں وہ تقلید کی اجازت نہیں دیتے۔ تقلید میں غلو اور حد سے تجاوز کرنے کے بھی وہ شدید مخالف تھے۔ اس ضمن میں وہ اعتدال کے حامی تھے اور صرف عوام کے لیے تقلید کی حمایت کرتے تھے۔ تقلید کی ایک قسم کو تو شاہ صاحب قطعاً حرام قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک تقلید کی یہ وہ قسم ہے، جس میں دانستہ یا غیر دانستہ طور پر مقلد ہر صورت میں صراحتاً حدیث رسول کریم ﷺ پر اپنے مفتیوں اور فقیہوں کے اقوال کو ترجیح دے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ تقلید حرام کی صورت یہ ہے کہ کسی فقیہ کے بارے میں یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ علم وادراک میں انتہا درجے کو پہنچ گیا ہے۔ اس سے غلطی اور خطا کا ارتکاب نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کے مقلد کو اگر ایسی کوئی صحیح اور واضح حدیث سنائی جائے جو اس کے فقیہ کے قول کے مخالف ہو تو وہ فقیہ کے قول کو ترک نہیں کرتا۔

مسلکی نقطۂ نظر:

فروعی مسائل اور ان امور میں جو اہل حدیث اور احناف کے درمیان مختلف فیہ ہیں۔ شاہ صاحب کا نقطۂ نظر بڑے اعتدال و توازن پر مبنی تھا۔ تشدد اور غلو سے ان کو نفرت تھی۔ جو بات قرآن وحدیث کی میزان میں پوری اترتی، اسی پر عمل کرتے اور تحریر و تقریر میں اسی کا اظہار فرماتے۔ اگر کوئی شخص مسئلہ دریافت کرتا تو اسی کے مطابق جواب دیتے۔ انھوں نے ائمہ حدیث کی فقہ یا فقہ الحدیث کے کچھ بنیادی اصول مقرر کیے ہیں، جن کا اپنی تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں ذکر فرمایا ہے۔ وہ اصول مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اگر قرآن مجید میں کوئی حکم صراحت سے موجود ہو، تو اہل حدیث کے نزدیک اسی کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔ کسی دوسری طرف التفات کی ضرورت نہیں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔ اگر حکم قرآنی حکم میں تاویل کی گنجائش ہو اور مختلف مفہوم پیدا ہونے کا احتمال ہو تو اس صورت میں سنت کا فیصلہ ناطق ہوگا۔ قرآن کے اسی مفہوم کو صحیح سمجھا جائے گا جس کی تائید سنت سے ہوتی ہو۔

۳۔ اگر قرآن کسی حکم کے بارے میں خاموش ہو تو عمل سنت پر ہوگا، اگرچہ وہ سنت تمام فقہا میں متعارف اور معلوم ہو، یا کسی خاص شہر، علاقے اور خاندان سے مروی ہو، کسی نے اس کو معمول بہا ٹھہرایا ہو، یا نہ ٹھہرایا ہو۔ ائمہ حدیث کے نزدیک وہ بہرحال قابل حجت اور لائق استناد قرار پائے گی۔

۴۔ اگر کسی مسئلے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث مل جائے تو اس کے مقابلے میں کسی مجتہد اور امام کے قول کو کوئی اہمیت نہ دی جائے گی، نہ کوئی اثر قابل توجہ ہوگا۔

۵۔ اگر پوری کوشش کے باوجود کسی مسئلے کی تہ تک پہنچنے کے لیے کوئی حدیث نہ ملے تو صحابہ کرام کے ارشادات اور تابعین کے اقوال کو لائق عمل ٹھہرایا جائے گا، اور اس میں کسی شہر، علاقے یا خاندان کی قید یا تخصیص نہیں ہوگی۔

۶۔ اگر جمہور فقہا کسی معاملے میں متفق ہوں تو اسے عمل کے لیے کافی قرار دیا جائے گا۔

۷۔ اگر فقہا کے درمیان اختلاف ہو، تو ان فقہا سے مروی حدیث قبول کی جائے گی جو تقویٰ اور ضبط میں زیادہ اچھی شہرت کے مالک ہوں، یا پھر اس روایت کو قابل قبول سمجھا جائے گا جو زیادہ مشہور ہو۔

۸۔ اگر علم و فضل، ورع و تقویٰ اور ضبط و حفظ میں سب ایک سے ہوں اور زیر بحث مسئلے میں متعدد اقوال منقول ہوں، تو جس امام کے قول پر مناسب سمجھیں، عمل کیا جائے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۹۔ اگر اس میں بھی اطمینان بخش کامیابی نہ ہو تو قرآن و سنت کے عمومی اقتضا اور ارشادات پر عمل کیا جائے گا اور مسئلہ زیر بحث کے نظائر کو دیکھا جائے گا۔ پھر اس کی روشنی میں حکم کا استخراج کیا جائے گا۔ اس میں اصول فقہ کے مروج و مشہور قواعد پر اعتماد نہ کیا جائے گا۔ بلکہ اطمینان قلب اور ضمیر کے سکون کو قابل اعتماد گردانا جائے گا۔

اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ شاہ ولی اللہ تقلید سے وابستگی کے زیادہ قائل نہیں ہیں اور مسائل میں کتاب و سنت کو ہر حال میں مقدم رکھنے کے سختی سے حامی ہیں۔ ائمہ سلف کے عمل و قول کا درجہ ان کے نزدیک بہت بعد میں آتا ہے۔ وہ حتی الامکان شخصی آرا و افکار اور تقلید کے جمود و تقید سے ذہنوں کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔

اہل سنت کو شاہ صاحب دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک فریق کو وہ اہل الحدیث کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور ایک کو اہل الرائے کے نام سے۔ یوں تو دونوں فریقوں کے نہج و اسلوب کو وہ صحیح سمجھتے ہیں لیکن فقہائے اہل حدیث کے طریق عمل کو زیادہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ غلو خواہ کسی طرف سے ہو، اس کے وہ سخت مخالف ہیں۔ مسائل میں تعصب اور حد اعتدال سے تجاوز کو وہ قطعاً برداشت نہیں کرتے۔ لکھتے ہیں:

باید دانست کہ سلف در استنباط مسائل و فتاویٰ در دو وجہ بودند۔ یکے آں کہ قرآن و حدیث و آثار صحابہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جمع می کردند واز آنجا استنباط می نمودند دریں طریقہ اصل راہ محدثین است۔ او دیگر آں کہ قواعد کلیہ کہ جمع از ائمہ تنقیح وتہذیب آں کردہ اند یاد گیرند بے ملاحظہ ماخذ آنہا۔ پس ہر مسئلہ کہ واردمی شد جواب آں از ہمہ قواعد طلب می کردند، وایں طریقہ اصل راہ فقہا است، وغالب بر بعض سلف طریقہ اولیٰ بود، وبر بعض آخر، طریقہ ثانیہ ❶۔

یعنی یاد رکھنا چاہیے کہ سلف میں فتاویٰ ومسائل میں استنباط کے دو طریقے مروج تھے۔ پہلا طریقہ یہ تھا کہ قرآن وحدیث اور آثار صحابہ جمع کرتے تھے، اور انھیں اصل قرار دے کر ان کی روشنی میں پیش آئند مسائل پر غور کرتے تھے۔ یہ محدثین کا طریقہ ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ائمہ کے منقح ومہذب کیے ہوئے قواعد کلیہ کو اصل قرار دیا جائے اور انھی سے پیش آئند مسائل کا حل تلاش کیا جائے، اور اصل ماخذ کو لائق اعتنا قرار دینے کی ضرورت نہ سمجھی جائے۔ یہ فقہا کا طریق عمل ہے۔ سلف کا ایک کثیر طبقہ پہلے طریقے کا پابند ہے اور ایک طبقہ دوسرے طریق عمل کا۔

یہاں شاہ صاحب نے دونوں فریقوں کے الگ الگ طریق عمل کا ذکر کر دیا ہے، کسی کو تنقید کا ہدف نہیں بنایا۔ یہ ان کی میانہ روی اور اقتصاد واعتدال کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کے الفاظ سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ اصحاب الحدیث اور محدثین کے طریق عمل کو دوسرے طریق عمل پر ترجیح دیتے ہیں۔ وصیت نامے میں بھی کتاب وسنت کی پیروی کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان کے الفاظ قابل ملاحظہ ہیں۔

وصیت اول، ایں فقیر چنگ زدن است بکتاب وسنت در اعتقاد وعمل وپیوستہ بتدبر ہر دو مشغول شدن وہر روز حصہ از ہر دو خواندن، واگر طاقت خواندن ندارد ترجمہ ورقے از ہر دو شنیدن، ودر عقائد مذہب قدمائے اہل سنت اختیار کردن واز تفصیل وتفتیش آنچہ سلف تفتیش نہ کردند، اعراض نمودن وبہ تشکیکات معقولیان خام التفات نہ کردن، ودر فروع پیروی علمائے محدثین کہ جامع باشند میان فقہ وحدیث کردن، ودائماً تفریعات فقہیہ را بر کتاب وسنت عرض نمودن، آنچہ موافق، باشد در حیز قبول آوردن، والا ”کالائے بد بریش خاوند“ دادن، امت راہیچ وقت از عرض مجتہدات بر کتاب وسنت استغنا حاصل نیست، وسخن متقشفۂ فقہا کہ تقلید عالمے را دستاویز ساختہ تتبع سنت را ترک کردہ اند نشنیدن وبدیشاں التفات نہ کردن، وقربت خدا جستن بہ دوری ایناں۔

یعنی اس فقیر کی پہلی وصیت یہ ہے کہ اعتقاد اور عمل دونوں میں کتاب وسنت (قرآن وحدیث) کو نہایت مضبوطی سے پکڑا جائے۔ اور برابر ان کے تدبر میں مشغول رہا جائے اور اگر عربی نہ جاننے کی وجہ سے خود نہ پڑھ سکتا ہو تو کسی دوسرے سے دونوں کا کم از کم ایک ورق ترجمہ ہی سن لیا کرے اور عقائد میں قدمائے اہل سنت کا مسلک اختیار کیا جائے اور اسلاف کرام نے جس چیز کی کھود کرید نہیں کی، اس کے پیچھے نہ پڑا جائے۔ اور ”معقولیان خام“ جو شبہات پیدا کرتے ہیں ان کی طرف مطلق توجہ نہ کی جائے اور فروع فقہ میں ان علمائے محدثین کی پیروی کی جائے جو حدیث وفقہ کے جامع ہوں اور فقہی تخریجات کو لازماً ہمیشہ کتاب وسنت کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ جو بات اس کے مطابق ہو اسے قبول کر لیا جائے، ورنہ ”کالائے بد بریش خاوند“ والا معاملہ کیا

❶ مصفّٰی ج۱ص۹۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جائے۔ اور یہ یاد رکھا جائے کہ امت کسی وقت بھی ”مجتہدات فقہا“ کو کتاب وسنت کی بنیاد پر جانچنے سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہوسکتی اور وہ متقشف فقہا جو کسی عالم کی بات کو دستاویز قرار دے کر سنت کے تتبع سے بے پروا ہوگئے ہیں، ان کی بات تک نہ سنی جائے اور نہ انھیں قابل التفات گردانا جائے، بلکہ ان سے دور رہ کر اللہ کی خوش نودی اور اس کا قرب حاصل کیا جائے۔

شاہ صاحب کسی ایک ہی امام یا مجتہد کے مقلد نہ تھے، بلکہ جو بات حدیث سے ہم آہنگ ہوتی، اس پر عمل کرتے۔ اس سلسلے میں وہ احناف یا شوافع میں کسی امتیاز کے پابند نہ تھے۔ چنانچہ تفہیمات میں تحریر فرماتے ہیں:

ونحن ناخذ من الفروع مااتفق عليه العلماء لاسيما هاتان الفرقتان العظيمتان الحنفية والشافعية وخصوصا فى الطهارة ولصلوٰة فان لم يتبيسر الاتفاق واختلفوا فناخذ بما يشهدله ظاهر الحديث ومعروفه❶۔

(ہم فروعات میں ان مسائل پر عمل کرتے ہیں، جن پر علما کا اتفاق ہو، خصوصیت سے جن پر اہل سنت کی دو بڑی جماعتیں حنفی اور شافعی متفق ہوں۔ طہارت اور نماز سے متعلق مسائل میں ہم بالخصوص اس کا التزام کرتے ہیں۔ اگر ان دو بڑی جماعتوں کا اتفاق نہ ہو، تو جو مسائل ظواہر حدیث کے موافق ہوں، ان پر عمل کرتے ہیں۔)

اب ذیل میں وہ چند مسائل درج کیے جاتے ہیں جن میں شاہ صاحب رسول اللہ ﷺ کی احادیث پر عمل فرماتے تھے۔

۱۔ امام کی اقتدا میں سورہ فاتحہ پڑھنی چاہیے یا نہیں۔ یہ ایک مشہور مسئلہ ہے۔ احناف اس کے قائل نہیں، لیکن شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:

وان كان ماموماً وجب عليه الانصات والاستماع، فان جهر الامام لم يقراء الا عند الا سكاتة وان خافت فله الخيرة فان قرأ فليقراء الفاتحة قرأة لايشوش على الامام، وهذا اولى الاقوال عندى، وبه يجمع بين احاديث الباب❷۔

(مقتدی کو چاہیے کہ امام کے پیچھے خاموشی سے سنے، اگر امام اونچی آواز سے پڑھے تو مقتدی سکتوں میں پڑھے۔ اگر امام آہستہ پڑھ رہا ہو، تو مقتدی کو اختیار ہے، جس طرح

❶ تفہیمات الٰہیہ ج ۲ ص ۲۴۲۔

❷ حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۹۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چاہے پڑھے۔ لیکن سورہ سفاتحہ اس طرح پڑھے کہ امام کی قرأت میں تشویش اور پریشانی نہ ہو۔ میرے نزدیک یہ نقطہ نظر اولیٰ ہے، اور اس مسئلے کے متعلق جو احادیث مروی ہیں، ان میں توافق وتطابق کی صحیح صورت یہی ہے۔

۲۔ حضرات احناف نماز میں رفع یدین کے قائل نہیں، لیکن شاہ ولی اللہ کی تحقیق یہ ہے کہ رفع یدین کرنے کی احادیث ''اکثر'' اور ''اثبت'' ہیں۔ اسی طرح وتر کی ایک رکعت کو بھی ''سنت'' قرار دیتے ہیں، جب کہ احناف تین رکعت کے قائل ہیں۔ مگر شاہ صاحب ان مسائل میں جھگڑے فساد کو پسند نہیں کرتے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

والحق عندی فی مثل ذلك ان الكل سنة ، ونظيره الوتر بركعة واحدة او بثلاث ، والذی يرفع ، احب الی ممن لايرفع فان احاديث الرفع اكثر واثبت ، غيرانه لاينبغی لانسان فی مثل هذه الصور ان يثير علیٰ نفسه فتنة عوام بلده❶۔

(میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ رفع یدین کرنا یا نہ کرنا دونوں سنت ہیں۔ یہی معاملہ ایک رکعت یا تین رکعت وتر پڑھنے کا ہے۔ رفع یدین کرنے والا میرے نزدیک نہ کرنے والے سے زیادہ اچھا ہے، کیونکہ رفع یدین کی احادیث تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور زیادہ صحیح بھی ہیں۔ لیکن انسان کو اس قسم کے مسائل میں اپنے شہر کے لوگوں کو یہ موقع نہیں دینا چاہیے کہ وہ اس کے خلاف ہنگامہ بپا کر دیں۔)

۳۔ فقہائے حنفیہ وتروں کو واجب قرار دیتے ہیں اور محدثین اسے سنت کہتے ہیں۔ شاہ صاحب بھی اس میں محدثین کی تائید فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

والحق ان الوتر سنة هواوكد السنن ، بينه علی وابن عمر وعبادة بن الصامت رضی الله عنهم ❷۔

(وتر سنت مؤکدہ ہے۔ حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہم سے یہی منقول ہے اور انھوں نے اسی کی وضاحت فرمائی ہے۔

۴۔ عذر کی بنا پر دو نمازیں جمع کرنے کے بارے میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے۔ فقہائے حنفیہ نہ جمع تقدیم کے قائل ہیں، نہ جمع تاخیر کے، لیکن شاہ صاحب جمع تقدیم کو بھی جائز سمجھتے ہیں اور جمع تاخیر کو بھی۔ فرماتے ہیں:

❶ حجۃ اللہ البالغہ ج ۲، ص ۱۰

❷ ایضاً ص ۱۷۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ومنها الجمع بين الظهر والعصر، والمغرب والعشاء❶۔

(یعنی ایک مسئلہ نماز ظہر اور نماز عصر کو اور نماز مغرب اور نماز عشا کو جمع کر کے پڑھنے کا ہے۔)

فشرع لهم جمع التقديم والتاخير لكنه لم يواظب عليه ولم يعزم عليه مثل مافعل في القصر❷۔

(اور رسول اللہ ﷺ نے جمع تقدیم اور جمع تاخیر دونوں کی اجازت دی لیکن نہ اس پر ہمیشگی کا حکم دیا اور نہ اس کی تاکید فرمائی، جیسا کہ سفر میں نماز قصر کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔)

۵۔ جمعۃ القریٰ یعنی دیہات میں جمعہ پڑھنا چاہیے یا نہیں۔ احناف اور اہل حدیث کے درمیان یہ ایک مشہور اختلافی مسئلہ ہے۔ احناف دیہات میں جمعے کے قائل نہیں ہیں، جب کہ حدیث کی روشنی میں اہل حدیث اسے ضروری قرار دیتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب بھی دیہات میں جمعے کے وجوب کے قائل ہیں۔ اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث نقل فرماتے ہیں:

وقال رسول الله ﷺ الجمعة واجبة علىٰ كل قرية❸۔

یعنی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ جمعہ ہر گاؤں میں پڑھنا واجب ہے۔

اس سے آگے فرماتے ہیں:

ومن تخلف عنها فهو الآثم❹۔

(جو شخص جمعہ ترک کر دے وہ گناہ گار ہے۔)

۶۔ عیدین کی تکبیرات میں فقہائے حنفیہ اور محدثین میں اختلاف ہے، محدثین کا نقطہ نظر اس باب میں وہی ہے، جو اہل الحرمین (ساکنان مکہ اور باشندگان مدینہ) کا ہے۔ یعنی پہلی رکعت میں سات تکبیریں اور دوسری میں پانچ تکبیریں کہی جائیں۔ اس کے بعد خطبہ دیا جائے۔ شاہ صاحب بھی اسی طریق عمل کو ترجیح دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

يكبر في الاولى سبعاً قبل القراة، والثانية خمسا قبل القرأة، وعمل الكوفيين ان يكبر اربعاً كتكبيرات لجنائز في الاولى قبل القراء۔ و في الثانية بعدها وهما سنتان وعمل الحرمين ارجح ثم يخطب يامربتقوى الله ويعظ ويذكر❺۔

❶ حجۃ اللہ البالغہ ج ۲، ص ۲۴۔
❷ حجۃ اللہ البالغہ ج ۲، ص ۲۴
❸، ❹ ایضاً ص ۳۰
❺ حجۃ اللہ البالغہ، ج ۲، ص ۳۱

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(پہلی رکعت میں قرأت سے پہلے سات تکبیریں اور دوسری میں قرأت سے پہلے پانچ تکبیریں کہی جائیں۔ (یہ عمل اہل حرمین کا ہے) لیکن اہل کوفہ کا عمل یہ ہے کہ تکبیرات جنازہ کی طرح پہلی رکعت میں قرات سے قبل چار تکبیریں کہی جائیں اور دوسری میں قرأت کے بعد کہی جائیں۔ اگرچہ یہ دونوں طریقے مسنون ہیں، لیکن اہل حرمین کا عمل زیادہ راجح اور قابل حجت ہے۔ اس کے بعد خطیب خطبہ دے، اللہ سے تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دے اور وعظ و نصیحت کرے۔)

۷۔ فقہائے حنفیہ اور فقہائے شافعیہ میں اس مسئلے سے متعلق بڑا اختلاف ہے کہ ''ماء کثیر'' کیا ہے اور پانی کتنی مقدار میں ہو تو نجس ہو جاتا ہے اور کتنی مقدار میں ہو تو نجاست سے آلودہ نہیں ہوتا۔ شوافع کا مسلک اس ضمن میں یہ ہے کہ پانی قلتین ہو تو نجاست سے محفوظ رہتا ہے اور احناف عشر فی العشر'' یعنی ''دہ دردہ'' کی مقدار میں پائے جانے والے پانی کو نجاست کی آلودگی سے مبرا گردانتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر کنوئیں میں کتا، بلی، چوہا وغیرہ مر جائے تو احناف کے نزدیک پانی کے ڈولوں کی ایک خاص تعداد مقرر ہے جن کا کنوئیں سے نکالنا واجب ہے، اگر اس تعداد میں ڈول نہ نکالے جائیں تو پانی نجس ہی رہتا ہے۔ شاہ ولی اللہ بھی حجۃ البالغہ میں اس مسئلے پر بحث کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کنویں میں جانوروں کے مرنے سے پانی کی نجاست و طہارت کے بارے میں جو تفصیلات بیان کی جاتی ہیں، ان کا رسول اللہ ﷺ کے فرمان اقدس یا حدیث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس بحث کو فقہا نے خواہ مخواہ طول دیا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

وقد اطال القوم فی فروع موت الحیوان فی البئر، والعشر فی العشر، والماء الجاری ولیس فی کل ذلک حدیث عن النبی ﷺ البتة ❶۔

(کنوئیں میں مختلف قسم کے حیوانات (کتا، بلی، چوہا وغیرہ) کے مرنے اور دہ دردہ اور ماء جاری کے متعلق مسائل میں فقہاء نے طویل بحثیں کی ہیں، لیکن ان میں سے کسی مسئلے کے متعلق بھی رسول اللہ ﷺ کی قطعاً کوئی حدیث نہیں ہے۔)

اس سے آگے شاہ صاحب لکھتے ہیں:

وبالجملة فلیس فی هذا الباب شئی یعتدبه ویجب العمل علیه وحدیث القلتین اثبت من ذالك کله بغیر شبهة ❷۔

(بات یہ ہے کہ ان مسائل کے سلسلے میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جسے قابل اعتماد اور واجب العمل گردانا جائے۔ البتہ قلتین والی حدیث بلاشبہ زیادہ ثابت اور صحیح ہے۔)

❶ حجۃ اللہ البالغہ ج ۱، ص ۱۸۵۔

❷ ایضاً۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بہر حال شاہ صاحب کی تصانیف سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ہر مسئلے میں کتاب وسنت کو پیش نگاہ رکھتے ہیں، خود بھی اسی پر عمل کرتے اور دوسروں کو بھی اسی پر محل کی تلقین فرماتے ہیں۔ اگر کوئی بات کتاب وسنت میں موجود نہ ہو تو ائمہ کرام میں سے جس کے قول کو سنت سے اوفق یا اقرب پاتے ہیں، اسے اپنے لیے قابل عمل قرار دیتے ہیں اور ہر شخص کو اسی کی تاکید کرتے ہیں۔ وہ حق کو کسی ایک ہی امام یا مجتہد کے قول وعمل میں منحصر نہیں سمجھتے۔

احناف اور غیر احناف کے درمیان جن مابہ الامتیاز مسائل میں زیادہ قوی دلائل کی بنا پر شاہ صاحب احناف سے اظہار اختلاف فرماتے ہیں، ان کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں:

آپ (شاہ صاحب) نے دیگر ائمہ کے بعض اقوال کو از روئے ادلہ، زیادہ قوی سمجھ کر اختیار بھی فرمایا ہے، اور یہ ذکر، نادر قسم کے مسائل ہی کا نہیں ہے بلکہ جن مسائل کو آج کل حنفیوں اور غیر حنفیوں میں مابہ الامتیاز سمجھا جاتا ہے، بعض ایسے مسائل میں بھی شاہ صاحب نے کسی دوسرے امام کے قول کو قوت دلائل کی وجہ سے اختیار کیا ہے۔ مثلاً قلتین، رفع یدین، الترجیع فی الاذان والایتار فی الاقامہ اقامۃ الجمعۃ فی القری التی فیہا اربعون رجلاً حراً وغیرہ وغیرہ ❶۔

ان الفاظ کے بعد مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں:

میرا خیال ہے کہ اگر آج کوئی فاضل دیانت داری سے اس روش پر چلے اور شاہ صاحب ہی کی طرح اس کو "حنفیت" کے مناقض نہ سمجھتا ہو، بلکہ اس کو بھی حنفیت ہی کا ایک طریقہ سمجھتا ہو، اور اسی بنا پر اپنا رشتہ حنفیت سے بھی رکھنا چاہتا ہو تو ہمارے زمانے کے ٹکسالی قسم کے حنفی حضرات کبھی بھی اس کو حنفی تسلیم نہیں کریں گے ❷۔

بلاشبہ شاہ صاحب اور ان کے رفقائے کرام عقائد، اصول، اور فروعی مسائل میں تقلید وجمود کے حامی نہیں۔ ان کا اپنا مکتب فکر یہ ہے (اور اسی کو وہ تمام لوگوں میں رائج کرنا چاہتے تھے) کہ کسی پابندی اور تقید کے بغیر مذاہب اربعہ اور ائمہ حدیث سے منقول مسائل پر، عمل کا قصر رفیع تعمیر کیا جائے۔ بہ ظاہر حنفی ہونے کے باوجود وہ اصحاب الحدیث اور شوافع کے معمولات ورجحانات کو ترجیح دیتے ہیں۔

یہاں یہ حقیقت بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ شاہ صاحب نے فقہی اعتبار سے مسائل حنفیہ پر کثرت سے عمل کا سلسلہ ہندوستان میں دیکھا، لیکن جب وہ حجاز تشریف لے گئے تو وہاں انھیں فقہائے شافعیہ کی بہت بڑی تعداد سے میل جول کے مواقع میسر آئے، یہ حضرات مسائل فقیہ میں عمل حجاز اور حدیث رسول اکرم ﷺ کو مقدم گردانتے تھے، شاہ صاحب چونکہ فکری لحاظ سے بلند مرتبے پر فائز تھے، لہٰذا انھوں نے ان دونوں عظیم مکاتب فکر میں اتحاد کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا، اور اپنی تصانیف میں جابجا یہی طرز عمل اختیار فرمایا۔ ان کے انداز بیان اور اسلوب تحریر سے صاف پتا چلتا ہے کہ فقہی مسائل وافکار میں وہ اہل علم کے اذہان کو تقلید کی جکڑ

❶ الفرقان۔ شاہ ولی اللہ نمبر، ص ۴۰۱

❷ ایضاً

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بندیوں سے آزاد دیکھنے کے متمنی تھے۔ چنانچہ اصحاب فکر ونظر کو سخت لہجے میں فرماتے ہیں:

خضتم کالخوض فی استحسانات الفقہاء من قبلکم و تفریعاتھم۔ اما تعرفون ان الحکم ماحکمه الله ورسوله، ورب انسان منکم یبلغه حدیث من احادیث نبیکم فلایعمل به، ویقول انما عملی علیٰ مذھب فلان لاعلی الحدیث ثم اختال بان فھم الحدیث فالقضاء به من شان الکمل المھرۃ وان ائمة لم یکونوا ممن یخفیٰ علیھم ھذا الحدیث فما ترکوہ الالوجه ظھرلھم فی الدین من نسخ و مرجوحیة ❶۔

(تم نے پوری طرح اپنے سے پہلے کے فقہا کے استحسانات اور تفریعات کی طرف توجہ مرکوز کر رکھی ہے۔ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ درحقیقت حکم تو صرف اللہ تعالیٰ کا اور اس کے رسول ﷺ کا ہے۔ تم میں سے بہت سے لوگوں کو آنحضرت ﷺ کی حدیث پہنچ جاتی ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ ہم تو فلاں امام کے مذہب کے پابند ہیں، حدیث کے نہیں۔ وہ اپنے دل میں یہ خیال جمائے بیٹھے ہیں کہ حدیث کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ماہرین اور اصحاب کمال کا شیوہ ہے، اور ائمہ کرام سے کوئی بات مخفی نہ تھی۔ ان کو اس حدیث کا ضرور علم ہوگا، انھوں نے اس کو چھوڑ دیا اور اس پر عمل نہیں کیا تو اس کی وجہ یا تو اس کا نسخ ہوگا یا مرجوحیت ہوگی، ورنہ وہ ضرور اس پر عمل کرتے۔)

ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ شاہ صاحب ان حضرات سے سخت ذہنی اور فکری کوفت محسوس کرتے ہیں، جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کے واضح احکام کو ترک کر کے محض بر بنائے تقلید اپنے ائمہ عظام کے ارشادات کو مرکز عمل قرار دے رکھا ہے۔

شاہ صاحب ان معنوں میں حنفی نہ تھے کہ تقلید کو اپنا مطمحِ نظر ٹھہرائیں۔ وہ ہر چیز کو کتاب وسنت کی میزان میں رکھتے تھے اور اسی بات پر عمل کرتے تھے، جو کتاب وسنت سے ہم آہنگ ہوتی۔ کسی خاص امام کے قول کے مقابلے میں کتاب وسنت کے صریح احکام کا ترک ان کے نزدیک انتہائی مذموم اور قابل نفرت ہے۔

وہ ان معنوں میں اہل حدیث بھی نہ تھے، جو بعض حضرات کے نزدیک مشہور و متعارف ہیں۔ ان کا نقطۂ فکر یہ تھا کہ جو بات کسی فقہی مسلک میں قرآن اور حدیث کی نص صریح سے ثابت ہے، یا اس بنیادی ماخذ سے مطابقت رکھتی ہے، اس کو معمول بہا ٹھہرایا جائے۔ اس سلسلے میں ان کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے، جو مندرجہ ذیل ہے:

شیخ محمد فاخر زائرؔ الہ آبادی بارھویں صدی ہجری کے نامور عالم تھے۔ ان کے حالات گزشتہ صفحات

❶ تفہیمات الٰہیہ ج ۱ ص ۲۸۳۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں بیان ہو چکے ہیں، وہ ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء میں صوبہ یوپی کے شہر الہ آباد میں پیدا ہوئے اور ۱۱ ذی الحجہ ۱۱۶۴ھ کو برہان پوری میں وفات پائی۔ شیخ ممدوح غالباً جب پہلی مرتبہ دہلی تشریف لائے تو انھیں ایک عجیب واقعہ پیش آیا، وہ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے دہلی کی جامع مسجد میں نماز پڑھی تو آمین بالجہر پکاری۔ وہاں کے لوگوں کے لیے یہ ایک نئی بات تھی، اور وہ شیخ محمد فاخر اور ان کے مرتبہ علم وفضل سے بھی واقف نہ تھے۔ نماز میں آمین بالجہر کی آواز سنی تو سخت حیران ہوئے۔ نماز کے بعد شیخ کو گھیر لیا اور مختلف قسم کی باتیں کرنے لگے۔ شیخ نے ہر چند رسول اللہ ﷺ کی حدیث کا حوالہ دے کر انھیں اپنی بات سمجھانے اور مطابق سنت ثابت کرنے کی کوشش کی، مگر کسی نے ایک نہ مانی اور بدستور ان سے بحث کرتے رہے۔ آخر شیخ نے فرمایا کہ میری بات تم نہیں مانتے تو مجھے اپنے شہر کے کسی عالم کے پاس لے چلو، ان سے مسئلہ پوچھ لیتے ہیں۔ وہ لوگ شیخ ممدوح کو حضرت شاہ ولی اللہ کے پاس لے گئے اور ساری بات ان کے گوش گزار کی۔ شاہ صاحب نے لوگوں سے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث سے آمین بالجہر پکارنا ثابت ہے۔ شاہ صاحب کی زبان سے یہ الفاظ سن کر لوگ چلے گئے اور بھیڑ چھٹ گئی۔ شیخ محمد فاخر اور شاہ ولی اللہ دونوں رہ گئے تو موقع پا کر شیخ محمد فاخر نے شاہ صاحب سے کہا: ''آپ کھلتے کیوں نہیں''؟

شاہ صاحب نے جواب دیا۔ ''اگر کھل جاتا تو آج آپ کو کیسے بچاتا۔''

اس قسم کے واقعات سے صاف پتا چلتا ہے کہ شاہ ولی اللہ کو معروف ومتعارف معنوں میں حنفی کہنا یا اہل حدیث کے زمرے میں داخل کرنا محض کھینچا تانی ہے۔ البتہ ان کا عمل ان مسائل پر تھا جو احادیث سے ثابت ہیں اور جن پر اہل حدیث عامل ہیں۔

علم تصوف:

شاہ ولی اللہ صاحب بحر تصوف کے شناور اور اس کی تمام اداؤں سے بہ درجہ غایت آشنا تھے۔ اس کی چند وجوہ ہیں :

۱۔ ان کے دور میں تصوف کا عام چرچا تھا اور اہل علم میں اس کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔

۲۔ شاہ صاحب کے اسلاف اس علم سے گہری وابستگی رکھتے تھے، ان کے خاندان کے دیگر اہل علم کو بھی اس سے لگاؤ تھا۔ شاہ صاحب کے اخلاف کی بھی اس سے دلچسپی قائم رہی۔

۳۔ اس دور میں انھی اہل علم کی بات کو زیادہ لائق اعتنا سمجھا جاتا تھا، جو تصوف سے رسم وراہ رکھتے تھے۔ اب بھی عام طور پر یہی حال ہے۔

۴۔ ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی جو اس دور میں بھی ہے اور اسے کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں کے متعدد علوم وفنون میں تصوف کی چھاپ موجود ہے۔ مثلاً ان کے ادب میں تصوف کے اثرات پائے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاتے ہیں، ان کی شعر و شاعری کو اس نے بہت متاثر کیا ہے، فلسفۂ اسلام کی توضیح و تبیین میں اس کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے، مذہب میں اس کا باقاعدہ عمل دخل ہے، اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے اسلوب میں اس سے مدد لی جاتی ہے، مسلمانوں کی ثقافت کا یہ ایک اہم جز بن گیا ہے اور ان کے رسم و رواج تک میں اس کی جڑیں پیوست ہو گئی ہیں۔ لہٰذا شاہ صاحب کا اس سے اثر پذیر ہونا اور اس کے مختلف گوشوں سے واقفیت حاصل کرنا وقت کا ضروری تقاضا تھا۔

شاہ صاحب نے اس علم کو مرکز التفات ٹھہرایا اور اس میں اس درجے رسوخ حاصل کیا اور گہرائی کو پہنچے کہ اسے بہ طور مثال پیش کیا جاتا ہے۔

تصوف کو مسلمانوں کے لٹریچر کے ایک لازمی جز کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ اگر کوئی شخص اس سے عدم اعتنا کرتا ہے تو اسے یہ سوچنا پڑے گا کہ اس طرز عمل سے مسلمانوں کے بہت سے اجزائے علم متاثر ہوں گے اور ان امور سے تہی دامن ہونے کے خطرات ابھریں گے، جو ہمارے متعدد علوم میں پوری طرح رچ بس گئے ہیں۔

علاوہ ازیں اس حقیقت کو بھی نظر و بصر سے اوجھل نہیں کیا جا سکتا کہ صحیح تصوف سے قلب میں اخلاص کے جذبات ابھرتے اور روح میں احسان کے داعیے کروٹ لیتے ہیں۔ اخلاق کا پاکیزہ عاطفہ جنم لیتا اور کردار کی نئی دنیا عالم وجود میں آتی ہے۔ زبان آشنائے عذوبت اور گفتار ہم آہنگ لطافت ہوتی ہے۔

بہرکیف تصوف کے کچھ اثرات مثبت اسلوب میں ظاہر ہوتے ہیں اور کچھ منفی انداز میں۔! مثبت اسلوب یہ ہے کہ صحت مندانہ تصوف سے، بہ الفاظ واضح اس تصوف سے جسے کتاب و سنت کی روشنی میں اختیار کیا جائے، انسان کے دل میں ترحم، تلطف، دوسرے کی ہمدردی، ایثار، خدمت گزاری، خداترسی اللہ کا خوف، ابنائے جنس سے محبت، مخلوق خدا سے مودت، تقویٰ الٰہی، فرائض شرعی کی تکمیل، اصلاح نفس، بڑے کی تکریم اور چھوٹے پر شفقت وغیرہ کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ منفی انداز یہ ہے کہ غلظت قلب، انتقامی جذبات، حسد و کدورت، خواہشات نفس، عداوت و دشمنی، ہوا و ہوس، غیظ و غضب اور دیگر برائیوں کا صحیح تصوف سے خاتمہ ہوتا ہے۔

یہی وہ تصوف ہے جس کو اپنانے سے انسان نیکی اور صالحیت کا پیکر بن جاتا ہے، اور یہی وہ تصوف ہے جو عین اسلام ہے، اور شاہ صاحب اپنے مخاطبین کو اسی تصوف کی تلقین اور تبلیغ فرماتے ہیں۔ اس کے علاوہ ''تصوف'' کی جو بھی قسم اور شکل ہے، سب خلاف شریعت اور کتاب و سنت کے منافی ہے۔

اصحاب تصوف کے اس طرز عمل سے جو شرعی نقطۂ نظر سے قابل اعتراض ہے، شاہ صاحب خوب آگاہ تھے۔ وہ اس کی سخت الفاظ میں تردید کرتے ہیں اور جو بدعات ان صوفیا نے مسلمانوں میں رائج کر دی تھیں، ان سے بچنے کی تاکید فرماتے ہیں۔ چنانچہ وصیت نامہ میں اپنی تیسری وصیت میں کہتے ہیں کہ اس زمانے کے جو مشائخ کئی قسم کی بدعات میں مبتلا ہیں، اور اپنی کرامتوں کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں، ان کے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دینا چاہیے اور کبھی ان کے حلقہ بیعت میں داخل نہیں ہونا چاہیے۔ شاہ صاحب اس قسم کے لوگوں کو ''دغاباز'' اور

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"کرامات فروشان ایں زمانہ" قرار دیتے ہیں۔

شاہ صاحب بلاشبہ صوفی اور اہل سلوک میں سے تھے، لیکن تصوف و طریقت کے کسی ایک ہی خاص سلسلے کے پابند نہ تھے، جس صاحب فیض کو احکام شریعت کا متبع سمجھتے، اس سے فیض حاصل کرتے۔ یعنی جس طرح وہ فقہ کے مذاہب اربعہ میں سے کسی خاص مذہب کے مقلد نہ تھے، اسی طرح اہل سلوک کے سلسلوں میں سے بھی کسی ایک سلسلے سے وابستگی نہ رکھتے تھے۔ بلکہ تمام مذاہب فقہ اور سلاسل تصوف میں سے جس کی جو بات قرآن و حدیث کے زیادہ مطابق اور انسان کی دینی اور روحانی فلاح و بہبود کے لیے زیادہ فائدہ مند سمجھتے، اسے اختیار فرما لیتے۔

شاہ صاحب نے علم تصوف کے بارے میں متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں قول الجمیل، الطاف القدس، خیر کثیر، انتباہ فی سلاسل اولیا اللہ، سطعات اہمعات، لمعات قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں تفہیمات الٰہیہ کا اکثر حصہ مسائل تصوف سے متعلق ہے۔ انفاس العارفین میں بھی تصوف کے بہت سے مباحث آ گئے ہیں۔ ان کتابوں کے اردو ترجمے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن ان کے بیشتر مسائل نہایت مشکل اور پیچیدہ ہیں۔ ان کا سمجھنا بھی ہر صاحب علم کے بس کا روگ نہیں۔ ان میں بعض ایسی چیزیں بھی آ گئی ہیں جن کی صحت اور عدم صحت کے بارے میں ایک سے زائد رائیں ہو سکتی ہیں اور شرعی نقطہ نظر سے ان میں بہرحال اختلاف یا اتفاق کی گنجائش موجود ہے۔

اقتصادی، معاشی اور اصلاحی نظریات:

شاہ صاحب نے اپنی تصنیفات بالخصوص حجتہ اللہ البالغہ کے ابواب ابتغاء الرزق، باب سیاستہ المدنیہ، باب الرسوم السائرۃ بین الناس، باب اقامتہ الارتفاقات واصلاح الرسوم وغیرہ میں معاشرتی اصلاح کے کچھ اصول بیان کیے ہیں، جو مذہبیات، تجارت، اقتصادیات، سیاسیات، نظام حکومت، آجر اور کاشت کار کے حقوق اور بعض دیگر معاملات میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں:

- جو معاشرہ کسی کی محنت اور جدو جہد کا قدر دان نہیں، اور اس کی مناسب اجرت ادا نہیں کرتا، آجر اور مزارع پر نا قابل برداشت محصولات عائد کرتا ہے، وہ قوم کا دشمن ہے، اسے ختم ہو جانا چاہیے۔
- عیاشی کے مراکز اور جوئے اور قمار بازی کے اڈے وغیرہ یک قلم بند کر دیے جائیں۔ اگر یہ باقی رہیں گے تو دولت کی تقسیم کا صحت مندانہ نظام قائم نہیں ہو سکے گا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دولت زیادہ لوگوں کے ہاتھوں میں جانے اور صحیح خطوط پر گردش کرنے کے بجائے چند محدود افراد کے قبضے میں چلی جائے گی۔
- پیداوار اور آمدنی کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے کا ہر فرد ایک دوسرے سے تعاون کرے۔ اگر اس میں تعاون کا اصول کارفرما نہیں ہوگا تو معاشرتی خرابیاں پیدا ہوں گی۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

⦿ مزدور اور کاشت کار کی حیثیت قوت کاسبہ کی ہے، اور دولت کا حصول، محنت اور باہمی تعاون کا متقاضی ہے۔ کیوں کہ شہریت اور مدنیت کی اصل روح یہی ہے۔ جو شخص ملک اور قوم کی خدمت کے لیے تگ ودو نہیں کرتا، وہ ملکی دولت میں حصے دار بننے کا مستحق نہیں ہوسکتا۔

⦿ دولت کے مستحق وہی لوگ ہیں جو اجرت اور زراعت کے ذریعے یا دماغی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ملک وقوم کی خدمت کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ ان کی خوش حالی اور ارتقا ملک وقوم کی خوش حالی اور ارتقا کے مترادف ہے۔ جو معاشرتی نظام ان قوتوں کو کمزور کرنے کے درپے ہے، اس کو قائم نہیں رہنا چاہیے۔

⦿ آجر کے اوقات کار کی تعیین اور تحدید ضروری ہے، اس کو اتنا وقت بہرحال ملنا چاہیے، جس میں وہ اپنی اخلاقی اصلاح اور روحانی پاکیزگی کے لیے کوئی قدم اٹھا سکے، اور اپنی ان صلاحیتوں کا جائزہ لے سکے جو اللہ نے اس کے اندر ودیعت کی ہیں۔

⦿ تجارت، باہمی تعاون کا عظیم ذریعہ ہے، اس لیے تجارت کو اسی بنیادی اصول کے مطابق جاری رہنا چاہیے۔ نہ تاجر پیشہ طبقے کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ غلط طریق کار اختیار کر کے چیزوں کی قیمتیں بڑھائے اور نہ حکومت کے لیے مناسب ہے کہ وہ بھاری بھرکم محصول عاید کر کے تجارت کے فروغ وترقی میں رکاوٹ پیدا کرے۔ یہ چیزیں ترقی اور باہمی تعاون کو نقصان پہنچانے کا باعث بنتی ہیں۔

⦿ زمین کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے، ملک کے باشندوں کی حیثیت فقط اتنی ہے، جتنی کہ مسافر خانے میں قیام کرنے والے کسی مسافر کی ہوسکتی ہے۔

⦿ تمام انسان بحیثیت انسان یکساں ہیں۔ کوئی شخص مالک الملک یا ملک الناس یا مالک قوم نہیں کہلا سکتا۔ کوئی اپنے آپ کو انسانوں کا مالک نہ سمجھے۔ کوئی شخص کسی بڑے سے بڑے آدمی کے لیے بھی اس قسم کے الفاظ استعمال نہ کرے۔

⦿ ریاست کے امیر یا سربراہ کی حیثیت کسی وقف کے متولی کی سی ہے۔ وقف کا متولی اگر ضرورت مند ہو تو اس میں سے اتنا وظیفہ لے سکتا ہے کہ جس سے ملک کے ایک عام شخص کی طرح زندگی بسر کر سکے۔

⦿ شاہ صاحب نے اپنی تصنیف البدور البازغہ کے بعض مباحث اور حجۃ اللہ البالغہ کے مختلف ابواب میں انسان کے بنیادی حقوق کی بھی وضاحت فرمائی ہے، جن کا خلاصہ یہ ہے۔

⦿ رہائش کے لیے مکان، کھانے پینے کی چیزیں، پہننے کے لیے کپڑا، اور اتنی استطاعت کہ نکاح و ازدواج کا سلسلہ قائم ہو سکے اور بچوں کی تعلیم وتربیت ہو سکے، یہ وہ ضروریات ہیں جن کے حصول کا مذہب اور نسل کی تفریق کے بغیر ہر شخص کو استحقاق ہے

⦿ بلا امتیاز مذہب ونسل اور بلا تفاوت رنگ ولون ملک کے تمام لوگوں میں عدل وانصاف، مال وجان کا تحفظ، عزت وناموس کی حفاظت اور شہری حقوق میں یکسانیت سب کا بنیادی حق ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

⊙ اپنی زبان اور تہذیب و ثقافت کو محفوظ اور زندہ رکھنا ہر فرقے اور جماعت کا حق ہے۔

مذہبی معاملات میں شاہ صاحب کا نقطہ نظر یہ ہے کہ تمام فرقوں میں سچائی کے اصول اور صداقت کے بنیادی تقاضے مسلمہ ہیں۔ مثلاً سب لوگ اللہ کی عبادت کو ضروری قرار دیتے ہیں، صدقات و خیرات کو لازمی چیز سمجھتے ہیں، اور روزے کے قائل ہیں، البتہ عبادت کے طریقے اور شکلیں مختلف ہیں۔ کسی کو پریشان کرنا، قتل و غارت پر آمادہ ہونا، بے حیائی پر اتر آنا، معصیت کا ارتکاب کرنا اور برائی پھیلانا یا کسی کو غلط باتوں کی ترغیب دینا، سب کے نزدیک معیوب اور مذموم ہے۔ ہر مذہب اور ہر فرقے کے لوگ اس کی مذمت کرتے ہیں۔

شاہ صاحب نے معاشرتی اصلاح کے جو اصول اور نظریات بیان کیے ہیں۔ وہ انتہائی اہم ہیں۔ ان سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ اپنی مختلف تصانیف کے متعدد ابواب میں موقع و محل کی مناسبت سے انھوں نے بڑی صفائی کے ساتھ ایسی باتیں تحریر فرمائی ہیں جو ہر دور میں ہر شخص کے لیے قابل قبول ہیں اور آسانی سے ذہن و فکر میں اترتی جاتی ہیں۔

اقتصادی اور معاشی نظریات کی بھی انھوں نے وضاحت کی ہے اور نہایت زوردار الفاظ میں دردناک انداز کے ساتھ ملک کے مختلف طبقوں کو مخاطب کیا ہے۔ وہ امرائے مملکت کو ان الفاظ سے خطاب فرماتے ہیں:

اے طبقہ امرا۔! غور سے سنو! کیا تمھیں اللہ کا خوف نہیں، تم دنیا کی عارضی اور فانی لذتوں میں غرق ہورہے ہو، اور جن لوگوں کی حفاظت کی ذمے داری تم پر عائد کی گئی ہے، ان سے تم نے روگردانی کرلی ہے، تاکہ ان کے بعض لوگ بعض لوگوں کو کھاتے اور نگلتے رہیں۔ تمھاری تمام تر ذہنی توانائیاں فقط اس پر خرچ ہورہی ہیں کہ مختلف قسم کے لذیذ کھانے پکواتے اور عورتوں سے لطف اندوز ہوتے رہو۔ بہترین کپڑوں اور بلند و بالا مکانوں کے سوا تم اور کسی چیز کی طرف ملتفت نہیں ہوتے۔

سپاہیوں اور فوجیوں میں ان کے عہد میں جو برائیاں پیدا ہوگئی تھیں، ان کی نشان دہی کرتے ہوئے ملک کے اس طبقے کو مخاطب ہوکر کہتے ہیں۔

تم اپنے اخراجات میں میانہ روی اختیار کرو اور اعتدال کی راہ اپناؤ، اپنے آپ کو صرف اتنی ہی روزی پر قناعت کرنے کے لیے آمادہ کرو جو تمھیں آخرت کی زندگی کے بہتر نتائج تک پہنچانے کے لیے کافی ہو۔ اپنے خرچ کو اپنی آمدنی سے کم رکھو۔ اس میں سے جو بچ جائے اس سے مسافروں اور مسکینوں کی مدد کرو۔ ناگہانی اور اتفاقی مصیبتوں اور ضرورتوں کے لیے بھی بچا کر رکھا کرو۔

مشائخ کو بالخصوص سخت الفاظ اور ترش لہجے سے خطاب کرتے ہیں فرماتے ہیں:

ہم ایسے لوگوں کو ہرگز پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے جو لوگوں کو محض اس لیے اپنے حلقہ ارادت میں داخل کرتے ہیں تاکہ ان سے روپے پیسے وصول کریں۔

اس سلسلے میں شاہ صاحب مذکورہ بالا طبقوں کے علاوہ ملک کے عام لوگوں کو بھی خطاب کرتے ہیں اور

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انھیں نصیحت کے اسلوب میں فرماتے ہیں:

اپنے رہن سہن اور انداز زیست میں تکلف سے کام نہ لو اگر ایسا کرو گے تو بالآخر فسق کی حدود میں داخل ہو جاؤ گے۔ اللہ کے نزدیک پسندیدہ چیز یہ ہے کہ اس کے بندے اس کی پیدا کردہ سہولتوں سے فائدہ اٹھائیں۔ اتنا کچھ کمانے کی سعی کرو جس سے تمھاری ضرورتیں پوری ہوسکیں۔ معاشی طور سے دوسروں پر اس طرح بوجھ نہ بنو کہ ان سے مانگ مانگ کر کھاؤ۔ یا ان سے مانگو اور وہ نہ دیں۔ اسی طرح ارباب سلطنت اور اصحاب حکومت پر بھی بوجھ نہ بنو۔ تمھارے لیے مناسب اور بہتر بات یہی ہے کہ خود کما کر کھاؤ، اگر ایسا کرو گے تو خدا تمھیں معاش کی ایسی راہ سجھا دے گا جو تمھاری ضروریات کی تکمیل کے لیے کافی ہوگی۔

اے ابنائے آدم! اللہ نے جس کو سکونت کے لیے جگہ عنایت کر دی ہو، جس میں وہ آرام کرے، اتنا پانی عطا فرما دیا ہو، جس سے سیراب ہو سکے، اتنا کھانے کو دے دیا ہو جس سے گزر بسر ہو سکے، اتنا کپڑا ہو، جس سے تن بدن کو ڈھانپ سکے، ایسی بیوی اس کے گھر میں ہو، جو رہن سہن کے معاملات میں اس کو مدد دے سکتی ہو، یاد رکھو، پوری دنیا اس شخص کو مل چکی ہے، ضروری ہے کہ ان نعمتوں پر وہ خدا کا شکر ادا کر سکے۔

اس سے آگے لکھتے ہیں:

انسان کو کمائی کی کوئی نہ کوئی راہ بہر حال اختیار کرنی چاہیے۔ یہ اس کے لیے بہت ضروری ہے۔

شاہ صاحب کا زمانہ چونکہ مغلیہ سلطنت کے زوال کا زمانہ ہے، اس لیے انھوں نے حجۃ اللہ البالغہ کے باب سیاست المدنیہ میں زوال سلطنت کے اسباب پر بھی بحث کی ہے۔ اس کے انھوں نے مختلف اسباب بیان کیے ہیں، جن میں بڑا سبب اقتصادی ہے۔ اس زمانے میں سپاہی، شاعر، زاہد، صوفی اور بعض دیگر لوگ بالکل بے کار ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ اور بادشاہ خود ان کو انعام و اکرام سے نوازتے تھے۔ اسی طرح اہل کاروں نے محنت اور سعی و کوشش کو ترک کر دیا تھا۔ حکومت نے کاشت کاروں اور تاجروں سے بھاری محصول لینا شروع کر دیے تھے، اور اس سلسلے میں ان پر سختی کی جاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی اقتصادی اور معاشی حالت کو شدید دھچکا لگا اور حالات روز بروز بگڑتے چلے گئے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

اس زمانے میں ملک کی خرابی اور ویرانی کے زیادہ تر دو سبب ہیں۔ ایک بیت المال یعنی ملک کے خزانے پر مالی بوجھ، وہ اس طرح کہ لوگوں کو یہ عادت پڑ گئی ہے کہ کسی قسم کی محنت کرنے اور مشقت اٹھائے بغیر ملکی خزانے سے اس دعوے کے ساتھ روپیہ حاصل کریں کہ وہ ملک کے سپاہی ہیں یا عالم ہیں، جو اس ملک کے خزانے کی آمدنی میں اپنا حق رکھتے ہیں ــــــ یا ان لوگوں میں سے ہیں جن کو بادشاہ خود انعام و اکرام عطا کیا کرتے ہیں، جیسے زہد پیشہ لوگ یا شعرا حضرات، اسی طرح دوسرے طبقوں کے لوگ جو ملک اور سلطنت کا کوئی کام کیے بغیر کوئی نہ کوئی ایسا ذریعہ اختیار کر کے روزی حاصل کرتے ہیں، جس میں ان کو کوئی محنت نہیں کرنا پڑتی۔ ــــــ یہ وہ لوگ ہیں جو ملک کے ذرائع آمدنی کو کم کرتے ہیں اور ملک کے خزانے پر بوجھ بنے ہوئے ہیں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ملک کی اقتصادی حالت کی خرابی کا دوسرا سبب کاشت کاروں، تاجروں اور مختلف پیشے کے لوگوں پر بھاری بھر کم محصول لگانا اور اس سلسلے میں ان پر سختی کرنا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ حکومت کے اطاعت شعار اور اس کے تابع احکام ہیں، وہ تباہ ہو رہے ہیں، اور جو سرکش اور نادہندہ ہیں وہ اور سرکش ہو رہے ہیں، اور ان کے ذمے حکومت کے جو واجب الادا محصول ہیں، وہ ادا نہیں کرتے، حالانکہ ملک اور سلطنت کی ترقی اس بات میں مضمر ہے کہ محصول کم ہو، اور فوج اور اہل کاروں کا تقرر ضرورت کے مطابق کیا جائے۔ اس زمانے کے لوگوں کو ہوشیار ہو کر اس راز اور نکتے کو سمجھنا چاہیے ❶۔

شاہ صاحب کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ فرسودہ نظام بہر حال تباہی سے ہم کنار ہوگا۔ انھیں ملکی فضا میں فکِ کل نظام یعنی انقلاب احوال کی صدائیں بلند ہوتی سنائی دیتی تھیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ معاشی نظام کو صحیح اصولوں کے مطابق ترقی دینا اور اس کی بنیادوں کو مستحکم کرنا انسانی معاشرے کے استحکام کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اس سلسلے میں وہ وضاحت سے کہتے ہیں کہ زمین کو درست کرنا، اس کو قابل کاشت بنانا، مویشیوں کی افزائش نسل کے لیے کوشاں ہونا اور باہمی تعاون سے کام لینا لازمی ہے۔ اس ضمن میں حجۃ اللہ البالغہ میں انھوں نے جو الفاظ تحریر کیے ہیں، ان کا ترجمہ یہ ہے:

انسانی معاشرے میں معاشی وسائل کو بروئے کار لانے کے لیے بنیادی اصول یہ ہے کہ جائز مال کو قبضے میں لایا جائے اور اس کو مناسب اور جائز طریقے سے ترقی دی جائے، جیسے مویشیوں کی افزائش نسل، آب پاشی اور زمین کو درست کر کے زراعت کرنا وغیرہ۔ لیکن اس تعاون باہمی سے معاشی وسائل کے حصول کی لازمی شرط یہ ہے کہ انسانی معاشرے میں ترقی کی طرف قدم زن ہونا ایک دوسرے کی معاشی زندگی کے لیے تکلیف اور تنگی کا سبب نہ بن جائے، جس کا نتیجہ تمدنی فساد کی صورت میں ظاہر ہونے لگے ❷۔

مال کو بڑھانے اور اقتصادی ذرائع کو ترقی دینے کے مسئلہ پر بھی شاہ صاحب نے بحث کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس میں باہمی تعاون ضروری ہے، جن ذرائع میں باہمی تعاون کا فقدان ہوگا اور ایک دوسرے کی رضامندی مفقود ہوگی، وہ ناپسندیدہ اور غیر مستحسن ہوں گے۔ شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

فان کان الاستمناء فیما لیس له دخل فی التعاون کالمیسر اوبما هو تراض یشبه الاقتضاب کالر فان المفلس یضطر الیٰ التزام مالا یقدر علیٰ ایفائه ولیس رضاه رضافی الحقیقة فلیس من العقود المرضیة والاالاسباب الصالحة وانما هو باطل وسحت باصل الحکمه المدینة❸۔

❶ حجۃ اللہ البالغہ باب سیاستہ المدینہ ج ا ص ۴۵۔

❷ حجۃ اللہ البالغہ ابواب ابتغاء الرزق، ج ۲ ص ۱۰۳۔

❸ ایضاً۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یعنی اگر مال بڑھانے میں باہمی تعاون کو دخل نہ ہو جیسے جوئے بازی یا ایسی رضامندی ہو جس میں جبر پایا جاتا ہو، جیسے سود، ایک مفلس آدمی سود مجبوری کی حالت میں ادا کرتا ہے، کیوں کہ وہ درحقیقت اس کے ادا کرنے پر قادر نہیں ہوتا، اس قسم کے تمام معاملات ناپسندیدہ اور غیر مستحسن ہیں، اور اجتماعی زندگی میں جو اصول کارفرما ہیں، ان کے مطابق یہ معاملات باطل اور حرام قرار پاتے ہیں، ان کا صاف ستھری مدنیت اور صحت مندانہ شہریت سے کوئی تعلق نہیں۔

شاہ صاحب محصولات کی بھرمار، عیاشانہ زندگی، زیورات کی کثرت اور بلند وبالا عمارتوں کو بھی اقتصادی اعتبار سے تباہ کن اور ملک کے مفاد عامہ کے منافی قرار دیتے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

وکذالك من مفاسد المدن ان ترغب عظماء هم فی دقائق الحلی واللباس والبناء والمطاعم وعید النساء ونحوذالك زیادة علی ماتعطیه الارتفاقات الضروریة التی لابدللناس منهاواجتمع علیها عربهم وعجمهم۔

یعنی شہروں کی بربادی اور مدنیت کی (اقتصادی) خرابی کے اسباب میں سے ایک سبب یہ ہے کہ وہاں کے باشندے عمدہ زیورات، بہترین لباس، پُرشکوہ عمارات، لذیذ کھانوں اور عورتوں کے حسن وغیرہ کو اپنے لیے مرغوب اور پسندیدہ چیزیں قرار دے لیں، اور اس طرح وہ ان ارتفاقات ضروریہ یا مفادات عامہ کے حصول میں حد سے تجاوز کرنے لگیں، جو انسان کی ضروریات میں شامل ہیں اور جن پر عرب وعجم کے لوگوں کا بہرحال اتفاق ہے۔

شاہ صاحب بے پناہ بصیرت کے مالک تھے، آج سے تقریباً تین سو سال پہلے اقتصادیات کے بارے میں انھوں نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اس بنیادی مسئلے کے تمام پہلوؤں پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ حجۃ اللہ ہی میں لکھتے ہیں:

اگر کسی قوم میں تمدن کا ارتقا خاص تسلسل کے ساتھ جاری رہے تو اس کی صنعت وحرفت درجہ کمال کو پہنچ جاتی ہے، پھر اگر حکمران طبقہ آرام وآسائش اور زینت وتفاخر کو زندگی کا شعار بنا لے تو اس کا تمام تر بوجھ قوم کے کاری گر طبقے پر پڑے گا اور اتنا بڑھ جائے گا کہ معاشرے کا بہت بڑا حصہ حیوانوں کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اور انسانیت کا اجتماعی اخلاق اس وقت تباہ ہو جائے گا جب جبر کے کے ذریعے سے لوگوں کو اقتصادی تنگی پر مجبور کر دیا جائے تو وہ گدھوں اور بیلوں کی طرح فقط روٹی کمانے کے لیے کام کریں گے۔ جب انسانوں پر ایسی سخت مصیبت نازل ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کی نجات کے لیے ضرور کوئی راستہ ان کو سجھا دیتا ہے۔ یعنی ضروری ہو جاتا ہے کہ قدرت الٰہیہ انقلاب وتغیر کے سامان پیدا کر کے اس غلط حکمران طبقے کا بوجھ قوم

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے سر سے اتار دے۔

حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ صاحب نے ملکیت زمین کے مسئلے کو بھی موضوع بحث ٹھہرایا ہے۔ ان کے نظریے کے مطابق حقیقت میں ساری زمین سرائے یا مسجد کی حیثیت رکھتی ہے اور اس سے انتفاع میں سب لوگ برابر کے شریک ہیں۔ ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

والارض كلها فى الحقيقة بمنزلة مسجد او رباط جعل وقفا على ابناء السبيل وهم شركاء فيه فيقدم الاسبق فالاسبق ومعنى الملك فى حق الادمى كونه احق بالانتفاع من غيره❶۔

یعنی زمین درحقیقت سب کی سب مسجد یا سرائے کی حیثیت رکھتی ہے جو مسافروں کے لیے وقف کی گئی ہے، اور وہ سب اس میں برابر کے شریک ہیں، تقدم صرف پہلے اور پھر اس سے پہلے کو حاصل ہوا۔ انسان کے حق میں ملک کا مطلب فقط اتنا ہے کہ وہ دوسرے کی نسبت اس سے انتفاع کا زیادہ استحقاق رکھتا ہے۔

سیاسی بصیرت کی چند مثالیں:

شاہ ولی اللہ کا زمانہ ہندوستان میں سیاسی لحاظ سے نہایت پرآشوب زمانہ تھا۔ پورا ملک بدامنی کی خوف ناک لہروں کی زد میں تھا۔ ہر طرف بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی، نظم و نسق کی تمام چولیں ڈھیلی پڑ گئیں تھیں، بادشاہ کا احترام لوگوں کے دلوں سے ختم ہو چکا تھا، عسکری نظام تباہ ہو گیا تھا، مغلوں کے ڈیڑھ سو سالہ اقتدار کا ملک گیر سایہ تیزی سے سمٹ رہا تھا، سرکش اور باغی عناصر ہر طرف دندناتے پھرتے تھے، کسی کو انھیں روکنے اور ٹوکنے کی جرأت نہ تھی۔ روہیلے، جاٹ، مرہٹے، سکھ سب ہوس ملک گیری میں مبتلا تھے۔ لوٹ مار کا دور دورہ اور قتل و غارت کا بازار گرم تھا اور مغل بادشاہوں کا تاج ان ہیبت ناک طوفانی موجوں کی لپیٹ میں آ کر اپنا روایتی وقار کھو چکا تھا۔

ظاہر ہے یہ حالات نہایت مایوس کن اور ذہنی طور سے بہ درجہ غایت اذیت ناک تھے۔ لیکن شاہ صاحب نے ہمت نہ ہاری۔ انھوں نے تاریکیوں میں روشنی تلاش کرنے کی کوشش کی اور ظلمت کے مہیب طوفانوں میں شمع جلانے کا عزم کیا۔ تمام واقعات کا پوری سیاسی بصیرت کے ساتھ جائزہ لیا، زوال سلطنت کے اسباب پر غور کیا، ملک میں بسنے والی سب قوموں کے نقطہ نظر کا اندازہ لگایا، امرا و سلاطین کی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کو پرکھا اور پھر اصلاح احوال کے لیے کام کا ایک نقشہ تیار کیا۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ شاہ صاحب کے اسلاف میں سے دو ایک کے سوا (جن کا ذکر گزشتہ صفحات

❶ حجۃ اللہ البالغہ، ابواب ابتغاء الرزق ج ۲، ص ۱۰۳۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں آ چکا ہے) ارباب حکومت اور اصحاب اقتدار سے کبھی کسی کو کوئی تعلق نہیں رہا۔ لیکن اس کے باوجود شاہان مغلیہ کے ہاں شاہ صاحب کو بڑی قدر و منزلت حاصل تھی، وہ ان سے اس درجہ عقیدت رکھتے تھے کہ ان کے مدرسے میں آتے، اور ان کی مجلس میں بیٹھنے اور ان کے ساتھ کھانے میں شامل ہونے کو اپنے لیے باعث برکت اور موجب سعادت قرار دیتے تھے۔ شاہی محل کی خواتین بعض اہم امور میں ان سے مشورہ کرتیں اور امرا و وزرا ان کی نصیحت آموز باتوں سے مستفید ہونے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔

اس مشاورت اور حاضری کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ شاہ صاحب نہایت متقی اور پرہیز گار بزرگ تھے، اور مختلف حلقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ، سلطنت و حکومت کے بعض اہم اور پیچیدہ معاملات سے متعلق ان سے رائے لیتے اور دعا کی درخواست کرتے تھے۔ دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ شاہ صاحب انتہائی سیاسی بصیرت کے مالک تھے، وہ ملک کی فضا سے واقعات کی رفتار کا پوری طرح اندازہ کر لیتے تھے۔ پھر اس کے اظہار میں جو الفاظ استعمال فرماتے، وہ بڑی احتیاط کے حامل ہوتے، وہ الفاظ کتابوں میں مرقوم ہیں اور بلاشبہ شاہ صاحب کی علمی اور فکری بلند پروازی کا عمدہ ترین ثبوت پیش کرتے ہیں۔ مختلف حضرات کے نام انھوں نے جو مکتوبات تحریر فرمائے، ان میں بھی اس دور کی سیاست اور اس کے بارے میں ان کے نقطہ نگاہ کی وضاحت موجود ہے۔

شاہ صاحب کے تلامذہ کرام میں سے ایک بزرگ شیخ محمد عاشق پھلتی تھے، انھوں نے شاہ صاحب کی زندگی ہی میں ''قول الجلی واسرار الخفی'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جو شاہ صاحب کے ملفوظات اور حالات و سوانح پر مشتمل ہے۔ اس میں بھی ایسے بہت سے واقعات مندرج ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سیاسیات کے نشیب و فراز پر شاہ صاحب گہری نظر رکھتے تھے۔ یہ کتاب خود شاہ صاحب کے ملاحظہ گرامی میں بھی آئی تھی، اور ان کی وفات کے بعد حضرت مصنف نے اس میں ایک باب کا مزید اضافہ کیا تھا۔ اس کتاب کے حوالے سے ہندوستان کے نامور محقق پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی تصنیف ''شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات'' میں شاہ صاحب کے سیاسی افکار کی وضاحت کی ہے اور بعض اہم واقعات تحریر کیے ہیں۔ ان واقعات میں سے بعض باتیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ کتاب کی فارسی عبارتوں کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

۱۔ جب رفیع الدرجات (جو اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد چوتھا مغل بادشاہ تھا) مہلک مرض میں مبتلا ہوا اور اس کی زندگی کی کوئی امید باقی نہ رہی، تو سید عبداللہ خان قطب الملک کو (جو سادات بارہ میں نہایت اہم شخصیت کے مالک تھے) اس کے جانشین کی فکر ہوئی۔ خواجہ محمد سلطان اس سلسلے میں مشورے کے لیے شاہ ولی اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا، بادشاہ کی اولاد کافی ہے، معلوم نہیں ان میں سے کون تخت حکومت پر بیٹھے گا۔ شاہ صاحب نے روشن اختر کا نام لیا اور کہا کہ وہ مستقبل کا بادشاہ ہوگا۔ خواجہ محمد سلطان کو اس بشارت سے خوشی ہوئی اور شہزادے کو بھی یہ خبر سنا دی، لیکن جب رفیع الدرجات کا انتقال ہوا تو سب نے متفقہ طور پر رفیع الدولہ کو تخت پر بٹھا دیا۔ قول الجلی کے مصنف لکھتے ہیں، یہ بات شاہ صاحب کے لیے تشویش خاطر کا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باعث ہوئی۔ لیکن پھر بھی بشارت کے ظہور کا انتظار رہا۔ آخر چند روز بعد رفیع الدولہ کا انتقال ہو گیا اور شاہ صاحب کی بشارت پوری ہوئی۔ روشن اختر جس کا لقب محمد شاہ ہے، تخت سلطنت پر بیٹھا ❶۔

۲۔ جب سید محمد عبداللہ خان قطب الملک مذکور نے محمد شاہ کی زندگی میں سلطان ابراہیم کو تخت دہلی پر بٹھایا اور محمد شاہ سے جنگ کا ارادہ کیا تو خواجہ سلطان محمد پھر شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دریافت کیا کہ اس جنگ میں کون کامیاب ہوگا؟ محمد شاہ یا ابراہیم؟ شاہ صاحب نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد فرمایا:

مجھے اس طرح دکھایا گیا ہے کہ عبداللہ خان کی تمام فوج منتشر ہو گئی ہے اور اس کا ہاتھی تنہا میدان میں کھڑا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی فوج کو شکست ہوگی اور محمد شاہ فتح یاب ہوگا۔ پھر جب دونوں میں جنگ ہوئی تو وہی ظہور میں آیا جس کی شاہ صاحب نے پیش گوئی فرمائی تھی ❷۔

۳۔ ایک شخص نے شاہ صاحب کی خدمت عرض کیا کہ فلاں مہینے میں سلطنت مغلیہ میں انقلاب آ جائے گا، آپ اس سلسلے میں کیا فرماتے ہیں؟ فرمایا، اس وقت تو کوئی چیز معلوم نہیں ہو رہی، جب کچھ معلوم ہوگا، بتا دیا جائے گا۔ دوسرے دن فرمایا۔ ''میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک اونچا دروازہ ہے، جس پر محمد شاہ اور دو اور شخص بیٹھے ہیں۔ میں بھی وہاں موجود ہوں۔ اتنے میں ایک شخص محمد شاہ کے معزول ہونے کی خبر سناتا ہے اور اس کو ایذا پہنچانا چاہتا ہے۔ میں اس سے کہتا ہوں کہ اس کو معزول کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی محمد شاہ سے کہتا ہوں کہ یہ شخص تیرا دشمن ہے، اس کو ختم کر دے۔ محمد شاہ کی کمر میں ہتھیار بندھے ہوئے ہیں، لیکن حملہ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی اور وہ اس شخص سے خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ وہ شخص بھی محمد شاہ پر حملہ کرنا چاہتا ہے لیکن ڈر محسوس کرتا ہے۔ بالآخر محمد شاہ اس مجلس میں محفوظ رہتا ہے۔'' ___ یہ خواب بیان کرنے کے بعد شاہ صاحب نے فرمایا، ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ایام میں انقلاب سلطنت ہرگز نہ ہوگا ❸۔''

۴۔ قول الجلی میں دہلی پر نادر شاہ کے حملے کی تفصیلات بھی بیان کی گئی ہیں۔ لکھا ہے کہ ایک دن شاہ صاحب نے فرمایا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آگ کا ایک دریا امنڈا آیا رہا ہے، اور بڑے بڑے حوادث پیش آنے کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ پھر جو کچھ فرمایا اس کا ترجمہ یہ ہے۔

آباد بستیاں تباہ اور برباد ہو جائیں گی اور ایسی آفت آئے گی کہ ارکان سلطنت اس کا علاج نہ کر سکیں گے اور ایسا بھی نظر آتا ہے کہ دہلی شہر جو ملک کا دارالسلطنت ہے، زیادہ تر وہی آفات کی زد میں ہے ❹۔

۱۱۴۸ھ/۱۷۳۶ء کے سال کا آغاز ہوا تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ ان مصائب کا وقت قریب آ گیا

---

❶ قول الجلی ص ۶۴۔

❷ قول الجلی ص ۶۵۔

❸ ایضاً ص ۸۳۔

❹ قول الجلی ص ۹۰۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے، جن سے آباد شہر ویران اور بستے ہوئے دیہات و قصبات تباہی سے ہم کنار ہو جائیں گے، اور شہر دہلی بالخصوص ان مصائب کا ہدف بنے گا۔ چنانچہ اس زمانے میں اتنی بارش ہوئی کہ مضبوط تر محل (قصور مشیدہ) گر گئے اور ملک کی بہت بڑی آبادی مصیبتوں کے خوف ناک ریلے میں آ گئی۔ اسی زمانے میں ''غنیم دکھنی'' (مرہٹوں) نے حملہ کیا اور شاہی عساکر کی موجودگی کے باوجود وہ دہلی کے قریب پہنچ گئے اور اس کو تباہ کرنے کا عزم کیا۔

دریا کے کنارے سخت مقابلہ ہوا، کثیر تعداد میں لوگ مارے گئے۔ بہت بڑی جنگ اور تباہی کے بعد اس مصیبت سے نجات حاصل ہوئی۔ اس کے بعد شاہ صاحب کے بعض عقیدت مندوں نے دریافت کیا کہ جس مصیبت کا خطرہ تھا، کیا وہ گزر گئی؟ فرمایا، نہیں، وہ تو آنے والی ہے۔

انہی دنوں کا واقعہ ہے کہ شاہ نور اللہ، دہلی کے شاہی بازار (''سوق سلطانی'') میں کچھ چیزیں خریدنے کے لیے گئے۔ واپس آئے تو شاہ صاحب نے پوچھا۔

حال اہل بازار چگونہ دیدید؟

(بازار کے لوگوں کو کس حال میں دیکھا؟)

انھوں نے جواب دیا کہ ابھی تک تو محفوظ ہیں لیکن سب پر وحشت سی چھائی ہوئی ہے۔ یہ سن کر شاہ صاحب نے کہا:

ایں بازار ربلسان حال می گویند کہ دریں جا جو ہائے خون رواں شوند ❶۔

(یہ بازار زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ یہاں خون کے دریا رواں ہوں گے۔)

اگرچہ اس وقت بہ ظاہر کوئی خاص خطرہ نظر نہ آتا تھا لیکن شاہ صاحب کے ان الفاظ سے لوگوں میں اضطراب اور بے چینی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس سے تقریباً ایک سال بعد دہلی پر نادر شاہ کا حملہ ہوا۔

نادر شاہ کا حملہ اہل دہلی کے لیے نہایت الم ناک فتنہ تھا، جس سے تباہی اور بربادی اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ ''قول الجلی'' کے بیان کے مطابق نادر شاہ ''ہزاراں ہزار'' افراد کے سفاک ہجوم کے ساتھ ملک کے شہروں اور قصبوں کو روندتا ہوا کرنال پہنچا اور محمد شاہ اس کے مقابلے میں آیا۔ اس زمانے میں کچھ لوگوں نے شاہ صاحب کو خطوط لکھے اور دریافت کیا کہ اب کیا ہوگا؟ آپ نے جواب دیا کہ بہت بڑی مصیبت آئے گی، لیکن محمد شاہ بہ دستور اپنی جگہ پر قائم رہے گا۔

اس لڑائی میں محمد شاہ کے ۵۲ ہاتھی مارے گئے اور لشکر کا خاصا بڑا حصہ تباہ ہو گیا۔ جو لوگ باقی بچے ان پر اتنا رعب چھا گیا کہ ادھر ادھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس موقعے پر ''شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات'' میں قول الجلی'' کی یہ عبارت درج ہے:

❶ قول الجلی، ص ۹۱۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باقی ماندگان را عسا کر قزلباش محصور ساختند، دریں میاں عالمی از گرسنگی جان بداد، وسلطان ووزیر ہر دو اسیر شدند ❶۔

یعنی جو باقی بچے ان کو عسا کر قزلباش (افغانوں) نے گھیرے میں لے لیا، ان دنوں بہت سے لوگوں نے بھوک کی شدت سے جان دے دی۔ بادشاہ اور وزیر دونوں پکڑ لیے گئے۔

وہاں سے چل کر نادر شاہ دہلی میں داخل ہوا، اور تیسرے دن اس نے قتل عام کا حکم دیا۔ صبح سے لے کر تین گھڑی دن گزرے تک اس کے تیس ہزار سواروں نے قتل وغارت کا بازار گرم کیے رکھا۔ شیخ محمد عاشق پھلتی افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں۔

ہر جان داری کہ یافتند از انسان وحیوان ہمہ را بہ تیغ کشیدند تا سگ وگربہ راہمدراں میاں نگزاشتند وشہر را آتش دادہ بازار ہا ور کوشکہا را بسوختند ــــــ از کشتگان پشتہ ہا بر پا شدند، ودر بازار ہا خصوصاً در سوق سلطانی کہ بہ چاندنی چوک مشہور است جوہائے خون رواں گردید ❷۔

(نادر شاہ کے فوجی) جس جان دار کو پاتے، وہ انسان ہوتا یا حیوان اسے قتل کر دیتے۔ یہاں تک کہ انھوں نے کتوں اور بلیوں کو بھی نہ چھوڑا، شہر کے بازاروں اور مکانوں کو آگ لگا دی...... مقتولوں کے ڈھیر لگ گئے۔ سوق سلطانی (شاہی بازار) میں جو چاندنی چوک کے نام سے مشہور ہے، خون کی ندیاں بہہ گئیں۔)

شہر دہلی کی حالت اس زمانے میں انتہائی ابتر تھی۔ نہ اس میں کوئی داخل ہو سکتا نہ اس سے باہر جا سکتا تھا، نہ کھانے کی کوئی چیز میسر تھی، نہ عام استعمال کے لیے کچھ حاصل ہوتا تھا۔ ہزاروں آدمی بھوک سے بے تاب ہو کر مر گئے۔ گلی کوچے لاشوں سے اٹے پڑے تھے، ان کو دفن کرنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ان کی عفونت سے بے شمار لوگ دم توڑ گئے۔ ملکی حالات اس قدر بگڑ گئے کہ مغل حکومت کے باقی رہنے کا بھی کسی کو یقین نہ تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ نادر شاہ دہلی کو لوٹ کر تمام نئے اور پرانے خزانے اپنے ساتھ لے گیا۔ اور شاہ صاحب نے اپنی سیاسی بصیرت کی بنا پر جو یہ پیشین گوئی کی تھی کہ محمد شاہ بہ حیثیت بادشاہ موجود رہے گا، وہ پوری ہوئی۔

اس ہنگامہ خیز اور الم ناک دور میں شاہ صاحب کے بہت سے عقیدت مندوں نے ان کو خطوط لکھے اور دعا کی درخواست کی۔ شاہ صاحب نے سب کو تسلی دی، اور لکھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں، تمام متعلقین محفوظ رہیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، ان کے سب متعلقین ومعتقدین بھی محفوظ رہے اور ان کا محلّہ بھی اللہ کے فضل سے محفوظ رہا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے زمانے میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر جو مسلسل حملے کیے، ان کا ذکر ''القول الجلی'' میں شیخ محمد عاشق پھلتی نے متعدد مقامات پر کیا ہے۔ ان حملوں کے ملک کی سیاسی فضا پر جو اثرات مرتب ہوئے اور جو نتائج نکلے، ان کی نشان دہی بھی کی ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ''شاہ ولی اللہ

❶ قول الجلی ص ۹۲۔

❷ قول الجلی، ص ۹۳۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے سیاسی مکتوبات'' کے مقدمے میں اسے خاصی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ دہلی میں اس سے جو اضطراب پھیلا اور بے چینی پیدا ہوئی، قول الجلی کے حوالے سے اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ مثلاً شاہ صاحب کے حلقہ تعلقات کے بعض بزرگوں ۔۔۔ خواجہ حبیب اللہ کشمیری اور عمر خان قصوری۔۔۔۔۔ نے ان سے پوچھا کہ اس دور پُر آشوب میں ہم اپنا مال و اسباب کہاں منتقل کریں اور اپنی حفاظت کے لیے کیا قدم اٹھائیں؟ شاہ صاحب نے نہایت اطمینان سے جواب دیا:

ما و ہمہ مخلصان ما بلکہ تمام اہل شہر دریں شور و فتنہ ان شاء اللہ محفوظ خواہم ماند و خدائے تعالیٰ لطیفہ خواہد پیدا کرد کہ امن از جمیع وجوہ ظہور خواہد آمد ❶۔

(ہم اور ہمارے مخلصین بلکہ تمام باشندگان دہلی اس فتنے میں محفوظ رہیں گے اور اللہ تعالیٰ ایسی صورت ظاہر فرما دے گا کہ امن کی فضا پیدا ہو جائے گی۔)

شیخ محمد عاشق پھلتی لکھتے ہیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور باشندگان دہلی محفوظ رہے۔

یہ انتہائی فتنہ خیز دور تھا، ہر طرف ہنگامے بپا تھے اور ملک کی حالت نہایت خراب ہو گئی تھی۔ مرہٹوں نے بالخصوص بہت طاقت پیدا کر لی تھی اور وہ سلطنت مغلیہ کے لیے زبردست مصیبت بن گئے تھے۔ ان کی طاقت کو پانی پت کے میدان میں احمد شاہ ابدالی نے ختم کیا۔ احمد شاہ ابدالی یکم نومبر ۱۷۶۰ء کو پانی پت کے میدان میں پہنچا، اس سے دو روز پہلے ۲۹ اکتوبر ۱۷۶۰ء کو مرہٹہ جرنیل سداشیو راؤ بھاؤ پانی پت کے میدان میں اپنی فوجیں اتار چکا تھا۔ ابدالی کی افغان فوجوں اور مرہٹوں کے درمیان ڈھائی مہینے تک لڑائی کا سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو ابدالی نے شدید جنگ کے بعد مرہٹوں کو شکست فاش دی۔ سداشیو راؤ بھاؤ اور پیشوا کا بیٹا وشواس راؤ میدان جنگ میں مارے گئے، اور بقول ایک مؤرخ کے مرہٹوں کی طاقت چشم زدن میں کافور کی طرح اڑ گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ مرہٹوں کی اس بہت بڑی طاقت کا جس نے ہندوستان کی مغل حکومت کو انتہائی پریشان کر رکھا تھا، اس جنگ کے نتیجے میں ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود مرہٹوں کے مرکز میں کوئی گھر ایسا نہ تھا، جس میں صف ماتم نہ بچھ گئی ہو، مرہٹہ لیڈروں کی ایک پوری نسل ایک ہی معرکے میں صفحۂ ہستی سے غائب ہو گئی۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی اس دور کے ہندوستان کے سیاسی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: کہ ''پانی پت کا میدان کارزار حقیقت میں شاہ ولی اللہ کا سجایا ہوا تھا ❷۔''

شاہ صاحب نے ملک کی سیاسی ابتری کو ہدف فکر ٹھہرایا تو اس کی اصلاح کے لیے ان کی نظر دو شخصیتوں پر پڑی۔ ایک ملک سے باہر احمد شاہ ابدالی پر، دوسرے ملک کے اندر نجیب الدولہ پر! احمد شاہ ابدالی اپنی دیگر

❶ قول الجلی، ص ۶۰۔

❷ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، ص ۴۲۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خوبیوں کے ساتھ اس خوبی کا بھی مالک تھا کہ تمام افغان فوج اس کے زیر کمان تھی، اور نجیب الدولہ میں یہ صفت پائی جاتی تھی کہ روہیلوں کی عسکری طاقت اس کے تابع فرمان تھی۔ اپنے مکتوبات میں شاہ صاحب نجیب الدولہ کو بے حد اہمیت دیتے ہیں۔ اور اسے ''رئیس الغزاۃ'' اور ''راس المجاہدین'' کے پُرعظمت خطاب سے مخاطب فرماتے ہیں۔

ملک کے انتہائی بگڑے ہوئے حالات کی اصلاح کے لیے ان شخصیتوں کا انتخاب شاہ صاحب کی سیاسی بصیرت پر دلالت کرتا ہے۔ روہیلوں کی جنگی صلاحیت اور فوجی قوت سب کے نزدیک مسلمہ تھی۔ ان کا رہنما نجیب الدولہ بھی عظیم سیاسی مدبر، بہادر سپاہی اور دور اندیش جرنیل تھا۔ شاہ صاحب نے اپنے وقت کی ان دو ممتاز شخصیتوں کو ایک ہی مقصد کی تکمیل کے لیے متعین کر کے انتہائی حقیقت شناسی کا ثبوت بہم پہنچایا۔

بہر کیف شاہ ولی اللہ صاحب کا ذہن سیاسی لحاظ سے بہت زرخیز تھا۔ انھوں نے اس بات کی کھل کر وضاحت کی ہے کہ ملک کی سیاسی ترقی کا راز پانچ چیزوں میں مضمر ہے، جو درج ذیل ہیں:

۱۔ ملکی خزانے میں کسی موقعے پر بھی کمی واقع نہ ہو۔ خزانہ ہر آن بھرپور رہنا چاہیے، تاکہ افواج شاہی اور تمام ملازمین سلطنت کی تنخواہیں بروقت ادا ہوتی رہیں اور حکومت کی مخالفت کا کوئی خطرہ کسی طرف سے باقی نہ رہے۔

۲۔ ملک میں جاگیرداروں کی کثرت نہیں ہونی چاہیے، ان کی تعداد جہاں تک ممکن ہو کم کر دینی چاہیے۔ چھوٹی چھوٹی بہت سی جاگیرداریوں کی بنا پر زمین چھوٹے چھوٹے قطعوں کی شکل میں بے شمار حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ جاگیر کے رقبے میں اضافے کی وجہ سے مرکزی حکومت کا استحکام متاثر ہوتا ہے، اور وہ جاگیرداروں کے رحم و کرم کی محتاج ہو جاتی ہے۔ جاگیریں جتنی زیادہ ہوں گی اسی قدر حکومت کے نظم و نسق کا ڈھانچا کمزور ہوگا۔ اور کاشت کار پریشانی میں مبتلا ہوں گے، جس سے ملکی سیاست کے مجروح ہونے کے امکانات ابھریں گے۔

۳۔ ملک کے تمام گروہوں کو اعتدال میں رکھا جائے۔ کسی گروہ کی کسی معاملے میں اس طرح اجارہ داری نہیں ہونی چاہیے کہ وہ معاشرے کے کم زور افراد کو مالی یا ذہنی تکلیفوں میں مبتلا کر دے۔ اگر ایسا ہو گیا تو ملک کے سیاسی حالات مستحکم نہیں رہ سکیں گے۔

۴۔ ملک کی فوج بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ملکی سرحدوں کی حفاظت کا عظیم فرض فوج ہی سرانجام دیتی ہے۔ اس کی تنخواہیں باقاعدگی کے ساتھ وقت پر ادا کی جائیں۔ اسے کسی قسم کی شکایت نہ پیدا ہونے دی جائے۔

۵۔ خالصہ کا علاقہ محدود نہ رکھا جائے، جہاں تک ہو سکے اسے وسیع کیا جائے۔

''خالصہ'' اس علاقے کو کہا جاتا تھا، جو براہ راست بادشاہ کے ماتحت ہوتا تھا، یعنی ''خالصہ'' سے مراد

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وہ علاقہ ہے جو مرکزی حکومت کے انتظام یا اختیار میں ہو۔ دور بادشاہت میں علاقہ خالصہ کے محاصل اپنے مقرر کردہ حکام کے ذریعے خود بادشاہ وصول کرتا تھا۔ اس کے برعکس جاگیر کا علاقہ وہ کہلاتا تھا جس کے محاصل جاگیردار وصول کرتے تھے اور جس کا مرکزی حکومت سے براہ راست کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔

دہلی کے تخت حکومت پر جتنے بھی بڑے بڑے حکمران متمکن ہوئے وہ سب اس کوشش میں رہتے تھے کہ خالصہ کے علاقے میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جائے، کیونکہ اگر خالصہ کا علاقہ زیادہ ہوتا اور اس سے معقول آمدنی ہوتی تو بادشاہ آمدنی کے لحاظ سے صوبائی گورنروں اور علاقائی جاگیرداروں کا محتاج نہیں ہوتا تھا، مرکزی دفاتر اور بادشاہ کے محل کے اخراجات کے لیے جس قدر رقم کی ضرورت ہوتی، وہ برابر اس علاقے سے بادشاہ کو وصول ہوتی رہتی جو براہ راست بادشاہ کے قبضے میں ہوتا تھا، اور اس علاقے کو ''خالصہ'' سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اگر کبھی صوبائی حکومتیں یا بعض علاقوں کے جاگیردار بادشاہ سے بغاوت بھی کر دیتے اور محاصل ادا کرنے سے انکار کر دیتے، جب بھی خالصہ کی آمدنی سے مرکزی حکومت کے اخراجات بلاکسی تکلیف کے پورے ہوتے رہتے تھے۔

ظہیر الدین بابر کے حالات میں کتب تاریخ میں مرقوم ہے کہ جب اس نے ہندوستان پر قبضہ کیا اور اس پر حکومت کرنے لگا تو مختلف حاکموں کو اس نے جاگیریں عطا کیں، لیکن ''خالصہ'' میں اضافے کا پورا خیال رکھا۔ کہتے ہیں، اس نے بہار کی جاگیر ایک شخص محمد زمان کو دی، لیکن ایک کروڑ پچیس لاکھ کے محاصل کے علاقے کو خالصہ قرار دے دیا۔

شاہ ولی اللہ نے خالصہ کے علاقے میں اضافے پر جو زور دیا اور اسے مرکزی حکومت کے استحکام کا بہت بڑا ذریعہ قرار دیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے زمانے میں اس میں بہت کمی واقع ہوگئی تھی اور جاگیرداروں کا سلسلہ برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ صوبہ دہلی کے دیہات اور بعض دوسرے صوبوں کے گاؤں جو پہلے خالصہ میں شامل تھے اور جن سے بادشاہ کے مرکزی دفاتر اور ذاتی ملازموں کی تنخواہیں ادا کی جاتی تھیں، سب کے سب ہاتھ سے نکل گئے تھے۔

سہارن پور، جس کے محاصل جاگیرداروں کو دے دیے گئے تھے، نجیب خان روہیلہ کے قبضے میں آ گیا تھا۔ آگرہ کے گرد و نواح کے علاقے جاٹوں کے انصرام میں تھے، جے پور کے مادھو سنگھ نے نارنول وغیرہ کے علاقوں پر تسلط جما لیا تھا۔ اسی طرح اور بھی بعض جاگیرداروں نے خالصہ کے علاقوں کو اپنے قبضے میں کر کے بادشاہ کو مالی اعتبار سے اس درجے بے بس کر دیا تھا کہ بعض دفعہ فوجیوں اور ملازموں کی تنخواہیں ادا کرنا بھی اس کے لیے انتہائی مشکل ہو جاتا تھا۔

شاہ صاحب کی فراست اور سیاسی بصیرت ملاحظہ ہو کہ وہ اپنے ان خطوط میں جو انھوں نے بادشاہوں، وزیروں اور مملکت کے امیروں کے نام تحریر کیے صاف لفظوں میں مشورہ دیتے ہیں، کہ ''خالصہ'' کے علاقے کو

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس قدر وسیع ہونا چاہیے کہ دہلی کے گرد و نواح کا پورا علاقہ خالصہ میں شامل ہو، پھر وہاں سے وہ آگرہ، حصار، دریائے گنگا، اور سرہند تک ممتد ہوتا چلا جائے۔ اس کے لیے ان کے الفاظ قابل مطالعہ ہیں فرماتے ہیں:

خالصہ را کشادہ تر باید ساخت، خصوصاً آنچہ گرداگرد شاہ جہان آباد است، تا اکبر آباد و تا حصار و تا دریائے گنگ تا حد حدود سہرند، ہمہ اش یا اکثرش خالصہ شریف باشد کہ موجب ضعفِ امورِ سلطنت کمی خالصہ و قلتِ خزانہ است ❶۔

(علاقہ خالصہ کو وسیع تر کرنا چاہیے، خصوصاً وہ علاقہ جو دہلی کے اردگرد واقع ہے، آگرہ، حصار، اور دریائے گنگا اور حدود سرہند تک کا تمام تر علاقہ یا اس کا اکثر علاقہ خالصہ ہونا چاہیے کیونکہ امور سلطنت میں ضعف کا باعث خالصہ کی کمی اور خزانے کی قلت ہوتی ہے۔)

شاہ صاحب کی بلندیٔ فکر کا اندازہ کیجیے کہ مرکز کے استحکام کے لیے وہ اربابِ حکومت اور بادشاہ کو صاف لفظوں میں مشورہ دیتے ہیں کہ چھوٹے منصب داروں کو جاگیریں نہ دی جائیں، اور علاقہ خالصہ کو وسعت دی جائے، تاکہ مرکزی حکومت میں کمزوری کے آثار نمودار نہ ہوں۔

بہرحال شاہ صاحب نے حکومت کے استحکام اور سیاسی ترقی کے لیے جو یہ پانچ اصول بیان کیے اس زمانے کے لحاظ سے وہ بلاشبہ اپنی جگہ بڑے اہم اور ان کی بے پناہ سیاسی بصیرت کے عکاس تھے۔

مکتوبات:

شاہ ولی اللہ صاحب کے افکار عالیہ میں ان کے مکتوبات بھی شامل ہیں، جو انھوں نے مختلف مواقع پر ہند اور بیرون ہند کے متعدد حضرات کے نام تحریر فرمائے۔ یہ مکتوبات عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں ہیں، اور ایک مستقل علمی ذخیرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں بعض خطوط تو وہ ہیں جو انھوں نے اپنے بعض اساتذہ کی خدمت میں ارسال کیے۔ بعض اس دور کے علما و زعما کو تحریر فرمائے۔ بعض خطوط مختلف مسائل دریافت کرنے اور ضروری معاملات کے متعلق استفسار کرنے والوں کو لکھے۔ بعض خطوط بالکل علمی، مذہبی اور خالص فقہی نوعیت کے ہیں اور بعض کا تعلق ذاتی اور نجی قسم کے معاملات سے ہے۔ ان میں بیالیس (۴۲) خطوط سیاسی نوعیت کے ہیں جو پروفیسر خلیق احمد نظامی نے مرتب کر کے شائع کر دیے ہیں۔ ان خطوط میں ایک خط ایک مغل بادشاہ کے نام ہے۔ کچھ وزرائے سلطنت اور امرائے مملکت کے نام ہیں۔ کچھ خطوط ملک کی بعض اہم شخصیتوں کے نام ہیں اور ایک طویل خط افغانستان کے بادشاہ احمد شاہ ابدالی کے نام ہے۔ اس خط میں شاہ صاحب نے اس دور کے ہندوستان کے سیاسی حالات، تاریخی واقعات اور قابل اصلاح امور کی وضاحت کی ہے، اور سلطنت کے امرا و وزرا کی سازشوں اور باہمی رقابتوں کا ذکر کیا ہے۔ نیز مرہٹوں، جاٹوں اور دیگر قوموں نے ملک میں جو اودھم

❶ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، مکتوب اول ص ۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مچا رکھا تھا، اس کی ضروری تفصیلات بیان کر کے احمد شاہ ابدالی سے درخواست کی ہے کہ وہ صورت احوال کی اصلاح کے لیے مضبوط قدم اٹھائے۔ چنانچہ پروفیسر خلیق احمد نظامی کا کہنا ہے کہ اس خط کے بعد احمد شاہ ابدالی نے جو پہلے کئی بار ہندوستان پر حملے کر چکا تھا، پھر ہندوستان کا رخ کیا اور پانی پت میں مرہٹوں سے زبردست جنگ کی۔ اس جنگ میں مرہٹوں کو احمد شاہ کے مقابلے میں شکست فاش سے دوچار ہونا پڑا۔ نظامی صاحب لکھتے ہیں:

اس خط کے نتیجے میں پانی پت کا میدان کارزار سجا۔ اس جنگ کی تاریخی اہمیت سے تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔ لیکن یہ حقیقت بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مدرسہ رحیمیہ کا ایک مدرس اس تاریخی جنگ کے نقشے تیار کر رہا تھا۔ اس خط کے مطالعے کے بعد شاہ صاحب کی سیاسی خدمات کا ایک اہم پہلو روشن ہو جاتا ہے[1]۔

بیالیس مکتوبات کے اس مجموعے میں سولہ خط شیخ محمد عاشق پھلتی کے نام ہیں۔

یہاں شیخ محمد عاشق پھلتی کا تعارف کرانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ شیخ ممدوح بارھویں صدی ہجری کے ایک مشہور بزرگ تھے جو شاہ ولی اللہ کے ماموں شیخ عبیداللہ صدیقی کے بیٹے تھے۔ موضع پھلت (ضلع مظفر نگر ہندوستان) کے باشندے تھے۔ اپنے عہد کے جید عالم اور متقی بزرگ تھے۔ عرصے تک شاہ صاحب کی صحبت و رفاقت میں رہے اور ان سے خوب استفادہ کیا۔ ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۱ء میں شاہ صاحب حجاز مقدس گئے تو یہ بھی ان کے ساتھ تھے۔ ان کی علمی رفعت اور سلوک وطریقت میں درک کا یہ عالم تھا کہ شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین نے ان سے فیض حاصل کیا اور ان کی زبانی اپنے جلیل القدر باپ (حضرت شاہ ولی اللہ) کے معارف وتصوف سے متمتع ہوئے۔ سبیل الرشاد، قول الجلی اور شرح دعاء الاعتصام ان کی تصانیف ہیں۔ ۱۱۸۷ یا ۱۱۸۸ھ/۷۳-۱۷۷۴ء میں فوت ہوئے۔

بے شک شاہ ولی اللہ اپنے دور کی عظیم شخصیت تھے۔ ان کے افکار وخیالات کا سلسلہ نہایت وسعت پذیر تھا۔ وہ جس مسئلے پر گفتگو کرتے اور جس معاملے کو موضوع بحث ٹھہراتے، اس کے تمام پہلوؤں کو واضح اور مصرح کرتے جاتے۔ اس کا اندازہ ان کے مکتوبات سے بھی ہوتا ہے۔ جس طرح وہ اپنی تصانیف میں پورے زور اور دلائل سے بات کرتے ہیں، مکتوبات میں بھی انھوں نے اسی اسلوب انشا اور طرز نگارش کو برقرار رکھا۔ قلم میں وہی زور، استدلال میں وہی قوت، الفاظ کے انتخاب میں وہی احتیاط اور بیان وکلام میں وہی اعتدال ہے، جو ان کی باقاعدہ تصانیف کا طرۂ امتیاز ہے۔

شعر وشاعری:

شاہ ولی اللہ صاحب شعر وشاعری سے بھی دلچسپی رکھتے اور خوب صورت شعر کہتے تھے، امین تخلص کرتے تھے۔ عربی اور فارسی میں ان کے اشعار کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے، ان کی متعدد غزلیں اور رباعیاں

[1] شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات ص ۵۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معرفت و تصوف کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

علمے کہ نہ ماخوذ زِ مشکوٰۃ نبی است — واللہ کہ سیرابی از وتشنہ لبی است
جائیکہ بود جلوۂ حق حاکم وقت — تابع شدن حکم خرد بولہبی است
"نخستین بادہ کاندر جام کردند" ❶ — مزاجش عکس آں گلفام کردند
شراب وحدت از خمخانۂ غیب — مراصبح ازل در کام کردند
چوغلطیدم زمستیہا بہر سو — حریفاں مستی از من دام کردند
ولی دارم زخود خالی حبابش میتواں گفتن — درو کیفیت جوش شرابش میتواں گفتن
وجود بے نمود معنی نادیدنی دارد — درین نیرنگہا بوئے عبابش میتواں گفتن
سوید ای دل مایابی اندر پیچ و تاب او — نفوس عالم ام الکتابش میتواں گفتن
فرو پاشید از ہم کثرت موہوم چوں شبنم — زفیض معنی ماآفتابش میتواں گفتن

غزل کے چند شعر پڑھیے:

تابکے محنت مہجوری و دوری بکشم — نازنین وطنم سوئے وطن بازروم
تابکے باخس و خاشاک بود صحبت من — صدر بزم چمنم سوئے چمن بازروم
تابکے ہمدمی سنگ شود شیوۂ من — گوہرے از عدنم سوئے عدن بازروم
تابکے بستۂ زنجیر تعلق باشم — آہوئے از ختنم سوئے ختن باز روم
بوئے جان میرسد از بادیمن دردوجہاں — شاہ ملک یمنم سوئے یمن بازروم

چند شعر عربی کے ملاحظہ فرمائیے:

كان نجوما اومضت فى الغياهب — عيون الافاعى اورؤس العقارب
ثلث خصال من تعاجيب ربنا — نجابة اعقاب لوالدطالب
خلافة عباس و دين نبينا — تزايد فى الاقطار من كل جانب
يؤيد دين الله فى كل دورة — عصائب تتلو مثلها من عصائب
فمنهم رجال يدفعون عدوهم — بسمرا لقنا والمرهفات القواضب
ومنهم رجال يغلبون عدوهم — باقوى دليل مفحم للبغاضب
ومنهم رجال بينوا شرح ربنا — وما كان فيه من حرام وواجب

---

❶ یہ مصرع صوفی شاعر فخر الدین ابراہیم عراقی (۱۲۱۳ھ-۱۲۸۹/۱۷۹۷ء-۱۸۷۲ء) کی ایک غزل کا ہے۔ دوسرا مصرع یہ ہے "زچشم مست ساقی وام کردند" شاہ صاحب نے اس مصرعے کو تضمین کیا ہے، لیکن تذکرہ نگار نے اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا، جس سے عام قاری کو یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ یہ مصرع شاہ صاحب کا ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ومنهم رجال يدرسون كتابه بتجويد ترتيل وحفظ مراتب
ومنهم رجال فسروه بعلمهم وهم علموا ناما به من غرائب
ومنهم رجال بالحديث تولعوا وماكان فيه من صحيح وذاهب
ومنهم رجال مخلصون لربهم بانفاسهم خصب البلاد الاجادب
ومنهم رجال يهتدى بعظاتهم قيام الى دين من الله واصب
على الله رب الناس حسن جزائهم بمالا يوافى عده ذهن حاسب
فمن شاء فليذكر جمال نبيه ومن شاء فليغزل بحب الربائب
ساذكر حبى للحبيب محمد اذا وصف العشاق حب الحبائب

اذا اخبرت يوما عن ضياء فلا تلهج ببدر اوذكاء
وان تمدح بجود اوسمو فلا تنظر لجود او سماء

وان لابد تمدح ذا معال! فحسبك مدح خير الانبياء
وان تمدح رسول الله يوما فحاز ران تقصر فى الثناء

شاہ صاحب کے عربی اور فارسی کے بہت سے اشعار کا پتا چلتا ہے۔ یہاں نمونے کے طور پر صرف چند شعر درج کیے گئے ہیں۔

آخری مرض اور وفات:

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۳ء کے محرم کی آخری تاریخ کو ہفتے کے دن باسٹھ سال عمر پا کر دہلی میں انتقال فرمایا۔ ان کے آخری مرض اور وفات کے وقت رائے بریلی کے ایک بزرگ سید محمد نعمان حسنی جو حضرت سید احمد شہیدؒ کے اسلاف میں سے تھے، ان کے پاس موجود تھے۔ انھوں نے رائے بریلی کے اپنے ایک عزیز سید ابوسعید حسنی کو اس کی بعض تفصیلات ایک مکتوب میں تحریر فرمائی تھیں۔ یہ مکتوب فارسی میں ہے، یہاں اس کا ترجمہ دیا جاتا ہے۔ سید محمد نعمان اور ابوسعید دونوں شاہ صاحب کے مخلصین میں سے تھے۔

اللہ سبحانہ، وتعالیٰ شانہ، کے نام کے ساتھ ____ سب تعریف اللہ کی ہے اس کی نعمتوں پر، رضا بالقضا کے حصول پر، مصیبت و تکلیف میں صبر حاصل ہونے پر، اور درود و سلام سید الشاکرین، زبدۃ الراضین، قدوۃ الصابرین، شفیع المذنبین، رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ پر، اور آپ کے آل و اصحاب پر جو کہ طیب و طاہر تھے اور آپ کے وارثین یعنی علمائے راسخین اور اولیائے مرشدین پر، یہ سلسلہ قیام قیامت تک جاری رہے گا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حمد وصلوٰۃ کے بعد واضح ہو کہ امام سنت، مقتدائے ارباب کرامت، پیشوائے عرفائے زمان، سرآمد اولیائے جہان، قطب زمانی، محبوب سبحانی، سیدنا ومرشدنا ولی اللہ فاروقی مجدد وقت رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال پرملال کا واقعہ اگر تفصیل سے لکھا جائے تو ہم جیسے غم زدہ لوگوں کے لیے عین مناسب ہے۔

چہ بخاطر رسید یارمرا کہ بہ ہجراں کشید کارمرا

(یعنی ہمارے دوست کے دل میں کیا آیا کہ ہمیں فراق ومہجوری میں مبتلا کر گیا)

وامصیبتاہ! اللہ کی شان بے نیازی کا یہ عجب نمونہ ہے کہ ایسے مقتدا کی روح کو صرف ۶۲ سال کی عمر میں ارجعی الی ربك راضیتہ مرضیتہ۔ (اے نفس مطمئنہ اپنے رب کی طرف راضی اور پسندیدہ ہو کر واپس جا) کی ندا دی گئی اور اہل بدعت وضلالت کو خوش اور اصحاب دین کو اندوہ گین کر دیا گیا۔ یعنی ہفتے کے دن ظہر کے وقت، محرم کی آخری تاریخ ۱۱۷۶ھ/۲۱ اگست ۱۷۶۲ء کو حکم خداوندی سے حضرت کے طائر روح نے قالب عنصری سے پرواز کر کے اوج علیین میں اپنا نشیمن بنالیا۔ آپ کی مفارقت سے آپ کے احباب ورفقاء کی حالت ایسی خستہ وخراب تھی کہ احاطۂ تحریر میں نہیں آسکتی۔۔۔۔۔۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب میں اصل مقصد کی طرف آتا ہوں۔ اللہ کے فضل وکرم سے اس عاصی کو حضرت (شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ) کی کشش نے اپنی طرف کھینچا، چنانچہ ماہ ذی قعدہ (۱۱۷۵ھ یکم جولائی ۱۷۶۲) میں بڈھانہ جا کر آستانہ بوسی کی سعادت حاصل ہوئی، اور آپ کی صحبت اقدس سے شرف یاب ہوا۔ بڈھانہ سے ۹ ذی الحجہ (۱۱۷۵ھ) کو آپ بغرض علاج دہلی تشریف لائے اور بابا فضل اللہ کے مکان پر مسجد روشن الدولہ کے احاطے میں جو چوک سعد اللہ خان میں واقع ہے، فروکش ہوئے۔ فرزندان گرامی قدر میں سے میاں محمد صاحب، میاں عبدالعزیز اور میاں رفیع الدین مدظلہم العالی، اور اقربا وتلامذہ میں سے میاں محمد عاشق صاحب، میاں اہل اللہ صاحب، میاں محمد فائق، میاں محمد جواد اور خواجہ محمد امین وغیرہ حاضر خدمت تھے۔

یہ غلام (یعنی سید محمد نعمان حسنی) میر محمد عتیق اور میر قاسم علی جنھوں نے حضرت کے آخری ایام میں شرف بیعت حاصل کیا تھا، ہر روز خدمت گاری کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوتے رہتے تھے۔

مشفق من! ــــ یہ آخری مجلسیں بھی عجیب پُر کیف اور پُر فیض تھیں۔ نفحات انس ورحمت اور رشحات قدس وبرکت بارش کی طرح برستے تھے۔ اکثر اہل نسبت حضرات اپنے وجدان صحیح سے اس صورت حال کو محسوس کرتے تھے۔ اہل اللہ اور عارف تو ہمیشہ اور ہر زمانے میں ہوتے ہیں، مگر ایسا مرد حقانی جو جمیع اوصاف حمیدہ کا حامل اور کتاب وسنت کا مجتہدانہ شان سے عالم ہو، نیز حقائق ومعارف میں بحر مواج اور دیگر علوم میں دریائے زخار ہو، صدیوں کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

دور ہا باید کہ تا یک مرد صاحب دل شود
بایزید اندر خراساں یا سہیل اندر یمن

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ بات بھی لائق تعریف ہے کہ حضرت مرحوم ومغفور کی آپ سے رضامندی اور آپ پر ان کی توجہات عالیہ کو میں نے حد بیان سے زیادہ پایا، آپ کے حالات اکثر اوقات دریافت کرتے رہتے تھے۔

ابدالیوں کی جنگ کا واقعہ اور آپ کا عین اس ہنگامۂ قیامت خیز میں پہنچنا اور آپ کے قدوم گرامی سے آتش فتنہ کا فرو ہو جانا، یہ سب باتیں حضرت اپنی زبان دُرفشاں سے بیان فرمایا کرتے تھے۔شاید آپ سے آخری ملاقات کی تمنا حضرت کے دل میں تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ یہ الفاظ فرمائے۔

"میر ابوسعید ارادۂ آمدن دارند، اگر زود برسند بہتر باشد۔"

(میر ابوسعید آنے کا ارادہ کر رہے ہیں، اگر جلدی آ جائیں تو اچھا ہو۔)

صاحب من! حضرت کی ظاہری صحبت تو اب میسر نہیں آ سکتی۔ البتہ علوم دینیہ میں ان کی تصنیفات نوے (۹۰) کے قریب بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں۔ تفسیر، اصول فقہ، کلام اور حدیث میں جیسے حجۃ اللہ البالغہ، ازالۃ الخفاء عن الخلفاء، اور ترجمہ قرآن، جن میں ہر کتاب کی کافی بڑی ضخامت ہے۔ ان کے علاوہ دیگر رسائل ہیں، جو حقایق و معارف پر مشتمل ہیں، جیسے الطاف القدس، ہمعات، فیوض الحرمین اور انفاس العارفین وغیرہ۔ یہ کتابیں حضرت کے فیوض و برکات کی نشان دہی کرتی ہیں۔ آپ اس بات کا عزم کریں کہ ان تمام کتابوں کو لکھوا کر رائج فرمائیں گے۔ یہ کام تھوڑی سی توجہ سے انجام پا سکتا ہے۔ معلوم نہیں اس قسم کی کتابیں گزشتہ دور میں معرض تصنیف میں آئی ہیں یا نہیں۔ واللہ اعلم۔ ارباب بصیرت ان کتابوں کی افادیت کا اقرار کرتے ہیں۔

حضرت (شاہ صاحب) کا کلام ہر بات میں اصولی اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس فقیر کو اور صاحب زادگان گرامی نیز حضرت ممدوح کے تمام رفقائے کرام کو آپ کی حضرت سے محبت کے پیش نظر یہ یقین ہے کہ جیسے ہی آپ اس حادثہ عظیمہ (یعنی شاہ صاحب کی وفات) کی خبر سنیں گے، دہلی کو روانہ ہو جائیں گے۔ اسی وجہ سے میں بھی آپ کی آمد کا منتظر ہوں۔ اگر آپ جلدی تشریف لائیں میں ملاقات سامی سے مسرور ہو جاؤں۔ اگر تشریف لانے میں کچھ دیر ہو تو مطلع فرمائیں، کیونکہ یہ فقیر بھی واپس وطن آنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ میاں محمد عاشق صاحب بعد سلام فرماتے ہیں کہ میر ابوسعید کو لکھو کہ حضرت اقدس (شاہ صاحب) کے جتنے مکتوبات بھی ان کے نام لکھے گئے ہیں، ان کی نقول ضرور بھیجیں تاکہ ان کو مکاتیب کے مجموعے میں شامل کیا جائے۔

حضرت میاں اہل اللہ صاحب اور دیگر حضرات نیز (شاہ صاحب کے) صاحب زادگان کی طرف سے سلام قبول فرمائیں۔

بڈھانہ میں حضرت اقدس کی خدمت میں بھائی محمد معین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی کیفیت بیان کر دی تھی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے لیے دعا کی اور نہایت افسوس کا اظہار فرمایا تھا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شاہ صاحب کے فرزندان گرامی:

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں اختصار سے بیان کیا جا چکا، مختلف علوم وفنون میں شاہ ولی اللہ کا مرتبہ بہت بلند تھا اور وہ ہر مسئلے میں گہری نظر رکھتے تھے۔ نواب صدیق حسن خان ان کے فضل وکمال کی وسعتوں کا واضح الفاظ میں ذکر کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

وانصاف ایں است کہ اگر وجود او در صدر اول وزمانۂ ماضی می بود امام الائمہ وتاج المجتہدین شمردہ می باشد❶۔

یعنی انصاف کی بات یہ ہے کہ اگر شاہ صاحب دور اول میں پیدا ہوتے اور زمانۂ ماضی سے ان کا تعلق ہوتا تو ائمہ حدیث وفقہ کی عظیم المرتبت جماعت میں وہ امام الائمہ کے مرتبے پر فائز ہوتے اور انھیں مجتہدین کرام کے سرتاج گردانا جاتا۔

شاہ صاحب کی یہ بہت بڑی خوش بختی ہے کہ جس طرح انھوں نے تصنیفات کی صورت میں اپنے پیچھے علم وفضل کا عظیم الشان ذخیرہ چھوڑا، اسی طرح اولاد کی شکل میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو خاص امتیاز بخشا۔ ان کی صلبی اولاد میں چار بیٹے فضل وکمال کے بلند مرتبے کو پہنچے جنھوں نے اپنے عالی قدر باپ کے علمی سلسلے کو باقاعدہ جاری رکھا اور آگے بڑھایا۔

شاہ صاحب کی دو شادیاں ہوئی تھیں۔ پہلی شادی اپنے ماموں کی دختر نیک اختر سے ہوئی۔ اس خاتون سے ایک لڑکا پیدا ہوا، جن کا نام محمد تھا۔ مولانا محمد ایک عالم آدمی تھے اور شاہ صاحب کی وفات کے وقت زندہ تھے، لیکن لاولد انتقال کر گئے۔

پہلی بیوی کی وفات کے بعد شاہ صاحب کی دوسری شادی سونی پت کے ایک بزرگ سید ثناء اللہ کی صاحب زادی سے ہوئی۔ اس نیک بخت خاتون کے بطن سے پانچ بچے متولد ہوئے۔ ایک بیٹی اور چار بیٹے۔ بیٹی کا نام امتہ العزیز تھا، بیٹوں کے نام علی الترتیب یہ ہیں: شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، اور شاہ عبدالغنی۔ ان کے جو حالات مل سکے وہ تو ان شاء اللہ بشرط زندگی فقہائے ہند کی اگلی جلد (تیرھویں صدی ہجری کے ضمن میں) تحریر کیے جائیں گے لیکن موقعے کی مناسبت سے ان کا مختصر تعارف ذیل کی سطور میں کرایا جاتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز:

آپ حضرت شاہ ولی اللہ کے سب سے بڑے صاحب زادے تھے۔ ان کی ولادت ۲۵ رمضان المبارک ۱۱۵۹ھ (۳۰ ستمبر ۱۷۴۶ء) میں ہوئی۔ تمام علوم مروجہ کی باقاعدہ تحصیل کی۔ نہایت ذہین اور حاضر جواب تھے۔ باپ کی وفات کے بعد ان کی مسند درس پر متمکن ہوئے۔ ساٹھ برس تک طلبائے علم کو علم حدیث اور

❶ اتحاف النبلاء، ص ۴۳۰۔

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیگر علوم اسلامی کا درس دیتے رہے۔ ان کے شاگردوں میں بڑے بڑے نامور حضرات کے اسمائے گرامی شامل ہیں، جنھوں نے بالخصوص علم حدیث کی بہت اشاعت کی۔ شاہ عبدالعزیز کے نرینہ اولاد نہ تھی۔ تین بیٹیاں تھیں، جن میں سے ایک کی شادی مولانا عبدالحی سے، دوسری کی شاہ رفیع الدین کے بیٹے مولانا عیسٰی سے اور تیسری کی شیخ محمد افضل سے ہوئی۔ شاہ عبدالعزیز متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات کو اہل علم میں نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور مختلف مسائل میں ان کے حوالے دیے جاتے ہیں۔ انھوں نے ۸۰ سال عمر پائی اور ۷ شوال ۱۲۳۹ھ (۱۷ جولائی ۱۸۲۴ء) کو اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو رخصت ہوئے۔

شاہ رفیع الدین:

آپ شاہ ولی اللہ کے دوسرے فرزند تھے۔ ۱۱۶۳ھ (۱۷۴۹ء) میں پیدا ہوئے۔ علم و فضل میں یگانۂ روزگار تھے۔ کئی کتابیں تصنیف کیں، تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ان کا سب سے عظیم کارنامہ یہ ہے کہ قرآن مجید کا اردو زبان میں ترجمہ کیا، جو ہر حلقے میں مقبول ہے۔ ۷۰ برس کی عمر کو پہنچ کر ۶ شوال ۱۲۳۳ھ (۹ اگست ۱۸۱۸ء) کو اپنے بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز کی زندگی میں انتقال کیا۔ اپنے والد بزرگ وار کے قریب پائیں کی طرف مدفون ہوئے۔

شاہ عبدالقادر:

شاہ ولی اللہ کے تیسرے بیٹے شاہ عبدالقادر تھے جو ۱۱۶۷ھ (۱۷۵۳ء) میں پیدا ہوئے اور علوم بوقلموں میں مرتبۂ اجتہاد کو پہنچے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر فنون متداولہ میں خوب مہارت پیدا کی۔ تقوے اور صالحیت میں ممتاز تھے۔ عزلت گزینی اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ قرآن مجید کا اردو ترجمہ ان کا رفیع الشان کام ہے۔ یہ ترجمہ ۱۲۰۵ھ (۱۷۹۱ء) میں مکمل ہوا۔ ''موضح القرآن'' اس کا نام ہے۔ ۱۹ رجب ۱۲۳۰ھ (۲۷ جون ۱۸۱۵ء) کو سفر آخرت اختیار کیا۔ اردو میں سب سے پہلے قران مجید کا ترجمہ شاہ عبدالقادر نے کیا۔

شاہ عبدالغنی:

شاہ ولی اللہ کے چوتھے فرزند شاہ عبدالغنی تھے۔ انھوں نے اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح زیادہ شہرت نہیں پائی، لیکن اس کمی کو ان کے فرزند عالی قدر حضرت شاہ اسماعیل شہید نے پورا کردیا۔ شاہ شہید نے شاہ عبدالعزیز کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور اپنے جدامجد حضرت شاہ ولی اللہ کے کمالات علمی اور معارف روحانی میں درجہ کمال کو پہنچے، اور پھر اپنے عمل و کردار سے اس کی خوب اشاعت کی۔ انھوں نے اس برصغیر کے مسلمانوں کی مذہبی، دینی اور سیاسی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور اپنی خدمات نوع بنوع سے انوکھے اسلوب کار کی طرح ڈالی، جس کی ضروری تفصیلات سلسلہ فقہائے ہند کی آئندہ جلدوں میں بیان کی جائیں گی۔ ان شاء اللہ العزیز۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے فرزندان گرامی کا یہ مختصر سا تعارف ہے۔ پوری اسلامی دنیا شاہ صاحب اور ان کی اولاد کے فیوض علمی و عملی سے بہرہ یاب ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی، ان کے حالات و سوانح

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھی بے شمار حضرات نے تحریر کیے اور آئندہ کرتے رہیں گے، لیکن افسوس ہے، اس وقت اس عالم آب وگل میں اس خاندان کا کوئی فرد موجود نہیں۔ نواب صدیق حسن خاں کی تصنیف "اتحاف النبلاء" ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء میں طبع ہوئی تھی۔ وہ اس میں شاہ ولی اللہ کے حالات کے ضمن میں لکھتے ہیں:

ولیکن دریں وقت ایں خاندان علم وکمال بتمامہا منقرض شدہ۔ دہیچ یکی ازاں ہا باقی نماندہ ❶۔

(اس وقت یہ پورا خاندانِ علم وکمال ختم ہو چکا ہے اور ان میں سے کوئی شخص اس دنیا میں باقی نہیں ہے۔)

قرآن مجید کا اردو ترجمہ:

آج اردو زبان بے حد ترقی کر چکی ہے، بہت سے علوم وفنون اس میں منتقل ہو گئے ہیں اور یہ ایک علمی زبان بن گئی ہے۔ اس میں اب قرآن مجید کے بہت سے ترجمے موجود ہیں، جن سے ہم استفادہ کرتے ہیں، لیکن آج سے ڈھائی سو سال پہلے کے حالات کو سامنے رکھیے، جب اردو زبان بالکل ابتدائی مرحلے میں تھی، پورے ہندوستان میں اس زبان میں چند گنتی کی کتابیں لکھی گئی تھیں اور اہل علم میں اس زبان میں تحریر وکتابت کا رواج نہ تھا۔ نہ اس کے اصول وقواعد وضع ہوئے تھے، نہ یہ علمی زبان بنی تھی اور نہ اس میں الفاظ کا ذخیرہ موجود تھا۔ اس زمانے میں اردو زبان کو ترجمے کی زبان بنانا اور ترجمے کے لیے بھی قرآن مجید کا انتخاب کرنا علمی لحاظ سے بہت مشکل اور دل گردے کا کام تھا۔

ترجمے کے سلسلے میں یہ بات ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ ترجمہ کرنے والے کے لیے کم سے کم تین اوصاف کا حامل ہونا ضروری ہے۔

۱۔ جس زبان میں ترجمہ کرنا مقصود ہے، اس میں مہارت رکھتا ہو۔

۲۔ جس زبان سے ترجمہ کرنا چاہتا ہے اس پر عبور ہو۔

۳۔ جس موضوع کی کتاب ترجمے کے لیے منتخب کی گئی ہے، اس موضوع کو خوب سمجھتا ہو۔

شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر بے شک عربی زبان کے ماہر تھے، مروجہ علوم وفنون میں بھی عبور رکھتے تھے۔ لیکن اردو زبان تو ان کے زمانے میں بالکل ابتدائی دور میں تھی اور اس کا دامن ابھی الفاظ وتراکیب کی وسعت سے زیادہ آشنا نہ ہوا تھا۔ اس میں قرآن مجید کا ترجمہ کرنا محض نصرت خداوندی اور ان بزرگوں کی بے پناہ ذہانت کی دلیل ہے۔

بہر حال شاہ ولی اللہ صاحب کے فرزندان گرامی ___ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر ___ کی بہت بڑی دینی خدمت، قرآن مجید کا اردو ترجمہ ہے۔ جس طرح خود شاہ صاحب نے قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کر کے عظیم الشان کارنامہ انجام دیا، اسی طرح ان کے بیٹوں نے بھی یہ عدیم المثال خدمت انجام دی۔ رحمہم اللہ تعالیٰ

❶ اتحاف النبلاء ص ۴۳۱۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ـــــ ی ـــــ

۹۹۔ مولانا یار محمد لاہوری

بارھویں صدی ہجری میں خطہ لاہور کے جن علمائے کرام نے خاص طور پر شہرت حاصل کی ان میں مولانا یار محمد کا اسم گرامی قابل ذکر ہے۔ مولانا ممدوح اپنے وقت کے فاضل بزرگوں میں گردانے جاتے تھے۔ لاہور میں پیدا ہوئے اور یہیں نشوونما پائی۔ قرآن مجید حفظ کیا اور مختلف اساتذہ سے علوم متداولہ کی تحصیل کی۔ پھر حجاز کی ارض مقدس کا قصد کیا اور حج وزیارت کی نعمت سے مالا مال ہوئے۔ بعد ازاں مراجعت فرمائے وطن ہوئے اور خدمت دین کو مقصد حیات ٹھہرایا۔ اپنے گوناگوں اوصاف کی بنا پر لوگوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور بڑی عزت وتکریم کے مالک تھے۔ اسلامی معاملات میں جری اور غیور تھے۔ امور دینیہ کی اشاعت اور تائید حق میں بحث ومناظرہ میں تیز تھے۔

اس ضمن میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا شاہ عالم سریر آرائے سلطنت ہند ہوا تو اس نے تخت نشینی کے کچھ عرصہ بعد یہ حکم جاری کر دیا کہ مملکت ہند کی تمام مسجدوں کے خطیب خطبہ عیدین اور خطبہ جمعہ میں خلفائے راشدین کے ذکر میں جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام لیں تو ان کے ساتھ لفظ ''وصی'' استعمال کریں۔ اس حکم پر پورے ملک میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا اور مساجد کے خطیبوں اور عوام اہل سنت نے شدید احتجاج کیا اور مختلف مقامات میں سخت ہنگامے ہوئے۔ ان مقامات میں لاہور اور احمد آباد بھی شامل ہیں۔ یہاں کے لوگ میدان میں نکل آئے۔ احمد آباد میں تو سخت اشتعال پیدا ہو گیا اور نوبت قتل و غارت تک پہنچ گئی۔ لاہور میں بھی بہت ہنگامی صورت حال پیدا ہو گئی اور لوگ بادشاہ کے اس حکم کی برسرعام مخالفت کرنے لگے۔ علما میں مولانا یار محمد اور مولانا محمد مراد نے بادشاہ کے اس فرمان کو ماننے اور اس پر عمل کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔ مولانا یار محمد صورت حال کی وضاحت کے لیے لاہور کے قاضی کے پاس گئے اور کہا کہ بادشاہ یہ حکم واپس لے لے۔ جب معاملہ سنگین نوعیت اختیار کر گیا تو خود بادشاہ نے علمائے لاہور سے گفتگو کی اور اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کو موضوع بحث ٹھہرایا۔

مولانا یار محمد ہی زیادہ تر بادشاہ سے گفتگو کرتے رہے۔ مسئلہ چونکہ نازک منزل میں داخل ہو گیا تھا اور اس میں خود بادشاہ کے ذاتی وقار اور حکم کا سوال تھا، اس لیے بادشاہ کی یہ کوشش تھی کہ اس حکم پر بہر حال عمل کیا جائے۔ مگر مولانا یار محمد یہ قطعاً برداشت نہ کرتے تھے اور ان کا انداز کلام اتنا سخت تھا کہ منتخب اللباب کا مصنف خافی خان اسے ''گستاخانہ'' قرار دیتا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں:

حاجی یار محمد در رد قول پادشاہ گستاخانہ و بے محابا پیش آمدہ با پادشاہ سوال و جواب می نمود، پادشاہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

برآشفتہ فرمودند کہ از غضب پادشاہاں نمی ترسی کہ چنیں خلاف آداب مجلس سلاطین مبادرت بکلمہ وکلام می نمائی ❶۔

یعنی حاجی یار محمد نے بادشاہ کی بات کے رد میں گستاخانہ اور غیر مؤدبانہ انداز اختیار کیا اور بادشاہ کے حضور سختی سے گفتگو کی۔ بادشاہ اس سے بہت خفا ہوا، اور فرمایا کہ تم بادشاہ کے غضب سے نہیں ڈرتے، اور تلخ کلامی سے پیش آتے ہو جو کہ بادشاہوں کی آداب مجلس کے بالکل منافی ہے۔

مولانا یار محمد چونکہ نہایت جرأت مند عالم دین تھے اور کلمۂ حق کہنے میں کسی کی پروانہ کرتے تھے، بے جھجک بولے۔

حاجی یار محمد در جواب گفت کہ من آرزوئے عطائے چہار چیز از واہب بے نخت خود داشتم، اول تحصیل علم، دوم حفظ کلام اللہ، سوم حج، چہارم شہادت۔ الحمد للہ کی از طرف عطائی سہ نعمت الٰہی کامیاب شدہ ام، آرزوئے شہادت باقی ماندہ، امید دارم کہ از توجہ پادشاہ عدالت اساس کامروا گردم ❷۔

(حاجی یار محمد نے جواب دیا کہ میں بارگاہ خداوندی سے چار چیزوں کی آرزو رکھتا تھا۔ ایک حصول علم کی، دوسرے حفظ قرآن مجید کی، تیسرے حج بیت اللہ کی، اور چوتھے راہ خدا میں شہادت کی۔ الحمد للہ! کہ اللہ نے مجھے پہلی تین چیزوں کی نعمت کے حصول میں کامیاب فرمایا دہے۔ اب آرزوئے شہادت باقی ہے۔ امید رکھتا ہوں کہ بادشاہ کی مہربانی سے اس نعمت کے حصول میں بھی کامیاب ہو جاؤں گا۔)

اس نازک اور اہم مسئلے پر کئی روز تک بحث ہوتی رہی۔ اس اثنا میں تمام لوگ مولانا یار محمد کی حمایت پر اتر آئے اور بادشاہ کے حکم کی برملا مخالفت کرنے لگے۔ منتخب اللباب کا مصنف لکھتا ہے کہ خود بادشاہ کا بیٹا عظیم الشان بھی مولانا ممدوح کا حامی اور بادشاہ کا مخالف ہوگیا۔ چنانچہ بادشاہ نے گہری نظر سے حالات کا جائزہ لیا اور علما، عوام اور خود بیٹے کو اپنے خلاف پایا تو حکم واپس لے لیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ لفظ ''وصی'' شامل کرنے سے خطیبوں کو منع کر دیا۔

لیکن حالات کچھ ایسا رخ اختیار کر گئے تھے کہ اگرچہ بادشاہ نے اپنا حکم واپس لے لیا تھا مگر لوگ مطمئن نہ ہوئے اور کثیر تعداد میں نماز جمعہ میں شریک ہوئے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اگر یہ لفظ پڑھا گیا تو اس کے خلاف احتجاج کیا جائے گا، لیکن جب انھوں نے خطبہ جمعہ سنا اور لفظ ''وصی'' خطبے میں نہ پڑھا گیا تو اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ پھر جب بادشاہ کو یہ اطلاع پہنچی کہ لوگ مسجد میں ہجوم کر کے آگئے تھے تو اس نے شدید خفگی کا اظہار کیا اور مولانا یار محمد اور ان کے ساتھی علما کو گرفتار کر کے قلعے میں بند کر دیا۔ اس نے یہ قدم اس لیے اٹھایا کہ اسے شبہ تھا کہ لوگوں کو مسجد میں مولانا یار محمد اور ان کے رفقا نے بھیجا ہے۔ مگر بعد میں صورت حال معمول پر آگئی اور گرفتار شدگان کو رہا کر دیا گیا۔

بہر حال مولانا یار محمد لاہوری اپنے عہد کے مشہور اور نامور عالم و فقیہ تھے ❸۔

---

❶ منتخب اللباب ج ۲ ص ۶۸۲

❷ منتخب اللباب ج ۲، ص ۶۸۲۔

❸ منتخب اللباب کے علاوہ یہ واقعہ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۴۱۸، ۴۱۹ میں بھی مرقوم ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۰۰۔ شیخ یٰسین جون پوری

ارض ہند میں علم وفضل اور تصوف وسلوک کے لحاظ سے گزشتہ دور میں صوبہ یوپی کے شہر جون پور کو بڑی خصوصیت حاصل رہی ہے۔ وہاں کے اہل علم اور ذی فضل حضرات نے بے حد شہرت پائی اور تصنیف و تالیف، درس وتدریس اور دیگر اوصاف وکمالات میں بلند مرتبے کو پہنچے۔ انہی حضرات میں ایک عالم دین شیخ یٰسین بن باقر عثمانی جون پوری مازندرانی بھی تھے۔ وہ جون پور میں پیدا ہوئے، وہیں نشوونما پائی، اور حصول علم کے لیے الٰہ آباد پہنچے۔ وہاں شیخ محمد یحییٰ عباسی (متوفی ۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۱۴۴ھ/ ۳۱ اکتوبر ۱۷۳۱) اور ان کے لائق بیٹے شیخ محمد طاہر عباسی (متوفی ۲ جمادی ۱۱۴۳ھ/ ۲ نومبر ۱۷۳۰ء) کا سلسلہ درس جاری تھا، اس میں شامل ہوئے۔ کتب درسیہ ان دونوں باپ بیٹے سے پڑھیں۔ شیخ محمد یحییٰ عباسی سے اخذ طریقت بھی کیا اور ایک عرصے تک وہاں رہے، پھر جون پور واپس آ گئے اور شادی کی۔ کچھ مدت بعد بیوی کا انتقال ہو گیا تو گوشہ گیری کی زندگی اختیار کر لی اور پھر سفر حج پر روانہ ہو گئے۔ ۱۱۴۹ھ/ ۱۷۳۷ء میں فریضۂ حج ادا کیا۔ اس زمانے میں مدینہ منورہ میں شیخ محمد حیات سندھی (متوفی ۲۶ صفر ۱۱۶۳ھ/ ۲۴ جنوری ۱۷۵۰ء) کی مسند تدریس آراستہ تھی، اس میں شریک ہو گئے اور ان سے علم حدیث حاصل کیا۔ پھر ہندوستان واپس آئے اور زندگی کے آخری دو سال فرخ آباد میں گزارے اور وہیں ۵ جمادی الاخریٰ ۱۱۸۳ھ/ ۱۶ اکتوبر ۱۷۶۹ء کو وفات پائی [1]۔

۱۰۱۔ مفتی یعقوب فرنگی محلی لکھنوی

علمائے فرنگی محلی کی طویل فہرست میں مفتی یعقوب بن عبدالعزیز بن اسعد بن قطب الدین انصاری سہالوی لکھنوی کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ ممدوح کا شمار بارھویں صدی ہجری کے ممتاز ہندی علما وفقہا میں ہوتا ہے۔ ان کا مولد ومنشا لکھنؤ ہے۔ اپنے دور کے معروف عالم مولانا محمد حسن انصاری سہالوی لکھنوی (متوفی ۳ صفر ۱۱۹۹ھ/ ۱۶ دسمبر ۱۷۸۴ء) اور اپنے والد مکرم کے عم محترم اور عالم کبیر شیخ نظام الدین انصاری سہالوی (متوفی ۸ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ/ ۲۵ اپریل ۱۷۴۸ء) سے کسب علم کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مسند درس پر فائز ہوئے اور علم فقہ اور دیگر علوم متداولہ میں شہرت حاصل کی۔ ان کو یہ شرف حاصل ہے کہ شیخ نظام الدین انصاری سہالوی کی زندگی ہی میں ان کا شمار اپنے عصر کے معروف علمائے کرام میں ہونے لگا تھا۔ ان کی علمی شہرت سے متاثر ہو کر وزیر الممالک صفدر جنگ ابوالمنصور خان نے ان کو لکھنؤ کے منصب افتا پر فائز کر دیا تھا۔

مفتی یعقوب علوم دینیہ کا درس دیتے تھے اور امانت و دیانت میں نہایت مشہور تھے۔ انھوں نے ۶۳ سال عمر پائی اور ۱۱۸۷ھ/ ۱۷۷۳ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا [2]۔

---

[1] تجلی نور، ج ۲ ص ۴۸ تا ۵۱۔ تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۶۹۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۴۱۹، ۴۲۰۔

[2] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۰۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۲۰۵، ۲۰۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۴۲۲۔ احوال علمائے فرنگی محل ص ۸۱۳

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مراجع ومصادر

اس کتاب کی تصنیف میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔

۱۔ صحیح بخاری: محمد بن اسماعیل بخاری۔ مطبع اصح المطابع دہلی۔

۲۔ صحیح مسلم: امام مسلم۔ مطبع اصح المطابع، دہلی۔

۳۔ ابجد العلوم: نواب صدیق حسن خان۔ مطبع صدیقیہ، بھوپال، ۱۲۹۵ھ۔

۴۔ اتحاف النبلا: نواب صدیق حسن خان۔ مطبع نظامی، کان پور، ۱۲۸۸ھ۔

۵۔ احوال علمائے فرنگی محل: شیخ الطاف الرحمن۔ مطبع مجتبائی۔

۶۔ اخبار الصنادید: حکیم نجم الغنی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔

۷۔ ادبیات سرحد: رضا ہمدانی۔ نیا مکتبہ، پشاور۔ ۱۹۵۳ء

۸۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ بہ ضمن ''ٹیپو سلطان'' مضمون غلام رسول مہر۔

۹۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ بہ ضمن '' حافظ رحمت خاں'' مضمون بزمی انصاری۔

۱۰۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور بہ ضمن ''برکی'' مضمون ڈاکٹر محمد جہاں گیر خاں۔

۱۱۔ اذکار الابرار: شاہ محمد تقی حیدر۔ شاہی پریس لکھنؤ۔ ۱۳۵۷ھ

۱۲۔ ارمغان شاہ ولی اللہ: محمد سرور جامعی۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ لاہور۔

۱۳۔ انسان العین فی مشائخ الحرمین: شاہ ولی اللہ دہلوی۔ مطبع احمدی، دہلی۔

۱۴۔ امداد فی مآثر الاجداد: شاہ ولی اللہ دہلوی۔ مطبع احمدی، دہلی۔

۱۵۔ عطیۃ الصمدیہ فی الانفاس المحمدیہ: شاہ ولی اللہ دہلوی۔ مطبع احمدی، دہلی۔

۱۶۔ انفاس العارفین: شاہ ولی اللہ دہلوی، مطبع مجتبائی، دہلی ۱۹۱۷ء

۱۷۔ البدور البازغہ: شاہ ولی اللہ دہلوی۔ شاہ ولی اللہ اکیڈیمی، حیدر آباد (سندھ) ۱۹۷۰ء

۱۸۔ تاریخ سلطنت خداداد میسور: محمود خان بنگلوری۔ پبلشرز یونائیٹڈ، لاہور۔ ۱۹۴۷ء

۱۹۔ بزم تیموریہ: سید صباح الدین عبدالرحمن۔ دار المصنفین، اعظم گڑھ۔

۲۰۔ بزم سخن: سید علی حسن خان، مطبع نامی مفید عام، آگرہ۔ ۱۸۸۱ء

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۱۔ بوستان اخبار: سعید احمد مارہروی۔ مطبوعہ آگرہ۔ ۱۳۳۱ھ۔

۲۲۔ تاریخ برہان پور: خلیل الرحمن برہان پوری۔ مطبع مجتبائی، دہلی ۱۳۱۷ھ۔

۲۳۔ تاریخ خورشید شاہی: غلام امام خان ترین۔ مطبع خورشیدیہ، حیدرآباد (دکن) ۱۲۸۶ھ۔ ۱۸۷۰ء

۲۴۔ تاریخ شیراز ہند جون پور: سید اقبال حسین۔ ادارہ شیراز ہند پبلشنگ ہاؤس، جون پور۔ ۱۹۶۴ء

۲۵۔ تاریخ کشمیر اعظمی: خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کشمیری۔ ناشر، غلام محمد نور محمد سری نگر۔

۲۶۔ تاریخ مشاہیر چشت: خلیق احمد نظامی، ندوۃ المصنفین، دہلی۔ ۱۹۵۳ء

۲۷۔ تاریخ معصومی: میر محمد معصوم بھکری۔ سندھی ادبی بورڈ، کراچی۔ ۱۹۵۹ء

۲۸۔ تاریخ النوائط: نواب عزیز جنگ بہادر۔ عزیز المطابع، حیدرآباد (دکن) ۱۳۲۲ھ

۲۹۔ تجلی نور المعروف تذکرہ مشاہیر جون پور: نور الدین زیدی۔ مطبع اعظم المطابع، جون پور۔ ۱۸۸۹ء

۳۰۔ تحفۃ الکرام: میر علی شیر قانع۔ سندھی ادبی بورڈ، کراچی۔ ۱۹۵۹ء

۳۱۔ تحفہ کشمیر: منشی گنیش لعل دہلوی، مطبع کوہ نور، لاہور۔ ۱۸۵۳ء

۳۲۔ تذکرہ آثار الشعراء: سید محمد ممتاز، مطبع شاہ جہانی، بھوپال۔ ۱۳۰۴ھ

۳۳۔ تذکرہ الشعراء: امیر دولت شاہ۔ مطبع مجیدی، کان پور۔ ۱۳۲۶ھ

۳۴۔ تذکرہ صوفیائے سندھ: اعجاز الحق قدوسی۔ اردو اکیڈیمی سندھ، کراچی۔ ۱۹۵۹ء

۳۵۔ تذکرۃ العلماء والمشائخ: محمد الدین فوق۔ گلزار محمدیہ اسٹیم پریس، لاہور، ۱۳۲۸ھ

۳۶۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل: مولوی محمد عنایت اللہ۔ مطبوعہ لکھنو۔ ۱۹۳۰ء

۳۷۔ تذکرہ علمائے ہند: رحمان علی۔ مطبع نول کشور لکھنو۔ ۱۹۱۴ء

۳۸۔ تذکرہ مشائخ بنارس: ابوالاثر عبدالسلام۔ ندوۃ المعارف، بنارس۔ ۱۳۷۱ھ

۳۹۔ تذکرہ مشاہیر کاکوری: محمد علی حیدر۔ مطبع اصح المطابع لکھنو۔ ۱۹۲۷ء

۴۰۔ تذکرہ مصنفین درس نظامی: اختر راہی۔ مکتبہ رحمانیہ، لاہور۔ ۱۳۹۸ھ۔ ۱۹۷۸ء

۴۱۔ تفہیمات الالٰہیہ: شاہ ولی اللہ۔ مطبوعہ حیدرآباد (سندھ) ۱۹۶۷ء

۴۲۔ تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار: نواب صدیق حسن خان۔ مطبوعہ بھوپال۔ ۱۲۹۸ھ

۴۳۔ الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند: سید عبدالحی حسنی لکھنوی۔ مطبوعہ دمشق۔ ۱۹۵۸ء

۴۴۔ چمنستان شعراء: رائے لچھمی نرائن شفیق: مطبوعہ حیدرآباد (دکن) ۱۹۲۸ء

۴۵۔ حجۃ اللہ البالغہ: شاہ ولی اللہ دہلوی۔ مکتبہ سلفیہ، شیش محل روڈ۔ لاہور۔ ۱۹۷۵ء

۴۶۔ حدائق الحنفیہ: مولوی فقیر محمد جہلمی۔ مطبع نول کشور لکھنو۔ ۱۳۲۴ھ۔ ۱۹۰۶ء

۴۷۔ حدیقۃ الاولیا: مفتی غلام سرور لاہور۔ مطبع نول کشور لکھنو۔ ۱۸۷۷ء

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴۸۔ حکایات کشمیر: محمد الدین فوق۔ کریمی پریس، لاہور۔ ۱۳۴۷ھ۔ ۱۹۲۹ء
۴۹۔ حیات حافظ رحمت خاں: سید الطاف علی بریلوی۔ اکیڈمی آف ایجوکیشنل آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی۔ ۱۹۶۳ء
۵۰۔ حیات العلما: سید عبدالباقی سہسوانی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۳۴۰ھ۔ ۱۹۲۲ء
۵۱۔ حیات ولی: مولانا رحیم بخش دہلوی۔ مکتبہ سلفیہ، لاہور۔ ۱۹۵۵ء
۵۲۔ تذکرہ۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ مکتبہ احباب، لاہور۔
۵۳۔ قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین: شاہ ولی اللہ دہلوی۔ مکتبہ سلفیہ، لاہور۔ ۱۳۹۶ھ۔ ۱۹۷۶ء
۵۴۔ ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون: اسماعیل پاشا۔ مکتبہ بہیہ استنبول۔ ۱۹۴۵ء۔ ۱۳۶۴ھ
۵۵۔ وارن ہیسٹنگز اور انگریزی راج: ازای۔ پی۔ مون۔ ترجمہ۔ سید اولاد علی گیلانی۔ ناشر۔ کتاب منزل، لاہور۔ ۱۹۵۱ء
۵۶۔ مومن، حالات زندگی اور ان کے کلام پر تنقید: کلب علی خان فائق رام پوری۔ مجلس ترقی ادب، لاہور۔ ۱۹۶۱ء
۵۷۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل: سید طفیل احمد منگلوری علیگ۔ ناشر حماد الکتبی، شیش محل روڈ۔ لاہور۔
۵۸۔ خزانہ عامرہ: سید غلام علی آزاد بلگرامی۔ مطبع نول کشور۔ لکھنؤ۔ ۱۹۱۴ء
۵۹۔ خزینۃ الاصفیا: مفتی غلام سرور لاہور۔ مطبع نامی گرامی سراج پنڈت بیج ناتھ موسوم بہ ثمر ہند، لکھنؤ۔ ۱۲۹۰ھ
۶۰۔ خلاصۃ التواریخ: لالہ سجان رائے بٹالوی۔ بہ تصحیح ظفر احسن، مطبع جی اینڈ سنز، دہلی۔ ۱۹۱۸ء
۶۱۔ رود کوثر: شیخ محمد اکرام۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔ ۱۹۷۵ء
۶۲۔ روضۃ الابرار: محمد الدین۔ سراج المطابع، جہلم۔ ۱۳۰۲ھ
۶۳۔ روضۃ الاولیا: غلام علی آزاد بلگرامی۔ مطبع اعجاز صفدری، حیدرآباد (دکن) ۱۳۰۱ھ
۶۴۔ سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان: غلام علی آزاد بلگرامی۔ طبع بمبئی۔ ۱۳۰۳ھ
۶۵۔ سرو آزاد: غلام علی آزاد بلگرامی۔ مطبع مفید عام، آگرہ۔ ۱۹۱۰ء
۶۶۔ سفینۃ الاولیا: داراشکوہ۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۸۸۴ء
۶۷۔ سید احمد شہید: غلام رسول مہر۔ کتاب منزل، لاہور۔ ۱۹۵۴ء
۶۸۔ سیر الاولیا: محمد مبارک علوی المعروف امیر خرد کرمانی۔ مطبع محب ہند۔ دہلی۔ ۱۳۰۲ھ
۶۹۔ سیر المتاخرین: غلام حسین طباطبائی۔ نول کشور لکھنؤ۔ ۱۲۸۲ھ
۷۰۔ طرب الاماثل بتراجم الافاضل: مولانا ابوالحسنات عبدالحی لکھنوی۔ مطبع یوسفی، لکھنؤ۔ ۱۹۲۱ء
۷۱۔ فرحت الناظرین (شخصیات): محمد اسلم پسروری۔ ترجمہ و ترتیب، محمد ایوب قادری مطبوعہ کراچی۔ ۱۹۷۲ء
۷۲۔ الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ: مولانا ابوالحسنات عبدالحی لکھنوی، مطبوعہ مصر۔ ۱۳۲۴ھ
۷۳۔ قضاء الارب من ذکر علما النحو والادب: ذوالفقار احمد۔ طبع آگرہ۔ ۱۳۱۶ھ
۷۴۔ کلمات طیبات: ابوالخیر محمد بن احمد مراد آبادی۔ مطبع مجتبائی، دہلی۔ ۱۳۰۹ھ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۷۵۔ گل رعنا: سید عبدالحی حسنی لکھنوی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔ طبع سوم، ۱۹۶۴ء
۷۶۔ گلزار اولیا: مظفر حسین۔ مطبع سبحانی، حیدر آباد (دکن)۔ ۱۳۳۹ھ۔ ۱۹۲۰ء
۷۷۔ مآثر الامرا: شاہ نواز خاں۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ۔ ۱۸۸۸ء۔ ۱۸۹۰ء
۷۸۔ مآثر عالم گیری: محمد ساقی مستعد خان، نفیس اکیڈیمی، کراچی۔ ۱۹۶۲ء
۷۹۔ مآثر الکرام: غلام علی آزاد بلگرامی۔ مکتبہ احیاء العلوم الشرقیہ، لاہور۔ ۱۹۷۱ء
۸۰۔ محبوب ذی المنن تذکرہ علمائے دکن: عبدالجبار خاں ملکاپوری۔ مطبع رحمانی وحسن پریس، حیدر آباد (دکن) ۱۳۳۳ھ
۸۱۔ محبوب ذی المنن تذکرہ شعرائے دکن: عبدالجبار خاں ملکاپوری۔ مطبع رحمانی حیدر آباد (دکن) ۱۳۲۹ھ
۸۲۔ مرأت احمدی: مرزا محمد حسن الملقب بہ علی محمد خاں بہادر۔ مطبوعہ کلکتہ۔ ۱۹۱۷ء
۸۳۔ مسلم الثبوت: قاضی محب اللہ بہاری۔ مطبع انصاری، دہلی۔ ۱۸۹۹ء
۸۴۔ مشاہیر ادب اردو: مہیش پرشاد۔ ناشر نندکشور اینڈ برادرز بنارس۔ ۱۹۳۲ء
۸۵۔ معمولات مظہریہ: نعیم اللہ بھرائچی۔ مطبع محمدی، لاہور۔ ۱۳۱۰ھ
۸۶۔ مقامات مظہری: غلام علی علوی مجددی۔ مطبع مجتبائی، دہلی، ۱۳۰۹ھ۔ ۱۸۹۲ء
۸۷۔ ملفوظات شاہ عبدالعزیز دہلوی: مطبع مجتبائی میرٹھ۔ ۱۳۱۴ھ
۸۸۔ مقالات شبلی (جلد سوم): مرتبہ، سید سلیمان ندوی۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۳۷۵ھ۔ ۱۹۵۵ء
۸۹۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی (جلد دوم): مولانا محمد میاں۔ مکتبہ محمودیہ۔ لاہور۔ ۱۳۹۷ھ۔ ۱۹۷۷ء
۹۰۔ منتخب اللباب: خافی خاں۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ۔ ۱۸۶۹ء
۹۱۔ نزہۃ الخواطر (جلد ششم): سید عبدالحی حسنی لکھنوی۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ، حیدراباد (دکن) ۱۳۷۶ھ۔ ۱۹۵۷ء
۹۲۔ نوائے معارک: عطا محمد شکارپوری۔ سندھی ادبی بورڈ، کراچی۔ ۱۹۵۹ء
۹۳۔ مصفیٰ ومسویٰ شرح موطا: شاہ ولی اللہ دہلوی۔ جید برقی پریس۔ دہلی۔ ۱۳۴۶ھ
۹۴۔ عمل صالح (شاہ جہان نامہ): محمد صالح کنبو۔ مجلس ترقی ادب۔ لاہور
۹۵۔ کشف الظنون: (دو جلد) حاجی خلیفہ۔ مطبعہ بہیہ، استنبول۔ جلد اول طبع ۱۹۴۱ء۔ ۱۳۶۰ھ، جلد ثانی طبع ۱۹۴۳ء، ۱۳۶۲ھ
۹۶۔ نصب الرایہ لاحادیث الہدایہ: (جز اول) ابو محمد عبداللہ بن یوسف حنفی زیلعی۔ طبع اول۔ ۱۳۵۷ھ۔ ۱۹۳۸ء
۹۷۔ واقعات دارالحکومت دہلی: (حصہ اول، دوم، سوم) بشیر الدین احمد دہلوی شمسی مشین پریس، آگرہ۔ ۱۳۳۷ھ۔ ۱۹۱۹ء
۹۸۔ ہدیۃ العافین اسماء المولفین وآثار المصنفین: (جلد اول) اسماعیل پاشا بغدادی مطبعہ بہیہ، استنبول۔ ۱۹۵۱ء
۹۹۔ ہدیۃ العارفین اسماء المولفین وآثار المصنفین: (جلد ثانی) اسماعیل پاشا بغدادی مطبعہ بہیہ، ۱۹۵۵ء
۱۰۰۔ الیانع الجنی: محمد بن یحیٰی المدعو بہ محسن تیمی بکری ترہتی۔ مطبع صدیقی، بریلی۔ ۱۲۸۷ھ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۰۱۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات: خلیق احمد نظامی، ادارہ اسلامیات، لاہور۔

۱۰۲۔ روز نامہ امروز: لاہور، مورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۶۰ء مضمون، مولانا علم الدین سالک۔

۱۰۳۔ ہفت روزہ الاعتصام: لاہور، بابت ماہ مارچ ۴، ۱۱ مارچ ۱۹۵۵ء مضمون فیض الرحمٰن الثوری۔

۱۰۴۔ ماہ نامہ ترجمان الحدیث: لاہور، بابت ماہ مارچ ۱۹۷۹ء۔ مضمون ارشاد الحق اثری۔

۱۰۵۔ ماہ نامہ الحق: اکوڑہ خٹک، بابت ماہ جنوری ۱۹۷۸ء مضمون ڈاکٹر سید سعید اللہ۔

۱۰۶۔ ماہ نامہ الرحیم: حیدر آباد، بابت ماہ اگست ۱۹۶۳ء۔ مضمون مخدوم امیر احمد۔

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ